وہ جو بیچتے تھے دوائے دل

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی



وہ جو بیچتے تھے دوائے دل......

علم وادب اور دینی وملی خدمات کے مختلف شعبوں سے متعلق
اہم شخصیات کا تذکرہ، جس کو حالات کے ساتھ نقوش وتاثرات
اور جگ بیتی کے ساتھ آپ بیتی کی آمیزش نے مسافران علم
وقلم اور طالبانِ رشد وہدایت کے لئے مشعل راہ بنادیا ہے۔

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

طبع دوم ۲۰۱۵ء — ۱۴۳۷ھ

نام کتاب	:	وہ جو بیچتے تھے دوائے دل......
تالیف	:	مولانا خالد سیف اللہ رحمانی
صفحات	:	٦٥٦
کمپیوٹر کتابت	:	محمد نصیر عالم سبیلی ''**العالم**'' اُردو کمپیوٹر سنٹر، کوتہ پیٹ، حیدرآباد (فون نمبر: 9959897621, 8125690571)
اشاعت	:	۱۴۳۷ھ — ۲۰۱۵ء
تعداد	:	ایک ہزار
قیمت	:	

ناشر : کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، سہارنپور (یوپی)

ملنے کے پتے

- کتب خانہ نعیمیہ دیوبند، ضلع سہارنپور، یوپی۔
- المعہد العالی الاسلامی، تعلیم آباد، قبا کالونی، شاہین نگر، حیدرآباد۔
- ایفا پبلی کیشنز، نئی دہلی۔
- ہندوستان پیپر ایمپوریم، مچھلی کمان، حیدرآباد۔
- دکن ٹریڈرس، مغل پورہ پانی کی ٹنکی، حیدرآباد۔

کوئی کیوں کسی کا لبھائے دل
کوئی کیا کسی سے لگائے دل

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل
وہ دُکان اپنی بڑھائے گئے

(بہادر شاہ ظفرؔ)

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۔ (الحشر:۱۰)

ہمارے پروردگار! ہمیں معاف کر دیجئے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی، جو ہم سے پہلے ایمان لائے اور ہمارے دلوں میں ان لوگوں کے لئے کینہ نہ رہنے دیجئے، جو ایمان لا چکے ہیں، پروردگارا! آپ بے شک بے حد شفیق اور بہت ہی مہربان ہیں۔

فہرست مضامین

دوسرا باب : دیدہ وشنیدہ نامور ہستیاں

تیسرا باب : مشفق اساتذہ اور محسن احباب

چوتھا باب : کچھ خاندانی بزرگ

اگر سیاہ دلم ، داغِ لالہ زار او ام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہارِ او ام

دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

۞ ۞ ۞

کچھ اس کتاب
اور
صاحبِ کتاب کے بارے میں!

مجھے خوشی ہے کہ اس عہد کے ایک ممتاز عالم دین اور صاحبِ قلم کے مضامین کے اس مجموعہ کے بارے میں کچھ اظہار خیال کا موقع حاصل ہورہا ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی عصر رواں کے ایک ممتاز عالم دین، فقیہ، خطیب اور داعی حق ہیں، ساتھ ہی ساتھ خدا نے انھیں لطیف ودلکش پیرایہ میں اظہار خیال پر قدرت عطا کی ہے، اشخاص ورجال کی شخصیت کے خاکے اوران کے علمی وفکری مقام ومرتبہ پر روشنی ڈالنے میں انھیں مہارت حاصل ہے، عام طور پر ہمارے علماء دین اوراہل مدرسہ انشاء پردازی کے آرٹ سے کم واقف ہوتے ہیں اور وہ جو کچھ لکھتے لکھاتے ہیں، اس میں بڑی خشکی اور بے کیفی ہوتی ہے؛ لیکن مشیت کی طرف سے جسے ملکہ انشاپردازی حاصل ہوتا ہے، وہ پھر اس طرح قلم کا جوہر دکھاتا ہے کہ دنیا حیران رہ جاتی ہے، مولانا رحمانی کی شخصیت بہ ظاہر ایک خشک عالم دین کی نظر آتی ہے، مگر جب وہ قلم ہاتھ میں لیتے ہیں، یا جب کسی مجمع سے مخاطب ہوتے ہیں تو ان کی تحریر کی نغمگی اور آواز کا جادو لوگوں کو مسحور کردیتا ہے، مجھے ان کی تحریریں اور تقریریں سننے کا بڑا وقیع موقع ملتا رہا ہے، حیران ہوں کہ خدا نے ان کے قلم وزبان کو کس قدر توانائی عطا کی ہے، جو کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتی، ملکی وملی اور عالمی مسائل پر اخبارات کے صفحات ان کی تحریروں سے جگمگاتے رہتے ہیں، پھر مسند فقہ وعلوم دین کی شہ نشین میں جب وہ جلوہ گر ہوتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ امام غزالیؒ وابن تیمیہؒ سے شاہ ولی اللہؒ تک کتنے دیدہ ورانِ اسلام کی جودت طبع کے چراغ ان کی انجمن میں روشن ہیں۔

پیش نظر مجموعہ مضامین ''وہ جو بیچتے تھے دوائے دل'' ان کے پینتالیس (۴۵)

اہم شخصیتوں کے خاکوں اوران کے کارناموں پر مشتمل ہے،ان میں کچھ وہ عظیم دیدہ وراِن ہیں، جن سے مصنف کی دید وشنید نہ تھی،مگران کے کارناموں پر مصنف وارفتہ ہے، یہ دودمانِ ملت ہیں: مولانا محمد قاسم نانوتوی، رشید احمد گنگوہی، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا انور شاہ کشمیری، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر حمید اللہ وغیرہ — کتاب کے دوسرے باب میں ایسے ناموروں کا ذکر ہے، جن سے مصنف کو قربت اور استفادہ کا موقع ملا، مثلاً قاری محمد طیب صاحب، مولانا محمد زکریا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا سید منت اللہ رحمانی، قاضی مجاہد الاسلام قاسمی، قاری محمد صدیق صاحب وغیرہ، کتاب کے تیسرے حصہ میں مصنف اپنے مشفق اساتذہ اور محسن احباب کا اور چوتھے باب میں اپنے اعزہ کا ذکر کرتے ہیں، اس حصہ میں ان کی تحریروں میں بڑا سوز وگداز اور والہانہ انداز موجود ہے، خاص طور پر اپنے والدین کے ذکر میں وہ خون جگر نچوڑ دیتے ہیں۔

علامہ اقبال، علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، عبدالماجد دریادی، ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب کے تذکرے میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی معرکۂ ادب وانشاء پردازی میں اللہ کی شمشیر بن کر سامنے آتے ہیں، اس تحریر کی ابتدائی سطریں محسوس ہوتی ہیں کہ مضمون نگار اپنے محبوب شاعر کے لئے رجز خوانی کررہا ہے، جیسے علامہ اقبالؒ کے بارے میں کہتے ہیں :

> یورپ دیدہ مگر کعبہ رسیدہ'' دماغ فلسفی، دل صوفی، رازی کے پیچ وتاب سے بھی واقف رومی کے سوز وگداز سے بھی آشنا، گفتار میں جوش، کردار میں ہوش، اُسلوب شاعرانہ، طبیعت واعظانہ، شاعر مگر عارض وگیسو کے قصوں سے نفور، صوفی، مگر مجاہدانہ حرارتوں سے معمور، علوم جدیدہ کا شہسوار مگر ایمان ویقین سے سرشار، خود یورپ کے الحاد خانہ میں دل حجاز کے خداخانہ میں، اسی مجموعہ کو اقبال کہا جاتا ہے :

خیرہ نہ کرسکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

اقبالؒ کی شاعری اوران کی فکر کے متعدد پہلوؤں پر مضمون نگاراس خوش اُسلوبی سے روشنی ڈالتا ہے کہ ہم اس کے شیدائی ہوجاتے ہیں، پھرایک اور مضمون 'اقبال اور کردار سازی کی دعوت' میں مولانا رحمانی نے علامہ کے ان اشعار کا حوالہ دیا ہے، جوانسان کے کردار کو اسلامی فکر کے سانچے میں ڈھال کراسے عرش کی بلندیوں تک لے جاسکتے ہیں، وہ علامہ کے ان اشعار کا بہ کثرت حوالہ دیتے ہیں، جوتہذیب فرنگ کی آلائشوں سے آگاہ کرنے والے ہیں :

بیکاری و میخواری و عریانی و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہے محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

حیرت ہوتی ہے کہ علامہ کے اُردو و فارسی کلام پراتنی گہری نظراس عالم دین کی ہے، جو کسی یونیورسٹی کے اقبال چیئر کے فکراقبال میں غوطہ زن محقق کو بھی نہ ہوگی، وہ مغرب کی قوت کا راز اقبال کی زبان میں اشعار کے حوالے سے فاش کرتے ہیں :

قوت مغرب نہ از چنگ و رباب
نے ز رقص دختران بے حجاب
محکمی اورانہ از لا دینی است
از ہمیں آتش چراغش روشن است

جب وہ مفکراسلام مولانا محمد سجاد پرقلم اُٹھاتے ہیں تو مجھے اس میں اپنے دل کی دھڑکنیں سنائی پڑتی ہیں جس کا اظہار میں نے اس عظیم شخصیت پرایک سیمینار کے لئے لکھے گئے مضمون میں کیا تھا، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی بجا طور پر بیسویں صدی کے نصف اول کے ان دو دمانِ ملت پر ناز فرما ہیں، جنھوں نے ہندوستانی مسلمان کے مقدر کو تابناک بنانے کی خاطر اپنے پورے وجود کو اس طرح پگھلا دیا، جیسے طاق حرم میں جل رہی کوئی شمع اپنے وجود کو فنا کرکے ماحول کو روشنی عطا کررہی ہے، علامہ سید سلیمان ندوی پر خالد صاحب کا قلم بڑے والہانہ انداز سے

اُٹھتا ہے، لکھتے ہیں :

> قدرت ایمان ویقین کی پختگی، علوم اسلامیں مجتہدانہ بصیرت، ادب وتنقید میں دست گاہی، شعر وسخن کی شناوری، تاریخ وکلام اور فلسفہ قدیم وجدید میں غواصی لسانیات کا مذاق، فطری ذہانت وطباعی، تلاش وتحقیق کے سفر میں آبلہ پائی کے جذبۂ بے نہایت اوران سب کے ساتھ ریشم سے زیادہ نرم خوئی اور برف سے زیادہ خنک طبعی کے خمیر سے ایک تخت طاؤس تعمیر کیا اوراس میں حقائق کو جاننے کی سعی کی۔

اس مضمون میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کی انشاء پردازی اپنے نقطۂ عروج پر ہے، گویا علامہ سید سلیمان ندوی کی روح ان کے اندر اُتر آئی ہو، پھر یہی کیفیت مولانا آزاد اور مولانا عبدالماجد دریابادی پران کے رشحاتِ قلم میں نظر آتی ہے۔

ایک دوحوالوں سے بات بنتی نہیں، یہ پورا ضخیم مجموعہ مضامین ایسے ادبی جواہر پاروں سے لبریز ہے، مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کا یہ مجموعہ انھیں اُردو کے ایک اچھے نثر نگار کی حیثیت سے متعارف کراتا ہے، شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، ابوالحسن علی ندوی اور ابوالاعلیٰ مودودی کی طرح ان کی تحریروں میں روانی، سلاست، گہرائی اور فکر انگیزی جلوہ گر ہے، وہ اس عہد کے ایک صاحب نظر اور صاحب فکر قلمکار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، اس مجموعہ مضامین کے مطالعہ سے قاری اس عہد کی علمی وادبی تاریخ کی سیر کرسکتا ہے اور گذشتہ صدی میں برصغیر میں مسلمان مفکرین واہل قلم نے جو کارنامے انجام دیئے ہیں، اس کی ایک دلکش تاریخ سامنے آتی ہے، کتاب اس لائق ہے کہ ہماری تمام دانش گاہوں کی لائبریریوں کی زینت بنے؛ تاکہ آنے والی نسل اپنے متقدمین کے کارناموں سے اچھی طرح آگاہ ہوسکے۔

۹؍شعبان ۱۴۳۳ھ	**سید عبدالباری**
۲۹؍جون ۲۰۱۲ء	(ایڈیٹر: ’’ملی اتحاد‘‘ دہلی)

❁ ❁ ❁

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اپنے گذرے ہوئے لوگوں کی خوبیوں کا تذکرہ کیا کرو: ''**اذکروا محاسن موتاکم**'' (سنن ترمذی، کتاب الجنائز، حدیث نمبر: ۱۰۱۹) کیوں کہ جب گذرے ہوئے لوگوں کی خوبیاں سامنے آتی ہیں تو بعد کے لوگوں میں ان کی اقتداء و پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور وہ ان کی سیرت کے چراغ سے روشنی حاصل کرتے ہوئے ترقی کا سفر طے کرتے ہیں، اسی جذبہ کے تحت گذرے ہوئے لوگوں کے حالات پر قلم اُٹھانے کی روایت رہی ہے، علماء اسلام نے خاص طور سے اس پہلو پر توجہ دی ہے؛ چنانچہ رجال اور طبقات کی بیسیوں کتابیں آج اہل علم کے سامنے موجود ہیں، اُردو زبان میں بھی ایسے مضامین لکھے جاتے رہے ہیں، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی 'یادِ رفتگاں' سید صباح الدین عبد الرحمٰنؒ کی 'کاروانِ رفتگاں' اور پروفیسر رشید احمد صدیقیؒ کی 'گنج ہائے گراں مایہ' اور 'ہم نفسانِ رفتہ' مولانا عبد الماجد دریا آبادی کی 'معاصرین' اور مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی 'پرانے چراغ' اس سلسلہ کی ممتاز اور دلچسپ تالیفات ہیں، جن کو برصغیر میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی ہے، ماضی قریب میں اس سلسلہ کی کئی اہم تالیفات منظر عام پر آئی ہیں، جن میں مولانا نور عالم خلیل امینی کی 'پسِ مرگ زندہ' پروفیسر محسن عثمانی کی 'ستاروں کے درمیاں' اور مولانا ندیم الواجدی کی 'خدا رحمت کند' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس حقیر کو بھی سلف کے تذکروں کو پڑھنے سے بڑی رغبت رہی ہے اور اس نے شخصیت پر لکھی جانے والی تحریروں ہی سے اپنی تالیفی زندگی کا آغاز کیا ہے، خاص کر جب چودہویں صدی ہجری ختم ہو رہی تھی اور پندرہویں صدی کا چاند اُفق پر طلوع ہونے والا تھا تو اس وقت

ارادہ ہوا کہ چند ایسی شخصیتوں کا انتخاب کیا جائے، جنھوں نے گذشتہ صدی میں برصغیر کے مسلمانوں پر کسی بھی جہت سے گہرے اثرات ڈالے ہوں، یا انھوں نے کسی تحریک کی بنیاد رکھی ہو، یا کسی خاص شعبہ میں نیا منہج اور انقلابی فکر عطا کی ہو، خواہ ان کی فکر سے اتفاق ہو یا نہ ہو؛ چنانچہ اس سلسلہ میں میں نے تیرہ شخصیتوں کا انتخاب کیا تھا، اس مجموعہ میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، سر سید احمد خاں، مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا ابوالکلام آزاد اور علامہ اقبال پر جو مضامین شامل اشاعت ہیں، وہ اسی منصوبہ کے تحت لکھے گئے تھے، اس فہرست میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا محمد الیاس کاندھلوی، مولانا سید حسین احمد مدنی، جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، جماعت اہل حدیث کے سرخیل شاہ نذیر حسین محدث دہلوی اور بریلوی مکتبِ فکر کے مؤسس مولانا احمد رضا خاں بریلوی — رحمہم اللہ — کے نام بھی شامل تھے؛ لیکن ان شخصیات پر قلم اُٹھانے کی نوبت نہیں آسکی، **و لعل اللہ یحدث بعد ذلک امرا** ۔

ان کے علاوہ جن شخصیتوں پر مضامین شامل اشاعت ہیں، وہ ان کی وفات یا کسی سیمینار کی مناسبت سے لکھے گئے ہیں یا کسی کتاب کے ''پیش لفظ'' کے طور پر ان کو لکھا گیا تھا، اس لئے اگر بعض اہم شخصیات کا ذکر اس مجموعہ میں نہ ملے، تو اسے تعصب اور تنگ نظری خیال نہ کیا جائے؛ کیوں کہ یہ کسی منصوبہ کے ساتھ لکھے گئے مضامین نہیں ہیں؛ بلکہ وقتی محرک کی بنا پر لکھے گئے ہیں اور جہاں ملک کے مشاہیر کی حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے، وہیں ایسی شخصیتیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں، جن کو شہرت و ناموری تو اس درجہ حاصل نہیں ہوئی؛ لیکن اپنی صلاحیت اور صالحیت کے لحاظ سے وہ اس کے مستحق تھے، یا وہ بزرگ اور دوست جو میرے محسنوں میں تھے، نیز ان کے علاوہ والد ماجد، والدۂ ماجدہ اور میرے خسر (جو میرے والد کے خالہ زاد بھائی بھی تھے) پر بھی تحریریں شامل ہیں۔

مضامین کا یہ مجموعہ اس لحاظ سے میرے لئے اہم ہے کہ ان میں متعدد تحریریں ۲۰ سال کی عمر سے لے کر ۲۴ سال تک کے دوران لکھی گئی ہیں اور اب اشاعت کے وقت ان میں کہیں

کہیں معمولی ترمیم کی گئی ہے یا بعض اضافے کئے گئے ہیں، مولانا رشید احمد گنگوہی، سرسید احمد خاں، علامہ اقبال، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد، مولانا سید محمد علی مونگیری، مولانا ابوالکلام آزاد، حاجی محمد شفیع پھلواروی اور والد ماجد — رحمہم اللہ — پر مضامین اسی دور کے ہیں، مولانا ابوالکلام آزاد والے مضمون کی ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ میری تقریب نکاح کے موقع — جب مہمانوں کی ہماہمی تھی — ایک گوشہ میں بیٹھ کر میں اسے لکھنے میں مشغول تھا، اس وقت میری عمر کا ٢٣واں سال تھا، گویا جب میں نے لوح وقلم کی دنیا میں قدم رکھا، اس وقت کی یادگار تحریریں بھی اس میں شامل ہیں۔

مضامین کے اس مجموعہ کو راقم نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے باب میں ان شخصیتوں کا ذکر ہے، جن کی خدمات ناقابل فراموش ہیں، ان کا زمانہ اس حقیر سے پہلے کا ہے، یا ان کی عمر کا آفتاب اس وقت لب بام تھا، جب میں بچپن سے گذر رہا تھا، مگر انھیں دیکھنے کی سعادت سے محروم رہا، غرض یہ نادیدہ و ناشنیدہ ہستیاں ہیں، آنکھیں انھیں دیکھ نہیں سکیں اور کان انھیں سن نہیں سکے — دوسرے باب میں ان بزرگوں کا ذکر ہے، جن سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا اور جنھیں دیکھنے اور سننے کی سعادت حاصل ہوئی۔

تیسرے باب میں ان مشفق اساتذہ اور بزرگ ومحسن دوستوں کا تذکرہ ہے، جن سے قریب رہنے کا موقع ملا اور بے تکلف ربط وتعلق رہا — اور چوتھے باب میں اپنے چند اعزہ کا ذکر خیر ہے، جن کی آغوش محبت میں میری تربیت بھی ہوئی اور نشو ونما بھی، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سبھوں کو جنت کی آغوش عطا فرمائے اور ان کی قبروں کو جنت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری بنادے، اُمید کرتا ہوں کہ مستقبل میں اس کی دوسری جلد بھی آسکے گی اور جن حضرات پر ابھی نہیں لکھا جاسکا ہے؛ حالاں کہ ان کا حق تھا کہ ان کو یاد کیا جائے، ان کے مختصر تذکرے بھی اس میں شامل ہوں گے۔

اس مجموعہ میں جن لوگوں کا تذکرہ ہے، ان میں سے اکثر دل کی غذا اور روح کی دوا

بیچنے والے لوگ تھے، تعلق مع اللہ اور دین داری، نیز اسلامی علوم میں بصیرت اور خدمتِ دین سے وابستگی ان کا امتیاز تھا، اسی مناسبت سے ایک اُردو شاعر کے مصرع سے اس مجموعہ کو موسوم کیا جارہا ہے، یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ گفتگو میں مبالغہ اور عجمی مزاج کے مطابق خطابات والقاب کا طومار نہ ہو؛ بلکہ صاحبِ تذکرہ کا احترام اور ان کی خدمات کا اعتراف عدل واعتدال کے ساتھ ہو، اگر ان پر کوئی نقد ہو تو اس میں بھی انصاف واحترام کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بزم رفتگاں کو اپنے سایۂ رحمت میں جگہ دے اور ہمیں ان کی خوبیوں کو کشید کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

واللہ ھو المستعان۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۲۰؍شعبان ۱۴۳۳ھ

۱۱؍جولائی ۲۰۱۲ء

❁ ❁ ❁

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل……

پہلا باب

بہا رنا دیدہ

متکلم اسلام مولانا محمد قاسم نانوتویؒ ٭

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ جہاں جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں اس کے مطابق چیزیں پیدا فرماتے ہیں، صحرا اور ریگستان میں بارش نہیں ہوتی یا کم ہوتی ہے؛ کیوں کہ ریگستان کے وجود کے لئے بارش ضروری نہیں ہے؛ لیکن جنگلات میں بارش ہوتی ہے؛ کیوں کہ درخت اور پودے پانی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، جن علاقوں میں ٹھنڈک شدت کے ساتھ پڑتی ہے، وہیں زعفران کی پیداوار ہوتی ہے اور ایسے جانور پائے جاتے ہیں، جن پر بال کی بڑی مقدار ہو؛ تاکہ ٹھنڈک کا مداوا ہو سکے اور جہاں سخت گرمی کا موسم ہوتا ہے، وہاں ایسے پھل زیادہ پیدا ہوتے ہیں، جو مزاج کے اعتبار سے ٹھنڈے ہوں، اللہ تعالیٰ کی یہی سنت غالباً افراد اور شخصیات کی پیدائش کے سلسلہ میں بھی ہے، جس دور میں اور جہاں جس صلاحیت کی شخصیت مطلوب ہوتی ہے، اسی کے مطابق من جانب اللہ افراد پیدا کئے جاتے ہیں۔

انیسویں اور بیسویں صدی کا عہد تاتاریوں کے فتنہ کے بعد اسلام اور مسلمانوں کے لئے سب سے سخت دور تھا، جب مغرب کی استعمار پسندی کی وجہ سے عالم اسلام کے بہت سے حصوں پر وہ قابض ہوتے جارہے تھے، دنیا میں ایک فاتح قوم کی حیثیت سے مغرب سے مشرق تک یورپ کا جھنڈا لہرا رہا تھا، صلیبی جنگوں میں شکست کے زخم کی کسک مدت گذر جانے کے باوجود ان کو بے چین کئے ہوئے تھی، اسی لئے ملک گیری اور کشور کشائی کے ساتھ ساتھ وہ

٭ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے تحت ''جائزۃ الامام محمد قاسم النانوتوی'' کے پہلے اجلاس منعقدہ: استنبول، ۱۶/ ذوقعدہ ۱۴۳۱ھ کے موقع پر لکھا گیا مقالہ، جو عربی میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

اسلام پر فکری یلغار بھی کر رہے تھے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ، قرآن مجید، اسلامی شریعت، تاریخِ اسلام غرض ہر پہلو سے اسلام کو نشانہ بنایا جا رہا تھا، مسلمانوں کی بہت بڑی آبادی برصغیر میں واقع تھی، جو غالباً پورے عالم اسلام کا تقریباً ۴۰ فیصد تھی اور جہاں مغلوں کی ایک طاقتور حکومت قائم تھی، اس خطے کو اپنی ذہانت وذکاوت اور دینی حمیت کے اعتبار سے بھی خصوصی حیثیت حاصل تھی، اور ایک حد تک یہ علاقہ عالم اسلام کے وسط میں تھا۔

ان حالات میں ایک ایسی شخصیت کی ضرورت تھی، جو اپنی ذہانت کے ذریعہ اسلام کے خلاف اٹھائے جانے والے اعتراضات کا عقل کی ترازو میں تول کر اور فطرتِ انسانی کی روشنی میں تجزیہ کر کے جواب دے، جو ذہین وطباع ہونے کے ساتھ ساتھ فکرِ ارجمند اور دلِ دردمند بھی رکھتا ہو اور قوم کی بے راہ روی اسے تڑپاتی اور بے قرار کرتی ہو؛ کیوں کہ یہی بے قراری، انسان کو ابتلاء وآزمائش کے خارزار میں آبلہ پائی پر آمادہ کرتی ہے، یہ بھی ضروری تھا کہ وہ شخص جوش اور ہوش کا آمیزہ ہو، دینی حمیت کے نشہ سے سرشار بھی ہو اور حکمت اور زمانہ شناسی کی صلاحیت سے بہرہ ور بھی، وہ کتاب وسنت کا غواص بھی ہو اور عصری تقاضوں سے باخبر اور زمانہ آگاہ بھی۔

چنانچہ تاریخ کے ایسے نازک موڑ پر ان عبقری صلاحیتوں کی حامل شخصیت حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی کی شکل میں پیدا ہوئی، جنھوں نے مختصر زندگی پائی؛ لیکن پوری عمرِ عزیز کو اسلام کے دفاع اور فکری جہاد میں صرف کیا اور ایک ایسی تحریک ''تحریک مدارس'' کی بنیاد رکھی، جس کو گذشتہ دو صدیوں میں پیدا ہونے والی تحریکات میں سب سے وسیع الاثر، نتیجہ خیز اور طاقتور تحریک کہا جا سکتا ہے۔

ہندوستان میں ملک کی راجدھانی دہلی — جو کچھ وقفہ کے ساتھ مغل بادشاہ ''شاہجہاں'' کے زمانہ سے لے کر آج تک اس وسیع وعریض ملک کا صدر مقام ہے — سے قریب ایک شہر ''سہارنپور'' ہے، جو ایک بزرگ کی نسبت سے ''شاہ ہارون پور'' کہلاتا تھا؛ لیکن بتدریج سہارنپور کہلانے لگا، سہارنپور میں ایک قدیم قصبہ نانوتہ ہے، جو علمی اور دینی اعتبار سے ایک

ممتاز بستی ہے، وہاں ایک صدیقی خاندان قدیم زمانہ سے موجود تھا، جس کے مورث اعلیٰ کا نام محمد ہاشم ہے —— جو بلخ سے یہاں وارد ہوا تھا —— ان کی ساتویں پشت میں ایک بزرگ شیخ اسد علی صدیقی پیدا ہوئے، جن کا سلسلہ نسب ۴۳ واسطوں سے قاسم بن محمد بن ابی بکر رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے، مشہور مغلیہ بادشاہ ''شاہ جہاں'' کے زمانہ میں قصبہ نانوتہ کی جاگیر اسی خاندان کو حاصل تھی، انھیں کے صاحبزادے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی ہیں، جو شعبان یا رمضان ۱۲۴۸ھ مطابق جنوری ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے، مولانا نانوتوی کی والدہ سہارنپور کے مشہور وکیل شیخ وجیہ الدین کی صاحبزادی تھیں، جو انگریزوں کے زمانہ میں وکالت کیا کرتے تھے، جب کہ اس زمانہ میں کسی ہندوستانی خاص کر کسی مسلمان کا یہ مقام حاصل کر لینا ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا، مولانا نانوتوی بچپن ہی سے بے حد ذہین اور تعلیم میں ممتاز تھے، آپ نے متعدد اساتذہ سے تعلیم حاصل کی؛ لیکن زیادہ تر تعلیم اس زمانے کے مشہور عالم استاذ الاساتذہ مولانا مملوک علی نانوتویؒ سے حاصل کی، جو دہلی عربک کالج کے استاذ تھے، یہاں تک کہ ۱۲۵۵ھ میں تعلیم سے فراغت حاصل کی، آپ کے اساتذہ میں معروف عالم اور ادیب صدر الصدور مفتی صدر الدین تلمیذ شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ بھی تھے، کالج کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ نے حدیث ہندوستان کے مشہور محدث شاہ عبد الغنی مجددی دہلویؒ —— جو شیخ احمد سرہندی کے خاندان سے تھے —— سے حاصل کی اور ابوداؤد کے علاوہ صحاح ستہ انہیں سے پڑھی، جبکہ سنن أبی داؤد شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے ایک شاگرد مولانا احمد علی محدث سہارنپوریؒ سے پڑھی۔

آپ کے رفقاء درس میں مشہور عالم و محدث حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی مصنف لامع الدراری شرح صحیح بخاری اور الکوکب الدری شرح سنن ترمذی بھی ہیں اور کہا جاتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے بانی سرسید احمد خاں بھی آپ کے رفقاء درس میں تھے، گو بعض اہل علم کی تحقیق کے مطابق یہ درست نہیں، سلسلۂ احسان و تزکیہ میں آپ ہندوستان کے مشہور صاحب نسبت بزرگ حاجی امداد اللہ تھانوی مہاجر مکیؒ سے بیعت اور پھر ان کے مجاز ہوئے، جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خاندان سے تھے اور ہندوستان میں ان کا فیض شمال سے جنوب اور مشرق سے

مغرب تک پھیلا ہوا تھا۔

اس زمانہ میں سفر کی سہولتیں اور خاص کر ہوائی سفر کی آج کی طرح حاصل نہیں تھیں، اس کے باوجود تین بار (۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء، ۱۲۸۶ھ مطابق ۱۸۷۰ء، ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء) حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے، آخری سفر حج میں بیمار ہوئے اور واپسی کے بعد بھی آرام کرنے کی بجائے فتنۂ ارتداد کا مقابلہ کرنے کے لئے سرگرم عمل رہے، اس طرح بیماری بڑھتی گئی اور ۴؍ جمادی الاولیٰ ۱۲۹۷ھ مطابق ۱۵؍اپریل ۱۸۸۰ء کو بعد نماز ظہر وفات ہوئی۔

مولانا نانوتوی کی علمی خدمات کو تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: تدریس، دینی کتابوں کی تصحیح وتعلیق اور تصنیف۔

آپ اپنے استاذ کے حکم پر زمانہ طالب علمی میں بھی بعض مضامین کا درس دیا کرتے تھے، تعلیم مکمل ہونے کے بعد آپ ذریعہ معاش کے طور پر تصحیح کتب کا کام کیا کرتے تھے؛ لیکن اپنے طور پر کتب حدیث کا درس بھی دیتے تھے، خاص کر آپ کے بخاری ومسلم کے اسباق میں بڑے بڑے علماء نے شرکت کی ہے، اس کے علاوہ دوسرے علوم وفنون کی تعلیم بھی آپ نے دی ہے، مولانا محمود حسن دیوبندیؒ — جو علماء ہند کے استاذ الاساتذہ ہیں اور ''شیخ الہند'' سے ملقب ہیں — آپ کے شاگرد ہیں، اس کے علاوہ مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ، مولانا احمد حسن محدث امروہویؒ، مولانا عبد الرحمٰن امروہویؒ، مولانا حکیم منصور علی خانؒ، مولانا عبد العلی میرٹھیؒ جیسے مشاہیر اہل علم — جو اپنی محققانہ تالیفات کی وجہ سے علماء ہند میں امتیازی مقام کے حامل ہیں — آپ کے تلامذہ میں ہیں، اور آپ کے خرمن علم کے خوشہ چینوں اور دامن تربیت کے فیض یافتگان میں ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں حدیث کی متون نایاب تھیں، جو علماء حجاز جاتے تھے، وہ وہاں سے کتابوں کی نقل لے کر آیا کرتے تھے، یہی نقلیں ہاتھوں سے تیار کی جاتی تھیں، اس

کی وجہ سے ہندوستان میں علم حدیث کی اس طرح اشاعت نہیں ہو پارہی تھی، جو اس کا حق تھا؛ چنانچہ کچھ اصحاب علم نے کتب حدیث کی اشاعت کے لئے مکتبے قائم کئے، مولانا احمد علی سہارنپوری —— جو خود بڑے محدث تھے اور مکہ مکرمہ جا کر شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی مہاجر مکی سے سبقاً سبقاً صحاح پڑھی تھی —— نے ''مکتبہ احمدی'' قائم کیا اور بخاری شائع کی، بخاری کے پچیس اجزاء کی تصحیح اور تحشیہ کا کام خود انھوں نے کیا، بقیہ پانچ اجزاء کی تصحیح اور تحشیہ کا کام مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حوالہ کیا، یہ نسخہ ہندوستان میں پہلی بار ۱۲۶۷ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں شائع ہوا، نیز مطبع مجتبائی میں آپ نے شاہ عبد القادر دہلویؒ کے ترجمہ قرآن مجید کی تصحیح کی، یہ نسخہ ۱۲۸۶ھ میں شائع ہوا، اسی طرح اور بھی مختلف مطابع میں آپ نے تصحیح کتب کی خدمت انجام دی، جو اس زمانہ میں علم کی نشر واشاعت کا بہت اہم ذریعہ تھا —— واضح ہو کہ تصحیح میں مخطوطہ کی تبییض، اس کی اصلاح اور حسبِ ضرورت حواشی کے کام شامل تھے۔

مولانا کی علمی خدمت کی تیسری جہت تصنیف و تالیف کی تھی، آپ کی مجاہدانہ زندگی اور داعیانہ سرگرمیوں کی وجہ سے اس طرف زیادہ توجہ کا موقع نہیں ملا، پھر بھی آپ نے جو کچھ خدمت کی ہے، وہ آبِ زر سے لکھے جانے کی لائق ہے، آپ کی زیادہ تر تصنیفات اسلام کے دفاع اور عیسائیوں اور ہندوؤں کی طرف سے اسلام پر کئے جانے والے اعتراضات کی رد میں ہیں، جن کا مختصر تعارف اس طرح ہے :

حجۃ الاسلام

اس میں انسان کی تخلیق کا مقصد، توحید و رسالت کا اثبات، عقیدۂ تثلیث کا رد، دنیا کا فانی ہونا، استقبال قبلہ، نماز میں رکوع اور سجدہ کی مصلحت، زکاۃ، روزہ اور حج کی مصلحت، عصمت انبیاء، معجزات کی حقیقت، قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت، ختم نبوت، نسخ کی حقیقت، محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام انبیاء پر فضیلت، گوشت خوری کا فطرت انسانی کے مطابق ہونا اور اس طرح کے بعض اور مسائل پر بڑی حکیمانہ اور مدلل بحث ہے، جو دراصل شاہ جہاں پور میں ''میلۂ

خدا شناسی'' کے نام سے منعقد ہونے والے جلسہ کے لئے لکھا گیا تھا، جس میں ہر مذہب کے عالم کو اپنے اپنے مذہب کی حقانیت پر خطاب کرنا تھا، آپ کی اس تاریخی تقریر نے عیسائی اور ہندو نمائندوں کی بولتی بند کر دی تھی۔

انتصارالاسلام

ہندوؤں کے ایک فرقہ ''آریہ سماج'' کے بانی پنڈت دیانند سرسوتی نے اسلام کے خلاف ایک کتاب لکھی اور اس میں گیارہ اعتراضات کئے، جس کی گونج پورے ملک میں تھی، اس کتاب میں اسی کا جواب دیا گیا ہے، جس میں وجود باری، شیطان، جن اور فرشتوں کا وجود، جنت و دوزخ کا وجود، جنت میں ملنے والی شراب سے مراد، احکام خداوندی میں نسخ کی حقیقت اور اس کی مصلحت، مردہ کو جلانے کے بجائے تدفین کا بہتر ہونا، روح کا وجود، عالم برزخ کا وجود، جانوروں میں حلت وحرمت کی مصلحت، توبہ کی وجہ سے گناہ معاف کئے جانے کا خلافِ انصاف نہ ہونا وغیرہ، اُمور پر بڑی ہی بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے اور عقل اور انسانی فطرت کی روشنی میں ان کو واضح کیا گیا ہے۔

تحفہ لحمیہ

ہندوستان میں ہندو اور جین قومیں گوشت خوری اور ذبح حیوان کو ظلم قرار دیتی ہیں، اس کتاب میں عقلی اور طبی نقطۂ نظر سے اس کا رد کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ گوشت خوری فطرت انسانی کا حصہ ہے۔

براہین قاسمیہ

یہ کتاب ہندو فرقہ آریہ سماج کے اعتراضات کے رد میں ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا وجود، اللہ تعالیٰ کی صفات —— علیم اور واحد وغیرہ —— کا عقلی ثبوت، مادہ کے قدیم ہونے کی تردید، قرآن مجید کا کلام اللہ ہونا، انبیاء کی حیثیت اور رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت جیسے کلامی موضوعات پر منطقی ترتیب واسلوب کے ساتھ عقلی بحث کی گئی ہے، اس کتاب کا اصل نام ''جواب ترکی بہ

ترکی'' ہے، مولانا اشتیاق احمد صاحبؒ نے ''براہین قاسمیہ'' کے نام سے اس کی تسہیل کی ہے۔

قبلہ نما

پنڈت دیانند سرسوتی کا ایک اعتراض یہ تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو تو بت پرست کہتے ہیں اور خود ہی پتھر کے ایک مکان یعنی کعبہ کو سجدہ کرتے ہیں ؛ چنانچہ آپ نے بت پرستی اور استقبال قبلہ کے فرق پر عقل کی روشنی میں مدلل گفتگو کی ہے۔

تقریر دل پذیر

یہ آپ کی بڑی اہم تالیف ہے، جو دعوتی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے، اس میں وجود باری، تثلیث واصنام پرستی کا خلاف عقل ہونا، انجیل کا محرّف ہونا، دنیا کا فانی ہونا، جنت و دوزخ اور ملائکہ وشیاطین کا وجود، اللہ تعالیٰ کا بندوں کے افعال کا خالق ہونا، مسئلہ تقدیر، آسمانی شریعتوں میں نسخ واقع ہونے کی وجہ، اعمال میں حسن و قبح کی حقیقت، نبوت کی ضرورت، صفات الٰہی، قیامت کا ممکن الوقوع ہونا اور اس طرح کے اعتقادی موضوعات پر بڑی چشم کشا اور تفصیلی بحث ہے۔

آب حیات

شیعہ حضرات کا پرانا اعتراض ہے کہ تبوک کی زمین میں حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو میراث نہ دے کر حضرات شیخین رضی اللہ عنہما نے زیادتی کی ہے، یہ کتاب دراصل انہیں کی رد میں ہے، آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ آپ ﷺ قبر میں بھی زندہ ہیں اور زندہ شخص کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوتی؛ اس لئے آپ ﷺ کے مال میں وراثت جاری نہیں ہوسکتی۔

توثیق الکلام

بعض لوگ کہا کرتے تھے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ نہ پڑھنے والوں کی نماز ہی نہیں ہوتی، آپ نے اس پر مدلل رد کیا ہے اور بڑے اعتدال کے ساتھ احناف کی رائے کو اس طرح مدلل کیا ہے کہ نقل و عقل دونوں پہلوؤں سے اس نقطۂ نظر کی ترجیح واضح ہوجائے۔

مکتوبات : آپ کے مکتوبات کے نو مجموعے طبع ہو چکے ہیں، جن کے نام ہیں :

(۱) مکتوباتِ قاسمیہ۔ (۲) فیوض قاسمیہ۔ (۳) لطائف قاسمیہ۔

(۴) جمال قاسمی۔ (۵) الحق الصریح۔ (۶) تحذیر الناس۔

(۷) اسرار قرآنی۔ (۸) فرائد قاسمیہ۔ (۹) تصفیۃ العقائد۔

یہ آپ کے مختلف شاگردوں اور متوسلین کے مرتب کئے ہوئے ہیں، ان مکتوبات میں شیعوں پر، غالی مبتدعین پر اور عقلیت پرستوں پر رد کیا گیا ہے اور ان حضرات کے مختلف دعاوی پر بحث کی گئی ہے، نیز ایک گروہ کہتا تھا کہ قراءت فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز ہی نہیں ہوتی اور تراویح کی بیس رکعت کا حدیث سے کوئی ثبوت نہیں ہے، بعض مکتوبات اس غلو کی رد میں بھی ہیں۔

غرض کہ آپ کی تصنیفات کا اصل موضوع ''علم کلام'' ہے، آپ نے زیادہ تر اسلام کے خلاف ہونے والی فکری یورشوں کے مقابلہ میں قلم اٹھایا ہے اور اسلام کے عقائد اور احکام شریعت کو عقل و مصلحت کی ترازو میں تول کر سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ہندوستان پر جب انگریزوں کا قبضہ مستحکم ہوگیا، یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء میں دہلی پر بھی برطانوی اقتدار کا جھنڈا لہرانے لگا، تو اب صورت حال یہ ہوئی کہ علانیہ مسلمانوں سے ان کے ایمان کا سودا کرنے کی کوشش شروع ہوگئی؛ بلکہ یہ منصوبہ پہلے سے برطانوی اصحاب اقتدار کے دماغ میں موجود تھا، انگریزوں سے قریبی تعلق رکھنے والے مشہور مفکر سر سید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۵۵ء میں پادری اے ایڈمنڈ کے کلکتہ سے جاری ہونے والے خط کا ذکر کیا ہے، جو تمام سرکاری ملازمین کو بھیجا گیا تھا کہ :

> اب تمام ہندوستان میں ایک عملداری ہوگئی، تار برقی سے سب جگہ کی خبر ایک ہوگئی، مذہب بھی ایک چاہئے؛ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔

سپریم کونسل انڈیا کے اہم رکن سر چارلس نے کہا تھا :

میں یہ اُمیدیں قائم کئے ہوئے تھا کہ جس طرح ہمارے لوگ کل کے کل ایک ساتھ عیسائی ہوگئے تھے، اسی طرح یہاں (ہندوستان میں) بھی سب ایک ساتھ عیسائی ہوجائیں گے۔ (مسلمانوں کا روشن مستقبل:۱۴۳)

برطانیہ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر مسٹر مینگلس نے ۱۸۵۷ء میں دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

ہر شخص کو اپنی تمام تر قوت ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی تکمیل میں صرف کرنی چاہئے۔ (حکومت خود اختیاری:ص:۱۳۶)

ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں ان کے نزدیک سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان ہی تھے اور مسلمانوں کو عیسائیت کی طرف لانے میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کے خیال میں قرآن مجید کا وجود تھا؛ چنانچہ ہنری طامس کا بیان ہے :

مسلمان کسی ایسی گورنمنٹ کے جس کا مذہب دوسرا ہو، اچھی رعایا نہیں ہوسکتے؛ اس لئے قرآنی احکام کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں۔ (حکومت خود اختیاری، ص:۵۵)

یہ بات ہنری طامس ہی کی نہیں ہے؛ بلکہ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گیڈ اسٹون نے قرآن مجید کو ہاتھ لگا کر عام مجمع میں کہا تھا :

جب تک یہ کتاب دنیا میں باقی ہے، دنیا متمدن اور مہذب نہیں ہوسکتی۔ (خطبہ صدارت:۱۵، سالانہ اجلاس آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ)

غرض کہ انگریز چاہتے تھے کہ ہندوستان کے رہنے والے بحیثیت قوم انگریز بن جائیں، وہ اس ملک میں اسپین کی تاریخ دہرانا چاہتے تھے، اس کے لئے ایک طرف حکومت ملازمت کی لالچ اور مالی تحریص سے کام لیتی تھی اور دوسری طرف بڑی تعداد میں عیسائی پادری اور مبلغین شہر شہر، قریہ قریہ، پہنچائے گئے، جو گلی کوچوں میں پہونچ کر دعوت ارتداد دیتے تھے، اس کے نتیجہ

میں نہ صرف عوام؛ بلکہ کئی ضعیف العقیدہ اور لالچی پڑھے لکھے مسلمانوں نے بھی نہ صرف اس دعوت ارتداد کے سامنے سر جھکا دیا؛ بلکہ وہ باضابطہ عیسائی پادری اور مبلغ بن گئے۔

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس فتنہ ارتداد کے مقابلہ میں ایک مضبوط چٹان بن کر کھڑے ہوگئے، انھوں نے اپنی تصنیفات میں عقیدۂ تثلیث، عقیدۂ کفارہ، حضرت مسیح کے فرزند خدا ہونے کا دعوی اور اس سلسلہ میں بائبل کے بیانات، بائبل میں تحریفات کے ثبوت اور محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور آپ ﷺ کی فضیلت پر خود بائبل، نیز عقل اور فطرت انسانی سے استدلال کرتے ہوئے بڑی ہی چشم کشا گفتگو کی ہے اور ایسے ایسے نکتے پیدا کئے ہیں، جو شاید کہیں اور نہ مل سکیں۔

مولانا نے عوامی سطح پر اس فتنہ کا مقابلہ کرنے کے لئے جگہ جگہ عیسائی پادریوں کا تعاقب کیا، ان کے سوالات کے جواب دیئے اور ان کو ایسا لاجواب کیا کہ انہیں یا تو اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑا یا مناظرہ کا میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا، ۱۸۷۶ء میں ایک برطانوی پادری نولس نے موضع چاندا پور ضلع شاہ جہاں پور میں وہاں کے رئیس منشی پیارے لال کبیر پنتھی کو ایک ایسے عظیم عوامی جلسہ کے انعقاد پر تیار کیا، جس میں ہندوؤں، عیسائیوں اور مسلمانوں کو اپنے مذہب کی صداقت ثابت کرنے کا موقع فراہم کیا جائے، اس جلسہ کو ''میلہ خدا شناسی'' کا نام دیا گیا، ۷؍مئی ۱۸۷۶ء کو پہلا میلہ منعقد ہوا، جس میں مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، ان کے تلامذہ اور مولانا ابوالمنصور دہلوی بحیثیت نمائندہ شریک ہوئے، عیسائیوں کی طرف سے پادری نولس، پادری اسکارٹ، پادری باکر اور پادری محی الدین نے شرکت کی، جبکہ ہندوؤں کی طرف سے پنڈت دیانند سرسوتی، منشی پیارے لال اور پنڈت اندرمن وغیرہ شریک ہوئے، اس موقع پر مختلف مذاہب کے عوام بہت بڑی تعداد میں جمع ہوگئے تھے، میلہ میں عیسائی نمائندہ کو بائبل میں تحریف کا اعتراف کرنا پڑا اور تین روز کے اس مباحثہ میں عیسائی اور ہندو نمائندے بار بار عوام کے سامنے لاجواب ہوگئے، یہاں تک کہ ان کو وقت سے پہلے میدان مباحثہ سے راہ فرار اختیار کرنی پڑی، پادری محی الدین پیشاوری —— جسے بڑا چرب زبان عیسائی مناظر سمجھا

جاتا تھا— عیسائیت سے تائب ہوگیا اور دوبارہ دامن اسلام میں داخل ہوا۔

دوسرے سال ۱۹-۲۰/ مارچ ۱۸۷۷ء کو پھر یہی میلہ منعقد ہوا اور مولانا نانوتویؒ کے خطاب اور بحث نے کھلے طور پر اسلام کی فتح کا اعتراف کرنے پر دوست اور دشمن سب کو مجبور کردیا، ان مذہبی میلوں کا پورے ہندوستان میں شور تھا اور دوسرے مذاہب پر اسلام کی فتح اتنی واضح تھی کہ معاندین کے لئے بھی اس سے انکار ممکن نہیں تھا، اس صورت حال نے پورے ملک میں مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا کی ، انھیں اپنے دین پر استقامت حاصل ہوئی اور عیسائی مبلغین، مسلمان علماء اور مناظرین کے نام سے کانپنے لگے۔

مسلمانوں کو اس وقت جو دوسرا فتنہ درپیش تھا، وہ تھا ہندوؤں اور خاص کر ہندوؤں کے فرقہ آریہ سماجیوں کی طرف سے، جس کے قائد تھے سوامی دیانند جی سرسوتی، دیانند جی کی ایک کتاب ستیہ پرکاش ۱۸۷۵ء میں بنارس سے شائع ہوئی، جس میں ایک مستقل باب قرآن مجید اور اسلام پر اعتراض کا ہے، اس میں سورہ فاتحہ سے لے کر سورہ ناس تک تقریباً ہر سورت میں کچھ اعتراضات کئے گئے ہیں، ان کی تقریریں پورے ہندوستان میں آگ لگا رہی تھیں، اسی طرح مرادآباد کے ایک ہندو فاضل پنڈت اندرمن تھے، وہ اردو اور فارسی زبان سے اچھی طرح واقف تھے، انہوں نے بھی اسلام پر بڑی جارحانہ کتابیں لکھیں، آریہ سماجیوں کی طرف سے ایک مستقل میگزین 'آریہ سماچار' شائع ہوا کرتا تھا، یہ بھی مسلمانوں کو دعوت ارتداد دیتا تھا اور اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں اہانت آمیز لب ولہجہ اختیار کرتا تھا، ان حالات میں ۶/ مئی ۱۸۷۶ء کو ''میلہ خدا شناسی'' منعقد ہوا، جس میں عیسائیوں کے علاوہ ہندوؤں کے دو بڑے فرقے آریہ سماجی اور سناتنی بھی تھے اور اسلام کے خلاف ہونے والی جارحانہ یلغار کی وجہ سے دور دور تک اس مناظرہ کا شہرہ ہوگیا تھا، اس مناظرہ میں درج ذیل موضوعات زیر بحث تھے :

(۱) دنیا کو خالق نے کس چیز سے بنایا اور کس وقت اور کس واسطے؟

(۲) خالق کی ذات محیط کل ہے یا نہیں؟

(۳) خالق عادل ہے اور رحیم بھی ہے، دونوں کس طرح؟

(۴) وید، بائبل اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کیا دلیل ہے؟

(۵) نجات کیا چیز ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوسکتی ہے؟

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے نہ صرف ان سوالات کے مسکت عقلی جواب دیئے اور ہندو اور عیسائی مذہب کے مقابلہ اسلام کی برتری کو ثابت کیا؛ بلکہ بہت سے دوسرے سوالات جو ہندوؤں کی طرف سے اٹھائے جاتے تھے، ان کے بھی جوابات دیئے، اس مناظرہ کی جہاں جہاں خبر پہنچی، اس نے مسلمانوں کا حوصلہ بڑھایا۔

ہندوستان کے مغربی علاقے کے ایک شہر کا نام ''رڑکی'' ہے، جولائی ۱۸۷۸ء میں پنڈت دیانند سرسوتی نے یہاں آکر تقریر کرنا اور زہر پھیلانا شروع کردیا، مولانا وہاں تشریف لے گئے اور کئی دنوں تک خواہش کرتے رہے کہ پنڈت جی مناظرہ کریں؛ لیکن مختلف بہانے کرتے ہوئے انہوں نے انکار کردیا؛ بالآخر مسلمانوں اور ہندوؤں کا عام جلسہ منعقد کرکے تین دنوں تک آپ نے اسلام کی حقانیت اور ہندو مذہب کے بطلان پر تقریریں کیں، پنڈت جی کے گیارہ اعتراضات تھے، جن کو وہ جگہ جگہ اپنی تقریروں میں دہرایا کرتے تھے، آپ نے ان کے جوابات لکھے، جن کو آپ کے ایک تلمیذ رشید مولانا فخر الحسن گنگوہیؒ نے ''انتصار الاسلام'' کے نام سے شائع کیا ہے، پنڈت دیانند جی کا حال یہ تھا کہ وہ مولانا کا سامنا کرنے کو تو تیار نہیں تھے؛ لیکن جگہ جگہ جا کر لوگوں کو گمراہ کیا کرتے تھے اور اسلام کے خلاف زہر افشانی کرتے تھے، مولانا اس کا پیچھا کرتے اور جس شہر میں پہنچتے، پنڈت جی وہاں سے رفو چکر ہوجاتے، اس صورتحال نے فتنۂ ارتداد کی لہر کو روکنے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

دفاع عن الدین کے پہلو سے آپ کا تیسرا اہم کام اہل تشیع کا رد ہے، اس موضوع پر آپ کی ایک مبسوط کتاب ''ہدیۃ الشیعہ'' کے نام سے دو جلدوں میں ہے، کتاب میں آپ نے حضرات شیخین کی فضیلت، ازواج مطہرات کا اہل بیت میں ہونا، عقیدہ بداء، امامت، تحریف

قرآن، سبِّ صحابہ، تقیہ، متعہ، واقعۂ قرطاس، ارض فدک، عقد حضرت ام کلثوم وغیرہ پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور مذہب شیعہ پر بیالیس سوالات قائم کئے ہیں، اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیعی مآخذ پر آپ کی گہری نظر تھی، دوسرے اس کتاب کا لب و لہجہ بہت نرم، ناصحانہ اور حکیمانہ ہے اور آپ نے اسے نہایت مشفقانہ اور داعیانہ لب ولہجہ میں لکھا ہے؛ تاکہ اہل تشیع حق وہدایت پر آجائیں؛ چنانچہ بہت سے شیعہ آپ کی اس کتاب کو پڑھ کر اور اس موضوع پر آپ کے خطابات سن کر تائب ہوگئے، ردشیعیت کی اس وقت اس لئے بڑی اہمیت تھی کہ اکثر چھوٹی چھوٹی مسلم حکومتوں میں شیعہ دخیل تھے، بہت سے فیصلے انہیں کے اشاروں پر کئے جاتے تھے، اہل سنت اور اہل تشیع کے درمیان شادی بیاہ کا عام رواج تھا، مسلمانوں کی فکر اور ان کی عملی زندگی پر اس کے منفی اثرات مرتب ہورہے تھے اور چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں میں ان کی ریشہ دوانیوں کی وجہ سے سیاسی اعتبار سے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچ رہا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اسلام کی روشنی رسول اللہ ﷺ کی حیات میں ہی پہنچ چکی تھی، حاکم نے حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے:

أهدي ملک الهند إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم جرة فيها زنجبيل فأطعم أصحابه قطعة قطعة وأطعمني منها قطعة۔ (المستدرک للحاکم، کتاب الأطعمة، حدیث نمبر: ۷۱۹۰)

مشہور سیاح اور جہاز راں ''بزرگ بن شہر یار'' نے نقل کیا ہے کہ ''ہندوستان کے ساحلی علاقہ سرندیب (موجودہ سری لنکا) سے ایک وفد تحقیق حال کے لئے حجاز روانہ ہوا، مگر اس درمیان آپ ﷺ کی اور آپ ﷺ کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوگئی، یہاں تک کہ عہد فاروقی میں یہ وفد پہنچ پایا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو اسلام کے بارے میں شرح وبسط کے ساتھ سمجھایا'' (عجائب الہند: ص: ۱۵۷)؛ لیکن مغربی سمت سے مسلمانوں کی آمد محمد بن قاسم کے زیر کمان آنے والی فوج کے ساتھ سندھ میں ۹۳ھ مطابق ۷۱۱ء میں ہوئی، اس وقت سے لے کر

۱۸۵۷ء تک ملک کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی چھوٹی بڑی ریاستیں باقی رہیں، انگریزوں نے سولہویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے ہندوستان میں قدم رکھ دیا تھا، پھر انھوں نے آہستہ آہستہ ایک ایک ریاست کو اپنے قبضہ میں لینا شروع کیا، آخر ۱۸۵۷ء میں دہلی کے لال قلعہ پر بھی برطانوی جھنڈا نصب ہوگیا، بہادر شاہ ظفر — جو مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ تھے — گرفتار کر لئے گئے اور صرف ایک دن میں چودہ مغل شہزادوں کو پھانسی دے دی گئی؛ اگر چہ انگریزوں کا نشانہ ہندوستان کے ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی؛ لیکن مسلمانوں کو وہ خصوصیت سے نشانہ بناتے تھے؛ چنانچہ ایک مؤرخ کا بیان ہے :

> ایک انگریز کا شیوہ یہ ہوگیا تھا کہ ہر مسلمان کو باغی سمجھتا تھا، ہر ایک سے پوچھتا ہندو ہے یا مسلمان؟ جواب میں مسلمان سنتے ہی گولی مار دیتا۔ (عروج سلطنت انگلشیہ، ص:۲۱۷)

ایک اور مؤرخ کا بیان ہے :

> ستائیس ہزار اہل اسلام نے پھانسی پائی، سات دن برابر قتل عام رہا، اس کا حساب نہیں، اپنے نزدیک گویا نسل تیموری کو باقی نہ رکھا، مٹا دیا، بچوں تک کو مار ڈالا، عورتوں سے جو سلوک کیا، بیان سے باہر ہے، جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔ (قیصر التواریخ: ۲/۴۵۴)

انگریزوں کا ہدف صرف یہی نہیں تھا کہ ہندوستان میں اپنے سیاسی اقتدار کو پختہ کریں؛ بلکہ ان کے سامنے یہ بات بھی تھی کہ مذہبی اعتبار سے ہندوستانی باشندوں کو عیسائیت میں جذب کرلیا جائے، چنانچہ برطانوی پارلیمنٹ کے ایک ممبر نے دار العوام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا :

> خداوند تعالیٰ نے یہ دن دکھایا ہے کہ ہندوستان کی سلطنت انگلستان کے زیر نگرانی ہے؛ تا کہ عیسیٰ مسیح کا جھنڈا ہندوستان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک لہرا جائے، ہر شخص کو اپنی تمام

تر قوت تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے عظیم الشان کام کی
تکمیل میں صرف کرنا چاہئے اور اس میں کسی طرح کا تساہل نہیں
کرنا چاہئے ۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ، ص: ۴۲)

اس مقصد کے لئے ایک طرف عیسائیت کے تبلیغی مشن کو متحرک کیا گیا اور دوسری طرف ایک نئے نظام تعلیم کو رائج کرنے کی کوشش کی گئی ، انگریز ماہر تعلیم میکالے نے اپنی رپورٹ میں لکھا :

ہمیں ایک ایسی جماعت بنانی چاہئے ، جو خون اور رنگ کے اعتبار
سے تو ہندوستانی ہو، مگر مذاق ، رجحان ، رائے ، الفاظ اور سمجھ کے
اعتبار سے انگریز ہو۔

یہی میکالے ۱۲/اکتوبر ۱۸۳۶ء کو اپنی والدہ کے نام خط لکھتے ہوئے رقمطراز ہیں :

اگر میرے تعلیمی منصوبے پر پوری طرح عمل کیا گیا تو مجھے یقین ہے
کہ زیادہ سے زیادہ تیس سال کے بعد یہاں ایک بھی بت پرست
غیر عیسائی نہیں رہے گا۔

یہ وہ حالات تھے جن میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے محسوس کیا کہ اب مسلمانوں کے اقتدار کا سورج تو غروب ہو ہی چکا ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ایمان کے سرمایہ سے بھی محروم ہو جائیں اور اس سرزمین کا رشتہ نبی عربی ﷺ سے کٹ جائے ؛ چنانچہ اس مقصد کے لئے آپ نے اپنے رفقاء کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی ،جس کا مقصد صرف ایک تعلیمی ادارے کا قیام نہیں تھا ؛ بلکہ اسلام کا تحفظ اور بقاء تھا ؛ چوں کہ اس ادارے کو حکومت کی نظر سے بچانا قرین مصلحت تھا ؛ اس لئے دہلی کے بجائے وہاں سے تقریباً دو سو کلو میٹر کے فاصلے پر ''دیوبند'' نامی قصبہ میں اس کی بنیاد رکھی گئی ، حاجی سید محمد عابد صاحب ، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی اور مولانا فضل الرحمٰن عثمانی وغیرہ اس تحریک میں آپ کے ساتھ پیش پیش تھے ، آپ نے ۱۵/محرم ۱۲۸۳ھ مطابق ۳۰/مئی ۱۸۶۶ء روز جمعرات کو ایک مسجد —— جو چھتہ مسجد کہلاتی تھی —— کے

کھلے صحن میں انار کے درخت کے نیچے زیر آسمان بے سروسامانی اور توکل کے سرمایہ کے ساتھ اس درسگاہ کا آغاز کیا، جو ایک استاذ اور ایک شاگرد پر مشتمل تھی اور حسن اتفاق کہ دونوں کا نام ''محمود'' تھا، یہی شاگرد بعد کو ''شیخ الہند'' کہلائے، اور جنگ آزادی کی سپہ سالاری کی، اس مدرسہ کا جو عظیم مقصد تھا، اس کا اندازہ مولانا نانوتوی کے روحانی پیشوا حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے اس فقرہ سے ہوتا ہے، وہ اس وقت مکہ مکرمہ میں مقیم تھے، جب انہیں اس ادارہ کے قیام کی خبر دی گئی تو فرمایا :

> سبحان اللہ! آپ فرماتے ہیں کہ ہم نے مدرسہ قائم کیا ہے، یہ خبر نہیں کہ کتنی پیشانیاں اوقات سحر میں سر بسجود ہو کر گڑگڑاتی رہیں کہ خداوند ہندوستان میں بقائے اسلام اور تحفظ علم کا کوئی ذریعہ پیدا کر، یہ مدرسہ ان ہی سحر گاہی دعاؤں کا ثمرہ ہے۔ (تاریخ دار العلوم دیوبند: ۱/۱۴۹)

غرض کہ دار العلوم دیوبند کے قیام کا مقصد صرف دیوبند میں مدرسہ قائم کرنا نہیں تھا؛ بلکہ یہ ایک عظیم الشان تحریک تھی، جس کا مقصد ملک کے چپہ چپہ میں ایسے اسلامی مراکز کا قیام تھا، جو اسلام کے تحفظ اور ترجمانی کا ہمہ جہت فریضہ انجام دیں اور اس کے لئے افرادی وسائل فراہم کریں؛ چنانچہ آپ نے دیوبند کے بعد مراد آباد میں ایک بڑا مدرسہ قائم کیا، جس کا نام لوگوں نے ''جامعہ قاسمیہ شاہی مسجد'' رکھا، اس کے علاوہ تھانہ بھون، گلاؤٹھی ضلع بلند شہر، کرانہ ضلع مظفر نگر، دان پور ضلع بلند شہر، امبیٹھہ ضلع سہارنپور اور میرٹھ وغیرہ میں مدارس قائم کئے، اسی زمانے میں دیوبند سے قریب ہی سہارنپور میں 'مدرسہ مظاہر علوم' کا قیام عمل میں آیا، اسی عہد میں جنوبی ہند کے شہر ویلور میں ''مدرسہ باقیات الصالحات'' قائم ہوا، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے ایک مجاز فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ شاہ فاروقی نے حیدر آباد میں ''جامعہ نظامیہ''، حاجی صاحب کے ایک اور مجاز مولانا منور علی صاحبؒ نے ہندوستان کے مشرقی علاقہ کے قدیم شہر در بھنگہ میں مدرسہ امدادیہ کی بنیاد رکھی، اسی طرح مولانا عبد الغفار صاحب سرحدیؒ نے ۱۲۹۵ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں بہار کے مشہور تاریخی شہر گیا میں ''مدرسہ قاسمیہ اسلامیہ'' قائم کیا، حقیقت یہ ہے کہ یہ اور اس طرح کے

مدارس جو اس عہد میں قائم ہوئے، ان میں فکرِ قاسمی کی کرنیں ضوفشاں نظر آتی ہیں۔

اب تک ہندوستان؛ بلکہ دنیا کے اکثر علاقوں میں جو مدارس اسلامی چلتے تھے، وہ یا تو حکومت کے تعاون سے یا کسی رئیس کی شخصی مدد سے، آپ نے ایک ایسی دینی درسگاہ کا تصور دیا جو حکومت کے اثر سے آزاد رہے؛ تاکہ وہ اسلام کی بے لاگ اور بے آمیز ترجمانی کرسکے اور وہاں سے ایسے افراد پیدا ہوں، جو صرف علم ہی سے بہرہ ور نہ ہوں؛ بلکہ تعلق مع اللہ، دینی حمیت اور اسلامی غیرت سے بھی انھوں نے حصہ پایا ہو؛ چنانچہ آپ نے دار العلوم کے لئے آٹھ بنیادی اصول مقرر کئے، جن میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ سرکار اور امراء کی شرکت سے اس ادارہ کو بچایا جائے اور ایسے لوگوں سے تعاون حاصل کیا جائے، جن کے اندر ناموری کا جذبہ نہ ہو، اسی طرح ان اُصول ہشت گانہ کی ایک دفعہ انھیں کے الفاظ میں اس طرح ہے :

> اس مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں، جب تک یہ مدرسہ ان شاء اللہ بشرط توجہ الی اللہ اسی طرح چلے گا اور اگر کوئی آمدنی ایسی یقینی حاصل ہوگئی، جیسے جاگیر یا کارخانہ یا تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ، تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف ورجا جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے، ہاتھ سے جاتا رہے گا اور امدادِ غیبی موقوف ہوجائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہوجائے گا، القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔

چنانچہ حضرت نانوتوی کی اس تحریک کے اثر سے ۲۰، ۲۵/سال کے اندر ہی موجودہ افغانستان سے لے کر برما تک مدارس کا جال بچھ گیا، اور دار العلوم سے جو طلبہ فارغ ہوئے، انھوں نے اپنے اپنے علاقہ میں مدارس کا نظام قائم کیا، جس نے مسلمانوں کے ایک دینی مرکز کی حیثیت سے پورے علاقہ کے مسلمانوں کی قیادت کی۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جس زمانے میں دار العلوم قائم کیا، یہ وہ زمانہ ہے جب

ہندوستان کے چپہ چپہ میں انگریزوں اور عیسائی مشنریز کی طرف سے اسکول قائم کئے جارہے تھے، یہ اسکول صرف تعلیمی ادارے ہی نہیں تھے؛ بلکہ عیسائیت کی تبلیغ کے مراکز بھی تھے، جہاں تمام بچوں کو انجیل پڑھائی جاتی تھی، حضرت مسیح کے اسٹیچو کے سامنے لے جایا جاتا تھا اور ان سے دُعاء کرائی جاتی تھی، اس میں عیسائی اور غیر عیسائی طلبہ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا، اس کے برخلاف دینی تعلیم کا نہ نظم تھا اور نہ حسبِ ضرورت علماء موجود تھے؛ اس لئے آپ نے دارالعلوم کے بارے میں چاہا کہ اس کا نظام دینی تعلیم پر مرتکز ہو؛ تاکہ اس وقت اس ضرورت کو ترجیحی طور پر پورا کیا جاسکے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ علماء کے لئے جدید تعلیم کے مخالف تھے؛ چنانچہ ۹؍جنوری ۱۸۷۴ء کو دارالعلوم دیوبند کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے حضرت نانوتوی نے فرمایا :

> دارالعلوم دیوبند کے تعلیمی نصاب سے فارغ ہونے کے بعد اگر طلبائے دارالعلوم مدارس سرکاری میں جاکر علوم جدیدہ حاصل کریں تو ان کے کمال میں اس سے بہت اضافہ ہوگا۔

مولانا نانوتوی کا ذہن انقلابی تھا اور وہ زبان اور علم کے معاملہ میں تنگ نظری کے قائل نہ تھے؛ چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے نصاب میں ایک زمانہ میں سنسکرت زبان بھی داخل کی گئی، جو ہندوؤں کے مذہبی مآخذ کی زبان ہے، اس سلسلہ میں یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ آخری دفعہ جب آپ کا حج کا سفر ہوا تو پانی جہاز کے کیپٹن نے ایک ترجمان کے واسطہ سے آپ سے گفتگو کی اور آپ کی گفتگو سے اس قدر متاثر ہوا کہ قریب تھا کہ اسلام قبول کرلے؛ لیکن اس نے بعد میں آکر ملاقات کا وعدہ کیا، مولانا کا احساس تھا کہ براہِ راست گفتگو کا جو اثر ہوتا ہے، وہ بالواسطہ گفتگو میں نہیں ہوتا؛ اس لئے آپ نے ارادہ کیا کہ اگر عمر نے وفا کی تو وہ ہندوستان واپسی کے بعد اس زبان کو سیکھیں گے؛ لیکن افسوس کہ عمر نے وفا نہیں کیا۔

حضرت نانوتوی کے ایک ممتاز شاگرد شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی ہیں، انھوں نے ۲۹؍اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جامعہ ملیہ کے قیام کے سلسلہ میں علی گڑھ میں خطبہ دیتے ہوئے فرمایا :

> اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غم خوار

(جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں، تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتوی انگریزی زبان یا عصری علوم کو شجر ممنوعہ ہرگز نہیں سمجھتے تھے؛ بلکہ اس وقت کی ضرورت کے لحاظ سے آپ نے دارالعلوم کا نصاب مرتب کیا تھا، جس میں عربی، فارسی زبان اور اسلامی علوم کو خصوصی اہمیت دی گئی تھی؛ کیوں کہ اس وقت ایسا کرنا ضروری تھا۔

ہندوستان میں جو قدیم نصابِ تعلیم چل آرہا تھا، اس کو ''درسِ نظامی'' کہتے ہیں، جو ملا نظام الدین سہالویؒ (۱۱۶۱ھ-۱۷۴۸ء) کی طرف منسوب ہے، دیوبند کے بارے میں بھی خیال کیا جاتا ہے کہ یہ درسِ نظامی کی نمائندہ درسگاہ ہے؛ لیکن یہ غلط فہمی پر مبنی ہے، حقیقت یہ ہے کہ درسِ نظامی پر معقولات کا غلبہ تھا؛ کیوں کہ ۱۸۵۷ء تک ہندوستان میں مسلمانوں کے جو تعلیمی مراکز تھے، ان پر منطق وفلسفہ کا نشہ چڑھا ہوا تھا، خیرآباد، فرنگی محل، ٹونک اور رام پور وغیرہ ایسے تعلیمی مراکز تھے، جہاں حدیث وفقہ اور تفسیر وغیرہ کے لئے بہت محدود وقت رکھا گیا تھا، عام طور پر تفسیر میں ''مدارک التنزیل'' حدیث میں ''مشارق الانوار'' اور فقہ میں ''قدوری'' یا ''شرح وقایہ'' پڑھائی جاتی تھی، اور معقولات کی کتابیں کثیر تعداد میں شریک نصاب تھیں، جو تقریباً دو تہائی نصاب کا احاطہ کرتی تھیں، اس سے ہٹ کر ہندوستان میں جس دوسری درسگاہ کو قبولیت حاصل ہوئی، وہ ہے ''درسگاہِ ولی اللّٰہی''، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے دہلی میں مدرسہ رحیمیہ کے ذریعہ قرآن وحدیث کی تدریس کو فروغ دیا، آپؒ کے ذریعہ صحاحِ ستہ کے درس کا سلسلہ شروع ہوا اور آپ کے باکمال صاحب زادوں شاہ عبدالقادر دہلوی اور شاہ رفیع الدین دہلوی نے پہلی بار پورے قرآنِ مجید کا اردو ترجمہ فرمایا، جس کی بعض تنگ نظر مولویوں کی طرف سے بڑی مخالفت بھی کی گئی۔

حضرت نانوتوی نے دارالعلوم کا جو نصاب بنایا، اس میں درسگاہِ ولی اللّٰہی کو بنیاد بنایا، صحاح ستہ کو پوری اہمیت کے ساتھ داخلِ درس کیا، فقہ اور تفسیر کو شروع سے آخر تک نصاب میں خصوصی اہمیت دی گئی، علوم جدیدہ میں ریاضی اور فلکیات کو شاملِ نصاب رکھا، اس کے علاوہ منطق اور قدیم فلسفہ کو بھی حسبِ ضرورت نصاب میں شامل کیا گیا، اس طرح ہندوستان میں دینی تعلیم کے اعتبار سے یہ ایک انقلابی تبدیلی تھی، جو دارالعلوم دیوبند کے ذریعہ وجود میں آئی اور جہاں منقولات کی بجائے معقولات کو وجہِ افتخار سمجھا جاتا تھا، وہاں ہندوستان کے بام ودر علوم نقلیہ سے گونجنے لگے۔

تحریک مدارس نے امتِ اسلامیہ کو جو فائدہ پہنچایا ان کو احاطۂ تحریر میں لانا دشوار ہے؛ لیکن یہاں چند اہم نکات کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے :

(۱) ان مدارس سے ایسے فضلاء پیدا ہوئے، جو دینی حمیت کے حامل اور اسلام کی اشاعت وحفاظت کے جذبہ سے سرشار تھے، انہوں نے قناعت کو اپنا اثاثۂ زندگی بنایا، نہ حکومت یا رءوسا کے جبر ودباؤ کو قبول کیا اور نہ ان کی تحریص وترغیب سے متاثر ہوئے، جس کا نتیجہ ہے کہ اکثر حکومتوں سے ان کی مزاحمت بھی رہی اور انہوں نے ہمیشہ حکومت کا مالی تعاون قبول کرنے سے انکار کیا۔

(۲) سترہویں صدی کے بعد اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں میں شکوک وشبہات کو جنم دینے کی غرض سے استشراق کے نام سے ایک مستقل فن کو پروان چڑھایا گیا، جس کا عنوان تو رکھا گیا: مشرقی علوم اور تہذیبوں کے مطالعہ کا؛ لیکن اس کا اصل مقصد اسلام پر اعتراضات قرار پایا، مغربی استعماریت کے سہارے مسلم ممالک میں بھی اس فکر کو پہنچانے کی کوشش کی گئی، یہاں تک کہ مسلمانوں میں بھی ایک ایسا گروہ پیدا ہوگیا، جو ان کے اعتراضات سے متاثر ہوکر قرآنی آیات واحادیث کی بے جا تأویلات کرنے لگا، ہندوستان میں اس گروہ کے سرخیل سرسید احمد خاں مرحوم (بانی مسلم یونیورسیٹی علی گڑھ) تھے، تحریک مدارس نے اس فتنہ

کا مقابلہ کیا اور مسلمانوں کو فکری انحراف سے بچانے کی کامیاب کوشش کی۔

(۳) انگریزوں کی شہ پر اٹھارہویں صدی کے اواخر میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے ایک قصبہ ''قادیان'' سے مرزا غلام احمد نام کے ایک شخص نے نبوت کا دعوی کیا، اور مغربی طاقتوں کی تائید وتقویت کی وجہ سے اس نے ایک عظیم فتنہ کی شکل اختیار کرلی، یہ تحریک مدارس کے پروردہ اور پرداختہ افراد ہی تھے، جنھوں نے برصغیر سے لے کر یورپ اور امریکہ تک اس فتنہ کا کامیاب اور مؤثر تعاقب کیا اور آج بھی کررہے ہیں، اگر علماء اس کے مقابلہ کے لئے نہ اُٹھے ہوتے تو یہ فتنۂ ارتداد نہ جانے کتنے لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا۔

(۴) ہندوستان میں ایک زبردست تحریک بعض ہندو فرقوں کی طرف سے اٹھی، جس نے سادہ لوح اور دین سے ناواقف مسلمانوں کو باور کرایا کہ ان کے آباء واجداد اصل میں ہندو تھے اور انھیں جبر وزبردستی کرکے مسلمان بنالیا گیا ہے؛ اس لئے ان کو اپنے پرانے مذہب کی طرف لوٹ آنا چاہئے، اس سلسلہ میں بہت سے لٹریچر بھی شائع کئے گئے اور تقریر ومناظرہ کا راستہ بھی اختیار کیا گیا، مسلمانوں کی معاشی اور تعلیمی پس ماندگی نے فتنہ کی اس آگ پر تیل کا کام کیا، یہ دینی مدارس کے فضلاء ہی تھے کہ جنھوں نے ان حالات میں خطرات مول لے کر اور نامساعد حالات کا سامنا کرتے ہوئے اس فتنۂ ارتداد کا بھی مقابلہ کیا اور نوے فیصد مسلمانوں کو اس سے بچانے میں کامیاب رہے۔

(۵) مستشرقین کے زیر سایہ انکارِ حدیث کا فتنہ بھی پوری قوت کے ساتھ اٹھا، حدیث کا انکار گویا بالواسطہ اسلام کی بنیادی مسلّمہ حقیقتوں کا انکار ہے، اس فتنہ نے عالم عرب میں مصر کو اور مشرقی ملکوں میں ہندوستان کو بہت متاثر کیا اور فکری انحراف کا ایک وسیع دروازہ کھل گیا، اس کے مقابلہ کے لئے اسی تحریک کے تربیت یافتہ افراد کھڑے ہوئے، انھوں نے اس کی رد میں مدلل اور معیاری لٹریچر مرتب کیا اور اس طرح بڑی حد تک اس فتنہ کا ازالہ ہوسکا۔

(٦) تحریک مدارس ہی کے بطن سے کئی دینی، دعوتی، تعلیمی اور سیاسی تحریکوں نے جنم لیا ہے، ان میں سب سے نمایاں مسلمانوں میں دعوت کا کام کرنے والی جماعت ہے، جو

''تبلیغی جماعت'' کے نام سے معروف ہے اور جس کی بنیاد حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ نے رکھی ہے، آج یہ عالمگیر جماعت ہے، جس کے اثرات دنیا کے چپہ چپہ میں محسوس کئے جاسکتے ہیں، یہ جماعت مسلمانوں کو دین سے مربوط رکھنے، ان کی اسلامی شناخت کو باقی رکھنے اور دیہات وقریہ جات تک اسلام کی روشنی پہنچانے میں نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔

(۷) اس تحریک کے تربیت یافتہ افراد سیاست کے میدان میں بھی مسلمانوں کے مفادات اور اسلامی اقدار کے تحفظ کی بابت نہایت اہم کردار ادا کرتے رہے ہیں، ہندوستان میں جنگِ آزادی کے درمیان جمعیۃ العلماء کا قیام عمل میں آیا، جس نے ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں ناقابل فراموش خدمت انجام دی ہے، قیام پاکستان کی تحریک کو بھی اس وقت تقویت پہنچی اور قبولیت حاصل ہوئی، جب تحریک مدارس سے مربوط بعض بزرگ علماء نے اس کی تائید کی، پھر پاکستان بننے کے بعد جمعیت علماء پاکستان ہمیشہ سے پاکستان کی سیاست میں ایک اہم کردار ادا کرتی رہی ہے، اسی طرح افغانستان میں طالبان کے عروج واقتدار سے ساری دنیا واقف ہے، سیاسی محاذ پر مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کا کام بعض افریقی ملکوں میں بھی انھیں علماء کے ذریعہ سرانجام پارہا ہے؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ سیاسی سطح پر بھی اس تحریک کا کم سے کم برصغیر کے طول وعرض میں اہم رول رہا ہے۔

(۸) فقہاء نے ایسے ممالک میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، نظام امارت اور نظامِ دارالقضاء کے قیام کی رائے دی ہے؛ تاکہ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی ہوسکے اور وہ مسائل حل ہوسکیں جو مسلمان قاضی کے تصرف سے متعلق ہیں؛ چنانچہ ہندوستان میں انگریزوں کے غلبہ کے بعد علماء نے نصبِ امیر اور نصبِ قاضی کے واجب ہونے کا فتوی دیا اور سب سے پہلے ہندوستان کی ریاست بہار میں حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے امارت شرعیہ کی بنیاد رکھی، جس کے تحت دارالقضاء، بیت المال، دعوتِ اسلام اور تحفظ مسلمین کے شعبے قائم ہوئے، اس وقت یہ نظام ہندوستان کی بہت سی ریاستوں میں کام کررہا ہے، اس کے علاوہ بعض دوسرے ممالک جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں بھی مسلمانوں نے دارالقضاء کا نظام

قائم کیا ہے، جیسے برطانیہ، امریکہ، ماریشس اور جنوبی افریقہ وغیرہ، یہ خدمت بھی تحریک مدارس ہی سے جڑے ہوئے افراد نے کی ہے۔

(۹) ہندوستان میں برطانوی عہد ہی میں یہ قانون بن چکا تھا کہ پرسنل لا سے متعلق مقدمات میں اگر دونوں فریق مسلمان ہوں تو ان پر قانونِ شریعت کا نفاذ عمل میں آئے گا، ہندوستان میں یہ قانون ''شریعت اپلیکیشن ایکٹ ۱۹۳۷ء'' کے نام سے جانا جاتا ہے، افسوس کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد جمہوری حکومت نے یہ مذموم کوشش کی کہ مسلمانوں کو ان کے پرسنل لا سے محروم کردیا جائے، جس سے اس امت کا تہذیبی اور مذہبی تشخص متعلق ہے؛ چنانچہ ۱۹۷۲ء میں دار العلوم دیوبند نے پیش قدمی کرتے ہوئے اس مسئلہ کی اہمیت پر مختلف مکاتبِ فکر کے نمائندوں کو جمع کیا اور ہندوستان کے ساحلی شہر ممبئی میں ایسا عظیم الشان کنونشن منعقد کیا، کہا جاتا ہے کہ ملک کی تاریخ میں مسلمانوں کے لئے ایسے اجتماع کی کوئی اور مثال نہیں ملتی، اس اجتماع میں آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی تشکیل ہوئی، جو اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے نمائندہ، متحدہ اور موثر پلیٹ فارم ہے اور حکومت بھی اس کی آواز پر کان دھرنے پر مجبور ہوتی ہے، ہندوستان میں اٹھنے والی اس تحریک کا اثر اب دوسرے اُن ملکوں میں بھی محسوس کیا جارہا ہے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں؛ چنانچہ ماریشش میں وہاں کے علماء کی کوششوں سے نہ صرف مسلم پرسنل لا کو تسلیم کیا گیا؛ بلکہ دار القضاء کو بھی ایک حد تک عدالتی اختیارات دیئے گئے ہیں، اسی طرح جنوبی افریقہ میں بھی اس طرح کی کوششیں جاری ہیں۔

افسوس کہ اس دور میں مسلم ممالک میں بھی اسلام اور شریعتِ اسلامی کے تحفظ کے لئے کوشش کرنی پڑتی ہے؛ چنانچہ پاکستان میں شریعتِ اسلامی کی تنفیذ کے لئے جناب ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ''نظام مصطفیٰ'' کی تحریک شروع ہوئی، اس تحریک کو وجود میں لانے والے، پروان چڑھانے والے اور اس کی سالاری کرنے والے اسی تحریکِ مدارس سے مربوط حضرات تھے۔

(۱۰) مغرب نے پوری دنیا میں قومیت کا فتنہ ابھارا ہے؛ تاکہ نسلی اور جغرافیائی

بنیادوں پر انسانوں کو تقسیم کیا جا سکے، مسلمان اور عالم اسلام ان کا خصوصی ہدف ہیں، افسوس کہ گمراہی کے اس سیلاب میں بڑے بڑے مسلم قائدین بہہ گئے، اس فتنہ نے نہ صرف عالم اسلام کو پارہ پارہ کیا؛ بلکہ جن ملکوں میں مسلمان اقلیت میں تھے، وہاں بھی وہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے، اس سیلاب کے مقابلہ میں اگر کوئی گروہ ثابت قدم رہا اور اس نے اس تفریق کا مقابلہ اسلامی وحدت اور ایمانی اخوت سے کیا تو وہ علماء دین ہیں، آج دنیا میں مغرب کی ہزار ریشہ دوانیوں کے باوجود عام مسلمانوں کا اسلام سے تعلق اور امت اسلامیہ سے ان کی محبت دراصل ان ہی علماء کی کوششوں کا حصہ ہے، جو مدارسِ اسلامیہ کی پیداوار ہیں، جنھوں نے ہزار سازشوں کے باوجود اپنے آپ کو اسلامی فکر پر ثابت قدم رکھا ہے۔

(۱۱) تحریک مدارس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ یہاں ایسے افراد پیدا ہوئے، جنہوں نے مختلف میدانوں میں کام کیا اور ملتِ اسلامیہ کی خدمت کے لئے مختلف اداروں کی داغ بیل ڈالی، اس میں دینی مدارس کے علاوہ ماڈرن ایجوکیشن کے ادارے، مسلمانوں اور غیر مسلموں میں دعوتِ دین کے مراکز، خدمت خلق کے کام، سیاسی تنظیمیں، سماجی اصلاح کی تحریکیں وغیرہ شامل ہیں، صرف برصغیر میں ایسے اداروں کی تعداد کئی ہزار ہوگی، دوسرے مما لک میں ہونے والی کوششیں اس کے علاوہ ہیں۔

(۱۲) مدارسِ اسلامیہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہوا کہ دین اور ملت کے مختلف کاموں کے لئے جو تحریکیں، جماعتیں، تنظیمیں اور ادارے قائم ہوئے ان کو یہاں سے تربیت یافتہ افراد حاصل ہوئے اور انھیں اپنے مشن کو آگے بڑھانے میں افرادی وسائل کے لحاظ سے زیادہ دشواری نہیں ہوئی، اس سلسلہ میں یہ پہلو بھی قابلِ توجہ ہے کہ چوں کہ اس تحریک کا سرچشمہ برصغیر ہے اور برصغیر افرادی وسائل کے اعتبار سے دنیا کا سب سے مالدار خطہ ہے اور یہاں کے ہنرمند مشرق سے مغرب تک ہر علاقہ میں خدمت انجام دے رہے ہیں، اس کی وجہ سے آزاد مدارس کا نظام اور دینی سرگرمیوں کی سوغات بھی پوری دنیا میں پہنچ رہی ہے اور وہ مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور مذہبی ضرورت کے لحاظ سے ادارے قائم کررہے ہیں، امریکہ،

برطانیہ، جنوبی افریقہ اور جاپان وغیرہ میں اس کے عملی نمونے دیکھے جاسکتے ہیں۔

(۱۳) جدید وسائل کی پیدائش ، سیاسی اور معاشی نظام میں تبدیلیوں اور اخلاقی قدروں میں تفاوت کی وجہ سے نہ صرف فکری مسائل پیدا ہوتے ہیں ؛ بلکہ بہت سے نئے فقہی مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں ، ان مسائل کو مل کر حل کرنے کی کوششیں جہاں عالم اسلام میں سرکاری سطح پر ہورہی ہیں ، وہیں مسلم اقلیتی ممالک میں علماء اور فضلاء مدارس کے ذریعہ ہورہی ہیں ، ہندوستان کے اہل علم نے اس سلسلہ میں شروع سے جدوجہد کی ہے اور موجودہ دور میں اس کی ایک اچھی مثال ''مجمع الفقہ الاسلامی ، الہند'' ہے ، جس کی بنیاد حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے رکھی ہے ، اور وہ اپنی خدمات کے اعتبار سے عالمِ اسلام کی مجامعِ فقہیہ کے ہم پلہ ہے۔

(۱۴) یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ ڈیڑھ سو سال میں اسلامی علوم کا جو لٹریچر سامنے آیا ہے اور جس کے دائرہ میں تفسیر ، حدیث ، فقہ ، اُصول فقہ ، جدید علمِ کلام وغیرہ شامل ہے ، بڑی حد تک انھیں علماء کا عطیہ ہے ، خاص کر مسلم اقلیت ممالک میں یہ انھیں مدارس کے فضلاء کی خدمات کا نتیجہ ہے اور اہم بات یہ ہے کہ یہ لٹریچر استقامت پر مبنی ہے ، نہ مغرب سے متاثر ہوکر ایسا اسلام تراشنے کی کوشش کی گئی ہے ، جسے مغربی دنیا پسند کرتی ہو اور نہ حکومت کے دباؤ سے متاثر ہوکر ایسے فتاوی دیئے گئے ہیں ، جس سے حکومت کی پیشانی پر شکن نہ پڑے ، چاہے شریعت اسلامی کی روح متأثر ہوجائے۔

غرض کہ اس وقت مشرق سے مغرب تک اسلام کی طرف لوٹنے کی جو مہم چل رہی ہے اور پوری دنیا میں جو اسلامی بیداری محسوس کی جارہی ہے ، اس میں نہایت اہم رول ''تحریک مدارس اسلامیہ'' کا ہے ؛ اس لئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اگر عالمی سطح پر ان تحریکات کا جائزہ لیا جائے جو انیسویں اور بیسویں صدی میں اٹھی ہیں ، تو ان میں تحریک مدارس اسلامیہ —— جس کی بنیاد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے رکھی ہے —— سرفہرست ہے اور آج دشمنانِ اسلام بھی اس تحریک کی اہمیت ، اس کے اثرات اور اس کے رسوخ کے معترف ہیں اور اس کو اپنے

مذہب بیزار افکار کی اشاعت میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں۔

حضرت نانوتویؒ نے جہاں دفاع عن الاسلام کا فریضہ انجام دیا اور اسلام کے خلاف اٹھنے والی یورشوں کا مقابلہ فرمایا، وہیں آپ نے خود مسلمانوں میں بھی دعوت واصلاح کا کام کیا، اس خدمت کا ایک پہلو تو یہ تھا کہ ہندوستان میں شیعیت کے غلبہ کی وجہ سے بہت سی بدعات مسلمانوں کی مذہبی زندگی کا حصہ بن گئی تھیں، خود نانوتہ میں بھی شیعہ موجود تھے اور مولانا کے خاندان کی ایک شاخ بھی شیعہ ہوگئی تھی، اسی کا نتیجہ تھا کہ اہل سنت بڑی دھوم دھام سے تعزیہ داری کرتے تھے، اہل سنت کی مسجدوں میں بھی ایک کمرہ تعزیہ کے لئے ہوا کرتا تھا، اہل بیت کے مرثیئے پڑھے جاتے تھے، حضرت حسین ﷛ کے نام کی سبیل لگتی تھی، یہ کیفیت قریب قریب پورے ہندوستان میں تھی اور اب بھی بہت سی جگہ جاہل عوام میں اس کا اثر باقی ہے، آپ نے اس کے خلاف علم جہاد بلند کیا، جگہ جگہ تعزیہ داری رکوائی اور اس کے لئے عوام کی مخالفت کو برداشت کیا؛ لیکن اس کا فائدہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ اہل سنت اس برائی سے دور ہوتے گئے۔

بعض غالی مبتدعین کا خیال تھا کہ رسول اللہ ﷺ عالم الغیب ہیں، آپ نے اس کے خلاف قلم اُٹھایا اور اپنے ایک مکتوب میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حاضر وناظر ہونے اور مشائخ تصوف کی بابت ہمیشہ ساتھ رہنے کا تصور پایا جاتا تھا، آپ نے ان چیزوں کا رد فرمایا، اسی طرح غیر اللہ کے نام نذر ماننے کا رواج مسلمانوں میں بھی ہوگیا تھا، آپ نے اس کے خلاف آواز اٹھائی۔

اصلاحی کوششوں کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ رہنے کی وجہ سے جو سماجی برائیاں مسلمانوں میں پیدا ہوگئی تھیں، ان کے خلاف بھی آپ نے جدوجہد کی، جن میں ایک ''نکاحِ بیوگاں'' کا مسئلہ تھا، ہندوؤں کے یہاں بیوہ عورت کے لئے دوسرے نکاح کی گنجائش نہیں تھی اور ان کو منحوس سمجھا جاتا تھا، مسلمانوں میں بھی یہی تصور گھر کر گیا تھا؛ چنانچہ اس کے لئے سید احمد شہیدؒ نے اپنے زمانہ میں تحریک شروع کی تھی، بعض اور علماء نے بھی کوششیں کی؛ لیکن

اس بری رسم کوختم کرنے میں کماحقہ کامیابی حاصل نہیں ہوئی، حضرت نانوتوی نے علماء ومشائخ کوساتھ لے کر بڑے پیمانے پراس خراب رسم کے خلاف مہم چلائی اور عملی اقدامات بھی کئے، لوگوں کے لئے نمونہ فراہم کرنے کی غرض سے اپنی بیوہ خالہ کا نکاح کیا،انہیں اس سے اولاد بھی ہوئی؛لیکن کوئی ان بچوں سے شادی کے لئے تیار نہیں ہوتا تھااوراسے منحوس سمجھتا تھا، جب آپ تک یہ بات پہنچی تو آپ نے اپنی صاحبزادی کا ان سے نکاح فرمایا، اس طرح اس لعنت کوختم کرنے میں حضرت نانوتوی نے بڑااہم کرداراداکیا۔

عام طور جولوگ علم وتحقیق کے مردِ میدان ہوتے ہیں، وہ میدانِ جہاد کے شہہ سوار نہیں ہوتے ؛لیکن حضرت نانوتوی بہ یک وقت متکلم اسلام بھی ہیں، داعی دین بھی، مصلح امت بھی، علوم اسلامی کے مدرس بھی اور مجاہد بھی، ہندوستان پرانگریزوں کے غلبہ کوحضرت نانوتوی اس نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے کہ یہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے مادی وجود ہی کے لئے خطرہ نہیں ہے؛ بلکہ ان کے ملی وجوداور دینی تشخص کی بقاء کے لئے بھی خطرہ ہے؛اس لئے آپ نے جہاد کی معرکہ آرائی کے لئے ماحول تیارکیا، جہاد کے لئے امیر کی ضرورت تھی؛ چنانچہ آپ کے مشورہ پرحاجی امداداللہ صاحبؒ کوامیر مقرر کیا گیا اور خود حضرت نانوتوی چیف کمانڈر مقرر ہوئے، انگریزوں کی فوج کا ایک حصہ شاملی کے ایک کچے قلعہ میں مقیم تھا، مجاہدین کا یہ قافلہ وہیں پہنچا اور دونوں میں معرکہ ہوا، اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا فرمائی ؛ لیکن پورے ملک پر انگریزوں کا پنجۂ اقتدارگڑچکا تھا؛ اس لئے پھر دوبارہ زیادہ مؤثر ہتھیار کی طاقت سے انگریز علاقہ پرقابض ہوگئے،آپ کے نام گرفتاری کا وارنٹ بھی جاری ہوااورلوگوں کا اندازہ تھا کہ پھانسی سے کم سزا آپ کونہیں ملے گی، چندروز آپ کوروپوش بھی ہونا پڑا، آپ کے رفقاء کوبھی اسی طرح اپنی جان بچانی پڑی، حاجی امداداللہ صاحب مکہ ہجرت کرگئے، آخر ۱۹ر ماہ کی کش مکش کے بعد نومبر ۱۹۵۸ء مطابق ربیع الاول ۱۲۷۵ھ میں برطانیہ نے ہندوستان کی حکومت کو براہِ راست اپنے ہاتھ میں لے لیا اوراس موقع پرملکہ وکٹوریہ نے عام معافی کا اعلان کیا،اس طرح

آپ کو اس آزمائش سے نجات ملی۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے افکار کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنی کوششوں کا بنیادی محور اسلام کے دفاع اور غیر مسلموں کی طرف سے اسلام پر ہونے والی یلغار کے مقابلہ کو بنایا؛ چنانچہ آپ کی اکثر تصنیفات عیسائیت اور آریہ سماجیت کی رد میں ہیں اور آپ کے مناظروں، تقریروں اور دعوتی کوششوں کا بھی اصل رخ دعوتِ ارتداد کا مقابلہ کرنا اور مسلمانوں کو انحراف سے بچانا ہوتا تھا، اس کے برخلاف ان فرقوں کے بارے میں آپ کا لب ولہجہ نرم، معتدل اور ناصحانہ ہوتا تھا، جو اہل قبلہ میں سے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت نانوتوی کی یہ عبارت اصولی، چشم کشا اور اس دور کے علماء کے لئے قابل توجہ ہے :

> عقائد کے تغیر وتبدیل کو ہم ''رأس البدعات'' کہتے ہیں اور قواعد کلیہ کے تغیر وتبدیلی کو ہم ''بدعتِ کبری'' قرار دیتے ہیں،......اعمال جزئیہ کی کمی بیشی کو ہم ''بدعتِ صغری'' کہتے ہیں،...... بالجملہ ہم تغیر وتبدیل عقائد کو جیسے شیعہ وخوارج ومعتزلہ نے کیا ''رأس البدعات'' اور قواعد کلیہ کو مثلِ ایجاد تعزیہ و ماتم داری کو بدعت کبری اور کمی بیشی صدر جزئیہ کو بدعت صغری کہتے ہیں، برائی کی کمی وزیادتی بدعات میں بہ قدر چھوٹائی و بڑائی بدعت کے سمجھتے ہیں،......وہ بدعتیں جن کو کبری کہتے ہیں، بیشتر فرق ہائے باطلہ مثل شیعہ وخوارج میں پائے جاتے ہیں اور کم تر بعض جماعت اہل سنت میں نظر آتے ہیں۔

اسی لئے آپ نے شیعوں کے خلاف جو کتاب تالیف کی ہے، اس کا لب ولہجہ انتہائی ناصحانہ اور مشفقانہ ہے اور فریق مخالف کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے قلم اٹھایا ہے، بہ قول مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ انتہائی دل سوزی کے ساتھ آپ نے شیعوں کے خلاف قلم اٹھایا ہے۔

آپ عقائد کے باب میں بھی احکام کے مدارج کو پیش نظر رکھتے تھے اور جو امور مدارِ

نجات نہیں ہیں، ان کے سلسلہ میں شدت برتنے سے گریزاں تھے، مثلاً: آپؒ حیاتِ نبی کے قائل تھے، اس پر آپ کی کتاب ''آبِ حیات'' ایک معرکۃ الآراء تالیف ہے؛ لیکن آپ نے اس بات کو پسند نہیں کیا کہ اس عقیدہ کو ضروریاتِ دین میں شامل کر دیا جائے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> ......زیادہ کیا عرض کروں، ہاں اتنا عرض کئے دیتا ہوں کہ گو عقیدہ یہی ہے اور میں جانتا ہوں انشاء اللہ تعالیٰ ایسا ہی رہے گا، مگر اس عقیدہ کو عقائد ضروریہ میں سے نہیں سمجھتا، نہ تعلیم ایسی باتوں کی کرتا ہوں، نہ منکروں سے دست وگریباں ہوتا ہوں، خود کسی سے کہتا نہیں پھرتا، کوئی پوچھتا ہے اور اندیشۂ فساد نہیں ہوتا تو اظہار میں دریغ بھی نہیں کرتا، آپ بھی اس امر کو ملحوظ رکھیں تو بہتر ہے۔

فقہی مسائل میں بھی آپ کا یہی مزاج تھا، آپ عام طور پر فقہ کے باب میں اختلافی مسائل پر قلم نہیں اٹھاتے تھے؛ لیکن بعض غیر مقلد حضرات کے غلو اور تشدد کی رد میں جو کہا کرتے تھے کہ قراءت فاتحہ خلف الامام کے بغیر نماز ہی درست نہیں ہوتی اور ۲۰ رکعت تراویح بدعت ہے، کی رد میں قلم اٹھانا پڑا، آپ نے قراءت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں جمہور کے نقطۂ نظر کو ترجیح دی ہے اور اس کو نقل وعقل سے ہم آہنگ قرار دیا ہے کہ امام کے پیچھے قراءت کرنا ضروری نہیں؛ لیکن زیر بحث مسئلہ پر گفتگو کے بعد اخیر میں لکھتے ہیں :

> ......اس پر امام ابوحنیفہؒ پر طعن کئے جائیں اور تارکین قراءت پر عدم جواز صلاۃ کا الزام ہوا کرے تو کیا کیجئے، زبان وقلم کے آگے کوئی آڑ نہیں، پہاڑ نہیں، ہم کو دیکھئے باوجود توجیہاتِ مذکورہ اور استماعِ تشنیعات معلومہ فاتحہ پڑھنے والوں سے دست وگریباں نہیں ہوتے؛ بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم تو کس حساب میں ہیں، امام اعظم بھی باوجود عظمت شان امکانِ خطا سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ امام شافعیؒ صحیح فرماتے ہوں اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ نہ سمجھے ہوں، اس امر میں

زیادہ تعصب کو پسند نہیں کرتے، پر جس وقت امام علیہ الرحمہ کی توہین سنی جاتی ہے، دل جل کر خاک ہوجاتا ہے اور یوں جی میں آتا ہے کہ ان زبان درازیوں کے مقابلے میں ہم بھی لن ترانیوں پر آجائیں اور دو چار ہم بھی سنائیں، پر آیت: ''**وإذا خاطبهم الجاهلون قالوا سلاما، وإذا مروا باللغو مروا كراما** ''اور احادیث منع نزاع مانع ہیں۔(توثيق الكلام في الإنصات خلف الإمام،ص:۲۳)

پھر مسائل فقہیہ میں اعتدال اس درجہ ہے کہ ترکِ قراءت کو اولیٰ قرار دیتے ہیں گویا قراءت بھی ناجائز نہیں؛ چنانچہ رقم طراز ہیں :

ترکِ قراءت فاتحہ خلف الامام قراءت فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے۔

آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ فروعی مسائل کو نزاع کا سبب بنایا جائے ؛ چنانچہ دیہات میں نمازِ جمعہ قائم کرنے کو درست نہیں سمجھتے ؛ لیکن اپنے ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ اگر کہیں دیہات میں جمعہ قائم کرلیا جائے تو الجھنے کی بھی ضرورت نہیں :

اگر کسے در دیہی جمعہ قائم کند دست وگریبانش نہ زنند۔

اسی لئے اختلافی فقہی مسائل میں کسی ایک رائے پر تشدد کو پسند نہیں کرتے تھے، اسی نوعیت کے ایک مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

اسی لئے اہل اسلام کو یہ ضروری ہے کہ ایسے مسائل میں خواہ مخواہ ایسے پکے نہ ہو بیٹھیں کہ دوسری طرف کو بالکل باطل سمجھ لیں۔(جمال قاسمی:۹)

چنانچہ فقہ حنفی کے مقلد ہونے کے باوجود ایسی حدیثوں پر بھی بعض اوقات عمل کیا کرتے تھے جو دوسرے فقہاء کا مستدل ہیں، آپ کے ایک ممتاز شاگرد مولانا حکیم محمد منصور علی مرادآبادی ہیں، لکھتے ہیں :

عمل ان کا حنفی تھا، مگر ہر سنت کی اتباع میں بہت خیال رکھتے تھے

اور کبھی کبھی خلافی مسائل پر بھی عمل کر لیتے تھے۔ (مذہب منصور:۱۹۲/۲)

نصوص پر عمل کرنے کا ایسا ذوق تھا کہ چاہتے تھے کہ منسوخ احکام کو بھی استحباب کے درجہ میں رکھا جائے، حضرت نانوتویؒ کی فکر کا یہ اعتدال آج کے اہل علم کے لئے اُسوہ اور نمونہ ہے۔

اسی اعتدال کا پہلو یہ ہے کہ آپ اہل قبلہ کی تکفیر میں بہت ہی احتیاط سے کام لیتے تھے، جیسے روافض سے آپ کا بڑا سابقہ رہا ہے اور آپ کی سب سے ضخیم کتاب انہیں کی رد میں ہے؛ لیکن آپ نے صراحتاً ان کی تکفیر نہیں کی ؛ بلکہ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں ان کو ''من وجہٍ کافر اور من وجہٍ مؤمن'' قرار دیا ہے اور اس کی نظیر کے طور پر حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کا عمل پیش کیا ہے کہ انہوں نے خوارج سے جہاد بھی کیا، جو اصل میں کافروں سے ہے؛ لیکن جب ان کے لوگ گرفتار ہو کر آئے تو انھیں غلام اور باندی نہیں بنایا اور اس جہت سے انھیں کفار کے زمرہ میں نہیں رکھا۔

حضرت نانوتوی کا امتیازی وصف رجوع الی اللہ، تواضع اور اپنی شخصیت کا اخفاء ہے، انھوں نے دارالعلوم دیو بند کی بنیاد ہی توکل علی اللہ پر رکھی اور اس بات کی تلقین فرمائی کہ حکومت کے تعاون اور امیر محکم القول کے وعدہ کے بجائے اللہ پر بھروسہ رکھا جائے اور مستقل مالی وسائل حاصل کرنے سے گریز کیا جائے ؛ تاکہ توکل اور رجوع الی اللہ کی کیفیت متأثر نہ ہونے پائے ،تواضع کا حال یہ کہ دارالعلوم دیو بند کا نقشہ خود بناتے ہیں ؛لیکن اپنے رفقاء کو آگے رکھتے ہیں ،لباس اور وضع قطع ایسی ہے کہ دیکھنے والوں کو خیال گزرتا ہے کہ شاید گاؤں دیہات کا کوئی کاشت کار ہو، اسی تواضع اور للّٰہیت کا اثر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی تحریک کو عالمی اور آفاقی تحریک بنا دیا اور آپ نے اپنے آپ کو جتنا چھپایا، اسی قدر آپ کے علم وفضل کا شہرہ دور دور تک بلند ہوتا چلا گیا۔

❁ ❁ ❁

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ — حدیثی وفقہی خدمات ❁

اہل علم دو طرح کے گذرے ہیں، کچھ لوگ وہ ہیں جن کے یہاں وسعت اور پھیلاؤ ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے یہاں عمق اور گہرائی ہے، یہ دونوں طرح کا مذاق کچھ فرق کے ساتھ ہر عہد میں رہا ہے، علامہ سیوطیؒ اور علامہ سخاویؒ جو معاصر بھی ہیں اور اپنے اعلیٰ علمی ذوق اور تالیفات کی وجہ سے معروف بھی، ان کے بارے میں بھی بعض مقام شناس علماء کا تجزیہ یہی تھا کہ ایک کے پاس وسعت ہے اور دوسرے کے پاس عمق۔

اس لحاظ سے حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں علوم اسلامی میں عمق اور گہرائی پائی جاتی تھی، اخفاءِ حال کا اتنا غلبہ تھا کہ باضابطہ تصنیف وتالیف کا کام بہت کم کیا؛ لیکن جو کچھ لکھا اور جو کچھ ان سے سننے والوں نے محفوظ کیا، وہ ان کی بالغ نظری اور بلند نگاہی کا شاہد عدل ہے، وہ صرف تیراک نہ تھے، غواص بھی تھے، ان کے یہاں یافت سے زیادہ دریافت ہے، آپ کی جو بھی تحریر دیکھی جائے، اس میں نقل وحکایت کم ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے من جانب اللہ علوم ومعارف کا ورود ہو رہا ہے، کتابوں کے حوالوں سے مواد کا اکٹھا کر لینا بھی مشکل کام ہے، مگر نسبتاً آسان ہے؛ لیکن کسی موضوع کی تہہ تک پہنچ کر خود اپنی بات کہنا اور اپنی قوتِ فکر کا استعمال کر کے الجھی ہوئی ڈور سلجھانا دشوار کام ہے اور یہی کام حضرت نانوتویؒ نے کیا ہے، انھوں نے ایسے ایسے لعل وگہر اور جواہر ریزے نکالے ہیں کہ جہاں تک بڑے بڑے اہل علم کی بھی رسائی نہیں ہو پائی۔

❁ ابناء قدیم دارالعلوم دیوبند کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے مولانا محمد قاسم نانوتوی سیمینار مئی ۲۰۰۰ء دہلی کے لئے تحریر کیا جانے والا مقالہ۔

حضرت نانوتویؒ ان گوشہ نشیں اور عزلت گزیں اہل علم میں نہیں تھے، جو صرف علم وتحقیق کے کام میں مصروف ہوں اور اُمت جن ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذر رہی ہو، ان سے بے خبر اور بے تعلق ہوں ؛ بلکہ وہ دقیق النظر دماغ کے ساتھ ساتھ تڑتپا ہوا بے چین اور دردمند دل بھی رکھتے تھے، اُمت اسلامیہ ہند پر کفر کی جو یلغار ہورہی تھی، اس نے ان کی کروٹوں کو بے سکون کرکے رکھ دیا تھا؛ اسی لئے حضرت نانوتویؒ کے یہاں ''تحقیق برائے تحقیق'' کا ذوق نہیں تھا؛ بلکہ زبان جب بھی کھلتی، قلم جب بھی جنبش کرتا اور دل ودماغ جب بھی فکر ونظر کا سفر طے کرتا تو اس کا مقصد ومنشاء ایک ہی ہوتا تھا اور وہ مقصد جلیل تھا اسلام کی دعوت واشاعت اور دین حق کی حفاظت وحمایت، یہ وہ زمانہ تھا جب ایک طرف عیسائی اور دوسری طرف آریہ سماجی پوری قوت کے ساتھ اسلام پر حملہ زن تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رشتہ نبی عربی ﷺ کے لائے ہوئے دین متین سے کٹ جائے اور ان کی ثروت ایمانی لوٹ لی جائے، اللہ تعالیٰ نے اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے جن عبقری شخصیتوں کو پیدا فرمایا، ان میں سرفہرست مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات گرامی ہے؛ اس لئے فطری طور پر حضرت نانوتویؒ کا اصل موضوع علم کلام تھا، مولانا کی زیادہ تر تقریریں اور تحریریں عقلی طور پر اسلام کی حقانیت کے اثبات اور عیسائیت اور ہندومت کی رد میں ہیں، ان کا مواد اتنا وقیع، مخالفین کے لئے اس درجہ مؤثر اور معاندین کے لئے مسکت ہے کہ آج بھی اس کی افادیت مسلّم ہے اور اس کی قدر وقیمت میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔

اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کی خداداد ذہانت وذکاوت، حدیث کی تدریس اور اس کے ساتھ ساتھ رجال کار کی تیاری اور حدیث وفقہ کے میدان میں افراد سازی اور مردم گری سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ حضرت نانوتویؒ ان فنون میں بھی یگانۂ روزگار تھے، لیکن کچھ تو ان فتنوں کا مقابلہ — جو یقیناً اس عہد میں کفر وارتداد کے فتنہ کا مقابلہ تھا — اور کچھ کمال اخلاص کی وجہ سے اخفاء حال کا غلبہ اور نام ونمود سے دوری کی بنا پر حدیث وفقہ بلکہ علم کلام کے علاوہ دوسرے موضوعات پر تصنیف وتالیف کی طرف یا تو آپ کی توجہ نہیں ہوئی یا موقع

نہیں ملا؛ اس لئے اس موضوع پر بھرپور تفصیلی تجزیہ پیش کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے۔

تاہم اس سلسلے میں مولانا نانوتویؒ کی تحریر میں جو اشارات ملتے ہیں اور ضمنی طور پر حدیث وفقہ سے متعلق جو مباحث آ گئے ہیں، ان سے آپ کے فکری منہج کا اندازہ ہوتا ہے، اس سلسلے میں جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے، وہ یہ ہے کہ عام طور پر علماء اُصول لکھتے ہیں کہ احناف کا طریق یہ ہے کہ اگر روایتیں متعارض ہوں تو اولاً دیکھتے ہیں کہ کیا ایک روایت کے منسوخ اور دوسرے کے ناسخ ہونے پر کوئی دلیل موجود ہے؟ اگر نسخ کی دلیل مل جائے تو نسخ کا فیصلہ کرتے ہیں، ورنہ پھر اسبابِ ترجیح پر غور کرتے ہیں اور کوئی وجہ ترجیح ہاتھ آ جائے تو ترجیح سے کام لیتے ہیں، اگر کوئی وجہ ترجیح موجود نہ ہو تو پھر تطبیق وتوفیق کی کوشش کرتے ہیں، اگر تطبیق کی کوئی راہ نہ نکل سکے (جس کی شاید ہی کوئی مثال مل پائے) تو پھر دونوں دلیلوں کو ساقط الاعتبار سمجھتے ہوئے "**اذا تعارضا تساقطاً**" پر عمل کرتے ہیں؛ لیکن حضرت نانوتویؒ کا مذاق یہ ہے کہ ترجیح کی بجائے تطبیق وتوفیق کا راستہ اختیار کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، کوئی حدیث عمل سے رہ نہ جائے؛ چنانچہ حضرت نانوتویؒ نے غیر مقلد حضرات کے رد میں جو رسائل لکھے ہیں، جیسے "الحق الصریح" اور "توثیق الکلام" ان میں احادیث سے متعلق مباحث میں یہ فکر پوری طرح نمایاں ہے، یہی وہ مذاق قاسمی ہے جس کو عامۃً حلقہ دیوبند کے اہل علم نے اختیار کیا ہے اور یہ احادیث کے سلسلہ میں دیوبند کی امتیازی فکر اور اس کی شناخت ہے۔

بلکہ حضرت نانوتویؒ کا ذوق تو یہ ہے کہ جو احکام منسوخ ہیں، اگر فی نفسہ ان کی مشروعیت باقی ہو تو اس کو بھی مستحب کے درجہ میں رکھا جائے؛ تاکہ ان پر بھی فی الجملہ عمل ہو جائے اور رسول اللہ ﷺ کے ہر قول وفعل کی فی الجملہ اتباع ہو جائے؛ چنانچہ آپ کی رائے ہے کہ "گو پچاس نمازیں منسوخ ہیں؛ لیکن استحباب کے درجہ میں ہنوز باقی ہیں" پھر ایک نکتہ لکھا ہے کہ تتبع سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کا معمول شب وروز میں پچاس رکعت پڑھنے کا تھا۔

نسخ کے بارے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ جہاں تک ممکن ہو نسخ کم سے کم

مانا جائے جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان ہے، خود حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں ''نسخ خلاف اصل ہے، تامقدور اس سے احتراز مناسب ہے''، پھر جیسا کہ امام سرخسیؒ وغیرہ عام اُصولیین احناف نے لکھا ہے کہ عام کی تخصیص یا مطلق کی تقیید نسخ کے حکم میں ہے، یہی رائے حضرت نانوتویؒ کی بھی تھی، اسی طرح آپ نص کے ظاہری الفاظ پر عمل کرنے کو بمقابلہ اس کی تاویل وتوجیہ کے انسب خیال کرتے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں: ''تاویل کرنی یا تخصیص کرنی جس کا حاصل نسخ ہے زیبا نہیں''۔ (مجموعۂ ہفت رسائل: ۳۳۵)

''قرأۃ فاتحہ خلف الامام'' کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کی اپنی مستقل توجیہ ہے اور وہ یہ کہ مقتدی کے سورۂ فاتحہ پڑھنے اور نہ پڑھنے کا تعلق اس اصل سے ہے کہ امام مقتدیوں کا نائب ہوتا ہے اور اسی کی نماز اصل ہوتی ہے، امام کی حیثیت نماز میں بتدریج پایۂ تکمیل کو پہنچی ہے، ابتداء میں سلام وکلام بھی جائز تھا، اسے منسوخ کیا گیا، پھر مقتدی سورۂ فاتحہ کے ساتھ ساتھ ضم سورۃ بھی کیا کرتے تھے تو ضم سورۃ کا حکم منسوخ ہوا، پھر مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ پڑھنے کا حکم بھی منسوخ ہوگیا؛ تاکہ امام کی نیابت اور نماز میں اس کے ضامن ہونے کی کیفیت آہستہ آہستہ درجۂ کمال کو پہنچ جائے۔

موضوع قرآن کا ہو یا حدیث کا یا علم کلام کا، حضرت نانوتویؒ کا منہج فکر اور طریقۂ استدلال زیادہ تر اُصولی ہوتا ہے اور متکلمانہ طرز واُسلوب سے خالی نہیں ہوتا، مثلاً اسی 'قرأۃ فاتحہ خلف الامام' کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ کا نقطۂ نظر ہے کہ نماز میں اصل حیثیت امام کی ہے، مقتدی کی حیثیت محض تابع کی ہے، خود ان ہی کے الفاظ میں: ''امام موصوف بالذات بالصلوٰۃ ہے اور مقتدی موصوف بالعرض'' اور قاعدہ یہ ہے کہ احکام شرعیہ کے مخاطب وہ لوگ ہوتے ہیں جو اصل اور حضرت نانوتویؒ کی زبان میں ''موصوف بالذات'' ہوں، اس طرح گویا مقتدی اس آیت کے مخاطب ہی نہیں ہیں۔

حضرت نانوتویؒ کے ذہن رسا نے ''**لا صلوٰۃ الا بفاتحۃ الکتاب**'' کی بابت ایک اور نکتہ اخذ کیا ہے اور یقیناً وہ ان کے تفقہ پر دال ہے، ان کا خیال ہے کہ صلوٰۃ کا اطلاق کم سے

کم ایک رکعت پر ہوتا ہے، گویا صلوٰۃ کا طول ایک رکعت ہے، جس کے لئے سورۂ فاتحہ کافی ہے تو اسی طرح چوں کہ مقتدی امام کا تابع ہے، اس لئے امام کے ساتھ مل کر مقتدیوں کی نماز ایک نماز ہے؛ لہٰذا چوں کہ اس حدیث میں ایک صلوٰۃ کے لئے ایک سورۂ فاتحہ کو کافی قرار دیا گیا ہے؛ اس لئے ان دونوں کی مجموعی نماز کے لئے ایک ہی سورۂ فاتحہ کافی ہو جائے گی، جو امام کی قرأت سے پوری ہو جاتی ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کتاب وسنت کے غواص ہیں اور اپنی ذہانت اور قوتِ اخذ واستنباط سے الفاظ کی تہہ میں ایسے ایسے معانی ڈھونڈ نکالتے ہیں کہ عام اہل علم کو شاید اس کی ہوا بھی نہ لگے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ حدیث کے رجال، اس کے درجہ ومقام اور جن احادیث سے استدلال کیا جا رہا ہے، ان کے اطراف اور مختلف روایتوں میں الفاظ کا فرق اور احکام کے استنباط میں اس کے اثر پر بھی آپ کی گہری نظر تھی اور اُصول حدیث میں اہل حجاز اور اہل عراق دونوں کے نقاطِ نظر اور طریقہ فکر کو ملحوظ رکھتے تھے؛ چنانچہ اپنے رسالہ ''توثیق الکلام'' اور ''**الدلیل المحکم** '' میں محمد بن اسحٰق کے بارے میں علماء جرح وتعدیل کا اختلاف، بعض احادیث موقوفہ کا احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہونا، مؤطا امام محمد کی ایک روایت کے علی شرط الشیخین ہونے کا ذکر موجود ہے، یہ بھی لکھا ہے کہ مقتدی کے لئے تتبع سکتات یا سکتۂ طویلہ بین الفاتحہ والسورۃ پر کوئی مرفوع روایت موجود نہیں۔

تاہم اس میں شبہ نہیں کہ حضرت نانوتویؒ کے احادیث سے استدلال میں درایت کا پہلو غالب ہے، جو ایک مشکل کام ہے، کیوں کہ روایت تو محض نقل و حکایت ہے، حضرت نانوتویؒ نے اس بات کی طرف بار بار اشارہ فرمایا ہے :

قوتِ روایت باعتبار درایت قوتِ سند سے بڑھ کر ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :

قوتِ درایت قوتِ روایت سے مقدم ہے۔

اسی لئے حضرت نانوتویؒ کی رائے ہے کہ ایسے رواۃ جو تفقہ میں فائق ہوں، دوسرے

راویوں پر ترجیح رکھتے ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

اگر روایت میں فقہاء کا اعتبار نہ ہوتو اوروں کا بہ درجہ اولیٰ نہ ہوگا۔

ایک اور موقعہ پر لکھتے ہیں :

یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ فقہاء کا زیادہ سند میں اعتبار ہو، اور کیوں نہ ہو کہ روایت بالمعنی اکثر ہوتی ہے اور اس میں فہم ہی کی زیادہ ضرورت ہے۔

تراویح کے مسئلے میں حضرت نانوتویؒ نے اپنے مکتوب میں حدیث مرسل کی حجیت پر قلم اٹھایا ہے، اس میں ایک اعتراض جو غیر مقلد عالم کی طرف سے کیا گیا ہے کہ'' **علیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین** ''میں سنت خلفاء راشدین سے سنت نبوی ہی مراد ہے؛ کیوں کہ جب تکرار معرفہ ہوتو وہ متحد المعنی ہوتا ہے، حضرت نانوتویؒ نے اس کا خوب مسکت جواب دیا ہے اور آیت قرآنی: ''**أبناء نا وأبناؤكم وأنفسنا وأنفسكم** '' سے استدلال کیا ہے، تراویح ہی کے مسئلے میں آپ کے اس مکتوب (جوالحق الصریح کے نام سے موسوم ہے) میں کئی اہم مباحث آگئے ہیں، من جملہ ان کے یہ ہے کہ احکام شرعیہ کا ثبوت صرف صحاح ستہ ہی سے نہیں ہوتا، ضعیف اور موضوع روایتوں میں فرق ہے، فضائل اعمال میں ضعیف روایتیں معتبر ہیں اور تراویح بھی فضائل اعمال میں سے ہے، اسی طرح اس ضمن میں آپ نے یہ بھی لکھا ہے کہ خبر واحد سے اعتقادی احکام ثابت نہیں کئے جاسکتے اور عملی احکام میں واجبات وسنن اس سے ثابت ہوسکتے ہیں، تراویح اور تہجد کے دو علیحدہ نماز ہونے پر بھی آپ نے گفتگو کی ہے، جس کو اس مسئلہ میں بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

''فیض قاسمیہ'' کا ایک مکتوب جو دیہات میں نماز جمعہ سے متعلق ہے، اہل علم کے لئے سرمۂ چشم کا درجہ رکھتا ہے، سورۂ جمعہ کی آیت: ''**اذا نودی للصلوٰۃ من یوم الجمعة الخ** '' کی ایسی بلیغ تفسیر ہے کہ شاید کہیں اور مل سکے، اس ایک ہی آیت سے حضرت نانوتویؒ نے جمعہ کے وجوب اور جمعہ کی صحت سے متعلق شرائط کو ثابت کیا ہے اور اس آیت سے ''جمعہ فی القریٰ''

کے مسئلہ میں حنفیہ کی طرف سے استدلال کیا ہے، غرض یہ مکتوب قوتِ استنتاج اور صلاحیت استنباط کا اعلیٰ نمونہ ہے۔

فقہ وحدیث سے متعلق ایک اہم فن ''اسرارِ شریعت کا ہے، کہ احکام شرعیہ کی حکمتیں اور مصلحتیں کیا ہیں؟ اس موضوع پر حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں ایسی قیمتی نکتہ سنجیاں اور حکمت آفرینیاں موجود ہیں کہ شاید ہی کہیں اس کی مثال مل سکے اور اس کی وجہ سے ظاہر ہے کہ حضرت نانوتویؒ متکلم اسلام تھے؛ لیکن علم کلام میں آپ کا نہج خالصۃً نظری اور معقولی بحثوں کا نہ تھا؛ بلکہ آپ محسوسات اور مشاہدات سے مابعد الطبیعی اُمور پر ایسا استدلال کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو ایک روشن صبح کی طرح یہ اَن دیکھی حقیقتیں نظر آنے لگیں، مثلاً خود نماز ہی کے احکام میں قیام، رُکوع اور سجود، رات میں جہری اور دن میں سرّی قرأت، سلام، قبلہ کی شرعی حیثیت اور اس کی مصلحت وغیرہ پر ایسی گفتگو کی گئی ہے کہ بہت سی جگہ غالباً ایسی دل کو چھوتی اور عقل کو قائل کرتی ہوئی بات اس فن کے امام شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ **وذالک فضل اللہ یؤتیہ من یشاء۔**

حضرت نانوتویؒ کو حدیث وفقہ کے موضوع پر کوئی مستقل اور مربوط کام کرنے کا موقع نہیں ملا؛ لیکن بخاری شریف کے آخری پانچ اجزاء پر حواشی جو حضرت نانوتویؒ کے قلم سے ہیں، وہ خود آپ کی نگاہ کی وسعت کی دلیل ہیں، مولانا احمد علی صاحبؒ محدث سہارنپوری جیسے صاحب علم کے کام کو پورا کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا؛ لیکن مولانا سہانپوریؒ نے اس نوعمر معاصر عالم کو یہ عظیم الشان کام پورے اعتماد سے حوالہ فرمایا، یہ ایک طرف حضرت نانوتویؒ کے علمی جوہر اور دوسری طرف مولانا سہارنپوری کی جوہر شناسی کی واضح دلیل ہے، مولانا سہارنپوریؒ نے جب ان اجزاء کی تعلیق کا کام آپ کے سپرد فرمایا تو بعض لوگوں کو اس پر تامل ہوا؛ لیکن جب آپ نے اس کام کو مکمل فرمایا تو تمام ہی اہل علم نے اس پر آفریں کہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ حواشی حدیث کے اسناد و رجال اور معانی و مفاہیم دونوں پہلوؤں سے حضرت نانوتویؒ کی گہری نظر پر شاہد ہیں، ان میں کئی مواقع وہ ہیں، جہاں امام بخاریؒ نے

احناف کو ہدف تنقید بنایا ہے، ان مواقع پر آپ نے روایت و درایت دونوں پہلوؤں سے نہایت ہی عمدگی کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کو پیش فرمایا ہے اور حدیث وفقہ اور رجال کے بہت سے مراجع سے استفادہ کیا ہے، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب اس فن کی نادرونایاب کتب ہی نہیں آج جو متون متداول ہیں وہ بھی اہل علم کو دستیاب نہیں تھیں اور نگاہ شوق ان کو پانے کے لئے بے چین رہتی تھی؛ چنانچہ خود حضرت نانوتویؒ نے بعض مواقع پر کتابوں کی کمی اور عدم دستیابی کا رونا رویا ہے، ایسی صورتِ حال میں آپ نے اس کام کو انجام دیا، ان حواشی میں بہت سی مفید اور اہم بحثیں آگئی ہیں اور اگر ان کو ایک جگہ جمع کر دیا جائے تو یہ اہل علم کے لئے متاع گرانمایہ ثابت ہوگا۔

قضاء قاضی ظاہرا نافذ ہوگا یا باطنا؟ (ص:۱۰۳۰-۱۰۶۵) پڑوسی کے لئے حق شفعہ ہے یا نہیں؟ اس سلسلے میں احناف کا نقطۂ نظر اور امام بخاریؒ کی تنقید کا جواب (ص:۱۰۳۲) حانث ہونے سے پہلے کفارۂ قسم کی ادائے گی (ص:۱۰۱۸) قضاء علی الغائب (ص:۱۰۶۴) غلام مدبَّر کی بیع (ص: ۱۰٦٦) صوم وصال کی ممانعت (ص: ۱۰۷۵) وغیرہ پر نہایت نفیس فقیہانہ اور محدثانہ بحث ملتی ہے، اسی طرح گوہ کے گوشت کی بابت بحث کرتے ہوئے سند اور رجال پر بھی مبسوط اور چشم کشا کلام کیا گیا ہے۔ (ص:۱۰۷۹)

فقہ وحدیث میں ہم فرزندان قاسمی کے لئے سب سے اہم بات جو ہمارے لئے یقیناً اسوہ اور نمونہ ہے اور جس کو آج کے حالات میں خاص طور پر پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے، یہ ہے کہ حضرت نانوتویؒ کے یہاں مسائل میں کمالِ اعتدال اور تمام سلف صالحین کا غایت درجہ ادب واحترام ہے، نیز استنباط واستدلال میں کبھی عدل وانصاف کا دامن آپ کے ہاتھ سے نہیں چھوٹتا ہے، خود قرأت فاتحہ خلف الامام کے مسئلہ میں حضرت نانوتویؒ کے رجحان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ ترک قرأت اولیٰ ہے؛ لیکن قرأت بھی ناجائز نہیں، فرماتے ہیں :

ترک قرأۃ خلف الامام قرأۃ فاتحہ سے خیر اور احسن معلوم ہوتا ہے۔

ایک مقام پر غیر مقلد حضرات کی بے اعتدالی پر اظہارِ افسوس کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ہم کو دیکھئے باوجود توجیہات مذکورہ اور استماع تشنیعات معلومہ فاتحہ
پڑھنے والوں سے دست وگریباں نہیں ہوتے؛ بلکہ یوں سمجھ کر کہ ہم
تو کس حساب میں ہیں، امام اعظمؒ بھی باوجود عظمت شان امکانِ
خطاء سے منزہ نہیں، کیا عجب ہے کہ حضرت امام شافعیؒ صحیح فرماتے
ہوں گے اور ہم ہنوز ان کے قول کی وجہ کو نہ سمجھے ہوں؟

اپنے ایک مکتوب میں دیہات میں نماز جمعہ کے مسئلہ پر نہایت ہی مدلل اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے، لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی فرما دیا ہے کہ چوں کہ مسئلہ ظنی ہے اس لئے اگر کہیں دیہات میں جمعہ قائم کر لیا جائے تو اُلجھنے کی بھی ضرورت نہیں :

اگر کسے درد یہی جمعہ قائم کند دست و گریبانش نہ زنند

حضرت نانوتویؒ کا یہی وہ طریقۂ فکر ہے جو دیوبند کا اصل رنگ ہے اور جو حدیث وفقہ میں دیوبند کے محقق علماء کا اصل منہاج رہا ہے، یہی بات مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے یہاں ملتی ہے، احادیث میں تطبیق اور فقہی اختلافات میں توسع اور تسامح کی یہی کیفیت مولانا تھانویؒ کے یہاں ملتی ہے، ''حیلۃ ناجزۃ'' اس کا واضح ثبوت ہے اور یہی رنگ زیادہ وسعت اور عمق کے ساتھ حلقہ دیوبند کے سب سے بڑے محدث علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے یہاں موجود ہے، ''فیض الباری اور العرف الشذی'' کو کہیں سے دس بیس صفحہ بھی پڑھ لیا جائے تو علامہ کشمیریؒ کا یہ رنگ کسی حقیقت پسند عالم کی نظر سے مخفی نہیں رہ سکتا، افراط وتفریط سے بچتے ہوئے عدل واعتدال کی راہ اختیار کرنا، اعتقادی مسائل میں تصلب اور احکام فقہیہ میں دلائل کے اختلاف اور احوال زمانہ کی تبدیلیوں کے اعتبار سے توسع اور کتبِ فقہ کی ظاہری عبارتوں پر جمود واصرار کے بجائے سلفِ صالحین کے مقصد ومنشاء اور ان کے استنباط واجتہاد کی روح کو سمجھنا اور اس کو اپنے لئے چراغِ راہ اور خضرِ طریق بنانا، یہ ہے بزرگانِ دیوبند کی اصل فکر جو میراث ہے، اس خانوادۂ فکری کے مورثِ اعلیٰ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اور فکر ولی اللہی کے خوشہ چیں اور نقیب وترجمان حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی۔

اخیر میں اس سیمینار اور سیمینار منعقد کرنے والے ذمہ داروں سے درخواست ہے کہ حضرت نانوتویؒ کی تحریروں میں حدیث وفقہ کی بحثیں جا بجا بکھری ہوئی ہیں، جن میں ایسے جواہر پارے موجود ہیں جو شاید کہیں نہ مل سکیں، ان کو ایک جگہ حدیثی اور فقہی افادات کے مجموعہ کی حیثیت سے جمع کر دیا جائے اور اسے حضرت نانوتویؒ کے الفاظ میں لکھنے کی بجائے آج کی زبان اور آج کے اُسلوب میں مرتب کیا جائے تو اس طرح انشاء اللہ علوم قاسمی کا احیاء ہو سکے گا اور اہل علم اور اصحاب فکر ونظر کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہوگا۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان۔

❁ ❁ ❁

فقیہ عصر مولانا رشید احمد گنگوہیؒ

چہ باید مرد را ؟ طبعِ بلندے ، مشربِ نابے
دلِ گرمے ، نگاہِ پاک بینے ، جانِ بے تابے!

درمیانہ قد،فراخ جبیں،بھویں گنجان اور کمان کی سی،آنکھیں بڑی اور سرمگیں،آنکھ کے چاروں طرف حلقے ،داڑھی گھنی ،سینہ کشادہ اور سینۂ وشکم ہموار، رنگ صاف ،انگلیاں سیدھی ، لانبی اور پُر گوشت ، آواز بلند اور باوقار ،خوش الحان ،خوش بیان اور خوش خط ، ہنسنا ہوتا تو مسکراتے ،بولتے تو اس طرح کہ ہر شخص سمجھ لے،تکلفات اور نمائش سے دور، بدعات اور رسمی خرافات سے نفور،علم وفن کے گوہر نایاب ،اتباع سنت میں اپنی مثال آپ ،شہرت و ناموری سے بیزار،سراپا عجز وانکسار،عابد شب بیدار بھی اور مجاہد کارزار بھی،علم وفن کی بزم میں بھی چہکتے اور گولہ وبارود کی رزم میں بھی چمکتے ،راتیں نالۂ نیم شبی اور آہ سحر گاہی میں بسر ہوتیں اور دن دین متین کی تعلیم میں گذرتا —— ان رنگا رنگ خوبیوں اور نوع بہ نوع کمالات کے خارجی وجود کا تصور کیجئے اور سمجھ لیجئے کہ یہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ ہیں۔

پیدائش کا سال ۱۲۴۴ھ م ۱۸۲۹ء ہے اور مہینہ ذوقعدہ،دن پیر کا،ضلع سہارنپور کے قصبہ گنگوہ کو وطن ہونے کی سعادت حاصل ہے،نسبتاً انصاری ہیں اور حضرت ابوایوب انصاریؓ کی نسل سے ہیں،والد ماجد کا نام ’’ہدایت احمد‘‘ تھا،جو بڑے علماء میں تھے اور کتاب وسنت پر گہری نگاہ رکھتے تھے ،ابتدائی تعلیم اپنے ماموں مولوی محمد تقی ،محمد بخش رام پوری اور قاضی احمد الدین جھلمی کے پاس ہوئی ،فقہی کتابیں اپنے زمانہ کے مشہور استاذ اسلامیات مولانا مملوک علی نانوتوی سے پڑھیں ،یہیں سے مولانا گنگوہی اور مولانا نانوتوی کے درمیان رفاقت کا رشتہ قائم ہوا، جو آخر تک باقی رہا،حدیث شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ سے پڑھی اور انھیں سے حدیث کی

اجازت حاصل کی —— بیعت وارشاد کا تعلق مولانا شیخ محمد تھانویؒ سے تھا، انھیں سے بیعت ہوئے، یہیں تربیت پائی اور تصوف کے چاروں سلاسل سے اجازت حاصل کی، پھر بعد کو مشہور بزرگ حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی تربیت میں بھی رہے، حاجی صاحب سے آپ کو جو غیر معمولی تعلق رہا، اسے عشق سے کم اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

مولانا گنگوہیؒ کی زندگی کا ایک دور سیاسی بھی رہا ہے، ۱۸۵۷ء مطابق ۱۲۷۵ھ میں معرکۂ آزادی کا وہ ہولناک واقعہ پیش آیا، جسے انگریز ''غدر'' کہتے تھے، اس نے پورے شمالی ہند کو ایک سیاسی بھونچال اور ہنگامہ خیز و پرشور حالات میں مبتلا کر دیا تھا، ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہندوستان سے انگریزوں کا چل چلاؤ ہے؛ لیکن افسوس کہ اس اقدام کے پیچھے کوئی منظم پروگرام اور مرتب منصوبہ نہیں تھا اور اس اہم اور مشکل کام کے لئے جس تیاری اور تنظیم کی ضرورت تھی، اس کا فقدان تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی یہ بغاوت طاقت کے زور سے کچل دی گئی اور ہندوستانیوں کا سارا جوش وخروش کافور ہوگیا، اب صورتحال یہ تھی کہ ہر شخص اپنے اوپر تلوار لٹکی ہوئی محسوس کررہا تھا اور یہ کہنا مشکل تھا کہ کب کون دارورسن کی زینت بن جائے؟

عین اسی وقت مولانا گنگوہیؒ گرفتار کر لئے گئے، گرفتاری کی بنیاد یہ تھی کہ شاملی کے میدان میں حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے مختصر سے قافلہ اور انگریزوں کی بندوق سے لیس فوج کے درمیان ہونے والے معرکہ میں شریک تھے اور اس منصوبہ کے ایک اہم اور فعال ستون تھے، مقدمہ چلا اور توقع کے مطابق آپ بھی ان مجرموں اور بے گناہ گنہگاروں کے کٹہرے میں کھڑے کر دیئے گئے، جن کو پھانسی دیئے جانے کا فیصلہ کیا گیا تھا؛ لیکن انگریزی عدالت نے جس ''رشید احمد'' کی موت کا فیصلہ کیا تھا، خدا کی عدالت اس کو زندہ رکھنا اور اس سے دین متین کی پاسبانی کے لئے مزید کام لینا چاہتی تھی؛ چنانچہ یہی ہوا، چھ ماہ تک آپ کو قید کی زندگی بسر کرنی پڑی اور اس ''سنت یوسفی'' میں ابتلاء وآزمائش کے وہ سارے نازک موڑ آئے، جو ایک راہ حق کے مسافر کے سامنے آتے ہیں، مگر آپ برابر ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ کرتے

رہے، بزدلی اور مایوسی نے کبھی اپنا سایہ نہ ڈالا اورعزم وحوصلہ نے کبھی ساتھ نہ چھوڑا؛ یہاں تک کہ آپ بری ہوگئے اور رہا کردیئے گئے۔

فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی مملکت پر کفار غالب آجائیں اور اسلامی حکومت، غیر اسلامی حکومت میں تبدیل ہوجائے تو بھی مسلمانوں پر واجب ہے کہ بطور خود باہمی رضامندی سے ایک امیر ووالی منتخب کرلیں، جس کے حکم سے جمعہ وعیدین کی نمازیں ادا کی جائیں اور اس کے مقرر کئے ہوئے قاضی مسلمانوں کے مقدمات شرعی احکام وقوانین کی روشنی میں فیصل کیا کریں، چنانچہ ہندوستان پر برطانوی تسلط کے ساتھ ہی شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے ہندوستان میں ''قیام امارت'' کا فتویٰ دیا تھا، مولانا گنگوہی نے اپنے عہد میں بعض بزرگوں کی مدد سے شرعی امارت کا یہ نظام بھی قائم فرمایا، حاجی امداداللہ مہاجر مکی اس کے امیر منتخب ہوئے اور انھوں نے مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کو سپہ سالار اور مولانا گنگوہیؒ کو اس چھوٹی سی اسلامی امارت کا —— جو تھانہ بھون اور اس کے مضافات پر قائم تھی —— قاضی مقرر فرمایا۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب حکومت کا جور وستم حد سے گذر گیا، تو اس بات کا قوی اندیشہ پیدا ہوگیا کہ یہ حضرات بھی تختۂ دار پر چڑھا دیئے جائیں گے اور مولانا گنگوہیؒ کے سلسلہ میں تو انگریزی حکومت نے فیصلہ بھی کردیا تھا، ان حالات میں حاجی امداداللہ صاحبؒ افغانستان کی راہ سے مکہ مکرمہ کو ہجرت کرگئے اور مولانا گنگوہیؒ گنگوہ میں گوشہ نشیں ہوگئے، مولانا گنگوہی کی زندگی کا بڑا حصہ قرآن و حدیث کی اشاعت، ہندوستان کی معقولات پرست درسگاہوں اور منطق وفلسفہ کے مفروضات وتخیلات کی صداؤں سے گونجنے والے مدارس کے بیچ حدیث نبوی کو عام کرنے اور علوم دینیہ کی اشاعت میں صرف ہوا۔

یوں تو انھوں نے تمام ہی اسلامی علوم —— فقہ، اُصولِ فقہ، تفسیر، اُصولِ حدیث وغیرہ —— کی تعلیم دی ہے؛ لیکن آپ کی عمر کا بڑا حصہ خالصتاً حدیث نبوی کی تدریس میں گذرا ہے، آپ کے سامنے گنگوہ کی اس چھوٹی سی خانقاہ میں —— جو خانقاہ بھی تھی اور مسجد بھی، مدرسہ بھی

تھا اور دار الافتاء بھی —— سینکڑوں آدمیوں نے آکر تلمذ کا شرف حاصل کیا، آپ ''صحاحِ ستہ'' کی تمام کتابوں کا درس دیا کرتے تھے، ''سنن ترمذی'' کو پہلے پڑھاتے اور خاص اہتمام سے پڑھاتے، آپ کے انداز تدریس پر محدثانہ رنگ غالب تھا، متعارض احادیث کو تطبیق دینے میں ید طولیٰ حاصل تھا، اُصولِ حدیث پر گہری نگاہ تھی، اسماء رجال جیسے مشکل فن میں آپ اپنے عہد میں یگانہ شمار کئے جاتے تھے، صحیح بخاری اور صحیح ترمذی پر آپ کی درسی تقریر ''لامع الدراری'' اور ''الکوکب الدری'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، جو اپنے اختصار کے باوجود بڑی جامع شرح ہے۔

عام طور پر فقہ و حدیث کے درس میں اساتذہ جب فقہی نوک جھونک کا آغاز کرتے ہیں اور کسی ایک مسلک کو ثابت کرنے پر اترتے ہیں تو گفتگو کا لب لہجہ کچھ ایسا ہوتا ہے کہ گویا اُن خاص امام کے علاوہ دوسرے فقہاء کی رایوں کے لئے کوئی عقلی اور شرعی بنیاد ہی نہیں ہے؛ بلکہ کبھی تو معاملہ اس سے بھی آگے چلا جاتا ہے اور دوسرے ائمہ پر زبان درازیاں ہونے لگتی ہیں، مولانا گنگوہی اس معاملہ میں بہت محتاط اور معتدل تھے اور درس میں بھی ان کا یہی رنگ رہتا تھا، یہاں تک کہ نفس تقلید میں بھی حد سے بڑھنا آپ کو پسند نہ تھا، بعض طلبہ عصبیت میں محدثین سے بدظن ہو جاتے تو مولانا تقریر کا رُخ پھیر دیتے اور کلام کا ڈھنگ بدل دیا کرتے، جس وقت کسی طالب علم کی زبان سے کسی محدث پر اعتراض یا تنقیصِ شان کا کلمہ سنتے تو چہرہ پر کراہیت کا اثر پیدا ہوتا اور سبق میں بجائے ترجیح مذہب حنفیہ دیگر مذاہب مثل امام بخاری وغیرہ کی وجوہ ترجیح بیان فرمانے لگتے۔ (تذکرۃ الرشید:۹۱/۱)

مولانا سید مومن علی صاحب آپ کے پہلے اور مولانا یحییٰ کاندھلوی آپ کے آخری شاگرد ہیں، ۱۲۶۵ھ مطابق ۱۸۳۸ء سے آپ نے تدریسی خدمات کا آغاز کیا، اور ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۰ء تک حج اور قید و بند کی کچھ مختصر سی مدت کے علاوہ پورے پچاس سال آپ کا یہی مشغلہ رہا، مولانا گنگوہی کا تعلیمی نقطۂ نظر اپنے زمانہ کے مروجہ تعلیمی ڈھانچہ سے بہت کچھ مختلف تھا، عام طور پر دینی مدارس میں معقولات یا معقولی طرز و اُسلوب پر لکھی گئی تصانیف کو غلبہ حاصل تھا۔

اس کے برخلاف مولانا رشید احمد گنگوہی کا تعلیمی نقطۂ نظر بڑی حد تک وہ تھا، جو شاہ ولی اللہ دہلوی صاحبؒ کی فکر تھی، وہ معقولات کو نہ صرف یہ کہ نصاب میں داخل نہ کرتے تھے؛ بلکہ اس سے نفرت بھی کرتے تھے؛ چنانچہ ان کے تذکرہ نگاروں کی روایت ہے کہ منطق فلسفہ وغیرہ کو مخالفت شرع کے باعث ناجائز فرماتے تھے اور اس درجہ تنفیر دلایا کرتے تھے کہ حد نہیں (تذکرۃ الرشید) اور فرمایا کرتے تھے کہ اس منطق وفلسفہ سے تو انگریزی بہتر ہے کہ اس سے دنیا کے نفع کی اُمید تو ہے۔ (تذکرۃ الرشید:۵۰/۲)

مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ نے اپنی کتاب ''علماء ہند کا شاندار ماضی'' میں مولانا گنگوہی کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے خواب میں دیکھا کہ دارالعلوم کے احاطہ مولسری میں ایک سیاہ کتا آ گیا ہے، جسے ہم نے بھگا دیا ہے، آپ نے اس کی تعبیر یہ نکالی کہ منطق وفلسفہ کو دیوبند کے نصاب تعلیم سے نکال دیا جائے اور آپ نے اس پر عمل بھی فرمایا، مگر پھر مجلس شوریٰ نے ایسی تمام کتابوں کو داخل نصاب کر دیا۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی خدمت کی دو جہتیں ایسی ہیں جو ان کو اپنے معاصرین میں امتیازی حیثیت عطا کرتی ہیں، ایک درس حدیث کی خدمت، یوں تو آپ ابتدا ہی سے مختلف علوم وفنون کا درس دیا کرتے تھے؛ لیکن جب آپ تیسرے اور آخری حج سے ۱۳۰۰ھ میں واپس ہوئے تو آپ نے صحاح ستہ کا بالاستیعاب درس دینا شروع کیا اور ۱۳۱۴ھ تک —— جس کے بعد آپ کی بینائی ختم ہوگئی —— صحاحِ ستہ کا درس دیتے رہے، یہ آپ کے درس کی مقبولیت ہے کہ دور دور سے طالبانِ علم آپ کے یہاں حاضر ہوتے اور اپنی علمی پیاس بجھا کر واپس ہوتے، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ (والد ماجد شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ) آخری شاگردوں میں تھے اور اللہ کے یہاں یہ بات مقدر تھی کہ ان ہی کے ذریعہ اس خورشیدِ علم کی کرنیں بعد کے لوگوں تک پہنچیں؛ چنانچہ آپ نے بخاری اور ترمذی کے درسی افادات ''لامع الدراری'' اور ''الکوکب الدری'' کے نام سے جمع فرمایا، یہ کتابیں اختصار کے باوجود علم کا مغز

ہیں اور بعض جگہ سطر دو سطر میں وہ طویل بحثیں آگئی ہیں، جن کے لئے دوسرے شارحین نے کئی کئی صفحات لکھے ہیں، اس حقیر کے لئے ایک سعادت کا پہلو یہ ہے کہ اس کے جد امجد مولانا عبدالاحد صاحبؒ کو بھی حضرت گنگوہی سے درست حدیث میں تلمذ کا شرف حاصل ہے۔

آپ کا دوسرا امتیاز بدعت کی مخالفت ہے اور اس پہلو سے اُمت کی اصلاح و ہدایت پر آپ نے خصوصی توجہ دی ہے، آپ گنگوہ میں مولانا عبدالقدوس گنگوہیؒ کے مزار سے متصل ہی مقیم تھے، جہاں بڑے دھوم دھام سے عرس ہوا کرتا تھا، عام طور سے ایسے مراکز کی قربت نرم گوشہ پیدا کردیتی ہے؛ لیکن سنت سے محبت کا نتیجہ ہے کہ آپ کو بدعات سے سخت نفرت تھی، محفل میلاد، عرس، قبر کا طواف، اہل قبر سے استعانت، مروجہ فاتحہ، تیجہ، چہلم، قبر پر اذان، گیارہویں اور رجبی، محرم کی بدعات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے علم غیب کا اثبات وغیرہ پر آپ نے سخت نکیر فرمائی ہے، آپ اپنے متوسلین کو پابند فرماتے تھے کہ جس زمانہ میں گنگوہ میں عرس ہو، اس زمانہ میں ملاقات کے لئے نہ آئیں کہ ان کا آنا اہل بدعت کے لئے تکثیر سواد کا باعث ہوگا؛ اسی لئے ہندوستان میں اہل بدعت کو سب سے زیادہ تکدر شاہ اسماعیل شہید اور مولانا گنگوہی سے ہے؛ کیوں کہ ان دونوں بزرگوں نے کسی رورعایت کے بغیر بدعات کا رد فرمایا اور اُمت کو فساد عقیدۂ وعمل سے بچانے کے سلسلہ میں کوئی نرم روی اختیار نہیں کی، یہاں تک کہ بعض مسائل میں آپ نے اپنے شیخ حاجی امداد اللہ صاحبؒ سے بھی اختلاف کیا اور ہمیشہ شریعت کو طریقت پر غالب رکھا۔

حدیث کے علاوہ آپ کا خاص موضوع فقہ وفتاویٰ تھا، آپ کے فتاویٰ کا ایک مجموعہ ''فتاویٰ رشیدیہ'' کے نام سے ایک جلد میں چھپ چکا ہے؛ لیکن یہ آپ کے تمام فتاویٰ نہیں تھے، محبّ گرامی جناب مولانا نورالحسن راشد کاندھلوی نے آپ کے بہت سے فتاوی حاصل کئے اور انھیں بڑے سلیقہ سے مرتب کیا ہے، یہ بڑے اہم فتاوی ہیں، جن سے فقہ میں آپ کی غیر معمولی بصیرت ظاہر ہوتی ہے؛ اسی لئے علامہ انور شاہ کشمیریؒ آپ کو ''فقیہ النفس''

کہتے تھے اور علامہ شامی پر فائق قرار دیتے تھے، فقہی مباحث میں آپ کا وہ رنگ اعتدال پوری طرح واضح ہے، جو عام طور پر حدیث وفقہ کی جامع شخصیتوں میں پایا جاتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے فتاویٰ سے مختلف علمی، دینی وملی مسائل کے بارے میں ان کی فکر واضح ہوتی ہے، جیسے فلسفہ کی کتاب ''صدرا'' کی تدریس پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

> تعلیم صدرا خود ناپسندیدہ ہے، انصاف کرنا چاہئے کہ اثبات ہیولیٰ وصورت سے کیا مطلب ہے؟ ابطال قیامت واقرار تعدد قدماء، وعدم اختیار جل علامہ علیٰ شانہٗ نہیں تو کیا ہے؟ ان عقائد فاسدہ کومنھ سے نکالنا موجب ظلمت ہے...... پہلے زمانہ میں یہ ضرورتِ ابطال مذہب فلاسفہ اور معتزلہ، اس کو پڑھنے کی ضرورت تھی کہ مطلع ہوکر مثل ان قواعد کے جواب دیویں، اب کیا ضرورت ہے؟ بالکل غلط ہے، سب حیلہ ہے، لہٰذا اس نوکری کو جائز نہیں سمجھتا ہوں۔
>
> (باقیات فتاویٰ رشیدیہ:۴۰۲)

انگریزی زبان کی تعلیم اور وہ بھی کسبِ معاش کے سلسلہ میں فرماتے ہیں :

> انگریزی زبان کا سیکھنا مباح ہے، نفسِ تعلیم زبان میں کوئی معصیت نہیں، مگر امر مباح اختلاط غیر مشروع سے ناجائز ہوجاتا ہے۔

حضرت گنگوہیؒ تقلید کو مباح اور عوام کے لئے واجب قرار دیتے ہیں، آپ ائمہ اربعہ کی فقہ کو یکساں قابل احترام سمجھتے ہیں؛ چنانچہ ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں :

> تقلید ایک امام کی درست ہے اور عوام کو بسبب خلاف اور فساد فتنہ کے ایک کی تقلید واجب ہے اور یہ کہنا کہ 'یہ قول فلاں امام کا مخالف قرآن وحدیث کے ہے، کسی جاہل یا کم پڑھے کا ہے' نہ ماننا چاہئے، ائمہ نے جو کچھ فرمایا ہے، قرآن وحدیث اور اقوالِ صحابہ ہی سے

استخراج کیا ہے، اس کے فہم کو بھی عقل اور علم کامل درکار ہے، ایسی بات کچے پڑھے ہوئے کہتے ہیں، اہل علم جانتے ہیں کہ سب ائمہ نے موافق قاعدہ شرع فرمایا ہے۔

اسی طرح کے ایک اور سوال کے جواب میں کہتے ہیں :

عامی کو کسی عالم محقق متدین سے کافی اور فرض امر سوال سے ادا ہوجانے کو بس ہے، خواہ ایک ہی عالم سے پوچھا کرے، خواہ متعدد علماء سے اور خواہ ایک مذہب معین کے علماء سے، خواہ مذاہب متعددہ کے ...... پس فروع میں ہر چند متعدد علماء مذاہب سے سوال کرنا درست ہے، خصوصاً احوط کا اختیار کرنا، مگر حسب مشاہدہ زمانہ موجود یہ بھی محقق ہے کہ عوامی کو متعدد مذاہب کے علماء سے سوال کرنے میں ابتلاء مرض تلہی فی الدین کا ہوجاتا ہے اور لا ابالی دین میں بن جاتا ہے اور یہ ممنوع اور معیوب ملت غرا میں ہے ......لہٰذا عامی کو مذہب معین سے سوال جملہ مسائل کا کر کے عامل ہونا ضرور ہوگا۔

اسی طرح آپ نے ایک فتوے میں غیر مقلد کے مسجد سے باہر نکال دینے کو گناہ اور ظلم قرار دیتے ہوئے لکھا ہے :

یہ حرکت امام کی اچھی نہیں، اس سے باز آنا اور توبہ کرنا واجب ہے۔

مولانا گنگوہی کے فتاویٰ میں بھی اس بات پر خاص توجہ دی جاتی تھی کہ لوگ بدعت میں نہ پڑ جائیں، بہت سے لوگ پیرانِ طریقت کی بات کو احکام شرعیہ میں بھی معتبر ماننے لگتے ہیں، مولانا گنگوہی اس کی تردید کرتے ہوئے ایسے مسائل میں ان کی تقلید واتباع سے منع کرتے ہیں؛ لیکن سجدۂ تحیت کو منع کرتے ہوئے جو لوگ نصوص سے استشہاد کرتے ہوئے سجدۂ تحیت کو جائز قرار دیتے ہیں، ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ بدعتی نہیں ہیں، فتویٰ کے الفاظ اس طرح ہیں :

جس کام کے اولیاء مجتہد ہیں اس میں ان کی تقلید درست ہے، وہ علم باطن ہے، یہ (سجدۂ تحیت کے جواز وعدم جواز کا مسئلہ) علم ظاہر ہے، ایسے مشروط طور پر لوگ مبتدع نہیں۔

اگر کوئی مسلمان ایک شیخ سے بیعت ہو اور پھر دوسرے سے بھی بیعت ہو جائے تو آپ اسے جائز قرار دیتے ہیں :

دوسری جگہ بیعت کرنا فضل دوسرے سلسلے کو حاصل کرنے کو، یا برکت دوسرے میں شریک ہونے کو درست ہے؛ بشرطیکہ دوسرا شخص قابل بیعت ہو ورنہ کسی حال بیعت درست نہیں، خواہ اول ہو یا دوبارہ۔

جو لوگ تصوف سے اشتغال رکھتے ہیں، عام طور پر ان کا تصور یہ ہوتا ہے کہ ذکر و شغل کا درجہ اونچا ہے اور تعلیم و تدریس کم تر درجہ کا عمل ہے، حضرت گنگوہی نے ایک سائل کو ان کے سوال کا جواب دیتے ہوئے اس کا بڑا بہتر جواب دیا ہے :

اس واسطے ہی شغل کرنا، طالب علم و مدرس کو بندہ جائز نہیں جانتا اور ہمیشہ بیعت و شغل سے انکار کرتا ہے، وہی امر آپ کو پیش کیا، پس اب جس قدر ذکر اور شغل بدون حرج تدریس ہو سکے کر لیا کرو اور فکر ایسی خلوت اور استغراق کا ہرگز ہرگز مت کرنا: کہ یہ وسوسہ ہے اور کسی کے کہنے سننے سے تمام عمر کی محنت کو کہ علم ہے، رائیگاں مت کرنا اور حجت اللہ اپنے اوپر قائم کر کے معصیت میں مبتلا مت ہونا، اگر جورو بچہ کو چھوڑ کر بہ خیال درویشی نکلو گے، تو فردا قیامت کو حقوق العباد کا کیا بندوبست اور جواب دو گے؟ اور جو تعلیم درس کو چھوڑ کر نفع متعدی کو ترک اور نفع لازم کی تحصیل میں جو ہنوز موہوم ہے، مشغول ہو گے تو فخر عالم ﷺ کو کیا جواب دو گے کہ فرماتے ہیں "**بلغوا عنی ولو آیة، فیبلغ الشاهد الغائب**" اور دیگر احادیث، کہ جس

میں تبلیغ کو فرض اور علم کو واجب وعمدہ شغل اور عبادت فرض اس کو فرمایا ہے اور شغل وتصوف وریاضت کہ ادب ومستحب ہے، اس میں منہمک ہوکر فرض کو ترک کرکے کیا نفع حاصل کروگے، بجز مطالبہ عباد اور شارع علیہ السلام کے۔

اسی طرح آپ نے لکھا ہے کہ ذکر جہری کے جائز ہونے یا مکروہ ہونے میں فقہاء حنفیہ کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا ہے؛ البتہ اگر ریا اور دوسروں کو تکلیف پہنچنے سے خالی ہوتو اس کی گنجائش ہے — تصورِ شیخ کے بارے میں فرماتے ہیں :

......اب اس وقت میں اس کی اجازت شرعی نہیں معلوم ہوتی کہ شائبہ بت پرستی ہوگیا اور اس کی چنداں ضرورت بھی نہیں۔

ایک اور موقع پر لکھتے ہیں :

کسی بزرگ کو ذہن میں حاضر کرکے اس سے اپنا مطلب مانگنا شرک ہی معلوم ہوتا ہے؛ کیوں کہ ہر وقت حاضر ہونے والا اللہ تعالیٰ ہے، اس سے مرادات چاہئے اور احضار صورت شیخ سے شیخ حاضر نہیں ہوتا، پھر اس صورت وتماثل ذہن سے کچھ حاجت دینی ودنیوی طلب کرنا خود واہی امر ہوا، جس سے شارع علیہ السلام نے منع فرمایا، اگرچہ بسبب تاویل کے اس کو شرک نہ کہا جاوے، مگر بظاہر صورت شرک کی ہے؛ لہٰذا ترک اس کا واجب ہے، جو امر موہم معصیت کا ہو اس کو بھی ترک کرنا لازم دینی ہے۔

صوفیاء کی زبان سے جو بعض الفاظ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں نامناسب نکل جاتے ہیں، آپ نے ان سے متعلق ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا ہے :

حق تعالیٰ کی ذات مقدس پر اطلاق الفاظ مکروہ کا مثل بت وغیرہ کے حرام وموجب کفر کا ہوسکتا ہے، خواہ کوئی بولے، مشائخ کے فعل کی

تاویل کرنی چاہئے، اگرچہ بعید ہو، نہ یہ کہ حکم شرع کا ان کے فعل کے سبب بدلنا، حق تعالیٰ کے نام توقیفی ہیں، مثلاً جواد حق تعالیٰ پر بولنا درست اور سخی کہنا منع ہے، حکیم درست اور طبیب غیر جائز، پس ایسے مکروہ لفظ کس طرح درست ہو سکتے ہیں، کسی شیخ کے فعل کے سبب۔

پس مسئلہ عقائد کا مجمع علیہ اُمت کا اپنے حال پر رکھو، مشائخ کے قول وفعل کی کوئی تاویل کرو، یہ ہے حکم ادب شریعت کا، نہ یہ کہ مشائخ معدودہ کے فعل کو اصل ٹھہرا کر حکم شریعت کو منسوخ بناؤ کہ قواعدِ شرعی کسی شیخ سے ردورفع نہیں ہو سکتے۔

بادل، بجلی اور کڑک وغیرہ سے متعلق ایک صاحب نے سائنس دانوں کے نظریات کی بابت دریافت کیا، اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

شریعت ان اُمور کا انکار نہیں کرتی، ان میں کوئی بات خلاف قواعد شریعت نہیں۔

لباس میں غیر مسلموں کے تشبہ کا معیار اس طرح مقرر کرتے ہیں :

دور سے اگر کرسٹان (عیسائی) معلوم ہوتا ہو تو ناجائز ہے۔

غیر مسلم حضرات اپنے تہواروں کے موقع پر مسلمانوں کو جو تحفہ دیں، ان کے بارے میں لکھتے ہیں :

اگر ہنود اپنے تہوار میں بوجہ ملاقات اہل اسلام کو کھیل (بھنے ہوئے چاول یا مکئی یا جوار) بتاشہ، شیرنی وغیرہ لاکر دیں تو اس کا لینا اور کھانا درست ہے۔

فضائل اعمال میں ضعیف احادیث کے بارے میں افراط وتفریط پائی جاتی ہے، آپ کی رائے اس سلسلے میں اعتدال پر مبنی ہے :

حدیث ضعیف اگر سبب سوء حفظ راوی کے یا مرسل ہونے کے، تو

> اس پر عمل کرنا درست ہے، مگر راوی عادل ثقہ ہے، تو اس پر عمل کرنا درست ہے؛ اگر چہ اثبات حکم اس سے نہیں ہوسکتا، جب تک جبر اس ضعف کا نہ ہو جائے اور جو بسبب فسق اور کذب راوی کے یا بسبب اتہام وضع کے ہو، تو اس پر فضائل اعمال میں بھی عمل کرنا ناجائز ہے، شدید الضعف یہ قسم آخر ہے اور پہلی قسم میں ضعف ادنیٰ ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کے یہاں، جہاں دلائل کے اختلاف کی بنا پر فقہاء کے درمیان ہونے والے اختلاف رائے میں مسامحت کا رنگ ہے، وہیں بدعات کے بارے میں آپ کا لب ولہجہ سخت ہوتا ہے اور آپ اس میں کسی نرمی کے روادار نہیں ہوتے :

> ......لہٰذا جو امر اگر چہ فی حد ذاتہ مباح ہی ہو، مگر جب اس میں تشبہ ہووے گا تو وہ ناجائز ہو جائے گا، تو سوم، چہلم، عرس، کھانے پر قرآن پڑھنا وغیرہ اُمور سب ناجائز ہوتے، ...... یہ امر ثابت ہوا کہ کسی مباح ومندوب پر ایسا التزام کہ مثل واجب وسنت مؤکدہ کے ہووے اور اہتمام مثل واجب کے کیا جائے، بدعت ہے،......
> پس اہتمام موجود ویقین وتقسیم شیرینی اور تخصیص طعام شب براءت وعید اور تخصیص معانقہ عیدین کا اور قبور پر پھول کو ضروری جاننا اس قاعدۂ حدیث سے سب بدعت ہووے گا۔

چنانچہ آپ کے مجموعہ فتاویٰ میں رد بدعت پر بہت توجہ دی گئی ہے۔

آپ کی تالیفات زیادہ نہیں ہیں؛ لیکن مقدار کے اعتبار سے کم ہونے کے باوجود معیار کے اعتبار سے بڑے پایہ کی ہیں اور زیادہ تر کسی فکر باطل کے رد یا غلط فہمی کے ازالہ کے لئے لکھی گئی ہیں، **سبیل الرشاد، الرأی النجیح، اوثق العری، تصفیة القلوب، هدایة الشیعة، هدایة المعتدی** اسی نوعیت کی تالیفات ہیں، تصوف پر آپ کی کتاب 'امداد السلوک' اور احکام حج پر 'زبدۃ المناسک' بھی بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔

ہندوستان کی دو بڑی دینی درسگاہیں ـــــ دارالعلوم دیوبند اور جامعہ مظاہر علوم سہارنپور ـــــ کو آپ کی سرپرستی کا شرف حاصل رہا ہے، گویا آپ کی ذات قران السعدین تھی، اس سرپرستی کے دوران آپ نے کئی بصیرت مندانہ فیصلے کئے اور اس طرح اپنے ناخن تدبیر سے بعض قضایا کی عقدہ کشائی کی کہ اس نے بہت سے فتنوں کا سر کچل دیا اور اخلاص وللّٰہیت کے ساتھ قائم ہونے والے ان مراکز پر کوئی آنچ نہ آنے پائی، اخیر عمر میں نہ صرف علوم ظاہری؛ بلکہ تزکیہ واصلاح کے اعتبار سے بھی علماء، خواص اور عوام کا مرکز بن گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے باوجود اس کے کہ ایک حلقہ کی طرف سے آپ کی تکفیر کی مہم اپنے شباب پر تھی، ایسی قبولیت اور پذیرائی عطا فرمائی، جو کم لوگوں کے حصہ میں آئی تھی، ۹؍ جمادی الثانیہ ۱۳۲۳ھ مطابق ۱۱؍اگست ۱۹۰۸ء جمعہ کے دن آپ کی وفات ہوگئی، جب کہ آپ کی عمر ۷۸ سال سے زیادہ تھی۔

❁ ❁ ❁

بانی علی گڑھ تحریک سرسید احمد خاں

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتی ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

ہندوستان میں مسلمانوں کی عصری تعلیم میں حصہ داری کی جو بھی تاریخ لکھی جائے گی اوراس سلسلے میں ملتِ اسلامیہ کے جس محسن کا نام سب سے جلی اور روشن حرف میں لکھا جائے گا، وہ یقیناً سرسید احمد خاں ہوگا، جب مسلمان عصری تعلیم سے کٹے ہوئے تھے اور علم و دانش سے یہ محرومی زندگی کے مختلف شعبوں میں انھیں پسماندہ تر بناتی جارہی تھی، اس وقت سرسید نے علی گڑھ کے ایک قصبہ سے علم کا صور پھونکا اور یقیناً یہ ان کے خلوص کا نتیجہ تھا کہ یہ نوائے درد برصغیر کے چپہ چپہ تک پہنچ گئی، یہ سرسید کا ایسا احسان ہے جس سے برصغیر کے مسلمان کبھی سبکبار نہیں ہوسکتے۔

۵؍ذوالحجہ ۱۲۲۲ھ ۱۷؍اکتوبر ۱۸۱۷ء کو پیدا ہوئے' نام نامی سید احمد' والد کا اسم گرامی میر تقی، وطن دہلی مرحوم، نسباً سادات سے تھے اور دربار شاہی سے تعلق تھا، جو ۱۸۵۷ء تک رہا، خانوادہ دینی اور درویشی مزاج کا حامل تھا، تربیت والدہ کے سایۂ عاطفت میں ہوئی، عربی، فارسی، ریاضی اور طب کی تعلیم حاصل کی، ذکاوت خداداد تھی، ۳۲ سال کی عمر سے سرکاری ملازمت کی اور مختلف محکموں میں مختلف قسم کی خدمات انجام دیتے رہے، ۱۸۷۱ء میں عمر ملازمت تمام ہوئی، اسی دوران انگلستان کا سفر بھی ہوا، ۱۸۶۰ء کے بعد علی گڑھ ہی میں فروکش ہوئے اور مدرسۃ العلوم کی خدمت انجام دیتے رہے، ہندوستان کے مغلیہ دربار اور برطانیہ کی طرف سے مختلف خطابات سر، ڈاکٹر، جوادالدولہ، عارف جنگ وغیرہ سے نوازے گئے۔

سرسید احمد خاں کی زندگی پر فکری اعتبار سے تین ادوار گذرے ہیں، پہلے دور میں وہ ایک عام مسلمانوں کی طرح تھے اور خاندانی ورثہ میں عقائد اور دین کا جو حصہ ملا تھا، اسی پر قانع اور ایک معتدل مسلک کے علمبردار تھے، ان کا دادیہال اور نانیہال دونوں ہی دینی مزاج کا حامل تھا اور نانیہال کو امتیاز حاصل تھا کہ ان کا ارادتمندانہ تعلق خاندان ولی اللّٰہی سے تھا، اس رشتہ نے ان کی فکر کو اعتدال کی دولت سے بہرہ منداور ایمان ویقین کی حرات سے آشنا کیا تھا؛ البتہ اس وقت بھی ان کا رجحان ایک گونہ عدم تقلید کی طرف تھا، ان کے اس دور کی فکری اُفتادان کی تصانیف ''کلمۃ الحق، راہ سنت و بدعت، جلاء القلوب بذکرالمحبوب اور رسالہ تصور شیخ'' وغیرہ سے ظاہر ہے، انھوں نے اسی زمانہ میں امام غزالی کی ''کیمیائے سعادت'' اور ''احیاء العلوم'' کے کچھ ابواب کا اور شاہ اسماعیل شہید کی ''تحفۂ اثناعشریہ'' کے بعض حصوں کا ترجمہ کیا تھا، سرسید کا یہ فکری رنگ ١٨٥٧ء تک باقی رہا۔

١٨٥٧ء میں برطانوی ہند کے خلاف جو تحریک اُٹھی، وہ گویا اس دور میں ہندوستانیوں کی جنگ حریت کا آخری معرکہ تھا، اس کے بعد ہندوستان میں مکمل طور پر برطانوی حکومت قائم ہوگئی، سرسید اب اس نئے آستانہ اقتدار سے وابستہ ہوگئے، ١٨٥٧ء کے بعد ان کے فکر ومزاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا ہوگیا، وہ زمانہ تھا، جب فاتح قوم مفتوح کے جسم وملک سے گذر کر دل ونگاہ کو بھی فتح کر رہی تھی، سرسید بھی اسی کیفیت سے گذر رہے تھے۔

انھوں نے مسلمانوں کی بھلائی اسی میں سمجھی کہ ان کے اور انگریزوں کے درمیان جو خلیج حائل ہے، اسے پُر کیا جائے، دونوں میں فکری اور مذہبی ہم آہنگی پیدا کی جائے، مشرقی مسلمانوں کو مغرب کے پیمانۂ تمدن کی مئے ہوشربا سے سرشار ہونے کا موقع ملے اور نفرت کی بجائے محبت کی تخم ڈالی جائے، مسلمان انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک ترک کردیں اور انگریز مسلمانوں کے خلاف اپنا معاندانہ رویہ چھوڑ دیں۔

اس دور کی ان کی تمام تر تحریری اور تصنیفی سرگرمیوں کی روح یہی فکر رہی ہے، انھوں نے

'تحقیق لفظ نصاریٰ' لکھی اور حکومت برطانیہ کی اس غلط فہمی کا ازالہ کیا کہ لفظ نصاریٰ مسیحیت کے لئے عناداً یا از راہ نفرت لکھا جاتا ہے، انھوں نے اہل کتاب کے ساتھ کھانے کے شرعی آداب لکھے اور ثابت کیا کہ انگریزوں کے ساتھ ہم طعامی میں کوئی قباحت نہیں ہے، انھوں نے 'تاریخ سرکشیٔ بجنور' لکھی اور ثابت کیا کہ ۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء میں ہونے والی بغاوت سے مسلمانوں کا کوئی تعلق نہیں ہے، انھوں نے اسباب بغاوت ہند لکھی اور مسلمانوں کی براءت ظاہر کرنے میں پوری قوت صرف فرمائی ، انھوں نے ۱۸۶۰ء میں لائل محمڈ آف انڈیا نام سے اُردو اورانگریزی میں ایک جریدہ کا اجراء کیا، جس میں ۵۷ء کی تحریک حریت میں برطانیہ کی حکومت کے طرفدار مسلمانوں کے تذکرے بطور خاص کئے جاتے ، اپنی ادارت میں علی گڑھ سے ''سائنٹفک سوسائٹی'' اخبار نکالا، جو بعد کو ''علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ'' سے موسوم ہوا، اس میں بھی مسلمانوں اورانگریزوں کے سیاسی اتحاد پر مضامین لکھے۔

سرسید کی زندگی کا یہ دوران کے پہلے اور تیسرے دور کے درمیان ایک واسطہ اور پل کی حیثیت رکھتا ہے، پہلے دور میں وہ ایک روایتی مسلمان نظر آتے ہیں، جب کہ تیسرے دور میں ایک متجدد مسلمان کے قالب میں ڈھل چکے ہوتے ہیں؛ لیکن اس درمیانی دور میں ان کی زندگی ایک کشمکش کے دوراہے پر ہے، پچھلی روایات سے بغاوت کے آثار نمودار ہو چکے ہیں، مگر اپنے موروثی افکار و نظریات سے یک سر ترک تعلق کر لینا بھی ابھی ان کے لئے دشوار ہے اور یہ دور ۱۸۶۹ء 'سفر انگلستان' تک رہتا ہے۔

سرسید کا تیسرا دور ۱۸۶۹ء سفر انگلستان سے شروع ہوکر تادم آخریں رہتا ہے ، انگریزوں کی ملاقات ہی نے ان کو مغربی علوم وترقی کا مسحور بنا دیا تھا، برطانیہ کے سفر میں جب انھوں نے بچشم خود وہاں کے علمی ،فکری ،تہذیبی اور صنعتی ارتقاء کا حال دیکھا تو یہ رنگ اور گہرا ہوگیا، مغرب کی ''مرعوبیت'' نے ان کے اندر مشرقی اقدار کی کمتری کا احساس پیدا کر دیا اور ان کی نگاہیں یورپ کی علمی وعسکری فتوحات کو دیکھ کر خیرہ ہوگئیں ، اس احساس نے روایتی

تصورات کے خلاف آتش بغاوت کو بھڑکا دیا، اب وہ اسلام کے سلسلے میں سلف صالحین کی تعبیر وتشریح پر کھل کر تنقید کرنے لگے، زبان میں سختی، لب ولہجہ میں درشتی، تخاطب میں تحقیر وتمسخر اور فکر میں پوری طرح انحراف واعتزال پیدا ہوگیا۔

ان کے رسالہ ''تہذیب الاخلاق'' کے ہر شمارے میں اس نوعیت کے مضامین مل جایا کرتے تھے، ان کی بدلی ہوئی سوچ کا اندازہ ان کے اس اقتباس سے لگایا جاسکتا ہے :

> اسلام کی وہ حالت مجموعی جو تیرہ سو برس سے دنیا میں کہلایا، درحقیقت وہ اسلام نہ تھا، وہ تو علماء محمدیہ کا تراشا ہوا یا قرآن وحدیث کا درست مطلب نہ سمجھ کر نکالا ہوا اسلام تھا، اگر ان میں درست بھی تھا تو اسی قدر جس پر کچھ اعتراض نہ پڑتا ہو اور جن باتوں پر علوم غیر سے اعتراض واقع ہوئے ہیں، وہ سب نقصان کی باتیں ہیں، ہمارے بزرگ عالموں کی غلطی سے اسلام میں قرار پکڑے ہوئے ہیں۔

ان کی یہ فکر اس دور کی تمام ہی تصانیف میں ملتی ہے، انھوں نے اسی دور میں 'خطبات احمدیہ' لکھی، جو ان کے عشق نبوی کا شاہد ہے، جس میں سر ولیم میور کی جانب سے ہونے والے اعتراضات کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے اور انجیل کی بشارتوں سے آنحضور ﷺ کی نبوت کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مگر جواب پر دفاع اور معذرت خواہی کا رنگ غالب ہے، انھوں نے 'تفسیر القرآن' لکھی اور اپنے خیال میں اسلام کی سائنٹفک توجیہات کیں، اس تفسیر کی چھ جلدیں طبع ہوچکی ہیں، جو سورۂ بنی اسرائیل تک ہے اور ایک جلد غیر مطبوعہ ہے، جو سورۂ انبیاء تک ہے، لندن کا سفرنامہ ترتیب دیا، جس کی ابتدائی اقساط ''سوسائٹی'' اخبار میں شائع ہوئی، غالباً اس میں بھی ان کی مغرب زدگی کا رنگ نمایاں تھا؛ اس لئے سخت مخالفت ہوئی اور انجام کار یہ سلسلہ بند ہوگیا، ایک مصنف نے ۱۸۷۱ء میں ایک کتاب لکھی، جس میں ثابت کیا کہ مسلمانوں کا حکومتِ برطانیہ سے اختلاف مذہبی اعتبار سے فطری ہے، سرسید نے ضروری

سمجھا کہ اس پر تبصرہ لکھ کر انگریزوں سے مسلمانوں کی وفا شعاری ثابت کی جائے، اسی دور میں انھوں نے ایک رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء کیا جو بار بار ڈوبتا اور طلوع ہوتا رہا، یہ پرچہ ان کی فکر ونظر کا زبردست داعی تھا، اس کی تمام تر دینی بحثیں اسی فکر کے گرد گردش کرتی تھی۔

سر سید کی تصانیف اور علمی آثار میں ان کی کتابوں کے علاوہ ان کا ایک فارسی رسالہ 'جام جم' ہے، جس میں ۴۳ بادشاہوں کے مختصر حالات مذکور ہیں، بوعلی سینا کے ایک فارسی رسالہ ''معیار العقول'' کا ترجمہ بھی آپ نے کیا ہے زمین کے گردش کرنے کی تردید میں ''قول متین در ابطال حرکت زمین'' نامی رسالہ ہے، ''تاریخ ضلع بجنور'' ہے، اس کے علاوہ آپ نے ''آئین اکبری'' اور ''تاریخ فیروز شاہی'' کو بھی ایڈیٹ کیا ہے۔

تاہم ''آثار الصنادید، تفسیر القرآن اور تبیین الکلام'' کو آپ کی تالیفات میں خصوصی اہمیت حاصل ہے، تفسیر الکلام پر آگے گفتگو ہوگی، تبیین الکلام 'انجیل' کی شرح ہے اور 'آثار الصنادید' ان کی تحقیق وجستجو کا شاہکار اور جیتا جاگتا نمونہ ہے، جس میں دہلی کی تاریخی عمارتوں کا حال لکھا گیا ہے، بعض یورپین زبانوں میں بھی اس کے تراجم ہوئے ہیں اور اہل علم نے اسے شوق کے ہاتھوں لیا ہے، اس کتاب کا ایک باب شخصیات اور دہلی کے بادشاہوں کی فہرست پر مشتمل ہے، بعد میں یہ حصہ ''سلسلۃ الملوک'' کے نام سے علاحدہ شائع ہوا ہے۔

سر سید کا اصل موضوع دراصل تاریخ ہی تھا اور شاید قدرت نے ان کو اسی کام کے لئے پیدا کیا تھا، اگر وہ اس موضوع پر کام کرتے تو اُردو کے بلند پایہ مؤرخ ہوتے اور تاریخ نویسی میں عین ممکن تھا، وہ وہی درجہ حاصل کر لیتے، جو ان کے دبستان کے ایک اہم رکن ''شبلی'' کو حاصل ہوا، مگر ان کی ذہنی اُلجھنوں اور فلسفیانہ مزاج نے ان کا رُخ پھیر دیا اور وہ علم کلام اور اسلامیات کو اپنی جولانگاہ فکر ونظر بنا بیٹھے، سر سید کی زندگی کا یہ بڑا سانحہ ہوا، جس نے اُردو زبان کو قابل قدر علمی تحقیق سے محروم کر دیا۔

سرسید کی تجدد پر مبنی فکر کی آئینہ دار اور سب سے زیادہ اختلافی تصنیف ''تفسیر القرآن'' ہے، کوئی بھی غیر جانبدار شخص اس تفسیر کو دیکھ کر یہی فیصلہ کرے گا کہ مغربی فاتحین کے اعتراضات نے ان کو مرعوب کر دیا ہے، سرسید معجزات کے قائل نہیں ہیں اور اشاعرہ و ماتریدیہ کے مسلک کے برعکس ان کے نزدیک ''خوارق عادت''، ممکن ہی نہیں ہے؛ اس لئے انھوں نے تمام معجزات کی تاویل کرلی ہے، قرآن نے کہا ''**وإذ فرقنا بكم البحر فانجيناكم**'' (کہ ہم نے سمندروں کو پھاڑ کر بنی اسرائیل کو بچالیا) سید صاحب نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عبور کرتے وقت دریا اتفاقاً اترا ہوا تھا اور فرعون کی آمد کے وقت چڑھا ہوا تھا، قرآن کہتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا ''**إضرب بعصاك الحجر**'' (اپنی لاٹھی پتھر پر مارو تو پتھر سے چشمے اُبل پڑیں گے) سید صاحب نے کہا کہ ''ضرب'' کے معنی چلنے کے ہیں ''حجر'' سے مراد پہاڑ ہے، مطلب یہ ہے کہ لاٹھی کے سہارے پہاڑ پر چڑھو تو پانی نظر آئے گا، قرآن نے کہا ''**رفعنا فوقكم الطور**'' کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر پہاڑ کو اُٹھالیا تھا، سید صاحب نے کہا پہاڑ میں ایسا تزلزل پیدا ہوا کہ وہ ڈر گئے، کہیں ان پر گر نہ پڑے، قرآن نے بنی اسرائیل کے ایک گروہ پر مسخ کے عذاب کا تذکرہ کیا ہے ''**كونوا قردة خاسئين**'' (اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم ذلیل بندر بن جاؤ اور وہ بندر بن گئے) سید صاحب نے کہا مطلب یہ ہے کہ بندر کی طرح ذلیل ہو جاؤ، اسی طرح وہ معراج جسمانی کے قائل نہیں ہیں، ان کے یہاں ہر چیز جو ماورائے عقل ہے خلاف عقل ہے اور ہر چیز جو حد احساس و مشاہدہ سے باہر ہے، ناممکن ہے اور ان کا قائل ہونا ''شہوانی ملاؤں'' کی غلطی یا غلط فہمی ہے۔

وہ قرآن کے تمام مابعد الطبعی اُمور کی دور از کار تاویلیں کرتے ہیں، نبوت کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ان کے الفاظ میں یہ ہے:

> نبوت کو خدا کی طرف سے ایک عہدہ سمجھنا کہ وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اہل اسلام کا غلط عقیدہ ہے؛ بلکہ نبوت ایک فطری ملکہ ہے، جس طرح انسان کے اندر اور صدہا فطری ملکات ہیں، یہ بھی ایک

ملکہ ہے جو جسم کے قوی وضعیف ہونے سے قوی وضعیف ہوتا ہے، پس جس میں اخلاقِ انسانی کی تعلیم وتربیت کا ملکہ اس کی فطرت میں خدا سے عنایت ہوتا ہے وہ پیغمبر کہلاتا ہے، پھر یہ پیغمبری کسی شخص اور کسی زمانہ میں منحصر نہیں ؛ بلکہ ہر زمانہ ہر ملک میں ایسے لوگ جو ریفارمر کہلاتے ہیں، نبی ہیں۔

گویا نبوت بھی ایک عمومی کسبی صلاحیت اور خود آموز فن کا نام ہے —— جنت کی حقیقت ان کے الفاظ میں یہ ہے :

جنت و دوزح صرف راحت وتکلیف کا نام ہے، موسیٰ نے ان کی تفسیر کثرت اولاد اور پیدائش مال سے کی ہے، اور دوزخ ان چیزوں کے نقصان اور ہیضہ وغیرہ مصائب کو بتلاتا ہے، محمد ﷺ نے قرآن میں رغبت اور خُود لانے کی مصلحت سے ان کی تفسیر حور وقصور، باغ اور نہریں اور شعلہ آتش وزقوم وحمیم کے ساتھ کردی ہے اور اگر یہی جنت ہے تو اس سے ہماری خرابات بہتر ہے۔

اپنی اس رائے کے معاملے میں ان کے اصرار اور جمہور اُمت کے استہزاء کے لئے یہ اقتباس پڑھا جاسکتا ہے :

یہ سمجھنا کہ جنت مثل ایک باغ کے پیدا ہوئی ہے، اس میں سنگ مرمر اور موتی جڑاؤ محل ہے، باغ میں سرسبز وشاداب درخت ہے، دودھ وشراب وشہد کی ندیاں بہہ رہی ہیں، ہر قسم کا میوہ کھانے کو موجود ہے، ساقی ساقنین خوبصورت چاندی کے کنگن پہنے ہوئے، جو ہمارے یہاں گھوسنین پہنتی ہیں، شراب پلا رہی ہیں، ایک چھاتی سے لپٹا رہا ہے، ایک نے لب جان بخش کا بوسہ لیا، کوئی کسی کونے میں کچھ کر رہا ہے، کوئی کسی کونے میں کچھ، ایسا بیہودہ پن ہے جس پر تعجب ہوتا ہے،

اگر بہشت یہی ہے تو بے مبالغہ ہمارے خرابات اس سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔

فرشتہ وابلیس ان کے یہاں کوئی مستقل مخلوق نہیں ہے؛ بلکہ انسانوں کی ملکوتی اور شہوانی صلاحیتوں کا نام ہے، غرض کہ تمام ہی مابعدالطبیعی اعتقادات کے بارے میں ان کی رائے اسی انداز کی ہے، اسی طرح احکام وقوانین کے باب میں بھی جس حکم پر مغرب نے تنقید کی ہے، سرسید نے فوراً اس پر خطِ نسخ پھیر دیا ہے اور کچھ نہ کچھ تاویل کر ڈالی ہے۔

سیاسی اعتبار سے سرسید کو بعض حضرات نے فرقہ پرست کہا ہے، مگر یہ صحیح نہیں ہے، وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور ثقافتی اعتبار سے ایک دوسرے سے مربوط دیکھنا چاہتے تھے، خود جواہر لال نہرو نے اس کا اعتراف کیا ہے، انھوں نے جس طرح کانگریس کی مخالفت کی، جس پر ہندوؤں کا غلبہ تھا، وہیں جسٹس امیر علی کی ''محمڈن ایسوسی ایشن'' —— جو ۱۸۷۷ء میں کلکتہ میں قائم ہوئی —— کی بھی مخالفت کی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام گو مسلمانوں کے نام پر عمل میں آیا؛ مگر عملاً شروع ہی سے ہندو طلبہ اور غیر مسلم اساتذہ کا تناسب مسلم طلبہ اور اساتذہ کے مقابلہ تقریباً برابر رہا اور [illegible]وں کو یکساں مراعات حاصل رہیں؛ البتہ چوں کہ مسلمان جدید تعلیم کی تحصیل میں ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے، اس لئے اس کے قیام کا منشاء اول روز ہی سے یہ تھا کہ مسلمانوں کو ان کی صف میں لا کھڑا کیا جائے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بعض فرزندوں نے پاکستان کی نوخیز مملکت میں قائدانہ کردار ادا کیا، مگر یہ محض اتفاق ہے، قیام پاکستان کے بعد مغربی حصہ میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی نے پرچم کشائی فرمائی، جو دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ ہیں، پھر کیا اس کی وجہ سے دیوبند کو قیام پاکستان کا محرک تصور کیا جائے گا؟

سرسید حیرت انگیز طور پر سیاسی حیثیت سے —— کہا جاسکتا ہے کہ —— رجعت پسند واقع ہوئے تھے اور یورپ کے نظریہ جمہوریت سے متاثر نہیں تھے، وہ شاہی اور آمرانہ طرز

حکومت کے حامل تھے، ان کا خیال تھا کہ :

> وائسرے کے ساتھ کونسل میں بیٹھنے کے لئے واجبات سے ہے کہ وہ ملک کے معزز شخصوں میں سے ہو، کیا ہمارے ملک کے رئیس اس کو پسند کرلیں گے، ادنی قوم یا ادنی درجہ کا لواری خواہ اس نے بی اے کی ڈگری لی ہو یا ایم اے کی اور گووہ لائق بھی ہو، کہ ان پر بیٹھ کر حکومت کرے، ان کے مال، جائداد اور عزت پر حاکم ہو، کوئی بھی پسند نہیں کرے گا، گورنمنٹ کی کرسی نہایت معزز ہے، گورنمنٹ مجبور ہے کہ سوائے معزز کے کسی کو بھی نہیں بٹھا سکتی اور نہ وائسرے ان کا کلیگٹ یا مائی کلیگٹ ہوسکتا ہے اور نہ شاہی دفتروں میں اور شہنشانی جلوسوں میں جہاں دیوکٹ اور لوگ شریک ہوتے ہیں، انھیں بلایا جاسکتا ہے۔

سرسید کی بہت سی کمزوریوں کے باوجود ان کی تالیف ''خطبات احمدیہ'' اسلام اور پیغمبر اسلام سے ان کے تعلق کا مظہر ہے، اس کتاب کی علمی حیثیت سے قطع نظر ان کے وہ نیک دینی جذبہ قابل قدر اور لائق احترام ہے، جس نے ان کے دل کو اُمنگ بخشا اور دل نے قلم کو راہ دکھائی۔

یہ کتاب سرولیم میور کی مشہور کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کے جواب میں ہے، سرسید نے اس کتاب کے لئے بہ نفس نفیس برطانیہ کا سفر کیا، پورے انہاک سے کتب خانہ میں وقت گذارے، یورپی مصنفین کی تصانیف سے اپنے مقصد کی عبارتیں اقتباس کیں، پھر اتنی یکسوئی سے کتاب لکھی کہ لوگوں سے ملاقات تک ترک کردی، گھر کے سامان بیچ کر روپیہ منگاتے رہے اور اپنے کام میں مصروف رہے، وہ اسے اتنا بڑا مذہبی فریضہ تصور کرتے تھے کہ کہا کرتے تھے، اگر میری یہ کتاب تیار ہوگئی تو میں اس سفر لندن کو حج کے برابر سمجھوں گا، سرسید نے اس کتاب

میں کہیں کہیں غلطی بھی کی ہے اور کہیں ٹھوس مدلل جوابات بھی دیئے ہیں، خدا کرے یہی کتاب ان کے لئے حیلۂ مغفرت بن جائے کہ ''رحمت حق بہانہ می جوید''۔

سرسید احمد خان کا سب سے بڑا کارنامہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا قیام ہے، جب مسلمان جذبات کی رَو میں بہہ کر عصری تعلیم سے رشتہ توڑ چکے تھے اور برادرانِ وطن پوری توجہ کے ساتھ اس سفر میں آگے بڑھ رہے تھے، اس وقت سرسید احمد خان نے انگریزی زبان اور جدید علوم کی تحصیل کی طرف مسلمانوں کو دعوت دی اور اس کے لئے اسکول اور کالج کی سطح سے اپنی کوشش شروع کر کے اسے قلیل عرصہ میں یونیورسٹی کے درجہ تک پہنچایا، انھوں نے صرف ایک درسگاہ ہی قائم نہیں کی؛ بلکہ ایک تعلیمی تحریک کو وجود بخشا، اپنے بعض مخصوص افکار اور انحرافات کی وجہ سے انھیں مخالفتوں کے طوفان سے گزرنا بھی پڑا، بعض دفعہ وہ تکلیف دہ حالات سے بھی دوچار ہوئے اور ملت کی خیر خواہی کے جذبہ سے ایک گداگر کا کشکول لے کر اپنوں اور بیگانوں کی چوکھٹ پر پہنچے اور تلخ نوائیوں کو سہا؛ لیکن حوصلہ شکن حالات ان کے عزم مصمم میں حائل نہ ہوسکے، آج یہ تحریک ایک شجر سایہ دار بن کر پورے برصغیر پر سایہ فگن ہے۔

اس حقیر کا خیال ہے کہ اس موقع پر ایک غلطی سرسید سے ہوئی اور دوسری ان علماء سے، جو ان کی مخالفت میں خم ٹھونک کر کھڑے ہوئے تھے، سرسید کی غلطی کہ وہ مغربی علوم اور مغربی افکار میں فرق نہیں کر سکے، ان کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کو مغربی علوم کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ مغربی افکار کو بھی قبول کر لیا اور مغرب کی علمی ترقی اور تہذیبی گراوٹ میں فرق نہ کر سکے، علماء کی غلطی یہ تھی کہ انھوں نے بھی مغربی ثقافت اور مغربی علوم میں فرق نہیں کیا، انھوں نے نہ صرف مغربی تہذیب کی مخالفت کی؛ بلکہ انگریزی زبان اور جدید علوم کے ساتھ بھی معاندانہ رویہ اختیار کر لیا، اگر سرسید صرف جدید علوم کی دعوت دیتے تو ان کی اس درجہ مخالفت نہ ہوتی جو ہوئی کہ اس سے اس تحریک کو نقصان پہنچا اور یہ جس پذیرائی کی حقدار تھی، وہ حاصل نہ ہوسکی، اسی طرح علماء اگر جدید علوم کی مخالفت نہیں کرتے اور جیسے انھوں نے دینی مدارس کی تحریک چلائی تھی، دینی ماحول میں عصری اداروں کی داغ بیل ڈالتے تو آج اس ملک کا نقشہ

الگ ہوتا، اس ملک کے فیصلوں میں مسلمان کلیدی رول ادا کرنے کے لائق ہوتے اور مسلمان اس بے وزنی سے دوچار نہ ہوتے جس سے وہ آج دوچار ہیں، غالباً یہ ایک تاریخی غلطی تھی اور آج تک ملتِ اسلامیہ ہند اس کا کفارہ ادا کر رہی ہے!

سرسید احمد خان جہاں ایک اچھے ادیب، محقق اور ایک عظیم تعلیمی تحریک کے مؤسس تھے، وہیں وہ ایک اچھے انسان، کریم النفس اور بلند اخلاق مسلمان بھی تھے؛ حالاں کہ ان کا قلم بعض اوقات تیز ہو جاتا تھا؛ لیکن نجی زندگی میں بردبار اور حلیم شخص تھے، ایک بار جب سرسید نے ملت کی تعلیم کے لئے ہاتھ پھیلایا تو ایک قدر ناشناس شخص نے ان کے ہاتھوں پر تھوک دیا؛ لیکن سرسید کی پیشانی پر کوئی شکن نہیں آئی اور انھوں نے اپنے ہاتھ کو اپنے چہرے پر لگالیا کہ بہر حال یہ بھی میری قوم کی طرف سے آیا ہے۔

مذہبی معاملات میں سرسید کے افکار عام طور پر قابل قبول نہیں ہیں؛ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ دینی جذبہ سے عاری تھے، انھوں نے یونیورسٹی میں شروع سے شعبہ دینیات قائم کیا اور اس کے لئے دارالعلوم دیوبند کے بانی حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے داماد حضرت مولانا عبداللہ انصاری کا انتخاب کیا، وہ یونیورسٹی میں طلبہ سے نماز باجماعت کا اہتمام کراتے تھے، وہ کہا کرتے تھے کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے داہنے ہاتھ میں قرآن ہو، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر لا الہ الا اللہ کا تاج۔

علم و ادب کا یہ چراغ ۵/ ذوالقعدہ ۱۳۱۵ھ کو ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا اور مسلم یونیورسٹی کے احاطہ کی مسجد میں تدفین عمل میں آئی، سرسید کچھ ہوں مگر ایک عظیم انسان، ثابت قدم رہنما اور اپنے ارادہ کے پکے اور ذہین آدمی تھے اور اس معاملہ میں قابل تقلید تھے، اللہ ان پر اپنا فضل فرمائے۔ وھو الرحمن الرحیم۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر علامہ اقبالؒ

سر آمد روزگارے ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید کہ ناید

یورپ دیدہ مگر کعبہ رسیدہ، دماغ فلسفی دل صوفی، رازی کے پیچ وتاب سے بھی واقف، رومی کے سوز وگداز سے بھی آشنا، گفتار میں جوش، کردار میں ہوش، اُسلوب شاعرانہ، طبیعت واعظانہ، شاعر مگر عارض وگیسو کے قصوں سے نفور، صوفی مگر مجاہدانہ حرارتوں سے معمور، علوم جدیدہ کا شہسوار مگر ایمان ویقین سے سرشار، خود یورپ کے الحاد خانہ میں دل حجاز کے خدا خانہ میں — اسی مجموعۂ اضداد کو ''اقبال'' کہا جاتا ہے۔

۲۴/ ذی الحجہ ۱۲۸۹ھ کو پیدا ہوئے، نسباً برہمن نژاد، جو اقبال کے اقبال سے ڈھائی سو برس پہلے اسلام سے مشرف ہوا، آبائی وطن کشمیر مگر خود پنجاب میں پیدا ہوئے اور یہیں کے ہو رہے، والد ماجد کا نام شیخ نور محمد، دادا کا شیخ رفیق اور والدہ کا نام امام بی بی، نور محمد گو تعلیم سے ناآشنا تھے، مگر دیندار آدمی تھے، دینیات اوا اسلامیات کا زیادہ تر حصہ مولانا شاہ میر حسن سے پڑھا، مولانا ابراہیم سیالکوٹی کے بیان کے مطابق ۱۸۸۷ء میں پرائمری، ۱۸۹۰ءم میں میٹرک اور ۱۸۹۲ء میں انٹرنس پاس کیا اور ہر بار انعام حاصل کیا، ۱۸۹۵ء میں گورنمنٹ کالج لاہور میں بی، اے میں داخل ہوئے، فلسفہ اور عربی کے مضامین کا انتخاب کیا، ۱۸۹۹ءم میں ایم، اے کیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آئے، یہاں فلسفہ کے آپ کے خاص استاذ تھامس آرنلڈ تھے، ۱۹۰۵ء میں تعلیم کی مزید تحصیل کے لئے یورپ گئے اور کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے، پھر میونخ جرمنی یونیورسٹی سے پی، ایچ، ڈی کیا — قانون کی بھی تعلیم حاصل کی، ۱۸۹۸ء میں اُصولِ قانون کے پرچہ میں فیل ہوگئے، اس لئے انگلستان جاکر قانون پڑھا اور وکالت ہی

زیادہ تر ذریعہ معاش رہا، درمیان میں کچھ دنوں تدریسی کام بھی کیے، اخیر عمر میں نواب بھوپال کی طرف سے وظیفہ مقرر ہو گیا تھا، زندگی سادہ تھی، اس لئے حرص سے پاک اور قناعت سے بہرہ ور تھے۔

اقبال کی عمرِ تعلیم کا بڑا حصہ یورپ کی سرزمین الحاد میں گذرا، وہاں کے اساتذۂ روزگار سے استفادہ کا موقع ملا، مغرب و مشرق کے فلسفۂ مابعد الطبیعی پر انھوں نے مجتہدانہ بصیرت حاصل کی، مغربی علوم و افکار پر وسعت نظر کے لحاظ سے وہ عالم اسلام میں منفرد حیثیت کے مالک ہو گئے، مغرب کی کافر ادا اور عشوہ طراز تہذیب نے ان کو مسحور کرنے کی پوری پوری سعی کی، مگر اس کے باوجود مشرق کی خدا شناسی ان کے دل میں رچی رہی اور وہ مئے حجازی کے پرستار بنے رہے، ان کے ایمان کی حرارت، دینی حمیت، نبی عربی سے عشق بے پایاں اور قرآن مجید میں تدبر نے ان کے قدم کو استقامت کی قوت اور دل کو فراست کا نور بخشا؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا ، خاک مدینہ و نجف

''دانش فرنگ'' کے جلوۂ نظر فریب کے پیچھے اخلاقی انارکی، اباحیت پسندی، وطنیت پرستی، حرص جاہ و متاع، انسانی قدروں سے دوری، جامۂ اخلاق سے برہنگی اور انسانیت کی پامالی کے جو مناظر اور انسانیت سوز مظاہر کارفرما تھے، اقبال کی نظر حقائق کی اس تہہ تک پہنچ گئی اور انھوں نے یورپ کی خدانا آشنا تہذیب کو دعوت دی کہ یہ دنیا جب تک حلال و حرام کی تمیز سے ناواقف اور معرفت خداوندی سے بے بہرہ رہے گی، علم و حکمت کے یہ دلفریب اور تحقیق و ایجاد کے یہ دیدہ زیب کارنامے خام و ناتمام ہوں گے :

آہ ، یورپ زین مقام آگاہ نیست
چشم او ینظر بنور اللہ نیست
او نداند از حلال و از حرام
حکمتش خام است وکاوش ناتمام

اقبال کے نزدیک مغربی تہذیب کی ساری کمزوریوں اور خامیوں کی جڑ اس کا لادینی اور مادی مزاج ہے، جس نے انسان کو روح، اور تقاضائے روح سے خالی، محض آب و گل کا مجموعہ، ایک بے منزل بھٹکتا ہوا قافلہ تصور کیا ہے، اس کی اس مادہ پرستی نے گو بظاہر انسان کے لئے عشق وعشرت کے کچھ محل تعمیر کر دیئے ہیں، مگر اس کے غم پنہاں، اور دردِ دل کی بلا اسی کی لائی ہوئی ہے :

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد
زیر گر دوں رسم لادینی نہاد
مشکلات حضرتِ انسان ازوست
آدمیت راغم پنہاں ازوست
درنگاہش آدمی آب و گل است
کاروان زندگی بے منزل است

وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک خداشناسی، علم وحی سے بہرہ مندی اور حق تعالیٰ کی معرفت حاصل نہ ہو، دنیا کی یہ ظاہری ترقیاں ظلمات ہیں، وہ یورپ پر تیکھی تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

بیکاری و میخواری و عریانی و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات ؟
وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

ان کی شاعری کو جس چیز نے خون جگر سے لالہ زار اور اندوہ وغم سے اشکبار بنا رکھا ہے، وہ یہی حسرت وحرمان نصیبی ہے کہ مغرب کی یہ لادین لب گور مدنیت مشرق کے اُفق پر چھاتی جارہی ہے :

زندہ کرسکتی ہے ایران و عرب کو کیوں کر
یہ فرنگی مدنیت کہ جو ہے خود لب گور

عصر حاضر کی زبوں حالی اور مشرق ومغرب کی حرمانی کا سبب ان کی نگاہ میں فقط یہی ہے کہ مغرب میں لادینیت، الحاد اور مادہ پرستی نے عشق اور معرفت ربانی کی آگ کو مردہ کردیا ہے اور مشرق ذہنی غلامی وتقلید کی وجہ سے فکر کی ژولیدگی کا شکار ہوتا جارہا ہے :

مردہ لادینی افکار سے افرنگ میں عشق
عقل بے ربطیٔ افکار سے مشرق میں غلام

فرنگی تہذیب اپنے ساتھ مدنیت کے کیا تحفے لائی ہے اور دینی اقدار اور اسلامی افکار کو سینہ سے لگائے رکھنے والوں پر کیا فتویٰ صادر کرتی ہے، اسے اقبال کی زبان حق ترجمان سے سنئے :

جہاں حرام قمار نہیں ، زن تنگ لباس نہیں
جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مئے خواری
نظر دران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ
وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

اقبال مشرق کی تقلید مغرب سے بہت فکر مند تھے اور اس کو ان کی اخلاقی روایات اور مذہبی افکار کے لئے بہت مہلک تصور کرتے تھے، ان کے خیال میں مشرق کا بنیادی مرض ہی تقلید ہے :

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظام جمہوری

''محراب گل افغانوں کے افکار'' کے عنوان سے ان کی طویل نظم اسی موضوع پر ہے، جس میں اپنی خودی کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے کہ یہ گوہر یگانہ ہے، اسی طرح غلامان تہذیب اور نقالان تمدن کا حال ان کی زبان میں یہ تھا :

حرف اس قوم کا بے سوز ، عمل زارو زبوں
ہوگیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر

اور عربوں کو فرنگیت کا مسحور بنا کر اسلام سے دور کردینا ان کے نزدیک ایک عظیم ابلیسی سازش تھی :

فکر عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرت دیں کا ہے یہ علاج
مُلّاؔ کو ان کے کوہ و دمَن سے نکال دو

اقبال گو مغرب کی علمی ترقی اور جدید اکتشافات کے معترف اور قدرداں ہیں ، وہ مغرب کے اس میخانہ سے مشرق کو فائدہ اُٹھانے اور ان علوم نافع کی سرمستیوں سے لذت یاب ہونے کی دعوت دیتے ہیں اور مومن کا درجہ اس سے فزوں تر قرار دیتے ہیں :

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہاء راہ نہیں
کھلے ہیں سب کے لے غریبوں کے میخانے
علومِ تازہ کی سرمستیاں گناہ نہیں

(ضربِ کلیم)

مگر اس اعتراف کے باوجود وہ مغربی درسگاہوں کی اس سازش اور ساحرانہ ادا سے بھی واقف ہیں کہ :

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو
ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے ادھر پھیر

اس لئے ''تعلیم فرنگیانہ'' سے پہلے وہ ضروری سمجھتے تھے کہ ایمان ویقین اور تسلیم ورضا کے جوہر میں اچھی طرح رچ بس جائے اور پہلے اس کے دل ونگاہ مسلمان ہوجائیں :

تعلیم ہو گو فرنگیانہ جوہر میں ہو لا الہ تو کیا خوف؟

وہ دیکھ رہے تھے کہ مغربی درسگاہوں سے نکلنے والی نسل اپنے ساتھ علم وفن کا کم اور الحاد ودہریت ، بددینی اور اباحت کا سودائے خام زیادہ لا رہی ہے ، دین کی اس پامالی ، اخلاق کی اس آبرو باختگی اور فکر وعقیدہ کے اس بگاڑ کے باجود ممکن نہ تھا کہ یہ دل دردمند اور فکر ارجمند

فریاد کناں نہ ہو :

خوش تو ہم بھی ہیں جوانوں کی ترقی سے مگر
لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ ؟

یہ اقبال کی کرامت تھی کہ جب مشرق میں رہ کر مغربی علوم حاصل کرنے والے اپنی تہذیب اور اپنے علوم و افکار پر شرمسار محسوس ہوتے تھے، مغرب سے مرعوبیت اور ان کے مقابلہ اپنی بے مائیگی کے احساس نے ان کو احساس کمتری میں مبتلا کر دیا تھا اور انھوں نے جسم و جان اور زمین و مکان کے ساتھ ساتھ فکر و نظر اور تہذیب و تمدن کی دنیا میں بھی فاتح قوم کے سامنے ہتھیار ڈال دیا تھا، اقبال نے مغرب کا رُخ کیا، وہاں کی آب و ہوا میں پلے، اعلیٰ تعلیم حاصل کی، مگر وہاں کی ''فکر خام اور تمدن ناکام'' پر ان کی نظر تقلید نہیں جمی، ان کا دل آتش ایمانی سے گرم اور ان کی فکر ندائے حجازی کی آئینہ دار رہی، جس میکدہ سے واپس آ کر لوگ غلامی و تقلید کی دعوت دیتے تھے، اقبال اسی میخانہ سے واپس آ کر اہل مشرق سے سراپا شکوہ سنج ہوئے کہ :

یورپ کی غلامی سے رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے ، یورپ سے نہیں ہے

اقبال کی وابستگی عملی سیاست سے ایک گونہ کم رہی ہے؛ لیکن بہرحال وہ اپنا ایک مستقل سیاسی نقطۂ نظر رکھتے تھے اور اس معاملہ میں ان کو ''قومیت'' کے مغربی تصور سے سخت نفرت تھی، وہ اس کو مذہب کا کفن تصور کرتے تھے، انھوں نے خلافت عثمانیہ کا چراغ بجھتے اور اسلامی دنیا کو پارہ پارہ ہوتے ہوئے اپنی بدنصیب آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنے جگر سوختہ اور دل پژمردہ سے اس کا ماتم کیا تھا، وہ مسلمانوں کے لئے ''ملی قومیت'' اور مذہبی وحدت کے قائل تھے؛ بلکہ وہ غیر منقسم ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی علاحدہ ریاست کے قائل تھے، ''وطنیت'' کے عنوان سے ان کی ایک پوری نظم ہے، جس کا ہر شعر فکر اسلامی اور مشیت ایمانی کی ترجمان ہے، اس

نظم کا پہلا بند یوں ہے :

اس دور میں مئے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی ہے روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے ، وہ مذہب کا کفن ہے

(بانگ درا)

ان کا خیال ہے کہ مغرب کے پاس چوں کہ مذہب کی کوئی ٹھوس عقلی وفکری بنیاد اور جامع دستور حیات ہی نہیں ہے، جو لوگوں کو ایک نقطہ پر جمع رکھ سکے؛ اس لئے ان کی جمعیۃ کا مدار ہی تصور ''وطنیت'' پر ہے، لیکن مسلمانوں کا ملی ڈھانچہ اور ان کا مزاج اس سے یکسر مختلف ہے :

اپنی ملت کو قیاس اقوام مغرب پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوت مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تیری

مسلمان اگر ''اختیار رنگ وخون'' کو اپنے دین اور معاشرہ میں جگہ دیدیں گے اور نبی عربی سے ملت کی وحدت ، یکتائیت اور مساوات واُخوت کا جو درس ملا ہے، اسے پس پشت ڈال دیں گے، تو یہ سب مٹ جائیں گے :

جو کرے گا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاک رہ گذر

(دنیائے اسلام — بانگ درا)

''اقبال'' کی نظر حق شناس اس حقیقت سے واقف تھی کہ رنگ وخون کے یہ بت جب تک ٹوٹ نہ جائیں گے اور جب تک علاقائیت اور وطنیت کی خود ساختہ دیواریں منہدم نہیں ہوجائیں گی، اس وقت تک یہ اُمت سفر زندگی کی راہ میں ''سمندر بیکراں'' نہیں بن سکتی اور جب تک اس ''مرغ حرم'' کے پَر اس غبار رنگ ونسب سے آلودہ رہیں گے، زندگی کے اُفق پر یہ اپنے پر پھیلا نہ سکے گا:

بتان رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا
نہ تورانی رہے باقی ، نہ ایرانی ، نہ افغانی
یہ ہندی ، وہ خراسانی ، یہ افغانی ، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل ، اچھل کر بیکراں ہوجا
غبار آلودۂ رنگ و نسل ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغ حرم ! اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہوجا

اقبال کا یہ سوز وساز اور درد وگداز آج بھی عالم اسلام اور اُمتِ اسلامیہ ہند کے لئے ''بانگ درا'' کی حیثیت رکھتا ہے، کاش مسلم سیاست داں اور عالم اسلام کے ''اسلام ناآشنا راہبر'' اس حقیقت سے آشنا ہوسکیں!

تصوف اور احسان اقبال کی سرشت اور فطرت میں تھا، اللہ تعالیٰ نے ان کو آہ سحر گاہی اور نالۂ نیم شبی، قرآن کی تلاوت اور اس میں فکر وتدبر اور رسول عربی ﷺ سے عشق بے پایاں کی نعمت سے نوازا تھا، اس چیز نے ان کے دل کی زمین کو نرم اور ان کے خون جگر اور غیرت ایمانی کو گرم بنادیا تھا، یہ اندر کی اسی پاکیزگی اور پاکبازی کا نتیجہ تھا کہ مغرب کا مادہ پرستانہ ماحول ان کے ''جوہر مومنانہ'' پر کچھ اثر انداز نہ ہوسکا۔

لیکن چوں کہ وہ فلسفہ کے طالب علم تھے، انھوں نے مشرق ومغرب کے فلاسفہ کو پڑھا تھا اور اس پر گہری بصیرت حاصل کی تھی، اس لئے ایک عرصہ تک فلسفہ اور تصوف کی کشمکش ان کے دل ودماغ میں برپا رہی اور فلسفہ کے پیچ وتاب اور تصوف کے سوز وساز کے درمیان حیران

وسرگرداں رہے :

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی ، کبھی پیچ و تاب رازی

جب تک وہ اپنے حقیقی راہبر کو پہچان نہیں سکے دونوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی دور چلتے رہے :

حیران ہے بوعلی کہ میں آیا کہاں سے ہوں
رومی یہ سوچتا ہے کہ جاؤں کدھر کو میں
جاتا ہوں تھوڑی دیر ہر ایک راہبر کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

(فلسفہ مذہب—بال جبریل)

لیکن بالآخر حقیقت کے دروازے ان پر وا ہو گئے اور وہ جس نتیجہ پر پہنچے، وہ یہ ہے کہ اصل چیز ''عشق'' ہے، جو انسان کو منزل تک پہنچاتا ہے :

عشق سراپا حضور ، علم سراپا حجاب
علم ہے پیدا سوال ، عشق ہے پنہاں جواب

(علم وعشق—ضرب کلیم)

پھر کوچۂ تصوف میں ان پر دو دور گذرے ہیں، ایک زمانہ وہ تھا جب نہ صرف یہ کہ وہ صوفی تھے؛ بلکہ وجودی بھی تھے اور ابن عربی کے نظریۂ وحدۃ الوجود کے قائل تھے؛ چنانچہ ان کے پہلے اُردو مجموعۂ کلام ''بانگ درا'' کی متعدد نظموں کو اس سلسلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے، مثلاً :

چھپایا حسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے
وہی ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں

(بانگ درا)

اسی طرح یہ کہ :

کمال وحدت عیاں ہے ایسا کہ نوک نشتر سے تو جو چھیڑے
یقین ہے مجھ کو گرے رگ گل سے قطرہ انسان کے لہو کا

اور ''سلمیٰ'' کے عنوان سے ان کی نظم تو پوری کی پوری اسی فکر کی غماز ہے۔

۱۹۰۵ء میں اقبال نے ''میونخ جرمن یونیورسٹی'' سے پی ، ایچ ، ڈی کی ڈگری حاصل کرنے کے لئے اپنا عنوان ''ایران کا مابعد الطبیعی فلسفہ'' منتخب کیا، اس مقالہ کی تیاری میں ان کو ڈوب کر فلسفہ اور تصوف کو پڑھنے اور سمجھنے کا موقعہ ملا ، اسی دوران انھوں نے مختلف صوفیاء اور فلسفۂ تصوف پر درک رکھنے والی شخصیتوں سے مراسلت کی اور اسی وقت سے ان کے ذہن میں ایک کشمکش برپا ہوگئی، جس نے بالآخران کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ موجودہ تصوف بڑی حد تک اسلام کے پاکیزہ اور سیدھے سادے احسان وتزکیہ سے مختلف اور غیر اسلامی فلسفہ سے متاثر ہے، یہ جمود کی دعوت دیتا ہے اور اُمتوں کی صلاحیت کار کو مفلوج کر کے رکھ دیتا ہے، یہ قوموں کی پیری کی علامت ہے، یہ زندگی اور ہنگامہ گیتی سے فرار کی ایک راہ ہے، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے پیغمبرانہ اُسلوب سے انحراف ہے اور وحدت الوجود کا یہ تصور اسلامی عقائد سے قطعی متصادم ہے؛ چنانچہ رقمطراز ہیں :

مجھے اس امر کا اعتراف کرنے میں کوئی شرم نہیں کہ میں ایک عرصہ تک ایسے عقائد و مسائل کا قائل رہا، جو بعض صوفیا کے ساتھ خاص ہیں اور جو بعد میں قرآن شریف پر تدبر کرنے سے قطعاً غیر اسلامی ثابت ہوئے ہیں ، مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی کا مسئلہ قدامت ارواح کملاء، مسئلہ وحدۃ الوجود یا مسئلہ تنزلات ستہ۔ (اقبال اور جمالیات:٦٦)

آگے لکھتے ہیں :

میرا مذہب ہے کہ خداوند تعالیٰ عالم میں جاری ساری نہیں ؛ بلکہ نظام عالم کا خالق ہے اور اس کی ربوبیت کی وجہ ہی سے یہ نظام قائم ہے،

جب وہ چاہے گا اس کا خاتمہ ہو جائے گا۔ (اقبال اور جمالیات:٦٦)

اقبال اس قسم کی متصوفانہ فکر اور اسی نسبت سے حافظ پر سخت نقد کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

ہوشیار از حافظ صہبا گسار
جامش از زہر اجل سرمایہ دار
(شیرازی)

لیکن حافظ شیرازی کے مداحوں کے اعتراض پر دوسرے ایڈیشن سے یہ اشعار نکال دیئے گئے۔

اقبال مولوی سراج احمد پال کے نام اپنے ایک مکتوب میں شعراء عجم کے طرز فکر پر سخت تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

شعراء عجم میں بیش تر وہ شعراء تھے، جو اپنے فطری میلان کے باعث وجودی فلسفے کی طرف مائل تھے، اسلام سے پہلے بھی ایرانی قوم میں یہ میلان موجود تھا، ان شعراء نے نہایت عجیب وغریب اور بظاہر دلفریب طریقوں سے شعائر اسلام کی تردید یا تنسیخ کی ہے اور اسلام کی ہر محمود شئے کو ایک طرح سے مذموم بیان کیا ہے، اگر اسلام افلاس کو برا کہتا ہے تو حکیم سنائی افلاس کو اعلیٰ درجہ کی سعادت قرار دیتا ہے، اسلام جہاد فی سبیل اللہ کو حیات کے لئے ضروری تصور کرتا ہے، تو شعرائے عجم ان شعار میں کوئی اور معنی تلاش کرتے ہیں :

غازی زپئے شہادت اند و رنگ و پوست
غافل کہ شہید عشق فاضل ترازوست
ور روز قیامت ایں بہ اوکہ ماند
ایں کشتہ دشمن است و آن کشتہ دوست

انصاف سے دیکھئے تو جہاد اسلام کی تردید میں اس سے زیادہ دلچسپ

اور خوبصورت طریق کار اختیار نہیں کیا جا سکتا، شاعر نے کمال یہ
دیکھایا ہے کہ جس کو اس نے زہر دیا ہے، اس کو احساس بھی نہیں
ہوسکتا کہ مجھے کس نے زہر دیا ہے......اس نقطۂ خیال سے نہ صرف
حافظ بلکہ تمام شعراء ایران پر نگاہ ڈالنی چاہئے۔(ص:۲۱-۲۰، ذکر اقبال)

اقبال کو اس باب میں اس درجہ غلو ہے کہ وہ محی الدین ابن عربی کی معروف تصنیف ''فصوص الحکم'' کے بارے میں لکھتے ہیں کہ جہاں تک مجھے علم ہے فصوص میں سوائے الحاد وزندقہ کے اور کچھ نہیں ہے۔

انھوں نے اپنے اشعار میں بھی بکثرت پیشہ ور اہل تصوف پر تیکھی تنقیدیں کی ہیں، ابلیس کی مجلس شوریٰ میں تصوف کا مسئلہ یوں زیر بحث آتا ہے :

طبع مشرق کے لئے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم کلام
ہے یہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپادے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات
(ارمغان حجاز)

خانقاہوں کے رہبانی رجحان اور عزلت گزینی کے طرز عمل نے ان کو خانقاہوں سے بیگانہ کر دیا تھا، وہ ایسے تسبیح خانوں کو دعوت عمل دیتے ہوئے للکارتے ہیں :

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسم شبیری
کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری
تیرے دین و ادب سے آرہی ہے بوئے رہبانی
یہی ہے مرنے والی اُمتوں کا عالم پیری

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ نفس تصوف کے منکر تھے؛ وہ صرف اس تصوف کے خلاف تھے، جو زندگی سے گریز اور فرار کی تعلیم دیتا ہے، جو زمانہ سازی کے بجائے دنیا سے کٹ جانے کا داعی ہے :

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں
بہانہ بے عملی کا بنا شراب الست
(ضربِ کلیم)

مہرومہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر
(ضرب کلیم)

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری
کمال ترک ہے تسخیر خاکی و نوری
میں ایسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا
تمہارا فقر ہے بے دوستی ور نجوری
(بال جبریل)

وہ معاصر صوفیا کی تاریک ضمیری اور حقیقت تصوف سے بے شعوری پر نوحہ کناں ہیں کہ ''رہی پیری، گئی روشن ضمیری''۔

اور یہ کہ :

وہ صوفی کہ تھا خدمت حق میں مرد
محبت میں یکتا ، حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھوگیا
یہ سالک مقامات میں کھوگیا
(ساقی نامہ—بال جبریل)

وہ تصوف کو ایک پے چیدہ اور نا قابل فہم فلسفہ بنانے کے بجائے اس ''احسان صافی'' کے قائل تھے جو قرآن وحدیث سے مستنبط ہو، وہ اسی پر عمل پیرا بھی تھے، اس بات میں وہ مولانا جلال الدین رومیؒ کے مرید اور پیرو تھے، انھوں نے خود اپنے آپ کو ''برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است'' کہا ہے، مولانا رومی سے ان کو والہانہ لگاؤ اور بے ساختہ عشق ہے، وہ اپنے اشعار میں بہ کثرت ان کا ذکر کرتے ہیں، نیز اسی ''آتش رومی'' کو فرنگیوں کے فسوں سے نجات

دہندہ قرار دیتے ہیں :

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے تیرا
تیری خرد پر ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

(بال جبریل)

وہ اپنے آپ کو اسی قافلۂ شوق و درد کا راہرو تصور کرتے ہیں، جس کے سالار مولانا رومی ہیں :

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال
جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

اقبال کے سلسلہ میں دو طبقے افراط وتفریط کا شکار ہیں، کچھ لوگ ان کو بہرحال صوفی اور اس کے ساتھ وجودی ثابت کرنا چاہتے ہیں اور ان کے ابتدائی دور کے اشعار کو شواہد بناتے ہیں، جب کہ کچھ لوگ ان کو سرے سے تصوف کا منکر سمجھتے ہیں؛ لیکن میرے خیال میں تصوف کے بارے میں اقبال کا اصل نقطۂ نظر وہ ہے جو اوپر مذکور ہوا، ہم اخیر میں اس بحث کو اقبال ہی کی ایک عبارت پر ختم کرنا چاہتے ہیں :

> حضرت مجدد الف ثانیؒ اپنے مکتوب میں کئی جگہ ارشاد فرماتے ہیں کہ تصوف حلقۂ اسلامیہ میں خلوص پیدا کرنے کا نام ہے، اگر تصوف کی یہ تعریف کی جائے تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض کرنے کی جرأت نہیں ہوسکتی ، راقم الحروف اس تصوف کو جس کا نصب العین شعائر اسلام میں مخلصانہ استقامت پیدا کرنا ہو، عین اسلام جانتا ہے اور اس پر اعتراض کرنے کو بدبختی اور خسران کا مرادف سمجھتا ہے۔

اقبال چوں کہ جدید و قدیم سے آشنا ،نبض شناس اور بالغ نظر آدمی تھے ، اسلام اور مغربی تہذیب کی کشمکش ان کے آنکھوں کے سامنے تھی ، مغربیت کے سیل رواں نے ان کے دل دردمند کو آزردہ کر رکھا تھا اور وہ محسوس کرر ہے تھے کہ اس کے مقابلہ کے لئے اور اس دور

میں اسلام کی افادیت کوثابت کرنے کے لئے فقہ اسلامی میں توسع اور جدید حالات کو پیش نظر رکھ کر بعض ایسی تبدیلیاں ناگزیر ہوگئی ہیں، جن کو قدیم حالات و معاشرہ ہی میں برتا جاسکتا تھا، اس لئے انھوں نے اجتہاد کی دعوت دی اور اس اہم اور نازک کام کے علمبردار کو اس عہد کا مجدد قرار دیا۔ (ملاحظہ ہو ص:۳۰۳، ذکر اقبال)

شاید اسی کے پیش نظر اقبال ایک ''اسلامی ادارہ'' کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے، جس میں وہ علوم جدیدہ کے ماہرین اور علوم دینیہ پر مجتہدانہ بصیرت رکھنے والے علماء کو جمع کر کے اسلام کی تشکیل جدید کا اہم فریضہ انجام دینا چاہتے تھے، اقبال نے اس سلسلہ میں جامع از ہر مصر کے شیخ اور مشہور عالم مصطفیٰ مراغی مرحوم سے ایک روشن خیال، قابل، علوم دینیہ کے ماہر کی فرمائش بھی کی تھی، اس کے لئے انھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض بھی حاصل کیا تھا، جس کا نام ''دارالاسلام'' پڑا اور بعد کو تحریک اسلامی کے داعی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی یہیں قیام پذیر ہوئے۔

اقبال خود بھی بعض ایسی تصانیف کا خاکہ اپنے ذہن میں رکھتے تھے، جس کے ذریعہ جدید اُسلوب پر اسلام کے اُصول قانون کو مرتب کیا جائے، مغربی اعتراضات کی قلعی کھولی جائے اور اکتشافات حاضرہ اور فلسفۂ جدیدہ کی روشنی میں اسلام کے مابعد الطبیعی اعتقادات کو ثابت کیا جائے، مگر افسوس کہ یہ آرزو ان کے ساتھ ہی دفن ہوگئی، ورنہ اقبال کے یہ ''ناشگفتہ گنج ہائے علم ونظر'' شاید ان کے سارے کارناموں سے بڑھ کر ہوتے۔

لیکن اجتہاد کے بارے میں اقبال کے جو افکار تھے، ان کو اس تجدد پسندی اور روشن خیالی سے کوئی نسبت نہیں ہے، جو مغرب زدہ اور علوم اسلامی سے ناآشنا اور بے بہرہ روشن خیالوں اور ''نوزائیدہ مجتہدین'' سے ظہور میں آتی رہتی ہے اور جو اسلام کو تراش خراش کر بہر حال '' مغربی تہذیب وافکار'' کے سانچہ میں ڈھال لینے کے درپے ہیں، ان کے نزدیک یہ ''فکرخام''، فکر وتدبر کے سلیقہ سے خالی ہونے کے سبب فکر تباہی اور فساد ہے :

آزادی افکار سے ان کی ہے تباہی
رکھتے نہیں جو فکر و تدبر کا سلیقہ

ہو فکر اگر خام تو آزادیٔ افکار
انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ

اقبال ایسے مغرب زدہ سامری فن مصلحین مشرق اور متجد دین اسلام کی تہی دامانی اور بے بصیرتی کا ماتم کرتے ہوئے کہتے ہیں :

میں ہوں نومید تیرے ساقیان سامری فن سے
کہ بزم خاوراں میں لے کے آئے ساتگیں خالی
نئی بجلی کہاں ، ان بادلوں کے جیب و دامن میں
پرانی بجلیوں سے بھی ہے جن کی آستیں خالی

گذشتہ صدی میں ''دین'' کی اس خراش تراش کے دو علمبردار حکمراں —— رضا شاہ پہلوی (سابق شاہ ایران) اور مصطفیٰ کمال پاشاہ (ترکی مرحوم) —— کی کورفکری پر تنقید کرتے ہوئے اقبال شکوہ سنج ہیں :

نہ مصطفیٰ نہ رضاشاہ میں نمود اس کی
کہ روح شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
(مشرق — بانگ درا)

اقبال کی نگاہ میں ''یہ شیوۂ کافرانہ'' ہے، کہ زندگی کا جوا زمانہ کے ہاتھ کھیلا جائے اور زمانہ کو اپنے رنگ میں بدلنے کے بجائے خود کو زمانہ کے سانچہ میں ڈھال لیا جائے :

چہ کافرانہ قمار حیات می بازی
کہ با زمانہ بہ سازی ، بہ خود زمانہ نہ ساز

''ابلیس کی مجلس شوریٰ'' میں ابلیس کے اہم فرامین میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عربوں کو فرنگی تخیلات کا نشہ پلا کر اسلام سے دور کردو اور افغانیوں کو غیرت دینی سے عاری کرنے کے لئے ''ملا کو ان کے کوہ و دمن سے نکال دو''۔

اور ''رموز بے خودی'' میں تو انھوں نے کھلے لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کردیا ہے کہ انحطاط، مرعوبیت، احساس کمتری اور مفتوحیت کے دور میں قوموں اور اُمتوں کے لئے تقلید

ہی زیادہ بہتر ہوتی ہے اور وہی اس کے قومی مظاہر کو زندہ و پائندہ رکھ سکتی ہے :

جلوہ اش مار از مابیگانہ کرد ساز مارا از نوا بے گانہ کرد
از دل ما آتش دیرینہ برد نور و نارِ لا الہ از سینہ برد
اجتہاد اندر زمان انحطاط قوم را برہم ہمی پیچد بساط
زاجتہاد عالمان کم نظر اقتداء بر رفتگاں محفوظ تر

علامہ اقبال کے ان واضح افکار کے باوجود بھی ان کو اس تجدد پسندی اور نام نہاد، روشن خیالی کے زمرہ میں کھڑا کرنا کیسا انصاف ہے؟

بعض حضرات اقبال کو بہر طور اشتراکیت اور کمیونزم کا حامی قرار دینا چاہتے ہیں، ان کے لئے اقبال کے وہ اشعار غذا کا کام کرتے ہیں، جس میں انھوں نے مغرب کی ظالمانہ سرمایہ داری پر سخت تنقیدیں کی ہیں؛ لیکن دراصل یہ وہ لوگ ہیں جو اسلام کے جامع نظام حیات سے ناواقف ہیں، اور جو سرمایہ داری کے بعد دوسری پناہ گاہ لامحالہ اشتراکیت ہی کو سمجھتے ہیں، اقبال، اسلام اور صرف اسلام کے حامی تھے اور جس طرح موجودہ سرمایہ دارانہ نظام وافکار کے بہت سے اجزاء کمیونزم سے متصادم ہیں، ایسے ہی اسلام بھی ان کو گوارہ نہیں کرتا، اقبال نے ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر تنقید کرانا اپنا فریضہ سمجھا۔

آخر وہ اقبال جس کی پوری شاعری اور زندگی کی ساری علمی اور تحقیقی کاوشیں صرف اس دعوت کے گرد گھومتی ہیں کہ انسان اپنی ذات کو اور اس کے ذریعہ خدا کو پہچان لے، جو مغرب کی اخلاق سوز اور حیا باختہ تہذیب پر نوحہ کناں ہے، آخرت کا یقین جس کے شعر شعر سے امڈا آتا ہے اور جس کے یہاں زندگی کا معیار اور کسوٹی سوز صدیق، زور حیدر اور فقر بوذر رہے، آخر اس کو اس نظام سے کیا رشتہ، جس کی بنیاد ہی الحاد و دہریت سے اُٹھتی ہے، جس کے پاس اخلاق کی قدر و قیمت پاجامہ کے برابر بھی نہیں ہے، جہاں مقتدی فکر ایک یہودی دماغ ہے اور آخرت کا تصور جہاں ایک مضحکہ خیز فرسودگی ہے، ان کے'' قال'' اور'' حال'' میں بہت ہم آہنگی نہ تھی، اقبال کی پہلی ملاقات جب جرنیل نادر خاں سے ہوئی تو اس نے متعجب ہوکر یہی سوال کیا کہ کیا آپ ہی

اقبال ہیں؟ میں نے سمجھا تھا کہ آپ کوئی لمبی داڑھی والے بزرگ ہوں گے'' گو کہ اس وقت اقبال نے ایک مزاحیہ جواب دے دیا؛ لیکن یہ سوال اقبال کے جذبۂ دینی سے متاثر ہر مدح خواں کے دل میں چبھتا رہتا ہے اور اقبال کی زندگی اس کا جواب دینے سے قاصر رہتی ہے۔

اقبال کی بے نیازی، فقر و استغنا اور حمیت دینی کے دوش بدوش بعض ایسے واقعات نظر آتے ہیں جو ان کے عقیدت مندوں کے لئے بجا طور پر حیرت کا باعث ہیں، مثلاً جو شخص ایک طرف اپنے اشعار میں درویشی اور قلندری کی اتنی توصیف کرتا ہے اور شاہی و سلطانی اور تاج وتخت کو ایک کم قیمت چیز شمار کرتا ہے، وہی شخص اپنے ایک ایسے قیمتی اور انمول مجموعۂ کلام کو جس میں خودی، خودداری اور خودشناسی کی تعلیم دی گئی ہے اور جسے ''اسرارخودی'' ہی کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، ایک ریاست کے مسلم وزیر اور اسلام دشمن حکومت کے خطاب یافتہ ''سر علی امام'' کی طرف منسوب کرتا ہے اور اس کے لئے اس کی نگاہ گذرے ہوئے یا موجود کسی حوصلہ منداور جری داعی وقائد کے بجائے ایک وزیر کی طرف اٹھتی ہے۔

پھر ہم دیکھتے ہیں کہ جو شخص ایک طرف یورپ اور برطانیہ کی تہذیب پر بے لاگ تنقیدیں کرتا ہے اور ان کی حکومت کو ایک جابرانہ تسلط تصور کرتا ہے، دوسری طرف وہی شخص اس حکومت سے ـــــ جس نے عالم اسلام کو پارہ پارہ کر دیا تھا اور خلافت عثمانیہ اسلامیہ کا ٹمٹماتا ہوا چراغ بجھا کر مسلمانوں سے ان کی عزت وآبرو اور ناموس کا آخری نشان بھی چھین لیا تھا ـــــ ہنسی خوشی ''سر'' کا سرکاری خطاب حاصل کر لیتا ہے اور یہ دیکھ کر تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ پہلی جنگ عظیم ـــــ جس میں برطانیہ ترکوں سے برسر پیکار تھا اور کہنا چاہئے کہ برطانیہ ہی نے خلافت اسلامیہ کا سہاگ لوٹا تھا ـــــ کے خاتمہ یعنی اتحادیوں کی فتح اور ترکوں کی شکست پر جب وائسرائے ہند نے دہلی میں جشن منایا تو ان کی دعوت پر اقبال بھی ایک قصیدہ لے کر پہنچ گئے کہ :

ہنگامۂ دغا میں میرا سر قبول ہو
اہل وفا کی نذر محقر قبول ہو
سطوت سے تیری پختہ جہاں کا نظام ہے
ذرے کا آفتاب سے اونچا مقام ہے

دینی افکار کے معاملہ میں بھی ان کی بہت سے آراء اُمت کے سواد اعظم کے نقطۂ نظر سے مختلف ہیں، مدراس میں دیئے گئے ان کے مشہور لکچرس بھی ایسے نہیں ہیں جن کو غل وغش سے پاک سمجھا جائے، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے :

> میرے نزدیک مہدی، مسیحیت اور مجددیت کے متعلق جو احادیث ہیں، وہ ایرانی وعجمی تخلیقات کا نتیجہ ہیں، عربی تخلیقات اور قرآن کی صحیح اسپرٹ سے ان کا کوئی سروکار نہیں۔

حالاں کہ مجددین کی آمد، حضرت مسیحؑ کا دوبارہ نزول اور امام مہدی کی خلافت ایسی احادیث میں وارد ہے، جن کو محدثین نے قابل استناد قرار دیا ہے، اس قسم کی فروگذاشتیں اقبال کے کلام میں بہت ملتی ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس کے باوجود وہ ملت اسلامیہ کے لئے ایک دل دردمند رکھتے تھے اور اسلام سے ان کو عشق تھا، انھوں نے مغرب پر جیسی جرأت مندانہ تنقید کی اور قادیانیت کے خلاف جو شاندار مقالہ لکھا، جس نے پنجاب میں ہوا کا رُخ بدل دیا، وہ ان کا بڑا کارنامہ اور ذخیرہ آخرت ہے۔

اقبال کی شخصیت کا تعارف اگر ہم مختصر لفظوں میں کرانا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک عظیم اور بلند پایہ شاعر تھے، وہ شاعر سے بڑھ کر فلسفی تھے اور فلسفی سے زیادہ ایک مردمومن اور سچے مسلمان تھے۔

۲۱؍اپریل ۱۹۳۸ء کو صبح کے ۵؍بجے تاریخ کی یہ عبقری شخصیت اپنے جان آفریں کے حوالہ ہوگئی، خدا کرے وہ اپنے معبود کے حضور ان ''ارباب ہمم'' اور ''پاکان حرم'' کی صف میں ہوں، جن کے بارے میں ان کی زبان حق ترجمان نے موت سے صرف دو دنوں پہلے کہا تھا :

بہشتے بہر ارباب ہمم است
بہشتے بہر پاکان حرم است

❀ ❀ ❀

اقبالؒ اور کردار سازی کی دعوت ۞

یہ عجیب بات ہے کہ اُردو نثر کا دامن شروع سے اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور انسانیت کی بلند اقدار کا ترجمان رہا ہے، اگر ''معراج العاشقین'' کو اُردو کی پہلی نثر مانا جائے تو دینی اور اخلاقی قدروں سے اس کا تعلق ظاہر ہے، اُردو اپنی ابتدائی عمر میں ہی ترجمۂ قرآن مجید، سیرت نبوی اور تذکرہ اولیاء کی نقیب و ترجمان بن چکی تھی اور جوں جوں اس کے رُخ زیبا کا نکھار بڑھتا گیا، دینی اور اخلاقی مضامین کے سرمایہ کے اعتبار سے بھی وہ آگے بڑھتی گئی، اُردو نظم کا معاملہ اس سے کسی قدر مختلف ہے، اُردو نظم میں زیادہ تر ان افکار و خیالات، اقدار وروایات اور تعبیرات واستعارات کی پیروی کی گئی ہے، جو فارسی شاعری میں مروج تھے، اس لئے اُردو شاعری میں شروع ہی سے محبوب کے لب و عارض کا نقشہ کھینچنے، گیسو و کمر کو ناپنے اور بادہ مینا کی بزم آراستہ کرنے کی روایت رہی ہے، اسی لئے مولانا حالی کو کسی قدر تندی کے ساتھ اُردو شاعری کے اس رویہ پر شکایت کرنی پڑی، پھر جب اشتراکی تحریک اُٹھی اور اس کے زیر اثر ترقی پسند شاعری نے جنم لیا تو اب بات عاشق کے دل زار اور معشوق کے حسن دل فگار سے بطن مزدور تک آ پہنچی اور ایک ایسے ادب نے جنم لیا، جس میں غریبوں اور مزدوروں کی محرومی، سرمایہ داروں کے خلاف احتجاج اور ارباب اقتدار سے بغاوت کے خیالات مچلنے لگے، اعلیٰ اخلاقی قدروں کو اُبھارنے اور صالح اعمال کی طرف ترغیب دینے کے لئے نہ پہلی قسم کی شاعری میں کوئی جگہ تھی اور نہ دوسری قسم کی شاعری میں؛ بلکہ اس ترقی پسند شاعری نے تو اشتراکی افکار سے تاثر کی وجہ سے مذہب، خدا، رسول، مذہبی شعائر اور بعض اوقات مسلّمہ اخلاقی اقدار کا مذاق بھی اُڑانا شروع کر دیا۔

۞ رابطہ ادب اسلامی کے ایک سیمینار کے لئے لکھا گیا مقالہ۔

یہ ایک بد بختانہ صورتِ حال ہے، کیوں کہ ادب نثر ہو یا نظم اور پھر نظم و نثر کی کوئی صنف ہو، انسانی زندگی کی تعمیر اس کا بڑا ہدف ہے، جو مشین تعمیر کے لئے ہو اگر وہی تخریب کا کام کرنے لگے تو اس سے زیادہ محرومی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے؟ —— لیکن اس سے کچھ مستثنیات بھی ہیں، ان مستثنیٰ شخصیتوں میں غالباً سب سے اہم نام ''علامہ اقبالؒ'' کا ہے، اقبال کو جس چیز نے اقبال کے ثریا پر پہنچایا اور ان کے کلام کو آفاقیت عطا کی، وہ ان کی فکر کی سلامتی اس پر استقامت اور انقلاب انگیز دعوت حق کا جذبۂ بیکراں ہے :

اوروں کا ہے پیام اور ، میرا پیام اور ہے
عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے

اقبال واقعی عشق کے دردمند تھے، اور ان کا طرز کلام اور ہی ہے، ایسا کلام جو فکر کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دے، ایسا طرز کلام جو دلوں کو گھلنا سکھا دے اور ایسا طرز کلام جو نابینائے بصیرت کو بینا کر دے، اسی لئے اقبال کی پوری شاعری عمل صالح کی دعوت، منکرات و بے حیائی سے روکنے کی کوشش اور مسلمانوں کو مغربی تہذیب کی یلغار سے بچانے کی سعی و کاوش سے عبارت ہے، اقبال کی مخصوص اصطلاحات —— انسان کامل، مردمومن، عشق اور فلسفۂ خودی —— کی تہہ میں جھانک کر دیکھئے تو ان سب کا فکری سرچشمہ ایک ہی نظر آتا ہے اور وہ ہے دعوت خیر، اقبال کی نگاہ میں اسلام ہی تمام نیکیوں کا منبع اور سرچشمہ ہے، اس لئے الفاظ اور تعبیر کے فرق کے ساتھ ان کے اشعار میں ہر جگہ اسلامی افکار و اقدار کی دعوت ملتی ہے، وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان حقیقی مرد مسلمان بن جائے، وہ مسلمان کی تعریف اس طرح کرتے ہیں کہ مومن ایمان و عمل کے اعتبار سے ہر لحہ ترقی کی راہ پر گامزن رہتا ہے، اس کا قول و فعل اس طرح شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہوتا ہے کہ گویا وہ زبان حال سے اللہ کی برہان اور اللہ کی مرضیات کا ترجمان ہے، وہ ''تخلقوا باخلاق اللہ'' کا مصداق اور صفات باری کا پرتو ہوتا ہے، وہ حق کے معاملہ میں غیرت مند، اپنی ذات کے معاملہ میں حلیم و بردبار اور پاک نفس و پاکدامن ہوا کرتا ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں ، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

مسلمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی سرتاپا قرآن ہو، جیسا کہ حضرت عائشہؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا: **کان خلقه القرآن** :

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے ، حقیقت میں ہے قرآن

وہ موقع ومحل کی رعایت سے گرم بھی ہوتا ہے اور نرم بھی، موم بھی بنتا ہے اور فولاد بھی :

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

علامہ اقبال نے ارکان اسلام میں سے ایک ایک کی اپنے انداز پر بڑی خوبصورت توضیح کی ہے، اس کی حکمت پر روشنی ڈالی ہے اور خوش اُسلوبی کے ساتھ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دی ہے، فرماتے ہیں کہ ایمان ہی اصل ہے اور توحید کے ذریعہ انسان ہر خوف سے نجات پاسکتا ہے، پھر ایمان اگر صدف ہے تو نماز اس کا در بے بہا ہے، جو ایمان کی تجدید کے اعتبار سے قلبِ مسلم کے لئے حج اصغر سے کم نہیں، مومن کے ہاتھ میں یہ ایک خنجر آبدار ہے، جس سے وہ بے حیائی اور برائی کو قتل کرسکتا ہے، روزہ بھوک و پیاس کی برداشت کی وقت پیدا کرتا ہے اور تن پروری کے جذبۂ بے نہایت کو شکست دیتا ہے، حج مومن کو اس کی اصل فطرت کی طرف لاتا ہے اور اس کی اصل فطرت دین کے لئے ہجرت اور دینی اُخوت کے مقابلہ وطن کے رشتہ کو قربان کرنا ہے، زکوٰۃ مال وزر کی محبت کو کم کرتا ہے اور مساوات کا سبق دیتا ہے :

تا عصائے لاالہ داری بدست — ہر طلسم خوف را خواہی شکست
لاالہ باشد صدف ، گوہر نماز — قلب مسلم را حج اصغر نماز

در کف مسلم مثال خنجر است　　قاتل فحشاء و بغی و منکر است
روزہ برجوع و عطش شبخون زند　　خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج　　ہجرت آموز و وطن سوز است حج
حُبِّ دولت را فنا سازد زکوٰۃ　　ہم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

مغرب سے تاثر اور مرعوبیت کے نتیجہ میں بے حیائی کا جو طوفان اُٹھ رہا ہے اور یہ سیل رواں مشرقی تہذیب کی درودیوار کوز میں بوس کرنے کو تیار ہے، اقبال اس تہذیبی فتنہ سے خوب آگاہ تھے؛ کیوں کہ وہ خود مغربی معاشرہ کو سرکی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، اسی لئے اقبال مسلمانوں کو متوجہ کرتے ہیں کہ مغربی علوم وفنون الگ چیزیں ہیں اور مغرب کی الحادی فکر اور حیاباختہ تہذیب وثقافت دوسری شئ ،مغرب کی طاقت کا راز رقص وسرود، بے حجابی، برہنہ ٹانگیں، کٹے ہوئے بال اور الحاد وانکار نہیں ہے، نہ ان کی یہ ترقی لادینی طرز حکومت اور لاطینی خط کی وجہ سے ہے، جیسا کہ ترکی میں کمال اتاترک اور عالم عرب کی بعض دوسری ریاستوں نے سمجھا؛ بلکہ مغرب کی قوت، علم وفن کی وجہ سے ہے اور آتش علم نے ان کے چراغ کو روشن کر رکھا ہے :

قوتِ مغرب نہ از چنگ و رباب　　نے ز رقص دختران بے حجاب
نے ز سحر ساحرانِ لالہ روست　　نے زعریاں ساق ونے ازقطع موست
محکمی او رانہ از لادینی ست　　نے فروغش از خط لاطینی است
قوت افرنگ از علم و فن است　　از ہمیں آتش چراغش روشن است

اس کے ساتھ علامہ اقبال اس بات کے قائل تھے کہ عمل وہی معتبر ہے جس کی تائید وحی الٰہی سے ہو، اگر انسان سائنس وٹکنالوجی میں تو ترقی کے آسمان پر پہنچ جائے؛ لیکن فیضان سماوی سے محروم ہو، تو ان کے کمالات کی حد برق و بخارات ہیں، علم وعمل کے حقیقی کمالات تک فیضان سماوی کے بغیر رسائی نہیں ہوسکتی :

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات

اسی لئے یورپ کی علمی ترقی کو —— جو حسن کردار اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے خالی ہے —— وہ بے فیض سمجھتے تھے، فرماتے ہیں :

یورپ میں بہت روشنیٔ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

ظاہر ہے کہ اس فیضان سماوی کا آخری و مکمل منبع نبوت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم ہے؛ اس لئے اقبال کا کلام محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے پناہ محبت کا آئینہ دار اور اسوۂ محمدی کے اتباع و پیروی کا داعی و ترجمان ہے، اقبال کہتے ہیں کہ جہاں کہیں ہنگامۂ عالم موجود ہے، وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت بے کراں کا پرتو ہے، اگر خلق، تقدیر اور ہدایت کا انتظام اس کائنات کا نقطۂ آغاز ہے تو رسول اللہ ﷺ کا ورود مسعود اس کی انتہاء اور اوج کمال :

ہر کجا ہنگامۂ عالم بود — رحمۃ للعالمینی ہم بود
خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست — رحمۃ للعالمینی انتہاء است

علامہ اقبال نے انسانیت کے لئے رسالت کی ضرورت اور رسالت سے انسانیت کے رشتہ کو مختلف مقامات پر کہیں عقل و فلسفہ کی میزان میں اور کہیں عشق و محبت کی زبان میں پیش کیا ہے، اقبال کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے قالب کو پیدا فرمایا اور رسالت کے ذریعہ اس قالب کو روح ہدایت سے معمور فرمایا، اگر فرد کا وجود اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا مظہر ہے تو ملت کی شیرازہ بندی ذاتِ رسالت سے قائم ہے اور ملت اسی کے آفتاب حسن کی کرنوں سے روشن ہے، مسلمان کی پاک طینت ایک موتی سے کم نہیں؛ کیوں کہ اس کی آب و تاب پیغمبر سے ہے :

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید — وز رسالت در تن ماجاں دمید
فرد از حق، ملت از وے زندہ است — از شعاع مہر او تابندہ است
طینت پاکِ مسلماں گوہر است — آب و تابش از یم پیغمبر است

عمل اور حسن کردار کی اصل بنیاد عشق پر ہے؛ چنانچہ اقبال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو

مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا عشق کی رہین منت ہے اور عشق کا سرچشمہ آپ کا سینۂ مبارک ہے، پس سرور عشق آپ ہی کی مئے دیرینہ سے حاصل ہوسکا ہے :

جہاں از عشق و عشق از سینۂ تُست
سُرورش از مئے دیرینۂ تُست

علامہ اقبال کے یہاں مسلمان کی ساری عزت سنت نبوی کی اتباع اور محبت میں ہے، جو شخص شریعت کا دامن چھوڑ دے، وہ عزت سے بھی محروم رہے گا اور اپنی لیلائے مقصود کو پانے میں بھی ناکام رہے گا :

عزت ہے محبت کی قائم ، اے قیس ! حجاب محمل سے
محمل جو گیا ، عزت بھی گئی ، غیرت بھی گئی ، لیلا بھی گئی

اسی لئے اقبال کے نزدیک دین تمام تر اتباع محمدی سے عبارت ہے، جو شخص اپنی فکر ونظر اور قول وعمل میں اس کسوٹی پر پورا اُتر گیا، اس نے دین کو پالیا او جو صراط مستقیم سے منحرف ہوا، وہ بولہبی میں گرفتار ہے :

بہ مصطفیٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

علامہ اقبال اس بات کے مخالف ہیں: کہ ''چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی'' —— اقبال کہتے ہیں کہ انسان وقت کی سواری نہیں ہے، کہ وقت جدھر چاہے اور جہاں چاہے اسے لے جائے؛ بلکہ وہ خود وقت کی سواری کی سمت متعین کرنے والا شہسوار ہے؛ کیوں کہ وقت کی حدود متعین کرنے والی علامتیں سورج ہوں، چاند ہوں، ستارے ہوں، یہ سب انساں کے خادم ہیں نہ کہ مخدوم :

مہر و مہہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں ، راکب ہے قلندر

اقبال نے ایک اور موقع پر کہا :

حدیث کم نظراں ہے ''تو با زمانہ بساز''
زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

علامہ اقبال نے نہ صرف سلامت فکر، صدق مقال اور اصلاح حال کی دعوت دی ہے، بلکہ یہ رہنمائی بھی کی ہے، کہ انسان کو کس طرح حسن کردار کی نعمت کو بچانا چاہئے؟ منکرات ومفاسد کا منبع کیا ہے؟ کہاں سے منکرات اور بے حیائی کا سیلاب آرہا ہے؟ اور لوگ اپنی کوتاہ فکری کی وجہ سے اسے بہ سروچشم قبول کرتے جارہے ہیں، اقبال نے جہاں الحاد اور مغربی ثقافت پر تنقید کی ہے اور حسن عمل کی دعوت دی ہے، وہیں اس نے ادیبوں اور شاعروں کو بھی متوجہ کیا ہے، کہ ادب برائے ادب ایک بے روح ادب ہے، جو انسان کو حقیقت تک پہنچنے نہیں دیتا، فن تو وہ ہے جو زندگی کو ابدی گداز عطا کرے نہ کہ نفس دو نفس کی لذت، جس ادب سے دل کی دنیا میں تلاطم پیدا نہ ہو اور وہ فکر وعمل کو انقلاب سے ہمکنار نہ کرسکے، وہ ادب کیا ہے؟ اگر ادیبوں کا ادب، شاعروں کے رشحاتِ فکر چمن انسانیت کو افسردہ کرکے رکھ دیں اور اس کے کردار وعمل کے لئے باد سموم بن جائیں تو اس کی کوئی قیمت نہیں، فن کہلانے کا مستحق تو وہ ہے جو انقلابی تاثیر رکھتا ہو اور انسانوں کو حق سے آشنا کرنے کی صلاحیت کا حامل ہو، ورنہ جو علم وفن اور ادب وآرٹ اس قوت اعجاز سے خالی ہو، وہ بے فیض ونامراد ہے :

اے اہل نظر ! ذوق نظر خوب ہے لیکن
جو شئے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا ؟
مقصود ہنر سوز حیات ابدی ہے
یہ ایک نفس دو نفس مثل شرر کیا ؟
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں ! وہ صدف کیا ! وہ گہر کیا ؟
شاعر کی نوا ہوکہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا ؟

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضرب کلیمی نہیں رکھتا ، وہ ہنر کیا ؟

دنیا میں جو بلند پایہ شخصیتیں گذری ہیں، اگر ان کے افکار کا مطالعہ کیا جائے تو اس کی تہہ میں کوئی اور شخصیت بھی چھپی ہوتی ہے، جس کی فکر کا اثر وہ قبول کرتا ہے، علامہ اقبال نے فلسفہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا ؛لیکن وہ اپنی فطرت کے لحاظ سے دماغ سے زیادہ دل کے مالک تھے، وہ عقل کی صحرانوردی اور آبلہ پائی کو بے نتیجہ سمجھتے تھے، ان کا خیال تھا کہ دل اور اس کی غذا ہی انسان کے لئے اصل خضر طریق اور اس کی منزل مقصود کا صحیح رہنما ہے، اقبال نے عقل کی پیچ وتاب اور دل کی سوز وساز دونوں کے ساتھ سفر کیا :

اسی کشمکش میں گذریں میری زندگی کی راتیں
کبھی سوز و ساز رومی ، کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن بالآخر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دل کے سوز وساز ہی میں انسان کا اصل علاج مخفی ہے، اقبال اس حقیقت کو دوٹوک طریقہ پر بیان کرتے ہیں :

نے مہرہ باقی ، نے مہرہ بازی
جیتا ہے رومی ، ہارا ہے رازی

ایک اور موقع پر کہتے ہیں کہ فرنگیوں کے فسوں کا علاج آتش رومی ہی سے ہوسکتا ہے :

علاج آتش رومی کے سوز میں ہے تیرا
تیری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

یہ دل کی غذا اور دل کی انگیٹھیوں کو گرم کرنے والی دوا انھیں مولانا روم سے حاصل ہوئی اور اس نے انھیں عقل وفلسفہ کے دشت بے آب سے نکال کر روحانیت کی آب حیات سے ہم کنار کیا :

صحبت پیر روم سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بہ جیب ، ایک کلیم سر بہ کف

اقبال کی خوش قسمتی ہے کہ انھیں مولانا روم جیسا صاحب بصیرت اور صاحب دل پیر رومی مل گیا اور یہ مولانا روم کی بھی خوش بختی ہے کہ انھیں تقریباً سات سو سال بعد ایک ایسا اَن دیکھا مرید حاصل ہوا، جس نے ان کی فکر کو ایک نئی جہت اور ایک نئی زبان دی، اوران کے پیغام کو ان لوگوں تک پہنچایا، جوان کی زبان سے بھی نا آشنا ہیں، چنانچہ اقبال نے اپنی نظم ''پیر و مرید'' میں مولانا روم کو ''پیر رومی'' اور اپنے آپ کو ''مرید ہندی'' کی حیثیت سے پیش کیا ہے، اقبال کو اس بات پر فخر ہے کہ وہ روم وتبریز کے رمز آشنا ہیں، اپنے بارے میں فرماتے ہیں :

برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال پر مولانا روم کا کتنا اثر تھا؟ انھوں نے مولانا روم کو اپنے لئے آئیڈل بنایا تھا اور اقبال نے اُردو شاعری کو جو ایک نئی جہت دی اوراس کو آوارہ خیالی کی بجائے تعمیر فکر اور تعمیر کردار کا ذریعہ بنایا، اس میں اس تاثر اور فکری ارتباط کا بڑا حصہ تھا۔

اقبال کی بارے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ انھوں نے نہ صرف تعمیر کردار کو اپنا موضوع بنایا، بلکہ اُردو شاعری میں ایک نئی روح پھونکی، اس کو ایک نئے شعور سے آشنا کیا اوراسے مادیت سے روحانیت کی طرف کھینچنے کے لئے کوشاں رہے، اس لئے اقبال کے بعد اُردو شاعری میں صالح اور تعمیری رجحانات کی ترجمانی زیادہ ملتی ہے، ایسانہیں ہے کہ اقبال سے پہلے دوسرے شعراءنہیں تھے، لیکن انھیں مئے خانہ ادب میں ''زاہد خشک'' اور ''واعظ سمع خراش'' تصور کیا جاتا تھا اور نظر انداز کر دیا جاتا تھا، اقبال واقعی اقبال تھے، وہ شعر وسخن کے اُفق پر خورشید جہاں تاب بن کر طلوع ہوئے، ان کی ضوفشاں کرنوں کے آگے تمام ستارے بجھ سے گئے، اس لئے اقبال کی شاعری، اس کے لب ولہجہ کا جوش وخروش اور اُسلوب کی اس خوبصورتی کے واسطہ سے دل کے دروازہ پر دستک دینے والی فکر رسا سے منھ موڑ لینا اور اسے نظر انداز کر دینا ممکن نہیں تھا، اس لئے اقبال نے نہ صرف اپنی شاعری کو تعمیر کردار کا نقیب بنایا؛ بلکہ بہت سے برادران ادب کو یہ راہ دکھائی اور انھیں فکر وخیال کی ایک نئی حیثیت اور تعمیری جہت سے روشناس کرایا۔

❀ ❀ ❀

مفکر اسلام مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجادؒ

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش روشنی دی زمانے کو

۱۹۱۷ء ہندوستان کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے، اسی سال تحریک ریشمی رومال شروع ہوکر ناکامی پر اختتام پذیر ہوئی، اس تحریک کے پیچھے شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اوران کے رفقاء کا دماغ کارفرما تھا، اگر قبل از وقت یہ تحریک کھل نہ جاتی اور کامیابی سے ہمکنار ہوجاتی تو مستقبل پراس کے گہرے اثرات مرتب ہوتے، اس تحریک نے برطانوی حکومت میں یہ تاثر پیدا کیا کہ یہ سیدھے سادھے مولوی جو مدرسوں اور خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے ہیں، انھیں بے خبر اور کمزور نہ سمجھنا چاہئے، یہ بڑی سے بڑی تحریک کو وجود میں لاسکتے ہیں؛ چنانچہ اسی احساس کے تحت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، ان کے رفقاء اور اکثر مذہبی قائدین گرفتار کر لئے گئے اور جنگ آزادی کا میدانِ کارزار گویا خالی ہوگیا۔

لیکن ٹھیک انھیں حالات میں جب میدان عمل رجال کار سے خالی ہو چکا تھا، ایک خاموش اور مستور شخصیت تھی، جو گیا کے گوشۂ عزلت میں بیٹھ کر مسلمانوں کے بین الاقوامی زوال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بے چین ہورہی تھی، اس نے اپنے سینہ میں جو ''دل دردمند'' پایا تھا، وہ اسے بے تاب کئے دے رہا تھا، ملی غیرت وحمیت کے علاوہ حق تعالیٰ نے اس کو ''فکر ارجمند'' سے بھی نوازا تھا، مسلمانوں کے ادبار سے اس کا حساس دل پاش پاش ہوا جاتا تھا، بالآخر اس صورت حال نے اس کو درسگاہ کا گوشۂ عافیت چھوڑ کر پاکیزہ سیاست اور قومی خدمات کی منجدھار میں قدم ڈالنے پر مجبور کردیا، یہ مرد درویش کون تھا؟ —— یہ تھے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ!

رنگ گندم گوں، میانہ قد، دبلے پتلے، پیشانی فراخ، سلوٹیں لئے ہوئی، داڑھی گھنی، سینہ کشادہ، سر پر عمامہ یا دوپلہ ٹوپی، جسم پر کرتا اور شلوار، کپڑا کھدر کا معمولی قسم کا، متواضع، نرم خو اور چشم پوش، مگر دینی معاملات میں اتنے ہی سخت گیر اور ثابت قدم، احباب ان کی غمگساری اور اصابت رائے کے مداح، مخالفین ان کے اخلاص اور سوز دروں کے معترف، علماء ان کی علمی بصیرت کے معترف، صلحاء ان کے صلاح وتقویٰ کے ثنا خواں، مصیبتوں اور پریشانیوں میں خنداں، ملت کے زوال وانحطاط پر گریاں، مظلوموں اور بے کسوں کے لئے ماویٰ وغمخوار، اعداء اسلام کے لئے برہنہ تلوار، کردار گفتار سے، دل ودماغ جسم وتن سے اور حال قال سے کہیں بڑھ کر، ملی حمیت اور دینی غیرت خداداد، سیاسی بصیرت اپنی مثال آپ، بادشاہ گر مگر خود درویشِ عزیز، رزم ہو یا بزم، ہر جگہ چمکنے اور چہکنے والے اور اسلام کی ترجمانی کا حق ادا کرنے والے، اخلاص وللّٰہیت کے پیکر، ریا، دکھاوے اور نام ونمود کے جذبہ سے بے نیاز ''نوّر اللہ مرقدہ''۔

سیاسی مسلک

یہی مولانا محمود حسن صاحبؒ کی اسارت مالٹا کا دور ہے، جہاں سے مولاناؒ کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، مولانا کی زندگی کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ سیاسی مسائل میں ان کا نقطۂ نظر اور لوگوں سے مختلف تھا، جسے بعد کو عملاً دوسرے بزرگوں نے بھی اختیار کیا، آزادی کی جنگ میں شریک ہونے والے بہت سے مسلمان آزادی حاصل کرنے اور انگریزوں کو بھگانے کے جوش میں اس کو فراموش کر جاتے تھے کہ ملک کے آزاد ہونے کے بعد مسلمانوں کی سیاسی پوزیشن کیا ہوگی اور آزاد ہندوستان میں ان کو اپنے ملی تشخص کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنے کے لئے کیا کرنا چاہئے؟ —— بعض حضرات نے آزادی ہی کو اپنی منزل مقصود تصور کرلیا تھا؛ حالاں کہ یہ ایک غلط فہمی تھی، انگریزوں کے رہنے اور چلے جانے کے درمیان اس کے سوا اور کوئی فرق نہیں تھا کہ مسلمانوں کے حریف ''بدیشی'' کے بجائے ''سدیشی'' ہوجاتے؛ لیکن مولانا نے کبھی ''راہ'' اور ''منزل'' کے فرق کو فراموش نہیں کیا اور ملک کی آزادی کے لئے لڑنے کے ساتھ ساتھ پہلے ایسے اقدامات کئے اور ایسی تنظیموں کی داغ بیل ڈالی، جو

مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور ان کو ایک باوقار اور مضبوط و متحد اُمت کی حیثیت سے باقی رکھنے کا فریضہ انجام دے؛ تاکہ آزادی کے بعد ان کی یہ ''پس اندوختہ جدوجہد'' ان کو زیادہ سے زیادہ باوقار حیثیت دلا سکے اور وہ اس ملک میں اپنے ملی تشخص اور انفرادیت کے ساتھ زندہ رہیں۔

اس کا اندازہ اس واقعے سے کیا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد جب گرفتار ہوکر رانچی آئے تو ان کے ذہن میں بھی ایک تنظیم قائم کرنے کا تصور تھا اور وہی دور تھا جب مولانا سجاد صاحبؒ بھی مسلمانوں کی علاحدہ تنظیم کے لئے کوشاں تھے، مگر مولانا آزاد کے سامنے تنظیم کا جو نقشہ تھا، وہ ملک کی آزادی کے لئے عسکری جدوجہد تھی، جس کا نام وہ ''حزب اللہ'' رکھنا چاہتے تھے، جب کہ مولانا سجادؒ کے سامنے ایک ''مثبت'' پروگرام تھا، یعنی ''امارت شرعیہ'' کا قیام؛ تاکہ آئینی حدود میں رہ کر اس کے ذریعہ مسلمان اپنی دینی اقدار کو محفوظ رکھیں، یہاں تک کہ آزادی کے بعد بھی مذہبی تشخص کو ان کا دستوری حق تسلیم کرلیا جائے اور اسی مشترکہ پلیٹ فارم سے آزادی کے مجاہدین کا تعاون بھی کیا جائے۔

مولانا کی اس سیاسی پالیسی سے منطقی طور پر جو دوسرا نتیجہ نکالا جاسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ مولانا کے نزدیک ملی مسائل کو ملکی مسائل پر ترجیح حاصل تھی، وہ قوم پرست لیڈروں کے ساتھ اتنی دور نہیں جاسکتے تھے، جہاں جاکر مذہبی معاملات میں مداہنت کا شکار ہونا پڑتا ہے، اس باب میں رواداری اور رعایت کی ان کے یہاں کوئی گنجائش نہ تھی، یہی وجہ ہے کہ مولانا ہمیشہ کانگریس میں مشروط شرکت کے قائل رہے اور جہاں بھی دین میں مداخلت، یا مسلمانوں سے ناانصافی محسوس کی تو مصلحت شناسی اور رواداری ان کی زبان بند نہ کرسکی اور پوری جرأت سے انھوں نے مخالفت کی۔

تیسرے: مولاناؒ اس کے قائل نہ تھے کہ ''بہت بہتر'' کی موہوم اُمید پر نسبتاً ''کم بہتر'' کو ـــــ جو حاصل ہورہا ہو ـــــ چھوڑ دیا جائے، یہاں تک کہ دونوں سے ہاتھ دھونا پڑے؛ بلکہ وہ ''کم'' کو قبول کرکے ''مزید'' کے لئے کوشاں رہتے تھے، مثلاً ''اقامت دین'' کی جدوجہد

مولاناؒ کا خاص مشن تھا، مگر جب انھوں نے یہ محسوس کیا کہ موجودہ حالات میں مسلمان ایک مکمل دارالاسلام (اسلامی اسٹیٹ) قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں تو ہندوستان کے حالات زیادہ سے زیادہ جس ''اجتماعی نظام'' کو برپا کرنے کی اجازت دیتے ہیں، مولاناؒ نے امارت شرعیہ کی صورت میں اس کی داغ بیل ڈالی۔

اسی طرح مولانا زیادہ نقصان کے مقابلہ ''کم نقصان'' گوارا کر لینے کے قائل تھے، مثلاً پارلیمانی انتخاب میں حصہ لینا اگرچہ ایک درجہ میں ''حکومت کافرہ'' کے ساتھ تعاون تھا؛ لیکن چوں کہ حکومت میں مسلمانوں کی نمائندگی نہ ہونے کی صورت میں اس سے بڑھ کر نقصان پہنچ سکتا ہے اور حکومت مسلمانوں کے ملی تشخص اور بچے کھچے مذہبی حقوق پر بھی ہاتھ ڈال سکتی ہے، اس لئے مولانا اول دن سے مسلمانوں کے بھی انتخاب میں حصہ لینے کے قائل تھے۔

مولانا ہمیشہ اپنی اسی سوچ پر عامل رہے کہ سیاسی وابستگی دین وملت سے فروتر ہے؛ اس لئے ممکن نہ تھا کہ دین وملت کے مسائل میں سیاست ذرا بھی آپ کے قول وعمل پر اثر انداز ہوجائے، مولانا کانگریس کے حامیوں میں تھے اور کانگریس کے اسٹیج سے خطاب بھی کرتے تھے؛ لیکن جب بھی کانگریس کا کوئی عمل مسلمانوں کے دینی یا قومی مفاد کے خلاف ہوتا تو آپ بلا جھجھک اور پوری شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کرتے، ۱۹۳۷ء میں حکومت بہار نے زرعی انکم ٹیکس کا قانون پاس کیا اور مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی، مسلم ممبران اسمبلی کے ذریعہ اس کے خلاف اسمبلی میں آواز اٹھوائی، فضاء ہموار کی، بالآخر ۲۹ / اپریل ۱۹۳۸ء کو اسمبلی میں حکومت بہار نے مولانا کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا اور وقف کی جائداد کو ٹیکس سے مستثنیٰ کردیا، پھر اس کے بعد آپ نے مسلم اوقاف کا ایک بل مرتب فرمایا اور اسے بہار اسمبلی میں پیش کرایا، جو منظور ہوا، جب گاؤکشی کا مسئلہ اُٹھا تو کانگریس پارٹی کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو رضاکارانہ طور پر اسے تسلیم کرلینا چاہئے اور گائے کی قربانی نہیں کرنی چاہئے، مولانا نے اس کے خلاف بھی آواز بلند کی اور اس پر اپنا ایک تفصیلی فتویٰ تحریر فرمایا، جو مولانا کی فقہی بصیرت کا آئینہ دار ہے اور فتاویٰ امارت شرعیہ جلد اول میں شامل ہے۔

۱۹۳۹ء میں ایک قانون پاس ہوا، جس میں دَین مہر اور جہیز کو قانونی جرم قرار دیا گیا تھا، مولانا نے اس کی سخت مخالفت کی اور امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ —— جو مولانا کی تائید سے رکن اسمبلی منتخب ہوئے تھے —— کے ذریعے بہار اسمبلی میں اپنے موقف کی ترجمانی کرائی، بالآخر مسلمان اس سے مستثنیٰ کردیئے گئے، جب شدھی تحریک شروع ہوئی تو کانگریس کے اعلیٰ قائدین کی رائے تھی کہ مسلمان اس کی مخالفت میں زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ نہیں کریں اور کانگریس کے مسلم قائدین بھی تذبذب میں تھے؛ تاکہ ہندو مسلم نفرت کی فضاء پیدا نہ ہوجائے، جو انگریز چاہتے تھے؛ لیکن مولانا کی اسلامی حمیت نے اس معاملے میں کسی رواداری کو گوارہ نہ کیا، آپ نے پوری قوت وشدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی اور عملی طور پر ہندو فرقہ پرستوں کی اس مہم کو ناکام بنادیا۔

۱۹۳۷ء میں جب بہار میں الیکشن ہوا تو مولانا نے ''مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی'' قائم کی، مولانا خود اس پارٹی کے سرپرست تھے اور امارت شرعیہ اس کی تائید کرتی تھی، کانگریس کے بعد سب سے زیادہ سیٹیں اسی پارٹی کو حاصل ہوئیں؛ لیکن کانگریس نے حکومت بنانے سے انکار کردیا، مولانا نے محسوس کیا کہ اگر مسلم انڈی پینڈینٹ پارٹی حکومت بنالیتی ہے تو یہ مسلمانوں کے مفاد میں ہوگا؛ چنانچہ اس پارٹی نے حکومت بنائی اور جناب محمد یونس وزیر اعلیٰ بنائے گئے، اس حکومت نے مسلمانوں کے حق میں کئی اہم فیصلے کیے، جن میں ایک اُردو زبان سے متعلق تھا، یہاں تک کہ کانگریس کے فرقہ پرست لیڈر محسوس کرنے لگے کہ انھوں نے حکومت نہ بنا کر غلطی کی ہے، غرض کہ مولانا کے یہاں دین وملت کے تعلق کو ہر تعلق پر تقدم حاصل تھا اور جب کبھی ملی مفادات خطرہ میں پڑتے تھے، آپ اس کے خلاف شمشیر برہنہ بن جاتے تھے۔

جمعیۃ علماء بہار کا قیام

مولانا نے اس سلسلہ میں سب سے پہلا اقدام یہ کیا کہ 'مدرسہ انوار العلوم' گیا، کے سالانہ اجلاس اکتوبر ۱۹۱۷ء میں پورے صوبہ کے علماء کو دعوت دی اور علماء کی ایک کثیر تعداد کو

اکٹھا فرما کر ان کی ایک متحدہ تنظیم بنائی، جو ''انجمن علماء بہار'' کے نام سے موسوم ہوئی۔

یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان گیر پیمانہ پر قائم ہونے والی جمعیۃ کا مولانا گیلانی (متوفی: ۵۶ھ) کے الفاظ میں خواب بھی نہیں دیکھا گیا تھا؛ لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ مولانا سجادؒ صرف بہار کی حد تک جمعیۃ پر قناعت کر لینے کا ارادہ رکھتے تھے؛ بلکہ مولانا شروع ہی سے ''جمعیۃ علماء ہند'' کا قیام چاہتے تھے؛ چنانچہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ (متوفی:۵۶ھ) فرماتے ہیں :

ابھی چند مہینے ہوئے کہ استھاواں کا الکن خطیب (مولانا سجادؒ)
خانقاہ مونگیر اس غرض سے آیا ہوا تھا کہ علماء کی منتشر اور پراگندہ
جماعت کو ایک نقطہ پر خاص سیاسی خیالات کے ساتھ جمع کیا جائے،
پھر بتدریج اس کا دائرہ بڑھایا جائے۔

یہ تنظیم کئی وجوہ سے غیر معمولی اہمیت کی حامل تھی، پہلی بات یہ ہے کہ یہی علماء دراصل مسلمانوں کے ارباب حل وعقد تھے، ان ہی کو قوم کی امامت اور قیادت کا فریضہ انجام دینا تھا؛ لیکن بدقسمتی سے قوم کا یہ دماغ اپنے آپ کو وقتی مصالح اور عصری تقاضوں سے کاٹ کر گوشوں میں فروکش ہو چکا تھا، مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت مرادآباد میں اس پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے۔

دوسرے: مسلمانوں کا باہمی انتشار اور گروہ بندیاں ہی دراصل مسلمانوں کے عالمگیر زوال کا سبب تھیں، پھر یہ بھی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مذہبی سطح پر جو کچھ نزاعات تھے، دراصل وہ علماء ہی کے آپسی اختلاف پر مبنی تھے، اگر یہ حضرات ایک پلیٹ فارم پر کھڑے ہونے اور دوش بدوش ہو کر کوئی کام کرنے کو آمادہ ہو جائیں اور ''قدر مشترک'' کے لئے مشترکہ جدوجہد کرنے کو آمادہ ہوں تو ان کی باہمی غلط فہمیاں بھی کم ہو جاتیں، خواص اور عوام دونوں طبقوں سے پراگندگی دور ہوتی اور رفتہ رفتہ علماء کی یہ تنظیم مسلمانوں کی ایسی تنظیم کا ذریعہ بن سکتی تھی، جو مسلکی اور گروہی اختلافات اور عصبیتوں سے بالاتر ہو کر ملی مسائل سے نمٹے اور بے شک جمعیۃ اس حیثیت سے اپنے مقصد میں کامیاب رہی۔

اس نوخیز جمعیۃ کا پہلا باضابطہ اجلاس بہار کے تاریخی شہر اور اس وقت کی مشہور درسگاہ ''مدرسہ عزیزیہ بہار شریف'' میں ۵-۶/شوال ۱۳۳۶ھ کو مشہور واعظ و یکے از بانیان تحریک ندوۃ العلماء شاہ سلیمان پھلواروی (۱۸۵۹-۱۹۳۵) کے زیر صدارت منعقد ہوا، جو غالبًا اس حیثیت سے اپنی نوعیت کا پہلا اجلاس تھا کہ اس میں بڑی تعداد میں مختلف مسلک و مشرب کے علماء شریک ہوئے، اس اجلاس میں علماء کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضۂ منصبی کی طرف متوجہ کرنے کے علاوہ مولانا محمود حسن صاحبؒ (دیوبند) اور مولانا ابوالکلام آزادؒ وغیرہ کی رہائی کا مطالبہ کیا گیا، نیز ''ذبح گاؤ'' کو شعائرِ اسلام قرار دیتے ہوئے اس معاہدہ کی مخالفت کی گئی، جس میں ''ذبح گاؤ'' کے چھوڑ دینے پر مصالحت کر لی گئی تھی، ان تجاویز کی روشنی میں کوئی بھی صاحب انصاف فیصلہ کر سکتا ہے کہ اُس جمعیۃ نے اس وقت کے دشوار گذار اور مایوس کن حالات میں میدانِ عمل سے کھنچے اور ملت کے مسائل سے کٹے ہوئے علماء کو میدانِ عمل میں آکر جدوجہد کرنے اور ان کو سرد و گرم سے نمٹنے پر آمادہ کرنے میں کیا رول ادا کیا؟

خلافت کمیٹی

پھر یہی دور تھا جب ''خلافتِ عثمانیہ'' کے خلاف تمام اسلام دشمن طاقتیں دوش بدوش متحد ہو کر برسرِ پیکار تھیں، جب مسلسل تگ و دو کے باوجود ان کو کامیابی نہ ہو سکی تو انھوں نے اس کے لئے ایک نیا حربہ اختیار کیا اور خلافت ترکیہ کو داخلی جھگڑوں میں اُلجھانے کی سازش شروع کر دی گئی، انگریزوں نے اپنے اس مقصد کے لئے ''قومیت'' اور ''وطنیت'' کا نشتر چلایا، جو تیر بہدف ثابت ہوا۔

حجاز میں شریف حسین کی صورت میں انگریزوں کو ایک مہرہ ہاتھ آ گیا، شریف حسین کو حجاز، شام، عراق اور فلسطین کی وسیع و عریض سلطنت کی بادشاہت کا حسین خواب دکھایا گیا اور بغاوت کرا دی گئی، آخر اقتدار کی حرص اور وطن پرستی کے جاہلی جذبہ نے خلافت کو تنہا کر دیا اور بالآخر خلافت عثمانیہ کو اتحادیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی، اس طرح عالم اسلام ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا، حجاز پر شریف حسین، شام پر ان کے بیٹے، اُردن میں شاہ عبداللہ کی حکومتیں قائم

ہوگئیں اور مستقبل قریب میں اسرائیل کے قیام کی راہ ہموار ہوگئی۔

ایک طرف عالم اسلام کی متحدہ طاقت کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے مختلف چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں تقسیم کر دیا گیا، دوسری طرف ترکی، آرینیا اور تھریس تک محدود ہوکر رہ گیا اور اس میں بھی عملاً ترکوں کو بے اختیار بنا دیا گیا۔

ترکی کی شکست صرف ترکی کا مسئلہ نہ تھا، پورے عالم اسلام اور مقامات مقدسہ کے تحفظ کا مسئلہ تھا؛ اسی لئے ہندوستان کے مسلمان بھی اس واقعہ سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہے اور ترکی کی مدد کے لئے ہندوستان میں ''خلافت کمیٹی'' قائم کی گئی، جس نے حکومت برطانیہ سے قسطنطنیہ، تھریس، اناطولیہ اور آرمینیا میں مستقل اور آزاد حکومت کے قیام کا مطالبہ کیا اور ترکوں کی مالی اعانت بھی کی، یہ خلافت تحریک ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۲ء تک ہندوستان کی پُرشور اور اہم ترین تحریک رہی ہے، اس تحریک میں ہندو مسلم اتحاد کا جیسا مظاہرہ ہوا، وہ اس کے بعد دیکھنے میں نہیں آیا۔

اس خلافت کمیٹی کے مؤسسین میں مولانا سجاد صاحبؒ بھی تھے، مولانا سجادؒ صاحب نے اس بارے میں مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے تبادلۂ خیال کیا اور انھیں دونوں بزرگوں کی تحریک پر مولانا محمد علی جوہرؒ، مفتی محمد کفایت اللہ صاحب، مولانا شوکت علیؒ، حکیم اجمل خاں اور بعض دیگر علماء وقائدین کی مشاورت سے ممبئی میں خلافت کمیٹی کی بنیاد پڑی۔

مولانا ممبئی سے واپس آئے اور گیا میں دوسری اور پھلواری شریف میں تیسری خلافت کمیٹی قائم کی اور مولانا ہی کی تحریک اور سعی سے پھلواری شریف میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا، جس کی صدارت امیر شریعت ثانی شاہ محی الدین صاحب نے فرمائی، اس کے بعد برابر مولانا اس تحریک کے دل ودماغ بنے رہے، مولانا کی یہی صلاحیت تھی کہ ۱۹۲۲ء میں گیا میں ہونے والی آل انڈیا خلافت و جمعیۃ علماء کانفرنس کے اجلاس کے موقع پر معروف عالم ابولبرکات مولانا عبدالرؤف داناپوری صدر مجلس استقبالیہ نے برسرعام مولانا کے متعلق اعتراف کیا کہ ہندوستان اگر ابھی آزاد ملک ہوتا تو اس کا گورنر جنرل مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو بنایا جاتا اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند نے اس کی تائید فرمائی —— اس کے بعد مولانا بہار میں مختلف

مقامات پر خلافت کے جلسے کراتے رہے اور مالی معاونت کے سلسلہ میں کوشاں رہے۔

جمعیۃ علماء ہند

جیسا کہ ذکر ہوا مولانا محمد سجاد صاحبؒ نے 'انجمن علماء بہار' کی بنیاد رکھی تھی، اس وقت آپ کا دائرۂ کار اور حلقۂ اثر بظاہر صوبہ بہار تک محدود تھا؛ لیکن تحریک خلافت نے آپ کے روابط کو ہندوستان گیر سطح پر وسیع کر دیا، اس کے بعد ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کی بنیاد پڑی، اس کی تاسیسی نشست مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی دعوت پر امرتسر میں مولانا عبدالباری فرنگیؒ کے زیر صدارت منعقد ہوئی، مولانا سجاد صاحبؒ اس کے محرکین اور داعیان میں تھے؛ لیکن کسی مجبوری کی وجہ سے اس نشست میں شریک نہیں ہو سکے؛ البتہ اپنا نمائندہ بھیجا، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا احمد سعید دہلوی اور مولانا آزاد سبحانی نیز دوسرے رفقاء نے شرکت فرمائی اور اس پہلی نشست کے تمام شرکاء بنیادی ارکان تسلیم کئے گئے، پس بظاہر جمعیۃ کے قیام کے بھی محرک اول مولانا ہی تھے؛ اس لئے کہ آپ اس سے پہلے بہار کی سطح پر ایسی ہی تنظیم قائم کر چکے تھے اور اس کی حیثیت ایک عملی نمونہ کی تھی۔

اس کے بعد سال بہ سال جمعیۃ کے اجلاس ہوتے رہے، جن کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، اس زمانہ میں جمعیۃ علماء کی حیثیت وہی تھی، جو اس وقت ''آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ'' کی ہے، مولانا برابر جلسوں میں شرکت فرماتے رہے اور شروع سے عاملہ کے رکن رکین رہے، ہمیشہ آپ کی قانونی بصیرت اور سیاسی دوراندیشی کا لوہا مانا جاتا رہا، مختلف مواقع پر حکومت کے منظور کردہ یا مجوزہ کسی ایکٹ میں ترمیم یا اس کا کوئی متبادل فارمولہ پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو یہ اہم کام آپ ہی کو سونپا جاتا، آپ بولتے کم تھے، زبان میں لکنت تھی، اس لئے عام جلسوں میں آپ تقریر کم کرتے تھے؛ لیکن جمعیۃ کے انتظامی اور تحریکی معاملات میں آپ کی حیثیت ''روح'' کی تھی؛ چنانچہ مولانا محمد میاں فرماتے ہیں :

> جمعیۃ علماء ہند کے صدر مفتی اعظم حضرت مولانا کفایت اللہ اور ناظم اعلیٰ سبحان الہند حضرت مولانا احمد سعید تھے، مگر وہ ڈاکٹر جس کو بہت

سے انجکشن دے دیئے گئے تھے، ابوالمحاسن حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ نائب امیر شریعت تھے۔(الجمعیۃ مجاہد الملت نمبر،ص:۴۵)

دائرہ حربیہ

ہندوستان کی مکمل آزادی کی لڑائی دراصل ۱۹۳۰ء سے شروع ہوتی ہے، اسی سال لاہور کے ''اجلاس آل انڈیا کانگریس'' میں کانگریس نے مکمل آزادی کے مطالبہ کی تجویز پاس کردی، مسلمانوں کی کسی تنظیم نے اب تک مکمل آزادی کی تجویز منظور نہیں کی تھی؛ چنانچہ اسی سال امروہہ کے اجلاس میں ''جمعیۃ علماء ہند'' نے بھی یہی تجویز منظور کی اور جنگ آزادی میں شرکت کا فیصلہ کیا، جمعیۃ علماء کی پالیسی یہ تھی کہ جنگ آزادی میں شرکت، اس سلسلہ میں گرفتاری کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے اور سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے لئے ایک مستقل نظام قائم کیا جائے اور چوں کہ گورنمنٹ نے اس سلسلہ میں قانونی پہرہ بٹھا رکھا تھا، اس لئے اس کی بھی ضرورت تھی کہ کوئی خفیہ انتظامیہ ہو، جو رضا کاروں کو گرفتار ہونے اور قانون کی خلاف ورزی کرنے پر آمادہ کرے اور پھر ان کے وفود کا اجتماعی جلوس اس طرح نکالا جائے کہ گورنمنٹ کو اس سرچشمہ کی اطلاع بھی نہ ہوسکے، کانگریس نے اس مقصد کے لئے ''جنگی کونسل'' قائم کی اور جمعیۃ علماء نے ''دائرۂ حربیہ'' —— اس کے لئے ایک مدبر، ہوش مند، جری اور صاحب عزیمت منتظم کی ضرورت تھی، ہندوستان میں یہ وقت مسلم قیادت کے شباب کا تھا اور جمعیۃ اس وقت ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق تھی؛ مگر اس کے لئے جس شخصیت کا انتخاب عمل میں آیا، وہ مولانا سجادؒ ہی تھے۔

ترک موالات

۱۹۱۶ء میں جب خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی گئی، کانگریس نے ''عدم تشدد'' کی پالیسی اپناتے ہوئے انگریزی سامانِ تجارت —— کپڑے وغیرہ —— کا بائیکاٹ کیا، اس معاملہ میں خلافت کمیٹی بھی کانگریس کی ہم نوا تھی، مگر مسلمان اس کو محض سیاسی مسئلہ کی حیثیت سے دیکھتے تھے اور اس تحریک سے زیادہ قریب نہیں تھے، اس موقع پر ''جمعیۃ علماء ہند'' نے بھی ''ترک موالات''

کی تجویز پاس کردی اوراس کی شرعی حیثیت پرایک تفصیلی فتویٰ مرتب کیا،جس میں کتاب وسنت کی روشنی میں کافرین محاربین کے احکام پر روشنی ڈالتے ہوئے مسلمانوں سے ترک موالات کا مطالبہ کیا گیا تھااوراس پرمختلف مکاتب فکر کے پانچ سوعلماء کرام کے توثیقی دستخط لئے گئے تھے۔

اس فاضلانہ فتویٰ کوغیر معمولی اہمیت حاصل ہوئی اوراس کی وجہ سے مسلمانوں نے بھی پورے جوش وخروش سے تحریک کا تعاون کیا، کانگریس اور خلافت کمیٹی نے بھی اس فتویٰ سے اپنے کاز کو مدد پہنچائی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کے بیان کے مطابق وہ فتویٰ مولانا ہی کا ترتیب دیا ہوا تھا، جوآپ کی علمی، فقہی اورسیاسی بصیرت کا آئینہ دار ہے، بالآخر حکومت نے اس فتویٰ کوضبط کرلیا۔

شعبۂ تبلیغ اسلام

۱۹۲۲ء میں شدھی تحریک کا آغاز ہوااور مسلمانوں کے ایمان کوعیسائی مشنریز کے علاوہ برادرانِ وطن کی جانب سے بھی خطرہ لاحق ہوگیا، اس دعوتِ ارتداد کے نتیجہ میں بڑی تعداد میں ناخواندہ اور مفلس مسلمان مرتد ہونے لگے، اس موقع پر ملک کی بعض دوسری تحریکوں کے علاوہ ''جمعیۃ علماء ہند'' نے بھی اسلام کی حفاظت وتبلیغ کے سلسلہ میں مؤثر رول ادا کیا اوراسی مقصد کے لئے یہ شعبۂ قائم کیا گیا۔

اس شعبہ کے ناظم مولانا ابوالمعارف محمد عرفان صاحب منتخب کئے گئے اورسترہ ممتاز علماء ومفکرین پرمشتمل ایک انتظامیہ بنی، جس میں مولانا بھی تھے، مولانا جمعیۃ کے اس شعبہ سے بطور خاص دلچسپی لیتے تھے، ۷رنومبر ۲۳ءکواس کا اجلاس دہلی میں ہوا تو آپ اس کی تمام نشستوں میں موجود رہے، مولانا ہی کی تحریک اوراصرار پراس اجلاس میں یہ تجویز طے پائی کہ ''الداعی'' کے نام سے اس شعبہ کا ایک ہفتہ وار'' آرگن'' نکلے۔

پھر ۲۶-۲۷راگست ۱۹۴۳ءکواس کا ایک اہم انتظامی اجلاس ہوا، اس میں بھی آپ تمام نشستوں میں شریک رہے، اس موقع پر نومسلم مردوں اورعورتوں کی تعلیم وتربیت، دستکاری اورصنعت وحرفت وغیرہ کے سلسلہ میں درسگاہ کے قیام کی تجویز آئی تو مولانا ہی کے ذمہ اس کی

عملی، انتظامی اور دستوری صورتوں کا خاکہ تیار کرنے کا کام سونپا گیا ـــ مولانا نے اس سلسلہ میں امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے بھی بڑی جانفشانی فرمائی ہے، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

سائمن کمیشن

''ہندوستان کو محدود اختیارات اور آزادی'' کے لئے سائمن کمیشن نام سے ایک کمیشن مقرر کیا گیا تھا، اس سلسلہ میں اس سے پہلے ''نہرو رپورٹ'' بھی آچکی تھی، جسے مسلمانوں نے مسترد کر دیا تھا، ''سائمن کمیشن'' کی سفارشات میں بھی مسلم مفاد کی رعایت نہیں کی گئی تھی، قانون ساز اسمبلی کے لئے مسلمانوں کا تناسب کم رکھا گیا تھا، پرسنل لا کے تحفظ اور اُردو زبان کا کوئی ذکر نہ تھا، سندھ کو علاحدہ ریاست قرار دینے کے مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور متعدد دوسری خامیاں تھیں، جس کی وجہ سے یہ رپورٹ ''نہرو رپورٹ'' سے بھی زیادہ مسلمانوں کے لئے ناقابل قبول تھی۔

سب سے پہلے جمعیۃ علماء ہند نے لاہور کے اجلاس میں ''جو مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے زیر صدارت منعقد ہوا تھا'' اس سے اختلاف کیا، مولانا سجاد صاحبؒ اس کی مخالفت کرنے والوں میں پیش پیش تھے اور اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ آپ کے رفقاء میں قانونی باریکیوں پر آپ سے زیادہ گہری نگاہ رکھنے والا اور کوئی نہ تھا، جریدۂ 'امارت' میں بھی آپ نے اس کے خلافت مضامین لکھائے اور خود ۳ر جولائی ۱۹۳۰ء کو جمعیۃ علماء صوبہ بہار اور امارت شرعیہ کے زیر اہتمام ''نیشنلسٹ مسلم کانفرنس بہار و اُڑیسہ'' بلائی، جس کے صدر مجلس استقبالیہ خود مولاناؒ تھے، مولانا حسین احمد مدنیؒ صدر تھے، مولانا عبد الحلیم صدیقیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ اور شاہ عطاء اللہ شاہ بخاریؒ مندوبین خصوصی میں تھے، اس کانفرنس میں سات تجاویز منظور ہوئیں، جن میں سے ایک سائمن کمیشن سے متعلق تھی، پھر ۱۲-۱۳ر جولائی کو مجلس عاملہ جمعیۃ علماء ہند نے ـــ جس میں مولانا بھی تھے ـــ اس کمیشن کے خلاف تفصیلی تجاویز پاس کیں، جس میں رپورٹ کے تمام گوشوں اور مسلمانوں کو پہنچنے والے نقصانات کی نشاندہی کی گئی تھی۔

کمیونل ایوارڈ

پہلے سندھ اور ممبئی ایک ہی ریاست تھی، جس میں مجموعی طور پر ہندو اکثریت میں آجاتے تھے، جب کہ سندھ کے علاقہ میں مسلم اکثریت تھی، اس لئے مسلمانوں کا مطالبہ تھا کہ سندھ کو ایک علاحدہ صوبہ تسلیم کرلیا جائے، مگر ہندو لیڈران اس کے مخالف تھے اور اسی لئے انگریزوں نے مسلمانوں کا یہ مطالبہ مسترد کردیا تھا؛ چنانچہ ۱۹۳۲ء میں حکومت برطانیہ نے کمیونل ایوارڈ کے نام سے ہندو مسلم فرقہ وارانہ مسائل کے حل پر ایک فارمولہ پیش کیا، جس میں دو تجویزیں مسلم مفادات کے خلاف تھیں، ایک تو یہی کہ سندھ کو علاحدہ صوبہ تسلیم نہیں کیا گیا، دوسرے یہ کہ پنجاب میں مسلمانوں کی ۵۶ فیصد آبادی ہونے اور سکھوں کے اقلیت میں ہونے کے باجود سکھوں کو حکومت میں ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نمائندگی دی گئی تھی اور آئینی اعتبار سے مسلمانوں کی قطعی اکثریت تسلیم نہیں کی گئی تھی۔

سیاسی اعتبار سے یہ بڑا نازک موقع تھا، قوم پرست لیڈران کی زبانیں مروت میں بند ہورہی تھیں، مگر جمعیۃ علماء نے اس کی سخت مخالفت کی، مولانا سجاد صاحبؒ اس کی مخالفت کرنے والوں اور اس کے خلاف تحریک چلانے والوں میں سرفہرست تھے، آپ نے اس کے خلاف ایک تفصیلی بیان بھی دیا اور اس کے نقصانات پر بھی روشنی ڈالی، (دیکھئے جریدہ امارت، ۲۰/جمادی الاولیٰ ۵۱ھ) جمعیۃ علماء کے اجلاس منعقدہ ۲۷-۲۹/مارچ ۱۹۳۶ء بمقام دہلی میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا، مولانا بھی اس میں شریک رہے اور اس لڑائی کے روح رواں رہے، بالآخر الہ آباد کی ''یونٹی کانفرنس'' میں کانگریس نے متفقہ طور پر سندھ کو بھی علاحدہ ریاست تسلیم کرلیا اور پنجاب میں ۵۱ فیصد قطعی اکثریت مسلمانوں کی مان لی گئی، افسوس کہ ہند و پاک کی تقسیم نے ان تمام کاوشوں پر پانی پھیر دیا۔ فالاسف علی الاسف۔

فرقہ وارانہ مسائل کا دستوری حل

فرقہ وارانہ مسائل کے حل کے لئے ۱۹۳۱ء میں کانگریس نے قانونی تجاویز مرتب کرکے شائع کی تھیں اور اعلان کیا تھا کہ اگر کوئی اس سے اچھا دستور مرتب کرکے پیش کرسکے تو

کرسکتا ہے، اس موقع پر ایک ''متبادل دستور'' جمعیۃ علماء ہند نے پیش کیا، جس میں مسلمانوں کے مفادات اور حقوق کی پوری پوری رعایت کی گئی تھی، مگر افسوس کہ بعض مسلم رہنماؤں کی مداہنت کے نتیجہ میں گول میز کانفرنس ۱۹۳۵ء میں ان کو منظوری حاصل نہ ہوسکی، یہ ''دستور'' مولانا ہی کا ترتیب دیا ہوا تھا، جسے جمعیۃ علماء کی عاملہ نے منظور کیا۔

شاردا بل اور مجلس تحفظ ناموس شریعت

۲۳؍ستمبر ۱۹۲۹ء کو اسمبلی میں یہ بل پیش ہوا، جس کا مدعا یہ تھا کہ ۱۸ سال سے کم عمر میں لڑکے کی اور ۱۶ سال سے کم میں لڑکی کی شادی نہیں کی جاسکتی اور جو شخص اس کا مرتکب ہوگا، یا اس میں واسطہ بنے گا، یا اس کے گارجین جو اس پر اپنی رضامندی کا اظہار کریں گے، ان سب پر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جائے گا، اس قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ نہیں کیا گیا؛ حالاں کہ یہ اسلامی نقطۂ نظر کے خلاف ہے، اس موقع پر ہندوستان سے برما تک مسلمانوں نے اس کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور قانونِ اسلامی کے تحفظ کے لئے جمعیۃ علماء نے 'مجلس تحفظ ناموس شریعت' قائم کی، مولانا ہی اس کے ناظم اور ذمہ دار قرار پائے؛ چنانچہ اس موقع پر مولانا نے اس کی فقہی، قانونی اور سماجی حیثیت پر مضامین قلم بند فرمائے اور مسلمان کو مشورہ دیا کہ حکومت ان کے مطالبہ کو تسلیم نہ کرے تو وہ ''سول نافرمانی'' کی تحریک چلائیں، امارت شرعیہ کے زیر سرپرستی بہار و اُڑیسہ میں بھی اس کے خلاف زبردست احتجاج ہوا، مولانا نے جابجا اس قانون کی خلاف ورزی کرائی اور کم عمری کی شادیاں کرائیں، مولانا ہی کے ایما پر اس سلسلہ میں ''متحدہ کانفرنس'' منعقد ہوئی، جو مسلمانوں کے مختلف گروہوں اور مختلف مکاتب فکر کے لوگوں پر مشتمل تھی۔

مسلم اوقاف پر حکومت کا غاصبانہ قبضہ

حکومت برطانیہ نے بہت سے مسلم اوقاف پر ناجائز قبضہ کر رکھا تھا، جن میں بعض ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہد سے مغصوب تھیں، مولانا نے اس کے خلاف پرزور تحریک چلائی ''مجلس تحفظ ناموس شریعت'' کے تحت پورے ملک کے مسلمانوں نے حکومت کے خلاف اس

غاصبانہ قبضہ پر احتجاج کیا، آپ نے اس موقع سے تمام ممبران اسمبلی کے نام اپنی اپیل اور ''منصوبہ اوقاف'' کی تفصیل بھیجی، نیز عام مسلمانوں سے بھی اپیل کی کہ ''اس قسم کی تمام مساجد کا فوٹو اندر اور باہر سے جلد از جلد لے لیں، جس پر فوٹو گرافر کے علاوہ کم از کم دو شاہدوں کے دستخط ہو۔ (جریدۂ امارت،ص:۲۲،شمارہ:۲۰، جمادی الاولیٰ)

صدارت اجلاس مرادآباد

مولانا شہرت و ناموری سے دور رہتے تھے، جب بھی کسی اجلاس کی صدارت کو کہا گیا، ٹال گئے، بالآخر مفتی کفایت اللہؒ اور بعض دوسرے بزرگوں کے اصرار پر ۱۵-۱۷/ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ کو مرادآباد میں منعقد ہونے والے اس اہم اجلاس جمعیۃ علماء کی صدارت کو مولانا نے شرف قبول بخشا، اس اجلاس میں بالکل سرسری طور پر آپ نے جو خطبۂ صدارت تحریر فرمایا، وہ آپ کی علمی بصیرت، مطالعہ کی وسعت، فقہ پر گہری نظر، سیاسی شعور اور ملی حمیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، اس کو پڑھ کر مولانا کی غیر معمولی علمی صلاحیت، سیاسی بصیرت اور طباعی کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مولانا نے اس خطبہ میں اسلام میں سیاست کی اہمیت، خلافت کی ضرورت اور شرعی حیثیت، تنظیم امارت، ہندو مسلم اتحاد، ترک موالات کی فقہی حیثیت اور حالات کے اعتبار سے احکام شرعیہ میں تبدیلی وغیرہ، موضوعات پر بصیرت افروز گفتگو فرمائی ہے، اس ''خطبہ صدارت'' کی اس وقت کے مؤقر اخبارات ورسائل نے خوب تعریف وتحسین کی تھی۔

عہدۂ نظامت کی قبولیت

مولانا سے بارہا جمعیۃ علماء ہند کے عہدوں کی پیشکش کی جاتی رہی، مگر جمعیۃ علماء بہار کی نظامت اور مولانا عبدالوہاب بہاری کے انتقال کے بعد صدارت کا بوجھ، نیز امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کی گراں بار ذمہ داریاں، بہار میں ہونے والی مختلف اسلام دشمن یورشوں اور قدرتی آفات وغیرہ نے آپ کو اس کی اجازت نہیں دی، مگر مجلس عاملہ کے مسلسل اصرار پر اخیر عمر میں جمعیۃ علماء ہند کے عہدۂ نظامت کو قبول فرمایا اور تھوڑے ہی دنوں میں عمدہ تنظیمی اور اشاعتی کام

انجام دیئے، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا بیان ہے :

> عہدۂ نظامت کے قبول کرنے کے وقت سے وفات کے وقت تک زندگی کے اس تھوڑے وقفہ میں اندرونی تنظیم اور بیرونی نشر و اشاعت کے علاوہ جمعیۃ علماء کی یہ نمایاں خدمات انجام دیں کہ جمعیۃ علماء کی بیس سالہ تبلیغی، دینی، سیاسی اجتماعی خدمات اور علمی جدوجہد کا ایک مرقع تالیف فرمایا، جو ''تذکرہ جمعیۃ علماء ہند'' کے نام سے معنون کیا گیا۔

جمعیۃ علماء کے پلیٹ فارم سے آپ کی خدمات بے شمار ہیں، جن کے لئے ایک دفتر درکار ہے، یہاں محض نمونہ کے لئے ایک سرسری جائزہ پیش کر دیا گیا ہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جمعیۃ علماء کے متعلق مولانا کی خدمات کے بارے میں لکھا ہے :

> کتنے رفیق سفر تھک کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ رہے تھے، مگر یہی ایک ہستی تھی، جو آخر تک جمعیۃ کے ساتھ لگی رہی؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ انھیں کی روح تھی، جو اس کے قالب میں جلوہ گر حیات ہوتی رہی۔ (حیات سجاد)

امارت شرعیہ فی الہند

فقہاء نے صراحت کی ہے کہ جہاں مسلمان اقتدار سے محروم ہوں اور اقلیت میں ہوں، وہاں بھی ان کے لئے ضروری ہے کہ امارت شرعی کا نظام قائم کریں، یا تو حکومت مسلمانوں کے لئے ان ہی میں سے ایک آدمی مقرر کر دے، جو مسلمانوں کے شرعی اُمور کا ذمہ دار ہو اور اگر غیر مسلم حکومت کی طرف سے اس طرح کا نظام قائم نہ ہو پائے تو خود مسلمان باہمی اتفاق رائے سے کسی کو امیر منتخب کر لیں، جو ان کے لئے قاضی کا تقرر کرے اور شرعی ذمہ داریوں کو انجام دے، اگر یہ نہ ہو سکے تو کم سے کم باہمی اتفاق رائے سے قاضی کا تقرر کر لیا جائے اور اتفاق رائے سے مراد یہ نہیں ہے کہ ہر ہر فرد کو اتفاق ہو؛ کیوں کہ یہ عملاً ناممکن ہے؛ بلکہ اُمت کے اربابِ حل وعقد کی اکثریت کا متفق ہونا کافی ہوگا۔

علامہ ابن ہمام، ابن قاضی سماوہ، ابن نجیم مصری، علامہ حصکفی، علامہ طحطاوی اور علامہ ابن عابدین شامی رحمہم اللہ وغیرہ نے اپنی اپنی تعریفات میں اس کی صراحت کی ہے، ہندوستان میں برطانوی سامراج کے غلبہ حاصل کرنے کے بعد غالباً سب سے پہلے شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ نے اس سلسلے میں فتویٰ دیا، پھر مختلف اہل علم نے اس نظام کو قائم کرنے کی کوشش کی؛ چنانچہ سید احمد شہیدؒ کی امارت اسی نوعیت کی تھی، پھر جنگ شاملی کے موقع پر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ان کی امارت میں جدوجہد فرمائی؛ لیکن اس وقت جو سیاسی معرکہ آرائی چل رہی تھی، اس کی وجہ سے امارت شرعیہ کے اس نظام کو بقاء ودوام حاصل نہیں ہوسکا۔

اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے جس شخصیت کے لئے توفیق مقدر فرمائی تھی، وہ مولانا سجاد صاحبؒ ہیں، انھوں نے پہلے بہار میں دارالقضاء کا نظام قائم کیا، پھر جمعیۃ علماء ہند کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹-۲۱/نومبر ۱۹۲۰ء میں ''امارت شرعیہ ہند'' کے قیام کی تجویز پیش کی، جو مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی تائید سے منظور ہوئی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ خواہش مند تھے کہ جلد سے جلد امیر الہند کا انتخاب ہوجائے، مولانا سجاد صاحبؒ نے بحیثیت امیر الہند' مولانا ابوالکلام آزادؒ کے نام پر انھیں آمادہ بھی کرلیا تھا؛ لیکن مختلف دبستانِ فکر کی باہمی آویزشوں کے نتیجہ میں یہ تجویز روبہ عمل نہ آسکی۔

امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کا قیام

مولانا نے سوچا کہ جس طرح بہار میں جمعیۃ علماء قائم کرکے پورے ملک کو روشنی دیکھائی گئی ہے، اسی طرح بہار میں میں امارت شرعیہ قائم کرکے پورے ملک کے سامنے کام کا یہ نقشہ پیش کیا جائے؛ چنانچہ ۲۳-۲۴/شعبان ۱۳۲۹ھ کے اجلاس جمعیۃ علماء بہار (ضلع دربھنگہ) میں ''قیام امارت'' کی تجویز منظور ہوگئی اور انتخاب کے لئے ایک خصوصی اجلاس منعقد کرنا طے پاگیا، مولانا نے بہار واڑیسہ کے تمام ممتاز علماء اور ذمہ داران کے نام ایک مفصل خط لکھا، جس میں امارت کی اہمیت، شرعی حیثیت اور امیر کے اوصاف بیان کرتے ہوئے جلسہ میں شرکت کی

دعوت دی گئی تھی، اس خط کے حرف حرف سے داعی کا درد دل ابھرا پڑتا ہے۔

چنانچہ ۱۸-۱۹/شوال ۱۳۳۹ھ مطابق ۲۵-۲۶/جون ۱۹۲۱ء کو پتھر کی مسجد پٹنہ میں زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد یہ اجلاس منعقد ہوا، صدر مجلس استقبالیہ مولانا شاہ حبیب الحق عمادی (۱۲۶۸-۱۳۴۳ھ) تھے، شاہ بدرالدین پھلورویؒ سجادہ نشیں خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف کو امیر شریعت اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کو نائب امیر شریعت منتخب کیا گیا۔

دارالقضاء کا شعبہ جو پہلے ہی سے قائم تھا، مولانا نے اس کو امارت کے تحت کر دیا، جس کے ذریعہ بے شمار خواتین اور مظلوموں کو انصاف ملا، بعض حالات میں آپ نے خود بھی مقدمات کی سماعت فرمائی اور فیصلے لکھے، جس میں سے بعض شائع ہو چکے ہیں، امارت آنے والے فقہی سوالات کے جواب بھی مولانا دیتے تھے (جن کا مجموعہ فتاویٰ امارت شرعیہ، جلد اول کے نام سے شائع ہو چکا ہے) ''بیت المال'' اور اس کے تحت زکوٰۃ وصدقات کے لئے اجتماعی نظام قائم کیا، مسلمانوں کے درمیان ارتباط کے لئے ایک شعبہ ''تنظیم'' کا قائم کیا گیا، مولانا نے ''تنظیم'' کا جو خاکہ پیش کیا تھا، وہ یہ ہے کہ ہر گاؤں میں مسلمانوں کی شیرازہ بندی کر کے عہد اول کی اصطلاح کے مطابق ''نقیب'' کا تقرر ہو، پھر چند نقباء پر رئیس النقباءؔ اور ضلع کی سطح پر چند رئیس النقباء میں ''صدر النقیب'' کا انتخاب ہو، اس طرح مسلمان گاؤں سے لے کر صوبائی سطح تک مربوط ہو جائیں گے، مولانا سجاد صاحبؒ کے بنائے ہوئے اس نقشہ پر — جس میں خود انھوں نے رنگ بھر کر دکھایا تھا — غور کیجئے تو یہ بالکل ''خلافتِ اسلامیہ'' کا نمونہ محسوس ہوگی، جسے استھانواں کے ایک دردمند اور بے سروسامان مرد مومن نے محض اپنے ایثار و اخلاص کی قوت سے وجود بخشا تھا، اللہ ان پر اپنی بے پناہ رحمتیں نازل فرمائے۔ آمین

شدھی تحریک

عین اس وقت جب پورے ہندوستان میں ترک موالات اور خلافت کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور ہندو مسلمان دوش بدوش انگریزوں کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے، انگریزوں نے ہندو مسلم اختلاف پیدا کر کے ان تحریکوں کا زور کم کرنے کے لئے ہندوؤں کے رجعت پسند

طبقہ سے ''شدھی تحریک'' چلوائی، جس کا مقصد مسلمانوں کو مرتد کرنا تھا، اس تحریک کی سرپرستی تو حکومت کر ہی رہی تھی، مسلمانوں کی جہالت اور معاشی ابتری نے ''کریلے نیم چڑھے'' کا کام کیا اور تیزی سے ارتداد کا فتنہ پھیلنے لگا۔

چمپارن کا حلقہ جو علمی، دینی، تہذیبی اور معاشی اعتبار سے زیادہ پسماندہ تھا، خاص طور پر اس فتنہ کا شکار ہوا، وہاں گدیوں کی ایک بڑی آبادی تھی، جن کے نام تک ہندوانہ تھے، سروں پر ٹیکیں رکھتے تھے، داڑھیاں نہیں رکھتے تھے، بتوں کی پرستش کرتے تھے، اگرچہ نسلاً وہ مسلمان تھے، مگر اسلام سے ان کا دور کا تعلق بھی نہ تھا، آریہ سماجیوں نے ان پر ڈورے ڈالنے شروع کر دیئے، عنقریب انھیں باضابطہ مرتد کر لینے کا پروگرام تھا کہ مولانا سجاد کی قیادت میں امارت کے مبلغین نے جا کر اسلام کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ انجام دیا اور اس طرح ایک بہت بڑی آبادی مرتد ہونے سے بچ گئی۔

گورکھپور کے ایک علاقہ کے چار سو گدی مرتد ہو گئے، مولانا سجاد صاحبؒ سخت مشقتیں جھیل کر وہاں پہنچے اور ان سب کو توبہ کرائی، ہزاری باغ میں پانچ سو مسلمان شدھی تحریک کے زیر اثر مرتد ہو گئے، مولانا نے فوراً وہاں مبلغین کا وفد بھیجا اور وہ دوبارہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو گئے، چھپرہ میں بھاٹوں کی دو سو کی جمعیت مرتد ہو گئی، مولانا نے اپنی کاوش سے ان کو توبہ کرایا ـــــ مجموعی طور پر اس طرح ارتداد سے تائب ہونے والوں کی تعداد ۲۵ ہزار سے زیادہ ہے۔

پھر مولانا نہ صرف یہ کہ ان کو اسلام کی طرف واپس لائے اور توبہ کرائی ; بلکہ ان کی آبادی میں مسجدیں بھی تعمیر کرائیں، مکاتب بھی کھولے اور ان کے بچوں کو دینی مدارس میں اپنی نگرانی میں تعلیم دلائی، وقتاً فوقتاً ان کی تالیف قلب بھی کرتے رہے، اسلام لانے کی وجہ سے ان پر جو ابتلائیں آئیں اور جو مقدمات وغیرہ ہوئے، اس میں آخر دم تک تن من دھن لگا کر دلچسپی لیتے رہے اور اپنی دنیا داؤ پر لگا کر ان کی مدد فرماتے رہے۔

غیر مسلموں میں دعوتِ اسلام

چمپارن کے ایک حلقہ میں ڈوموں کی آبادی تھی ، یہ بہت جرائم پیشہ تھے ، حکومت برطانیہ نے ان کی اصلاح اور سماجی سدھار کے لئے مسیحی مشن کا تقرر کیا اور ان کا بھرپور تعاون کیا، مولانا فوراً اس موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے ، ایک تبلیغی وفد امارت شرعیہ سے وہاں بھیج دیا اور خود بھی ہمہ تن مصروف ہوگئے ، اس مختصر سی جمعیت کے پاس اخلاص و درد اور دعوتِ دین کی لگن کے سوا اور کوئی سرمایہ نہ تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے ان کی پُرخلوص مساعی کو کامیاب بنایا اور جوق درجوق لوگ اسلام میں داخل ہوگئے ، یہ لوگ اچھوت شمار کئے جاتے تھے، ہندو اور مسلمان دونوں ان کو حقارت سے دیکھتے تھے، مولانا نے ان کو اپنے ساتھ بیٹھایا، ساتھ کھلایا، خاطر و مدارات کی، بلاتکلف ان کے ساتھ رہے؛ حتیٰ کہ ان کے دل میں یہ احساس گھر کر گیا کہ یہی لوگ ہیں جو مجھ سے برابری کا سلوک روا رکھ سکتے ہیں، مولانا کی اس تدبیر نے بڑا کام کیا، آریہ سماجیوں نے اس کے بعد بہت کوشش کی کہ وہ اسلام سے منحرف ہوجائیں، مگر ان کی ایک نہ چلی۔

اس کے علاوہ بھی مولانا کی ذاتی جدوجہد اور امارت شرعیہ کے شعبۂ تبلیغ کی مساعی —— جو مولانا ہی کی زیرِ نگرانی کام کرتی تھی —— سے بہت سے لوگ دامن اسلام میں آگئے ، مندرجہ فہرست کے مطابق بھی ان کی تعداد تین ہزار سے زیادہ ہے۔

اصلاح وخدمتِ خلق

مولانا مسلم سماج کی اصلاح کے لئے بھی مضطرب رہتے تھے اور اس میں ذرا بھی کوتاہی آپ کو گوارا نہ تھی ، آپ نے امارت شرعیہ کے تحت شعبۂ تبلیغ قائم فرمایا، جو اقامت صلاۃ اور اصلاحِ منکرات پر خصوصی توجہ دیتا تھا، آپ نے نکاح بیوگاں کی تحریک چلائی ، اس موضوع پر مضامین لکھے اور جگہ جگہ جا کر لوگوں کو اس جانب متوجہ فرمایا، جہیز کے غیر شرعی رسم کو ختم کرنے ، خواتین کو حق میراث دینے اور آپسی نزاعات کو باہمی گفت وشنید کے ذریعہ حل کرنے پر خصوصی توجہ دلائی اور اس کے بہتر اثرات مرتب ہوئے ، بیوہ و مطلقہ خواتین کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے آپ نے تعدد ازدواج کی طرف بھی توجہ دلائی؛ تاکہ آسانی سے

یہ مسئلہ حل ہو سکے۔

عام طور پر اہل علم علمی وفکری رہنمائی کی خدمت تو انجام دیتے ہیں؛ لیکن خدمت خلق کی عملی کوششوں میں انکا حصہ نہیں ہوتا؛ لیکن مولانا سراپا حرکت وعمل تھے اور ہمہ جہت خدمت انجام دینے کا مزاج رکھتے تھے؛ چنانچہ خدمت خلق کے میدان میں بھی آپ نے نمایاں خدمات انجام دی ہیں، صوبہ بہار میں اس زمانہ میں خس پوش آبادیوں کی بہتات تھی؛ اس لئے آتش زدگی کے واقعات بھی کثرت سے پیش آتے تھے، اسی طرح شمالی بہار کے نشیبی علاقوں میں کثرت سے سیلاب آتا تھا؛ بلکہ اب بھی آتا ہے، ۱۹۳۴ء میں ریاست کے بہت بڑے علاقہ میں ہلاکت خیز زلزلہ آیا، جس نے کئی آبادیوں کے نقشے بدل دیئے، ان تمام مواقع پر مولانا کا بے چین دل ان کی کروٹوں کو بے سکون کر دیتا، وہ خود ریلیف جمع کراتے، امدادی وفد بھیجتے، خود بھی بنفس نفیس تشریف لے جاتے اور امیر قوم کی طرح نہیں؛ بلکہ ایک مزدور کی طرح لوگوں کی راحت رسانی کا سامان کرتے۔

خدمتِ خلق ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ نے امارت میں ایک مستقل شعبہ 'تحفظ انسانیت' کا قائم فرمایا تھا، یہ شعبہ خاص کر فرقہ وارانہ فسادات کے موقع پر بڑی اہم خدمت انجام دیتا، آزادی سے پہلے دربھنگہ، مظفر پور، بیتیا، سارن اور چمپارن کے بعض مقامات پر انتہائی خونریز اور انسانیت سوز فسادات ہوئے، جن کی کیفیت سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، مسلمانوں کی جانیں بھی لی گئیں، دکانیں بھی لوٹی گئیں، گھر بھی جلا دیئے گئے، بے آبروئی بھی کی گئی اور ان ہی پر مقدمات بھی کر دیئے گئے، ان مایوس کن حالات میں اگر بروقت مسلمانوں کو سہارا نہ دیا جاتا تو حالات بہت خراب ہو سکتے تھے۔

یوں تو ان واقعات پر پورے ملک کے مسلمانوں نے اظہار افسوس کیا؛ لیکن مولانا نے صرف اظہار ہمدردی ہی نہ کی؛ بلکہ خود ان کی معاشی مدد کی، ان کے مقدمات کی پیروی کی، عدالتوں میں جا کر بحث کی، زعماء ملک اور برسر اقتدار ارکان حکومت کو خطوط لکھے، بتیا کے فساد کے موقع پر مولانا نے خود چھ ماہ تک بتیا میں قیام کیا، شر پسند اور فرقہ پرست افراد کو سزائیں

دلوائیں اور مسلمانوں کو ان سے تاوان دلایا، جن لوگوں نے مولانا سے براہ راست استفادہ کیا ہے، ان کا بیان ہے کہ مولانا کو بہ نفس نفیس بتیا میں گھروں کی چھاؤنی کرنے میں شریک دیکھا گیا، آہ، کتنا بابرکت ہے وہ ہاتھ جو قلم بھی پکڑتا تھا، فقہ و قانون کے نادر نکتے بھی اس کے قلم سے وجود میں آتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کی تباہ حال اُمت کے لئے دوپہر کی دُھوپ میں بیٹھ کر ایک مزدور کی طرح چھپر کی چھاؤنی بھی کرتا تھا۔

مولانا کی ایک اہم خصوصیت ان کا ''اُمت پن'' تھا، یعنی اسلام اور نبوت محمدی (ﷺ) کی بنیاد پر تمام مسلمانوں سے محبت اور ہر حلقہ سے ربط و تعلق، آپ کا زیادہ تعلق علماء دیوبند سے تھا اور شیخ الہند مولانا محمود احسن صاحبؒ سے آپ نے استفادہ بھی کیا تھا؛ لیکن مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے ممتاز خلیفہ مولانا ظفر الدین صاحب سے بھی ربط تھا، مولانا عبد الباری فرنگی محلی جو بعض مسائل میں بریلویوں کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے، ان سے بھی مخلصانہ تعلق تھا، چوٹی کے علماء اہل حدیث مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا عبد الرؤف داناپوری اور علماء صادق پور سے بھی کچھ کم تعلق نہ تھا، علماء اور مشائخ، جدید تعلیم یافتہ گروہ اور دانشوران سب آپ کے معتقد، آپ کے اخلاص کے معترف اور آپ کی بالغ نظری کے قدر شناس تھے، افسوس کہ اب گروہ بندی اور فرقہ واریت نے ''اُمت پن'' پر غلبہ حاصل کرلیا ہے۔

معروف محقق و مؤلف مولانا عبد الصمد رحمانی نے حضرت مولانا ابو المحاسن سجادؒ کو اس شعر کا مصداق قرار دیا ہے :

پھونک کر اپنے آشیانے کو
بخش دی روشنی زمانے کو

واقعہ ہے کہ مولانا سجاد صاحب اسی شعر کا مصداق تھے، اگر کوئی شخص فکر کی گہرائی، مطالعہ کی وسعت، علم کا رُسوخ، حرکت و عمل کی بے پناہ صلاحیت، جہد پیہم، عزم محکم، جرأت و بیباکی، دینی غیرت و ملی حمیت اور ان سب کے ساتھ ساتھ بے نفسی اور خدا ترسی کو ایک وجود میں دیکھنا چاہے تو اسے مولانا سجاد صاحبؒ کی زندگی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔

آپ ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے بہار کے مردم خیز خطہ ضلع عظیم آباد کے ایک غیر معروف قصبہ 'پنہسہ' کو آپ کے وطن ہونے کا شرف حاصل ہے، آپ نے ابتدائی تعلیم مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں حاصل کی، مولانا وحید الحق صاحب مرحوم یہاں آپ کے استاذِ خصوصی اور نگراں تھے، جو بعد میں آپ کے خسر بھی ہوئے، متوسطات کی تعلیم کانپور جا کر حضرت مولانا احمد حسن صاحب علیہ الرحمہ سے حاصل کی اور اپنی ذہانت و ذکاوت، سعادت مندی اور سلامت روی کے باعث اساتذہ کے مرکز توجہ بنے رہے، منتہی کتابیں مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد میں پڑھیں، یہاں آپ پر اپنے زمانے کے مشہور استاذ مولانا عبدالکافی صاحبؒ کی خصوصی توجہ رہی، اپنی امتیازی صلاحیت، فہم و ذکاوت اور استعداد کی بدولت یہاں بھی ممتاز و ہر دل عزیز بنے رہے اور ۱۹/ربیع الاول ۱۳۲۲ھ، ۱۸۰۷ء میں یہیں سے فراغت حاصل کی۔

طالب علمی کی ان منزلوں سے گزرنے کے بعد آپ مدرسہ اسلامیہ بہار شریف میں مسند آرائے تدریس ہوگئے، آپ نے مدرسہ کو بڑی ترقی دی، اس گمنام مدرسہ کا دور دور تک شہرہ ہوگیا، دور دراز سے طلبہ آنے لگے اور دورۂ حدیث تک تعلیم ہونے لگی، مگر ابھی چند ہی سال گزرے تھے کہ مولانا عبدالکافی صاحبؒ جو طالب علمی ہی میں آپ کی خداداد صلاحیت اور فہم و فقاہت کا اندازہ لگا چکے تھے، نے آپ کو مدرسہ سبحانیہ الٰہ آباد بلالیا، آپ ۵-۶ سال تک الٰہ آباد میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے اور آپ سے سینکڑوں تشنگانِ علم سیراب ہوتے رہے، پھر ۱۳۳۹ھ میں آپ نے گیا کا رُخ کیا، مدرسہ انوار العلوم کی از سر نو تاسیس کی اور بارہ برس تک یہیں اقامت پذیر ہوکر قرآن وحدیث اور زبان وادب کی خدمت کرتے رہے، مسلمانوں کے پیہم زوال سے آپ ملولِ خاطر رہا کرتے تھے، آخر یہ آلام وافکار اس وقت رنگ لائے، جب ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تحریک خلافت شروع ہوئی اور آپ نے تدریس کے عزلت کدہ سے نکل کر ملی جدوجہد کے میدان میں قدم رکھا، پھر تو پوری زندگی اسی وادی پُر خار میں گزار دی۔

عام طور پر جب لوگ قیادت کے میدان میں قدم رکھتے ہیں تو مادی اعتبار سے تنگی سے وسعت اور دشواری سے آسانی کی طرف سفر کرتے ہیں؛ لیکن مولانا نے اس میدان میں کھونے کے لئے قدم رکھا تھا نہ کہ پانے کے لئے، اپنے آپ کو مٹانے کے لئے قدم رکھا تھا نہ کہ اپنے آپ کو بنانے کے لئے؛ حالاں کہ وہ ایک زمین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے؛ لیکن مسلمانوں پر آنے والی آفتوں کو دور کرنے اور مقدمات کی پیروی میں مشغول رہنے کی وجہ سے نوبت یہ آگئی کہ آہستہ آہستہ زمینیں نیلام ہوتی چلی گئیں، اکلوتے جواں سال صاحبزادے مولانا احمد سجاد جان کنی کی حالت میں ہیں اور اطلاع آئی کہ مسلمانوں پر آنے والی کسی افتاد کے سلسلے میں فوری طور پر بتیا کا سفر کرنا ہے، مولانا نے نم آنکھوں کے ساتھ بیٹے کو الوداع کہا اور روانہ ہو گئے، مولانا خود ملت کو بچانے کے سفر پر رواں دواں ہیں اور صاحبزادے سفر آخرت کی طرف، آخر مولانا کی عدم موجودگی میں صاحبزادے کی وفات ہوئی اور مولانا تدفین میں بھی شرکت نہ کر سکے۔

جناب محمد یونس بہار کے چیف منسٹر ہیں اور پٹنہ کی عالیشان کوٹھی میں مقیم ہیں، مولانا کسی ضروری امر پر مشورہ کے لئے پہنچے، شام دیر تک مشورہ ہوتا رہا اور مولانا انھیں ہدایات دیتے رہے، مگر مولانا نے نہ چائے کی ایک پیالی قبول کی اور نہ واپسی کے لئے موٹر کی سواری؛ بلکہ کچھ دور پیدل چلے، کچھ دور کے لئے تانگہ کرایہ پر لیا، جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ ہوٹل میں کھانا کھا سکیں، تو بھنے ہوئے چنے راستے میں لے لئے، خود بھی اس سے بھوک مٹائی اور اپنے رفقاء کو بھی پیش کیا؛ لیکن حکومت کا کوئی بارِ احسان نہ لیا کہ مبادا، اہل اقتدار اس کو ملت کی خرید وفروخت کے لئے وسیلہ نہ بنائیں۔

اسی درویشی اور دین کے لئے فداکاری و جانثاری کے ساتھ پوری زندگی بسر کی، الحاج محمد شفیع صاحب مرحوم (جو مولانا کے خاص صحبت یافتہ تھے) کے بیان کے مطابق وفات کے وقت کفن کے پیسے تک موجود نہیں تھے، اور متروکہ جسم پر زیب تن کپڑے کے علاوہ ایک بستر اور ایک جوڑے کے سوا کچھ نہ تھا، ۱۷/شوال ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۸/نومبر ۱۹۴۰ء کو شام کے

۴ بجکر ۲۵ منٹ پر علم وعمل کا یہ آفتاب غروب ہوگیا؛ لیکن اس کی روشنی آج تک ماند نہیں پڑی اور مولانا نے جس فکرِ امارت کی صدا لگائی تھی، آج نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پورے عالم میں اس کی گونج سنی جاسکتی ہے اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، فکر سجاد کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے!

❁ ❁ ❁

مآثرِ سجادؒ ❁

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کے علمی آثار

اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جب کسی شخصیت کا ایک پہلو نمایاں ہوتا ہے تو زندگی کے دوسرے گوشے نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوا، مولاناؒ کی قائدانہ صلاحیت اور جذبات دروں کا پہلو اتنا نمایاں اور اپنے معاصرین کے درمیان ممتاز اور بے مثال تھا اور ایک مفکر اور مدبر کی حیثیت سے ان کی عبقریت اتنی واضح تھی کہ مولانا کے علمی وفقہی مقام، مجتہدانہ بصیرت اور غیر معمولی ذکاوت وطباعی کی طرف کم توجہ دی گئی، مولاناؒ کو اپنے زمانہ کے شہرۂ آفاق اساتذۂ منقولات ومعقولات مولانا احمد حسن کانپوریؒ اور حضرت مولانا عبدالکافی صاحب جیسے لوگوں سے استفادہ کا موقعہ ملا اور سترہ اٹھارہ سال تک ابتدائی کتابوں سے لے کر حدیث کی اعلیٰ کتب تک کی تدریس کا شرف حاصل ہوا، مولانا اصغر حسین صاحب شارح آثار السنن نے آپ سے ترمذی شریف پڑھی، مولانا عبدالصمد رحمانی اور مولانا فرخند علی صاحب سہسرامی جیسے محقق علماء آپ کے تلامذہ میں ہیں، کثرتِ اسباق کا حال یہ تھا کہ نمازِ فجر سے پہلے سبق کا سلسلہ شروع ہوتا اور عصر کے بعد بھی بعض اہل ذوق ریاضی اور معقولات پڑھتے، عربی ادب کے بھی ایسے ذوق شناس تھے کہ ایک ادب شناس کے لئے صرف پندرہ بیس منٹ میں عربی کا ایک بلیغ قصیدہ کہہ دیا۔ (حیاتِ سجاد:۳۲)

❁ مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کی حیات وخدمات پر منعقد ہونے والے سیمینار ۲۰-۲۱/ اپریل ۱۹۹۹ء، ۳-۴/ محرم ۱۴۲۰ھ میں پیش کیا گیا مقالہ۔

مولانا کا مزاج علم و تحقیق میں تقلید وقناعت کا نہ تھا، بلکہ آپ اخذ و استنتاج کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے، قرآن مجید سے شغف کا حال یہ تھا کہ تفکر فی القرآن کے غلبہ کی وجہ سے گھنٹہ، آدھ گھنٹہ میں بہ مشکل ایک صفحہ کی تلاوت کر پاتے، بہار اسمبلی میں حکومت نے ایک ایسا بل پیش کیا تھا، جس کے رو سے اوقاف پر زرعی ٹیکس عائد ہوتا تھا، مولانا نے اس کی مؤثر اور کامیاب مخالفت کی، مولانا عبدالصمد صاحبؒ نے دریافت کیا کہ اوقاف پر زرعی ٹیکس کے خلافِ شرع ہونے کی بابت قرآن مجید میں کیا ماخذ ہے؟ مولانا نے یہ آیت پڑھی :

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهُ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔

کہ جب وصیت میں تبدیلی جائز نہیں، جو مرض الموت میں کی جاتی ہے تو پھر وقف میں بدرجہ اولیٰ جائز نہیں ہوگی، جو صحت اور طمانینت کی حالت میں کیا جاتا ہے، اسی اُصول پر ''شرط الوقف کالنص'' کا ضابطہ ہے، سورۂ فاتحہ میں مغضوب اور ضالین سے یہود ونصاریٰ کی جماعت مراد لی گئی ہے، جس کو رات دن نمازوں میں بتیس دفعہ ہر مسلمان پڑھتا ہے اور گویا یہود ونصاریٰ سے براءت کا اظہار کرتا ہے؛ حالاں کہ مشرکین سے بھی اس درجہ براءت کا اظہار نہیں کیا جاتا۔ حضرت مولاناؒ سے اس سلسلہ میں جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں یہود ونصاریٰ کی جماعتی فطرت یہ ہے کہ ان میں حق کے قبول کرنے کی استعداد نہیں اور مشرکین کی جماعتی فطرت میں حق کے قبول کرنے کی استعداد ہے؛ چنانچہ یہود ونصاریٰ کے متعلق قرآن نے کہا ہے: لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصَارٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (البقرۃ:۱۲) اور مشرکین کے متعلق قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ: وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ (القلم:۹) غور فرمایئے! کتنی بلیغ ہے یہ توجیہ۔

مولاناؒ کی تحریروں میں احادیث کا بکثرت ذکر ملتا ہے، مولانا کا نقطۂ نظر تھا کہ ہر حدیث قرآن مجید کی کسی نہ کسی آیت کی تفسیر ہے؛ اسی لئے مولانا کا خیال تھا کہ ہر حدیث کو پڑھاتے ہوئے قرآن مجید سے مربوط کر کے بتانا چاہئے۔

فقہ مولانا کا موضوع خاص تھا؛ جیسا کہ آپ کے فتاویٰ، قضایا اور دوسری تحریروں سے ظاہر ہے۔

مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے ممتاز اصحابِ علم وفضل آپ کو ''فقیہ النفس'' کہا کرتے تھے، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ سالہا سال سے درس وتدریس اور مطالعہ کا اتفاق نہ ہونے کے باوجود جب بھی آپ سے گفتگو کی جاتی تو علم تازہ نظر آتا، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا بیان ہے کہ ہماری جماعت میں مشہور ہے کہ زبردست دلائل کے ساتھ کسی بات کو مدلل کرکے بیان کرنا مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ کا خاص حصہ ہے، لیکن جماعت کے ذمہ دار ارکان اور میں نے بارہا یہ منظر دیکھا ہے کہ جب کسی مسئلہ پر حضرت مولانا محمد سجاد صاحب دلائل وبراہین فقہی کے ساتھ بحث فرماتے تو حضرت مفتی صاحبؒ بھی بے حد متاثر ہوتے اور ان کے علمی تبحر کا اعتراف کرتے ہوئے بے ساختہ ان کی زبان سے کلماتِ تحسین نکل جاتے۔

مولانا فقہ کے غواص اور شریعت کی روح ومقصد کے رمز شناس تھے اور اس کی وجہ سے اخذ واستنباط اور نکتہ سنجی ان کی طبیعت میں تھی، مولانا منظور نعمانیؒ نے لکھا ہے کہ لکھنؤ میں مدحِ صحابہ رضی اللہ عنہم ایجیٹیشن جاری تھا، اسی سلسلہ میں ایک جلسہ میں مردوں کے علاوہ عورتوں کا بھی ایک بڑا مجمع تھا، جب اس مقصد کے لئے گرفتاری پیش کرنے کی بات آئی تو ایک خاتون نے بھی ایک خط صدرِ جلسہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کو لکھا کہ خواتین بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہتی ہیں، مولانا مدنیؒ نے فرمایا کہ ان کی طرف سے اعلان کردیں کہ جب تک ہم میں سے ایک بھی موجود ہے، یہ گوارا نہیں ہوسکتا کہ آپ اس راہ میں تکلیف اُٹھائیں، مولانا نعمانی چلنے لگے تو مولانا سجاد صاحبؒ نے فرمایا کہ اس کے علاوہ مستورات کو یہ بھی سمجھا دینا کہ حربِ سلمی یعنی آئینی جنگ اور تلوار کی جنگ کے احکام شریعت میں جداگانہ ہیں، تلوار کی جنگ میں تو خاص حالات میں عورت کے لئے بھی شرکت کا موقع ہے، مگر یہ آئینی جنگ جس میں اپنے آپ کو گرفتار کرانا ہے، اس میں عورتوں کے لئے شرکت کا کوئی موقعہ نہیں، بلکہ شرعاً ان کے لئے ناجائز ہے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے بقول قضاء وامارت اور عشر وخراج وغیرہ جیسے اجتماعی مسائل میں مولاناؒ کو درکِ خاص حاصل تھا، مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں حزب اللہ کی تحریک کی بنیاد رکھ رہے تھے، قاضی احمد حسین صاحب نے ان کو مولانا کی فکر امارت سے آگاہ کیا، پھر آپ کی ملاقات مولانا آزادؒ سے کرائی، اس ملاقات نے مولانا آزادؒ کو ایک نئی سمت سفر سے آگاہ کیا اور پھر مولانا آزاد بھی فکر امارت کے داعیوں اور نقیبوں میں ہو گئے۔

مولاناؒ نہایت ہی اعلیٰ فقہی ذوق کے حامل تھے اور احوالِ زمانہ پر احکام فقہیہ کے انطباق میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، فقہاء کے درمیان جو اختلافِ رائے ہے، مولانا اس اختلاف کو اختلافِ برہان سے زیادہ اختلافِ زمان پر محمول کرتے تھے کہ یہ دراصل ماحول اور احوال میں تغیر کی بنیاد پر احکام میں تبدیلی ہے؛ امام ابوحنیفہؒ اور صاحبینؒ کے درمیان جو اختلافِ رائے پایا جاتا ہے، اس کے بارے میں بھی مولانا سجاد صاحبؒ کا یہی نقطۂ نظر تھا؛ اسی لئے مولانا اربابِ افتاء کو ہدایت دیتے تھے کہ وہ امام غزالی کی کتاب سے مصالح مرسلہ کا باب ضرور پڑھیں؛ تاکہ نئے پیش آمدہ مسائل میں وہ بصیرت کے ساتھ فتویٰ دے سکیں۔

علماء کو نئے دور کے مسائل کا سامنا کرنے کی صلاحیت کے مقصد کے لئے مولانا دینی مدارس کے موجودہ نصابِ تعلیم اور نظام درس کو ناکافی تصور کرتے تھے اور اس میں کچھ انقلابی تبدیلیاں چاہتے تھے، آپ کا خیال تھا کہ ہر اہم مدرسہ کے ذمہ ایک مخصوص فن دے دیا جائے، جس کی تکمیل وہاں ہو اور ابتداء ہی سے غیر محسوس طریقہ پر اس کا وہاں ہر درجہ میں لحاظ کیا جائے، کسی مدرسہ کا خاص فن حدیث ہو، کسی کا فقہ، کسی کا قرآن وغیرہ وغیرہ، بہار میں گورنمنٹ کے اثر سے آزاد دینی مدارس کے وفاق کا قیام مولانا کا دیرینہ خواب تھا، جو اب ایک درجہ میں شرمندۂ تعبیر ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں دوام واستمرار عطا فرمائے، حقیقت یہ ہے کہ مولانا سجاد صاحبؒ کا نظریۂ تعلیم ایک مستقل موضوع ہے، اس پر لکھنے کی بھی ضرورت ہے اور وفاق المدارس الاسلامیہ بہار کے قیام کے بعد اس بات کا موقعہ فراہم ہو گیا ہے کہ وہ مولانا کے

نصب العین کو سامنے رکھ کر مفید تر نصابِ تعلیم اور نظام تعلیم کا ایک انقلابی عمل شروع کرے۔

آج کل اکثر دینی تحریکات اور اداروں میں کثرتِ رائے اور رائیں مساوی ہوں تو صدر کے ترجیحی ووٹ کی بنیاد پر فیصلہ کرنے کا طریقہ مروج ہے، جمیعۃ علماء ہند کے دستور میں بھی شروع سے یہ بات رکھی گئی ہے، جب جمعیت میں یہ بات زیر بحث آئی کہ کیا عہد نبوی یا عہد صحابہ میں بھی اس کی کوئی نظیر ہے؟ تو مولاناؒ نے فرمایا کہ ہاں اس کی نظیر وہ کمیٹی ہے، جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ ثالث کے انتخاب کے لئے مقرر کیا تھا اور فرمایا تھا کہ چھ نفری کمیٹی میں سے اکثریت کی رائے پر عمل کرو اور اگر دونوں طرف رائیں برابر ہوں تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ جس طرف ہوں، ان کی رائے کو ترجیح ہوگی، ان واقعات سے مولانا کے ذہن رسا اور فکر بلیغ کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

مولانا اپنی فقہی مزاج کی وجہ سے قانونی نکتہ سنجیوں سے بھی خوب واقف تھے اور بڑی دقتِ نظر کے ساتھ قانونی موضوعات پر گفتگو کرتے تھے۔ بڑے بڑے دانشور اور قانون داں جب آپ سے گفتگو کرتے تو اپنے آپ کو طفل مکتب محسوس کرتے، اسی دسترس کی وجہ سے اکابر اہل علم اور اصحابِ نظر کی موجودگی میں تجاویز کی تربیت کا کام مولاناؒ کو سپرد کیا جاتا اور اکثر مولانا کی گفتگو حرفِ آخر تصور کی جاتی۔

علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا عبدالصمد رحمانیؒ، مولانا اصغر حسین صاحبؒ، مولانا مسعود عالم ندویؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ، مولانا منت اللہ رحمانیؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفتی کفایت اللہ صاحب دہلویؒ اور مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسے اصحابِ علم و نظر آپ کے علمی مقام، بلوغِ نظر اور بلندی نگاہ کے معترف نظر آتے ہیں۔

اگر مولانا علم و تحقیق ہی کے کاموں کے لئے وقف ہو جاتے تو وہ اپنے زمانہ کے چند گنے چنے اصحابِ علم و نظر میں شمار کئے جاتے؛ لیکن اُمت کے درد میں گھلنے والا اور ہر مسلمان کے لئے غم کھانے اور تڑپ اٹھنے والا جو دل اللہ تعالیٰ نے آپ کو ودیعت فرمایا تھا، وہ اس بات کے لئے

کیوں کرآمادہ ہوسکتا تھا کہ اُمت کو بے کسی کی حالت میں چھوڑ کراور قوم کے سفینہ کو بھنور کی گرفت میں دیکھنے کے باوجود گوشۂ سکون میں بیٹھ جائے اور ساحل پر ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ کر صرف دادِ تحقیق دینے پر اکتفاء کرے؛ اس لئے ہمارے سامنے مولانا کے علمی مآثر اس کمیت اور مقدار کے ساتھ نہیں ہیں، جو مولانا جیسی بالغ نگاہ، وسیع النظر اور عمیق الفکر شخصیت سے متوقع تھا، پھر بھی مولانا نے جو کچھ تحریری تبرکات چھوڑے ہیں، وہ ہم جیسے کم سوادوں کے لئے دلیل راہ سے کم نہیں۔

فتاویٰ

مولاناؒ کے علمی مآثر میں آپ کے فتاویٰ بھی ہیں، ابتدءً امارتِ شرعیہ کا شعبہ افتاء، پھلواری شریف کے ساتھ ساتھ گیا میں بھی کام کرتا تھا اور مولانا کا قیام بھی گیا ہی میں تھا، اس لئے اُمید ہے کہ وہاں سے بھی آپ نے سینکڑوں فتاویٰ دیئے ہوں گے، لیکن افسوس کہ ان فتاویٰ کی نقل محفوظ نہیں رہ سکی، پھلواری شریف سے آپ کے جو فتاویٰ صادر ہوئے وہ چند ماہ پہلے حضرت مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے بصیرت افروز حواشی سے آراستہ ہوکر شائع ہو چکے ہیں، اس مجموعہ میں ۱۹۸ فتاویٰ ہیں، جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق ہیں، ان میں بعض فتاویٰ نہایت معرکۃ الآراء ہیں، علماءِ دیوبند کی تکفیر اور مولانا عبدالکافی الہ آبادی کے نقطۂ نظر سے متعلق فتویٰ جو کتاب کے شروع ہی میں ہے، بہت اہم ہے، اجتماعی مسائل نیز امارت وقضاء سے متعلق موضوعات کی بابت جو فتاویٰ اس مجموعہ میں شامل ہیں، وہ علماء وارباب افتاء کے لئے بہت ہی چشم کشا ہیں، ہندوستان میں ایک زمانہ میں انگریزوں کے خلاف ''ترکِ موالات'' کی تحریک شروع ہوئی تھی، اس سلسلہ میں مولانا عبدالماجد قادری نے ایک استفتاء مرتب کیا ہے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب، علماءِ فرنگی محلی، سہارنپور، علماءِ بدایوں، علماءِ کانپور اور علماءِ دہلی نے اس کے جوابات لکھے ہیں، حضرت مولانا سجاد صاحبؒ نے اس کا تفصیلی اور نہایت بصیرت افروز جواب لکھا ہے، جو ایک طرف آپ کی فقہی بصیرت اور دوسری طرف احوالِ زمانہ سے آگہی کی شاہد عدل ہے؛ چنانچہ آپ کے اس جواب پر ہندوستان کے طول وعرض کے تمام مسالک کے علماء نے تحسین بھی کی ہے اور اس کی تصویب بھی، طلاقِ معلق کی ایک صورت کے بارے میں

قاضی عبدالحمید صاحب نے ایک استفتاء کیا ہے، جس کا ہندوستان کے مختلف ممتاز علماء بشمول مفتی کفایت اللہ صاحبؒ و مولانا ابوالکلام آزادؒ نے جواب دیا ہے، جوابات میں تعارض ہے، چنانچہ استفتاء اور یہ جوابات مولانا کے سامنے محاکمہ کے لئے پیش کیا گیا، مولانا نے اس پر اپنی زبردست قوتِ فیصلہ کے ساتھ محاکمہ فرمایا؛ یہ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

مولاناؒ کے فتاویٰ کا جو امتیازی پہلو ہے، ان میں ایک یہ ہے کہ آپ نے درس گاہ کے حصار میں محدود مفتی کی بجائے سماج و ماحول کے حالات سے واقف صاحبِ بصیرت فقیہ کی حیثیت سے فتاویٰ دیئے ہیں اور بحیثیت مجموعی اُمت کے مصالح کو ملحوظ رکھا ہے، مدارسِ اسلامیہ میں سرکاری اوقاف سے مدد لینے کے بارے میں آپ نے فتویٰ دیا ہے کہ اگر اندیشہ ہو کہ اربابِ حکومت خواہ مخواہ دخل دیں گے، اس کی وجہ سے تعلیم میں نقص اور اظہار حق میں کوتاہی کرنی پڑے گی، تو ایسی صورت میں مدد لینی جائز نہیں ہوگی، (ص: ۲۲۱) آج بہار اکزامینیشن بورڈ کے اکثر مدارس کے نصابِ تعلیم اور معیارِ تعلیم کو سامنے رکھا جائے تو مولاناؒ کا یہ فتویٰ نوشتۂ دیوار معلوم ہوتا ہے، غیر مسلموں سے تعمیر مساجد میں مالی تعاون لینے کی بابت مولاناؒ کی رائے عدم جواز کی ہے، ہاں یہ صورت آپ کے نزدیک جائز ہے کہ غیر مسلم نے مسلمان کو کوئی چیز ذاتی طور پر ہبہ کی ہو اور مسلمان اسے تعمیر مسجد میں صرف کردے، (ص: ۲۱۱) وجہ اس کی ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کے چندہ میں احتیاط نہ برتی جائے تو اندیشہ ہے کہ کل ہو کر وہ بھی اپنی عبادت گاہوں کے لئے مسلمانوں کو تعاون پر مجبور کریں گے۔

مسجد کی ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقلی کے بارے میں بھی مولانا کا فتویٰ بہت واضح اور بے لچک ہے (دیکھئے: ص: ۲۰۸،۹۰) کیوں کہ اس مسئلہ میں ذرا بھی نرم روی بہت بڑے فتنہ اور شعائر اسلام کی بے حرمتی کا پیش خیمہ بن سکتی تھی، بہت سے دیہات اور قریہ جات وہ ہیں جہاں نماز جمعہ ہی لوگوں کی اسلام سے وابستگی اور تعلق کا اثاثہ ہے اور اسی سے ان کی پہچان باقی ہے، اس لئے فقہی موشگافیوں سے قطع نظر ایک دردمند داعی کی نگاہ سے مولاناؒ اس مسئلہ کو دیکھتے تھے اور ایسے گاؤں میں جمعہ کے جواز کا فتویٰ دیتے تھے، جہاں مسلمانوں کی مستقل آبادی ہو

اور جماعت کے لئے مطلوب بالغ مرد موجود ہوں، (۲:۵۱تا۵۹) مسلمانوں کو اسلام پر باقی رکھنے کے لئے موجودہ حالات میں یہ فتویٰ کتنی اہمیت رکھتا ہے، وہ محتاجِ اظہار نہیں، مولاناؒ غیر عربی زبان میں خطبہ کے جواز کے قائل نہیں تھے، اس کے لئے فقہی دلائل تو پیش کرتے ہی تھے؛ لیکن نگاہِ دوررس اثر کے سامنے یہ حقیقت بھی تھی کہ ''جن وجوہ کی بناء پر لوگ خطبہ کو اُردو میں پسند کرتے ہیں، انھیں وجوہ کی بناء پر ترکوں نے نماز میں قرآن مجید کو بزبان ترکی پڑھنا چاہا اور روک دیئے گئے، شاید اگر یہی لیل ونہار رہے تو ہندوستان میں بھی کم از کم نماز جہری میں تو ضرور امام سے اُردو میں قرآن پڑھنے کی خواہش ہوگی''۔ (ص:۶۱)

سماجی اصلاح کا ایک موثر ذریعہ مالی جرمانہ ہے اور ہندوستان جیسے حالات میں جہاں جرم وسزا کا قانون مسلمانوں کے دائرۂ اختیار میں نہیں آ سکتا، سماجی اصلاح اور مفاہمت بین الناس کا یہ ایک موثر ذریعہ ہے، چنانچہ مولانا نے اس کی اجازت دی ہے۔ (ص:۲۵۸-۲۹۰)

مولاناؒ کے فتاویٰ میں ان کا داعیانہ رنگ ہر جگہ نمایاں ہے، کہ محض مسائل کی رہنمائی پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ مناسب حال تذکیر بھی کرتے ہیں اور اصلاح کے وسائل کی بھی رہنمائی فرماتے ہیں، خلع کے ایک مسئلہ میں مولاناؒ نے برادری کے لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ وہ شوہر کو طلاق دینے پر مجبور کریں؛ تاکہ عورت کی دادرسی ہوسکے، زنا اور اس سے ثبوت نسب سے متعلق ایک سوال وجواب میں مولاناؒ نے لکھا ہے کہ پنچایت کو چاہئے کہ مرد اور اس عورت کو ایسی تنبیہ کریں کہ جس سے آئندہ کے لئے بھی وہ ڈرتے رہیں اور ان کی برادری کے دوسرے لوگوں کو بھی عبرت ہو، (ص:۲۹۰) ایک سوال عصمت فروش عورتوں کے یہاں میلاد میں جانے سے متعلق ہے، مولاناؒ اس کی کمائی اور شیرینی وغیرہ کو تو ناجائز قرار دیا ہے؛ لیکن یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ: ''اگر کوئی حافظ اور مولوی اس کے یہاں محفل میلاد میں محض اس وجہ سے جائے کہ وہ اس بدکار عورت کو خدا اور رسول کا خوف دلائے اور توبہ کرنے کی ترغیب دے تو کوئی مضائقہ نہیں، (ص:۲۴۵) —— بیوی ماں یا بہن کہنے کا کیا حکم ہے؟ اس کا فقہی جواب دینے کے بعد فرماتے ہیں: ''زید اپنی تنبیہ کے لئے اپنے نفس پر کوئی ایسا صدقہ دینا لازم کرلے جو اس کے نفس پر کسی

قدر بار ہو؛ تا کہ اس کے ذریعہ ہمیشہ اس اثر کو یاد رکھے کہ ایسے کلمات کہنا خلافِ شریعت ہے اور ہمیشہ اس سے بچتا رہے''۔ (ص:۱٦۸)

مولانا کے فتاویٰ کا ایک امتیازی پہلو مسلمانوں کو فتنہ وانتشار سے بچانے کی کوشش بھی ہے، بعض مواقع پر محض حق کا اظہار اور مسائل کا بیان کر دینا کافی نہیں ہوتا کہ کبھی کبھی اس سے نزاع وانتشار کی صورت بھی پیدا ہوجاتی ہے، مولانا اپنے فتاویٰ میں اس بات کا خوب لحاظ رکھتے تھے، انگریزوں کے زمانے میں انگریزی اخبارات کے ذریعہ یہ بات پھیلائی گئی تھی کہ والیٔ کابل کی بیوی نے صدرِ فرانس سے ہاتھ ملایا، اس خبر اور تصویر کی اشاعت کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو امان اللہ خان سے بدگمان کرنا تھا، مولاناؒ نے اس سلسلہ میں استفتاء کا جواب لکھتے ہوئے پہلے تو غیر محرم مرد سے ہاتھ ملانے کا شرعی حکم بیان کیا، پھر تحریر فرمایا: ''لیکن اہلیہ غازی امان اللہ خاں بادشاہ کابل سے متعلق جو واقعہ آپ نے لکھا ہے، یہ تصدیق طلب ہے، بغیر کامل تصدیق کے اخباری خبروں وتصویروں پر اعتماد کر کے کوئی رائے قائم کرنا شرعاً درست نہیں''، (ص:۲۴۷) ایک جگہ پنچ نے چھوٹی بہن سے بڑی بہن کو سود دلوایا، اس کے جواب میں حضرت امیر شریعت ثانیؒ نے اس کی مذمت وشناعت پر مبنی جواب دیا، مولاناؒ نے اس جواب پر ایک تحریر کا اضافہ کیا، جس میں اس کی مزید تاکید کرتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ: ''اگر خدانخواستہ پنچ اور بڑی بہن راضی نہ ہوں اور سود کا روپیہ واپس نہ ہو تو اس کی وجہ سے کوئی جدید فتنہ برپا نہیں کرنا چاہئے''، (ص:۲۱۱) اسی طرح ایک مقام پر ایک مسجد سے قریب ہی دوسری مسجد کی تعمیر کے بارے میں دریافت کیا گیا، مولاناؒ نے اپنے فتویٰ میں بلاضرورت دوسری مسجد کی تعمیر سے منع فرمایا؛ لیکن یہ بھی فرمایا کہ اگر وہ لوگ اس پر مصر ہوں تو اختلاف نہ بڑھایا جائے، جس سے جو مسجد قریب ہو، وہ وہاں نماز ادا کیا کریں۔

غیرتِ ایمانی اور حمیت اسلامی مولاناؒ کا سب سے بڑا امتیاز تھا اور وہ اس کو تمام علائق سے بالاتر رکھتے تھے، فتاویٰ میں بھی مولانا کا یہ رنگ پوری طرح عیاں ہے اور اس معاملہ میں آپ کے یہاں کوئی لچک نہیں، ذبح گاؤ کے مسئلہ میں بعض اہل علم نرم رویہ رکھتے تھے اور آزادی

سے پہلے مسلم لیگ نے تو ایک تجویز ہی پاس کردی تھی کہ مسلمان ذبح گاؤ سے رک کر ہندو بھائیوں کے جذبات کا احترام کریں، لیکن مولاناؒ اس مسئلہ میں کسی مداہنت کے روادار نہیں تھے؛ چنانچہ جمعیۃ علماء بہار کے اجلاس دربھنگہ ۱۳۳۹ھ میں مولاناؒ نے ایک فتویٰ مرتب فرمایا، جس پر بہار کے سربرآوردہ علماءِ کرام نے اپنے دستخط ثبت فرمائے اور مولاناؒ نے اس کو ''علماء بہار کا متفقہ فتویٰ'' کے نام سے شائع فرمایا، اس میں آپ نے قشقہ لگانے، ہندوؤں کے مراسم مذہبی میں شریک ہونے، کنٹھا باندھنے اور ہندوؤں کے جذبۂ گاؤ پرستی کی رعایت کرتے ہوئے ذبح گاؤ سے پرہیز کرنے کو ناجائز اور حرام قرار دیا اور ان چیزوں کو بہتر اور جائز سمجھنے کو تائید علی الشرک ہونے کی بنا پر باعث کفر قرار دیا، (ص:۸۸-۲۸۷) گورنمنٹ کی جانب سے اس طرح کی پابندی عائد کرنے کی کوشش کی گئی کہ وہ ایک مخصوص مقام پر ہی قربانی کر سکتے ہیں، دوسری جگہوں پر قربانی کی اجازت نہیں، مولاناؒ نے اپنے فتویٰ میں ہدایت فرمائی کہ مسلمان ایسی قیود کو ہرگز قبول نہ کریں؛ لیکن حسن تدبیر کو ملحوظ رکھیں اور مولانا کے الفاظ میں ''دفع ضرر اور جلب منفعت کا لحاظ کر کے کام کرنا چاہئے'' غیر مسلموں کے مشرکانہ میلہ جیسے دسہرہ وغیرہ میں شرکت سے بھی مولاناؒ نے سختی سے منع فرمایا اور مستفتیوں سے خواہش کی ہے کہ مسلمان خود اپنے انتظام سے کوئی بازار لگائیں، جس میں کوئی ناجائز کام نہ ہو۔ (ص:۱۳۶)

انگریزوں کا عہد استبداد ہے؛ لیکن مولانا کا فتویٰ بالکل واضح ہے کہ جو لوگ بہ رضا ورغبت حکومت کے ملازم ہیں اور حکم شریعت کی پرواہ کئے بغیر حکومت کا ہر حکم بجالاتے ہیں، ان کو امام نہیں بنانا چاہئے ؛ البتہ اگر ان کے پیچھے نماز پڑھ لی جائے تو نماز ادا ہوجائے گی ، ویران مساجد کے بارے میں بھی آپؒ کی رائے بالکل واضح اور بے لچک تھی کہ وہ قیامت تک کے لئے مسجد ہے اور حسب طاقت واستطاعت مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان مسجدوں کو واپس لے کر آباد کریں ، ورنہ سخت گنہ گار ہوں گے، مولاناؒ نے اپنے بعض فتاویٰ میں انگریزی عدالتوں کے فیصلوں کو غیر معتبر کہنے میں کسی حیلہ وتعریض سے کام نہیں لیا ہے، (دیکھئے: ص:۱۹۴) اور متعدد مواقع پر متنبہ کیا ہے کہ انگریزی عدالتوں میں ایسے مقدمات کا لے جانا سخت معیوب ہے۔ (ص:۲۰۰)

جو مسائل حلال وحرام سے متعلق ہیں، ان میں مولاناؒ کے یہاں بڑی احتیاط ہے 'بیع بالوفاء' کا مسئلہ جس میں بعض فقہاء نے تعامل کی بنا پر کسی قدر نرمی برتی ہے، مولاناؒ نے اس کو معاملۂ فاسد ہی قرار دیا ہے، (ص:۲۳۰) عیدگاہ کی زمین پر مدرسہ یا دارالطلبہ بنانے کی اجازت آپ نے نہیں دی ہے؛ کیوں کہ منشاء واقف کی خلاف ورزی ہے، مسجد کے صحن میں انگریزی تعلیم سے آپؒ نے ماحول کے پس منظر میں منع فرمایا؛ کیوں کہ بقول مولانا ''انگریزی تعلیم محض دنیا طلبی کے لئے ہے، اس لئے مسجد کے صحن میں تو قطعاً نہیں پڑھانا چاہئے'' (ص:۲۱۹) مولاناؒ نے عام حالات میں بینک میں روپیہ رکھنے سے منع کیا ہے اور کاروبار یا دیگر ضرورتوں سے بھی قرض لینے سے منع کیا ہے، بینک کے سود کے بارے میں مولاناؒ کے فتاویٰ متعارض ہیں، بعض فتاویٰ میں آپ نے بینک کے سود کو جائز قرار دیا ہے اور مولانا کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ رقم چوں کہ کافر سے ایک معاہدہ کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے، اس لئے یہ فیٔ کے حکم میں ہے اور مسلمانوں کے لئے جائز ہے (ص:۲۳۳-۳۴) لیکن ایک فتویٰ میں آپ نے دارالحرب میں بھی سود کو حرام قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ یہ قول احوط ہے، (ص:۲۳۲) لیکن ظاہر ہے کہ یہ فتویٰ برطانوی عہد سے متعلق ہے، نہ کہ موجودہ جمہوری دور سے؛ چنانچہ مولانا ایک فتویٰ میں رقمطراز ہیں: ''ہندوستان ہمارے نزدیک حکومتِ انگلیشیہ کے کامل تسلط کے وقت سے دارالحرب ہے''۔

اس احتیاط کے باوجود ایسا تشدد بھی نہ تھا کہ واقعی ضروریات کو بھی نظر انداز کر دیا جائے، آپ کے فتاویٰ میں احوالِ زمانہ کی حسب موقعہ رعایت بھی ہے، استبدالِ وقف کے مسئلہ میں قاضی شریعت کے اذن سے جواز کا رجحان ہے، (ص:۲۰۲) اگر مسجد کے کے سامنے قبر ہو اور اس کے کچھ اوپر سے چھت ڈال دی جائے، مولاناؒ نے اس صورت کو متولی یا وارث کی اجازت سے درست قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اس میں نماز ادا کرنے میں کوئی قباحت نہیں، (ص:۲۱۵) تجارت میں آج کل کمیشن ایجنٹ کی صورت عام ہے، مولانا کا رجحان اس کے جواز کی طرف ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ اُصول وقواعد پر جتنی نظر ہوگی، نگاہ میں وسعت پیدا ہوگی اور رائے میں توازن ہوگا اور جزئیات پر انحصار وقناعت سے تنگیٔ فکر بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات آدمی

کی رائے غیر متوازن ہوجاتی ہے، مولاناؒ کے فتاویٰ اور دوسری تحریروں سے یہ بات عیاں ہے کہ آپ مسائل کے حل میں زیادہ تر اُصول وقواعد کو پیش نظر رکھتے تھے، آپ کے فتاویٰ میں بھی جا بجا یہ رنگ موجود ہے، مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں: عبادات میں وہی کام کرنا چاہئے جو حدیث وفقہ سے ثابت ہو (ص:۴۲) ایک فتویٰ میں رقم طراز ہیں کہ قرض میں سود کی شرط شرط فاسد ہے (۲:۲۳۲) ایک اور فتوے میں فرماتے ہیں کہ تبدیلیٔ اسم سے مسمیٰ کی حقیقت نہیں بدلتی۔

خطبۂ صدارت

مولاناؒ کے علمی آثار میں نہایت گراں قدر شئی آپ کا وہ خطبۂ صدارت ہے، جو آپ نے اجلاس جمعیۃ علماء ہند منعقدہ مرادآباد میں تحریری طور پر پیش کیا تھا، یہ نہایت عالمانہ، بصیرت افروز اور موثر خطبہ ہے، یہ ایک طرف آپ کے مطالعہ کی وسعت اور علمی گہرائی کا شاہد ہے، دوسری طرف اپنے عہد اور حالات پر آپ کی گہری نگاہ کا ثبوت اور ساتھ ہی ساتھ اُمت کی مصیبت پر تڑپ اور درد واضطراب کا آئینہ دار، یہ خطبہ ایک سو دو صفحات پر مشتمل ہے، اس خطبہ میں آپ نے خلافتِ اسلامیہ کے مسئلہ پر تفصیلی بحث کی ہے، اس زمانہ میں خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کا واقعہ پیش آیا تھا اور یورپ سمجھتا تھا کہ اب اسلام کا چل چلاؤ ہے؛ چنانچہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط پر اظہار افسوس کے ساتھ ساتھ آپ نے یہ بات بھی واضح فرمائی ہے کہ خلافت کا خاتمہ خدانخواستہ اسلام کے خاتمہ کا پیش خیمہ نہیں؛ کیوں کہ ۶۵۶ھ تا ۶۵۹ھ کے عرصہ میں بھی عالم اسلام میں خلافت کا وجود نہیں تھا اور اسلام کی شان وبان اس کے باوجود باقی رہی، ترک الغاءِ حکومت کے لئے جو اعذار بیان کرتے تھے، مولاناؒ نے نمبر وار ان کا ذکر کیا ہے اور ایک ایک کرکے ان کا مدلل رد فرمایا ہے، پھر یہ واضح فرمایا ہے کہ اصل میں الغاءِ خلافت کے اسباب کیا ہیں، مولاناؒ کے خیال میں اس کے تین بنیادی اسباب ہیں :

اول یہ کہ اسلام میں حریت اور آزادی کا تصور یورپ سے مختلف ہے، یورپ نے اس لفظ کا سہارا لے کر مسلمانوں کو دھوکہ دیا اور مسلمانوں نے بھی محض لفظ اور تعبیر کے اشتراک کی وجہ سے سمجھ لیا کہ یہی حریت اسلام میں بھی مطلوب ہے؛ حالاں کہ مولانا کے الفاظ میں :

> اسلامی حریت، حریت مطلقہ نہیں؛ بلکہ مقیدہ ہے اور حریت مفرطہ نہیں بلکہ حریت عادلہ معتدلہ ہے اور مسلمان انسانوں کی غلامی سے بالکلیہ آزاد ہونے کے باوجود سر سے پاؤں تک اس دنیا میں قوانین الٰہی کی زنجیروں میں ایسا جکڑا ہوا ہے کہ ان زنجیروں کو توڑ کر وہ آزاد نہیں ہوسکتا؛ بلکہ انھیں زنجیروں میں جکڑ بندر ہنے کے ساتھ تمام خودساختہ پرداختہ انسانی غلامی سے آزاد ہے اور بالکل آزاد ہے۔

دوسرا سبب مولاناؒ کے الفاظ میں جمہوریت فاسدہ کا تعاون ہے اور اس میں بھی یہی ہوا کہ فرانسیسی جمہوریت اور اسلام کے جمہوری اور شورائی نظام کے فرق کو سمجھا نہ جاسکا۔

تیسرا سبب وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تعمیر ہے اور مولاناؒ کے بقول :

> اسلامی قومیت کی تعمیر صرف کلمۂ ''لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اور اُصولِ اسلام کی تسلیم اور انقیاد پر ہے اور یہی اسلامی قومیت حدود جغرافیہ سے بالاتر ہے، وطنیت کے جذبہ کا یقیناً آخری یہی اثر ونتیجہ ہوگا کہ مختلف مما لک کے مسلمان ایک دوسرے سے بے نیاز ہوکر اس وطن پرستی میں مشغول ہوجائیں گے، جو یقیناً اتحادِ عالم اور اسلامی مرکزیت کو ہمیشہ کے لئے ناممکن بنادے گا، اس کے بعد مغربی گرگے ایک ایک کرکے ہر ایک کو نگلنا شروع کردیں گے۔

مولاناؒ نے اس خطبہ میں علماء سے گلہ کیا ہے کہ فقہاء نے آدابِ قضاء وسیر، کتاب البیوع اور علم الکلام کے فصل امامت میں سیاست مدن سے متعلق بہت سے اُصولی اور فروعی احکام ذکر کئے ہیں، لیکن کتاب الطہارۃ، کتاب الصلوٰۃ اور نکاح وطلاق کے ابواب میں جس طرح بال کی کھال نکالی گئی ہے، نظام اسلام کے اُصول وفروع میں اس تفصیل سے کام نہیں لیا گیا ہے، قرآن نے اقامت صلاۃ، ایتاء زکوٰۃ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو تمکین فی الارض کا ثمرہ قرار دیا ہے؛ لیکن ''تمکین فی الارض'' کی نسبت قرآن وسنت اور خلفا راشدین

کے اُسوہ کی جو رہنمائی ہے، اس سے اعتناء کامل نہیں کیا گیا ہے، مولانا کی رائے ہے کہ اُصولِ اسلام کے علاوہ اب اس کی بھی ضرورت ہے کہ ''نظام اسلام'' اور مروجہ نظام ہائے جمہوریت کے مابین ما بہ الافتراق اُمور کو نہایت وضاحت سے ظاہر کیا جائے اور پھر نظام اسلام کے تفوق کو نمایاں طور پر واضح کر دیا جائے۔

مولاناؒ کو علماء سے شکایت ہے کہ جیسے علمی اعتبار سے سیاست مدن اور اجتماعی زندگی کے ابواب سے بے اعتنائی برتی گئی، اسی طرح علماء نے عملی حیثیت سے بھی سیاست سے دوری اختیار کی اور خلفاء راشدین کے بعد سے ہمیشہ سے اس باب میں کمی ہی ہوتی رہی، مولاناؒ نے سیاست عادلہ اور سیاست ظالمہ کی تفصیل بیان کرتے ہوئے واضح فرمایا کہ سیاست عین دین ہے اور حدیث کے الفاظ: ''تسوسهم الانبياء'' سے واضح ہے کہ یہ انبیاء کا طریقہ ہے، پھر مولاناؒ نے سلف صالحین میں ان فقہاء کا ذکر کیا ہے جو ایک طرف علم اور تفقہ میں اوج کمال کو پہنچے ہوئے تھے اور دوسری طرف حکومت کے اعلیٰ سیاسی عہدوں پر فائز المرام تھے، مولاناؒ نے اس سلسلہ میں محمود بن مظفر مروزی، علامہ عیسیٰ بن محمد ہکاری، قاضی القضاۃ تقی الدین بن عبدالوہاب علائی، علامہ محمد بن حسین انصاریؒ، قاضی القضاۃ علامہ تاج الدین ابن عبدالوہاب کا ذکر فرمایا ہے، پھر مولانا نے اقامت خلافت کے سلسلہ میں مسلمانانِ ہند اور علماءِ ہند کو متوجہ کیا ہے، مولاناؒ نے اس مضمون میں نظام اسلام پر ایک مکمل اور جامع کتاب کی ترتیب کا مشورہ دیا ہے، جو صرف فقہاء، محدثین اور متکلمین ہی کے اقوال پر مبنی نہ ہو؛ بلکہ مدارک حکم اور اُصول استصلاح کو ملحوظ رکھ کے مرتب کی جائے، مولاناؒ نے مسئلہ استصلاح پر بھی ایک مستقل رسالہ کی ترتیب کا مشورہ دیا ہے، جو مصلحت کے مدارج اور مصالح کے اعتبار کے اُصول کو واضح کرتا ہو، مولاناؒ نے اپنے اس خطبہ میں اس بات پر خاص طور پر سے زور دیا ہے کہ جزیرۃ العرب کو غیر مسلم اثر سے ہمیشہ کے لئے محفوظ و مامون بنا دیا جائے، کہ یہ بہت ہی ضروری ہے۔

اس خطبہ میں اس زمانہ میں حجاز میں شریف حسین اور اہل نجد کے درمیان جو معرکہ آرائیاں ہوئیں، ان کا بھی تفصیلی تذکرہ ہے، ترک موالات کے مسئلہ پر بھی تفصیلی بحث کی گئی

ہے اور موالات کی مختلف قسمیں اور ان کے احکام پر فقیہانہ روشنی ڈالی گئی ہے اور کفار محاربین اور کفار غیر محاربین کا فرق واضح کیا گیا ہے، مولاناؒ نے اس ذیل میں اختلافِ احوال کی وجہ سے تبدیلی احکام پر بھی بحث کی ہے اور خوب کہا ہے کہ دراصل حکم شرعی نہیں بدلتا؛ بلکہ ''حکم شرعی کا محل بدل جاتا ہے اور جب وہ محل نہیں رہا تو اس کا جو حکم تھا، وہ حکم بھی نہیں رہا'' مولاناؒ نے اسی مسئلہ کے تحت ''أھون البلیتین '' پر بھی تفصیل سے روشی ڈالی ہے، پھر ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے اس بات کو بھی منقح کیا ہے کہ غیر مسلموں سے ہدنۃ وصلح اور موادعت کی کیا صورت ہونی چاہئے اور مسلمانوں کو اس بات پر متنبہ کیا ہے کہ صلح وآشتی بھی ایسی نہ ہو کہ وہ کفر وشرک تک پہنچادے۔

مولاناؒ نے امام غزالیؒ کی'' میزان العلم والعمل '' کے حوالہ سے یہ نکتہ بھی آشکارا کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ''شیبتنی الھود ''(سورۂ ہود نے مجھے بوڑھا کردیا) فرمانے کی وجہ اس سورۃ میں شدائد قیامت اور اُمم ماضیہ کا ذکر نہیں؛ بلکہ '' فَاسْتَقِمْ كَمَا أُمِرْتَ '' کا حکم ہے، پھر مولانا نے مسلمانوں کو استقامت کی دعوت دی ہے اور نہایت ہی درمندانہ اور عالمانہ انداز پر اتحادِ علماء کی طرف متوجہ کیا ہے، مولاناؒ نے اس خطبہ کے اخیر میں 'امارتِ شرعیہ فی الہند' کے قیام کی دیرینہ آرزو کو دہرایا ہے اور اس فریضہ کی طرف علماء کو متوجہ کیا ہے، پھر نظام امارت کا پورا خاکہ تحریر فرمایا ہے اور اخیر میں حضراتِ علماء کو ان الفاظ سے متوجہ کیا ہے :

> یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ جس نظام کی دعوت دے رہا ہوں، اس سے مقصود شخصیت پرستی ہے، بلکہ میں وحدت پرستی کی دعوت دیتا ہوں اور یہ کہتا ہوں کہ جس طرح شخصیت ملعونہ کے قلادہ کو نکال پھینکئے، اسی طرح جمہوریت منحرفہ کے طوق کاٹ ڈالئے اور اس سنت سنیہ کو اختیار کیجئے، جس کی اتباع میں دارین کی فلاح ہے اور سنت سنیہ کی راہ وہی ہے، جس کا ادنیٰ خاکہ میں نے پیش کیا ہے اور اگر مسح خفین کا مسئلہ حسب بیان بعض صحابی قرآن میں موجود ہے تو میرا یہ کہنا

غلط نہیں ہے کہ نظام اسلام کا وہ خاکہ بھی جو میں نے پیش کیا ہے
یا جمعیۃ علماء کے سامنے ہے، قرآن میں موجود ہے :
لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ، وقال رسول الله صلى الله عليه وسلم : عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين وعضوا عليها بالنواجذ .

حقیقت یہ ہے کہ مولاناؒ کا یہ خطبہ نہایت بصیرت افروز اور چشم کشا ہے اور اس لائق ہے کہ تمام مسلمان اور خاص کر علماء اور قائدین ضرور اس کا مطالعہ کریں، کہ شکوک وشبہات کی کتنی ہی گرہیں ہیں، جو اس خطبہ سے کھلتی ہیں اور فکر ونظر کی کتنی ہی سمتیں ہیں، جو اس خطبہ سے وا ہوتی ہیں۔

حکومتِ الٰہی

مولاناؒ نے خطبۂ صدارت مرادآباد میں نظام اسلام پر جس کتاب کی ضرورت کا اظہار فرمایا ہے اور اس جامع کتاب کا جو خاکہ آپ کے ذہن میں تھا، یہ کتاب اسی کی تمہید اور اس کا لُب لباب ہے؛ اسی لئے یہ کتاب صرف ایک باب پر مشتمل ہے، نہ معلوم اور کتنے ابواب کا خاکہ مولاناؒ کے ذہن میں تھا، اس مفصل کتاب کے لئے متفرق نوٹس آپ نے لکھ رکھا تھا، اب اس کی ترتیب وتدوین کا مرحلہ تھا، اسی سلسلہ میں یہ تمہیدی باب پورا ہوا اور لکھنے والے نے دل ودماغ کی اس امانت کو قلم کے سپرد کرنے سے پہلے ہی داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں بے آمیز طریقہ پر حکومت الٰہیہ قائم ہے، امیر شریعت رابع مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے ۱۹۴۱ء میں اسے طبع فرمایا، مولانا نا رحمانیؒ نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ’’حکومت الٰہیہ کے نظام کی تفصیلات مولاناؒ کے جمع کردہ نوٹس میں موجود ومحفوظ ہیں، اگرچہ ان کی ترتیب وتبویب کا کام آسان نہیں، لیکن کوشش کی جائے گی کہ اس کو مرتب کرکے شائع کیا جائے‘‘ (ص:۵-۶) نہ معلوم اب یہ نوٹس بھی موجود ومحفوظ ہیں یا نہیں؟ اگر یہ حاصل ہو جائیں اور موجودہ حالت میں ہی شائع ہو جائیں، تب بھی اُمید ہے کہ یہ اصحابِ فکر ونظر کے لئے خضر طریق سے کم نہ ہوگا، اس کتاب پر مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا بیش قیمت اور مفصل مقدمہ ہے، مولانا

سیوہارویؒ نے حضرت مولاناؒ کی شخصیت، ان کی فکر سلیم، اسلام اور اُمت مسلمہ کے لئے درد بیکراں اور مولانا کی فکر و نظر کی گہرائی اور اس کتاب کی اہمیت کا دل کھول کر اعتراف کیا ہے۔

یہ کتاب دس فصلوں پر مشتمل ہے، اس سے پہلے گیارہ صفحات پر نہایت ہی فاضلانہ تمہید ہے، جس میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ رب کائنات نے تمام حیوانات میں جماعتی اور اجتماعی اُصول پر زندگی بسر کرنے کا جذبہ ودیعت فرمایا ہے، پھر انسان جو اشرف المخلوقات ہے، وہ اس سے کیوں کر محروم رہ سکتا ہے؟ خدا کی ربوبیت کا تقاضہ صرف یہی نہیں کہ وہ ضروریاتِ زندگی کا سامان کر لے، بلکہ اس نے انسان کے لئے دستور العمل بھی دیا ہے، جس پر عمل کرنا ہر انسان کے لئے ضروری ہے۔

پھر اصل کتاب شروع ہوتی ہے، جس کا مقصد جماعتی نظام کی ضرورت کو بتلانا ہے، پھر مولاناؒ نے چار فصلوں میں انسان کی چار اہم حاجتوں: تحفظِ مال، تحفظِ نسل، تحفظِ ناموس وعزت اور تحفظِ جان کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ بغیر اجتماعی نظام کے ان مقاصد کا صحیح طریقہ پر حاصل ہونا ممکن نہیں، پانچویں فصل میں واضح کیا گیا ہے کہ جماعتی نظام کے برقرار رکھنے کے لئے انسانی حکومت ضروری ہے، انسانی حکومت کی جو صورت مروج ہے، وہ دو طرح کی ہے، ایک شخصی حکومت، دوسرے جمہوری حکومت، یہ بات کہ شخص واحد حکمراں ہو اور اس کی زبان قانون ہو، اہل دانش نے کبھی اس کو پسند نہیں کیا، عام طور پر عقلاء دہر کا فیصلہ جمہوری حکومت کے حق میں ہے؛ لیکن یہ جمہوری نظام چند در چند مفاسد کا مجموعہ ہے، مولاناؒ نے اس موضوع پر بڑی حکیمانہ گفتگو کی ہے اور بتایا ہے کہ جمہوری حکومت میں ایک بھی نمائندہ ایسا نہیں ہوتا جس پر تمام لوگ متفق ہوں، الیکشن کے ذریعہ منتخب ارکان جو قانون بناتے ہیں اگر حلقہ وار ووٹ کا شمار کیا جائے تو یہ اکثریتی فیصلہ نہیں ہوتا، بلکہ اقلیتی فیصلہ ہوتا ہے اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ ملک کے شہریوں کے دل میں اس قانون کا احترام نہیں پیدا ہوتا ہے۔

چھٹی فصل میں مولاناؒ نے ان اسباب ونتائج پر گفتگو کی ہے جو انسانی نظام حکومت کی ناکامی کا باعث ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول تو ہر انسان سمجھتا ہے کہ جو قانون واضع کیا گیا

ہے، اس کے وضع کرنے والے ہمارے ہی جیسے انسان ہیں اور بشری خواہشات اور عصبیتوں سے مبرا نہیں ہیں، اس لئے وہ قابل اعتماد نہیں ہیں، دوسرے اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے قانون سازی میں اپنے مصالح اور مفادات کو ترجیح دے کر جانب داری سے کام نہیں لیا ہے، تب بھی یہ ضروری نہیں کہ وہ قانون عام انسانوں کے لئے بھی مفید اور نافع ہو، تیسرے اگر واضع قانون نیک نیت بھی ہو اور قانون مفید بھی، جب بھی چوں کہ کوئی بھی قانون انسان کی مطلق آزادی کو محدود کرتی ہے، اس لئے اس کا ماننا گراں خاطر ہوگا اور قانون کے تئیں احترام اور جذبۂ وفاداری دل میں پیدا نہ ہوگا۔

اس کے بعد قانون سازی کے لوازم پر گفتگو کی گئی ہے کہ واضع قانون کو کن صفات اور صلاحیتوں کا حامل ہونا چاہئے؟ پھر بتایا گیا ہے کہ انسان کے اندران صفات کا جمع ہونا اور بہ درجۂ کمال پایا جانا ممکن نہیں؛ چنانچہ ساتویں فصل میں یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ وضع قانون کے لئے جو صفات اور صلاحیتیں مطلوب ہیں، وہ کائنات کے خالق اور رب کے سوا کسی مخلوق میں نہیں پائی جاسکتیں، پھر اللہ تعالیٰ کی صفت علم، صفت، ربوبیت، سماعت، کلام، تدبیر وارادہ، انعام واکرام، تعزیر وتعذیب اور وحدتِ الٰہ پر نہایت ہی ایمان افروز گفتگو کی گئی ہے، آٹھویں فصل میں استحضار مسئلہ کے لئے ان ہی مضامین کا خلاصہ ذکر کیا گیا ہے۔

جب یہ بات ثابت ہوگئی کہ انسان اپنے نظام اجتماعی کے لئے ایک قانون کا محتاج ہے اور خدا کے سوا کوئی نہیں جو اس قانون کو وضع کر سکے، تو اب نویں فصل میں اس بابت گفتگو کی گئی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کے قوانین کا علم کس طرح حاصل ہوسکتا ہے، پھر مولاناؒ نے بڑے حکیمانہ انداز میں یہ بات ثابت کی ہے کہ ہر انسان براہ راست قوانین الٰہی سے واقف نہیں ہوسکتا اور حضراتِ انبیاء علیہم السلام جن کے ذریعہ اللہ کی شریعت اللہ کے بندوں تک پہنچتی ہے، ان کی خصوصیات وامتیازات کا تفصیلی ذکر ہے، اس تمہیدی باب کی دسویں اور آخری فصل پوری کتاب کا مقصد اور نتیجہ ہے، کہ انسانیت کی فلاح کا ذریعہ صرف حکومتِ الٰہی ہے اور اس کے بعد مولاناؒ نے اجتماعی نظام الٰہی کی خصوصیات ذکر فرمائی ہیں۔

یہ مختصر لیکن چشم کشا کتاب کیا ہے؟ ایک مشعل راہ، جس میں اُمت کی صلاح وفلاح کا راستہ دیکھا جائے اور ان کی ذلت ورسوائی کا سبب دوپہر کی روشنی کی طرح متلاشیانِ حق کو نظر آجائے، اس کتاب کی سطر سطر مولاناؒ کے اخاذ ذہن، رسا دماغ، کتاب وسنت کی غواص فکر، دردمند تڑپتا ہوا اور بے چین دل کی شاہد عدل ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ گو ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں آپ دوسری مذہبی اکائیوں کے ساتھ شریک رہے؛ لیکن حکومت الٰہیہ اور خلافت علی منہاج النبوۃ کے قیام کا نصب العین کبھی آپ کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہوا، کوئی دن نہ تھا، جس نے جستجوئے منزل میں آپ کو بے چین نہ رکھا ہو اور کوئی شب نہ تھی، جس نے اس فکر میں آپ کی کروٹوں کو بے سکون نہ کیا ہو۔

مولاناؒ کوئی ادیب اور شاعر نہیں تھے، زبان بھی سنت موسوی کی متبع تھی، یعنی کسی قدر لکنت کے ساتھ گفتگو کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود دو باتیں مولاناؒ کی تحریر کا امتیاز ہیں: ایک تو مضامین میں آورد کی بجائے آمد کی کیفیت، خداداد مضامین جن سے مولاناؒ کی زبردست قوت فکریہ کا اندازہ ہوتا ہے، دوسرے: مشکل مضامین کو بھی عام فہم اور موثر تعبیر کے ساتھ پیش کرنا، جس میں قلم کی روشنائی سے زیادہ مولاناؒ کے خونِ جگر کی آمیزش اہل نظر کو صاف نظر آتی ہے، ایسے بہت سے اقتباسات ہیں جو نقل کئے جانے کے لائق ہیں؛ لیکن یہ طوالت کا باعث ہوں گے، مگر جی چاہتا ہے کہ مولاناؒ کے بیان وتعبیر کے اُسلوب کی بابت ایک آدھ اقتباسات ضرور ہی آپ کی خدمت میں پیش کردوں :

> علم التشریحات کے جاننے والوں نے انسانوں کے جسم اور اس کے تمام اعضاء کو ہزاروں بار چیر پھاڑ کر دیکھا ہے اور سرجری کی بڑی بڑی کتابیں لکھ ڈالی ہیں، وہ ان کی لمبائی، چوڑائی، موٹائی، گہرائی سب کو بتائیں گے، اس میں جو مرض پیدا ہوگا، وہ بھی بتائیں گے، اس کا علاج بھی کریں گے، مگر وہ اس امر کے بتانے سے عاجز ہیں کہ ایک انسان کی آواز دوسرے انسان کی آواز سے، مرد کی آواز عورت

کی آواز سے پھر ہر مرد بچے کی آواز دوسرے مرد بچے کی آواز سے اور ہر عورت اور بچیوں کی آواز دوسری عورت اور بچیوں کی آواز سے کیوں مختلف ہے؟ کوئی ایک آواز دوسری آواز سے کبھی نہیں ملتی، اس چندانچ کی نالیوں کے اندر خالق نے اپنے ارادہ سے کیسی کیسی تدبیر کی ہے کہ اسی چندانچ کی نالیوں سے اربوں قسم کی آواز نکلتی ہے اور کوئی ایک دوسرے سے نہیں ملتی ......اگر نباتات کے پتوں اور پھولوں کو دیکھو تو تمہیں نظر آئے گا کہ ایک ہی پھول کے درخت کی ہر ایک پتی اور پھول میں مختلف رنگ اور نقش ونگار ہیں، جن کو دیکھ کر تمہاری آنکھوں کو ٹھنڈک اور لذت محسوس ہوتی ہے اور دل مسرور ہوتے ہیں، مگر یہ تو سوچو کہ پودا ایک، زمین ایک، زمین کی کھاد اور آب وہوا ایک، اس وحدت اور یکجہتی کے باوجود مختلف رنگ اور مختلف نقش ونگار کس طرح پیدا ہوگئے؟ مادیات جن سے پودوں کو غذا ملتی ہے اور جن سے وہ پرورش پاتے ہیں، ان میں نہ ارادہ ہے، نہ شعور ہے کہ کچھ بھی کرسکیں، چہ جائے کہ اس حسن وترتیب وحسن صنعت کے ساتھ کسی کام کو انجام دے سکیں، پھر نیلے، پیلے، اودے، سرخ اور گلابی رنگ ایک خاص تناسب سے ہری ہری ڈالیوں کی پتیوں اور کلیوں میں کس طرح پیدا ہوگئے؟ ان سوالات کا جواب تم یا کوئی دوسرا دانش مند دے سکتا ہے؟ سوا اس کے کہ وہ یہ کہے کہ خالق کائنات کی قدرت کی یہ صناعی ہے، جس نے اپنے ارادہ اور حسن تدبیر سے پتیوں، پھولوں اور کلیوں میں یہ تمام گلکاریاں کی ہیں۔

❁ ❁ ❁

مولانا سید محمد علی مونگیریؒ

اس کا انداز نظر اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیران طریق

ہندوستان میں احیاء دین، دعوت و اصلاح اور اسلام کے تحفظ کی جو بھی تاریخ لکھی جائے گی، مولانا محمد علی مونگیریؒ کے ذکر کے بغیر ادھوری اور نامکمل ہوگی — وہ دل و دماغ کا حسین سنگم اور عقل و معرفت کا خوبصورت امتزاج تھے، قدرت نے ان کو بیک وقت دوراندیشی، فراست و دانائی، بالغ نظری اور بیدار مغزی سے بھی نوازا تھا اور درد و سوز، سیماب وش تڑپ اور دینی غیرت وحمیت سے بھی، سوز و کیف نے کبھی ان کو اپنے ماحول اور واقعی حالات سے غافل نہ کیا اور فراست و دانائی کبھی ان کی رسم درویشی سے آزاد نہ ہوسکی۔

قدرت نے ان کو جس خاندان کی آغوش میں جگہ دی، وہ پہلے ہی سے ارشاد و معرفت میں ممتاز اور مشہور تھا، ان کے جد امجد سید شاہ غوث علیؒ بڑے صاحب دل اور خداترس آدمی تھے، جن کا قیام کانپور میں تھا، یہیں ۳ رشعبان ۱۲۶۲ھ م ۲۸ رجولائی ۱۸۴۶ء کو پیدا ہوئے، دو سال کے تھے کہ والد ماجد نے داغ فراق دیا اور دس بارہ سال کی عمر تک دادا کے زیر سایہ پرورش پائی، ابتدائی تعلیم خود دادا جان کے پاس ہوئی، قرآن مجید عم محترم سید ظہور علی صاحب سے پڑھا، فارسی کی تعلیم مولوی عبدالواحد بلگرامی سے حاصل کی، حفظ شروع کیا؛ مگر ناسازی طبع نے موقع نہ دیا اور تکمیل نہ ہوسکی، نحو وصرف کی کتابیں اپنے زمانہ کے مشہور عالم اور مدرس مفتی عنایت احمد کاکوروی سے اور معقولات اور شرح ملا جامی وغیرہ مولانا سید حسین شاہ سے

پڑھی، صحاحِ ستہ کا درس سبقاً سبقاً نہایت اہتمام سے اور بقول ان کے ہدایہ کی طرح صفحہ دو صفحہ کر کے استاذ الاساتذہ مولانا لطف اللہ علی گڑھی سے لیا اور یہ ساری تعلیم اپنے گھر کے علاوہ ''مدرسہ فیض عام کانپور'' اور مولانا لطف اللہ صاحب کے علی گڑھ منتقل ہونے کے بعد مدرسہ جامع مسجد علی گڑھ میں ہوئی، طالب علمی ہی کے زمانہ سے معقولات سے بے رغبتی ؛ بلکہ ایک گونہ تنفر اور قرآن وحدیث اور فقہ سے شغف تھا اور حدیث سے تو خصوصی تعلق تھا: چنانچہ تعلیم کی تکمیل اور شادی وغیرہ کے بعد پھر دل و دماغ کی تشنہ کامی مشہور محدث مولانا احمد علی سہارنپوریؒ کے پاس لے گئی، وہاں صحاحِ ستہ کے علاوہ مؤطاامام مالک اور مؤطاامام محمد پڑھی، شاگرد کی سعادت اور مستقبل کی ہوشمندی کا اندازہ کر کے مولانا سہارنپوری بھی احترام واکرام سے پیش آتے، وہاں سے حدیث کی اجازت لی، پھر گنج مرادآباد آئے، یہاں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی نے صحاح ستہ، مؤطا امام مالکؒ اور حصن حصین کی اجازت دی، اس سے پہلے ایک بزرگ مولانا آل محمد محدث پھلواروی، مہاجر مدنی بھی بلا طلب ہی صحیح بخاری کی اجازت دے چکے تھے۔

سہارنپور سے واپس آئے تو کانپور ہی میں تدریس کا مشغلہ شروع کیا، ذکاوت وطباعی اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی سے دی تھی، طالب علمی کے زمانہ میں بھی درسی مسائل پر گھنٹوں اور کئی کئی دن بحث رہتی اور آپ کے اساتذہ بھی آپ کی فطانت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے، اب جو درس شروع کیا تو مرجع خاص وعام بن گئے، صبح سے شب تک پورا وقت تدریس میں گذرتا، ابتداءً تو علاحدہ درس دیتے رہے، پھر مدرسہ فیض عام کے ارباب انتظام کی خواہش اور اصرار پر خود مدرسہ میں مدرس ہو گئے اور ڈھائی تین سال تعلیم دی، پھر صحت کی نامساعدت اور علالت نے ایسا مجبور کیا کہ تدریس سے رشتہ توڑنا پڑا۔

سلامت روی اور تعلق باللہ فطرت میں ودیعت تھا، بچپن ہی سے علماءِ حق اور بزرگوں کی تلاش تھی، جب بھی کسی مردِ صالح بندۂ خدا نے رُخ کیا، آپ استفادہ کے لئے ان کی خدمت

میں حاضر ہو گئے، آغازِ شباب میں کچھ استفادہ حافظ محمد صاحب سے کیا اور اسی وقت سے دل پر عجیب قسم کی واردات طاری ہونے لگیں، پھر ایک صاحب دل بزرگ مولانا کرامت علی قادریؒ سے دس ماہ استفادہ کیا، اس زمانہ میں حضرت شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کی کانپور میں آمد ورفت رہتی تھی، آپ طالب علمی ہی سے خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، یہاں تک کہ بیعت بھی ہو گئے اور جلد ہی اجازت وخلافت سے سرفراز بھی کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے اندر جو بے نفسی، کسر ذات، استغناء، قناعت وتوکل، حلم وانکسار اور صبر ورضا کا جوہر رکھا تھا، وہ خال خال ہی پایا جاتا ہے، سوز وگداز کا عالم یہ تھا کہ بچپن ہی سے حضور ﷺ کی زیارت کو روتے تھے، نعتیہ اشعار سنتے تو کیف واستغراق پیدا ہو جاتا، نماز سے ایسا عشق کہ اگر جماعت چھوٹ گئی تو صدمہ سے گر پڑتے، تہجد کے بھی پابند، دنیا سے بے رغبتی اور مال واسباب سے بے اعتنائی اس درجہ کہ نذر ونیاز قبول نہ کرتے، توکل کا یہ عالم کہ بارہ سال کی عمر میں جدامجد کا انتقال ہوا اور پورے گھر کی ذمہ داری سر پر آ گئی مگر تعلیم نہ ترک کی، پھر نکاح کیا، حالات نے ملازمت پر مجبور کیا؛ مگر اللہ کی رزاقیت کا ایک مضمون پڑھا، دل کا وسوسہ جاتا رہا اور تحصیل علم میں مصروف رہے، استغناء کا یہ حال کہ حیدرآباد اور مختلف رؤساء وامراء کی طرف سے بڑی بڑی تنخواہوں اور جلیل القدر عہدوں کی پیش کش ہوئی، مگر کاخ درویشی کو ترجیح دیا اور اس طرف توجہ تک نہ کی، بزرگوں کا احترام اس قدر کہ ان کی جوتیوں کے پاس جا کر بیٹھتے، حلم وبردباری کی حد یہ کہ اپنے ماتحتوں کے سخت ترین خطوط اور تنقیدات پر بھی قلم پر حرف شکایت نہ آتا ——مگر ان کی ذات درویشی کے ساتھ ساتھ سلطانی کا بہترین مظہر تھی، کہ مہمانوں کی کثرت اور منتسبین کا اژدحام ہوتا، مگر ہر ایک کے لئے مناسب قیام وطعام کا انتظام۔

شاہ فضل رحماں گنج مرادآبادی فرماتے تھے کہ یہ بڑے اور غنی آدمی ہیں اور مجھے اس کو اپنا خلیفہ کہنے میں شرم محسوس ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان میں ایسا اثر رکھا تھا کہ ایک دفعہ ''اللہ'' کہتے اور پورے مجمع پر رقت اور وارفتگی طاری ہو جاتی، کبھی جوش میں ایک دو

فقرے کہتے تو یہ حال ہوتا کہ تمام حاضرین و جدوجذب کی کیفیت میں مبتلا ہوجاتے اوردلوں پر قابونہیں رہتا، آپ نے جس علاقہ کا رُخ کیا وہاں مردہ دلوں پر زندگی کی ایک باد بہار آ گئی، نشہ خواروں نے نشہ سے اور بے نمازیوں نے غفلت سے توبہ کی اور ننگ قوم رشک قوم بن گئے۔

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اس طرح ان کی طرف متوجہ کیا کہ جہاں جاتے، دور دراز سے لوگوں کا ہجوم وارد ہوکر بیعت ہوتا، حضرت گنج مرادآبادی کے بعد تو ان کے تمام مریدین اور منتسبین کا رُخ بھی آپ ہی کی طرف تھا اور مریدین کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی، صوبہ بہار کے علاوہ بنگال وافریقہ اور مختلف علاقوں میں آپ کے مریدین تھے اور ''چین'' کے بھی ایک بڑے عالم آپ سے بیعت تھے، آپ کے خلفاء میں مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوریؒ اور مولانا عبدالرشید صاحب رانی ساگریؒ کو زیادہ مرجعیت حاصل ہوئی اور فرزند اکبر مولانا لطف اللہ صاحبؒ جانشیں ہوئے۔

تصوف کے سلسلہ میں مروجہ رسوم سے دور تھے، ان کے یہاں طریقت شریعت کی پابند تھی، فرماتے تھے کہ اتباع سنت ہی سب سے بڑی کرامت ہے، لوگ کشف وکرامات دیکھتے ہیں؛ حالاں کہ دیکھنے کی چیز شریعت پر استقامت، اس کی محبت کا فیض اور متعلقین پر اس کے اثرات ہیں، وہ اس کے قائل نہ تھے کہ شریعت کے مختلف احکام میں درجات ومراتب کا فرق باقی نہ رکھا جائے، مستحب کو واجب کا درجہ دے دیا جائے اور اس کے تارک کو تحقیر کی نظر سے دیکھا جائے، مشاہدات وکرامات کو آپ کے یہاں اہمیت حاصل نہ تھی؛ بلکہ قلب میں حب الٰہی پیدا ہوجانا، ماسوی اللہ سے دل کا کٹ جانا اور خدا کی ذات وصفات کا استحضار زیادہ اہم تھا، وہ رسمی ذکر اور اس کی لذت کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے؛ بلکہ تعلق مع اللہ کا حکم دیتے اور فرماتے کہ بہت سے ذاکرین کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا، شیخ کا معیار آپ کے پاس یہ تھا کہ شریعت کا پابند اور عبادات ومعاملات میں درست ہو، اس کی صحبت سے خدا یاد آئے اور دنیا کی محبت کم ہو، وہ ایسے تصوف کے قائل نہ تھے کہ دنیا اور اسباب دنیا سے کوئی ربط ہی نہ رہے؛ چنانچہ اپنے ایک

متعلق کو جنھوں نے ذکر وغیرہ کے لئے تجارت چھوڑ رکھی تھی، بہ اصرار کہا کہ تجارت کریں، اسے حضور ﷺ نے ایک مبارک کام قرار دیا ہے، فرماتے ہیں کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ہر ایک تارک الدنیا ہوکر مسجد میں بیٹھ جائے؛ بلکہ کہتا ہوں کہ اپنی دنیا کی اصلاح کرو اور آخرت کے لئے عمل کرو۔

نقشبندی سلسلہ کے معمول کے مطابق مولانا بھی تصوف کے دقیق اور لطیف مسائل کی تعلیم نہ دیتے تھے، بلکہ ہر آدمی کے حالات اور صلاحیت کے پیش نظر اذکار و اوراد کی تلقین اور تربیت فرماتے تھے، ایک صاحب نے ابن عربیؒ کے ''وحدۃ الوجود'' اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے فلسفہ ''وحدۃ الشہور'' کی بابت تحقیق کی، تو آپ نے مثالوں کے ذریعہ تفہیم کی، اور اس قسم کے مسائل میں نہ پڑنے اور ان بحثوں میں نہ اُلجھنے کی بہ تاکید تلقین بھی فرمائی، اسی طرح ''تصورِ شیخ'' وغیرہ کی تعلیم بھی اپنے شیخ کے طریقہ کے مطابق نہیں دیتے تھے، مروجہ سماع و مزمار کے قائل نہ تھے اور نہ اس پر عامل، مگر تنہائی میں کبھی کسی خوش گلو رفیق سے ساز و آہنگ کے بغیر نعت سنا کرتے تھے اور اس وقت استغراق کی کیفیت طاری ہوجاتی تھی، طبیعت میں ذوق ونفاست تھی، طبیعت سادہ اور بے تکلف تھی، مگر خوش پوش اور خوش وضع تھے اور کمبل اوڑھنے اور موٹا کپڑا پہننے میں ریاکاری کا خوف محسوس کرتے تھے۔

سفر احسان وسلوک کے راہبر ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے اندر زمانہ شناسی اور حالات آگہی بھی تھی اور وہ اسلامی حدود میں جدید فکر و مزاج کے حامل بھی تھے، انھوں نے کانپور میں ''انجمن تہذیب'' قائم کی؛ حالاں کہ اس وقت کسی عالم دین کے لئے ثقافتی انجمنوں کا قیام ایک ''عجیب بات'' تھی، —— چوں کہ تعلیم کسی معاشرہ کے لئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی ہے اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہونے کے لئے دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم میں مناسب تغیر ضروری تھا؛ اس لئے عملاً آپ ہی نے سب سے پہلے اس سمت میں قدم اٹھایا اور علماء کو اس کی دعوت دی۔

ہندوستان میں اس وقت ''درسِ نظامی'' کا غلبہ تھا، اس نصاب میں ایک تو ''منطق وفلسفہ'' کو وافر جگہ دی گئی تھی، دوسرے جو اور فنون کی کتابیں تھیں، ان کا اُسلوب اور طرز تصنیف بھی خالص معقولی رنگ کا تھا، مولانا کو ایسی کتابیں پسند نہ تھیں، ایک تو شروع سے یہی آپ کی طبعی افتاد تھی، پھر حضرت گنج مرادآبادی کو بھی چوں کہ حدیث سے اشتغال کی وجہ سے معقولات سے نفور تھا؛ اس لئے ان کی محبت نے اور بھی تنفر پیدا کر دیا، ان کی خواہش تھی کہ اس طرح کی کتابیں کم سے کم کر دی جائیں اور تاریخ وجغرافیہ، اسرار وحِکَم، تجوید، سلوک، تہذیب نفس، فلسفۂ جدیدہ، ہیئت جدیدہ وغیرہ داخل نصاب ہو، علوم دینیہ میں جدید کلام اور فقہ میں مہارت اور وسیع النظری پر بہت زور دیتے تھے۔

عربی ادب میں مقفع و مسجع انشاء اور اشعار پر اکتفا کرنے اور اس پر زور دینے کے روادار نہ تھے؛ بلکہ عربی کی سلیس ورواں ادب کی کتابوں اور اس پر مشق وتمرین اور انشاء کے قائل تھے اور نصاب میں اس کو زیادہ سے زیادہ جگہ دینا چاہتے تھے، وہ مدارس میں انگریزی زبان کی تعلیم اور عصری تعلیم یافتہ حضرات کے لئے دینی تعلیم کے نظم کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے؛ البتہ اس کو ضروری سمجھتے تھے کہ علوم جدیدہ کو اس طرح داخل نصاب کیا جائے کہ علوم اسلامی کی تعلیم میں خلل پیدا نہ ہو، اُردو کے زندہ اور حاضر اُسلوب میں انشاء وخطابت کی مہارت اور تعلم کے بھی حامی تھے اور ندوہ کے متعلقین ومدرسین کو اس سلسلہ میں ہدایات دیتے رہتے تھے۔

علم کلام میں ان کا نقطۂ نظر تھا کہ قدیم علم کلام کے ساتھ کوئی ایسی کتاب بھی پڑھائی جائے، جس سے طلبہ جدید علم کلام، مستشرقین کے شبہات واعتراضات اور اس کے جواب نیز عیسائی مشنریوں کی طرف سے اُٹھنے والے تشکیکی پروپگنڈوں وغیرہ سے پوری طرح آشنا ہو جائیں، ان کا جواب دے سکیں اور ایسے اُسلوب میں دے سکیں، جو جدید ذہن کو مطمئن کرے۔

وہ تعلیم کی طرح مدارس کے نظام اور اُصول تربیت میں بھی ایک انقلابی مگر متوازن

تبدیلی چاہتے تھے، وہ طلبہ کے لئے جسمانی ورزش اور حفظان صحت کے اُصول کی رعایت کو بہت ضروری سمجھتے تھے، اس قدر آزادی اور چھوٹ کے بھی روادار نہ تھے کہ طلبہ غیر مہذب ہوجائیں اور اتنی قید و بند اور دباؤ کے بھی قائل نہ تھے کہ بشاشت وطباعی جاتی رہے، وہ ڈسپلن، پابندی اوقات، صفائی ستھرائی، بول چال میں تہذیب اور مطالعہ وغیرہ پر بہت زور دیتے تھے۔

نصاب تعلیم اور دینی مدارس کے نظام کے سلسلہ میں ان کے نقطۂ نظر کی اہمیت اب سمجھ میں نہیں آسکتی؛ اس لئے کہ آج ہر چہار گوشہ سے اس قسم کی صدائیں اٹھ رہی ہیں اور کل کے اندازے آج کے تجربات بن گئے ہیں، مگر اس وقت یہ آواز نامانوس اور عجوبہ تھی، شدید مخالفت کا سامنا تھا اور مدارس کی قدیم روایات کے خلاف گویا ایک طرح کی جسارت تھی۔

''تعلیم'' کے نصاب اور نظام میں اس تغیر کا منشاء یہ تھا کہ دینی مدارس کے فضلاء کو عصر حاضر کے تقاضوں سے ہم آہنگ اور جدید انداز فکر اور اُسلوب میں اسلام کا نمائندہ بنایا جاسکے، مگر ایسے کسی نظام کے قیام کے لئے اس بات کی بھی شدید ضرورت تھی کہ جدید وقدیم طبقہ ایک دوسرے سے قریب آئے، ان کی خلیج کم ہو اور ان کے فاصلے سمٹیں، نیز علماء جو جدید مسائل پر غور کرنے کی بجائے اپنی پوری توجہ ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق پر صرف کررہے ہیں اور جن کے قلم کی ساری جولانی اور فکر وخیال کی تمام تر تابانی گڑی ہوئی ہڈیاں اکھیڑنے پر لگی ہوئی ہیں، وہ ان باہمی اختلافات اور نزاعات کو بھول کر وسیع النظری اور فراخدلی کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھیں اور ان مسائل پر غور کریں، جو جدید حالات میں ملت اسلامیہ کو درپیش ہیں اور جن کے کے لئے زمانہ آگہی اور اپنے عہد سے باخبری کے ساتھ ساتھ علوم شریعت کی روح، اسلاف کے طریق کار سے واقفیت اور گہری بصیرت کی ضرورت ہے۔

انھیں اُمور کو سامنے رکھ کر انھوں نے ١٣١٠ھ میں اکابر علماء جن میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوریؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، کی معیت میں ''ندوۃ العلماء'' کی بنیاد رکھی، خود ہی اس کے

محرک تھے اور مشورہ میں وہی اس کے پہلے ناظم مقرر ہوئے، جس کا بنیادی مقصد علماء کی جدید تقاضوں کے مطابق تربیت اور ان کے درمیان اتفاق واتحاد پیدا کرنا تھا، اہل دانش اور علماء کی جانب سے اس تحریک کی —— جو وقت کی آواز اور سب سے بڑی ضرورت تھی —— زبردست تائید ہوئی؛ چنانچہ ہر سال مختلف شہروں میں اس کے سالانہ جلسے ہونے لگے، جس میں جدید مسائل پر مقالات پڑھے جاتے اور تقریریں ہوتیں، یہاں تک کہ اسی مقصد کی تکمیل کے لئے ۱۳۱۶ھ م ۱۸۹۸ء میں ندوہ کے تحت ایک ''دارالعلوم'' کی داغ بیل ڈالی گئی، جو اب ایک معروف تاریخی ''جامعہ'' بن چکا ہے۔

جدید وقدیم کے امتزاج کا خیال مولانا نے ابتداء ہی سے رکھا، بہتر اساتذہ کا انتخاب کیا، یہاں تک کہ مولانا شبلی نعمانیؒ جیسے دیدہ ور، بالغ نظر اور عبقری عالم کو لائے اور ان کی درشت مزاجی اور ایک گونہ تندی کے باوجود پورے حلم وانکسار کے ساتھ نباہ کیا اور اس طرح ندوہ کی آغوش سے علامہ سید سلیمان ندویؒ جیسا عالم پیدا ہوا، جو مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے الفاظ میں تنہا ندوہ کے فخر کے لئے کافی ہے —— مولانا نے ندوہ کا نصاب بہت متوازن رکھا تھا اور ''زبان ہوش مند'' کے ساتھ علم وتحقیق پر بھی زور دیا تھا، گو ایک عرصہ تک ندوہ کی فضاء میں زبان وادب اور تاریخ وتذکرہ کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہو رہی۔

مولانا کا خاص مزاج یہ تھا کہ وہ ہر اجتماعی کام میں آگے بڑھتے تھے اور اس کی پوری حوصلہ افزائی اور نصرت کرتے تھے، انھوں نے انجمن تہذیب قائم کی اور خود کوئی عہدہ قبول نہ کیا، ندوہ کی بنیاد رکھی اور لوگوں کے اصرار پر نظامت قبول فرمائی، مگر اس سے بھی بارہا استعفیٰ دیا اور بالآخر مستعفی ہوگئے —— اسی زمانہ میں مفکر اسلام مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ نے امارت شرعیہ کی تحریک کی اور اس کے قیام کے لئے ہندوستان گیر سطح پر جدوجہد شروع کی، مگر مسلمانوں کی گروہ بندی کی وجہ سے اس میں کامیابی حاصل نہ ہوسکی، مولانا مونگیری اس تحریک میں شروع سے شریک ومعاون رہے۔

امارت کے قیام سے پہلے ابتدائی مرحلہ کے طور پر مولانا سجاد صاحبؒ نے ''انجمن علماء بہار'' کی بنیاد رکھی اور بہار شریف میں ١٣٣٦ھ میں اس کا پہلا اجلاس ہوا، اس اجلاس میں مولانا مونگیریؒ کے نمائندہ کی حیثیت سے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے شرکت فرمائی، پھر جب ١٣٢١ھ میں امارت شرعیہ کے باضابطہ قیام کے لئے مولانا سجاد صاحب نے مختلف علماء کے نام خطوط لکھے، تو مولانا مونگیریؒ نے پوری گرم جوشی سے اس کا استقبال فرمایا اور اجلاسِ انتخاب میں اپنا نمائندہ بھیجنے کا وعدہ کیا۔

اس وقت بحیثیت امیر دو بزرگوں پر نظر جاتی تھی، ایک: مولانا مونگیریؒ، دوسرے: مولانا شاہ بدرالدین پھلوارویؒ، اتفاق یہ کہ امیر کے لئے مولانا مونگیریؒ نے مولانا پھلوارویؒ کے نام کی اور مولانا پھلوارویؒ نے مولانا مونگیریؒ کے نام کی تائید فرمائی، اس طرح بالاتفاق مولانا پھلوارویؒ پہلے امیر منتخب ہوئے، بعد میں جب بعض شر پسندوں نے مخالفت کی تو مولانا مونگیریؒ نے پوری قوت اور خلوص کے ساتھ امیر شریعت اول کی تائید کی اور لوگوں کو امارت سے تعاون کرنے کی تلقین کی۔

ہندوستان میں جونہی انگریزوں نے سیاسی اعتبار سے اپنے قدم جما لئے، انھوں نے اپنے فکری اور مذہبی تسلط کی جدو جہد بھی شروع کردی اور بڑے پیمانے پر عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوگئی، اس فتنہ کے مقابلہ میں سرفہرست مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ تھے، جنھوں نے ہند سے لے کر حجاز وترکی تک عیسائیت اور مشہور پادری فنڈر کا تعاقب کیا، مگر ان کے بعد یہ میدان بڑی حد تک خالی رہ گیا، عام علماء کو اس طرف توجہ نہ تھی اور عیسائیت تھی کہ ہر جگہ اپنا قدم مضبوط کرتی چلی جارہی تھی؛ چنانچہ مولانا کیرانویؒ کے بعد جس شخصیت نے اس محاذ پر سب سے گرانقدر خدمت انجام دی، وہ مولانا مونگیریؒ ہی تھے۔

وہ اس کام کے لئے خود بھی اٹھے، دوسرے اہل علم وقلم کو بھی اٹھایا اور عیسائیوں کی چابک دستی علماء کے سامنے رکھ کر ان کو جھنجھوڑا، ١٢٨٩ھ میں انھوں نے کانپور سے باضابطہ رد

عیسائیت ہی کے لئے ''منشور محمدی'' نامی اخبار جاری کیا، یہ اخبار چار پانچ سال تک رد عیسائیت کا گرانقدر کام کرتا رہا، منشی صفدر علی (جو جبل پور کا رہنے والا تھا اور ۱۸۶۵ء میں مرتد ہوگیا تھا) کی کتاب ''نیاز نامہ'' —— جس میں شریعت اسلامیہ کو بے ضرورت ثابت کیا گیا تھا —— کا مدلل اور مسکت جواب'' آئینہ اسلام کے'' نام سے حیدرآباد کے دوران قیام ۱۲۹۷ھ میں تصنیف فرمایا۔

پادری عماد الدین امرتسری جو ۱۸۶۶ء میں مرتد ہوگیا تھا، کے ایک مناظرہ کی روداد عیسائیت کی حمایت میں ''نغمہ طنبوری'' کے نام سے شائع ہوئی تھی، مولانا نے اس کے جواب میں ''ترانۂ حجازی'' لکھی، جس میں نبوت محمدی ﷺ، عصمت انبیاء، ماٰخذ قرآن وغیرہ پر بہت نفیس بحثیں کی گئی ہیں، اسی طرح پادری صاحب موصوف کی کتاب ''تعلیقات'' کے جواب میں ''ردتعلیقات'' اور'' دفع تعلیقات'' تصنیف فرمائی، اس میں اناجیل کی تحریفات پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے —— ان کے علاوہ قرآن مجید کے الہامی ہونے پر'' سواطع البرہان'' اور عیسائی عقائد کے ابطال پر'' براہین قاطعہ'' تصنیف فرمائی۔

''ردعیسائیت'' کے موضوع پر مولانا کا سب سے برا کارنامہ ''پیغام محمدی ﷺ'' ہے —— یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں ہے، جس میں بائبل کی تحریفات، تثلیث وکفارہ کے عقائد کا بطلان، قرآن مجید کی حقانیت اور شرع اسلامی اور شرع مسیحی کے تقابلی جائزہ پر مفصل اور مدلل بحث ہے اور جابجا خود عیسائی علماء کا اعتراف بھی نقل کیا گیا ہے، عیسائی پادریوں سے اس کے جواب کا مطالبہ بھی کیا گیا، مگر کسی کو قلم اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔

علماء اسلام کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ وہ جب ابطال باطل کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے تو بڑے بڑے صنادید کی زبانیں گنگ ہوکر رہ گئیں، خود ہندوستان میں شاہ اسماعیل شہید، مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے نام سے بڑے بڑے پادری بھاگتے تھے اور مناظرہ کے لئے تیار نہ ہوتے تھے، یہی معاملہ مولانا مونگیریؒ کے ساتھ ہوا، مولانا کیرانویؒ کے دور میں جیسے پادری فنڈر طاقتور تھا اور وہ مولانا کے نام سے منھ چھپائے پھرتا تھا، اسی طرح

مولانا مونگیری کے زمانہ میں پادری عمادالدین اور پادری صفدر علی کا شہرہ تھا، مگر اس کا حال یہ تھا کہ مولانا مونگیری کے نام سے بھاگتا تھا اور مناظرہ کے لئے تیار نہ ہوتا تھا۔

مولانا مونگیریؒ کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کا لب و لہجہ اور اُسلوب تحریر مناظرانہ اور مخاصمانہ نہیں تھا، وہ سنجیدہ، متین اور مؤثر لب ولہجہ میں مسکت اور مدلل تنقید کرتے تھے، زبان بھی عام فہم اور سہل تھی، نیز پھر عیسائیت، اس کی تاریخ، بائبل کی تفاسیر، علماء عیسائیت کے اقوال و آراء، ان کے فرقے، یہاں تک کہ بائبل کی شخصیات پر بھی ان کا گہرا اور وسیع مطالعہ تھا اور کوئی عیسائی مصنف ان کو دھوکہ نہیں دے سکتا تھا۔

ان کا دوسرا بڑا کارنامہ ''قادیانیت'' کی سرکوبی ہے، بقول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ:
وہ ان چار افراد میں سے ایک تھے، جنھوں نے قادیانیت کی تردید اور مسلمانوں کو اس فتنہ کبریٰ سے محفوظ رکھنے میں پیش پیش رہے، بھاگلپور (جہاں علماء کی تعداد کم تھی) اور اس کے مضافاتی اضلاع میں اس بات کا شدید اندیشہ پیدا ہوگیا تھا کہ مبادا یہ پوری آبادی ارتداد کا شکار نہ ہوجائے اور قادیانیوں کی قوت تشہیر کا عالم یہ تھا کہ ان کے رسائل واخبارات کی تعداد اشاعت ۲۶ ہزار تک تھی، جو اس زمانہ میں غیر معمولی تعداد تھی۔

مولانا اس موقع سے ہمہ تن اس کے مقابلہ کے لئے کمربستہ ہوگئے، اپنے تربیت یافتہ لوگوں کو عام لوگوں کی تنبیہ کے لئے گاؤں گاؤں بھیجا، خطوط لکھے، وقت کا سب سے بڑا فرض اور سب سے بڑا جہاد اسی کو قرار دیا اور فرمایا کہ میرے اس کام میں جو لوگ مدد نہ کریں، میں ان سے ناخوش ہوں، طبعی افتاد کے خلاف اس کام کے لئے چندے بھی کئے، تقریباً سو رسائل ''صحیفۂ رحمانیہ'' کے نام سے شائع کئے، جن میں چالیس آپ کے نام سے اور اکثر دوسروں کے نام سے طبع ہوئے، آپ نے نوافل، اوراد، تہجد اور معمولات وغیرہ کے اوقات کا بڑا حصہ بھی اسی موضوع پر تصنیف وتالیف کے لئے لگادیا تھا۔

مولانا کی ان کتابوں میں معیار صداقت، معیار المسیح، حقیقۃ المسیح، تنزیہ ربانی، آئینہ

کمالات مرزا، چیلنج محمدیہ، ناشہ حقانی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں؛ لیکن اس موضوع پر آپ کی سب سے اہم کتاب تین جلدوں میں 'فیصلہ آسمانی' اور دو جلدوں میں 'شہادت آسمانی' ہے ، اول الذکر مثبت انداز کی ہے، جس میں مرزا قادیانی کے دعویٔ نبوت پر اُصولی اور علمی حیثیت سے عام فہم بحث کی گئی ہے، مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے بہ قول یہ کتاب ہر طرح کی استدلالی کمزوری سے پاک اور مفید نوعیت کی حامل ہے، ثانی الذکر مرزا صاحب کے بعض دعووں کی مدلل تردید اور مؤرخانہ تنقید پر مشتمل ہے اور علم و تحقیق کا ایک دُر گراں مایہ ہے۔

ان کتابوں نے ہوا کا رُخ بدل دیا اور لاکھوں آدمی جو مرتد ہو چکے تھے، اسلام میں لوٹ آئے ، قادیانی مرتدین جہاں جہاں جاتے ، یہ لٹریچر ان کا تعاقب کرتا؛ یہاں تک کہ قادیانیوں نے کتاب کا علمی جواب دینے کے بجائے مولانا کی ذاتی زندگی کے بارے میں غلیظ افترا پردازیاں شروع کردیں؛ تاکہ لوگوں میں بدظنی پیدا ہو — مولانا کی یہ کتابیں بہار وبنگال، پنجاب ودکن اور بیرون ہند برما، افریقہ تک پہنچیں اور بہت سی جگہوں سے قادیانیت کی بیخ و بن اکھڑ گئی، مولانا ردقادیانیت کی کتابوں کی تالیف، ان کی اشاعت اور پھیلاؤ میں اس قدر سرگرم تھے کہ فرماتے تھے''اتنا لکھو، اس قدر طبع کراؤ اور اس قدر تقسیم کرو کہ ہر مسلمان جب صبح سو کر اٹھے تو اپنے سرہانے ردقادیانیت کی کتاب پائے''۔

مولانا نے اس مقصد کے لئے خانقاہ میں ایک بڑا مناظرہ بھی کرایا تھا، جس میں مرزا صاحب کی طرف سے ان کے خصوصی نمائندے حکیم نورالدین ، سرور شاہ اور روشن علی اور مسلمانوں کی طرف سے علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا عبدالوہاب بہاریؒ، مولانا ابراہیم سیالکوٹیؒ اور مولانا مرتضٰی حسن چاند پوریؒ کے بشمول تقریباً چالیس علماء تھے، مولانا مونگیری نے مولانا مرتضی حسن صاحب کو تحریری طور پر اپنا نمائندہ بنایا، جن کی طلاقت لسانی اور حاضر جوابی مشہور تھی ، اِدھر مناظرہ شروع ہوا، اُدھر مولانا مونگیریؒ سجدہ میں گر پڑے اور اس وقت تک سر نہ اٹھایا جب تک قادیانیوں کی فاش شکست کی اطلاع نہ مل گئی ، اللہ کی

قدرت ایسی ہوئی کہ مولانا مرتضی حسن صاحب کی ایک ہی تقریر کے بعد قادیانی لاجواب ہو گئے اور راہ فرار اختیار کی۔

مذاہب کے مطالعہ کے علاوہ فقہ پر بھی آپ کی گہری نگاہ تھی، فتاویٰ بھی دیا کرتے تھے، بسا اوقات کانپور سے لکھنو محض کسی مسئلہ کی تحقیق کے لئے سفر فرماتے، مولانا کی فقہی بصیرت اور فقہی مراجع پر وسیع نظر کا اندازہ ان کے ''خطبۂ صدارت جمعیۃ علماء ہند'' سے لگایا جا سکتا ہے، جو امارت کے موضوع پر ہے، یہ کتاب اس مسئلہ پر نہایت شافی و کافی ہے ـــــ بعض مسائل میں ان کی رائے عام علماء دیو بند سے مختلف تھی، وہ ''مجالس میلاد'' کو حسب مصلحت درست سمجھتے تھے؛ البتہ اس کی بدعات کے روادار نہ تھے، خطبۂ جمعہ کی زبان کے طور پر عربی کو ضروری نہ سمجھتے تھے اور امام ابوحنیفہؒ کے اس قول کے قائل تھے، جس کے مطابق خطبۂ جمعہ غیر عربی میں دیا جا سکتا ہے، اس موضوع پر ان کی محققانہ کتاب ''**القول المحکم فی خطابة العجم**'' ہے، تراویح کے موضوع پر ان کا رسالہ ''احکام التراویح'' بہت جامع اور نافع ہے۔

فقہ سے ان کی دلچسپی ہی کا نتیجہ تھا کہ ندوہ کے قیام کے بعد اوائل ہی میں انھوں نے ''دارالافتاء'' کے قیام کی تحریک کی اور سے قائم فرمایا، وہ نئے زمانہ اور حالات کے لحاظ سے وسیع النظری اور جدید پیش آمدہ مسائل میں اجتہاد کی طرف علماء کو توجہ دلاتے تھے اور شاکی تھے کہ علماء خود حالات زمانہ سے واقف نہیں ہیں۔

۸؍ربیع الاول سہ شنبہ ۱۳۴۶ھ م ۱۳؍ستمبر ۱۹۲۷ء کو نماز ظہر کے بعد ذکر کرتے ہوئے بخار کے مرض میں انتقال ہوا ـــــ نزہۃ الخواطر (تالیف: مولانا سید عبدالحیٔ حسنی لکھنویؒ) کی آٹھویں جلد میں مصنف کے فرزند ارجمند مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے مولانا کی بڑی اچھی قلمی تصویر کھینچی ہے ـــــ ''دراز قد، پُر گوشت، گندمی رنگ، سینہ فراخ، کشادہ جبیں، ہمیشہ ہشاش وبشاش، بلند آواز، باوقار و بارعب، نظافت و ستھرائی کے دلدادہ، بہت حیاء دار اور ہر ایک کے

ساتھ محبت سے پیش آنے والے'' ـــــ حقیقت یہ ہے کہ وہ عالم تھے؛ مگر بلوغ نظر میں اپنے عہد کے علماء سے فائق اور عصری کتابوں سے باخبر، وہ صوفی تھے؛ مگر مشائخ زمانہ سے جدا اور مجاہدانہ حرارتوں سے معمور :

اس کا اندازِ نظر ، اپنے زمانہ سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق

❁ ❁ ❁

علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم ، چوں رفتم ، بزم برہم ساختم

ہندوستان میں آج جو کچھ علم حدیث کی روشنی ہے، اس کا سرچشمہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کا ''خانوادۂ ہمہ آفتاب'' ہے، برصغیر ہند میں آج شاید ہی کوئی ایسا عالم ہو کہ حدیث میں اس کا سلسلۂ سند شاہ صاحب سے نہ ملتا ہو — جس طرح یہ ایک حقیقت ہے اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مولانا انور شاہ کشمیریؒ نے حدیث کے درس کو ایک نیا رُخ اور نیا اُسلوب دیا اور ہندوستان میں آج علوم حدیث سے جو اعتناء و اہتمام اور اس کے درس کی جلالت و عظمت ہے، اس میں مولانا کشمیری کا بڑا حصہ ہے۔

ان کے علم اور قوت حافظہ سے متقدمین کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، قدرت نے ان کو عجیب ذکاوت و طباعی سے نوازا تھا، وہ صرف ناقل اور راوی نہ تھے، بلکہ بہت سی چیزوں میں مجتہدانہ کلام کرتے تھے، وہ خود کہتے تھے کہ میں صرف فقہ میں مقلد ہوں — علمی دنیا میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے ''حدیث متواتر'' کے دائرہ کو وسیع کر دیا اور تواتر سند کے علاوہ 'تواتر طبقہ، تواتر عمل اور تواتر قدر مشترک' نئی قسمیں مقرر کیں، پھر تواتر کی ان تمام اقسام کے لئے خود شریعت سے بنیادیں تلاش کیں، اس طرح شریعت کا اکثر حصہ قطعی اور ظن و گمان سے بالاتر قرار پاتا ہے، شاہ صاحب کی یہ تحقیق کارنامہ کہلانے کی مستحق اس لئے ہے کہ اس سے بہت سے فتنوں کے دروازے بند ہوتے ہیں اور ہمارے زمانہ میں انکار حدیث اور تجدد کی تحریکیں دین کے جن احکام کو ہدف بناتی ہیں اور تاریخی استناد کے اعتبار سے ان کے غیر یقینی ہونے کا

بہانہ کررہی ہیں، یا ضروریات دین کا انکار کرنے کے باوجود بھی اپنے مسلمان کہلانے پر مصر ہیں، یہ ان کا خود بخود جواب ہو جاتا ہے۔

علمی اعتبار سے ان کو حیرت انگیز جامعیت حاصل تھی، فلسفۂ قدیمہ وجدیدہ میں ایسی بصیرت حاصل تھی کہ خود اقبال نے زمان ومکان کی بحث میں ان سے تشفی حاصل کی؛ حالاں کہ وہ یورپ کے بڑے مفکرین سے اس سلسلہ میں استفادہ کر چکے تھے، شاہ صاحبؒ نے ان کو اس جانب بھی متوجہ کیا کہ اس موضوع پر نیوٹن نے جو کچھ لکھا ہے، وہ علامہ عراقی کی تصنیف ''**غاية الامكان في دراية المكان** '' سے مستفاد ہے، حدوث عالم، وحدۃ الوجود وغیرہ کے مسئلہ پر ''**ضرب الخاتم على حدوث العالم** '' کے نام سے ایک رسالہ نظم فرمایا، جو چارسو اشعار پر مشتمل ہے اور فلسفہ، کلام اور تصوف کے دقیق مسائل پر مشتمل ہے، علامہ اقبالؒ نے اس رسالہ کو پڑھ کر اعتراف کیا کہ علماء اسلام کا علم جدید حکماء یورپ سے بھی بڑھ کر ہے۔

تدبر قرآن گویا ان کی فطرت میں ودیعت تھا، اس معاملہ میں اس قدر انہماک تھا کہ اپنے غیر معمولی قوت حافظہ کے باوجود حفظ نہ کر سکے، اس لئے کہ جب بھی قرآن پڑھتے، اس کے حقائق میں کھو جاتے، اعجاز قرآن پر خاص نظر تھی، علماء تفسیر کے درمیان مشہور ہے کہ علامہ جرجانی اور زمخشری ہی اعجاز قرآن سے کما حقہ واقف تھے، شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اعجاز قرآن کو سمجھنے والا تیسرا شخص میں ہوں، وہ قرآن کو ہر جہت سے معجزانہ کلام باور کرتے تھے اور اس مسئلہ میں ''امام باقلانی'' کو جو خود ''اعجاز قرآن'' کے موضوع پر اولین قلم اُٹھانے والوں میں ہیں، سند نہیں سمجھتے تھے، اعجاز قرآن کے سلسلہ میں شاہ صاحب کے افادات کا جامع تذکرہ ان کے تلمیذ رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ نے اپنی کتاب ''يتيمة البيان في علوم القرآن'' میں کیا ہے اور مفردات قرآن کے اعجاز پر بعض بالکل نئے گوشے پیش کئے ہیں، شاہ صاحب قرآن مجید میں باہمی ربط کے قائل تھے، نسخ قرآن کے سلسلہ میں ان کا تصور تھا کہ ہر منسوخ آیت کا حکم کسی نہ کسی درجہ میں ضرور باقی ہے، ان کا خیال تھا کہ ''مشکلاتِ قرآن'' حدیث کی مشکلات سے بھی بڑھ کر اور زیادہ توجہ کی مستحق ہیں، مگر اُمت نے اس کی طرف کما حقہٗ توجہ نہیں کی۔

فقہ میں بھی شاہ صاحب کو گہری بصیرت حاصل تھی، تین سالوں تک اپنے وطن مالوف کشمیر میں فتاویٰ نویسی کے فرائض انجام دیئے، مذاہب اربعہ کی فقہ پر یکساں نظر تھی، امام شافعی کی ''کتاب الام'' کے بڑے مداح اور اس کو امام شافعی کی ذکاوت و فطانت کا شاہکار تصور کرتے تھے، فقہ حنفی کی کتابوں میں علامہ کاسانیؒ کی ''بدائع الصنائع'' اور فقہی جزئیات کے استقصاء کے اعتبار سے ابن نجیم مصری کی البحر الرائق اور ابن عابدین شامی کی ''ردالمحتار'' کے بڑے قائل تھے، احناف میں امام طحاویؒ کے بہت معترف تھے، نیز امام ابوحنیفہؒ اور ان کے صاحبین کے بعد امام طحاویؒ ہی کی رائے کو قابل اعتبار تصور کرتے تھے اور مشائخ احناف میں فقہاء عراق کو ''فقہاء ماوراء النہر'' پر قابل ترجیح سمجھتے تھے۔

شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی طرح ان کا رجحان بھی اس طرف تھا کہ فقہی اجتہادی مسائل میں جہاں اختلاف رائے پیدا ہو، وہاں ہر دو رائے کے حامل صائب اور برحق ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی ''خطاء'' نہیں کہا جاسکتا؛ بلکہ فرماتے تھے کہ فقہاء کے درمیان جو اختلاف رائے ہے اس میں صواب وخطا کو اللہ تعالیٰ قیامت میں بھی ظاہر نہیں فرمائیں گے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو — انشاء اللہ — اپنے مقبول بندوں کو رسوا کرنا منظور نہ ہوگا۔

ائمہ اربعہ کے طریق استنباط کے سلسلہ میں ان کا تبصرہ تھا کہ امام مالک کے یہاں اہل مدینہ کا عمل اصل ہے، یہاں تک کہ احادیث پر بھی اس کو ترجیح ہے، امام شافعیؒ کے یہاں کسی مسئلہ پر آنے والی احادیث میں جو سب سے قوی ہیں، اس پر عمل کیا جاتا ہے اور دوسری تمام احادیث مسترد کردی جاتی ہیں، امام احمدؒ کے نزدیک ہر قسم کی حدیث پر عمل ہے، امام ابوحنیفہؒ تمام اقسام حدیث کو جمع کرتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کے مضمون کو قانون کلی ہونے کی بنا پر شرعی قانون کی حیثیت دیتے ہوئے دوسری روایات کی مناسب توجیہ کرتے ہیں؛ اس لئے حنفیہ کے یہاں احادیث میں تاویلات زیادہ ہیں اور شوافع کے یہاں راویوں پر جرح وتنقید زیادہ۔

ان کا سب سے اہم موضوع علم حدیث ہے —— ان کا مزاج اصل میں محدثانہ ہے، اسی لئے ان کے یہاں روایتی فقہاء کی طرح تقلید میں غلو نہیں ہے؛ بلکہ جہاں صحیح احادیث موجود ہوں، وہاں اسے قبول بھی کرتے ہیں، مکہ معظّمہ کی حرمت پر اتفاق ہے، مدینہ کی حرمت کے امام ابوحنیفہؒ قائل نہیں ہیں، مگر شاہ صاحبؒ صحیح احادیث کی وجہ سے مدینہ کی حرمت کے بھی قائل تھے، وہ سری نمازوں میں مقتدی کے سورہ فاتحہ پڑھنے اور اذان میں ترجیع کو جائز اور تکبیر تحریمہ کے علاوہ اوقات رفع یدین کو جائز اور محض خلاف اولیٰ تصور کرتے تھے، جب کہ بعض فقہاء احناف اسے مکروہ تحریمی قرار دیتے ہیں، اسی عدل وانصاف کا ایک پہلو یہ ہے کہ وہ بدرالدین عینیؒ پر حافظ ابن حجرؒ کو ترجیح دیتے تھے۔

فقہ حنفی کو حدیث سے ثابت کرنے اور محدثین کی تنقیدات کا جواب دینے میں انھوں نے جو نمایاں کام انجام دیا ہے، ابن ہمام اور زیلعی کے بعد کسی حنفی فقیہ سے وہ کم نہیں ہے، مثلاً ''حدیث مصراۃ'' کا مشہور مسئلہ جو ''فقہ حنفی'' کے لئے ایک سنگ گراں بار رہا ہے، کا جواب دیتے ہیں کہ وہ حکم ازراہ دیانت ہے، قضاء کے طور پر نہیں ہے، محدثین ''**إنما الأعمال بالنيات** '' سے ثابت کرتے ہیں کہ وضو میں نیت ضروری ہے، حنفیہ کا مسلک اس کے خلاف ہے، علامہ کشمیریؒ کہتے ہیں کہ عقوبات، معاملات، اعتقادات واخلاقیات میں کوئی بھی نیت کا قائل نہیں؛ حالاں کہ وہ مقصود ہیں، صرف وضو میں جو ایک وسیلہ ہے، امام ابوحنیفہؒ نیت کے قائل نہیں، تو اس پر آخر تنقید اور اعتراض کا کیا جواز ہے؟ —— وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے اس عہد میں فقہ حنفی کے استحکام کے لئے پیدا کیا گیا ہے اور میں نے یہ کام اس حد تک انجام دیا ہے کہ ایک صدی تک حنفیت میں اضمحلال نہیں آئے گا؛ اسی لئے امام طحاوی کی ''معانی الآثار'' کو خصوصی اہمیت دیتے تھے، احناف کی اس غفلت پر نوحہ کناں تھے کہ اس کتاب کی طرف کما حقہ توجہ نہیں دی جاتی، دیوبند میں بھی اس کی سعی کی اور سہارنپور میں بھی مولانا یحیٰ صاحب کو ''طحاوی'' کو خصوصی اہمیت دینے پر توجہ دلائی؛ مگر کامیابی نہ ہوئی۔

ان کے محدثانہ مزاج و مذاق کا نتیجہ تھا کہ وہ اجلۂ محدثین پر بھی شائستہ تنقید کرتے تھے،

امام بخاری کی جلالت شان کا اعتراف کرتے ہوئے یہ شکایت کرتے کہ ''جب ایک فقہی رُخ اختیار کرتے ہیں تو دوسری طرف سے کلیتاً بے نیازی برتتے ہیں، حائضہ عورت یا جنبی کو محض آثار کی بناء پر تلاوت کی اجازت دے رہے ہیں؛ حالاں کہ جمہور کے پاس ممانعت تلاوت کے لئے حدیث موجود ہے''۔

رجال اور اسناد کی بحث کسی قدر دشوار ہے، شاہ صاحب کی اس فن پر بھی گہری نگاہ تھی، وہ ''رجال'' کے سلسلہ میں صحاح ستہ کے مصنفین اور فن رجال کے ماہرین کے تسامحات پر بھی نظر رکھتے تھے، امام بخاری نے ایک سلسلۂ سند میں راوی کا نام ''محمود بن ربیع'' لکھ دیا ہے، آپ نے تنقیح کی کہ وہ دراصل ''نافع بن محمود بن ربیع'' ہیں، امام مالک نے ایک روایت میں راوی کا نام ''عبداللہ'' نقل کیا، آپ نے وضاحت کی کہ وہ عبیداللہ ہیں، رجال کی کتب میں ''ابن اسحاق'' کو غیر ثقہ قرار دیا گیا ہے، آپ نے فرمایا وہ ابن اسحاق واسطی ہیں، دوسرے ابن اسحاق مدنی ہیں اور وہ ثقہ ہیں، محدثین کو اس میں اشتباہ ہو گیا ہے، ان کی اسی طرح کی بہت سی تنقیدات ابن تیمیہ، زیلعی، ابن حجر، اوزاعی اور دارقطنی وغیرہ پر ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو حافظہ بھی ایسا دیا تھا کہ محدثین اور متقدمین علماء کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، درس کے لئے ایک دفعہ دیکھی ہوئی کتاب کو بار بار نہ دیکھتے تھے، ایک بار فتح القدیر کا ذکر کیا تو کہا کہ ۲۶ر سال قبل دیکھا تھا، جو کچھ بیان کروں گا، مراجعت کروگے تو تفاوت کم پاؤ گے، اخیر عمر میں فرمایا کہ اب بھی یہ حال ہے کہ جس کتاب کا سرسری مطالعہ کرتا ہوں، پندرہ سال تک بقید صفحات اس کے مضامین محفوظ ہو جاتے ہیں، مولانا حبیب الرحمان عثمانی آپؒ کو ''چلتا پھرتا کتب خانہ'' کہتے تھے، آپ کی قوتِ حافظہ کے بہت سے واقعات مشہور ہیں۔

احادیث کی تاویل و تطبیق، ایک ہی فقیہ کے مختلف اقوال میں توافق اور فقہ حنفی کی ترجیح میں ان کی بہت سے اولیات اور تفردات بھی ہیں، جن کو ان کے اُردو اور عربی سوانح نگاروں نے ایک حد تک تفصیل سے نقل کر دیا ہے۔

شاہ صاحب ایک خاص انداز درس کے موجد ہیں، ان کا درس نہایت مفصل، مدلل، ہر گوشہ کو حاوی، جامع اور مختلف فنون کی بحثوں کا گلدستہ اور امتزاج ہوتا تھا، ان کے بعض تلامذہ نے اپنے درسی بیاض میں مختلف فنون کے خانے بنا رکھے تھے اور درس میں جس فن کی بات آتی، اس کو وہاں نقل کرتے، تقریر درس میں نادر حوالے، مختلف جوابات، اس پر محاکمہ اور پھر اخیر میں اپنی ترجیح کا ذکر ہوتا، کتب حوالہ کی قطار درسگاہ ہی میں ہوتی اور حسبِ ضرورت ان کی عبارتیں، استشہاد میں پیش کی جاتی رہتیں اور گویا علم کا ایک سمندر رواں ہوتا، جس میں لعل و جواہر اور خس وخاشاک سب کچھ ہوتے، علامہ رشید رضا مصری کے خیر مقدم میں شاہ صاحب نے عربی زبان میں جو مدلل تقریر فرمائی ہے، نیز احادیث میں تطبیق کے ضابطے، علماء دیوبند کا طرز عمل، اجتہاد کے مختلف درجات اور فقہ حنفی کی حدیث سے ہم آہنگی پر جو بصیرت افروز روشنی ڈالی ہے، واقعہ ہے کہ وہ ایک گنجینۂ علم ہے۔

ان کے اس طرز تدریس کا نتیجہ تھا کہ ان کے تلامذہ میں بھی بڑے اہل پیدا ہوئے، جو جس بزم میں پہنچا، منتہائے علم قرار پایا، آپ نے چالیس سال درس دیا، یوں تو اس میں بے شمار افراد نے آپ سے کسب علم کیا؛ مگر ان میں بھی مولانا محمد یوسف بنوریؒ، مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ، مولانا محمد چراغ لاہوریؒ، مولانا احمد رضا بجنوریؒ، مولانا فخر الدین صاحبؒ، مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ، مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مفتی عتیق الرحمان عثمانیؒ، مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شاہ صاحب کا اصل مزاج تدریس کا تھا، تصنیف و تالیف سے زیادہ مناسبت نہ تھی، زندگی کا بڑا حصہ افراد اور آدمیوں کی تصنیف جیسے اہم کام میں صرف ہوا، آپ کی طرف منسوب اکثر کتابیں آپؒ کے افادات کا مجموعہ ہیں، جسے آپ کے لائق تلامذہ نے مرتب کیا ہے، آپ کی اہم اور معروف تصنیف ''فیض الباری شرح بخاری'' ہے، جس میں آپ کے درسی افادات کو

مولانا بدر عالم میرٹھیؒ نے مرتب کیا ہے، اسی طرح ترمذی شریف کی درسی تقریروں کا خلاصہ مولانا محمد چراغ صاحب نے ''العرف الشذی'' کے نام سے دو جلدوں میں اور ابوداؤد کی درسی تقریروں کا حاصل کچھ اضافہ کے ساتھ مولانا صدیق نجیب آبادی نے ''انوارالمحمود'' کے نام سے مرتب فرمایا ہے، اسی سلسلہ کی ایک کڑی حدیث کے فقہی مباحث پر مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ''معارف السنن'' ہے، جس میں مولانا نے اپنے استاذ کے افادات بہ کثرت نقل کئے ہیں، اس کے علاوہ علم حدیث میں مولانا ظہیر احسن شوق نیمویؒ کی تالیف '' آثارالسنن'' پر شاہ صاحب کے قیمتی حواشی ہیں، جو ایک غنچۂ ناشگفتہ کی طرح بعض اہل علم کے سینوں اور دفینوں میں مخفی ہیں، مسلم شریف کی درسی تقریر مرتبہ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، افسوس کہ ضائع ہو چکی اور ابن ماجہ کا ایک حاشیہ بھی جو شاہ صاحب کا خودنوشتہ تھا، محفوظ نہیں رہا۔

کتبِ حدیث کی شروح وحواشی کے علاوہ حدیث کے مشہور اختلافی فقہی مسائل پر آپ کے مستقل رسائل بھی ہیں، جن میں آپ نے حنفیہ کے دلائل کو مستحکم کرنے کے علاوہ ''تقریب بین المذاہب''، یعنی مختلف فقہاء کی آراء میں قربت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلہ میں ''قرأۃ خلف الامام'' کے موضوع پر ''فصل الخطاب'' اور ''**خاتمة الخطاب فی فاتحة الکتاب** ''رفع یدین کی بحث پر ''نیل الفرقدین'' اور ''بسط الیدین'' اور نماز وتر کے اختلافات پر ''**کشف الستر عن صلوٰۃ الوتر** '' تالیف فرمائی۔

مشکلات قرآنی پر شاہ صاحب کی خاص نظر تھی، اس موضوع پر آپ کی ایک نفیس کتاب ''مشکلات القرآن'' ہے، جو اس موضوع پر آپ کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے، جہاں جو آیت اس قسم کی نظر آئی کہ ان کو مشکلات میں سمجھا جاتا ہے، اس پر ایک تفسیری نوٹ لکھ دیا اور اس آیت کی بہتر تفسیر کے لئے مناسب حوالے درج کر دیئے، مجلس علمی ڈابھیل تعلیق وتحقیق کے ساتھ اس مجموعہ کو شائع کر چکی ہے۔

اخیر دور میں جب قادیانیت کا فتنہ اٹھا، آپ نے اس کی سرکوبی کے لئے مختلف رسائل تحریر فرمائے اور اپنی افتادِ طبع کے خلاف اس کا لب ولہجہ اور اُسلوب خطاب بھی سخت رکھا، ان

میں عقیدۃ الاسلام فی حیاۃ عیسیٰ علیہ السلام، تحیۃ الاسلام، التصریح بما تواتر فی نزول المسیح اور ''اکفار الملحدین'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، زندگی کے آخری ایام میں کشمیری ہم وطنوں کو قادیانیت سے بچانے کے لئے فارسی زبان میں ''خاتم النبیین'' اور مختصر رسالہ ''دعوت حفظ ایمان'' اُردو زبان میں مرتب فرمایا اور اول الذکر کو اپنے لئے ''توشہ آخرت'' قرار دیا۔

نثر کی طرح نظم پر بھی آپ کو قدرت تھی، چنانچہ وراثت کے احکام پر ''النور الفائض علی نظم الفرائض''، نظم کی، حدوث عالم کے موضوع پر چار سو اشعار پر مشتمل ''ضرب الخاتم'' کے نام سے اور نظم ہی میں ایک دوسرا (۶۲) صفحات کا رسالہ ''مرقاۃ الطارم'' ہے جو دقیق علمی مواد اور مضامین پر مشتمل ہے۔

بریلوی نقطۂ نظر کہ حضور عالم الغیب ہیں، کی رد میں ''سہم الغیب'' اور ایک شیعہ مؤلف کی رد میں کتاب ''الذب عن قرۃ العینین'' تالیف فرمائی، اس کے علاوہ بھی آپ کے بعض افادات ہیں، جو تشنۂ طبع ہیں یا حالات زمانہ نے ان کو ضائع کر دیا ہے۔

مولاناؒ کی بہت بڑی خدمت، جس نے ان کو عزلت گزیں مدرسین کی صف سے نکال کر ایک داعی اور مجاہد کی حیثیت عطا کی ہے، رد قادیانیت کا کام ہے، باوجود اس کے کہ تصنیف وتالیف کا مذاق نہ تھا، پھر بھی اس موضوع پر ضخیم کتابیں تالیف فرمائی ہیں، اس موضوع پر آپ کی سب سے ضخیم کتاب ''عقیدۃ الاسلام'' ہے، جس میں مرزا صاحب کے اس دعویٰ کی تردید کی گئی ہے کہ حضرت مسیح کی وفات ہو چکی ہے اور ''توفی'' کی حقیقت اور اس عقیدہ کے ضروریات دین میں سے ہونے پر بحث کی گئی ہے، ''تحیۃ الاسلام'' کے نام سے اس پر مزید تحقیقات کا اضافہ کیا ہے، بعض لوگوں کو شبہ تھا کہ چوں کہ مرزا صاحب اہل قبلہ میں ہیں؛ اس لئے ان کی اوران کے متبعین کی تکفیر کس طرح کی جائے؟ اس شبہ کے ازالہ اور ضروریات دین کے انکار کی وجہ سے ان کی تکفیر کے واجب ہونے پر ''اکفار الملحدین''، لکھی۔

قادیانیت کی رد میں آپ کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کا شوہر

قادیانی ہوگیا اور اس نے اس اختلاف مذہب کی بنا پر فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا، شوہر کو قادیانی ہونے کے باوجود اپنے مسلمان ہونے کا دعویٰ تھا؛ چنانچہ ''بھاول پور'' جہاں اس مقدمہ کی سماعت ہو رہی تھی، میں علماء اسلام کی طلبی ہوئی، شاہ صاحب اپنی پیرانہ سالی، علالت اور بعض معذوریوں کے باوجود وہاں پہنچے اور قادیانیوں کی دسیسہ کاریوں کے بخئے ادھیڑ دیئے، اس یادگار خطبہ کی تلخیص ''نقش دوام'' میں موجود ہے،(۱) اس خطبہ میں ضروریات دین کے انکار پر تکفیر، اہل قبلہ سے مراد، اجماع کے انکار اور مسلمانوں اور قادیانیوں کے اختلاف کی نوعیت وغیرہ پر نہایت اہم بحثیں ہیں، شاہ صاحب اس سفر کو اپنے لئے زادآخرت سمجھتے تھے، ردقادنیت کو وقت کا سب سے اہم مسئلہ باور کرتے تھے اور فرماتے تھے ''اگر ہم تحفظ ختم نبوت نہ کرسکیں تو گلی کا کتا بھی ہم سے بہتر ہے''۔

چوں کہ یہ فتنہ پنجاب سے پیدا ہوا تھا؛ اس لئے ضرورت تھی کہ پنجاب ہی کے اہل علم ودین اس طرف توجہ کریں، چنانچہ شاہ صاحب نے پنجاب کے بعض حوصلہ مندوں کو اس کام کے لئے آمادہ کیا، جن میں سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ بھی تھے، ان حضرات نے ''مجلس احرار'' قائم کی، جس نے قادیانیت کے استیصال میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔

آپ اسے مسلمانوں کی حیات وموت کا مسئلہ سمجھتے تھے، آپ نے نہ صرف یہ کہ خود پوری تندہی سے اس فریضہ کو انجام دیا؛ بلکہ اپنے تلامذہ کو بھی اس کی طرف متوجہ کیا اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا محمد یوسف بنوری اور دیگر علماء سے قادیانیت کے خلاف اہم کتابیں لکھوائیں، تقسیم ملک کے بعد جب قادیانیت کے صنادید پاکستان منتقل ہوگئے، ان کو ملک میں اہم اور کلیدی عہدے حاصل ہوگئے اور وہ ایک فتنہ بن گیا تو وہاں جن لوگوں نے قادیانیت کی مخالفت میں بنیادی کردار ادا کیا، ان میں سرفہرست شاہ صاحب کے شاگرد رشید مولانا محمد یوسف بنوریؒ (صدر مجلس تحفظ ختم نبوت) تھے۔

---

(۱) کچھ عرصہ پہلے اس مقدمہ کی پوری کارروائی ''مقدمۂ بھاول پور'' کے نام سے دوجلدوں میں شائع ہوچکی ہے۔

مولانا جس طرح علم وفن اور تحقیق کے میدان کے شہسوار تھے، اسی طرح حسن اخلاق اور شرافت کا بہترین نمونہ بھی تھے، طبیعت میں حد درجہ زہد وقناعت اور توکل تھا، شادی کے بعد آپ کے گھر کا کل اثاثہ تھا ''مٹی کا ایک لوٹا، ایک چٹائی اور مٹی کے دو پیالے'' دارالعلوم سے نکلنے کے بعد ڈھاکہ اور کلکتہ سے ہزار روپیہ تنخواہ کی پیشکش ہوئی؛ مگر اس پر ڈابھیل کے ۵۷ روپئے کو ترجیح دی، علالت کے دوران اہل مدرسہ نے تنخواہ دی تو واپس کر دیا کہ جب کام نہ کیا تو مشاہرہ کا بھی کوئی حق نہیں، تواضع اور ادب واحترام اس قدر کہ سات سال کی عمر سے کوئی دینی کتاب بے وضو نہ دیکھی، اپنے استاذ شیخ الہند کے احترام میں اس قدر جھک جاتے کہ گویا گر پڑیں گے، مولانا بنوری نے ایک دفعہ آپ کے نام کے ساتھ کچھ القاب لگا دیئے تو سختی سے تنبیہ کی اور آئندہ کے لئے اس سے منع فرما دیا، بڑے متبع سنت تھے، چال ڈھال اور رفتار تک میں اس کا لحاظ رکھتے تھے، غیبت، بدگوئی اور دل آزار باتوں سے بہت محترز تھے۔

ارشاد وبیعت کا تعلق پہلے خود اپنے والد ماجد معظم شاہ سے ہوا، اور انھوں نے سہروردی سلسلہ میں اجازت بھی دی، پھر حضرت گنگوہی سے کسبِ فیض کیا اور انھوں نے بھی اجازت دی، شیخ الہند نے بھی نہ صرف یہ کہ مجاز گردانا؛ بلکہ اپنے مسترشدین سے اپنی غیبت میں شاہ صاحب کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ بھی دیا؛ چنانچہ مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ، مولانا ادریس کاندھلویؒ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانویؒ اور مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ آپ سے بیعت ہونے والوں میں تھے، اپنی غیر معمولی علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ تہجد، اوّابین اور بعد نماز فجر ''پاس انفاس'' وغیرہ کا معمول تھا۔

علمی اور درسی اشتغال نے گو آپ کو سیاسی میدانوں میں کام کرنے کا موقع نہیں دیا، مگر آپ اس کوچہ سے بھی بالکل بے تعلق نہیں تھے، شیخ الہند کے تحریکی کاموں میں آپ کا تعاون بھی شامل ہوتا تھا، جمعیۃ علماء ہند سے ہمیشہ قریبی ربط وتعلق رہا، اس کے اجلاس کی صدارت بھی کی اور بڑا چشم کشا خطبۂ صدارت دیا، بعض مواقع پر حکومت برطانیہ کے کارندوں نے آپ کے مکان پر دھاوا بھی مارا، آپ ہندوستان میں امارت شرعی اور قضاء کا نظام قائم کرنے کے بڑے

حامی اور مؤید تھے اور اپنے بعض خطبات میں آپ نے اس پر بہت زور دیا ہے۔

مشہور اسلامی شخصیات کے بارے میں ان کی خاص رائیں تھیں، وہ حافظ ابن حجر کے بڑے مداح تھے اور کہا کرتے تھے کہ متعصب ہونے کے باوجود بہت بیدار مغز ہیں، زیلعی کو معتدل اور مصنف مزاج قرار دیتے تھے، ابن تیمیہ کو بحر ناپیدا کنار کہتے؛ البتہ جمہور اُمت کے مقابلہ ان کے تفردات پر نقد بھی کرتے، ابن عربی کے بھی مداح تھے، امام طحاوی کو مجتہد اور حدیث میں ایک نئے اُسلوب کا بانی قرار دیتے تھے، فقہاء احناف کی کتابوں میں کاسانی کی ''بدائع الصنائع'' کو بہت سراہتے تھے، ابن نجیم مصریؒ اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کو تفقہ میں علامہ ابن عابدین شامیؒ پر ترجیح دیتے تھے۔

معاصرین کی تعریف میں بھی بخل سے کام نہ لیتے تھے، مولانا شوق نیمویؒ پر انھوں نے مستقل ایک قصیدہ لکھا، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے بارے میں لکھا کہ وہ محدث، مفسر، متکلم اور اپنے زمانہ کے علامہ ہیں، مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ کو ''فقیہ النفس'' کہتے تھے، مولانا تھانویؒ کی بیان القرآن کو دیکھ کر کہا کہ علم اب اُردو کی کتابوں میں آگیا ہے اور اس کتاب کو دیکھ کر اُردو کتابوں کے مطالعہ کو بھی جی چاہتا ہے۔

اسی طرح خود ان کی علمی عبقریت کا اعتراف ان کے اکثر معاصرین کو بھی تھا اور بزرگوں کو بھی، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ خود بعض مسائل میں آپ سے رُجوع کرتے، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے آپ کو ابن تیمیہ اور ابن دقیق العید کی نظیر قرار دیا، مولانا حبیب الرحمان عثمانیؒ کتب خانہ کہتے، اقبال کی رائے تھی کہ پانچ صدیوں سے ایسا کوئی عالم پیدا نہیں ہوا، مولانا تھانویؒ نے فرمایا کہ شاہ صاحب کا مسلمان ہونا اسلام کے حق ہونے کی دلیل ہے، رشید رضا مصریؒ نے آپ کی تقریر سنی تو کہا کہ میں نے آپ جیسی شخصیت نہیں دیکھی، علامہ زاہد الکوثری نے فقہ کی حدیث سے مطابقت میں ابن ہمام کے بعد آپ کو درجہ دیا ہے۔

علم وفضل کی بلندی کے ساتھ ساتھ آپ پاکیزہ اخلاق کے حامل بھی تھے، کبھی نہیں دیکھا گیا کہ کوئی سائل آپ کے پاس آیا ہو اور نامراد واپس گیا ہو، جیب میں جو کچھ ہوتا، اٹھنّی یا روپیہ، سائل کے حوالہ کردیتے، ایسی بات کرنے سے احتراز کرتے جس سے کسی کی دل آزادی ہو، ایک دفعہ امرتسر تشریف لے گئے، وہاں کے ایک نامی گرامی بیرسٹر بر بنائے عقیدت حاضر ہوئے؛ لیکن ڈاڑھی مونچھ صاف ہونے کی وجہ سے بھینچے بھینچے سے بیٹھے شرمندگی محسوس کررہے تھے، آپ نے بھانپ لیا اور نہایت منکسر مزاجی کے ساتھ فرمایا: بیرسٹر صاحب! آپ کیوں خواہ مخواہ شرمندہ ہورہے ہیں، ہم دونوں کا فعل اگرچہ مختلف ہے؛ لیکن غرض وغایت دونوں کی ایک ہی ہے، یعنی دنیا کمانے میں اگر مولوی ہوکر ڈاڑھی نہ رکھوں تو کوئی مجھے کھانے کو نہ دے اور اسی طرح اگر آپ بیرسٹر ہوکر ڈاڑھی صاف نہ کرائیں تو ہر کوئی کہے کہ اب ان کو بیرسٹر کس نے بنادیا؟ یہ تو ملاجی ہیں، تو پھر آپ کو بھی بیرسٹری کے نام پر روٹی نہ ملے، جب ہم دونوں کی غرض ایک ہے، تو محض اختلافِ فعل پر شرمندہ کیوں؟۔

آپ کے اندر خودداری بھی انتہا درجہ کی تھی، ''برار'' کے قضیہ کے سلسلہ میں نظام حیدرآباد دہلی آئے ہوئے تھے، خود نظام کی خواہش پر شاہ صاحبؒ بھی دیوبند سے دہلی تشریف لائے اور وقت مقررہ پر نظام کی قیام گاہ پر پہنچے، خبر ہوتے ہی نظام نے اندر بلالیا، شاہ صاحبؒ پہنچے تو نہ عام طریقہ کے مطابق آداب وشرائط کا لحاظ کیا اور نہ کسی شاہی دستور وآئین کی پابندی کی، روبرو ہوتے ہی آپ نے پیش قدمی کی اور خالص اسلامی طریقہ پر ''السلام علیکم'' کہا، نظام پیشوائی کے لئے آگے بڑھے اور ''وعلیکم السلام'' کہہ کر شاہ صاحبؒ کا ہاتھ پکڑ کر ایک کرسی پر لیجاکر بٹھادیا، اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ زیادہ تر 'دائرۃ المعارف' کے کام سے متعلق تھی، شاہ صاحبؒ نے حدیث کی چند اہم کتابوں اور ان کے قلمی نسخوں کا ذکر کرکے فرمایا کہ اگر آپ ان کو بھی حاصل کرکے دائرۃ المعارف کی طرف سے شائع کردیں تو بے شبہ علم حدیث کی اور اس کے واسطہ سے اسلام کی یہ بڑی خدمت ہوگی۔

اس زمانہ میں دیوبند سے ایک ہفت روزہ ''اخبار'' مہاجر نکلتا تھا، اس کے ایڈیٹر نے اس

ملاقات کی خبر چھاپنے کا ارادہ کیا تو عام ذہن کے مطابق ''بارگاہ خسروی میں حضرت علامہ کشمیری کی باریابی'' یا اس مفہوم کی کوئی اور عبارت خبر کے عنوان طور پر لکھی، چھپنے سے پہلے اتفاق سے شاہ صاحبؒ کو خبر ہوگئی تو حد درجہ خفا ہوئے اور فرمایا کہ میں ہر چند ایک مرد بے مایہ و بے بضاعت ہوں؛ لیکن اتنا منکسر المزاج بھی نہیں کہ یہ عنوان گوارا کرلوں، کیسی بارگاہ خسروی اور کیسی باریابی؟ صاف لکھئے کہ نظام اور انور شاہ کی ملاقات۔

اگرچہ آپ نے ہمیشہ عربی و فارسی زبان کو اپنے لئے ذریعۂ اظہار بنایا؛ مگر زبان کے معاملہ میں آپ کے یہاں کوئی تنگ نظری نہیں تھی، آپ نے کسی زبان کو تحقیر کی نظر سے نہیں دیکھا؛ چنانچہ ایک دفعہ دورۂ حدیث شریف کے طلبہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

> میں نے اپنے عربی و فارسی ذوق کو محفوظ رکھنے کے لئے ہمیشہ اُردو پڑھنے لکھنے سے احتراز کیا، یہاں تک کہ عام طور سے اپنی خط و کتابت کی زبان بھی میں نے عربی فارسی ہی رکھی؛ لیکن اب مجھے اس پر افسوس ہے، ہندوستان میں اب دین کی خدمت اور دین کا دفاع کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اُردو میں مہارت پیدا کی جائے اور باہر کی دنیا میں دین کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ انگریزی زبان کو ذریعہ بنایا جائے، میں اس بارے میں آپ صاحبان کو خاص طور سے وصیت کرتا ہوں۔

آپ کا رنگ بہت کھلا ہوا تھا، قد میانہ مائل بہ پستی، آواز ہلکی، صورت باوقار، مزاج میں رقیق القلب تھے —— کشمیر کے'' دودھ دان'' نامی گاؤں میں ۲۷ ؍شوال ۱۲۹۲ھ م ۱۷؍۱۷ اکتوبر ۱۹۵۷ء ہفتہ کو صبح کے وقت پیدا ہوئے، ابتدائی کتابیں والد ماجد اور مولانا غلام محمد سے پڑھیں پھر صوبۂ سرحد کا سفر کیا، وہاں فقہ، اُصول فقہ اور منطق کی کتابیں پڑھیں، ۱۳۱۰ھ میں دیوبند کا سفر کیا اور مولانا اسحاق امرتسری، مولانا غلام رسول ہزاروی، مولانا خلیل احمد

انبیٹھوی اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی سے حدیث اور مختلف علوم کی تحصیل کی، ۱۳۱۴ھ میں فراغت کے بعد ۱۳۱۵ھ میں مدرسہ امینیہ دہلی میں مدرس ہوئے اور ایک زمانہ تک درس دیتے رہے، ۱۳۲۰ھ میں کشمیر لوٹ آئے اور وہیں مدرسہ فیض عام کی بنا رکھی، ۱۳۲۳ھ میں حجاز کا سفر کیا، حج وزیارت کی سعادت حاصل کی اور رسالہ حمیدیہ کے مصنف شیخ حسین بن طرابلسی سے سند حدیث لی اور ہندوستان واپس آ کر دیوبند میں تدریس کا فریضہ انجام دینے لگے۔

۱۳۳۳ھ میں جب مولانا محمود حسن صاحبؒ کا سفر حجاز ہوا، تو آپ کو اپنا جانشیں اور صدر مدرس مقرر کر گئے، اب آپ بخاری وترمذی کا درس دینے لگے اور مسلسل تیرہ سال تک اسی خدمت میں مشغول رہے، یہاں تک کہ ۱۳۴۶ھ میں بعض اختلافات کے باعث دیوبند سے مستعفی ہو گئے اور بعض دوستوں اور شاگردوں کی خواہش پر ڈابھیل (گجرات) کا رُخ کیا، آپ کی تشریف آوری سے مدرسہ تعلیم الدین طالبانِ علوم نبوت کا مرجع بن گیا۔

اسی زمانہ میں بواسیر کی شکایت ہوئی، یہاں تک کہ مرض نے بہت نحیف کر دیا؛ چنانچہ دیوبند آ گئے، موت کا وقت آ چکا تھا، ۱۳۵۲ھ میں صفر کی ابتدائی شب میں انتقال ہوا، علماء وطلبہ کی ایک بڑی جماعت نے نماز جنازہ پڑھی اور دیوبند ہی میں عیدگاہ کے پاس دفن ہوئے۔

رحمهٗ الله تعالٰی رحمة واسعة ۔

❁ ❁ ❁

علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خطبات پر ایک نظر!❀

اس بحر بے کنار کا ساحل نہیں کوئی

سید العلماء علامہ سید سلیمان ندوی نالندہ صوبہ بہار کے ایک گاؤں دیسنہ میں ۱۸۸۴ء مطابق ۱۳۰۲ھ میں ایک علمی اور دینی خانوادہ میں پیدا ہوئے، انھوں نے اعلیٰ تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء میں حاصل کی اور خاص طور پر علامہ شبلی نعمانی کے تلمذ سے بہریاب ہوئے، تلمیذ سعید کو اپنے تلمذ کو سرمایہ سعادت سمجھتا تھا اور استاد اس بات کو اپنے لئے تمغۂ افتخار سمجھتے تھے کہ ان سے ایسے ہونہار شاگرد کی استاذی کا اعزاز حاصل ہے، وہ ندوۃ کے ایسے سپوت تھے کہ مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے فرمایا :

کہ اگر ندوہ نے سوائے سید سلیمان ندوی کے کسی اور کو جنم نہ دیا ہوتا
تب بھی یہی اس کے فخر کے لئے کافی ہوتا۔

انیسویں اور بیسویں صدی میں علم و تحقیق کے آسمان پر جو ستارے روشن ہوئے، علامہ سید سلیمان ندوی کی مثال ان کے درمیان چودہویں کے چاند کی تھی، وہ میدان تحقیق کے صرف تیراک نہیں تھے، غواص بھی تھے اور گہرائیوں میں اتر کر ایسے لعل و گہر تلاش کرتے تھے اور اس کے لئے دشت فکر و نظر کے ایسے ایسے گوشوں میں آبلہ پائی کرتے تھے، جہاں تک پہنچنے کے بارے میں دوسرے لوگ سوچ بھی نہیں سکتے تھے؛ اسی لئے علامہ اقبالؒ نے انھیں ''علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کا فرہاد'' قرار دیا، سید صاحب کی خصوصیات میں سے ایک ان کی شان جامعیت ہے، انھوں نے خدمت علم، خدمت دین اور خدمت قوم و ملت کے ہر کوچہ میں آبلہ پائی کی، علم و فن کے اعتبار سے ہر قریۂ علم میں پہنچے اور جس موضوع پر لکھا، خوب لکھا، ایسا لکھا کہ

❀ رابطہ ادب اسلامی کے ایک سیمینار کے لئے لکھی گئی تحریر۔

یا تو وہ اس موضوع پر حرف آخر ہے یا بعد میں کام کرنے والوں کے لئے متن متین، ان کا ایک امتیازی وصف یہ بھی ہے کہ ان کی کسی تحریر کو پڑھ کر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہاں پہنچتے پہنچتے مصنف کا قلم تھک چکا ہے، وہ جیسے اپنی ابتدائی تحریر میں تازہ دم نظر آئے ہیں ویسے ہی اخیر عمر کی تحریر میں بھی، قرآنیات پر ان کی تالیف ''کنز القرآن'' ایک بے نظیر کتاب ہے، جس سے ان کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوتا ہے اور سیرت النبی کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں قرآن مجید کا کیسا فہم عطا فرمایا تھا، بہ قول مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ: ''سید صاحب کی طرح فہم قرآن کسی اور میں نہیں دیکھا'' سیرت ان کا خاص موضوع تھا، جو انھیں اپنے استاذ علامہ شبلی نعمانی سے ورثہ میں ملا تھا، انھوں نے سیرت النبی کی تکمیل کی، جو اپنے موضوع پر اتنی عظیم الشان تالیف ہے کہ عربی زبان میں بھی مشکل ہی سے اس کی نظیر ملے گی، سیرت کی لٹریچر میں ان کی خطبات مدراس ایک البیلی تالیف ہے، جس کی تازگی اور تاثیر میں آج تک کوئی فرق نہیں آیا، سیرت ہی پر بچوں کے لئے ایک مختصر تالیف رحمت عالم ہے، جس کو ایسی پذیرائی حاصل ہوئی کہ شاید ہی کسی اور کتاب کے حصہ میں آئی ہے، اُم المومنین حضرت عائشہؓ کی سیرت پر سیرت عائشہ کو وہی درجہ حاصل ہے جو علامہ شبلی کی الفاروق کو اور کتنے ہی تالیفات اور تحقیقی مقالات ہیں جو آپ کے قلم کی مرہون منت ہے، مذہب سے لے کر شعر وادب تک آپ کے جلوے نظر آتے ہیں؛ لیکن اس وقت سید صاحب کے خطبات پر دو چار حرف عرض کرنے کی سعادت کی جاتی ہے۔

اظہار وتعبیر کے جتنے ذرائع ہیں، ان میں دو ذرائع وہ ہیں جو سب سے زیادہ اثر انگیز اور اثر آفریں واقع ہوئے ہیں، ایک شعر گوئی اور دوسرے خطبہ وموعظت، شعر اگر عمدہ ہو تو کانوں سے دلوں تک کا فاصلہ بہت جلد طے کر لیتا ہے اور لمحوں میں تار نفس کو چھیڑتا اور ساز احساس کو نغمہ ریز کر دیتا ہے؛ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اشعار کا اثر بہت دیر تک نہیں رہتا، اسی لئے شاید ہی کوئی فکری، سیاسی، سماجی یا اخلاقی انقلاب ہو جس کو محض کسی شاعر کی درافشانی نے وجود بخشا ہو، پھر جیسے شعر گوئی ایک مشکل فن ہے، اس لئے طبیعت کی موزونیت، کلام کو موزوں

کرنے کی صلاحیت، ردائف وقوافی پر عبور اور فکر وخیال میں ایجادی قدرت مطلوب ہے، اسی طرح شعر فہمی بھی کچھ کم دشوار نہیں؛ بلکہ دفعہ بے قید و بند شاعری شعر فہمی سے کہیں آسان ہوا کرتی ہے۔

خطبات اور مواعظ میں انقلاب انگیزی، دلوں کو زیر و زبر کرنے، قلب کی ٹھنڈی انگیٹھیوں کو سلگانے اور جذبات کے آتش کدوں کو سرد کرنے کی سب سے زیادہ صلاحیت ہوتی ہے، الفاظ کی لہروں کے ساتھ آواز کا تلاطم، خطیب کے چہرے کے نقوش اور اس کے چشم وابرو کے اشارے کی شمولیت اس کی تاثیر کو دوآتشہ کردیتی ہے، شاید اسی لئے پیغمبروں پر جو کلام نازل ہوا وہ منظوم تو نہیں تھا؛ لیکن اس کے لب ولہجہ میں خطیبانہ آہنگ ضرور موجود ہے، اکثر آسمانی صحیفے ایسے ہیں کہ گویا خدا براہ راست اپنے بندوں کو آواز دے رہا ہو اور اپنی خلقت سے مخاطب ہو، قرآن مجید میں یہ انداز شاید تمام کتابوں سے زیادہ نمایاں ہے، ''یٰأیھا الناس، یٰایھا الذین آمنوا ، یٰاھل الکتاب اور یٰایھا النبی'' یہ صاف طور پر خطیبانہ لہجہ ہے اور اس کی وجہ ظاہر ہے کہ اس میں تصنع اور تکلف کی حاجت نہیں، اس کو سمجھنا عامی سے عامی کے لئے آسان ہے اور اس میں اعلیٰ سے اعلیٰ مضامین کا بیان مشکل نہیں ہے۔

پھر جیسے رب کائنات نے موسم اور علاقہ کی نسبت سے پھول وپھل پیدا کئے ہیں، شاید انسانی ضروریات اور حاجات ہی کے لحاظ سے ہر عہد اور ہر دور کی مناسبت سے افراد واشخاص بھی پیدا فرمائے ہیں، ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر ایک قیامت آئی، حکمران محکوم بنے، تخت فرماں روائی جن کے وجود پر ناز کرتا تھا، تختۂ دار نے بڑھ کر انھیں گلے لگایا، جن کے آنسو کی قیمت ادا نہ ہوسکتی تھی، ان سے لہو کے جام بھر بھر سوغات طلب کی گئی اور طبع خون آشام کی سیری کے لئے خون جگر کی ایک ایک بوند بھی نچوڑ لی گئی، جن کے سر پر تاج سطوت سجا رہتا تھا، اس نے غریب الوطنی میں اپنی بے بسی وبے کسی کا رونا اس طرح رویا :

جو سلوک کرتے تھے اور سے، وہی اب ہیں کتنے ذلیل سے
وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے، رہا تن پہ ان کے نہ تار ہے

اس موج بلاخیز کو جب ٹھہراؤ ہوا تو ملک وقوم کی آزادی کا جہاد شروع ہوا، اس جہاد کی حقیقی تخم حضرت سید احمد شہیدؒ نے ڈالی اور ایک قافلہ ترتیب دیا، یہ قافلہ جو درویشوں، عالموں، مجاہدوں اور سب سے بڑھ کر حقیقی مومنوں کا قافلہ تھا، صرف کاروان جہاد نہیں تھا؛ بلکہ ایمان ویقین اور علم وادب کی طاقت اس کا سب سے بڑا سرمایہ تھی، سید احمد شہید کے بعد اس قافلہ کی سب سے اہم شخصیت شاہ اسماعیل شہید کی تھی، جو خطابت میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے اور جن کی تقریریں چلتے ہوئے قدم کو رکنے پر مجبور کردیتی تھیں۔

یہ زمانہ جہاد کا، جوش وخروش کا، آتش جذبات کو سلگانے اور عقل کے فرزانوں کو دیوانگی کی چوکھٹ پر جبیں ریز کرنے کا، سوئے ہوؤں کو جگانے اور سرمستان عیش کو آبلہ پائی اور صحر انوردی کا خوگر بنانے کا تھا، اس لئے اس عہد کو خطباء ومقررین اور جادو اثر واعظین کی حاجت تھی اور اسی نسبت سے اس عہد میں جیسے مشہور اور سحر البیان خطباء پیدا ہوئے شاید ہی اس کے بعد پیدا ہوئے ہوں، مولانا ابوالکلام آزادؒ، بہادر یار جنگؒ، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ جیسے خطباء پیدا ہوئے، جو سامعین کے قلوب کو اس طرح مسخر کرلیتے تھے، جیسے ایک سرکش ہاتھی مسلح ہاتھی بان کے ہاتھ میں ہوتا ہے، یہی دور اسلام پر فکری یلغار اور علمی یورش کا بھی تھا، اس لئے زمانہ کو ایسے خطیبوں کی بھی حاجت تھی، جس کا تخاطب دل کے ساتھ ساتھ دماغ سے بھی ہو، جو علم وتحقیق کے ہتھیار سے مسلح ہو اور جو اسلام کے خورشید جہاں تاب کی کرنوں کے سامنے آنے والی مصنوعی گھٹاؤں کو صاف کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، ایسے ہی خطیبوں میں ایک روشن نام ''علامہ سید سلیمان ندویؒ'' کا تھا۔

قدرت نے ایمان ویقین کی پختگی، علوم اسلامی میں مجتہدانہ بصیرت، ادب وتنقید میں دستگاہی، شعر وسخن کی شناوری، تاریخ وکلام اور فلسفہ قدیم وجدید میں غواصی، لسانیات کا مذاق خصوصی اور مغرب ومشرق کے ادبی، اعتقادی، مذہبی اور سماجی وسیاسی فکر سے آگہی، فطری ذہانت وطباعی، تلاش وتحقیق کے سفر میں آبلہ پائی کے جذبۂ بے نہایت اور ان سب کے ساتھ ریشم سے زیادہ نرم خوئی اور برف سے زیادہ خنک طبعی کے خمیر سے ایک ''تخت طاؤس'' تعمیر کیا اور اس

سلطنت علم وادب، قلم وزبان اورانشاء وخطابت کا فرماں روابنا کراس شخص کو بٹھایا جیسے دنیا ''علامہ سید سلیمان ندوی'' کہتی ہے وہ اقبال کی زبان میں ''جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد'' (اقبال نامہ:۱۹۶) اور ''استاذ الکل'' تھے۔ (اقبال نامہ:۱۷)

علامہ سید سلیمان ندوی کی بعض علمی اور قلمی خصوصیات وہ ہیں، جن میں شاید ان کے معاصرین میں کوئی بھی ان کا ہمسر نہیں، علمی اعتبار سے جامعیت اور ہر موضوع پر حق تحقیق کی ادائے گی ان کا وصف خاص ہے، علم کلام، قرآن اور تاریخ تو سید صاحب کا خاص موضوع فکر ہی ہے؛ لیکن حدیث، فقہ، اُصول، تصوف، جغرافیائی تحقیق، زبان و ادب، اخلاقیات اور سیاست ملکی وغیرہ پر بھی جہاں سید صاحب قلم اُٹھاتے ہیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہی آپ کا موضوع خاص ہے؛ بلکہ جس موضوع پر قلم اٹھایا وہ گویا اس موضوع پر حرف آخر ہے، چاہے سیرت اور ارض القرآن جیسا خالص دینی موضوع ہو یا خیام اور عرب و ہند کے تعلقات وغیرہ کے تاریخی موضوعات؛ اسی لئے سید صاحب کی شخصیت جہاں ایک طرف علماء ومشائخ کے درمیان پایۂ اعتبار و اسناد رکھتی ہے، وہیں ادباء و ماہرین لسانیات اور جدید تعلیم یافتہ دانشوروں کے یہاں بھی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔

عرب و ہند کے تعلقات

سید صاب کی زبان میں جو حلاوت، عبارت میں روانی ورعنائی اور الفاظ کے انتخاب میں موزونیت پائی جاتی ہے، وہ تو اہل علم کے لئے محتاج اظہار نہیں؛ لیکن دو خصوصیتیں ان کو عام اہل قلم سے ممتاز کرتی ہیں، اول مشکل سے مشکل اور خشک سے خشک مضمون میں بھی زبان کی حلاوت ورعنائی کو برقرار رکھنا، مثلاً غور کیا جائے کہ 'ارض القرآن' کا موضوع کتنا خشک اور دقیق ہے؛ لیکن سید صاحب نے یہاں بھی زبان و بیان کی آبرو باقی رکھی ہے اور بڑی آبلہ پائی کر کے صحراء کو سبزہ زار بنانے کی سعی کی ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ یہ کیفیت سید صاحب کی اولین کتاب ''ارض القرآن'' سے لے کر آخری کتاب ''حیات شبلی'' تک یکساں طور پر موجود ہے، **وذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء**، —— دوسری چیز طول کلام اور درازنفسی سے بچتے

ہوئے اپنے منشاء ومقصود کی مکمل تفہیم ہے،بعض اہل علم کے یہاں اس قدر طول کلام ہوتا ہے کہ صفحوں کا حاصل سطروں سے زیادہ نہیں ہوتا،سید صاحب کے یہاں مغز ہی مغز ہے،دشوار سے دشوار مضمون کو عام فہم بنا کر پیش کرتے ہیں اور کم سے کم عبارت میں ، خیال ہوتا ہے کہ سید صاحب کے دس صفحات کوشاید ہی زبان وادب کی رعایت کرتے ہوئے نوصفحات میں بھی بیان کیا جاسکتا ہو۔

برصغیر میں ماضی قریب میں علمی، دینی اورادبی اعتبار سے سید صاحب کے خطبات نے جو وقار و اعتبار پایا ہے اور قبول عام و خاص حاصل کیا ہے، شاید ہی کسی اور کے حصہ میں وہ مقبولیت ومنزلت آئی ہو، سید صاحب کی متعدد اہم اور معروف کتابیں ایسے ہی خطبات کا مجموعہ ہیں ؛ چنانچہ ۱۹۲۹ء میں سید صاحب نے ''ہندوستانی اکیڈمی الٰہ آباد'' کی دعوت پر ''ہندوستان اورعربوں کے تعلقات'' پر وہ عظیم الشان عالمانہ اور محققانہ خطبات دیئے جو ''عرب و ہند کے تعلقات'' کے نام سے چارسوصفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، یہ کتاب پانچ ابواب پر منقسم ہے،جس میں ہند وعرب تعلقات کے آغاز ،تجارتی تعلقات ،علمی تعلقات ، مذہبی تعلقات نیز مسلمانوں کی فتوحات سے پہلے ہندوستان میں مسلمانوں کے حالات سے بحث کی گئی ہے،حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب پر ۳۶ سال کا عرصہ گذر چکا ہے؛لیکن شاید ہی اس پر کوئی علمی اضافہ ہوا ہو،سید صاحب نے اس کتاب میں بڑی نکتہ رسی اور دقیقہ سنجی کا ثبوت دیا ہے،سید صاحب کی تحقیق کے مطابق ایک جاٹ طبیب خدمت نبوی میں حاضر ہوا ہے (ص:۱۱) سید صاحب نے ابن قتیبہ اورابن خلکان کے حوالہ سے امام زین العابدین کے ایک سندھ نژاد خاتون سے نکاح کا ذکر کرتے ہوئے یہ نکتہ اخذ کیا ہے کہ اس طرح ''آل زین العابدین'' نیم ہندوستانی ہیں، (ص:۴) سید صاحب نے یہ سراغ بھی بعض ہندومورخین کی تحریروں سے حاصل کیا ہے کہ کورو پانڈو کی جنگ کے وقت بھی عربی زبان کے شناسا ہندوستان میں موجود تھے (ص:۱۱) ہند وعرب کے تجارتی تعلقات میں ہندوستان سے عرب کیا کچھ جایا کرتا تھا؟اس کے لئے سید صاحب نے معرب الفاظ پرنہایت دقت نظر اور ذہانت کے ساتھ نگاہ ڈالی ہے اوران کی روشنی

میں حقائق کو جاننے کی سعی کی ہے(ص:۶۹) بائبل کی شہادت سے ثابت کیا ہے کہ حضرت مسیح سے دو ہزار سال قبل سے ہی عرب اور ہندوستان کے درمیان تجارتی روابط قائم تھے،(ص:۷۲) سید صاحب نے ''الفنسٹن'' کی اس رائے سے محققانہ اختلاف کیا ہے کہ اہل ہند سمندری سفر سے بالکل نابلند تھے، سید صاحب نے اس سلسلہ میں ''منوشاستر'' کی ایک عبارت سے استدلال کیا ہے(ص:۸۲) سید صاحب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ پرتگالی جہازراں ''واسکوڈی گاما'' جس کو ہندوستان کا دریافت کنندہ کہا جاتا ہے، اس کو ہندوستان تک ایک عرب جہازراں ابن ماجد نے پہنچایا تھا، جو سمندری سفر میں اپنی مہارت کی وجہ سے ''اسدالبحر'' یعنی شیر سمندر کہلاتا تھا۔(دیکھئے:ص:۹۲)

سید صاحب نے عرب و ہند کے مذہبی تعلقات پر جو بحث کی ہے، وہ ہندوستان میں اسلام کی آمد اور تبلیغ و اشاعت پر ایک دستاویز کا درجہ رکھتی ہے، سید صاحب نے اس میں ہندوستان کے باشندوں کے ساتھ مسلمان فاتحین کی مذہبی رواداری کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے کہ عرب جس مذہب کو ''سمینت'' تعبیر کرتے ہیں، وہ دراصل یہی بودھ ازم ہے(ص:۲۱۹) یہ بھی سید صاحب کے انکشافات میں ہی شمار کئے جانے کے لائق ہے کہ قرآن مجید کا پہلا ہندی ترجمہ ۲۷۰ھ میں ایک راجہ کے حکم سے ہوا تھا، (ص:۲۴۲) سید صاحب نے اس کتاب کے آخری حصہ میں انگریزی مصنفین اور موجودہ زمانہ کے فرقہ پرست ہندو مؤرخین کے اس خیال کی تردید کی ہے کہ اسلام ہندوستان میں تلواروں کے جلو میں آیا اور بے رحمیوں اور ستم کوشیوں کے ذریعہ اس نے اپنے پایۂ اقتدار کو مضبوط کیا، سید صاحب کا خیال ہے کہ ہندوستان میں اسلام غزنی دور سے بہت پہلے آچکا تھا اور اسلام اصل میں اپنی مذہبی و اعتقادی کشش کی وجہ سے پھیلا اور عرب تاجروں کے ذریعہ ہندوستان کے لوگ اس سے روشناس ہوئے، اس سلسلہ میں سید صاحب نے خاص طور پر سری لنکا، مالدیپ، مالابار اور کارومنڈل وغیرہ جنوب کے ان مراکز کا ذکر کیا ہے، جہاں سے داعیان اسلام کی برکتوں سے اسلام نے ہندوستان میں پیش قدمی کی، (ص:۲۵۹) سید صاحب نے اس حقیقت کو بھی منکشف کیا ہے کہ جنوبی ہند میں اسلامی

فتوحات سے بہت پہلے ہندو سلطنتوں میں مسلمانوں کا اپنا ''قومی نظام قضاء'' قائم تھا اور یہ مسلمان قاضی جو حکومت کی طرف سے مقررہ اور مسلمہ ہوتے تھے ''ہنرمند'' کہلاتے تھے (ص:۲۷۸) اس کے علاوہ برمکہ کے مذہب (ص:۱۱۴) ہندسہ کی تحقیق (ص:۱۴۴) اور ہندوؤں کے بعض احکام میں اہل کتاب کے مشابہ ہونے (ص:۱۹۴) کی بحثیں نہایت اہم ہیں۔

حالاں کہ یہ کتاب ایک خشک تاریخی موضوع پر ہے جس میں جابجا تحقیقی مباحث اور بعض مقامات پر دوسرے مؤرخین پر نقد و استدراک بھی ہے؛ لیکن اس میں بھی زبان کی حلاوت و رعنائی نے کہیں ساتھ نہیں چھوڑا ہے، عرب و ہند کے علمی تعلقات کی بحث کا آغاز کرتے ہوئے خانوادۂ برامکہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> یہ وہ خانوادہ ہے جس نے بغداد کی عباسی خلافت میں پچاس سال — ۱۳۱ھ سے ۱۸۶ھ — نہایت امن و امان، نظم و نسق، جود و کرم اور بخشش و فیاضی کے ساتھ وزارت کے فرائض انجام دیئے؛ یہاں تک کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ خلافت عباسیہ کی نیک نامی، شہرت اور حسن انتظام انھیں برمکی وزیروں کی بدولت تھا، ان ہی کا ابر کرم تھا، جس کی چھینٹوں سے بغداد کبھی باغ و بہار بن گیا تھا، پہلے عباسی خلیفہ سفاح سے لے کر پانچویں خلیفہ ہارون الرشید اعظم تک ان کے خاندان کے مختلف افراد نے وزارت ہی نہیں، درحقیقت شہنشاہی کی، ان کے خاندان کا آغاز گو سفاح ہی کے زمانہ سے شروع ہوا؛ مگر ان کے اقبال کا آفتاب ہارون کے عہد میں اوج کمال تک پہنچ گیا اور ابھی دوپہر ہی تھی کہ ہارون کے ہاتھوں یہ ہمیشہ کے لئے ڈوب بھی گیا۔

عربوں کی جہاز رانی

سید صاحب سے اہل بمبئی نے عربوں کی جہاز رانی اور ان کے بحری اکتشافات کے

موضوع پر خطبہ دینے کی خواہش کی تھی، آپ نے صرف دو ہفتے کی تیاری کے ساتھ یہ خطبہ دیا، جو ''عربوں کی جہاز رانی'' کے نام سے پہلی دفعہ ۱۹۳۵ء میں بمبئی سے طبع ہوا، یہ خطبات اپنے موضوع پر نہایت محققانہ، عالمانہ اور بصیرت مندانہ ہیں اور سید صاحب نے اس میں کتنے ہی ایسے حقائق سے پردہ اٹھایا ہے، جو اہل علم کے لئے ''دریافت'' کا درجہ رکھتے ہیں، عرب جاہلیت میں جہاز رانی کے مزاج اور نظام کی تحقیق آسان نہیں تھی، سید صاحب نے اس کے لئے عربی لغت، عرب شاعری اور قرآن مجید کو اصل بنایا ہے، اور عربی زبان میں اس نوعیت کے جو بھی عربی یا معرب الفاظ موجود ہیں، ان کو تلاش کر کے ایسی تحقیق کی ہے کہ بظاہر اس پر اضافہ دشوار ہے، عرب شعراء کے کلام سے اور قرآن مجید میں عربوں کو سمندری اسفار کا حوالہ دے کر تخاطب سے یہ بات ثابت فرمائی ہے کہ وہ جہاز رانی کے فن سے خوب واقف تھے، اس ذیل میں آپ نے ان آیات قرآنی کی بڑی دل آویز اور عبرت آمیز تفسیریں کی ہیں جو سمندری اسفار سے متعلق ہیں۔

سید صاحب نے ابوالفداء کی ''تقویم البلدان'' کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ''نہر سوئیز'' کا تخیل سب سے پہلے حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے پیش کیا تھا (ص:۴۵) سید صاحب نے ابن خلدون کے حوالہ سے بحر احمر کی پیمائش چودہ سو میل نقل کی ہے، جب کہ جدید نقشوں کے مطابق اس کی مسافت ۱۳۱۰ میل ہے، پھر تقابل کیا ہے کہ عربوں کی تحقیق جدید تحقیق سے کس قدر قریب ہے؟ (ص:۹۸) سید صاحب کی تحقیق ہے کہ ''قطب نما'' کی ابتدائی ایجاد کا شرف اہل چین کو حاصل ہے؛ مگر وہ اس کو محض ریاضی کے ایک آلہ کے طور پر استعمال کرتے تھے، بحری اسفار میں سمت جاننے کے لئے سب سے پہلے اس کا استعمال عربوں نے کیا، (ص:۱۳۶) مقناطیسی کمپاس کا علم بھی عرب جہاز رانوں ہی کا رہین منت ہے، سید صاحب نے اس میں ذیلی طور پر اس پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ زمین کے گول ہونے اور جذب وکشش کے کائناتی نظام کا تصور ابن خردازویہ (المتوفی ۳۰۰ھ) نے پیش کیا تھا —— مشہور جہاز راں ابن ماجد سے بھی سید صاحب نے نظام ثقل کی بات نقل کی ہے (ص:۱۸۰) یہ کتاب کل دو سو سے کچھ زیادہ صفحات پر مشتمل ہے؛ لیکن ہزاروں صفحات کا مواد اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، مشہور محقق ڈاکٹر حمیداللہ صاحب

نے بھی سید صاحب کی اس کتاب کو ایک اچھوتے موضوع پر کثیر مواد کا حامل قرار دیا ہے۔

حالاں کہ اس کتاب کا موضوع جغرافیہ ہے اور اس میں جا بجا مغربی مصنفین کے خیالات کی تردید بھی ہے؛ اس لئے یہ ایسا موضوع نہیں کہ جس میں زبان و بیان کی قند و نبات سے قارئین کو محظوظ کیا جا سکے؛ لیکن اس کے باوجود سید صاحب کے یہ خطبات بھی مشکل مضمون کو شستہ اور شگفتہ زبان میں پیش کرنے کا ایک نمونہ ہے، ایک موقعہ پر سمندری سفر کی بابت ایک ارشاد ربانی کا پس منظر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> ناپیدا کنار سمندروں میں لکڑی کے چند تختوں پر، ہواؤں کے رحم و کرم پر ضعیف و ناتواں انسانوں کا سفر کس قدر خطروں سے لبریز تھا؟ ایسی حالت میں کبھی ان جہازوں کا مقابلہ جب مخالف ہواؤں سے، ابر و باد سے اور طوفان سے پڑتا ہوگا تو ہر طرف سے پانی کی موجوں میں موت کا کس قدر دلخراش منظر نظر آتا ہوگا، ان مایوسیوں کے بادل میں اگر اُمید کی بجلی کس طرف سے چمکتی ہوگی تو وہ صرف قدرت والے خدائے واحد کی نگاہ کرم سے :
>
> وَآيَةٌ لَّهُمْ أَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُونِ ، وَخَلَقْنَا لَهُم مِّن مِّثْلِهِ مَا يَرْكَبُونَ ، وَإِن نَّشَأْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنقَذُونَ ، إِلَّا رَحْمَةً مِّنَّا وَمَتَاعاً إِلَى حِينٍ ۔ (یٰسین: ۴۰-۴۳)

ایک اور موقعہ پر قرآن مجید میں مذکور بحری سفر کا مرقع اس طرح کھینچتے ہیں :

> اس مرقع کی سب سے زیادہ مؤثر اور دل نشیں تصویر ذیل کی آیتوں میں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سمندر موجیں لے رہا ہے، جہاز میں ہم سوار ہیں جہاز آہستہ آہستہ چل رہا ہے کہ دفعتاً ہوائیں اُٹھیں، موجوں میں تلاطم ہوا، جہاز کا بادبان ٹوٹا، تختے ملنے لگے اور جہاز کے مسافر چیخیں مار مار کر دُعاء و زاری میں مصروف ہیں اور آئندہ

کے لئے خدا سے قول وقرار کر رہے ہیں :

هُوَ الَّذِيْ يُسَيِّرُكُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتَّى إِذَا كُنتُمْ فِيْ الْفُلْكِ وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيْحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوْا بِهَا جَاءَ تْهَا رِيْحٌ عَاصِفٌ وَجَاءَ هُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوْا أَنَّهُمْ أُحِيْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هٰذِهِ لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّاكِرِيْنَ ، فَلَمَّا أَنجَاهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُوْنَ فِيْ الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۔ (یونس:۲۱-۲۲)

زبان وادب سے متعلق خطبات

دینی مدارس کی موجودہ حیثیت کے فضلاء میں شاید سید صاحب واحد خوش نصیب صاحب قلم ہیں، جن کی اہل دین کی طرح اہل ادب نے بھی منزلت کی ہے اور اپنی محافل سخن وادب کو ان کی صدارت سے رونق بخشی ہے —— ''نقوش سلیمانی'' میں اس طرح کے پانچ خطبات شریک اشاعت ہیں، ان میں پہلا خطبہ ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پونہ ۲۹/دسمبر ۱۹۱۵ء'' کا خطبہ صدارت ہے، اس خطبہ میں سید صاحب نے اُردو زبان کی پیدائش، اُردو کے قواعد کی تدوین اول اور اس وقت تک اُردو زبان میں ہونے والے کام پر تبصرہ کیا ہے، سید صاحب نے اس میں اس بات پر زور دیا ہے کہ اُردو کو ''ہندی'' یا ''ہندوستانی'' کہا جائے۔

دوسرا خطبہ : ''ہندوستان میں ہندوستانی'' ہے، جس میں اُردو زبان کی تاریخ پر بڑی نفیس گفتگو کی گئی ہے اور اُردو زبان کی تاریخ میں صوفیاء اور خانقاہوں کے حصہ کو بھی بڑی تحقیق سے واضح کیا ہے، نیز اس بات کا سراغ لگایا ہے کہ خواجہ فریدالدین شکر گنج (م: ٦٧٠ء) ہی کے عہد سے اُردو زبان کا استعمال شروع ہو چکا تھا۔

تیسرا خطبہ : وہ ہے جو آپ نے ۱۹۳۷ء میں اُردو کانفرنس لکھنؤ میں پڑھا ہے، اس میں سید صاحب نے لکھنؤ کے ادبی ذوق، لکھنؤ کے مطابع، اخبارات اور یہاں کی علمی وادبی اولیات پر بڑی گہری اور بصیرت مندانہ نگاہ ڈالی ہے۔

چوتھا خطبہ : ''ہماری زبان کا نام''...... کے عنوان سے ہے، یہ تقریر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں کی گئی ہے، اس میں سید صاحب نے بتایا ہے کہ اُردو کا لفظ ہندوستان میں کس طرح آیا؟ اُردو زبان کو ''اُردو'' کہنے کی وجہ جو بعض اہل علم سے منقول ہے، ان کا ناقدانہ جائزہ بھی لیا ہے، اور اس تجویز کو بڑی قوت سے پیش کیا گیا ہے کہ اُردو کو ''ہندوستانی'' کہا جائے، شاید سید صاحب اُردو کے اس قدیم نام کو زندہ کرکے اس کو مسلمانوں کی طرح ہندوؤں کے لئے بھی زیادہ سے زیادہ قابل قبول بنانا چاہتے تھے، اس میں ایک خطبہ ''ہماری زبان بیسوی صدی میں'' کے عنوان سے ہے، جو ۱۹۳۶ء میں ایک ادبی مجلس کی صدارتی تقریر ہے، اس میں اس عہد تک اُردو زبان میں ہونے والے علمی کام، تعلیمی و تصنیفی ادارے، ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اُردو کی صورت حال، اُردو اخبارات، اُردو رسائل، اُردو پریس اور ہر فن میں اُردو کتابوں کی تعداد اور ان کے اعداد و شمار بڑی عمدگی سے جمع کر دیئے گئے ہیں اور یہ گویا اس وقت تک کی اُردو تاریخ پر ایک دستاویز ہے۔

سید صاحب کے یہ خطبات بھی زبان و بیان کی خوبصورتی، برجستگی اور شستگی کا مظہر ہیں، عربی زبان نے دوسری زبان پر جو غلبہ حاصل کیا، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں :

> عرب کے بادیہ نشیں جب فاتحانہ پرچم کے سایہ میں عرب کے ریگستان سے باہر نکلے تو جس طرح ایران کا درفش کادیانی، چین کی دیوار، مصر کے اہرام، افریقہ کے صحارا اور اندلس کے دریا ان کے سیاسی زور و قوت کو روکنے سے عاجز تھا، اسی طرح ان کی عربی زبان کے معنوی استیلاء و اقتدار سے بھی بچاؤ ان کے لئے ناممکن تھا، ایران کی پہلوی، شام کی سریانی، مصر کی قبطی، افریقہ کی بربری اور اندلس کی اسپینی زبانیں دفعتاً پردۂ عالم سے گم تھیں، ایوانِ حکومت عرب سپہ سالاروں کے ماتحت تھے، تو معبدوں اور کلیساؤں کی درس گاہیں عربوں کے ادبیات و علوم کی سرپرستی میں تھیں، سندھ کے

کناروں سے اٹلانٹک کے ساحل تک ایک زبان تھی جو ساری دنیا پر حکمرانی کررہی تھی اور وہ قرآن کی زبان تھی۔

لکھنؤ سے اپنی نسبت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں :

خاکسار کو گو لکھنؤ سے وطن کی نسبت حاصل نہیں ؛ لیکن گذشتہ چھتیس برس سے مجھے اس سے جو علمی و تعلیمی تعلق رہا ہے، وہ وطن ہی کے مانند ہے، اسی کی گود میں میرے ہوش وتمیز کی آنکھیں کھلیں، اسی کے دامن میں میری تعلیم وتربیت ہوئی اور اس کی آب وہوا میں میرا علمی وادبی نشو ونما ہوا، اس لئے اس سرزمین کا ہر گوشہ میرے لئے مانوس اور اس چمن زار کی ہر کیاری میرے لئے نظر افروز ہے۔

خطبات مدراس

''خطبات مدراس'' سید صاحب کی شاہکار تالیفات میں ہے، جو ۱۹۳۵ء میں دیئے گئے تھے، یہ خطبات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق ومحبت، سیرت کے بصیرت مندانہ تقابلی مطالعہ، عصری مزاج و مذاق کی رعایت کے ساتھ سیرت کی پیشکش، اثر انگیزی و دلآویزی اور زبان و بیان کی خوبی و رعنائی میں اپنی مثال آپ ہے، مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا ان خطبات کے بارے میں بیان ہے :

میرے محدود علم میں کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقت ور، دلآویز، دل پذیر، اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی، اس میں سیرت کے کتب خانہ کا عطر آ گیا ہے اور تاریخی حقائق، تقابلی مطالعہ، نفسیاتی تجزیہ، علم الاخلاق، علم الاجتماع اور اپنی ادبیت اور خطیبانہ انشاء پردازی کی آمیزش سے اس کی افادیت اور اس کی علمی قدر و قیمت میں ایسا اضافہ ہوا ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ مسلمانوں اور سلیم الطبع اور جویائے حق غیر مسلموں کو دینے کے لئے اس سے

بہتر کوئی تحفہ نہیں۔

سید صاحب کے یہ خطبات ''ورق ورق روشن'' کا مصداق ہیں، تاہم ایک اقتباس یہاں نقل کیا جاتا ہے :

> اگر تم دولت مند ہو تو مکہ کے تاجر اور بحرین کے خزینہ دار کی تقلید کرو، اگر تم غریب ہو تو شعب ابی طالب کے قیدی اور مدینہ کے مہمان کی کیفیت سنو، اگر تم بادشاہ ہو تو سلطان عرب کا حال پڑھو، اگر تم رعایا ہو تو قریش کے محکوم کو ایک نظر دیکھو، اگر تم فاتح ہو تو بدر وحنین کے سپہ سالار پر نظر کرو، اگر تم نے شکست کھائی ہے تو معرکۂ احد سے عبرت حاصل کرو، اگر تم استاذ اور معلم ہو تو صفہ کی درس گاہ کے معلم قدس کو دیکھو، اگر تم شاگرد ہو تو روح امین کے سامنے بیٹھنے والے کو دیکھو، اگر تم واعظ اور ناصح ہو تو مسجد مدینہ کے منبر پر کھڑے ہونے والے کی باتیں سنو، اگر تم تنہائی اور بے کسی کے عالم میں حق کی منادی کا فرض انجام دینا چاہتے ہو تو مکہ کے بے یار و مددگار نبی کا اسوہ تمہارے سامنے ہے، اگر تم حق کی نصرت کے بعد اپنے دشمنوں کو زیر اور اپنے مخالفوں کو کمزور بنا چکے ہو تو فاتح مکہ کا نظارہ کرو، اگر تم اپنے کاروبار اور دنیاوی جد جہد کے نظم ونسق کو درست کرنا چاہتے ہو تو بنی نضیر خیبر اور فدک کے زمینوں کے مالک کے کاروبار اور نظم ونسق کو دیکھو، اگر تم یتیم ہو تو عبداللہ اور آمنہ کے جگر گوشہ کو نہ بھولو، اگر بچہ ہو تو حلیمہ سعدیہ کے لاڈلے بچے کو دیکھو، اگر تم جوان ہو تو مکہ کے ایک چرواہے کی سیرت پڑھو۔

کلمۂ آخریں

سید صاحب کے یہ خطبات گو مختلف اور متنوع موضوعات پر ہیں، کسی میں رسول اقدس ﷺ کی سیرت کے اہم گوشوں کی رہنمائی اور دوسرے پیشوایان مذاہب سے آپ کی ذات والا

صفات کا تقابلی مطالعہ ہے، کہیں اُردو زبان وادب کی تاریخ ہے اور اس کے انحطاط اور اہل زبان کے تغافل کا ماتم ہے، کہیں عرب و ہند کے قدیم اور قریبی تعلقات پر پڑے ہوئے تعصب اور ناواقفیت کے پردے چاک کئے جارہے ہیں اور کہیں جہاز رانی کے فن اور سمندری علوم کی بابت عربوں کی مہارت؛ بلکہ اس فن میں ان کی قیادت واولیت کا اثبات ہے، لیکن غور کیا جائے تو ایک ہی مرکزی فکر اور بنیادی خیال ہے جس کے گرد یہ تمام موضوعات گھومتے ہیں، ان میں مقصد ومنشاء کے اعتبار سے ایک طرح کی وحدت اور یکسانیت پائی جاتی ہے اور وہ ''اسلام اور اہل اسلام کی سر بلندی کی سعی اور مسلمانوں کو ان کی تاریخ کا آئینہ دکھا کر اس آئینے میں اپنے آپ کو سنوارنے اور اپنے خط وخال درست کرنے کی دعوت'' ہے، سید صاحب نے بہت کچھ لکھا اور بہت کچھ کہا ہے، علم وتحقیق کی مجلسیں آراستہ کیں، سخن وادب کی محفلیں سجائیں، جدید اہل علم کے درمیان وہ پذیرائی حاصل کی کہ شاید ہی دینی مدرسہ کے کسی اور باضابطہ فاضل کے حصہ میں آئی ہو، اہل سیاست کی نگاہ احترام بھی ان کے سامنے خم رہتی تھی، کوچۂ تزکیہ واحسان میں بھی آبلہ پائی کی اور خود بھی ایک عالم کو عطر بار ومشکبار کیا؛ لیکن سید صاحب نے شاید ایک سطر بھی ایسی نہیں لکھی اور نہیں کہی جس کا مقصد محض ''ادب برائے ادب'' ہو، جس سے ایمان ویقین کی روشنی نہ پھوٹتی ہو، جس سے اُمت کی محبت اور اس کے لئے تڑپ کا نغمہ نہ اُبلتا ہو، جس میں حق وراستی کی دعوت نہ ہو، جس کا مقصد اسلام کی تبلیغ واشاعت یا اس کی طرف سے مدافعت نہ ہو، گویا سید صاحب کے افکار، خطبات ومقالات اور تحریروں اور کتابوں کا خلاصہ یہی تھا کہ :

ان صلوتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ رب العالمین ۔

سید صاحب کے خطبات کی علمی وقعت اور مخصوص تحقیقی رنگ نے اہل علم اور اصحابِ تحقیق سے خراج تحسین تو ضرور وصول کیا ہے؛ لیکن سوائے ''خطبات مدراس'' کے دوسرے خطبات کے تذکیری پہلو اور دعوتی رنگ پر بہت کم توجہ کی گئی ہے اور اس نقطۂ نظر سے آپ کے خطبات کے مطالعہ اور اس میں سے جواہر ریزوں کے اخذ کرنے کی ضرورت ہے۔

❋ ❋ ❋

مولانا ابوالکلام آزادؒ

جس سے جگر ولالہ کو ٹھنڈک ہو وہ شبنم
فولاد کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

مولانا ابوالکلام آزاد ہندوستان کی ان چند عبقری شخصیتوں میں ہیں کہ ان جیسا صاحب دماغ، ذہین، دوراندیش اور بالغ نظر قائداور مفکرصدیوں میں پیدا ہوتا ہےاور تنہا ایک انجمن کا کام کرتا ہے!

نفسیاتی طور پر کوئی بھی آدمی اپنے ماحول اور مزاج سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، وہ جس سوسائٹی اور سماج کی گود میں پرورش پاتا ہےاور پروان چڑھتا ہے، ممکن نہیں ہے کہ اس کی اخلاقی، تہذیبی، تمدنی، علمی اور فکری اثرات کو قبول نہ کرے، ایسے لوگ بہت کم ہیں جن کا شعور اتنا بالغ، جن کی نگاہ اتنی وسیع اور جن کی عقل اتنی رسا ہو کہ وہ اپنے آپ کو ماحول کی اس گرفت سے آزاد رکھے — مولانا آزادؒ ایسے ہی بلند نگاہ لوگوں میں تھے۔

وہ جن باپ کے بیٹے تھے، وہ عام مسلمانوں یا روایتی علماء ومشائخ کی طرح روایات اور بدعات ہی کے مریض نہ تھے ؛ بلکہ غلو آمیز فکر وعقیدہ میں اس درجہ پختہ تھے کہ مولانا احمد رضاں خاں فاضل بریلوی مرحوم کا تشدد بھی ان کے آگے شرمسار تھا، عبدالرزاق ملیح آبادی کے بیان کے مطابق وہ صرف اپنے آپ کو اور مولانا عبدالقدیر بدایونی (جو ہندوستان میں بہت سی بدعات اور فتنۂ تکفیر کے جنم داتا تھے) کو پورا مسلمان تصور کرتے تھے، اور مولانا احمد رضا خاں کا نصف مسلمان ہونا بھی ان کے نزدیک مشکوک تھا — دوسری طرف مولانا آزاد کی آزادی فکر ونظر اور جستجوئے حقیقت نے ان کو جس مقام پر پہنچا دیا، وہ قریب قریب اس کی دوسری انتہاء تھی۔

ان کی ذات بڑی جامع صفات تھی، وہ بڑے عالم بھی تھے اور ادیب وانشاء پرداز بھی،

سیاسی بصیرت میں بھی وہ طاق تھے اور علمی و دینی مسائل میں بھی اپنی مثال آپ، نہ حاضر دماغی اور حاضر جوابی میں کوئی ان کا ہمسر تھا نہ شیریں مقالی اور شعلہ گفتاری میں کوئی ان کا شریک، وہ جس بزم میں گئے، چھا گئے اور جس محفل میں رہے، حاوی رہے۔

ان کے اُسلوب تحریر کی تعریف کرتے ہوئے غالباً سجاد حیدر یلدرم نے لکھا ہے کہ اگر قرآن اُردو زبان میں نازل ہوتا، تو مولانا آزاد کی نثر میں ہوتا یا اقبال کی نظم میں —— اس سے قطع نظر کہ دین وشریعت کی بارگاہ میں یہ فقرہ ایک گونہ سوءادب کا حامل ہے؛ کیوں کہ انسان کے کلام کو خدا کلام سے کوئی نسبت نہیں ہوسکتی، مگر بہر حال اس سے ان کے طرز نگارش کی وقعت اور اُسلوب کی ندرت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے!

وہ الفاظ و زبان کے سہارے قارئین کے بربط دل سے کھیلتے تھے اور ان کا ''آبدار قلم'' پڑھنے والوں کے قلب وجگر میں پیوست ہو جاتا تھا، وہ اس کے سینے میں جوش وخروش کی آگ، عزم وحوصلہ کی توانائی، اس کے دماغ میں شوکت وجلال کا احساس اور عظمتِ رفتہ کو حاصل کرنے کا جذبۂ بے کراں بھر دیتے تھے، سوئے ہوئے ضمیر اور ٹھٹھرے ہوئے اعصاب میں حوصلۂ سرفروشی اور جرأت و بے باکی کی برقی لہر دوڑا دینے میں ان کو یدطولیٰ حاصل تھا، تحریر وانشاء کی دنیا میں ان کا قلم شمشیر برہنہ تھا، جو دلوں کو آسانی سے فتح کر لیتا تھا، وہ اپنے اس فن میں یکتا تھے، بہتوں نے ان کی پیروی کی، ان کی بنائی ہوئی شاہراہ پر قدم جمانے کی کوشش کی، اور اس سعی نے کئی نئے اُسلوب پیدا کر دیئے، مگر ان کی پیروی کی دشوار گذار وادی کو شاید کوئی بھی عبور نہ کرسکا۔

ان کی تحریر میں جملوں کی اتنی حسین بندش، الفاظ کا ایسا شکوہ وجلال اور اس کے ساتھ ساتھ ایسی سلاست اور برجستگی ہوتی ہے کہ چاہے نہ چاہے قاری اپنا دل دیدے، ان کا اُسلوب بنیادی طور پر خطیبانہ ہے، ان کی تقریر اگر صفحۂ قرطاس پر لے آئی جائے تو تحریر اور انشاء کا بہترین نمونہ محسوس ہوتی ہے، اور ان کی تحریر کو اگر مقرر اپنی تقریر میں استعمال کرے تو وہ ایک

بہترین تقریر اور حرارت انگیز خطبہ معلوم ہوتا ہے۔

طبع زاد اصطلاحات کے استعمال میں ان کو جو ملکہ حاصل تھا، وہ کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے، کہا جاسکتا ہے کہ وہ اُردو کے معاملہ میں ایک حد تک تنگ نظر بھی تھے اور اُردو میں انگریزی الفاظ کی برآمد کے بالکل روادار نہ تھے، ان کی تحریروں میں کہیں کہیں تو عربی اور فارسی الفاظ کی اتنی بہتات اور فراوانی ہوتی ہے، کہ ایک عام پڑھے لکھے شخص کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہوجائے کہ آیا یہ اُردو زبان ہی کی کوئی کتاب ہے؟ وہ اُردو میں مستعمل عام انگریزی الفاظ کے لئے بھی عربی کا متبادل استعمال کرتے تھے، مثلاً ''رپورٹ'' کے لئے روداد، بیان'' کانفرنس'' کے لئے مؤتمر'' پارلیامنٹ'' کے لئے مجلس یا مجلس الحکومۃ'' ایڈیٹر'' کے لئے'مدیر'اور میگزین کے لئے 'جریدہ' وغیرہ الفاظ لکھا کرتے تھے اور اس کی تاکید بھی کرتے تھے، ان کے رسائل اور کتابوں کے نام پر بھی عربیت کی چھاپ ہوتی تھی، مثلاً: الہلال، البلاغ، الحرب فی الاسلام، الحریۃ فی الاسلام وغیرہ۔

وہ اپنی تحریروں میں آیات قرآنی کا استعمال بڑے اچھوتے انداز میں کرتے ہیں، آیات کے تذکرہ میں ان کے ہاں جو برجستگی اور بے ساختگی ہوتی ہے، وہ صرف انھیں کا حصہ ہے، یہی حال اشعار کا ہے، وہ اپنے مضامین میں اشعار کا بکثرت استعمال کرتے ہیں، جن میں اُردو سے زیادہ عربی اور فارسی کے اشعار ہوتے ہیں، آیات اور اشعار دونوں ہی کو وہ اس برجستگی سے لاتے ہیں، کہ گویا یہ ان کے مضمون ہی کا ایک حصہ ہو۔

طبیعت بھی موزوں پائی تھی، جہاں وہ ایک کامیاب نثر نگار اور انشاء پرداز تھے، وہیں گاہے گاہے خود بھی اشعار کہا کرتے تھے، یادش بخیر! ان کے ایک تذکرہ نگار عبداللہ بٹ نے اپنے ایک مقالہ میں ان کے بعض اشعار نقل کئے ہیں، مولانا آزاد ہی کا ایک شعر ہے:

کوئی نالاں، کوئی گریاں، کوئی بسمل ہوگیا
اس کے اُٹھتے ہی دگر گوں رنگ محفل ہوگیا

ان کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اساتذہ کے کلام پر ان کی بڑی نظر تھی، انتخاب میں

بھی ان کا ذوق بڑا ستھرا اور شائستہ تھا!

زبان وادب کے اعتبار سے ان کی تصانیف میں 'تذکرہ، عیدین اور صراط مستقیم' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اور ان کے تصوراتی مکاتیب کا مجموعہ ''غبار خاطر'' تو ان کی انشاء پردازی کا شاہکار ہے، الہلال، البلاغ، پیغام اور پیام وغیرہ رسائل میں شائع ہونے والے ان کے گرم جوش اور ذی ہوش مضامین بھی اُردو ادب کے بہترین نمونے ہیں، ان کے ان گرانقدر مضامین کا مجموعہ ''مضامین الہلال'' اور ''مضامین البلاغ'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع بھی ہو چکا ہے۔

مولانا زود نویس تھے، بہت جلد، بہت تیز اور بہت برجستہ لکھتے تھے؛ لیکن اپنی تحریر میں کانٹ چھانٹ بھی بہت کرتے تھے، اور یہ قطع و برید کبھی کبھی اس درجہ ہوتا تھا کہ پورا مضمون ہی بدل جاتا تھا؛ چنانچہ ان کے دیرینہ رفیق کار اور تذکرہ نگار کے حسب تحریر بسا اوقات وہ اپنے پورے مضمون کا ''قیمہ'' بنا ڈالتے تھے!

وہ اُردو کے علاوہ عربی بھی لکھا کرتے تھے، گو ان کا کوئی مضمون اور ان کی کسی عربی تحریر کو دیکھنے کا موقع میسر نہیں آیا، مگر ان کے مذاق سلیم سے اُمید ہے کہ وہ عربی بھی اچھی ہی لکھتے رہے ہوں گے، انھوں نے عربی کے دو رسالے ''الجامعہ'' اور ثقافۃ الہند'' بھی نکالے، جن کو عبدالرزاق ملیح آبادی ایڈٹ کرتے تھے اور مولانا ان کے نگراں تھے۔

مولانا آزادؒ جہاں ایک طرف علم وادب کی دنیا کے شہسوار تھے، وہیں وہ ہندوستانی سیاست کے قبلہ نما بھی تھے، ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی خدمات اور قربانیاں سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہیں، وہ ہندوستان کی جنگ آزادی کے ''سابقون اولون'' میں ہیں، انھوں نے جب اس پُر خطر رہگذر میں قدم رکھا، اس وقت عام طور پر مسلمان قائدین یا تو خواب غفلت میں پڑے ہوئے تھے، یا یہ اندیشہ انھیں سراسیمہ کئے ہوئے تھا کہ ہندوستان کی تین گنا ہندو آبادی ان کے نام ونشان مٹا کر رکھ دے گی، اس لئے انگریزوں کی

غلامی ہی بہتر ہے، خود شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے فرمایا کہ ''ہم سوئے ہوئے تھے، ہمیں الہلال نے جگایا ہے'' —— مولانا آزادؒ نے جس وقت ہندوستان کی ہنگامہ خیز سیاست میں قدم رکھا، اس وقت وہ شاید کانگریس کے سب سے کم عمر ممبر تھے، دوبار کانگریس پارٹی کے صدر بھی منتخب ہوئے اور پوری خوش اُسلوبی سے اپنے فرائض انجام دیئے، انھوں نے اپنی زندگی میں کانگریس، جمعیۃ علماء ہند اور خلافت کمیٹی کی مختلف کانفرنسوں کی صدارت بھی کی۔

ہندوستان کی اُس وقت کی گرما گرم سیاست میں مولانا آزاد کے الہلال اور الہلال بند ہونے کے بعد البلاغ نے بڑا اہم اور مؤثر کردار ادا کیا اور ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آگ لگادی، مسلمان —— جو تحریک آزادی کی ایک اہم ترین قوت تھے اور جن کی شمولیت کے بغیر اس لڑائی میں فتح پانا ممکن نہ تھا —— مولانا کی تحریروں کے ذریعہ تحریک میں شریک ہوئے اور ہندوستان کی تحریک آزادی کامیابی کے قریب آنے لگی۔

ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کشمکش میں جب خلافت تحریک اٹھی، تو اس کے بانیوں میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ اور مولانا الباری فرنگی محلیؒ کے علاوہ مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے اور اس کا پہلا اجلاس عام جو کلکتہ میں منعقد ہوا، اس کی صدارت مولانا آزاد ہی نے کی۔

پھر اسی زمانہ میں مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ نے ہندوستان میں ''شرعی امارت'' کے قیام کا نقشہ پیش کیا؛ تا کہ اس کے ذریعہ مسلمانان ہند کو منظّم کیا جا سکے اور مذہبی معاملات میں وہ آزاد رہیں، جس زمانہ میں مولانا سجادؒ اپنے اس ذہنی نقشہ کو حقیقت اور عمل کے سانچہ میں ڈھالنے کے لئے فکر مند تھے، ٹھیک وہی وقت تھا جب مولانا آزاد رانچی جیل میں ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک نیم عسکری تنظیم کی داغ بیل ڈالنا چاہتے تھے —— قاضی احمد حسین گیاوی (سابق ایم، پی حکومت ہند) کے ذریعہ مولانا آزاد کی یہ تجویز مولانا سجاد صاحبؒ کے کانوں تک پہنچی، جو اس وقت سیاست سے کنارہ کش تدریسی زندگی بسر کر رہے تھے، مولانا سجاد نے اس کے بالمقابل ''امارت شرعیہ'' کے قیام کی تجویز پیش کی اور فرمایا کہ یہ ایک شرعی تنظیم ہوگی —— قاضی صاحب موصوف ہی کے ذریعہ یہ تجویز جیل میں مولانا آزاد کو پہنچی، مولانا نے فوراً اس سے اتفاق کرلیا

اور پھر رہا ہونے کے بعد براہ راست خود مولانا سجادؒ سے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی۔

مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ جو بڑی حد تک جمعیۃ علماء کے محرک اول اور اس کے اہم ترین ارکان اور ذمہ داروں میں تھے، کی تحریک پر یہ بات طے پا گئی کہ کل ہند سطح پر امارت شرعیہ کا قیام عمل میں آئے اور کوئی ''امیر الہند'' منتخب کیا جائے، جس کے ہاتھ پر مسلمان سمع وطاعت کی بیعت کرلیں، اب سوال پیدا ہوا کہ ''امیر الہند'' کون ہو؟ اس وقت اس اہم ذمہ داری کے لئے جو شخصیتیں سامنے تھیں، وہ تھے مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ—— شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ ایک بے نفس عالم دین اور مجاہد آزادی بھی تھے اور کافی مریض بھی، اس وقت علماء اور خواص اُمت کی نگاہ اُن ہی کی طرف تھی—— جب کہ مولانا عبدالباری بھی اس کے متوقع اُمیدوار تھے اور مولانا آزاد بھی۔

مولانا سجادؒ صاحب بڑے دور اندیش شخص تھے، وہ اس اہم عہدہ کے لئے جو بیک وقت مذہبی بھی تھا اور سیاسی بھی، مولانا آزاد کو مناسب سمجھتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے مولانا محمود حسن صاحبؒ سے اس سلسلہ میں گفتگو کی، مولانا نے حسبِ توقع خود اس گراں بار ذمہ داری کو قبول کرنے سے انکار کردیا اور مولانا آزاد ہی کے نام کی تائید کی، چوں کہ پلڑا مولانا آزاد کے حق میں جھک رہا تھا، اس لئے چارونا چار مولانا عبدالباری صاحب نے بھی اس تجویز سے اتفاق کرلیا اور اس طرح یہ بات طئے پا گئی کہ انتخاب امیر کے لئے جمعیۃ علماء کے زیر اہتمام ایک اجلاس ہو اور اس میں مولانا آزاد کا انتخاب کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کرلی جائے، مگر افسوس کہ مولانا محمود حسن صاحبؒ کی علالت اور گروہی اختلاف نے اس خواب کو شرمندۂ تعبیر ہونے نہ دیا؛ ورنہ شاید آج ہندوستان میں مسلمانوں کی ملی زندگی کا نقشہ کچھ اور ہوتا۔

بہرحال مولانا آزاد جنگ آزادی کے اختتام تک کانگریس اور ملک کی تمام ان تحریکوں میں جن کا مقصد ملک کو غیر ملکیوں سے آزاد کرنا تھا، قائدانہ رول ادا کرتے رہے اور اس وقت تک ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لیڈران یہاں تک کہ خود گاندھی جی کا حال یہ تھا کہ وہ مولانا کے آستانہ پر دست بستہ حاضر ہوتے تھے اور مولانا ہی ہر اجلاس کی روح اور جان سمجھے

جاتے تھے —— افسوس کہ آزادی کے بعد اس دیش کے باشیوں نے رفتہ رفتہ مولانا کو فراموش کرنے کی پالیسی پر عمل کرنا شروع کردیا، اور ہندوستان کی تاریخ آزادی میں ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ایسی تحریف شروع کردی گئی کہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا فضل حق خیرآبادیؒ، علماء صادق پور، مولانا محمد علی جوہریؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ اور دوسرے دردمندان وطن کی خدمات اوران کے بلند کارناموں پر سیاہی پھیردی جائے۔

ہندوستان کی آزادی سے پہلے ہی ملک کی تقسیم اورایک علاحدہ ریاست کے قیام کی جو تحریک شروع ہوئی، مولانا آزاد نے اس کی سخت مخالفت کی، اس میں شبہ نہیں کہ مسلم لیگ کی قیام پاکستان کی تجویز اس وقت اتنی دیدہ زیب اور دلفریب ثابت ہوئی کہ اکثر مسلم قائدین اور علماء محمد علی جناح کے جھنڈے تلے چلے گئے اور یہ تحریک شعوری سے زیادہ جذباتی ہوکر رہ گئی۔

مولانا آزاد ایک تجربہ کار سیاستداں اور دور رس نگاہ کے مالک تھے، انھوں نے ہندوؤں سے ۵۱ فیصد پارلیمانی سیٹیں ہندوؤں کے لئے اور ۴۹ فیصد مسلمانوں کے لئے منوالی تھیں، اس طرح اقلیت میں ہونے کے باوجود مسلمان حکومتی سطح پر مساوی ہوتے، پھر مسلمانوں کی قوت اس سے بڑھ جاتی تھی کہ ہندوستان کے اکثر سرحدی صوبے مسلم اکثریت کے تھے اوراس طرح پورا ملک مسلم آبادی کے حصار میں تھا، اس کے علاوہ ہندوستان کو جن ممالک سے خارجہ تعلقات استوار رکھنے تھے اور جن سے مل کر رہنا ملک کے لئے ناگزیر تھا، وہ بھی اکثر مسلم ممالک تھے، نیز ہندوستان کی سرحدوں سے متصل بھی بعض مسلم مملکتیں تھیں۔

دوسری طرف ان کی چشم بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ تقسیم کے بعد مملکت پاکستان جن صوبوں پر مشتمل ہوگا، وہ ایک تو اپنے رقبہ کے اعتبار سے ہندوستان سے بہت کم ہوگا، دوسرے اس کے مختلف صوبے اپنی زبان، تہذیب وتمدن اور مزاج کے اعتبار سے ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہوں گے اوران کا ایک جھنڈے میں جمع رہنا، ان حالات میں جب کہ قومیت کے نشہ نے دنیا کے چپہ چپہ کو بدمست بنا رکھا ہے، عملاً ناممکن ہوگا، بالخصوص بنگال میں وطنیت پرستی کا یہ جذبہ اور بھی زیادہ پیدا ہوگا، مولانا بنگال کے اس مزاج کو بخوبی سمجھتے تھے؛ چنانچہ انھوں نے

ایک جگہ لکھا ہے :

”مائی انڈیا“ کی جگہ ”مائی بنگال“ کی صدا میں ہمیشہ سنتا رہتا ہوں، شاید کہا جاسکتا ہے کہ اور صوبوں کے مقابلہ میں پراون شیلزم کا جذبہ بنگال میں زیادہ ہے!

مولانا نے بڑی حد تک محمد علی جناح کو بھی اس کے لئے آمادہ کرلیا تھا،مگر جواہر لال نہرو کے ایک غیر ذمہ دارانہ بیان نے مولانا کی اس آخری کوشش کو بھی ناکام کردیا اور اس طرح مولانا کی سخت مخالفت کے باوجود بھی ملک کی تقسیم عمل میں آگئی، تقسیم ملک کی مخالفت کے نتیجہ میں مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کو اپنی نادان قوم کی طرف سے سخت لعن وطعن اور گالی گلوچ کا ہدف بننا پڑا اور یہ حضرات بڑے صبر اور تحمل کے ساتھ ان ساری ناشائستہ حرکتوں کو برداشت کرتے رہے۔

تقسیم ملک کے فوراً بعد قتل وخون کی جو ہولناک ہولی کھیلی گئی اور نفرت وعداوت کے شعلوں نے جس طرح پورے ملک کے امن وشانتی کو خاکستر کردیا، اس نے ہندوستانی مسلمانوں میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کردیا اور یہاں سے جوق در جوق لوگ پاکستان کے لئے رخت سفر باندھنے لگے،مولانا آزاد نے اس موقع پر بھی سختی سے مسلمانوں کو روکا، ان کو تسلی دی اور اسی موقع سے دلی کی جامع مسجد میں وہ تاریخی تقریر کی، جس نے دلوں کی دنیا بدل دی، جو بستر باندھ چکے تھے،انھوں نے اپنے بستر کھول دیئے، جانے والے رک گئے، بھاگنے والے تھم گئے، سراسیمہ اور ہراساں دلوں میں ثبات واستقامت کی شمع جلی اور عدم تحفظ کے احساس کی جگہ حفاظت خود اختیاری کے جذبہ نے لے لی، آج بھی اس تقریر کا ایک ایک لفظ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک جانفزا پیغام اور ثبات واستقلال کی دعوت ہے اور دلوں میں مانگنے کی بجائے خود اپنا حق لینے اور بھاگنے کی بجائے خود کو اس سرزمین کا اصل حقدار تصور کرنے کا احساس پیدا کرتا ہے۔

آزادی کے بعد مولانا کابینی وزیر بنائے گئے اور ان کے مذاق اور خواہش کی رعایت کرتے ہوئے اوقاف اور تعلیم کا شعبہ ان کو تفویض کیا گیا، وہ جب تک زندہ رہے، اسی عہدہ پر فائز رہے، مگر آزادی کے بعد مولانا کو وہ قوت حاصل نہ رہی جو پہلے تھی، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی اصل قوت مسلمان تھے اور ملک کی تقسیم کے بعد مسلمان ایک اقل ترین اور سہمی ہوئی اقلیت میں آ گئے تھے، بعض تنگ نظر اور فرقہ پرست ممبران پارلیامنٹ تو ان کے معاملہ میں بہت نیچی سطح پر اتر آتے تھے، سرکاری زبان کے معاملہ میں بھی اُردو کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی، اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے، مگر وہ کانگریس کی حمایت میں اتنی دور جا چکے تھے، نیز حالات کی زنجیر نے ان کو اس طرح جکڑ دیا تھا، کہ اب وہاں سے واپس آنا ان کے لئے ممکن نہیں تھا اور اس طرح شاید وہ ایک ''مجبور وزیر کی حیثیت سے جی رہے تھے، حتیٰ کہ خود مولانا آزاد ہی کی وزارت تعلیم کے دور میں ''مسلم یونیورسٹی بل'' میں وہ پہلی ترمیم ہوئی، جس نے رفتہ رفتہ اس کا اقلیتی کردار ہی ختم کر دیا — آزادی کے بعد مولانا کی بے بسی اور بدست دیگراں مجبوری کا اندازہ خود ان کی ان تصانیف سے بھی ہوتا ہے، جو ان کی موت کے بعد شائع ہوئی ہے، بعض لوگ اس سلسلہ میں مولانا کو ہدف اعتراض بھی بناتے ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ قائد کی طاقت اس کے الفاظ اور اس کی ذہانت نہیں ہوتی؛ بلکہ وہ قوم ہوتی ہے، جو اس کے پیچھے رہتی ہے اور تقسیم ہند کے بعد مولانا اس طاقت سے محروم ہو چکے تھے۔

مولانا ابتداء میں سبھاش چندر بوس اور ان پر جوش نیتاؤں کے ہمنوا تھے، جو بہ زور طاقت ہندوستان کو آزاد کرانا چاہتے تھے، مولانا آزاد اس کے لئے ایک طرف پڑوسی مسلم ممالک سے تعاون لینا چاہتے تھے اور دوسری طرف خود ہندوستان کو جہاد کے لئے تیار کر رہے تھے؛ چنانچہ انھوں نے ایک زمانہ میں ہندوستان میں جہاد کی بیعت بھی لی اور شاید اسی کے پیش نظر وہ ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک خفیہ تنظیم بھی قائم کرنا چاہتے تھے، مگر بعد کو تجربات نے مولانا کی رائے بدل دی اور وہ بھی گاندھی جی کی طرح عدم تشدد کی پالیسی ہی پر گامزن ہو گئے، نیز یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان اس وقت جن حالات سے دوچار تھا، اس کے تحت ہندوستان کے

لئے عدم تشدد کے ساتھ آزادی کی لڑائی ہی مناسب تھی اور بالآخر یہی ملک کے لئے نجات دہندہ ثابت ہوئی۔

ہندوستان کی آزادی کی لڑائی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہمی آویزش اور تنگ نظری تھی اور حکومت برطانیہ کی کوشش تھی کہ نفرت وعداوت کے یہ شعلے اور بھڑکیں، ان کی توجہ ملک کی آزادی کے بجائے ان مسائل پر مرکوز رہے اور یہ آپس میں لڑکر کمزور ہوتے رہیں —— حکومت نے کچھ ایسا پروپیگنڈا کیا تھا کہ ان میں سے ہر ایک دوسرے سے خائف تھا، مسلمان ہندو اکثریت کے خوف سے سہمے اور کانپے جارہے تھے، اور سمجھتے تھے کہ حکومت برطانیہ کی پناہ اُٹھتے ہی یہ ہم پر ٹوٹ پڑیں گے اور ہندوستان سے مسلمانوں کا نام ونشان مٹ جائے گا، جب کہ ہندوؤں کو یہ اندیشہ لرزا رہا تھا کہ انگریزوں کے جاتے ہی درۂ خیبر کے پٹھان اتریں گے اور ہندوستان میں ہندوؤں کے خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔

مولانا آزاد کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اس خلیج کو پاٹنے اور اس فاصلہ کو کم کرنے کی انتھک سعی کی، باہم اعتماد وخیر سگالی کی فضا پیدا کی، اپنی پرجوش و مدلل تقریروں اور اپنی ساحرانہ اور آتشیں تحریروں کے ذریعہ غلط فہمیوں کا ازالہ کیا، دونوں کو ان کے مشترکہ مسائل اور آزادی کی مشترکہ ضرورت پر توجہ دلائی اور ہندوستان میں ہندو مسلم بھائی چارے کی فضا پیدا کردی۔

مولانا آزاد نے اس سلسلہ میں بعض مسلم لیڈران کے اعتراضات کے جواب بھی دیئے، عہد رسالت میں کافروں سے معاہدہ اور مصالحت کی نظیریں بھی پیش کیں؛ بلکہ شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ مولانا کبھی کبھی ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کے لئے رواداری میں اتنی دور چلے جاتے تھے، جہاں بعض حضرات کے خیال کے مطابق ''مداہنت'' کی سرحد شروع ہوتی ہے۔

مثال کے طور پر آزادی سے پہلے ایک بار ''گاؤ کشی'' کا مسئلہ درپیش ہوا، عید قرباں کا موقع تھا، مولانا آزاد پٹنہ (بہار) آئے ہوئے تھے، اس زمانہ میں بہار میں محدود اختیارات کے

ساتھ کانگریسی وزارت قائم تھی، کانگریسی لیڈران کی رائے تھی کہ ہندو مسلم یگانگت برقرار رکھنے کے لئے مسلمان بطور خود گائے کی قربانی ترک کردیں، مولانا آزاد بھی اس پر نیم راضی ہوگئے تھے؛ مگر مولانا سجاد صاحبؒ نے اس کی شدید مخالفت کی اور کانگریس کے اجلاس مدراس میں منظور شدہ تجویز کا حوالہ دیا، جس کی رو سے یہ بات طے پائی تھی کہ مسلمان اپنے اپنے مکان میں گائے کی قربانی کیا کریں، اسی طرح بہار میں اوقاف پر کانگریسی وزارت کے انکم ٹیکس لگانے کے موقع پر اور مختلف دوسرے مواقع پر مولانا آزاد نے خود واضح موقف اختیار کرنے سے گریز کیا اور جمعیۃ علماء اور امارت شرعیہ وغیرہ کی مخالفت سے اس کا تدارک ہوا۔

اسلامیات پر مولانا کی گہری نگاہ تھی، تحقیق وتجسس کا جذبہ ان کی فطرت میں تھا، وہ ہر مسئلہ میں ڈوب کر اس کی تہ تک پہنچنا اور اس کی اصل اسپرٹ اور روح کو پرکھنا جانتے تھے، جواہر لال نہرو کے بقول وہ دراصل علم اور تصنیف وتالیف ہی کے شعبہ کے آدمی تھے؛ مگر قحط الرجال نے ان کو مجبور کردیا کہ وہ سیاست کی منجدھار میں کود پڑیں اور اپنے آپ کو اس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیں۔

جس زمانہ میں ان کی طوطی بول رہی تھی، وہ وقت تھا جس کو علمی اور دینی اعتبار سے اس ملک کی تاریخ کا زریں عہد کہا جاسکتا ہے، پھر ان کو جن علماء سے سابقہ تھا اور جن کے ساتھ ان کا اٹھنا بیٹھنا، باہم مشورہ کرنا اور ملنا جلنا ہوتا تھا، وہ سب اساتذۂ وقت اور ماہرین فن تھے اور ان میں سے ہر ایک اپنے موضوع پر یکتائے روزگار اور ممتاز تھا، مگر ان سب کے بیچ رہ کر بھی مولانا آزاد کبھی کم نہیں دیکھے گئے؛ بلکہ بہتوں پر بھاری رہے، اور اپنی ذکاوت وطباعی سے سبھوں پر چھائے رہے۔

مولانا آزاد کا ایک بڑا امتیاز یہ تھا کہ وہ جدید وقدیم کے حسین امتزاج تھے، علم کے قدیم سرچشمے، مختلف مذاہب اور ادیان کے ماٴخذ اور شریعت اسلامیہ کے مصادر پر بھی ان کی عمیق نظر تھی اور جدید علوم اور نئے افکار ونظریات سے بھی آشنا تھے، وہ ان دونوں وادیوں کی

سیر کر چکے تھے اور ان دونوں چشموں میں ڈوب کر غوطہ لگا چکے تھے، انگریزی انھوں نے باضابطہ نہیں پڑھی تھی، مگر خود اپنے ذاتی مطالعہ سے انھوں نے اس زبان پر بھی عبور حاصل کرلیا تھا، انھوں نے اپنی بساط بھر اسلام اور جدید انکشافات کے درمیان تطابق پیدا کرنے کی کوشش بھی کی اور بعض کتابیں بھی اس مقصد کے پیش نظر لکھیں۔

عبدالرزاق ملیح آبادی نے اپنی کتاب ''ذکر آزاد'' میں بعض فقہی اور اعتقادی مسائل سے متعلق ان کی تحریریں نقل کی ہیں، جن میں سے ایک مکتوب تصویر کے متعلق ہے، ایک قادیانیوں کے کفر و اسلام کے بارے میں ہے، ایک فتویٰ 'جمعہ فی القریٰ' کے مسئلہ پر ہے اور ایک مضمون قبر پرستی کے عدم جواز میں، گوکہ ان مسائل میں ان کی آراء سے مکمل اتفاق دشوار ہے؛ لیکن ان تحریروں سے بہرحال، ان کی علمی بصیرت، وسعت مطالعہ اور شریعت کی رمز شناسی کا اندازہ ہوتا ہے۔

مولانا آزاد بڑے عالم بھی تھے اور علم دوست بھی، نازک طبع تھے، بعض معاصرین کا خیال تھا کہ دوسروں کی بالاتری انھیں گوارا نہ ہوتی تھی، مگر اس کے باوجود مولانا شبلیؒ کے بہت قائل تھے اور ان کے معاملہ میں متواضع بھی، وہ بصیرت مند علماء کی قربت اور رفاقت کو پسند فرماتے تھے، مولانا آزاد نے کلکتہ میں مدرسہ عالیہ کے مقابلہ ایک دوسری درسگاہ ''مدرسہ اسلامیہ'' کے نام سے جاری فرمائی تھی، اس لئے کہ مدرسہ عالیہ گو عربی اور اسلامی مدرسہ تھا، مگر تھا حکومت کی تحویل میں، کانگریس نے ایسے مدارس کا بائیکاٹ کیا تھا اور مولانا نے اس کو عملی جامہ پہنچانے کے لئے یہ اقدام کیا تھا، اس موقع پر مولانا کی مردم شناس اور جوہر شناس نگاہ نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو حاصل کرنے کی بہت کوشش کی اور اپنے بعض قریبی رفقاء کے اختلاف کے باوجود اپنی رائے پر اٹل رہے، پھر جب ان دونوں کا آنا ممکن نہیں ہوسکا تو اس اہم کام کے لئے مولانا حسین احمد مدنیؒ کا انتخاب ہوا اور وہی تشریف لائے۔

مولانا آزادؒ نے کسی باضابطہ مدرسہ میں داخل نہ ہوکر چند ہی سال میں درس کی متداول

کتابیں پڑھ لیں، ان کی غیر معمولی ذہانت، زود فہمی اور علمی تجسس کی فطری لگن کا نتیجہ تھا کہ خود ان کے بقول اساتذہ ان کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے، انھوں نے علم کے ہر شعبہ کا دروازہ کھٹکھٹایا اور اس کا ذائقہ چکھ کر دیکھا، دینیات کے علاوہ معقولات اور قدیم منطق وفلسفہ کا بھی مطالعہ کیا، عروض اور صنف شاعری کے گلزار پُر بہار کی بھی سیر کی، موسیقی کے میکدہ بھی پہنچے اور اس کا فرادا کو بھی پہچانا، تصوف اور فلسفۂ تصوف کو بھی پڑھا، اور گو کہ طبیعت اس سے آشنا نہ ہو سکی، مگر علمی اور فکری اعتبار سے اس کے شناساؤں میں رہے۔

تفسیر اور قرآن مجید ان کی خاص جولانگاہ تھی، وہ آیات قرآنی کی تشریح، اس سے نئے نئے علمی اور سائنسی نکات کے استنباط، حالات حاضرہ کے اعتبار سے اس کی دل نشیں اور ماحول سے ہم آہنگ توضیح اور اس کے ادبی اسرار ورموز کی نقاب کشائی میں بڑا ملکہ رکھتے تھے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ وہ تاریخ عالم میں ہونے والے سیاسی اور فکری انقلابات ودواعی اور اس کے پس پردہ کارفرما قوتوں کا بہت عمدہ تجزیہ کرتے تھے اور قرآن مجید کی روشنی میں درپیش حالات پر غور کرتے تھے، تاریخ پر ان کا بہت ہمہ جہت، ہمہ گیر اور عمیق مطالعہ تھا، عام طور پر مؤرخین سیاسی انقلاب کو اپنا موضوع سخن بناتے ہیں اور یہی ان کے مطالعہ کا محور ہوتا ہے، مگر وہ مذہب، عقیدہ، فکر ونظر، اقتصادی حالات، سماجی مسائل اور ان کی عہد بہ عہد تبدیلی پر بھی نظر رکھتے تھے۔

مولانا آزاد ان تمام تاریخی ہستیوں سے ''بے تحاشا'' اور بسا اوقات ''ناقابل فہم'' حد تک عقیدت رکھتے تھے، جنھوں نے عزیمت واستقامت کا ثبوت دیا اور اپنے موقف پر اٹل اور قائم رہ کر قربانیوں اور جانبازیوں کی نازک وادیاں عبور کیں، مگر ظالم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، اس معاملہ میں ان کے یہاں مذہب، رنگ ونسل اور علاقہ ووطن کا کوئی فرق نہیں تھا، یہاں تک کہ بسا اوقات وہ تعریف کا قلم بہانے اور قصیدہ پڑھنے میں اس فرق کی بھی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے کہ سرفروشی کا یہ مظاہرہ حق کے لئے ہو رہا ہے یا باطل کی راہ میں؟

مولانا آزاد کے علمی آ ثار میں غالباً سب سے پہلی کتاب ''مسلمان عورت'' ہے، جو مصر کے مشہور مصنف فرید وجدی کی کتاب ''المرأة المسلمه '' کا ترجمہ ہے اور یہ کتاب مصر ہی کے ایک تجدد پسند مصنف کی ''المرء ة الجدیده '' کے جواب میں لکھی گئی ہے، گو فرید وجدی کی بعض آراء سے اختلاف کی پوری گنجائش موجود ہے ، مگر بڑی حد تک اس میں اسلام کی ترجمانی کی گئی ہے، مولانا آزاد نے اسی ترجمہ سے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز کیا ہے اور ترجمہ عمدہ اور سلیس ہے۔

مولانا آزاد کی تصانیف میں سب سے مشہور کتاب '' تذکرہ'' ہے ، یہ مختلف مجددین اور داعیان اُمت نیز ماہرین علوم اسلامی اور فقہاء شرع متین کے تذکرہ اور ان کے افکار و نظریات کی بابت تنقید و تبصرہ پر مشتمل ہے ، یہ کتاب زبان کے اعتبار سے مصنف کی بڑی اہم کتاب سمجھی گئی ؛ لیکن مصنف نے اس کتاب میں جن آراء اظہار کیا ہے اور اپنی جس آزادروی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی سرحدیں تجدد سے جا ملی ہیں ، علامہ ابن تیمیہؒ کی تائید میں مولانا کا قلم حد اعتدال سے آگے نکل گیا ہے ، دوسری طرف امام ابوحنیفہؒ اور بعض بزرگوں کے لئے بہتر اُسلوب اختیار نہیں کیا گیا ، کہیں کہیں تو تیز لب ولہجہ، الفاظ آرائی اور طنزیہ فقروں نے تنقید کو ''تنقیص'' کی حدوں میں داخل کر دیا ہے۔

ان کی مختصر کتابوں میں ایک 'عیدین' ہے، جو عید الفطر اور عید الاضحیٰ سے متعلق دو بلیغ اور اثر آفریں مضامین ہیں ، یہ بھی زبان کے اعتبار سے شاہکار ہونے کے ساتھ ساتھ عیدین پر بہترین علمی اور دعوتی خطبہ بھی ہے، اس کے علاوہ ولادت نبوی پر مولانا کی تحریر بھی ایک یادگار علمی سوغات ہے ، جس کی تازگی آج بھی روز اول ہی کی طرح برقرار ہے ، مولانا کے مضامین اور تقریروں کے مختلف مجموعے مختلف ناموں سے شائع ہو چکے ہیں، الہلال اور البلاغ کے منتخب مضامین کو بھی بعض اداروں نے کتابی صورت میں شائع کر دیا ہے ، جو بلا شبہ اُردو ادب اور دینیات کی بہترین کتابوں میں شمار کئے جانے کی مستحق ہیں —— مولانا آزاد نے اپنی زندگی میں الہلال، البلاغ، پیغام، پیام، الندوہ اور دوسرے رسائل میں اس قدر لکھا ہے کہ اگر ان کے

جمع کرنے اور مرتب کرنے کا اہتمام کیا جائے تو متعدد مفید اور اہم کتابیں تیار ہو جائیں گی۔

ان ہی کی ایک تصنیف ''شہید اعظم'' کے نام سے ہے، پہلی نظر میں ذہن اس طرف جاتا ہے کہ مولانا نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ لکھا ہوگا، کہ وہی سید الشہداء ہیں مگر نہیں، یہ تذکرہ سیدنا حضرت حسین رضی اللہ عنہ کا ہے، حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کے باب میں بعض شیعہ مؤرخین نے بڑے مبالغہ سے کام لیا ہے اور اکثر و بیشتر سیرت نگاروں نے زیب داستاں کے لئے ان من گھڑت کہانیاں پر رنگ چڑھانے کا فریضہ انجام دیا ہے — مولانا نے اس کتابچہ میں صحیح تاریخی روایات کی روشنی میں بالترتیب تمام واقعات جمع کئے ہیں، تحریر کی چاشنی قلم سحر رقم نے یہاں بھی دیکھائی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں اشکبار ہوئے بغیر نہ رہ پائیں اور سننے والے دل تڑپ اٹھیں!

ان کی وہ تقریر جو بحیثیت ملزم انھوں نے عدالت کے روبرو کی تھی، وہ بھی کتابی شکل میں طبع ہو چکی ہے، یہ کتاب ایک طرف ان کی شعلہ مقالی اور جولانئ خطابت کا نمونہ ہے، تو دوسری طرف ان کے عزم و استقلال، بلند حوصلگی اور عزیمت و استقامت ثبوت بھی!

مولانا کا سب سے نمایاں اور یادگار کارنامہ ان کا ''ترجمۂ قرآن'' ہے، جو ''ترجمان القرآن'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، سورۂ یوسف اور بعض اور مقامات کی مولانا نے بڑے البیلے انداز پر تفسیر کی ہے، مگر یہ ترجمہ پورا نہیں ہوسکا، جیسا کہ نام سے واضح ہے، اس میں ترجمہ کم اور ''ترجمانی'' زیادہ ہے، اہل علم اس ترجمہ میں احتیاط کی کمی محسوس کرتے ہیں، واقعہ ہے کہ قرآن مجید کی تفسیر میں ان سے بعض تقصیریں ہوئی ہیں، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

اس کے علاوہ مولانا کی اہم تصانیف میں 'اسلامی توحید اور مذاہب عالم، قانون نشو وارتقاء اور قرآن، القول الثابت، اتحاف الخلف، البرہان، الدین الخالص، الحریۃ فی الاسلام اور اصرار الاسلام، سیرت ابن تیمیہ، الدین القیم، جامع الشواہد، تاریخ اسلام اور تفسیر فی مقاصد القرآن وغیرہ ہیں، اب یہ کتابیں عام طور پر دستیاب نہیں ہیں اور کم مایہ راقم کی نظر سے گذری بھی نہیں ہیں، مگر خود مولانا آزاد نے ان کا ذکر کیا ہے اور خود ہی ان کا تعارف کرایا ہے، جو

عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف ''ذکرآزاد'' میں موجود ہے۔

ان کے علاوہ بھی سیاسی اور دینی موضوعات پر مولانا کے بعض رسائل ہیں، استفتاء اوراستفسار کے جوابات جومولانا کی طرف سے لکھے گئے ہیں، ان کوبھی ''افادات آزاد'' کے نام سے شائع کردیا گیاہے، مگراس کتاب میں جواختصار ہے، اس سے قاری کی وہ توقع پوری نہیں ہوتی ہے، جومصنف سے کی جاسکتی ہے۔

ان کی ایک اہم کتاب خودان کی املاکرائی ہوئی سوانح بھی ہے، جو'' آزاد کی کہانی، آزادکی زبانی'' کے نام سے شائع ہوئی ہے، اور بجائے خودایک دلچسپ کتاب ہے، ہندوستان کے بعض مکتبوں نے ''صدائے حق'' اور''صبح اُمید'' کے نام سے ان کی تقریروں اورمنتخب مضامین کا مجموعہ بھی شائع کیا تھا، جو چندسال پہلے راقم کی نظر سے گذرا تھا۔

❁ ❁ ❁

آہ! مولانا عبدالماجد دریابادیؒ ✿

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

''آمد ورفت'' تو اس دنیائے فانی کی فطرت ہے، یہاں جو بھی آیا ہے، جانے ہی کے لئے آیا ہے، ہر آمد روانگی کا اور ہر زندگی موت کا پیش خیمہ ہے؛ لیکن بعض ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جن کی موت ایک نفس اور ایک ذات سے آگے بڑھ کر ایک ''عالَم'' کے لئے موت بن جاتی ہے، اس کی موت سے علم وفن کے چراغ بجھ جاتے ہیں، فکر وآگہی کے سوتے خشک ہوجاتے ہیں اور ایمان ویقین کی محفلیں ویران ہوجاتی ہیں؛ چنانچہ چند روز ہوئے کہ ہند وپاک کی ایک عظیم شخصیت جس سے علم وفن کی ایک تاریخ وابستہ تھی، جس کے ایمان کی حرارت سے بہتوں کو ایمان، جس کے فکر ونظر کے چراغ سے بہتوں کو روشنی، جس کے ہدایت وارشاد سے بہتوں کو راہِ مستقیم اور جس کے قلم سحر طراز سے بہتوں کو قلم پکڑنے کا سلیقہ حاصل ہوا تھا، وہ ہمیں داغ مفارقت دے گئی ، میری مراد مفسر قرآن اور ممتاز صاحب طرز انشاء پرداز مولانا عبدالماجد دریا بادیؒ (مدیر صدق جدید) سے ہے، وہ اس قافلہ کے آخری مسافر تھے، جس کے علم وفن، وسعت نگاہ اور ادب وانشاء نے ہندوستان سے لے کر عالم اسلام اور عالم مغرب تک علماء ہند کے فضل وکمال کا سکہ بیٹھا دیا تھا۔

مولانا مرحوم کا وطن بارہ بنکی کا ایک مشہور قصبہ دریاباد ہے، ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے ، ذکاوت وذہانت بچپن ہی سے پائی تھی، ۱۹۱۸ء میں کیننگ کالج سے (بی،اے) کی ڈگری حاصل

✿ مولانا دریابادی کی وفات کے موقع پر ہفت روزہ نقیب پھلواری شریف پٹنہ کے لئے لکھی گئی تحریر، جو اس حقیر کے لوح وقلم کی دنیا میں قدم رکھنے کے ابتدائی زمانہ کی تحریر ہے۔

کی ، یہ وہ دور تھا کہ کسی ہندوستانی کا کوئی بڑی ڈگری حاصل کرلینا ایک اہم واقعہ سمجھا جاتا تھا، تصنیفی اورادبی ذوق ابتدا ہی سے تھا؛ چنانچہ صرف ۲۱ سال کی عمر میں نفسیات پر ان کی مشہور کتاب ''نفسیاتِ جذبات'' شائع ہوئی، جوایک مغربی مصنف کی انگریزی کتاب کا ترجمہ ہے اور پھر تو ان کی بیسیوں تصنیفات منظر عام پر آتی رہیں اورلوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے رہے، کچھ دنوں حیدرآباد میں دارالترجمہ میں رہ کربھی اسی نوعیت کا کام کرتے رہے۔

مولانا کی فکری زندگی کو ہم دوحصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں، ایک حصہ وہ ہے جب وہ مولانا تھانویؒ کے دامن تربیت سے وابستہ نہ ہوئے تھے،اس وقت ان پر فلسفہ کا غلبہ تھااور وہ الحاد ودہریت کے شکار تھے،ان کی طباعی اورذکاوت کو یہ گوارانہ تھا کہ وہ کسی کے سامنے جھکیں، وہ اسلام پر برجستہ اعتراضات کرتے تھے،انھوں نے بعض ایسی کتابیں بھی لکھیں،جس میں اسلام پراعتراضات تھے،اس وقت کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اسلام پراعتراض کرنے والا ''عبدالماجدؒ'' کبھی ایسا بدلے گا کہ اس کاقلم اسلام کی پاسبانی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا اورالحاد ودہریت کے علمبرداراس کے مقابلہ سے عاجز ہوں گے۔

غالباًاس میں بھی اللہ تعالیٰ کی کوئی حکمت ہے کہ وہ بعض شخصیات سے جب اپنے دین متین کی کوئی اہم خدمت لینا چاہتا ہےتو پہلے اس کوشکوک وشبہات اورگمراہی کی تاریکیوں میں میں بھٹکنے دیتا ہےاوجب دنیاوالوں پراس کی خدابیزاری واضح ہوجاتی ہےتو پھراسی کو''حق کا حامی'' اورمددگار بنا کرکھڑا کردیتا ہے،تا کہ دنیاوالے دیکھ لیں کہ اگروہ چاہےتو بت فروشوں میں بت شکن پیدا کرسکتا ہے،اس کے حکم سے عمرؓ جیسا''**متصلب فی الکفر**''فاروق اعظمؓ ہوسکتا ہےاوراس کے اشارے سے''کعبۂ توحید'' کوصنم خانوں سے بھی پاسبان مل جاتے ہیں۔

دوسرا دور وہ ہے جب وہ مئے خانۂ اشرفی کے بادہ خواروں میں شامل ہوچکے تھے، مولانا کا حضرت تھانویؒ سے تعلق ہوااور دل ودماغ کی حالت ہی بدل گئی، اب ہمہ دانی کا ادعاء کافور ہوگیا، اتراتا ہوا سرجھک گیا اورقرآن مجید کی تفسیر لکھنی شروع کردی اورایسی سچی

اور پکی توبہ کی، جسے واقعی ''توبۃ النصوح'' کہا جائے، اس دوسرے عہد میں وہ برابر فرمایا کرتے تھے کہ ''اب ہمیں اپنی اُن ملحدانہ کتابوں پر شرم محسوس ہوتی ہے''۔

وہ یورپ کی خدا بیزار تہذیب سے نالاں تھے، ان کو اس سے بڑا دکھ ہوتا تھا کہ نئی نسل اور قوم کی نئی پود اسی خدا دشمن اور حیا سوز تمدن سے مرعوب ہے؛ اس لئے تا موت وہ مغربیت کے خلاف علم جہاد بلند کرتے رہے، غالباً ''سچ'' اور ''صدق'' کا کوئی شمارہ ایسا نہ ہوتا تھا کہ جس میں کچھ نہ کچھ اس نوع کی باتیں نہ کہی گئی ہوں، وہ صرف ایک دو فقروں میں انتہائی ایجاز اور لطیف طنز کے ساتھ وہ سب کچھ کہہ جاتے تھے، جس کے لئے دوسرے اہل قلم طویل مضامین لکھ جاتے ہیں۔

یوں تو مستشرقین کے اعتراضات کا جواب دوسرے علماء نے بھی دیا ہے؛ لیکن مولانا مرحوم کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ اس میدان میں محض ''دفاع'' کی صورت اختیار نہ کرتے تھے؛ بلکہ خود ان کے افکار اور طرز معاشرت پر تنقید کرتے تھے، ان کا انداز اس پسپا اور شکست خوردہ سپاہی کا نہ تھا، جو اپنی کمزوری کا احساس کرتے ہوئے دوسروں پر حملہ کی جرأت نہیں کرتا اور صرف جانبری کے لئے دفاع کرتا رہتا ہے؛ بلکہ ان کو اسلامی تعلیمات اور اسلام کے تمدنی اور فکری نظام پر بھرپور یقین تھا اور وہ ایک ایسے سپاہی کی طرح — جس کو اپنی قوت، اپنے مقصد کی صحت و درستگی اور اپنے عزائم کی پاکیزگی پر پورا اعتماد ہو — مقابلہ کرتے تھے، ان کو اس میدان میں شہسواری کا حق اس لئے بھی تھا کہ وہ براہ راست ان کے افکار سے آگاہ تھے۔

اگر اس نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، مولانا کی تفسیر ''تفسیر ماجدی'' ایک انفرادیت کی حامل ہے، آپ نے اس میں ایک باخبر، زمانہ آگاہ اور مغرب کے راز دروں سے واقف شخص کی حیثیت سے ان کے افکار اور تہذیبی اقدار پر نقد کیا ہے، تفسیر ماجدی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بائبل پر مولانا کی وسیع نظر تھی، حضرت مسیح کے ان کے حواریوں پر مشتبہ ہو جانے اور یہودیوں کے حضرت عُزیز کو خدا کہنے کے سلسلہ میں آپ نے جو دل لگی تشریح کی ہے، وہ شاید اپنی مثال آپ ہے، مولانا کی یہ تفسیر گہری فکر اور وسیع مطالعہ پر مبنی ہے، آپ نے طویل

عربی عبارتوں سے اپنی کتاب کو بوجھل بھی نہیں بنایا ہے اور مختصر اقتباس مع حوالہ نقل کرکے کتاب کے استناد واعتبار کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا ہے، ترجمہ میں بھی آپ نے بڑی دقت نظر سے کام لیا ہے اور اپنے شیخ ومرشد حضرت تھانویؒ سے بھی خوب استفادہ کیا ہے؛ البتہ غالباً ترجمہ میں بے حد احتیاط کا اثر ہے کہ ترجمہ میں وہ روانی اور سلاست محسوس نہیں ہوتی ، جو آپ کی دوسری تالیفات میں ہے اور جس کی قاری آپ سے توقع رکھتا ہے۔

مولانا کی ایک خصوصیت، علمی اعتبار سے ان کی جامعیت ہے، انھوں نے اکثر موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے، قرآن مجید اور سیرت نبوی وہ موضوعات ہیں، جن سے انھیں والہانہ عشق تھا، تفسیر ماجدی کے علاوہ ''ارض القرآن ، اعلام القرآن ، حیوانات القرآن ، مشکلات القرآن ، قصص ومسائل اور سیرت نبوی—قرآن کی روشنی میں'' قرآنیات پر اہم تالیفات ہیں، سیرت نبوی پر ذکر رسول، آپ کے متفرق مضامین کا مجموعہ ہے، مختصر لیکن دلوں کو لبھانے اور اصحابِ ذوق کے کانوں کو بھانے والا ہر ہر فقرے سے رسول اللہ ﷺ کی محبت عیاں ہے اور ہر ہر سطر مصنف کے عشق وکیف کا بیاں ہے، بشریت رسول پر ''بشریت انبیاء'' کے نام سے آپ کی ایک چشم کشا تالیف ہے۔

ادب کی دنیا میں آپ اتنا ہی معروف تھے، جتنا مذہب کی دنیا میں، صاحب طرز انشاء پرداز اور منفرد سخن طراز تسلیم کئے گئے، ''انشائے ماجد، مقالاتِ ماجد، اقبالیات ماجد، تبصراتِ ماجدی اور اکبر نامہ'' ادب وتنقید کے باب میں آپ کی اہم تحریروں کا مجموعہ ہے، ہر مضمون ایک سے ایک، سنئے اور سر دھنئے، پڑھئے اور تحسین وآفریں کے کلمات کہئے، شخصیات پر لکھنے کا آپ کو خاص سلیقہ تھا، جو بات کہنے کے لئے لوگ کئی کئی صفحات لکھ جاتے ہیں، مولانا سطر دوسطر میں اسے سمود یتے ہیں۔

وفیات ماجدی اور چند سوانحی تحریریں، شخصیات پر آپ کے مضامین کے خوبصورت مجموعے ہیں، مولانا نے بہت لکھا اور بہتوں پر لکھا؛ لیکن چار شخصیتیں وہ ہیں، جو غالباً ان کو سب

سے زیادہ محبوب تھیں، علم و تحقیق اور ادب کے میدان میں علامہ سید سلیمان ندوی، مذہب اور تصوف میں مولانا اشرف علی تھانویؒ، ملی قیادت کے شعبہ میں مولانا محمد علی جوہر اور شعر وسخن میں اکبر آلہ آبادی، آپ نے سید صاحب کے مکتوبات کو جمع فرمایا اور 'حیات سلیمان' جن دو بزرگوں کی تحریک پر مرتب ہوئی، ان میں ایک آپ بھی ہیں، مولانا تھانوی پر ''حکیم الامت — نقوش وتاثرات'' تالیف کی، مولانا محمد علی جوہر پر ''محمد علی — ذاتی ڈائری'' اور اکبر آلہ آبادی پر ''اکبر نامہ'' تالیف فرمایا، مولانا نے اپنے ممدوحین کے محاسن کو بڑی خوش اُسلوبی سے پیش کیا ہے؛ لیکن اس میں بھی غلو اور مبالغہ نہیں، مثلاً مولانا نے اپنی تفسیر میں حضرت تھانوی سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے؛ لیکن یہ بھی لکھتے ہیں :

> کسی بزرگ کو بزرگ معظم ماننے سے یہ ہرگز لازم نہیں آتا کہ اس کی ساری ہی باتیں دل میں اُتر جائیں اور اس کا ایک ایک جزئیہ واجب التسلیم ہوجائے، کم از کم اپنا عقیدہ تو یہی ہے کہ اطاعت مطلق وغیر مشروط صرف رسول اللہ ﷺ معصوم کا حق خصوصی ہے۔
>
> (مولانا عبدالماجد دریابادی — حیات وخدمات: ۱۱۵)

ادب کا ایک اہم موضوع آپ بیتی ہے، آپ بیتی جگ بیتی سے زیادہ خوبصورت ہوتی ہے؛ کیوں اس میں مصنف کے اپنے جذبات شامل ہوتے ہیں، مولانا کی آپ بیتی، آپ بیتیوں کے درمیان امتیازی حیثیت کی حامل ہے، پڑھتے جایئے اور پیاس بڑھتی جائے، ایسا لگتا ہے، جیسے مصنف کی بیان کی ہوئی کیفیات خود قاری پر بیت رہی ہیں اور اس کے ذکر کئے ہوئے احوال پڑھے نہیں جارہے؛ بلکہ دیکھے جارہے ہیں — آپ بیتی ہی کا ایک حصہ انسان کے سفرنامے بھی ہوتے ہیں، آپ کے سفرناموں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں، گیارہ سفر، ڈھائی ہفتے پاکستان میں، تاثرات دکن، ایک ایمان افروز سفرنامہ، سفرحجاز، یہ ایسا سفرنامہ ہے، جس سے مصنف کے عہد کے حرمین شریفین اور حجاز کے راستوں، گلیوں اور کوچوں، پہاڑوں

اور ریگستانوں کی گویا قلمی تصویر سامنے آجاتی ہے اور اسے پڑھ کر سفر سعادت کے شوق کی آگ سلگ اُٹھتی ہے۔

مولانا کے مکتوبات ، جس کی ایک جلد رقعات ماجدی کے نام سے اور کئی جلدیں مکتوبات ماجدی کے نام سے شائع ہوچکی ہیں، خطوط کے ادب کا بہترین نمونہ ہیں، اسی طرح دو حصوں میں نشریات ماجد جو آپ کی ریڈیائی تقریریں ہیں، معنویت کے اعتبار سے اور زبان وادب کے لحاظ سے بھی اصحابِ ذوق کے لئے آنکھوں کا سرمہ ہیں، شعر وسخن کا بھی بڑا اعلیٰ ذوق پایا تھا اور علامہ سید سلیمان ندوی جیسے سخن ور اور سخن شناس نے آپ کے اشعار کی داد دی تھی، 'تغزل ماجدی' کے نام سے آپ کے اشعار اور زود پشیماں کے عنوان سے ڈرامہ آپ کی ادبی یادگاروں میں ہیں۔

آپ کا اصل موضوع فلسفہ اور نفسیات تھا اور جب تک مذہب کے کوچہ سے ناآشنا رہے، فلسفہ کی پرخار وادی میں گھومتے رہے؛ چنانچہ فلسفہ ونفسیات پر آپ کی متعدد کتابیں اس دور میں شائع ہوکر مقبول ہوئیں، جن میں فلسفۂ جذبات اور مبادی فلسفہ کو زیادہ شہرت حاصل ہوئی، عربی اور انگریزی کتابوں کے ترجمے کے سلسلہ میں بھی آپ کی بڑی قابل قدر کاوشیں ہیں، اس سلسلہ میں نظام حیدرآباد کی دعوت پر حیدرآباد میں بھی آپ کا قیام ہوا، ان ترجموں میں تاریخ اخلاق یورپ ، مکالمات برکلے اور فیہ مافیہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، ان کے علاوہ تصوف اور اصلاحی نقطۂ نظر سے آپ کی متعدد تالیفات شائع ہوچکی ہیں ، جو بڑی عبرت خیز اور موعظت انگیز ہیں۔

مولانا کا ایک امتیازی وصف دینی حمیت اور ملی غیرت ہے، اسی جذبہ نے ان کے قلم کو مغرب کے خلاف شمشیر بے نیام بنادیا تھا، سیاسی بے راہ روی ہو یا علمی وفکری گمراہی، ممکن نہیں تھا کہ آپ کی زبان حق ترجمان اس پر خاموش رہ جائے ؛ اسی لئے بہت سے معاصر قائدین، علماء اور دانشوروں سے آپ کا اختلاف رہا اور آپ نے اس اختلاف کو اپنے خیال میں اُمت

کی اصلاح کے لئے صیغۂ راز بنانے سے بھی گریز کیا، ڈنکے کی چوٹ پر کہنے کا یہ وہ مزاج تھا، جو نہ صرف مذہب کی دنیا میں ؛ بلکہ زبان وادب کی بارگاہ میں بھی اس بات کے کہنے پر آپ کو کمر بستہ رکھتا تھا، جس کو آپ حق اور درست سمجھتے تھے۔

سب سے بڑا معرکہ آپ کا نیاز فتح پوری کے ساتھ رہا، نیاز اپنی سحر طراز زبان کی وجہ سے اُردو دنیا پر چھائے ہوئے تھے اور ان کا پرچہ ''نگار'' عاشقانِ ادب کا نگار بنا ہوا تھا؛ لیکن انھوں نے اس مقبولیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے مذہب کو اپنا موضوع بنالیا اور الحاد و دہریت کے ترجمان ونقیب بن گئے، یہ بات برصغیر کے پورے مذہبی حلقہ اور ملت اسلامیہ کے لئے باعث تشویش تھی ، اس وقت جو لوگ اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑے ہوئے ، ان میں سرفہرست آپ کا اسم گرامی آتا ہے، آپ نے اس فتنہ کا بھر پور تعاقب کیا اور اسکو انجام تک پہنچایا۔

ایک بات آپ کے مداحوں کو بجا طور پر گراں گذرتی تھی کہ اس حمیت ایمانی اور غیرت ملی کے باوصف مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کے متبعین کے بارے میں نرم پہلو رکھتے تھے، خاص کر لاہوری فرقہ کے بارے میں جس کے بانی احمد علی لاہوری تھے، آپ انھیں کافر کہنے کے روادار نہیں تھے، قادیانی حضرات آج بھی آپ کی بعض تحریروں کو دلیل کے طور پر چھاپتے رہتے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ مولانا کو مرزا صاحب کی کتابوں اور ان کے متبعین کے لٹریچر کو پڑھنے کا کما حقہ موقع نہیں ملا، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قادیانیت اپنی روح کے اعتبار سے محمد رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور آپ کے لائے ہوئے دین کے خلاف علم بغاوت ہے، یہ بھی خیال ہوتا ہے کہ احمد علی لاہوری کی تفسیر سے تاثر کی وجہ سے ان کے باطل افکار کی طرف آپ کی توجہ نہیں ہوسکی؛ حالاں کہ خوب صورت اور خوشنما سانپ ہی کے منھ میں زہر کی تھیلی بھی ہوتی ہے، ویسے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بیان کے مطابق اپنی وفات سے تین چار سال پہلے مولانا نے اس سے رُجوع کرلیا تھا اور مولانا ندوی سے بڑھ کر مستند بیان کس کا ہوسکتا ہے؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا دریابادی ان بالغۂ روزگار اور عبقری ہستیوں میں تھے، جن کی مثال کم مل سکے گی، جو واقعی جدید وقدیم کا حسین امتزاج تھے، جو مذہب اور ادب دونوں ایوانوں کے تاج ور تھے، جو دین حق کے سپاہی اور فکر اسلامی کے مرد مجاہد تھے، جن کی تحریریں اپنی سلاست و روانی، خوش اُسلوبی و دل آویزی اور خوبصورتی و رعنائی کی وجہ سے صدیوں پڑھی جائیں گی اور اُردو دنیا سے خراج تحسین حاصل کریں گی، وہ ۱۶/ مارچ ۱۸۹۲ء کو دریاباد ضلع بارہ بنکی کے ایک قدوائی گھرانے میں پیدا ہوئے، ۱۹۱۲ء میں لکھنؤ سے بی اے کیا، ایم اے میں داخلہ لیا؛ لیکن والد کی وفات کی وجہ سے تعلیم مکمل نہیں کرسکے، ۱۹۱۳ء میں پہلی انگریزی کتاب ''سائیکلوجی آف لیڈرشپ'' لندن سے شائع ہوئی، ۱۹۱۸ء میں اسلام کی طرف واپسی ہوئی اور ۶/ جنوری ۱۹۷۷ء کو وفات ہوئی، ۱۹۲۵ء میں آپ نے ہفتہ وار ''سچ'' نکالا، اس کے بند ہونے پر آپ نے ''صدق'' اور اس کے بند ہوجانے پر ''صدقِ جدید'' نکالا، یہ جرائد مدتوں پورے برصغیر میں سچائیوں کی روشنی بکھیرتے رہے، اکیڈمیوں نے اعزازات سے اور یونیورسٹیوں نے اعزازی ڈگریوں سے نوازا؛ لیکن سچائی یہ ہے کہ ان اعزازات نے ان اداروں کو اعزاز بخشا نہ کہ آپ کو، کہ آپ کی شخصیت ان اعزازات واعترافات سے ماورا تھی۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحبؒ

ڈھونڈو گے ہمیں ملکوں ملکوں
ملنے کو نہیں ، نایاب ہیں ہم

کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جو بنی بنائی شاہراہ پر چلتے ہیں اور کچھ وہ حوصلہ منداشخاص ہوتے ہیں، جو آپ اپنی راہ تراشا کرتے ہیں اور اگر کسی بنی ہوئی سڑک پر اپنا سفر طے کرتے ہیں ،تو ایک ایک قدم بصیرت کے ساتھ اٹھاتے ہیں ، وہ یافت پر قناعت نہیں کرتے ؛ بلکہ دریافت کے خوگر ہوتے ہیں، ڈاکٹر محمد حمید اللہ ایسے ہی حوصلہ مند لوگوں میں سے تھے، وہ بحرعلم کے نکالے ہوئے لعل وگہر پر اکتفاء کرنے والے نہیں تھے؛ بلکہ وہ خود غواص تھے اور سمندرعلم کی تہوں سے خود گوہر آبدار تلاش کر کے لایا کرتے تھے، وہ شہد کے کھانے پر قانع نہیں تھے؛ بلکہ خود علم وتحقیق کے غنچۂ وگل کا عطر کشید کر کے دوسروں تک پہنچاتے تھے، جو لوگ تقلیدی ذہن کے حامل ہوتے ہیں، ان کے لئے علمی سفر آسان ہوتا ہے؛ لیکن جو لوگ ایجادی واجتہادی سوچ کے حامل ہوتے ہیں، انھیں اس راہ میں آبلہ پائی وصحرا نوردی کرنی پڑتی ہے، وہ دوسروں کی راہ سے الگ ہوتے ہیں ؛ اسی لئے ان کے کچھ تفردات بھی ہوتے ہیں ، یہ تفردات ان کی علمی کد وکاوش اور امانت دارانہ تحقیق کی دلیل تو ہوتے ہیں ؛ لیکن ان سے اتفاق ضروری نہیں ہوتا۔

اس پس منظر میں عرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب اپنے عہد کے بلند پایہ محقق تھے، ان کی شخصیت میں تحقیق اور دعوت دو ایسی جہتیں جمع ہوگئی تھیں، جو کم ایک ساتھ اکٹھا ہو پاتی ہیں، ان کے جذبۂ تحقیق اور اس سلسلہ میں غیر معمولی جد وجہد کی مشرق ومغرب ــ وں نے داد دی ہے؛ لیکن ان کے بیشتر مداحوں کو ان کی بعض آراء سے اختلاف بھی ہے، اور ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کسی شخصیت کے احترام وتحقیر وتوقیر کے مغائر نہیں ہے، یہاں ڈاکٹر صاحب کے ایسے چند

تفردات کا ذکر کیا جاتا ہے، جن میں سے بعض اس حقیر کے نزدیک قابل قبول ہیں، بعض قابل غور اور بعض نا قابل قبول۔

۱- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ ۔ (الشعراء:۱۹۶)

ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اس سے وہ کتاب مراد ہے، جسے ہندو ''پُران'' سے تعبیر کرتے ہیں اور یہ وہی لفظ ہے جسے اُردو میں پرانا کہا جاتا ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> ہندوستان میں بھی کچھ دینی کتابیں پائی جاتی ہیں اور ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے الہام شدہ کتابیں ہیں، ان مقدس کتابوں میں وید، پران، اپنشد اور دوسری کتابیں شامل ہیں، یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ سب کتابیں ایک ہی نبی پر نازل ہوئی ہیں، ممکن ہے متعدد نبیوں پر نازل ہوئی ہوں، بشرطیکہ وہ نبی ہوں، ان میں بھی خصوصاً ''پران'' نامی کتابوں میں کچھ دلچسپ اشارے ملتے ہیں، ''پران'' وہی لفظ ہے، جو اُردو میں پرانا یعنی قدیم ہے، اس کی طرف ہمیں قرآن مجید میں ایک عجیب وغریب اشارہ ملتا ہے، وَإِنَّهُ لَفِي زُبُرِ الْأَوَّلِينَ (الشعراء:۱۹۶) (اس چیز کا پرانے لوگوں کی کتابوں میں ذکر ہے)، میں نہیں جانتا کہ اس کا پران سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ بہر حال دس پران ہیں، ان میں سے ایک میں یہ ذکر آیا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک شخص ریگستان کے علاقہ سے پیدا ہوگا، اس کی ماں کا نام قابل اعتماد اور باپ کا نام اللہ کا غلام ہوگا، وہ اپنے وطن سے شمال کی طرف جا کر بسنے پر مجبور ہوگا اور پھر وہ اپنے وطن کو متعدد بار دس ہزار (یہ ایک عدد ہے جس کا اُردو میں مترادف نہیں، بہر حال ''متعدد بار دس ہزار'' کا اشارہ شاید حجۃ الوداع کی طرف ہو، نہ کہ فتح مکہ کی طرف)، آدمیوں کی مدد سے فتح کرے گا، جنگ میں اس کی رتھ کو

اونٹ کھینچیں گے اور وہ اونٹ اس قدر تیز رفتار ہوں گے کہ آسمان تک پہنچ جائیں گے، (یہ شاید معراج کی طرف اشارہ ہے) اس کتاب میں جو مذکورہ الفاظ ہمیں ملتے ہیں، ان سے ممکن ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ مستنبط کیا جا سکے۔ (خطبات بھاولپور: ۳، فقرہ: ۳)

ڈاکٹر صاحب نے 'پُر ان' کے الہامی ہونے کا امکان ظاہر کیا ہے؛ لیکن بعض حضرات نے اس امکان کو یقین تک پہنچا دیا ہے اور ہندوؤں کو اہل کتاب میں شمار کیا ہے، یہ بات محل نظر ہے، کسی گروہ کو اہل کتاب قرار دینے سے دوسرے احکام بھی متعلق ہیں، جیسے اہل کتاب کی خواتین سے نکاح کا جائز ہونا، ان کے ذبیحہ کا حلال ہونا اور یہ احکام حلال وحرام سے متعلق ہیں، جن میں احتیاط کے پہلو کو اختیار کیا جاتا ہے؛ البتہ ڈاکٹر صاحب کی یہ تحقیق بہر حال غور وفکر کا میدان فراہم کرتی ہے اور ضرورت ہے کہ ادیان و مذاہب کے تقابلی مطالعہ کا ذوق رکھنے والے حضرات اس موضوع پر توجہ کریں، دعوتی نقطۂ نظر سے بھی انشاء اللہ یہ ایک اہم خدمت ہوگی۔

۲- بائبل میں اس وقت زبور (Psarm) کے نام سے جو صحیفہ ملتا ہے، اس میں صرف خدا کی حمد وثناء ملتی ہے، اس ذیل میں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :

اس میں صرف خدا کی حمد وثناء کی نظمیں ہیں، کوئی نیا حکم نہیں ہے، ہمارا یہ تصور ہے کہ ہر رسول یا نبی ایک نئی شریعت لاتا ہے؛ لیکن اس کتاب میں ایسی کوئی نئی شریعت نہیں ملتی۔ (خطبات بھاولپور: ۶، فقرہ: ۵)

ڈاکٹر صاحب کا یہ نقطۂ نظر جمہور کی رائے سے مختلف ہے، جمہور نے رسول اور نبی میں فرق کیا ہے، کہ رسول نئی شریعت کا حامل ہوتا ہے اور نبی سابقہ شریعت کا متبع، خود بائبل کے عہد جدید میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ ارشاد ملتا ہے کہ وہ تورات کا ایک نقطہ بھی اپنی جگہ سے ہٹانے کے لئے نہیں آئے، اس سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نبی تھے؛ لیکن نئی شریعت کے حامل نہیں تھے۔

۳- بخاری شریف میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جب پہلی وحی

نازل ہوئی تو حضرت خدیجہ انھیں حضرت ورقہ بن نوفل رضی اللہ عنہ کے پاس لے گئیں، ورقہ بن نوفل نے آپ کے حالات سن کر کہے کہ یہ وہی ناموس ہے، جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ نے اُتارا تھا، **ھذا الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ** (بخاری:۳)، عام طور پر شارحین نے یہاں 'ناموس' سے فرشتہ یعنی حضرت جبرئیل کو مراد لیا ہے، علماء لغت کا کہنا ہے کہ ناموس اور جاسوس دو قریبی الفاظ ہیں، دونوں کے معنی رازدار کے ہیں، شر کے ارادہ سے راز سے آگاہ ہونے والے کو جاسوس اور خیر کے ارادہ سے ہم راز ہونے والے کو ناموس کہتے ہیں، اسی لئے شارحین حدیث نے ناموس سے حضرت جبرئیل کو مراد لیا ہے، **والمراد بناموس موسیٰ ھنا جبرئیل علیہ السلام** (فتح الباری:۲۶/۱، ط: دارالمعرفۃ)، ڈاکٹر صاحب کی رائے ہے کہ اصل میں یہ ''نوموس'' (Nomos) ہے، جو یونانی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی قانون کے آتے ہیں اور تورات کے معنی بھی قانون کے ہیں، پس یہاں ناموس سے تورات مراد ہے، کہ قرآن مجید تورات کے مشابہ ہے۔ (دیکھئے: خطبات بھاولپور:۱۱، فقرہ:۱۰)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تشریح بڑی حد تک دل کو لگتی ہے؛ کیوں کہ ایک نئی شریعت کے حامل ہونے کی حیثیت سے آپ کی نبوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے اور آپ پر نازل ہونے والی کتاب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب کے زیادہ مشابہ ہے، اسی لئے قرآن مجید نے ایک موقع پر آپ کی نبوت کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کے مشابہ قرار دیا ہے۔

۴- اجماع کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ یہ ایسا قیاس واجتہاد ہے، جس پر اس زمانہ کے تمام علماء متفق ہوجاتے ہیں؛ چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> قیاس اور اجماع عملاً ایک ہی چیز ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ اجتہاد ایک آدمی کی رائے ہوتی ہے، اور اجماع وہ ہے جس پر سارے فقیہ اور قانون کے ماہرین متفق ہوجائیں۔ (خطبات بھاولپور:۱۸۶)

ڈاکٹر صاحب کی یہ بات جزوی طور پر درست کہی جاسکتی ہے، قیاس کے لئے علت کا

وجود ضروری ہے؛ لیکن اجماع کے لئے یہ ضروری نہیں، مثلاً قرآن کی کوئی نص ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال رکھتی ہے، اوران میں سے ایک معنی پر تمام فقہاء متفق ہوجائیں، یہ بھی اجماع ہے، کوئی حدیث خبر واحد کے درجہ کی ہو، یا اہل فن کے نزدیک متکلم فیہ ہو؛ لیکن فقہا نے بالاتفاق اسے قبول کرلیا ہو، جیسے حدیث: ''لاوصیة لوارث ''تو یہ بھی اجماع ہے، بعض دفعہ کوئی حکم محض اُمت کی مصلحت اور سہولت کے لئے متفق علیہ بن جاتا ہے، یا اس میں عرف وعادت کی رعایت مقصود ہوتی ہے، یہ صورت بھی اجماع کی ہے؛ حالاں کہ ان صورتوں میں کسی متعینہ علت کا پایا جانا ضروری نہیں ہے؛ البتہ یہ درست ہے کہ بعض دفعہ قیاس کی بنیاد پر اجماع وجود میں آتا ہے، اسی لئے علماءِ اُصول نے اجماع کے لئے 'سند اجماع' کو ضروری قرار دیا ہے اور یہ سند کبھی نص ہوتی ہے کبھی قیاس اور کبھی مصلحت؛ لہٰذا اجماع عام ہے اور قیاس اس کے مقابلہ میں خاص ہے۔

۵- کیا ایک اجماع دوسرے اجماع کو منسوخ کرسکتا ہے؟ یعنی ایک زمانہ میں کسی بات پر اتفاق ہوجائے اور بعد میں اس کے خلاف امر پر لوگ متفق ہوجائیں تو کیا یہ دوسرا اجماع پہلے اجماع کو کالعدم کردے گا؟ —— اس سلسلہ میں علماءِ اُصول کے درمیان اختلافِ رائے رہا ہے، جمہور کی رائے یہ ہے کہ اجماع سے جو حکم ثابت ہو، وہ دلیل قطعی کے حکم میں ہے، اس لئے بعد کا اجماع پہلے کے اجماع کو منسوخ نہیں کرسکتا؛ لیکن ڈاکٹر صاحب اس نقطۂ نظر کے حامل ہیں کہ بعد کے دور کا اجماع بلاتفریق قدیم اجماع کو ختم کردے گا؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

> فرض کیجئے، ایک چیز پر اجماع پایا جاتا ہے، اجماع کے سامنے ہم سرِ تسلیم خم کرتے ہیں، مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ قیامت تک کوئی شخص اس کے خلاف زبان نہ کھولے، اگر کوئی شخص جرأت کرکے ادب کے ساتھ دلیلوں کے ساتھ اس کے خلاف اپنی رائے پیش کرے اور پھر اس نئی رائے کو دوسرے فقہاء بھی قبول کریں، تو ایک نیا اجماع ہوجاتا ہے، یہ نیا اجماع پرانے اجماع کو منسوخ کردیتا ہے۔ (خطبات بہاولپور : ۱۴۵)

ڈاکٹر صاحب اپنی رائے میں منفرد نہیں ہیں، بعض فقہاءِ متقدمین بھی اس نقطۂ نظر کے

حامل رہے ہیں ؛ لیکن جمہور کا نقطۂ نظر اس سے مختلف ہے ؛ کیوں کہ کسی رائے پر اجماع، کسی قوی دلیل شرعی کے بغیر نہیں ہوتا، اجماعی مسائل زیادہ تر وہ ہیں، جن پر عہد صحابہ میں اتفاق رائے ہوا ہے، اور صحابہ کے بارے میں خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صحیح راہ وہ ہے، جس کو میں نے اور میرے صحابہ ﷡ نے اختیار کیا ہے، **ما أنا علیه و أصحابی** آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ میرا اور میرے ہدایت یافتہ جانشینوں کا طریقہ اختیار کرو، **علیکم بسنتی و سنة الخلفاء الراشدین**، غالباً یہاں خلفاء راشدین سے صرف خلفاء اربعہ مراد نہیں ہیں؛ کیوں کہ خلیفہ کی اصطلاح تو رسول اللہ ﷺ کے بعد شروع ہوئی ہے، یہاں خلفاء راشدین سے پوری جماعت صحابہ ﷡ مراد ہے، ایسی صورت میں اُمت میں بعد میں آنے والے لوگوں کی رائے کو صحابہ ﷡ کی متفق علیہ رائے پر ترجیح دینا سمجھ میں نہیں آتا۔

دوسرے یہ ایک حقیقت ہے کہ فقہ اسلامی کی تدوین اور اجتہاد و استنباط کا سارا کام حکومتوں کے اثر اور دباؤ سے آزاد ہو کر کیا گیا ہے اور اسی لئے محدثین وفقہاء عام طور پر حکومتوں کے مطعون رہا کئے ہیں، اب اگر بعد میں آنے والوں کے لئے پچھلے لوگوں کے اجماع کو کالعدم کر دینے کی گنجائش ہو تو اس دور ہویٰ وہوس میں اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ حکومتوں کے زیر اثر مفتی حضرات فتوے دیا کریں گے، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دباؤ اور تحریص کے تحت دیئے جانے والے ان فتاویٰ کی اس طرح تشہیر کی جائے گی کہ گویا پوری دنیا کے اہل علم اس پر متفق ہو چکے ہیں اور کسی قابل ذکر فقیہ کی رائے اس سے مختلف نہیں ہے، اس طرح دین کو بازیچہ اطفال بنانے کی کوشش کی جائے گی، اس لئے صحیح اور محفوظ رائے وہی ہے، جو جمہور کی ہے کہ بعد کا اجماع پہلے اجماع کے لئے ناسخ نہیں ہوسکتا۔

۶- ڈاکٹر صاحب نے اس دور میں اجماع کی تشکیل کی بات لکھی ہے، کہ ہر ملک میں فقہاء کی ایک انجمن قائم کی جائے اور اس کا ایک صدر مرکز ہو، پھر اس کے تحت ہر علاقہ میں ذیلی مراکز قائم ہوں، اس طرح جو نئے مسائل پیدا ہوں، اس کے بارے میں سوال پوری دنیا میں بھیجا جائے، اگر ان کے جواب میں اتفاق ہو تو اسے اجماع سمجھا جائے

اور اختلاف ہوتو آراء اور دلائل دوبارہ ؎ ـوں کو بھیجا جائے ، پھر ان حضرات کا جواب آنے پر اس کے نتیجہ کو شائع کیا جائے ، کہ کس بات پر لوگوں کا اتفاق ہو گیا ہے اور کس چیز میں اختلاف رائے باقی ہے؟ (خطبات بھاولپور: ۸-۱۴۷، ملخصاً)

ڈاکٹر صاحب کی قیامِ اجماع کے لئے یہ تجویز مخلصانہ ہے ؛ لیکن عملی اعتبار سے جس قدر دشوار ہے وہ بھی ظاہر ہے ، اولاً تو ہوسکتا ہے کہ بعض فقہاء اس انجمن میں شامل نہیں ہوں ، اور یہ بھی ممکن ہے کہ فقہاء کو منتخب کرنے والا بورڈ اپنی رائے کے مطابق یا گروہی تنگ ذہنی کے باعث بعض ایسے اہل علم کو اس میں شامل نہیں کرے ، جنھیں شامل ہونا چاہئے اور انجمن سے باہر رہنے والے اہل علم کی رائے اس اتفاقی رائے سے مختلف ہو ، یہ بھی ممکن ہے کہ بعض حضرات ان سوالات کا جواب ہی نہ دیں ، ایسی صورت میں اجماع کا تحقق نہیں ہوسکتا ہے ؛ حالاں کہ انجمن اپنی معلومات کی بنیاد پر اجماع کا اعلان کردے گی ۔

پھر یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہئے کہ اجماع سے مراد مجتہدین کا اتفاق ہے نہ کہ عام اہل علم کا اتفاق ؛ اس لئے سب سے پہلے تو یہ بات طے کرنی ہوگی کہ کیا اس عہد میں اس صلاحیت کے لوگ موجود ہیں کہ انھیں انفرادی طور پر قوت اجتہاد کا حامل سمجھا جائے ، میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات بہت زیادہ محل نظر ہے ، ایسی صورت میں اگر اجماع کا کوئی ادارہ قائم کیا جائے تو کہیں نااہل لوگوں کا اتفاق اجماع کا درجہ نہ حاصل کرلے ۔

۷- اجتہاد کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ جن مسائل میں قرآن وحدیث کی صراحت نہیں ہو ، ان میں انفرادی طور پر بھی اجتہاد کی کوشش کی جائے اور اجتماعی طور پر بھی ؛ لیکن اگر سب لوگ متفق نہ ہوسکیں تو حکومت پارلیامنٹ کے ارکان کی کثرت رائے کی بنیاد پر فیصلہ کرے گی ، اور اس کے مطابق عمل کرائے گی (دیکھئے : خطبات بھاولپور: ۱۳۷) —— میرے خیال میں یہ بہت ہی پر خطر رائے ہے ؛ کیوں کہ بہت سے اجتہادی مسائل میں فقہاء کے تفردات موجود ہیں اور موجودہ زمانہ میں ارکان پارلیامنٹ کے لئے علم و عمل کا کوئی معیار مقرر نہیں ہے ، خاص کر علوم شریعت سے آگہی کا ، ایسی صورت حال میں اگر پارلیامنٹ کو اجتہاد

میں بھی حصہ دار بنا دیا جائے تو قوی اندیشہ ہے کہ دین ایک کھلونا بن کر رہ جائے۔

۸- فقہ اسلامی کے مصادر میں ایک 'شرائع ما قبل' بھی ہے، یعنی جو شریعتیں شریعت محمدی ﷺ سے پہلے نازل ہوئی ہیں، اگر قرآن وحدیث میں ان میں مذکور کسی حکم کے منسوخ ہونے کی صراحت کردی گئی ہو تو اس پر عمل نہیں کیا جائے گا، اگر صراحت کی گئی ہو کہ یہ حکم ابھی بھی باقی ہے تو یہ حکم اس اُمت کے لئے بھی باقی سمجھا جائے گا اور اگر قرآن وحدیث سے یہ وضاحت نہ ہوتی ہو کہ یہ حکم باقی ہے یا اس اُمت کے لئے یہ حکم نہیں ہے، تو ایسے احکام حجت ہوں گے یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں، اور حنفیہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ایسے احکام اس اُمت میں بھی باقی سمجھے جائیں گے، ڈاکٹر صاحب نے اس اُصول سے اتفاق کرتے ہوئے ایک اہم نکتہ پیدا کیا ہے کہ زانی کو رجم کرنے کے سلسلہ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد ''کہ اللہ کے احکام میں یہ چیز پائی جاتی تھی اور رسول اللہ ﷺ نے اس پر عمل کرایا'' میں اللہ کے احکام سے مراد تورات ہے، (خطبات بھاولپور: ۳۸) اس توجیہ سے وہ اعتراض ختم ہو جاتا ہے، جو مستشرقین نے آیت رجم کو لے کر قرآن مجید کی حفاظت کے سلسلہ میں کیا ہے۔

۹- ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ خصوصی حالات میں عورت امامت کر سکتی ہے؛ کیوں کہ حضرت ام ورقہ نے امامت فرمائی ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو ایک مسجد کا امام متعین فرمایا تھا، مرد بھی ان کے پیچھے نماز ادا کرتے تھے اور ان کا موذن ایک مرد تھا، ظاہر ہے وہ بھی بطور مقتدی ان کے پیچھے نماز پڑھتا ہوگا۔ (خطبات بھاولپور: ۳۵)

ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے اُمت کی اجماعی رائے کے خلاف ہے، اس روایت کو امام ابوداؤدؒ (دیکھئے: عون المعبود: ۱/۲۳۰)، امام احمد بن حنبلؒ (دیکھئے: فتح الربانی: ۵/۲۳۴) اور بعض اور محدثین نے نقل کیا ہے؛ لیکن ان تمام روایات کے بنیادی راوی ولید بن عبداللہ یا عبدالرحمٰن بن خلاد ہیں، ولید بن عبداللہ کے بارے میں حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں :

وذکره أیضاً فی الضعفاء وقال : ینفرد عن الا ثبات بما لا یشبه حدیث الثقات فلما فحش ذلک منه بطل

الاحتجاج به وقال ابن سعد : ثقة له احاديث ، وقال البزار : احتملوا حديثه وكان فيه تشيع ، قال العقيلى : فى حديثه اضطراب وقال الحاكم : لو لم يخرج له مسلم لكان أولى ۔ (تہذیب التہذیب:۱۳۹/۱۱)

ابن حبان نے ان کا ضعفاء میں بھی ذکر کیا ہے،اور کہا ہے کہ یہ معتبر راویوں سے ایسی روایات کو منسوب کرتے ہیں، جو ثقہ راویوں کی حدیث سے میل نہیں کھاتی ،تو اگر یہ کیفیت زیادہ ہوجائے تو اس سے استدلال کرنا درست نہیں ہوگا،ابن سعد کہتے ہیں کہ یہ ثقہ ہیں، جن سے چند حدیثیں منقول ہیں، بزار کا بیان ہے کہ محدثین نے ان کی حدیث لی ہے؛لیکن ان میں تشیع ہے،عقیلی کہتے ہیں کہ ان کی حدیث میں اضطراب ہے،اور حاکم نے کہا ہے کہ اگر امام مسلم نے ان کی حدیث کی تخریج نہ کی ہوتی تو بہتر ہوتا۔

عبدالرحمٰن بن خلاد کو بعض محققین جیسے ابوالحسن بن قطان نے مجہول قرار دیا ہے، (تہذیب التہذیب:۱۶۱/۶) یہ بھی ممکن ہے کہ موذن اذان دیتا ہو،اور دوسری مسجد میں نماز ادا کرلیتا ہو اور یہ خواتین کونماز پڑھاتی ہوں؛چنانچہ دارقطنی کی روایت میں ہے :

أن رسول الله أذن لها أن يؤذن لها ويقام وتؤم نساء ها ۔
(دیکھئے:الفتح الربانی:۲۳۴/۵)

رسول اللہ ﷺ نے اجازت دی تھی کہ ان کے لئے اذاں دی جائے، اقامت کہی جائے اور وہ اپنی عورتوں کی امامت کریں۔

پس ایک ایسی روایت جو متکلم فیہ ہے، سے ایک ایسے مسئلہ میں استدلال جو عہد نبوی، عہد صحابہ اور ہر عہد کے تعامل اور توارث کے خلاف ہے، نیز خواتین کے بارے میں پردہ اور مرد کے بارے میں قوامیت اور ولایت کے جو شرعی اُصول ہیں، ان سے بھی ہم آہنگ نہیں ہے،استدلال کرنا قابل قبول نظر نہیں آتا۔

۱۰- مصارف زکوٰۃ کے باب میں متعدد نکات پر ان کا نقطۂ نظر جمہور سے مختلف ہے؛ چنانچہ غارمین کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر ہے :

> حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بظاہر اس لفظ غارمین سے استنباط کر کے ایک نئی چیز کا ہمیں اضافہ نظر آتا ہے اور وہ سرکاری خزانے سے لوگوں کو امداد نہیں ؛ بلکہ قرض دینا ہے، کوئی شخص کھاتا ، پیتا ہے اس کو امداد کی ضرورت نہیں ؛ لیکن اس کو مال کی ضرورت ہے، مثلاً تجارت کے لئے یا کسی اور کام کے لئے ،تو حکومت اس کو قرض دیتی ہے...... چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا طرز عمل یہی نظر آتا ہے کہ وقتاً فوقتاً وہ لوگوں کو سرکاری خزانہ سے بلا سود قرض دیتے ، اس سے خود حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی فائدہ اٹھایا کرتے تھے۔ (خطبات بھاولپور: ۳۷۳/۴)

ڈاکٹر صاحب کی یہ تشریح ،اس تشریح سے مختلف ہے، جو سلف صالحین سے منقول ہے، غارمین سے مراد فقہاء کے ایک گروہ کے یہاں وہ لوگ ہیں جو قرض سے دبے ہوئے ہوں اور دوسرے گروہ کے نزدیک وہ لوگ جنھوں نے دو مسلمانوں کے درمیان صلح کرانے کے لئے کوئی مالی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہو— ڈاکٹر صاحب کی یہ تشریح دو وجوہ سے محل نظر ہے، اول تو اسی لئے کہ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے لئے ہر جگہ ایتاء کا لفظ وارد ہوا ہے، اور ایتاء کے معنی مکمل طور پر مالک بنا دینے کے ہیں ،قرض کے ذریعہ مقروض کو مکمل مالک نہیں بنایا جاتا ہے ؛ بلکہ یہ قابل واپسی رقم ہوتی ہے، دوسرے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیت المال سے قرض دینا ضرور ثابت ہے؛ لیکن یہ کہنا کہ یہ قرض زکوٰۃ ہی کے مد سے دیا جاتا تھا، محتاج ثبوت ہے، بیت المال میں مختلف مدات کی آمدنی ہوا کرتی تھی اور زیادہ حصہ مالِ غنیمت کا ہوا کرتا تھا۔

۱۱- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک 'عاملین' سے مراد پوری سیول اڈمنسٹریشن ہے، ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں :

> چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پوری سیول اڈمنسٹریشن یعنی سرکاری ملازمین

کی تنخواہ زکوٰۃ کی آمدنی سے دی جائے گی۔ (خطبات بھاولپور:۳۷۳)

اگراس سے زکوٰۃ کے حساب وکتاب اور جمع وتقسیم سے متعلق عملہ مراد ہو، تب تو ٹھیک ہے؛ لیکن اگر تمام سرکاری ملازمین کواس زمرہ میں رکھا جائے تو خود ’عاملین علیہا‘ کے الفاظ اس کے حق میں نہیں ہیں؛ کیوں کہ ’علیہا‘ کی ضمیر کا مرجع ’زکوٰۃ‘ ہے۔

۱۲- اسی طرح فی سبیل اللہ میں ڈاکٹر صاحب کے نزدیک پوری مل ’ٹری اڈمنسٹریشن‘ داخل ہے، جس میں فوج کی تنخواہ، اسلحہ کی فراہمی اور دوسری فوجی ضروریات بھی ہیں، گو یہ بات بھی بہت حد تک محل نظر ہے؛ لیکن فقہاء مالکیہ اور بعض دوسرے فقہاء کے نزدیک تمام فوجی ضروریات کو فی سبیل اللہ میں شامل رکھا گیا ہے؛ لیکن ڈاکٹر صاحب اس پر اکتفاء نہیں کرتے؛ بلکہ کہتے ہیں :

> نیز اور چیزیں بھی مثلاً مسجدوں کا بنانا، مدرسوں کی تعمیر وغیرہ یہ ساری چیزیں فی سبیل اللہ کے تحت آجاتی ہیں۔ (خطبات بھاولپور:۳۷۴)

اس سلسلہ میں یہ بات قابل غور ہے کہ قرآن مجید میں یہ لفظ لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے یا بطور اصطلاح کے؟ عام طور پر سلف صالحین نے اس کو ایک اصطلاحی لفظ کی نظر سے دیکھا ہے اور اس سے ’مجاہدین فی سبیل اللہ‘ مراد لئے ہیں؛ کیوں کہ اگر فی سبیل اللہ کا لفظ لغوی معنی میں ہو تو پھر زکوٰۃ کے آٹھ مصارف کو ذکر کرنے کی چنداں ضرورت نہیں تھی، یہ ایک لفظ ہی تمام مصارف کے لئے کافی تھا۔

۱۳- ’’ابن سبیل‘‘، یعنی مسافر کے مفہوم میں بھی ڈاکٹر صاحب نے بڑی وسعت برتی ہے، آپ فرماتے ہیں :

> ابن السبیل کے معنی پورے (Tourist Trafck) کا انتظام ہے، اس میں سڑکوں کا بنانا، پلوں کی تعمیر، پولیس کا انتظام کرنا کہ گذرجانے والوں کی جان و مال محفوظ رہے، اسی طرح بازاروں کی نگرانی کہ وہاں پر دغا اور فریب نہ ہو، غذا صحت کے لئے مضر نہ ہو، وغیرہ وغیرہ، یہ سب ابن السبیل کے لفظ کے تحت آجائیں گے۔ (خطبات بھاولپور:۳۷۴)

غور کیجئے کہ ابن سبیل سے مراد اشخاص و افراد ہیں ، جو سفر کی حالت میں ہوں اور ایمر جنسی مجبوری کا شکار ہوگئے ہوں ، اگر سیول اڈمنسٹریشن ، ملیٹری ایڈمنسٹریشن ، ٹریفک ایڈمنسٹریشن ، سارے کام زکوٰۃ ہی سے کئے جانے لگیں ، تو پھر مصارف زکوٰۃ کا کیا تشخص باقی رہ جائے گا اور کون سی چیز ہوگی ، جو زکوٰۃ کے تحت نہیں آئے گی؟

۱۴- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک زکوٰۃ 'مؤلفۃ القلوب' کے علاوہ غیر مسلموں کو بھی دی جاسکتی ہے ؛ چنانچہ آپ نے مساکین سے غیر مسلم فقراء مراد لئے ہیں ، اور دلیل یہ ہے کہ بوڑھے یہودی گداگر کی غربت سے متاثر ہوکر حضرت عمرؓ نے اپنے افسر خزانہ کو حکم دیا کہ اس یہودی سے آئندہ جزیہ نہ لیا جائے ؛ بلکہ مزید برآں اس کے لئے مقرر کر دیا جائے ، حضرت عمرؓ کے الفاظ میں : ''**ھذا من مساکین أھل الکتاب** '' یہ مساکین کی مد میں آتا ہے ، اس لئے زکوٰۃ سے اس کو رقم دی جائے (خطبات بھاولپور : ۳۷۱) ؛ لیکن غور کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کا یہ استدلال محل نظر ہے ، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے دینے کا حکم فرمایا ، زکوٰۃ کی صراحت نہیں فرمائی ، اور اگر کسی کو مسکین قرار دے کر اس کی مدد کی تلقین کی جائے تو یہ اس بات کی دلیل نہیں کہ زکوٰۃ ہی سے مدد کرنے کو کہا گیا ہے ؛ بلکہ یہ مدد اس حیثیت سے ہے کہ وہ ایک مسلم مملکت کا شہری ہے اور اس کی مدد کرنا مملکت کا فریضہ ہے۔

۱۵- اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے '' فی الرقاب '' میں غلام کے ساتھ ساتھ اسیروں اور قیدیوں کو بھی شامل کیا ہے ، اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی ، ابن سبیل یعنی مسافر میں بھی مسلمان اور غیر مسلم کو عام رکھا ہے ، ڈاکٹر صاحب کا کہنا ہے کہ شام کے سفر کے دوران حضرت عمرؓ نے زکوٰۃ کی مد سے غریب اور محتاج عیسائیوں کی مدد کرنے کا حکم دیا (خطبات بھاولپور : ۳۷۵) ؛ لیکن غالباً اس سلسلہ میں کوئی صریح بات منقول نہیں ، صدقہ کے لفظ کو ڈاکٹر صاحب نے زکوٰۃ سے تعبیر کیا ہے ؛ حالاں کہ صدقہ بمقابلہ زکوٰۃ کے عام ہے اور زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے صدقات واجبہ اور صدقات نافلہ غیر مسلموں کو بھی دیئے جاسکتے ہیں۔

مصارف زکوٰۃ کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کی جو آراء ہیں ، ان پر چند پہلوؤں سے

غور کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ قرآن وحدیث کی تعبیرات کے سلسلہ میں جو متوارث تشریح ملتی ہو، صرف لغوی معنی کی وجہ سے اس کو نظر انداز کردینا مناسب نہیں ہے؛ کیوں کہ بعض الفاظ کا دائرہ لغوی اعتبار سے وسیع ہوتا ہے؛ لیکن اس کا ذکر ایک اصطلاح کی حیثیت سے کیا جاتا ہے اور اس لحاظ سے اس کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔

(۲) قرآن مجید نے مصارفِ زکوٰۃ کو بیان کرکے اس کے مصرف کو محدود و متعین کرنا چاہا ہے، اگر یہ مقصد نہ ہوتا تو عمومی طور پر انفاق کا حکم دے دیا جاتا، خود رسول اللہ ﷺ نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اللہ تعالیٰ نے مصرف زکوٰۃ کو مجھ پر موقوف نہیں رکھا ہے؛ بلکہ خود اس کی تحدید فرمادی ہے، اگر مصارف زکوٰۃ کی ایسی تشریح کی جائے کہ مملکت کی تمام ضروریات اس میں شامل ہوجائیں تو یہ تحدید وتعیین بے معنی ہوکر رہ جائے گی۔

(۳) کسی لفظ کی مراد متعین کرنے کے لئے ضروری ہے کہ قرآن وحدیث میں اس سے متعلق تمام تعبیرات کو دیکھا جائے ، مثلاً زکوٰۃ کی ادائیگی کے لئے قرآن میں 'اتوا' کا لفظ استعمال ہوا ہے، مصارفِ زکوٰۃ والی آیت **انما الصدقات للفقراء** میں ''ل'' کا حرف وارد ہوا ہے، جو تملیک کے معنی میں ہے، حدیث میں زکوٰۃ کے لئے اعطاء اور تقسیم کے الفاظ وارد ہوئے ہیں ، اس میں بھی مالک بنائے جانے کے معنی میں ہیں ، زکوٰۃ کا مصرف ضرورت مند افراد کو قرار دیا گیا ہے، جیسے فقیر، مسکین، ابن سبیل وغیرہ، نہ کہ خود ''ضرورتوں'' کو، جیسے یہ نہیں کہا گیا کہ فلاں کام اور ضرورت میں زکوٰۃ کی رقم خرچ کی جائے —— اس سے معلوم ہوا کہ مصارف زکوٰۃ کی تعیین میں اس کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ افراد واشخاص کو مالک بنائے جانے کی کیفیت پائی جائے نہ یہ کہ اسے رفاہی اور خیراتی کاموں میں خرچ کردیا جائے۔

(۴) اس بات پر قریب قریب ائمہ مجتہدین کا اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی رقم مسلمانوں کے لئے مخصوص ہوگی ؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجتے ہوئے زکوٰۃ کے سلسلہ میں نصیحت فرمائی کہ مالدار مسلمانوں سے وصول کی جائے ،

اور غریب مسلمانوں میں خرچ کی جائے، **توخذ من اغنیائهم وتقسم فی فقرائهم** اور یہ بات قرین عقل وانصاف بھی ہے کہ زکوٰۃ جب مسلمانوں ہی سے لی جاتی ہے تو اس کو خرچ بھی ان ہی پر ہونا چاہئے۔

(۵) یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ زکوٰۃ کے مصارف میں سوائے عاملین اور مؤلفۃ القلوب کے فقر واحتیاج ملحوظ ہے، خواہ یہ فقر واحتیاج مستقل ہو یا وقتی طور پر کسی خاصی سبب سے پیدا ہو گیا ہو، اب اگر زکوٰۃ کی رقم سے مسجدیں تعمیر ہوں، پل اور سرائے کی عمارت کھڑی کی جائے، ٹریفک اور پولیس کا انتظام وانصرام کیا جائے تو اس سے مالدار ہو یا غریب اور کروڑ پتی ہو یا رکشہ چلانے والا مزدور، سبھی فائدہ اٹھالیں گے؛ لہٰذا غرباء کی کفالت اور محتاجوں کی مدد کا بنیادی مقصد فوت ہو کر رہ جائے گا۔

۱۶- زکوٰۃ کا نصاب کیا ہو؟ اس سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ دیکھنا چاہئے کہ اس زمانہ میں درہم کی قوت خرید کیا تھی اور اب اس کی قوت خرید کیا ہے؟ اور اسی کی روشنی میں غور کیا جاسکتا ہے کہ موجودہ دور میں گرانی کے باعث زکوٰۃ کے نصاب کے لئے ایسی مقدار مقرر کی جائے، جو مناسب ہو (خطبات بھاولپور: ۶-۳۹۵) —— ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے بھی محل نظر ہے؛ کیوں کہ زکوٰۃ عبادت کے قبیل سے ہے اور عبادات میں جو مقدار متعین کی گئی ہو، اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، مثلاً کسی جگہ دن بڑا ہو جائے تو روزہ کے اوقات کو مختصر کر دیا جائے، کہیں غربت ہو تو زکوٰۃ کی شرح بڑھا دی جائے، کوئی وقت زیادہ کام کا ہو تو نماز کی رکعات کم کر دی جائیں، ایسا کرنا درست نہیں ہے، پھر یہ کہ ایک شئ کی قوت خرید مختلف اشیاء کی نسبت سے الگ الگ ہوتی ہے، اور عہد نبوی سے آج کی قوت خرید کی نسبت متعین کی جائے تو بعض چیزوں میں یہ نسبت زیادہ ہوگی اور بعض میں کم ہوگی، اس لئے صحیح بات وہی ہے جس پر بڑی حد تک فقہاء کا اتفاق ہے کہ عبادات میں جس چیز کے لئے جو مقدار ومعیار متعین ہے، اسی کا اعتبار کیا جائے گا۔

۱۷- ڈاکٹر صاحب موسیقی کے جواز کے قائل ہیں؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

موسیقی کی اسلام میں مخالفت بالکل نہیں ہے، اگر ممانعت ہے تو اس

بات کی کہ مثلاً نماز کے وقت موسیقی کا شغل جاری رکھا جائے، یا اس
کا منشاء ایسی تفریح ہو، جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بُری سمجھی جاتی ہے۔
(خطبات بھاولپور:۲۵۲)

ڈاکٹر صاحب کی دلیل اس سلسلہ میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان سکھائی اور انھیں بتایا کہ کونسے الفاظ کھینچ کر ادا کئے جائیں اور کن لفظوں کو اختصار کے ساتھ؟ اس طرح آپ نے موسیقی کے سُر بتائے (خطبات بھاولپور:۲۵۲)، ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ حضور ﷺ نے ایک دعوت ولیمہ سے واپس آکر حضرت عائشہؓ! سے فرمایا کہ اے عائشہؓ آج میں تمہارے خاندان کے ایک فرد کی شادی میں گیا تھا، مگر وہاں موسیقی نہیں تھی، یہ کیسی بات ہے؟ (حوالۂ سابق) —— اسی طرح دُف بجانے کے واقعہ کو بھی ڈاکٹر صاحب نے موسیقی پر محمول کیا ہے؛ بلکہ ڈاکٹر صاحب کے الفاظ میں قرآن مجید کی تلاوت بھی موسیقی ہی کی ایک شاخ ہے (خطبات بھاولپور: ۳۵۳) —— ناظرین خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ موسیقی کے جواز پر یہ استدلات کس قدر قابل قبول ہیں، کیا اذان کی لئے اور قرآن کی تلاوت کو موسیقی کہا جا سکتا ہے؟ دُف بجانے کی صورت 'نوبت' بجانے کی تھی، اور اصل میں اس کا مقصد اعلان و اظہار ہوا کرتا تھا، کیا اسے موسیقی کے لئے وجہِ جواز بنایا جا سکتا ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزامیر سے سختی سے منع فرمایا اور غناء کے بارے میں فرمایا: کہ جیسے پانی سے پودا اگتا ہے، اسی طرح غنا نفاق کو پیدا کرتا ہے، اگر موسیقی جائز ہو تو ان ارشادات نبوی کا کیا مطلب ہوگا؟

۱۸- ڈاکٹر صاحب کے نزدیک نظام حکومت کا کوئی خاص نہج متعین نہیں ہے، خاندانی بادشاہت بھی جائز ہے اس پر آپ کی دلیل حضرت داؤد و سلیمان علیہما السلام کی بادشاہت ہے؛ لیکن یہ بات محل نظر ہے، مجبوری میں کسی نظام کو قبول کر لینا امر آخر ہے، جس کو فقہاء نے 'امارت قاہرہ' سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن اختیاری طور پر اسلام نے جس نظام حکومت کا تصور دیا ہے، وہ خلافت اور شورائی نظام ہے؛ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا انتخاب شورائی بنیاد پر ہی ہوا، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا تو لوگوں سے دریافت فرمایا کہ :

ترضون بمن استخلف عليكم فإني و الله ما الوث من

جهدى الراى ولا وليت ذا قربة وانى استخلف عمر بن الخطاب فاسمعوا له واطيعوا ۔
میں جسے تم پر جانشیں مقرر کروں، کیا تم لوگ اس پر راضی ہو؟ خدا کی قسم! میں نے اس مسئلہ پر غور کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی اور نہ اپنے کسی قرابت دار کو مقرر کیا، میں عمر بن خطاب کو اپنا جانشیں بناتا ہوں، تم لوگ ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔

اس پر مجمع نے اپنی آمادگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: **سمعنا و اطعنا** (تاریخ طبری:۳؍۳۱۴)
حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی لوگوں کی رائے اور مشورہ سے ہوا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے گھر گھر جا کر لوگوں سے استفسار کیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کا انتخاب بھی لوگوں کی رائے سے ہوا، یہاں تک کہ خود حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: **فإن بيعتي لا تكون خفيا ولا تكون إلا عن رضى من المسلمين ۔**

اس لئے یہ کہنا کہ خاندانی بادشاہت اسلام کے تصور سیاسی کے مغائر نہیں، قابل غور ہے، رہ گئی حضرت داؤد و سلیمان علیہ السلام کی فرمانروائی تو یہ خاندانی بادشاہت کی بنیاد پر نہیں تھی؛ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم اور وحی پر مبنی تھی اور خدا کی طرف سے یہ انتخاب محض رشتۂ فرزندی کی وجہ سے نہیں تھا؛ بلکہ ان کی صلاحیت اور استعداد کی وجہ سے تھا۔

۱۹- ڈاکٹر صاحب ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کی طرف بھی میلان رکھتے ہیں، ان کا بیان ہے کہ اخوان الصفا اور ابن مسکویہ کی 'الفوز الاصغر' جو تیسری چوتھی صدی ہجری کی کتابیں ہیں، میں بھی نظریۂ ارتقاء کو قبول کیا گیا ہے، اس طرح یہ چیزیں خود مسلمان حکماء کے یہاں موجود ہیں، پھر قرآن مجید میں انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے مٹی اور نطفہ کا ذکر کیا گیا ہے، یہ مٹی اور نطفہ کے درمیان کا مرحلہ ایک ارتقائی مرحلہ ہے، ڈاکٹر صاحب نے اس کے لئے قرآن مجید کے الفاظ: **خلقكم اطوارا** سے بھی استدلال کیا ہے (خطبات بھاولپور:۲۱۸) —— کسی قول کا مسلمان حکماء سے منقول ہونا تو اس کے ثبوت وصحت کی دلیل نہیں؛ لیکن قرآن مجید کے بیان سے انھوں نے جو استدلال کیا ہے، وہ محل نظر ہے کہ مٹی سے انسان اول کی تخلیق

اورنطفہ سے بقیہ انسانوں کی تخلیق مراد ہے یا اس درمیان ارتقاء کے بہت سے مراحل آئے ہیں؟ اور''اطوار'' سے استقرار حمل سے ولادت تک کے مختلف مراحل مراد ہیں، یا جماداتی، نباتاتی اور حیوانی مراحل کا ارتقاء؟ حقیقت یہ ہے کہ ڈارون کے نظریہ کو موجودہ دور کے سائنسدانوں نے خود رد کر دیا ہے اور قرآن مجید کے بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پہلے انسان حضرت آدم کی پیدائش براہ راست حکم ربانی سے مٹی کے ذریعہ ہوئی، پھر حضرت حوا کی پیدائش ہوئی اور اس کے بعد مرد وعورت کے ذریعہ انسان وجود میں آنے لگے، ڈارون کے مفروضہ کی نہ قرآن وحدیث سے تائید ہوتی ہے اور نہ عقل اسے قبول کرتی ہے۔

۲۰- عام طور پر اسلامی نظام حکومت میں یہ بات تسلیم کی گئی ہے کہ جس شخص کو امیر المومنین مقرر کیا جائے وہ زندگی بھر کے لئے امیر ہوگا، جیسا کہ خلافت راشدہ کی نظیر ہمارے سامنے ہے؛ لیکن ڈاکٹر صاحب کا نقطۂ نظر ہے کہ :

> مسلمان فقہاء کے بیان کے مطابق حکمراں یا خلیفہ کی حیثیت ایک وکیل کی ہے اور مؤکل جو کسی شخص کو اپنا وکیل بناتا ہے، اس بات ہمیشہ کا حق رکھتا ہے کہ وکیل کو معزول کرے، جو لوگ کسی کو حکمراں بنائیں گے ان ہی کو یہ حق بھی ہوگا کہ اس کو اس کی خدمت سے الگ کریں۔ (خطبات بھاولپور:۴۱۸)

واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی یہ بات موجودہ دور کے اخلاقی حالات کے پس منظر میں بڑی ہی معقول معلوم ہوتی ہے اور توکیل کے مذکورہ اُصول کی روشنی میں ایسا بھی ممکن ہے کہ امارت کو پانچ سال یا ایک مخصوص مدت کے لئے محدود کیا جائے، اگر ایسے امراء ہوں جن میں خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کی للّٰہیت کا دس بیس فیصد حصہ بھی ہو تو اس کی حین حیات امارت کے بارے میں سوچا جا سکتا ہے؛ لیکن موجودہ دینی واخلاقی انحطاط کے دور میں ایسے افراد کا ملنا اور ان کا منتخب ہونا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، ایسی صورت میں اگر زندگی بھر کے لئے اقتدار کی لگام کسی کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ فرعونِ بے سامان بن جاتا ہے، اس سلسلہ میں مسلم

ممالک کا تجربہ ہمارے سامنے ہے، اس لئے مدت امارت کی تحدید ہونی چاہئے اور عوام کو اسے معزول کرنے کا حق ہونا چاہئے۔

۲۱- ہندوستانی مسلمانوں میں ہندوؤں سے تاثر کی وجہ سے مختلف رسوم رواج پا گئے ہیں، جیسے علی التعیین وفات کے تیسرے، دسویں یا چالیسویں دن قرآنی خوانی کرانا وغیرہ، فقہ وفتاویٰ کی کتابوں میں صراحتاً ایصالِ ثواب کے لئے اس طرح کی تعیین کو منع کیا گیا ہے، اور بدعت قرار دیا گیا ہے؛ لیکن ڈاکٹر صاحب اسے درست قرار دیتے ہیں؛ چنانچہ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے فرماتے ہیں :

> اگر کسی کی وفات کے تیسرے دن، دسویں دن، چالیسویں دن ہم کچھ کرنا چاہیں تو وہ کام یہ ہونا چاہئے کہ قرآن مجید کی تلاوت کریں اور اس کا ثواب متوفی کو پہنچانے کی اللہ سے دُعاء کریں، اس میں کوئی امر مانع نہیں ہے، چاہے ہر روز کریں، چاہے ہر سال، چاہے ابتداء متعدد بار کریں، کوئی امر مانع نہیں ہوتا اور میرے مرنے کے بعد اگر آپ میرے لئے بھی دُعاء کریں تو میں آپ کا ممنون ہوں گا۔

ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے محل نظر ہے؛ کیوں کہ دین میں کوئی اضافہ اور دین کے کسی حکم میں اپنی طرف سے ایسی تعیین جو کتاب وسنت سے ثابت نہیں ہو، درست نہیں ہے اور یہ واضح طور پر ''احداث فی الدین'' اور ''بدعت'' میں شامل ہے، جس سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

یہ تو ڈاکٹر صاحب کے وہ تفردات ہیں، جو علوم شریعہ سے متعلق ہیں اور یہ محض سرسری اور طائرانہ نظر ڈالنے میں آگئے ہیں، ورنہ اگر آپ کی کتابوں کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے تو اس طرح کے اور بھی تفردات مل سکتے ہیں، وہ تفردات ان کے علاوہ ہیں، جو سیرت وتاریخ وغیرہ سے متعلق ہیں، مثلاً آپ کے نزدیک حضور ﷺ کی تاریخ ولادت ۱۷؍ جون ۵۶۹ء تھی، اور تاریخ وفات ۱۲؍ ربیع الاول نہیں بلکہ ۲۱؍ ربیع الاول تھی، نیز نزول قرآن کا آغاز ۲۷؍ رمضان کو نہیں بلکہ ۱۷؍ رمضان کو ہوا تھا، نکاح کے وقت حضرت خدیجہ کی عمر ۲۸؍ سال تھی نہ کہ ۴۰؍ سال، سورۃ علق

کی ابتدائی آیات کا نزول اور اس موقع سے حضرت جبرئیل کی آمد آپ کے نزدیک حالت خواب میں ہوئی تھی، آپ کے نزدیک معراج بھی خواب کا ایک واقعہ ہے، رسول اللہ ﷺ کے نامۂ مبارک کو کسرائے ایران کا چاک کر دینا ڈاکٹر صاحب کو تسلیم نہیں ہے، اسی طرح ڈاکٹر صاحب نے ہجرت کو ''ہجر'' سے ماخوذ مانا ہے، جس کے معنی حبشی زبان میں 'شہر' کے ہیں، اس طرح کے بعض اور تفردات بھی سیرت کے سلسلہ میں موجود ہیں، جن کو آپ کی فاضلانہ تالیف ''محمد رسول اللہ''، اور سیرت کی دوسری تالیفات ''عہد نبوی کے میدان جنگ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اور رسول اکرم کی سیاسی زندگی'' وغیرہ میں دیکھا جا سکتا ہے، عام طور پر ڈاکٹر صاحب کی یہ آراء دوسرے سیرت نگاروں سے مختلف ہیں اور بعض قابل غور اور بعض محل نظر ہیں؛ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ خیال ہوتا ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب کے قلم سے یہ بات نہ نکلی ہوتی تو بہتر ہوتا، جیسے رسول اللہ ﷺ کے بارے میں یہ کہنا کہ آپ ایک جونیر گھرانے کے جونیر فرد تھے، اور آپ کو نبی تسلیم کرنا بنو امیہ ہی کو نہیں؛ بلکہ بنو ہاشم کے سینئر لوگوں کو بھی گراں گذرتا تھا (دیکھئے: رسول اکرم کی سیاسی زندگی: ۴۷)؛ کیوں کہ نبی جس قوم میں مبعوث ہوتا ہے، وہ اپنی خاندانی اور سماجی وجاہت کے اعتبار سے اس درجۂ ومقام پر ہوتا ہے کہ کسی کو اس کی اتباع میں عار نہ ہو۔

مؤرخین اور سیرت نگاروں کے لئے یہ بات کافی نہیں ہوتی کہ وہ کسی روایت کو معتبر قرار دے دیں؛ بلکہ اس کی ذمہ داری یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ واقعات کی کڑیوں کو جوڑے اور روایتوں میں جو خلا رہ جائے اسے پُر کرے، اس کام کے لئے بہت سی جگہ اسے نامعتبر روایتوں سے یا خارجی قرائن سے بھی کام لینا پڑتا ہے، شاید اسی لئے ڈاکٹر صاحب کے یہاں بھی بہت سی جگہ ضعیف بلکہ موضوع روایات سے بھی استدلال کیا گیا ہے اور بعض مواقع پر قرائن اور قیاس سے بھی فائدہ اٹھایا گیا ہے؛ لیکن اُصولی طور پر ہمیں یہ بات مان کر چلنا چاہئے کہ تاریخی روایات فنی کسوٹی پر پوری اُتری ہوئی حدیثوں کے ہم پلہ نہیں ہو سکتیں، اس لئے جہاں احادیث اور تاریخی روایات کے درمیان تعارض ہو، وہاں احادیث ہی قابل عمل ہوں گی، ڈاکٹر صاحب کے یہاں بھی دوسرے سیرت نگاروں کی طرح یہ کمزوری کہیں کہیں محسوس ہوتی

ہے کہ انھوں نے احادیث پر تاریخی روایات یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر جزوی واقعات کو ترجیح دے دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب ایسی یگانۂ روزگار شخصیتوں میں تھے، جو صدیوں میں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے جلائے ہوئے فکر ونظر کے چراغ سے ہزاروں چراغ چلتے ہیں، وہ ۱۶؍محرم ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹؍فروری ۱۹۰۸ء، چہار شنبہ کو حیدر آباد (دکن) میں پیدا ہوئے، والد کا نام حاجی ابو محمد خلیل اللہ اور دادا کا اسم گرامی بدر الدولہ قاضی محمد صبغۃ اللہ، اس زمانہ میں حیدر آباد میں ایک درسگاہ دار العلوم کے نام سے قائم تھی، یہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی، ایک سال جامعہ نظامیہ سے کسب فیض کیا اور مولوی فاضل کی سند حاصل کی، عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے اور اس کے بعد دینیات میں ایم اے، نیز ۱۹۳۰ء میں ایل ایل بی کیا، بون یونیورسٹی جرمن سے ڈی فل اور سوبون یونیورسٹی پیرس سے ۱۹۳۵ء میں ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ، مفتی عبد اللطیف صاحب اور ڈاکٹر سید عبد اللطیف وغیرہ آپ کے نامور اساتذہ میں ہیں، عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد اور سربون یونیورسٹی پیرس میں تدریس و تحقیق کی خدمت کی، ۱۹۴۸ء سے پیرس میں مقیم ہوگئے، ۱۹۶۹ء میں ریٹائرڈ ہوئے، ۱۹۹۶ء میں بیمار ہو کر امریکہ منتقل ہوگئے اور ۱۷؍دسمبر ۲۰۰۱ء کو مشرق میں طلوع ہونے والا علم و تحقیق کا یہ خورشید مغرب میں غروب ہوگیا۔

تعداد کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی کتابیں بہت زیادہ نہیں ہیں، ممکن ہے ان کے بہت سے معاصرین کی کتابیں تعداد میں ان سے زیادہ ہوں؛ لیکن ڈاکٹر صاحب کی بات ایسے غواص کی بات ہوتی ہے، جو سمندر کی تہہ میں اُتر کر موتی نکالتا ہے، الفاظ سے نئے نئے معنی مستنبط کرتا ہے، واقعات سے نئے نئے مسائل اخذ کرتا ہے، قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے اس کا تاریخی پس منظر ایک آئینہ کی طرح اس کے سامنے ہے اور دور جدید کی معلومات و اصطلاحات وہ اس طرح قرآن وحدیث کی روشنی میں واضح کرتا ہے کہ قرآن کی ابدیت اور فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی مہر نیم روز کی طرح انسان کے سامنے روشن ہوجاتی ہے، تاہم ڈاکٹر صاحب نے جو تالیفی ورثہ چھوڑا ہے وہ اپنی مقدار کے اعتبار سے بھی کم نہیں ہے، آپ کی کتابوں میں رسول

اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، امام ابوحنیفہؒ کی تدوین قانون اسلامی، عہد نبوی کے میدان جنگ، عہد نبوی میں نظام حکمرانی، اسلامی حکومت اور خطبات بھاولپور، خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

آپ نے ''**مجموعة الوثائق السياسية للعهد اللنبوى والخلافة الراشدة**'' مرتب کیا اور عہد نبوی کے تمام نوشتوں کو اس میں جمع فرما دیا، جو علم و تحقیق کی دنیا میں آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے، آپ نے محمد ابن اسحاق کی سیرت، صحیفہ ہمام ابن منبہ، علامہ بلاذری کی النبات الاشراف، کتاب الذخائر والتحف اور بعض اور کتابوں کو ایڈٹ کیا ہے اور آپ کی تحقیق کے ساتھ وہ پہلی بار منظر عام پر آئی ہیں اور اہل علم کو ان سے استفادہ کرنے کا موقع ملا ہے، آپ کا خاص موضوع قانون بین المما لک تھا، اسلام کے قانون بین المما لک پر آپ نے کتاب بھی لکھی ہے اور آپ کے متعدد اور اہم قیمتی مقالات بھی شائع ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ بے شمار مقالات ہیں جو بجائے خود ایک کتاب کے متن کا درجہ رکھتے ہیں اور سیرت، قرآنیات، نیز دوسرے موضوعات پر لکھے گئے ہیں، نقوش کے ''رسول نمبر'' اور ''اُردو دائرۂ معارف اسلامیہ'' کے بہت سے مضامین آپ کے گہر بار قلم سے ہیں، آپ نے فرنچ زبان میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا ہے اور مذہبی طبقہ میں اس حیثیت سے آپ کو انفرادیت حاصل ہے کہ آپ دنیا کی متعدد زبانوں سے واقف تھے اور براہ راست ان سے استفادہ کرتے تھے۔

اس میں شبہ نہیں کہ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب اعلیٰ درجے کے محقق تھے، اور خاص کر فن سیرت نگاری کا ان کو ''مجدد'' قرار دیا جا سکتا ہے؛ لیکن انبیاء کے سواء کوئی بھی انسان ہو اور کتنی ہی اونچی سطح کا حامل ہو، لغزشوں سے ماوراء نہیں ہوسکتا، ڈاکٹر صاحب کے بہت سے تفردات بھی ایسے ہی ہیں، جن کو جمہور اہل علم کے لئے قبول کرنا دشوار ہے؛ لیکن اس سے ان کی علمی عظمت کم نہیں ہوتی اور قرآن مجید کی جو خدمت ان کے ہاتھوں ہوئی ہے، نیز مغرب تک اسلام کو پہنچانے کی جو بلند پایہ کوششیں انھوں نے فرمائی ہیں، ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

اللهم اغفرله وارحمهٗ وتقبل حسناتهٗ وتجاوز عن سياته ۔

❁ ❁ ❁

حیاتِ عزیز ٭

(بلند پایہ فقیہ مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ)

خالق کائنات نے جب انسانوں کی یہ بستی بسائی اور پہلے انسان اوران کے جوڑے حضرت آدم وحوا کو کرۂ ارضی پر اُتارا، تو جہاں ان مہمانوں کے لئے زمین پر بے شمار نعمتوں کا دسترخوان چنا گیا اور انھیں نوع بہ نوع نعمتوں سے سجایا گیا، وہیں ان کی ہدایت ورہنمائی کا سامان بھی اول دن سے کیا گیا اور بتایا گیا کہ انھیں کس طرح دنیا سے فائدہ اُٹھانا ہے، کن اُمور کو انجام دینا ہے اور کن کاموں سے بچنا ہے؟ —— ہدایت الٰہی کے اسی نظام کو ''نبوت'' کہتے ہیں، حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی تھے اور پہلے نبی بھی، نبوت کا سلسلہ جاری رہا اور حسب ضرورت گاہے گاہے آسمانی کتابیں بھی اُتاری جاتی رہیں، یہاں تک کہ جب انسانی تمدن اپنی پختگی کو پہنچ گیا تو آخری پیغمبر محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور آپ کے ذریعہ آخری آسمانی ہدایت نامہ ''قرآن مجید'' کی صورت میں انسانیت کو حوالہ کیا گیا، اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی نہیں آسکتا؛ کیوں کہ اب کسی نئے نبی اور نئی کتاب کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک غیبی انتظام یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کی حفاظت خود اپنے ذمہ لے لی ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ'' (الحجر:۹) نیز من جانب اللہ حضور ﷺ کے ارشادات اور معمولات کو احادیث نبوی کی صورت میں اس طرح محفوظ کردیا گیا کہ آج حضور ﷺ کی زندگی کا ایک ایک ورق پورے استناد واعتبار کے ساتھ انسانیت کے سامنے ہے، وہ قرآن کے ذریعہ حکم ربانی کو جان سکتا ہے اور حدیث کی صورت میں اس کے

٭ پیش لفظ: حیات عزیز، تالیف: مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی۔

عملی نمونہ کو دیکھ سکتا ہے؛ تاہم نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد بھی ایسے لوگوں کی ضرورت باقی رہے گی، جو زبان وقلم سے قرآن وحدیث کی ترجمانی کرتے ہوں اور عمل کے ذریعہ اس کا نمونہ پیش کرتے ہوں، وہ بالغ نظر بھی ہوں اور روشن دل بھی، ان کے اندر خدا کی خشیت ہو، رسول کی محبت ہو، دین کی عظمت ہو اور وہ علمی بصیرت اور تفقہ کی نعمت سے بھی سرفراز ہوں۔

یہ ضرورت پڑے گی تین کاموں کے لئے، ایک تو احکام شرعیہ کو سمجھنے اور سمجھانے اور ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوں، ان کو حل کرنے کے لئے — جس کو حدیث میں ''اجتہاد'' سے تعبیر کیا گیا ہے — دوسرے: بندگانِ ہوس کی طرف سے دین میں انحراف پیدا کرنے کی اور شریعت میں آمیزش اور احداث فی الدین کی جو مذموم کوششیں کی جائیں، ان کے مقابلہ کے لئے، اس کو حدیث میں ''تجدید'' کہا گیا ہے، تیسرے: اُمت کی اصلاح، یعنی جن لوگوں میں انکار نہ ہو مگر غفلت ہو، جن کے اندر فکری انحراف نہ ہو؛ لیکن تہذیبی وعملی ارتداد پایا جاتا ہو، ان کو دین کی حقیقی تعلیمات پر قائم رکھنے کی سعی کی جائے، اس کو اللہ تعالیٰ نے ''انذار'' سے تعبیر فرمایا ہے اور قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس کا ذکر آیا ہے، اجتہاد، تجدید اور انذار کی سہ رخی کوششوں کو ہم آسان زبان میں ''تحقیق دین، حفاظت دین اور دعوت دین'' سے تعبیر کرسکتے ہیں، اُمت کی ان ضرورتوں کے لئے قیامت تک اللہ کے مقبول بندے پیدا ہوتے رہیں گے اور یہ اُمت ایسے افراد کے وجود سے نہ بانجھ ہوگی اور نہ خالی۔

یوں تو دنیا کے ہر علاقہ میں ایسے علماء ربانیین پیدا ہوتے رہے ہیں؛ لیکن بعض علاقوں اور شہروں میں علم دین کی طرف توجہ، پہلے سے علماء ومشائخ کی موجودگی اور فطری صلاحیتوں کی بنا پر زیادہ شخصیتیں پیدا ہوئیں، جیسے: حرمین شریفین، بیت المقدس، کوفہ، بصرہ، بغداد، دمشق، قاہرہ اور اُندلس وغیرہ، ایسے ہی علم خیز ممالک میں ایک ہندوستان بھی ہے، جہاں یوں تو شروع ہی سے علماء کی ایک بڑی تعداد فروکش تھی؛ لیکن خاص کر جب خلافت عباسیہ میں تاتاری فتنہ شروع ہوا اور پوری مملکت میں قتل وغارت گری کا بازار گرم ہوگیا، تب سے بڑے بڑے اہل علم

نے ہندوستان کی طرف ہجرت کی اور ہندوستان کے مختلف شہر اور قصبہ جات بھی علم وفن کے مرکز بن گئے، جگہ جگہ درس کی مسندیں بچھیں اور تعلیم وتعلم کا چراغ روشن ہوا۔

ان ہی مقامات میں ایک ''دیوبند'' ہے، یہ یوں تو بہت قدیم آبادی ہے، جو بزرگوں کا مسکن رہی ہے، جہاں سے اہل دل کے قافلے گذرے ہیں اور انھوں نے اس کی فضاؤں میں نسیم ہدایت کی خوشبو محسوس کی ہے؛ لیکن پوری دنیا میں اس کو جو شہرت حاصل ہوئی، وہ یقیناً دارالعلوم کی نسبت کا فیض ہے، اسی قصبہ دیوبند میں ایک ممتاز علمی خاندان ''عثمانی شیوخ'' کا ہے، جو ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے، جس کے مورثِ اعلیٰ شیخ ابوالوفاء عثمانی تھے، اسی خاندان کے ایک بزرگ حضرت مولانا فضل الرحمٰن عثمانی (متوفی: ۱۳۲۵ھ) ہوئے، جو دارالعلوم دیوبند کے بانیوں میں تھے اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے دست راست شمار کئے جاتے تھے، ان کے تین معروف صاحبزادے ہوئے، تینوں نادرۂ روزگار اور گوہر یکتا: حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی اور حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ—— مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی (متوفی: ۱۳۴۸ھ) عرصہ تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم بھی رہے اور متعدد کتابیں آپ کی یادگار ہیں، جن میں سے ''دنیا میں اسلام کیوں کر پھیلا؟'' خاص طور پر قابل ذکر ہے، مولانا شبیر احمد عثمانی اپنے زمانے کے مقبول خطباء، صاحب نظر محققین اور بلند پایہ مصنفین میں تھے، اس حقیر کی نظر میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے بعد ہمارے حلقہ کے سب سے بڑے عالم یہی تھے، انھوں نے سرگرم عملی سیاست میں بھی حصہ لیا اور پاکستان بننے کے بعد مغربی پاکستان میں پہلی دفعہ اس ملک کا جھنڈا لہرایا، یوں تو آپ کی بہت سی تالیفات ہیں؛ لیکن خاص کر ''ترجمہ شیخ الہند'' پر حواشی اور صحیح مسلم کی شرح ''فتح الملہم'' ایسے علمی کارنامے ہیں، جو ہمیشہ آبِ زر سے لکھے جائیں گے۔

ان تینوں میں برادر بزرگ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل و دماغ کا حسین امتزاج بنایا تھا، آپ کو استاذ الاساتذہ مولانا محمد یعقوب

صاحب نانوتویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے شرف تلمذ حاصل تھا، نیز مولانا محمد یعقوب نانوتویؒ کے علاوہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ سے احسان وتزکیہ کی راہ میں مجاز تھے، آپ نے دارالعلوم میں تفسیر، حدیث اور فقہ کی اہم کتابوں کے درس بھی دیئے، ۱۳۰۱ھ میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سرپرست دوم دارالعلوم دیوبند کی تجویز پر دارالعلوم میں باضابطہ دارالافتاء قائم ہوا اور حضرت گنگوہی کی نگاہ گوہر شناس نے اس اہم ذمہ داری کے لئے مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کا انتخاب کیا، پھر مفتی صاحب جب تک دارالعلوم میں رہے، افتاء کی خدمت انجام دیتے رہے، مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب دامت برکاتہم (مرتب فتاویٰ دارالعلوم) کی تحریر کے مطابق کم وبیش سوا لاکھ فتاویٰ آپ کے قلم سے جاری ہوئے؛ البتہ جن فتاویٰ کا ریکارڈ موجود ہے وہ (۳۷۵۶۱) ہیں۔

حضرت مفتی صاحب دارالعلوم کے شعبۂ افتاء کی خشت اول ہیں، انھوں نے گویا حلقہ دیوبند کے اربابِ افتاء کے لئے فتویٰ نویسی کا ایک منہج متعین کر دیا، آپ کے فتاویٰ کی چند خصوصیات —— جو خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جن کا کچھ تجربہ اس حقیر کو بھی ہے اور مخدوم گرامی حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحب نے فتاویٰ دارالعلوم کے مقدمہ میں تفصیل سے اس پر روشنی ڈالی ہے —— کا تذکرہ یہاں مناسب ہوگا :

☆ مفتی صاحب کی زبان نہایت سلیس، شستہ، رواں اور عام فہم ہے، اس اعتبار سے ان کی زبان ان کے معاصرین میں امتیازی خصوصیت کی حامل ہے، اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی آج اگر کوئی عام آدمی ان کے فتاویٰ کو پڑھ لے تو انشاء اللہ وہ اسے بسہولت سمجھ لے گا اور اپنے گوہر مقصود کو پالے گا، میرے حقیر مطالعہ کے مطابق اُس دور کے فتاویٰ نویسوں میں مفتی عزیز الرحمٰن صاحب عثمانیؒ اور مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کی فتویٰ نویسی کا اُسلوب آج بھی اہل علم کے لئے قابل تقلید ہے۔

☆ فتویٰ میں اگر بہت تفصیل لکھی جائے تو بعض اوقات فقہی حدود کی رعایت متاثر

ہوجاتی ہے؛ چنانچہ بعض حضرات ایسا جواب لکھتے ہیں کہ ان کے جواب کے اندر مستفتی کو اپنا جواب تلاش کرنا پڑتا ہے، بعض حضرات کے فتاویٰ اتنے مختصر ہوتے ہیں کہ مستفتی کو اطمینان نہیں ہوتا؛ بلکہ کبھی تو ''جی ہاں'' اور ''جی نہیں'' میں جواب دیا جاتا ہے — مفتی صاحب کا جواب ان دونوں کے درمیان ہوتا، نہ اتنا مختصر کہ تشفی نہ ہو پائے اور نہ اتنا طویل کہ عام لوگوں کو اپنے سوال کا اصل جواب سمجھنا دشوار ہوجائے۔

☆ ہر فتویٰ میں حوالہ یا مکمل حوالہ کا اہتمام نہیں ہوتا، سوال و جواب کی نوعیت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس طرح کے جوابات عوام کے ہوتے تھے؛ لیکن اہل علم کے لئے جو جوابات لکھتے، وہ نسبتاً مفصل نیز دلائل اور حوالوں کے ساتھ ہوتا، یعنی مخاطب کی رعایت کے ساتھ فتویٰ تحریر فرماتے۔

☆ اُم المومنین حضرت عائشہ ﷞ کی روایت ہے کہ جب بھی رسول اللہ ﷺ کے سامنے کسی مسئلہ کے دو پہلو میں سے کسی پہلو کے درمیان اختیار دیا جاتا، آپ ﷺ اس میں سے اپنی اُمت کے لئے آسان کا انتخاب فرماتے، حضرت مفتی صاحب اسی سنت پر عامل تھے؛ چنانچہ مرتب فتاویٰ مفتی ظفیر الدین صاحب کا بیان ہے :

> حضرت مفتی صاحب قدس سرہٗ کا کمال یہ ہے کہ عرفِ زمانہ سے کبھی صرف نظر نہیں کرتے؛ بلکہ اس پر گہری نظر رکھتے ہیں، اگر کسی مسئلہ کے دو مختلف مفتی بہ پہلو ہیں تو ایسے موقع پر آپ سہل پہلو کو اختیار کرتے ہیں اور اسی پر فتویٰ دیتے ہیں، ایسی صورت ہرگز نہیں اختیار کرتے جو عوام کے لئے مشکلات پیدا کرنے والی ہو؛ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ آپ نے کنویں کی پاکی کے سلسلے میں تین سو ڈول نکالنے والی صورت پر فتویٰ دیا ہے، اسی طرح غیر ممالک سے تجارت میں بینک کا سود جو مجبوراً ادا کرنا پڑتا ہے اور اس کے بغیر تجارت ممکن نہیں، اسے اصل قیمت میں داخل کر کے تجارت کی

اجازت مرحمت فرمائی ہے، حرام قرار دے کر مسلمانوں کو اس طرح
کی تجارت سے محروم نہیں کیا۔

☆ مفتی صاحب غالباً اس بات کو بھی پیش نظر رکھتے تھے کہ کون سا قول اس دور میں اُمت کے لئے دینی مصلحت پر مبنی ہے؟ جیسے نماز جمعہ کا مسئلہ ہے، نماز جمعہ ہندوستان جیسے ممالک میں مسلمانوں کی اسلامی شناخت باقی رکھنے کا ایک موثر ذریعہ ہے؛ اس لئے اس کی شرائط میں کتاب وسنت کی حدود میں رہتے ہوئے جس قدر نرمی اور وسعت برتنا ممکن ہو، برتنا چاہئے، جمعہ کی شرائط میں سے ایک احناف کے نزدیک ''اذن عام'' ہے—اس پس منظر میں سوال یہ ہے کہ کارخانہ کے اندر جمعہ قائم کرنے کی اجازت ہوگی یا نہیں؟ اس سلسلہ میں مفتی صاحب کا رجحان جواز کا ہے؛ کیوں کہ ایک تو کارخانہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دینا خاص طور پر نماز جمعہ سے روکنے کے لئے نہیں ہے، دوسرے: جب جمعہ متعدد مقام پر ہوتا ہو تو اذن عام کی شرط اتنی اہمیت کی حامل باقی نہیں رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر ایک جگہ جمعہ کا اذن نہ ہو تو دوسری جگہ نماز ادا کی جاسکتی ہے، غرض کہ مفتی صاحب نے اُمت کی داعیانہ مصلحت کو پیش نظر رکھا ہے۔

☆ اسی طرح مذہب کی جو روایت نص سے ہم آہنگ ہو، مفتی صاحب اس کو ترجیح دیتے ہیں، جیسے تشہد میں اشارہ بالسبابہ کا مسئلہ ہے، بعض احناف اس کے قائل نہیں ہیں، معروف بزرگ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا بھی یہی نقطۂ نظر تھا؛ لیکن آپ نے اشارہ بالسبابہ کے مشروع ہونے کو ترجیح دی ہے؛ کیوں کہ یہ صحیح ومعتبر حدیثوں سے ثابت ہے۔

☆ مفتی صاحب اُمت کی ضرورت کو سامنے رکھ کر فتویٰ دیا کرتے تھے اور ان کی مشکلات کو حل کرنے میں فقہاء کے اختلاف سے فائدہ بھی اُٹھاتے تھے، جیسے تفریق کے ایک مسئلہ میں فرماتے ہیں :

اگر مفتی کی رائے میں قرائن و حالات سے یہ راجح معلوم ہو کہ
بحالت موجودہ زوجین میں موافقت نہ ہوگی اور فسخ نکاح کا حکم نہ کرنا

دیگر فتن کا باعث ہوگا؛ جیسا کہ مظنون ہے اور ''**عسی أن تعجز عن المقام معه**'' کا چسپاں ہونا یہاں زیادہ قریب الوقوع معلوم ہوتا ہے تو قول امام ابو یوسف کو اختیار کرنا بھی مؤید بالروایات ہے''۔ (فتاویٰ دار العلوم دیو بند: ۲۴۰/۸)

مفتی صاحب کی اس علمی و فقہی بصیرت کی بنیاد پر وہ اس وقت دار العلوم دیو بند کے منصب افتاء کی رونق بنائے گئے، جب خود حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ زندہ تھے ـــــ جنھیں علامہ کشمیریؒ، علامہ ابن عابدین شامیؒ پر تفقہ میں فائق قرار دیتے تھے ـــــ نیز حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے فقیہ موجود تھے۔

حضرت مفتی صاحب کی زندگی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ جیسے وہ علم و تفقہ کی چوٹی پر تھے، اسی طرح ورع و تقویٰ اور زہد و خشیت میں بھی سلف صالحین اور عہد صحابہ و تابعین کی یاد تازہ کرتے تھے، بے حد تواضع و خاکساری، بڑوں کے ساتھ ہی نہیں چھوٹوں کے ساتھ بھی ایسا سلوک کہ گویا وہ ان کے خورد ہوں، تعلق مع اللہ، ذکر و شغل کا اہتمام، مفتی صاحب کے یہ وہ اوصاف ہیں، جو سینہ بہ سینہ دار العلوم دیو بند میں نقل ہوتے آرہے ہیں اور واقعی ہم جیسے تہی دامن علم اور کوتاہ عمل لوگوں کے لئے اُسوۂ و نمونہ ہیں، واقعہ یہ ہے کہ اگر خانوادۂ عثمانی میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی ذہانت اور علمی بصیرت کا کوئی جواب نہیں، مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی کی انتظامی لیاقت اور معاملہ فہمی اپنی مثال آپ ہے تو حضرت مفتی صاحب زہد و تقویٰ اور اتباعِ سنت کے اہتمام میں امتیازی شان کے حامل ہیں۔

آپ ۱۲۷۵ھ کو پیدا ہوئے، آپ کا تاریخی نام ظفر الدین ہے، ۱۲۸۵ھ میں حفظ کا آغاز ہوا اور ۱۲۸۷ھ میں تکمیل، نیز ۱۲۹۵ھ میں دورہ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ دار العلوم دیو بند کے معین مدرس رہے، پھر مدرسہ اسلامیہ اندر کوٹ میرٹھ میں چند سال خدمات انجام دیں، ۱۳۰۹ھ میں آپ دار العلوم دیو بند کے نائب مہتمم

اور ۱۳۱۰ھ میں دارالعلوم کے پہلے مفتی مقرر ہوئے، آپ کو شاہ رفیع الدین دیوبندی مہتمم ثانی دارالعلوم دیوبند سے سلسلہ نقشبندیہ میں اجازت حاصل تھی، آپ کے مجازین میں معروف عالم ترجمان السنۃ کے مصنف مولانا بدر عالم میرٹھی مہاجر مدنی بھی شامل ہیں۔

آپ نے جلالین شریف کا اُردو ترجمہ فرمایا، تفسیر معالم التنزیل کی اُردو زبان میں تلخیص مرتب کی، اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ کا رسالہ ''میزان البلاغۃ'' پر حاشیہ لکھا، شعر وسخن کا بھی اللہ نے بہت اچھا ذوق دیا تھا، افتاء کے علاوہ تفسیر وحدیث کی اونچی کتابوں کا درس بھی دیا ہے اور علامہ انور شاہ کشمیری کی علالت کے زمانہ میں بخاری شریف کے چودہ اجزاء جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں پڑھائے ہیں، دارالعلوم دیوبند میں جو اختلاف پیدا ہوا اس وقت آپ علامہ کشمیری وغیرہ کے ساتھ دارالعلوم دیوبند سے ڈابھیل چلے گئے تھے، ۱۳۴۷ھ مطابق ۱۹۲۸ء کو دیوبند میں وفات پائی۔

آج کل معمولی لوگوں پر کتنے سارے طلبہ پی، ایچ، ڈی کر لیتے ہیں، عام اہل علم پر بھی کئی کئی کتابیں آجاتی ہیں؛ لیکن افسوس کہ بعض ایسی شخصیتیں جو رہروانِ علم وتحقیق کے لئے مینارۂ نور اور کاروانِ علم وعمل کے لئے مشعل راہ ہیں، ان پر کوئی قابل ذکر تحریر نہیں آتی، نتیجہ یہ ہے کہ نئی نسل ان کے کارناموں سے نابلد اور ان کی زندگی سے روشنی حاصل کرنے سے قاصر ہے، ایسی ہی شخصیتوں میں مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی نور اللہ مرقدہٗ بھی ہیں، آپ کی حیات پر تاریخ دارالعلوم یا فتاویٰ دارالعلوم کے مقدمہ میں جو کچھ ملتا ہے، وہ اگرچہ خوب ہے؛ لیکن ان کی شخصیت کے لحاظ سے بہت مختصر ہے، اس طرح حضرت مفتی صاحب کا تذکرہ گویا ایک فرض کفایہ تھا، جو علماء اور بالخصوص ابنائے دیوبند کے ذمہ تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس فرض کی ادائیگی ایک ایسی شخصیت کے ہاتھوں عمل میں آرہی ہے کہ حضرت مفتی صاحب سے براہ راست استفادہ کرنے والے اہل علم کے رخصت ہونے کے بعد ان سے بڑھ کر کوئی اور شخصیت ...... غالبًا...... اس کام کے لئے موزوں نہیں ہوسکتی تھی،

میری مراد حضرت مولانا مفتی فضیل الرحمٰن ہلال عثمانی دامت برکاتہم (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند و مفتی اعظم پنجاب) سے ہے، مولانا کو صاحب تذکرہ سے نسبی تعلق بھی ہے کہ وہ ان کے حفید رشید ہیں اور علمی تعلق بھی ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ فتویٰ نویسی کے ذریعہ اُمت کی رہنمائی میں گذارا ہے، فقہ و فتاویٰ ان کا خاص موضوع ہے، انھوں نے مسلم پرسنل لا سے متعلق شرعی قوانین کو بڑی عمدگی سے دفعہ وار قانون کی زبان میں مرتب کیا ہے، کئی مقبول دعوتی و اصلاحی کتابیں ان کے قلم کی رہین منت ہیں، انھوں نے حضرت مفتی صاحب کی شرح جلالین کو تشریح و تسہیل کے ساتھ مرتب و شائع کیا ہے، جو ''تفسیر روح القرآن'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، انھوں نے ''تفہیم المسلم'' کے نام سے صحیح مسلم کے مقدمہ اور کتاب الایمان کی جچی تلی تشریح فرمائی ہے، نحو و صرف اور فارسی کی تدریس کے لئے ان کی تالیفات بڑی اہمیت کی حامل ہیں، ابھی ماضی قریب میں '' قاعدہ تعلیم القرآن'' کے تین حصے عام لوگوں کی قرآن مجید تک رسائی کے لئے بڑی اہم کتابیں ہیں، جنھیں عام کرنے کی ضرورت ہے، سیرت کے موضوع پر ''معمارِ انسانیت'' اور ''نبی رحمت کا پیامِ رحمت'' ایسی تالیفات ہیں، جو نہ صرف مسلمانوں کے لئے اہم علمی و فکری سوغات ہیں؛ بلکہ غیر مسلموں کو بھی پیش کئے جانے کے لائق ہیں۔

علمی گہرائی کے ساتھ ساتھ ان کے قلم کی خوبصورتی اور تحریر کی شگفتگی و دل آویزی علماء و اہل قلم کے لئے ایک نمونہ ہے، وہ مشکل سے مشکل مضمون کو آسان ترین زبان میں لکھنے کا سلیقہ رکھتے ہیں، خشک سے خشک موضوع کو بھی زبان کی رعنائی دلچسپ بنا دیتی ہے، سنجیدہ مضامین میں بھی ادب کی چاشنی اور گاہے طنز و مزاح کے نشتر اصحابِ ذوق کی ضیافت کرتے ہیں، ان علمی و قلمی سرفرازیوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان کو جو فکر رسا عطا فرمائی ہے اور قومی و ملی مسائل پر ان کی سوچ جس قدر دور رس ہوتی ہے، وہ بھی ان کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو ہے، اس لئے مختلف ملی تنظیمیں ان کے مشوروں سے استفادہ کرتی ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن رکین اور مختلف علمی تنظیموں کے رہنماؤں میں ہیں اور ہر جگہ ان کی رائے کو قدر و وقعت کی

نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔

واقعہ ہے کہ ان کی یہ تالیف ''دیر آید درست آید'' کا مصداق ہے، اس میں مفتی صاحب کا خاندانی پس منظر، وطن عزیز دیوبند کی تاریخ، تدریسی خدمت، افتاء کے سلسلہ میں مفتی صاحب کا مزاج و مذاق اوران کے کمالات، تعلق مع القرآن، بلند پایہ اخلاق، سنت کی اتباع، بزرگوں سے تعلق، حضرت مفتی صاحب کے معمولات، ان کے پسماندگان، وفات کے اس موقع پراخبارات کی رپورٹیں، نیز مفتی صاحب کے دیگراحوال، غرض کہ صاحب تذکرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر بڑی خوش اُسلوبی کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے اور یقیناً اب یہ اپنے موضوع پر ایک جامع تذکرہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ مجھ جیسے کوتاہ علم کے لئے اس کتاب پر کچھ لکھنا ''چھوٹا منھ بڑی بات'' کے مترادف ہے؛ لیکن ہمارے بزرگوں میں خردنوازی کا جو جذبہ رہا ہے، مؤلف محترم واقعی اس کا نمونہ ہیں؛ اسی لئے ان کے اصرار پر چند سطریں لکھی گئی ہیں اور یہ خیال بھی ہے کہ اس طرح صاحب تذکرہ رحمۃ اللہ علیہ پر لکھنے والوں میں کسی درجہ اس حقیر کا بھی شمار ہوجائے اور شاید اس کی برکت سے ان کے علم وورع کا کوئی حصہ اس گنہگار کے حصہ میں آجائے کہ :

بلبل را ہمیں بس است کہ او قافیۂ گل است

اللہ تعالیٰ ہم سب کو صاحب تذکرہ کی زندگی کو اپنے لئے عکس حیات بنانے کی توفیق عطا فرمائے اور مؤلف گرامی کا سایۂ عاطفت تادیر ملت اسلامیہ پر قائم رہے۔

واللہ هو المستعان ۔

سالار قافلۂ ختم نبوت مولانا محمد یوسف بنوریؒ ٭

علم وفن سے عشق تھا جن کی طبیعت کا خمیر

نسباً سادات سے ہیں، سلسلۂ نسب کی نویں پشت میں معروف بزرگ سید آدم بنوریؒ آتے ہیں، جو شیخ احمد سرہندی کے اجلۂ خلفاء میں تھے، ۶/ربیع الثانی کو پشاور کے پاس ایک بستی میں پیدا ہوئے، سن پیدائش ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء ہے، وقت سحر کا اور دن جمعرات کا، —— قرآن مجید خود اپنے والد ماجد سے پڑھی، صرف ونحو کی ابتدائی تعلیم کابل کے ایک مکتب میں ہوئی، متوسطات تک کی کتابیں پشاور اور کابل کے مختلف اساتذہ سے پڑھیں، اس دور کے اہم اور قابل ذکر اساتذہ میں حافظ عبداللہ پشاوری (شہید ۱۳۴۰ھ) اور مولانا عبداللہ میر افغانی ہیں، منتہی کتابیں زیادہ تر دارالعلوم دیوبند میں ۱۳۴۵ھ تا ۱۳۴۷ھ کے درمیان ہوئیں، یہاں آپ نے جن اساتذۂ کبار اور نابغۂ روزگار ہستیوں سے استفادہ کیا، ان میں مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا میاں اصغر حسین صاحبؒ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔

۱۳۴۷ھ کے بعد بعض اختلافات کی بناء پر مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور بعض دیگر اکابر اساتذہ طلبہ کی ایک بڑی جمعیت کے ساتھ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل (گجرات) چلے گئے، مولانا یوسف بنوریؒ بھی ان جانے والوں میں تھے؛ چنانچہ دورۂ حدیث ڈابھیل ہی میں کیا، ۱۹۳۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے فاضل کا امتحان دیا اور کامیابی حاصل کی۔

طالب علمی کے یہ زینے طے ہوئے تو چار سال تک خود پشاور میں مقیم اور قومی ملی کاموں میں مصروف رہے، جمعیۃ علماء پشاور کے صدر منتخب ہوئے، یہ دور معاشی اعتبار سے ابتلاء وآزمائش کا تھا، اسی دوران عقد نکاح بھی ہوا، پھر مادر علمی جامعہ اسلامیہ ڈابھیل میں مدرس ہوئے اور ترقی

٭ مولانا بنوریؒ کی وفات کے موقع پر ماہنامہ دارالعلوم دیوبند میں طبع ہونے والا مضمون۔

کر کے شیخ الحدیث اور صدر مدرس کے منصب جلیل پر بھی فائز ہوئے، یہاں ''مجلس علمی'' کے رکن بھی بنے اور بعض کتابوں کی طباعت کے سلسلہ میں مصر، ترکی، سعودیہ وغیرہ کا سفر بھی کیا، اس دوران دارالعلوم دیوبند کی جانب سے طبقۂ علیا کی مدرسی اور منصب افتاء کے لئے بار بار اور بہ اصرار پیش کش ہوتی رہی، مگر قبول نہ کیا۔

جنوری ۱۹۵۱ء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ ''نوزائیدہ پاکستان'' تشریف لے آئے اور دارالعلوم الاسلامیہ ٹنڈو الہ حیدرآباد میں شیخ التفسیر کے منصب پر فائز المرام ہوئے؛ مگر تین سال سے زیادہ وہاں نہ رہ سکے اور کراچی کا رُخ کیا، متعدد ارباب مدارس نے صدر مدرس کی پیشکش کی، مگر مولانا نے معذرت کردی اور بعض دیگر حضرات کی رفاقت میں ''فارغین'' کی تربیت کے لئے ایک ادارہ کی داغ بیل ڈالی، مگر رفاقت راس نہ آئی اور یہ سلسلہ بھی منقطع ہوگیا، پھر حج کیا، دوران حج استخارہ کیا اور ''مدرسہ عربیہ'' کے نام سے نیوٹاؤن کراچی میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو پہلے مدرسہ عربیہ اسلامیہ اور پھر ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کے نام سے موسوم ہوا اور بحمداللہ اب تک قائم ہے۔

مولانا بنوریؒ اپنی علمی عظمت و کمال کے اعتبار سے اس صدی کی چند نابغۂ روزگار ہستیوں میں شمار کئے جانے کے لائق ہیں، ان کے علم میں وسعت بھی تھی اور گہرائی بھی، ان کی ذات کا سب سے بڑا امتیاز علمی اعتبار سے جامعیت اور ہمہ گیریت ہے، وہ بیک وقت ایک فقیہ اور اسلام کے اُصول قانون کے رمز شناس بھی تھے اور قرآنیات اور اُصول تفسیر پر عمیق نظر بھی رکھتے تھے، وہ اہل سنت والجماعت کے معتدل اور کتاب وسنت سے ہم آہنگ افکار ونظریات کے بلند پایہ ترجمان اور وکیل بھی تھے اور اسلام مخالف فتنوں اور سازشوں سے باخبر اور آگاہ بھی، متقدمین اور اسلاف کے علوم سے ان کو گہری اور والہانہ وابستگی بھی تھی اور جدید طرز واُسلوب پر اسلام کی ترجمانی کا سلیقہ بھی ان کو حاصل تھا، وہ جدید عربی انشاء وادب کے اُسلوب کے شہسوار بھی تھے اور اُردو بھی خوب لکھتے تھے، نیز ان کے علمی فضل وجلال کا سب سے بڑا میدان ''علم حدیث'' تھا، جس میں ان کے معاصرین میں کم ہی شخصیتیں ان کی ہمسر

ہوں گی۔

عربی نثر نگاری میں ان کا قلم کسی پختہ کار عرب ادیب سے کم نہیں تھا، حدیث کی مشکل اور دقیق بحثوں، فقہ الحدیث کے ژولیدہ مسائل، رجال کے خشک ابواب اور کلام وعقائد کے مابعد الطبیعی خالص فلسفیانہ ابحاث پر گفتگو کرتے وقت بھی ان کا قلم اپنی سحر نگاری، سلاست وروانی اور لب ولہجہ کی برجستگی وچاشنی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا اور 'معارف السنن' اس طرز واُسلوب کا جیتا جاگتا نمونہ ہے!

مولانا کو نثر کی طرح عربی نظم اور شعر گوئی میں بھی بڑا ادرک حاصل تھا، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات پر آپ نے دوطویل مرثیے کہے ہیں، یہ مراثی جذبات دل کی عکاسی کا بہترین نمونہ ہیں، نعتِ رسالت اور واقعۂ معراج پر آپ کی ایک طویل نظم جو۷۲ اشعار پر مشتمل ہے ہفت روزہ ''الاسلام'' (مصر) کی خصوصی اشاعت (۲۸/رجب ۱۳۵۷ھ) میں شائع ہو چکی ہے، جس کو مصر کے علمی اور ادبی حلقہ میں بہت سراہا گیا۔

مولانا بنوریؒ اپنی فقہی بصیرت کے اعتبار سے بھی اپنے عہد کے ممتاز لوگوں میں تھے، فقہاء کے اختلافات، وجوہ ترجیح، فقہی ماٴخذ، شریعت کے مقاصد اور احکام شریعت کے علل پر ان کی عمیق نظر تھی ''معارف السنن'' جہاں ان کے محدثانہ ذوق کا نمونہ ہے، وہیں ان کی فقہی بصیرت کا شاہکار بھی ہے، انھوں نے مذاہب اربعہ کے فقہی ماٴخذ کا براہ راست مطالعہ کیا ہے، وہ مسلک شافعی براہ راست ''کتاب الام'' سے، مالکیہ کا مسلک ''المدونہ'' سے اور امام احمد کی رائے ''المغنی لابن قدامہ'' سے نقل کرتے ہیں، بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ وہ ''واسطوں'' کو بنیاد بنا کر اختلاف مذہب نقل کرتے ہوں، پھر فقہاء احناف خود آپس میں جس مسئلہ کی بابت اختلاف رکھتے ہوں، ان میں تطبیق وترجیح سے کام لیتے ہیں، ان کا فقہی مذاق ہی تھا کہ انھوں نے شرح حدیث کے لئے صحیحین کے بجائے امام ترمذی کی ''الجامع'' کا انتخاب کیا۔

انھوں نے مولانا انور شاہ کشمیریؒ، جیسے جید، دیدہ ور اور علوم اسلامی کے شناور کی نگرانی اور سرپرستی میں فتاویٰ نویسی کی مشق کی اور فتاویٰ لکھے اور مولانا نبوریؒ نے خود لکھا ہے کہ شاہ

صاحب نے ہمیشہ ان کے فتاویٰ کی تصویب کی اور کبھی ترمیم یا تبدیلی کی نوبت نہیں آئی۔

تفسیر اور علوم القرآن پر بھی ان کی گہری نظر تھی، مگر اس کا اندازہ خاص طور پر ان کے اس محققانہ اور عالمانہ مقدمہ سے ہوتا ہے، جو انھوں نے اپنے استاذ و مربی مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی کتاب ''مشکلات القرآن'' پر لکھا ہے، متقدمین، متأخرین، اور جدید مصنفین کی تفسیروں پر ان کی خصوصیات، ان کے تفسیری مذاق، ان کی لغزشوں اور زلتوں اور ان کی خامیوں اور کمزوریوں پر ان کی گہری نگاہ ہے، انھوں نے مصر کے مشہورِ عالَم ادیب اور قرآن مجید کے شہرہ آفاق مفسر علامہ طنطاوی سے ان کی تفسیر قرآن کے سلسلہ میں بالمشافہ گفتگو کی اور ان پر مدلل تنقید فرمائی، اس موقع پر علامہ طنطاوی کے لئے اپنی غلطی اور مولانا یوسف بنوریؒ کی علمی عبقریت کا اعتراف کئے بغیر چارہ نہیں رہا، اور انھوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہمارے لئے فرشتۂ اصلاح بنا کر بھیجا ہے۔

مولانا بنوریؒ کا اصل موضوع اور جدوجہد کا اصل میدان ''علم حدیث'' ہے، وہ اپنے تمام شیوخ میں تین بزرگوں سے بہت متاثر ہیں، مولانا انور شاہ کشمیریؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور علامہ زاہد الکوثری —— اور یہ تینوں ہی حضرات اپنے عہد کے ان نادرۂ روزگار علماء میں ہیں، کہ حدیث اور اُصولِ حدیث میں جن کی مہارت و امتیاز کی طوطی بولتی تھی اور ان میں بھی وہ جس شخصیت پر سب سے زیادہ وارفتہ ہیں، وہ ہیں مولانا کشمیریؒ، جن کے مطالعہ کی وسعت، گہری بصیرت، خارق عادت حافظہ اور دقت نظر کی مثال ماضی قریب میں کم ہی ملے گی۔

اس فن میں آپ ابتداء ہی سے ممتاز تھے، شروع شروع میں جب ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' میں آپ نے اپنی تدریسی خدمت کا آغاز کیا تو ایک بار یہ مسئلہ پیدا ہوگیا کہ سنن کون پڑھائے؟ اس وقت نظر میں تین اساتذہ تھے، اور تینوں علمی حیثیت سے بہت ممتاز تھے، مولانا عبدالرحمٰن امروہویؒ، مولانا بدر عالم میرٹھیؒ اور مولانا بنوریؒ، طلبہ سے رائے لی گئی تو ۲۷ ووٹ مولانا بنوریؒ کے حق میں آئے، ۷ مولانا امروہویؒ اور ۳ مولانا میرٹھی کے حق میں۔

عنفوان شباب سے لے کر وفات تک پوری زندگی آپ حدیث کی مختلف کتابوں اورصحاح ستہ کا درس دیتے رہے اور ہمیشہ ممتاز اور طلبہ میں اپنی غیر معمولی علمی استعداد، تفہیم وتعبیر کی قدرت، وسعت مطالعہ اور توجہیات پر گہری نظر کے اعتبار سے مقبول رہے۔

علم حدیث میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''معارف السنن'' شرح ترمذی ہے، جو مفصل بھی ہے اور مختلف جہتوں سے منفرد بھی، اب تک اس کی چھ جلدیں شائع ہو چکی ہیں، جو ''کتاب الحج'' تک ہیں، اس کتاب میں مولانا نے اپنے استاذ مولانا انور شاہ کشمیری کے افادات سے بہت استفادہ کیا ہے اور بڑی داد تحقیق دی ہے — مولانا کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کسی مسئلہ سے متعلق ایسی عبارت بھی نقل کرتے ہیں، جو اس خاص مسئلہ کے بارے میں کسی غیر متعلق بحث میں ضمنی طور پر آ گئی ہے اور یہ دراصل ان کے استاذ کا ورثہ ہے۔

ترمذی کی ایک شرح مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے ''تحفۃ الاحوذی'' کے نام سے لکھی ہے، یہ بھی بڑی فاضلانہ شرح ہے؛ مگر اس کتاب میں اکثر مقامات پر فقہاء احناف بالخصوص علامہ بدرالدین عینی (مصنف عمدۃ القاری) صاحب آثارالسنن (تالیف: علامہ ظہیر احسن شوق نیموی) مولانا خلیل احمد سہارنپوری (مصنف بذل المجہود) اور مولانا انور شاہ کشمیری (صاحب العرف الشذی) پر سخت تنقیدیں کی گئی ہیں اور شاید یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ دوسری خوبیوں کے باوجود اس کتاب میں جابجا ایسا لب ولہجہ استعمال کیا گیا ہے، جو علمی وقار اور عالمانہ شائستگی کے شایان شان نہیں ہے — مولانا نے اپنی کتاب میں ان کا عالمانہ تعاقب کیا ہے اور ان کی تنقیدوں کا مدلل جواب دیا ہے۔

ظاہری تعارض کو دفع کرنے اور مشکلات حدیث کے حل کرنے میں ان کو بڑا ملکہ حاصل ہے، انھوں نے اس باب میں صرف نقل وروایت ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے؛ بلکہ خود اپنی جانب سے نئی توجیہات بھی پیش کی ہیں — وہ اکثر وبیشتر پوری قوت کے ساتھ اخیر میں علماء دیوبند اور خصوصاً اپنے استاذ مولانا انور شاہ کشمیری کی رائے نقل کرتے ہیں اور ان ہی کی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔

''رجال'' کا فن ایک مشکل فن ہے، اور وسیع مطالعہ کا متقاضی ہے، متأخرین شارحین حدیث عام طور پر ''رجال'' سے صرف نظر کر جاتے ہیں اور صرف ان خاص اسناد سے بحث کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، جن پر صاحب کتاب نے خود گفتگو کی ہے، مگر اپنے استاذ کی طرح مولانا بھی اس موضوع پر ہر جگہ کلام کرتے ہیں اور امام ترمذی جو علماء عراق کی مؤید احادیث پر نشتر چلانے میں مہارت رکھتے ہیں اور سرسری طور پر نقد کرتے چلے جاتے ہیں، مولانا نے ایسے مقامات پر مفصل گفتگو فرمائی ہے۔

یوں تو مولانا کی یہ کتاب ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' کا مصداق ہے، مگر ان کی علمی بصیرت اور محدثانہ مذاق کو سمجھنے کے لئے ''قراءۃ فاتحہ خلف الامام، آمین بالجہر، کلام فی الصلوٰۃ، صلوٰۃ الکسوف، تیمّم، رفع یدین، استنجاء بالاحجار وغیرہ'' جیسے چند موضوعات پر ان کی شرح ترمذی کا مطالعہ بھی کافی ہوگا۔

مولانا حنفی ہیں؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ متصلب حنفی ہیں؛ مگر اس کے باوجود اگر کہیں ان کو فقہاء احناف کی رائے حدیث سے ہٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، تو وہ اس پر بھی تنقید کرتے ہیں؛ چنانچہ انھوں نے تشہد میں اشارہ کے مسئلہ میں حدیث کے مقابلہ میں امام ابوحنیفہ کے قول کو ترجیح دینے کے سلسلہ میں ''تحفۃ الکندی'' کے مصنف پر ملا علی قاری کی سخت تنقید نقل کی ہے، جو ان کے منصفانہ انداز فکر کا واضح ثبوت ہے۔

مولانا بنوریؒ کو مولانا انور شاہ کشمیریؒ، علامہ زاہد الکوثری، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی، مولانا عبدالرحمٰن امروہوی، شیخ حسین بن محمد طرابلسی، شیخ عمران المقدسی المالکی، شیخ محمد بن حبیب اللہ الشنقیطی، شیخ خلیل الخالدی المقدسی اور شاہ عبدالغنی محدث دہلویؒ کی صاحب زادی امۃ اللہ المحدثہ جیسے نابغۂ روزگار علماء سے اجازت حدیث حاصل ہے —— جب کہ مولانا سے حدیث کی اجازت حاصل کرنے والوں میں مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور شیخ حسن مشاط المکی جیسے عالم اسلام کے بالغ نظر علماء شامل ہیں۔

مولانا بنوریؒ ایک بالغ نظر، نبض شناس اور زمانہ آشنا شخصیت کے مالک تھے، علوم اسلامیہ پر ان کو گہری بصیرت اور درسیات کی تدریس کا طویل تجربہ حاصل تھا، پھر وہ جدید حالات، اس کے تقاضوں اور اس کی ضرورتوں کو بھی اچھی طرح سمجھتے تھے، اس بناء پر مدارس اسلامیہ کے تعلیمی نظام اور نصاب کے لئے وہ ایک متوازن اور معتدل نظریہ رکھتے تھے، وہ ان ضرورت سے زیادہ جدت پسند حلقہ کے ساتھ بھی نہیں تھے، جو مدارس کے پورے نصاب کو یکسر قابل ترمیم اور گردن زدنی سمجھتے ہیں اور اگر ان کے مشوروں کو قبول کرلیا جائے تو اسلامی علوم کی حیثیت ثانوی ہوکر رہ جائے، دوسری طرف وہ اس جمود اور ہر قدیم شیٔ کی تقدیس کے روادار بھی نہیں تھے کہ مروجہ ''درسِ نظامی'' سے سرمو انحراف نہ کیا جائے اور نئے علوم اور جدید موضوعات کو شجر ممنوعہ سمجھ لیا جائے، انھوں نے خود اپنے مدرسہ میں اس سلسلہ میں بعض مناسب اصلاحی اقدامات کئے اور ''تخصص'' کے درجہ میں انگریزی کو بھی شامل کیا۔

وہ اسلامی تاریخ کے عہد وسطیٰ —— جو علمی انحطاط و پژمردگی کا دور تھا —— کی ان کتابوں کے روادار بھی نہیں تھے، جن میں لفظی موشگافیوں پر زیادہ توجہ دی گئی ہے اور جس میں پیچیدہ متن لکھنا، الفاظ کے استعمال میں کفایت شعاری برتنا اور دقیق اصطلاحات سے عبارت کو ژولیدہ تر بنادینا تصنیف وتالیف کا کمال تصور کیا جاتا تھا اور جن کتابوں کی تدریس میں ''فن'' اور اصل موضوع سے زیادہ اہمیت کتاب کی چیستاں عبارت اور اس کی مشکلات کو حاصل ہو جاتی ہے —— وہ ان کی جگہ خود متقدمین کی ایسی کتابوں کو لانا چاہتے تھے، جو ''فن'' میں بصیرت پیدا کرتی ہیں اور جن میں سادہ الفاظ اور واضح وسلیس تعبیرات تعبیر اختیار کی گئی ہیں۔

وہ نصابِ تعلیم میں عربی ادب وزبان کی اہمیت اور اُردو ادب وانشاء کی ضرورت کے بھی قائل ہیں، مدرسہ میں تاریخ وسیَر کا دروازہ تقریباً بند ہے، مگر وہ اس کو بھی نصاب میں جگہ پانے کا حق دیتے ہیں؛ لیکن ان کی وجہ سے اسلامیات یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، اُصول فقہ وغیرہ میں حذف وکمی کے روادار نہیں ہیں؛ بلکہ قدیم علوم عقلیہ —— جواب آثار قدیمہ بن کر رہ گئے ہیں —— کو کم کرکے ان مضامین کے لئے گنجائش فراہم کرنے کے قائل ہیں۔

وہ مدارس کے مروجہ طریق اور دراز مدت نصاب تعلیم کو بھی پسند نہیں کرتے، انھوں نے اس سلسلہ میں ایک پنج سالہ نصاب تیار اور رائج کیا، جس کے ذریعہ قلیل مدت میں ایک شخص علوم اسلامیہ سے آشنا ہو سکے اور اور مطالعہ کی ایسی راہ اور علم دین کا ایسا مذاق و وجدان حاصل کر لے کہ اگلے زینے خود طے کر سکے، دوسرا نصاب ''دس سالہ'' تیار کیا، جس میں اپنا زیادہ وقت لگانے کی گنجائش پانے والے ''طالبان علم دین'' لگ سکیں —— پھر انھوں نے ''تخصص'' کے درجات قائم کئے اور ابھی بھی تخصص فی علوم الحدیث، تخصص فی علوم القرآن، تخصص فی الفقہ اور تخصص فی الدعوۃ وارشاد کے شعبے ان کے مدرسہ میں قائم ہیں، اس سلسلہ میں ان کے سامنے اور بھی ''تخصصات'' تھے، مولانا کا یہ اقدام اور طریقہ کار ارباب مدارس کے لئے مشعل راہ ہے۔

وہ قدیم طرز تدریس میں بھی ایک گونہ اصلاح کے قائل ہیں اور چاہتے ہیں کہ قدیم انداز کی دور از کار طویل تقریروں، لفظی بحثوں اور مبادیات پر ضرورت سے زائد گفتگو کے بجائے صرف اصل مقصود کی تفہیم، اور فن کی تعلیم و مشق پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جائے —— اس موضوع پر مولانا کا فاضلانہ مقالہ ''مدارس اسلامیہ کا نصابِ تعلیم و نظام تعلیم'' جو پاکستان سے، پھر دارالعلوم دیوبند سے کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے، اور ماہنامہ الفرقان، لکھنؤ کی زینت بھی بن چکا ہے، بڑا بصیرت افروز اور ان کی بلند نگاہی کا شاہد ہے۔

مولانا کے علمی آثار میں —— جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے —— سب سے عظیم الشان یادگار صحیح ترمذی کی شرح ''معارف السنن'' ہے —— اس سلسلہ میں دوسری اہم تالیف ''عوارف المنن مقدمہ معارف السنن'' ہے، جو ان کے تلمیذ رشید مولانا عبداللہ المختار کے حسب تحریر دو تہائی لکھی جا چکی تھی کہ موت نے ہمیشہ کے لئے ان کے ہاتھ سے قلم چھین لیا، یہ ایک مستقل جلد ہے، اندازہ ہے کہ اس میں مولانا نے علم حدیث کے اُصول و مبادی وغیرہ پر گفتگو کی ہوگی۔

آپ کی ایک اہم اور اپنے موضوع پر منفرد تصنیف ''بغیۃ الاریب فی مسائل القبلۃ والمحاریب'' ہے، جو قبلہ اور محراب کے موضوع پر ہے، مولانا نے اپنی اس تصنیف لطیف کے لئے

امام ''قبلة المجلی فی قبلة المصلی'' تجویز کیا تھا، حضرت تھانوی نے فرمایا کہ نام تو عمدہ ہے؛ لیکن عام فہم نہیں، اس لئے اول الذکر نام رکھو۔

انھوں نے اپنے شیخ مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی ایک مفصل سوانح حیات بھی لکھی ہے، جس میں ان کے ذاتی حالات، علمی خصوصیات و کمالات اور دوسرے ممتاز علماء اور ارباب فن کے ان کے بارے میں تأثرات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اور عقیدت و احترام اور استاذ سے محبت و والہانہ وابستگی نے علم و داب اور زبان و بیان کے ایسے موتی بکھیرے ہیں، جو انھیں کا حصہ ہے، یہ کتاب جو عربی زبان میں ہے، ''نفحة العنبر'' سے موسوم ہے۔

مولانا کی ایک قابل ذکر اور ان کے وسعت مطالعہ کی شاہد تصنیف ''یتیمۃ البیان فی شئ من علوم القرآن'' ہے، اس کتاب میں اہل سنت والجماعت اور معتزلہ کے مشہور اختلاف ''مخلوقیت قرآن''، تفسیر کی حقیقت، اس کے لئے مطلوبہ علوم و اوصاف، مختلف عہد میں علم تفسیر کا درجہ بدرجہ ارتقاء، تفسیر بالرائی کی حقیقت وغیرہ اہم تفسیری موضوعات پر شافی کلام کرتے ہوئے متأخرین علماء کی تفسیروں کا ایک سرسری ناقدانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے اور ان کتابوں کی خوبیوں اور خامیوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

اخیر میں انھوں نے جماعت اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے اپنے فکری اور نظریاتی اختلاف کی وضاحت کرتے ہوئے اور عالم عرب کو اپنے خیال کے مطابق ان کے انداز فکر کی خامیوں اور کمزوریوں سے آگاہ کرنے کے لئے ''الاستاذ المودودی — وشئی من حیاته وافکاره'' لکھی ہے، جس میں ان کی تفسیر ''تفہیم القرآن'' کے علاوہ مختلف تصانیف کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

بہت سے تحقیقی، علمی اور دعوتی موضوعات پر آپ کے مقالات بھی عربی رسائل و جرائد کی زینت بنتے رہے ہیں، جن میں ''الاجتہاد فی الاسلام'' (جو ایک سیمینار میں پیش کیا گیا تھا) نیز سنن ترمذی لبنان کے ایک مؤقر جریدہ میں شائع ہونے والا مقالہ خاص طور پر قابل ذکر ہے، مصر کے اسفار میں آپ نے مختلف مواقع پر علماء ہند اور خصوصاً علماء دیوبند کی دینی، علمی خدمات

پر بیش قیمت اور گراں قدر مقالے تحریر فرمائے، جو وہاں کے بلند پایہ معیاری رسائل میں شائع اور مقبول ہوئے، ان کے علاوہ ماہنامہ ''بینات'' کے اداریے — جن میں معاصر اسلام معاند فتنوں پر مدلل گرفت ہوتی تھی، حکومت وقت اور اقتدارِ اعلیٰ کا احتساب ہوتا تھا، نیز حالات حاضرہ اور سیاسی اور قومی مسائل کا بے باک طور پر جائزہ لیا جاتا تھا — مولانا کی فہم و بصیرت، دردمندی اور غیرت ایمانی کے بہترین شاہکار تھے۔

مولانا کی مستقل تصانیف کے علاوہ فیض الباری، نصب الرایہ، مقالات کوثری، عقیدۃ السلام، اکفار الملحدین، اوجز المسالک، لامع الدراری، حجۃ الوداع، کتاب النفس والروح، موقف الامۃ الاسلامیہ، الاستاذ المودودی حیاتہٗ وافکارہٖ پر عربی زبان میں اور ''خاتم النبیین'' اور ''خلافت وملوکیت کی تاریخی وشرعی حیثیت'' پر اُردو زبان میں آپ کے قلم سے گرانقدر مقدمات ہیں، جو علمی وفکری اعتبار سے بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔

''کتابوں'' کی تصنیف سے دشوار کام آدمیوں کی تصنیف ہوتی ہے، مولانا یوسف بنوری کے علمی و دینی مآثر کا ایک اہم گوشہ یہ ہے کہ انھوں نے رجال کار تیار کئے، نوجوان فضلاء کی علمی تربیت فرمائی اور ان کو میدان عمل میں اُتارا۔

۱- ان علمی یادگاروں میں سب سے اہم ''جامعۃ العلوم الاسلامیہ'' کراچی ہے، جہاں عمومی تعلیم کے علاوہ دراسات اسلامیہ کے مختلف شعبوں میں تخصص کے شعبے قائم ہیں، اس میں ذی استعداد طلبہ کا داخلہ لیا جاتا ہے، ان سے قدیم وجدید علمی مآخذ کا گہرا مطالعہ کرایا جاتا ہے، تصنیف وتالیف کی مشق کرائی جاتی ہے، اور کسی اہم علمی تحقیقی موضوع پر مقالہ لکھایا جاتا ہے، یہ ایک منفرد نوعیت کی خدمت ہے، جو برصغیر میں اس ادارہ کا امتیاز ہے۔(۱)

---

(۱) بحمد اللہ انھیں خطوط پر عصری علوم اور انگریزی زبان کے اضافہ کے ساتھ اس حقیر نے ۱۴۲۰ھ میں ''المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد'' کی بنیاد رکھی، جس میں اب تک پانچ سو سے زیادہ فضلاء تربیت پاچکے ہیں اور زیر تربیت حضرات نے مختلف موضوعات پر جو کام کیا ہے، اس کی تعداد تادم تحریر پچاس ہزار صفحات سے زیادہ ہے۔

۲- آپ نے قرآن وحدیث کے موضوعات پر جدید طرز کے لٹریچر کی تیاری کے لئے ''ادارہ دعوت وتحقیق اسلامی'' قائم کیا ،جس میں ملک کے ممتاز اہل قلم اور اصحاب علم ونظر سے خدمت لی۔

۳- مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا مفتی محمود صاحبؒ کی رفاقت میں جدید پیش آمدہ فقہی مسائل پر غور وخوض اور ان کا فقہی حل تلاش کرنے کے لئے ''مجلس تحقیق مسائل حاضرہ'' کی بنیاد ڈالی ،جس نے انشورنش اور بینک وغیرہ کے مسائل پر قابل قدر کام کیا ہے۔

۴- جامعہ کے تحت انھوں نے دارالافتاء کی داغ بیل بھی ڈالی ، جو پاکستان کے ممتاز اداروں میں ہے اور مرجع خاص وعام ہے۔

مولانا کا مزاج یہ تھا کہ وہ مختلف اہل نظر سے ان کی حسب صلاحیت کام لیتے رہتے اور ان کو کام کے راستہ پر ڈال دیتے ، انھوں نے اپنے ایک لائق شاگرد مولانا محمد امین کو طحاوی کے سلسلہ میں ایک اہم کام سونپا ہے کہ وہ ہر باب کی تلخیص کریں ، ائمہ اربعہ کے مذاہب براہ راست ان کی کتابوں سے نکالیں ، زیر بحث مسئلہ میں احادیث نبوی اور آثار صحابہ وغیرہ کی تعداد درج کی جائے دوسری کتب حدیث سے ان کی متابعت نکالی جائے اور امام طحاوی نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق جو''نظر'' پیش کیا ہے ،اس کی شرح کی جائے۔

اس انداز کا ایک دوسرا قیمتی کام انھوں نے اپنے ایک دوسرے شاگرد مولانا عبداللہ مختار کو سونپا تھا کہ امام ترمذی نے ''فی الباب عن فلاں وفلاں'' کہہ کر جن احادیث کی طرف اشارہ کیا ہے ، وہ اس کی تخریج کریں ، اس کی اسناد پر بحث کریں اور اس سلسلہ میں اگر کچھ اور احادیث مل جائیں ،تو ان کو بھی درج کردیں ،اس کی کچھ جلدیں ''کشف النقاب'' کے نام سے شائع ہوچکی ہیں ، افسوس کہ یہ تشنۂ تکمیل ہے ، کاش کوئی صاحب حوصلہ انھیں خطوط پر اس کام کو مکمل کردیں۔

مولانا بنوریؒ کی غالباً سب سے اہم خصوصیت یہ تھی کہ وہ دین کے معاملہ میں بڑے

باحمیت اور غیور واقع ہوئے تھے اور اس معاملہ میں ذرا بھی مداہنت کے روادار نہ تھے، پاکستان بنا تو وہ پاکستان چلے گئے اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ پاکستان کوچ کر گیا، اب ہندوستان کے بجائے مسلمانوں کی مختلف قسم کی فکری کشاکش اور تناؤ کا میدان پاکستان بن گیا، تجدد پسند طبقہ پوری تیاری کے ساتھ میدان عمل میں اترا، اس نے اسلام کو عصر حاضر سے ہم آہنگ کرنے کے لئے دین کے اجماعی اور منصوص مسائل میں تبدیلی کا علم بلند کر دیا اور اپنے خودساختہ افکار کو اسلام پر تھوپنا شروع کر دیا، اللہ کا شکر ہے کہ علماء راسخین کی ایک جماعت اس فتنہ کے مقابلہ کے لئے کھڑی ہوئی، مولانا محمد یوسف بنوریؒ ان محافظین اسلام کی صف اول میں تھے، انکار حدیث اور اسلام کو بہرحال مغربی سانچہ میں ڈھالنے کی سعی نامسعود غیر منقسم برطانوی ہند ہی میں شروع ہو چکی تھی، پاکستان بنا، تو یہ ''ورثۂ نامبارک'' بھی وہیں پہنچا اور دین سے بےخبر حکمراں طبقہ کا سایۂ عاطفت بھی ان کو حاصل ہو گیا — اس سلسلہ میں ''غلام احمد پرویز'' کی متجددانہ تحریک سب سے آگے تھی۔

پرویز صاحب حدیث کے منکر تھے، تعقل پرست اور تجدد پسند تھے، کمیونزم پر ان کا یقین جازم تھا اور حکومت کی پشت پناہی اور حمایت ان کو حاصل تھی، ان سب باتوں نے مل کر ان کو سخت فکری کجروی میں مبتلا کر دیا تھا، انھوں نے دعویٰ کیا کہ اسلام دراصل کمیونزم کا داعی ہے، وراثت، زکوٰۃ وغیرہ جو انفرادی ملکیت کے منافی ہیں، محض ایک رہگذر کی حیثیت رکھتے ہیں، خدا اور رسول کی اطاعت مرکز نظام حکومت کی اطاعت کو قرار دیا گیا اور اس طرح ارباب حکومت تحلیل وتحریم کے مجاز گردانے گئے، دین میں ترمیم اور تبدیلی نہ صرف یہ کہ معاملات واخلاق اور اجتماعی اُمور میں جائز قرار پائی؛ بلکہ خود عبادات میں بھی اس کی گنجائش پیدا کی گئی، حدیث کا انکار اور اس کو بے اعتبار ٹھہرانا ان کا خاص ہدف تھا، اس فتنہ کو پھیلانے کے لئے انھوں نے ''طلوع اسلام'' کے نام سے ایک ادارہ کی داغ بیل بھی ڈالی تھی۔

مولانا یوسف بنوریؒ نے اس فتنہ کو قلع قمع کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا اور سب سے اہم کام یہ کیا کہ ان کی تمام تصانیف کو جمع کیا، ان کی قابل اعتراض عبارتیں یکجا کیں

اور برصغیر کے جملہ مکاتب فکر کے تمام علماء کے علاوہ ازہر اور عالم عرب کے چیدہ علماء کے فتوے حاصل کئے، تقریباً ■وں نے اس کے کفر اور ''زندیقیت'' کا فتویٰ دیا تھا، پھر آپ نے ان فتاویٰ کو کتابی صورت میں شائع کردیا، اس کا نتیجہ ہوا کہ پرویز صاحب کا زور ٹوٹ گیا اور الحمدللہ مسلمانوں کو اس سے نجات ملی۔

مسٹر پرویز کی یہ تحریک درگور ہوچکی تھی، مگر مشکل یہ تھی کہ ارباب اقتدار کا نشۂ اجتہاد اب تک کافور نہ ہوا تھا اور پاکستان کے خودساختہ صدر ایوب خاں مرحوم بہر حال اس ''فریضۂ نامسعود'' سے عہدہ برآ ہونا چاہتے تھے، انھوں نے اس تحریک کا نیا ایڈیشن تیار کیا اور کراچی میں ''ادارہ تحقیقات اسلامی'' کی بنیاد رکھی، تحقیقات اسلامی کے لئے جدید درس گاہوں اور مغربی جامعات کے فضلاء کی ایک ٹیم بلائی گئی اور میکگل یونیورسٹی امریکہ کے ایک فاضل ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو اس کا ڈائریکٹر نامزد کیا گیا، نتیجہ معلوم تھا، شراب پرانی تھی صرف بوتل نئی، ''فکر ونظر'' اس ادارہ کا ماہانہ آرگن تھا، احادیث من گھڑت قرار پائیں، آیات قرآنی کو رسول اللہ ﷺ کے وجدان واحساسات کا آئینہ بتایا گیا، قانون اسلامی کا ماخذ رومن لاء ٹھہرا، سود کی حلت کا فتویٰ دیا گیا، شراب جائز ہوگئی اور جمہورِ اُمت کے اسلامی تصورات پر ''جامد اسلام، فرسودہ اسلام اور روایتی اسلام'' کی پھبتیاں کسی جانے لگیں۔

مولانا بنوریؒ کی غیرت ایمانی اس موقعہ پر بھی حرکت میں آئی، ''بینات'' میں آپ نے اس پر سخت علمی تنقیدیں کیں، اس تحریک کا کھوکھلا پن واضح کیا اور ۶۳ء سے ۶۸ء تک مسلسل اس کے خلاف تحریک چلائی، بالآخر فضل الرحمٰن صاحب مستعفی ہونے پر مجبور ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں بعد ایوب خاں کو بھی اپنی غیر آئینی حکومت سے دستبردار ہوجانا پڑا۔

غیر منقسم ہندوستان میں ایک زمانہ میں ''علامہ عنایت اللہ مشرقی'' کی تحریک بھی اٹھی، انھوں نے عسکری سطح پر اپنے متبعین کو منظّم کرنا شروع کیا تھا، ان کی بعض باتیں اچھی بھی تھیں، انھوں نے قرآن مجید کی ایک تفسیر ''تذکرہ'' کے نام سے لکھی، یہ سرسید احمد خاں سے بہت متاثر تھے، بلکہ متجددانہ افکار میں ان سے کہیں آگے تھے، اسلام اور صراط مستقیم سے مراد ان کے یہاں

دینوی نعمتوں سے حظ اٹھانا تھا، دنیا سے آلودگی کا نام اسلام اوران سے اجتناب کا نام کفر تھا، اصحاب الجنۃ اوراصحاب نعیم یہود ونصاریٰ قرار دئے گئے اوراصحاب النار اوراصحاب الجحیم کی تفسیر روایتی مسلمانوں سے کی گئی، حساب وکتاب، جنت ودوزخ ان کی نگاہ میں کوئی محسوس چیز نہیں تھی، حور وقصور کا وہ مذاق اُڑاتے تھے، نصاریٰ کو تثلیث کے باوجود کافر کہنے کے روادار نہیں تھے، نہ اسلام کے ارکان خمسہ کے قائل تھے، انھوں نے ''خاکسار'' نامی تنظیم قائم کی اور عام مسلمانوں کے مذہبی افکار واطوار پر شدید تنقیدیں کیں — یہ تحریک پنجاب اور سرحد کے علاقہ میں اُٹھی تھی اوراپنے بال وپر نکالتی جارہی تھی، ان کا دعویٰ تھا کہ ''علامہ'' کا خطاب ان کو علماء ازہر نے دیا ہے، مولانا بنوریؒ نے پشاور آنے کے بعد ان کے خلاف تقریریں فرمائیں، مناظرہ کی دعوت دی، علمی تنقیدیں کیں اور ایک استفتاء مرتب کرکے علماء عرب اورشیوخ ازہر سے ان کے کفر کا متفقہ فتویٰ حاصل کیا گیا، جس نے مشرقی صاحب کا سر نیچا کردیا اوراس تحریک کے اصل رنگ وروپ مسلمانوں کے سامنے آئے۔

ان کا سب سے بڑا کارنامہ ''تحریک ختم نبوت'' ہے، ہند وپاک کی تقسیم کے بعد قادیانیت ہندوستان سے زیادہ پاکستان میں سرگرم ہوگئی اور مرزا غلام احمد قادیانی کے متبعین اوران کی نبوت پر ایمان رکھنے والوں نے پورے جوش وخروش سے قادیانیت کی تبلیغ شروع کردی، ہندوستان میں جن حضرات نے اس لہر کا مقابلہ کیا تھا، ان میں سرفہرست مولانا انورشاہ کشمیریؒ بھی ہیں، اس لئے مولانا بنوریؒ کو اس معاملہ میں غیرت وحمیت اپنے استاذ سے ورثہ میں ملی تھی۔

پاکستان میں قادیانیوں نے بہت منظّم سطح پر کام کیا، حکومت کے اہم عہدوں اور مناصب پر فائز ہوئے، مسٹر ظفر اللہ خاں تو جمہوریہ پاکستان کے وزیر خارجہ تک بنے، پاکستان میں ''ربوہ'' ان کا مرکز قرار پایا اور وہاں سے ملک بھر میں انھوں نے اپنے تبلیغی مشن پھیلا دیئے، مولانا بنوریؒ نے قلمی جہاد کے علاوہ مسلمانوں کی تمام تنظیموں کا اعتماد حاصل کرکے اس فتنہ کے خلاف ملک گیر سطح پر ایک تحریک منظّم کی اور ملک بھر میں پُرامن احتجاج شروع کرایا، خود اسفار کئے،

رابطۂ عالم اسلامی کے حکمرانوں کو فتنۂ قادیانیت کے سلسلہ میں دردمندانہ خطوط لکھے اور عالم عرب کو اس کے خطرات سے آگاہ کیا۔

مسٹر ذوالفقار علی بھٹو مرحوم، جو اس وقت سربراہ پاکستان تھے، قادیانیوں کو کافر اور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کو آمادہ نہیں تھے، بھٹو اور ان کی شریک حکمراں جماعت نے پوری قوت سے اس تحریک کو کچلنے کی کوشش کی؛ لیکن مولانا بنوریؒ کی حوصلہ مندی اور دانشمندی نیز مسلمانوں کے اتحاد اور یگانگت نے حکومت کو سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کردیا، بار بار مذاکرات ہوئے اور بالآخر حکومت نے ایک بل پیش کرکے ''قادیانیوں'' کو غیر مسلم قرار دے دیا۔

ان کا یہ کارنامہ اور تحریک ختم نبوت کے صدر ہونے کی حیثیت سے انتھک سعی وکاوش اسلام کی تاریخ دعوت وعزیمت کا روشن باب ہے، انھوں نے پاکستان کے علاوہ افریقہ کے ان ممالک میں بھی جاکر اس فتنہ کی بیخ وبن اُکھاڑنے کی پوری کوشش کی، جہاں یہ پھلتا، پھولتا اور بارآور ہوتا جارہا تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ دینی حمیت، مجاہدانہ حرارت اور جراءت وبے باکی ان کی فطرت میں ودیعت تھی، وہ جس چیز کو اخلاص کے ساتھ غلط سمجھتے تھے، اس پر بے کھٹک تنقید کرتے تھے اور اسے اپنا فریضۂ منصبی تصور کرتے تھے، ۶۸ء میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کی دعوت پر جو بین الاقوامی سیمینار ہوا، اس میں ایک مقرر صاحب نے اولیات حضرت عمرؓ سے اپنے لئے اجتہاد کی گنجائش پیدا کرنے کی کوشش کی، مولانا سے یہ جسارت دیکھی نہ گئی اور دوران تقریر ہی صدر مجلس مفتی اعظم فلسطین سے کہنے لگے: للہ ان کو لگام دیجئے، ان کو لگام دیجئے، یہ کیا کہتے جارہے ہیں؟

چنانچہ انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ، ان کی تحریک اسلامی اور ان کی مشہور مگر متنازعہ تصانیف — تجدید واحیاء دین، خلافت وملوکیت، قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں — پر سخت تنقیدیں کی ہیں، دوسری طرف محمود احمد عباسی کی تالیف ''خلافت معاویہ ویزید'' کا بھی شدید تعاقب کیا ہے — یہ ان کا فطری مزاج، دین کے ساتھ گہرا اخلاص اور وہ جس فکر کو صائب

سمجھتے تھے، اس پر غیر معمولی استقامت کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے جہاں بھی اور جو بھی خامی محسوس کی، اس کا محاسبہ کیا اور خاموشی اختیار کی۔

مولانا یوسف بنوریؒ جہاں ایک بلند پایہ عالم، بافیض مدرس اور بلند نگاہ محقق تھے، وہیں بلند اخلاق کے حامل اور کوچۂ احسان وتصوف کے راہ رو بلکہ راہبر بھی تھے، تواضع اور انکسار فطرت میں تھا، استغناء اور قناعت کا مزاج رکھتے تھے، تزکیۂ واحسان میں آپ نے سب سے پہلے حاجی امداد اللہ صاحبؒ کے مجاز حاجی شفیع الدین نگینوی مہاجر مکی سے حج کے موقعہ پر ۱۳۵۷ھ میں بیعت کی اور انھیں کے مجاز بھی ہوئے، پھر انھیں کے حسبِ ہدایت واپسی پر مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ سے استفادہ کرتے رہے، اول الذکر سے باضابطہ بیعت ہوئے، مولانا تھانویؒ سے بھی اصلاحی تعلق رہا اور انھوں نے اپنا ''مجاز صحبت'' بھی بنایا، مولانا حسین احمد صاحب سے بیعت کی اجازت تھی — بعض حضرات نے لکھا ہے کہ فراغت کے بعد آپ نے کابل کے ایک نقشبندی بزرگ شیخ شیر آغا جان سے بھی ارادت کا تعلق رکھا۔

مولانا بنوریؒ کی دینی حمیت اور اپنی جماعت دیوبند سے عقیدت کا تذکرہ اس سے پہلے ہو چکا ہے، اس کا فطری ردعمل مولانا پر یہ تھا کہ وہ جس سے اختلاف رکھتے تھے، اس کے معاملہ میں ان کا لب ولہجہ خاصا سخت اور ترش ہو جاتا تھا، انھوں نے سرسید احمد خاں مرحوم پر تنقید کرتے ہوئے ان کو بددین، جاہل، گمراہ، گمراہ کن اور کھلا ہوا منافق کہا ہے، مولانا شبلی نعمانیؒ کے لئے بہت محتاط ہو کر جو کم سے کم بات انھوں نے لکھی ہے، وہ یہ کہ وہ ذاتی مصالح کی بناء پر مداہنت کا شکار ہو جاتے تھے اور غالی معتزلی تھے، مولانا آزادؒ کو انھوں نے عہدہ کا حریص، منصب کا لالچی، کبر وغرور کا شکار، مسلک حق سے منحرف اور علم صحیح سے بے بہرہ وغیرہ کے خطاب دیئے ہیں اور لکھا ہے کہ ہفوات گوئی میں کوئی تفسیر ان کی تفسیر کی ہمسر نہیں ہے، مولانا مودودی پر تنقید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

اور اس کا یہ کلام دلالت کرتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص ہے، جس کا

اسلام سے کوئی تعلق نہیں ...... اس مقام پر مودودی صاحب ایک
ایسے شخص کا پارٹ ادا کر رہے ہیں جس کے دل میں ایمان نہ ہو
اور جو اسلام اور مسلمانوں سے انتقام لے رہا ہو۔

اس کے علاوہ انھوں نے مرحوم کو کجرد، گمراہ، گمراہ کن، جاہل، غبی وغیرہ کے الفاظ بہت فیاضی سے لکھے ہیں، انھوں نے اپنی کتاب ''یتیمۃ البیان فی شیٔ من علوم القرآن'' میں اپنے معاصر مفسرین کو بعض ایسی توضیحات پر بھی سخت تنقید کا ہدف بنایا ہے، جو تفسیر متقدمین میں بھی امام مجاہد اور عطاء ویسار جیسے جلیل القدر مفسرین کر چکے ہیں، یا علامہ فخر الدین رازیؒ — جن کی تفسیر کے خود وہ بھی مداح ہیں اور ان کے شیخ علامہ کشمیری بھی — انھوں نے بھی اس آیت کی یہی تشریح کی ہے۔

البتہ یہ دیکھ کر ایک گونہ حیرت ہوتی ہے کہ تنقید کرتے وقت وہ ہندوستانی مفسرین کے خلاف تو وہ لب ولہجہ اختیار کرتے ہیں، جس کا ذکر اوپر ہوا، مگر دوسری طرف اسی قسم کی تفسیری غلطیوں پر وہ عرب مصنفین کے بارے میں نسبتاً نرم رویہ اختیار کرتے ہیں، سید قطب شہید کی کتاب ''العدل الاجتماعی'' میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ پر اس سے بھی زیادہ سخت تنقید کی گئی ہے؛ جو خلافت وملوکیت میں ہے؛ لیکن اس کا تذکرہ کرتے ہوئے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ ان کی ان بحثوں نے مجھے ان کی تفسیر کے معاملہ میں غیر مطمئن بنا دیا ہے اور مجھے ان کی تحقیقات پر اعتبار نہیں رہا ہے۔

مولانا آزاد حدیث سے بے اعتنائی کی بناء پر گمراہ اور منحرف عن الحق قرار پاتے ہیں؛ لیکن باوجود اس کے کہ علامہ جوہری طنطاوی نے اپنی تفسیر ''جواہر القرآن'' میں جمہور مفسرین کے مسلک سے زیادہ انحراف کیا ہے اور خود مولانا کو اعتراف ہے کہ احادیث کو بسا اوقات وہ اپنی رائے اور عقل کی بناء پر رد کر دیتے ہیں، مگر اس سلسلہ میں صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفاء کرتے ہیں اور اس پر مزید کسی تبصرہ کی ضرورت محسوس نہیں کرتے، کچھ ایسا ہی سرسری تبصرہ مولانا نے علامہ رشید رضا مصری کی ''المنار'' پر بھی کیا ہے — حالاں کہ ان کی یہ کتابیں عربی زبان میں ہیں، اس لئے اس بات

کی زیادہ ضرورت تھی کہ وہ عالم عرب خاص کر مصر کے اہل علم کی تفسیروں کو موضوع بحث بناتے۔

مولانا کی ہشت پہل شخصیت سے مختلف ذمہ داریاں متعلق تھیں، وہ ''جامعۃ العلوم اسلامیہ'' کے بانی، شیخ الحدیث اور صدر مدرس بھی تھے اور بینات کے مدیر بھی، مختلف تصنیفی اور علمی اداروں سے تعلق تھا، مجمع البحوث الاسلامیہ جامعہ از ہر مصر، اور رابطہ عالم اسلامی کے رُکن رکین تھے، وہ ہندو پاک کے ان چند خوش نصیب لوگوں میں تھے جن کی علمی، تصنیفی اور دینی خدمات کی عالم عرب میں بھی پذیرائی ہوئی — جب پاکستان میں قوانین اسلامی کی تنفیذ کا کام شروع ہوا اور اس سلسلہ میں ''مشاورتی کانسل'' بنائی گئی تو مولانا بھی اس کے ایک اہم رُکن نامزد کئے گئے، اسی سلسلہ میں سفر کیا، کراچی سے راولپنڈی پہنچے، وہیں طبیعت بگڑی، دل کا دورہ پڑا اور بالآخر مؤرخہ ۱۳/ ذوقعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۷/ اکتوبر ۱۹۷۷ء کو وفات ہوگئی، اس حقیر کو اپنی طالب علمی کے زمانہ میں پاکستان کی چند شخصیتوں سے ملاقات کی بڑی آرزو تھی، ان میں سرفہرست مولانا محمد یوسف بنوری اور مفتی محمد شفیع صاحب کا نام نامی آتا ہے، جس سال یہ حقیر دورۂ حدیث میں تھا، اسی سال دارالعلوم نے اجلاس صد سالہ کے بارے میں طے کیا؛ اس لئے اُمید تھی کہ اس اجلاس کے موقع پر ان بزرگوں کے دیدار کا شرف حاصل ہو جائے گا؛ لیکن سوء اتفاق دیکھئے کہ اجلاس صد سالہ کے انعقاد سے پہلے ہی یہ دونوں بزرگ یکے بعد دیگرے رُخصت ہو گئے اور آنکھیں ان کے دیدار سے محروم رہ گئیں؛ لیکن ان بزرگوں سے یقیناً اس سے کم استفادہ کا موقع ملا، جتنا کہ اپنے اساتذہ سے استفادہ کیا گیا ہو؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ معنوی اعتبار سے ان سے تلمذ کا شرف حاصل رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے اور ان کے علمی ورثہ کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنادے، ''سفر فی سبیل اللہ'' سفر آخرت ثابت ہوا، اور جان آفریں سے جا ملے :

آسماں ان کی لحد پر شبنم آفشانی کرے

❁ ❁ ❁

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل......

دوسرا باب

دیدۂ و شنیدہ نامور ہستیاں

حکیم الاسلام مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ

در مدرسہ از جنبشِ لعلِ تو حکایت
در میکدہ از مستیِ چشمِ تو نشاں است

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ان لوگوں میں تھے، جن کے ذکر کے بغیر ہندوستان کی اسلامی تاریخ ادھوری ہوگی، اللہ تعالیٰ نے ان کو علمی کمالات، اخلاقی بلندیوں اور فکری اعتدال وتوازن کا حسین آمیزہ اور امتزاج بنایا تھا، وہ اس دور انحطاط میں سلف کے علم واخلاق اور متانت و وقار کے ساتھ تواضع وانکسار کا نمونہ تھے اور اللہ نے ان کو جو حکیمانہ بصیرت عطا کی تھی، وہ اس میں اپنی مثال آپ تھے۔

وہ مولانا حافظ محمد احمد صاحب کے صاحبزادہ تھے، جو سابق ریاست دکن کے صدر مفتی تھے اور ۳۵ سالوں تک دارالعلوم دیوبند کے مہتمم رہے، ان کے دادا حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی ذات بابرکات تھی، جنھوں نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، ۱۳۱۵ھ میں پیدا ہوئے، تاریخی نام ''مظفر الدین'' تھا، سات سال کے تھے کہ دارلعلوم میں داخل ہوئے، صرف دو سال میں تجوید وقرأت اور حفظ کی تکمیل کی، ۱۳۳۷ھ م ۱۹۱۸ء میں فراغت پائی اور سند فضیلت حاصل کی، حدیث کی تعلیم دیگر مشہور اساتذہ کے علاوہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ سے حاصل کی۔

فراغت کے ساتھ ہی دارالعلوم کے مدرس مقرر ہوئے اور اپنی ذکاوت وطباعی کی وجہ سے جلد ہی طلبہ میں مقبولیت حاصل کرلی، ۱۳۴۳ء میں نائب مہتمم مقرر ہوئے اور ۱۳۴۸ھ میں مہتمم، جس پر تاوفات فائز رہے، غالباً وہ دارالعلوم دیوبند کے سب سے طویل العہد مہتمم تھے، '' تاریخ

دارالعلوم دیوبند'' کے مصنف ان کے عہد کی ترقی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں :

> جب آپ نے انتظام دارالعلوم کی باگ ڈور ہاتھ میں لی تھی تو اس کے انتظامی شعبے آٹھ تھے، جن کی تعداد اب چوبیس تک پہنچ گئی ہے، اس وقت دارالعلوم کی آمدنی کا بجٹ ۵۰ ہزار روپئے سالانہ سے کچھ زیادہ تھا، آپ کے زمانہ میں ۲۶ لاکھ تک پہنچ چکا ہے، اس وقت دارالعلوم کا عملہ ۴۵ تھا اور اب ۱۷۵ ہے، اساتذہ کی تعداد ۱۸ تھی اور اب ۵۹ ہے، طلبہ کی تعداد ۴۵۰ تھی اور اب ڈیڑھ ہزار سے زائد ہے، عمارتوں میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے، دارالتفسیر، دارالافتاء، دارالقرآن، دارالحدیث فوقانی، مسجد کا بالائی حصہ، باب الظاہر، طبیہ کالج، جدید اونچی منزل، مہمان خانہ، کتب خانہ کے دو جدید ہال وغیرہ کی تعمیر وغیرہ ممدوح ہی کے دور اہتمام کی یادگاریں ہیں۔

ان کے علاوہ ان کے عہد زریں کا ایک اہم باب دارالعلوم دیوبند کے جشن صد سالہ کا کامیاب انعقاد ہے، جو ہندوستان کی اب تک کی تاریخ میں غالباً مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع تھا، مگر افسوس کہ یہی اجلاس بعض فتنوں کا سرچشمہ ثابت ہوا۔

دارالعلوم دیوبند کے سلسلہ میں ان کی خدمات کے دو ایسے پہلو ہیں، جن کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا، ایک یہ کہ انھوں نے دارالعلوم کا ماحول خالص علمی اور تحقیقی رکھا، اس کو سیاسی کشمکش اور مقابلہ آرائیوں سے یکسر الگ رکھا، اس کی وجہ سے وہاں علم و تحقیق کی فضا قائم رہی، جو عموماً سیاسی جھگڑوں میں مداخلت کے بعد پامال ہوجایا کرتی ہے، جنگ آزادی کے موقع سے دارالعلوم کی اندرونی فضا میں جو تھوڑی بہت سیاسی چہل پہل شروع ہوگئی تھی، اس کا سد باب کیا —— دوسرے ان کے فکری اعتدال، زبان و قلم کی احتیاط اور پرکشش شخصیت کے باعث مختلف طبقوں اور حلقوں میں دارالعلوم کو متفقہ حیثیت حاصل ہوگئی، اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ'' میں شدید مختلف الفکر تنظیموں اور جماعتوں کی شرکت کے

باوجود ان کی صدارت پر بیک زبان اتفاق ہوگیا، یہ حیثیت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کے علاوہ نہ اس سے پہلے کبھی دار العلوم کو حاصل رہی اور نہ قاری صاحب کے بعد رہی۔

ان کے اندر مختلف مسلک ومشرب، فکر ونظر اور سیاسی حلقوں کے لوگوں کو ایک ساتھ لے کر چلنے کی غیر معمولی صلاحیت تھی، دار العلوم دیوبند جب تک ان کے زیر انتظام رہا، وہاں بھی یہی توسع تھا، ایسے لوگ بھی ان کے زیر سایہ کام کر رہے تھے اور مطمئن تھے، جو انتظامی لحاظ سے یا اپنے مخصوص سیاسی مسلک اور جماعتی وابستگی کی بنا پر ان کے شدید معاند تھے۔

اس کی وجہ ان کی فراخدلی، وسیع الظرفی اور بلند اخلاقی تھی، وہ سخت ترین مخالفوں سے بھی مسکرا کر بات کرتے، غیظ وغضب، غیبت اور تند کلامی کا عنصر تو گویا ان کی ذات میں تھا ہی نہیں، مولانا اشرف علی تھانویؒ جیسے نبض شناس بزرگ ان کے حلم و بردباری کے مداح اور معترف تھے، ان کی تقریروں میں وہ لوگ بھی کثرت سے شریک ہوتے تھے، جو مسلک دیوبند کے مخالف ہونے میں شہرہ رکھتے ہیں، ان کے جواب اور دفاع کا انداز مناظرانہ نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ ہمیشہ ناصحانہ اور مثبت لب ولہجہ اختیار کرتے، طبیعت میں حد درجہ تواضع اور انکسار تھا، طلبہ کا بھی بہت اکرام کرتے، عزیزوں کے ساتھ بھی احترام سے پیش آتے، ہر شخص کو ''آپ'' سے مخاطب کرتے، ہر ایک کی بات پوری توجہ سے سنتے اور دلچسپی سے جواب دیتے۔

ان کی خدمات میں ایک روشن باب ''مسلم پرسنل لاء بورڈ'' ہے، انھوں نے جب محسوس کیا کہ مختلف حلقوں سے مسلم پرسنل لاء میں تبدیلی کی سازشیں اور خفیہ کوششیں ہو رہی ہیں تو مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر ۱۳-۱۴/ مارچ ۱۹۷۲ء کو دار العلوم دیوبند میں مختلف جماعتوں کا نمائندہ اجتماع طلب کیا، جس میں مسلم مجلس مشاورت، جمعیۃ علماء ہند، امارت شرعیہ بہار، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذمہ داروں کے علاوہ ملک کی اہم شخصیتیں شریک ہوئیں، پھر اس اجتماع کی تجویز کے مطابق ۲۷-۲۸/ دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں حضرت قاری صاحبؒ ہی کی صدارت میں تمام مسلم مذہبی فرقوں، اصلاحی اور سیاسی جماعتوں، نمائندہ اداروں اور مسلکوں

کا عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، —— اسی اجلاس میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام عمل میں آیا اور آپ ''حق بہ حقدار رسید'' کے مصداق بالاتفاق اس کے صدر منتخب ہوئے، اس کے بعد سے تادمِ وفات آپ ہی اس کے صدر رہے اور متبنیٰ بل، نفقہ مطلقہ وغیرہ مختلف مسائل میں آپ کی رہنمائی میں بورڈ قانون شریعت کے تحفظ کا فریضہ انجام دیتا رہا۔

مسلم پرسنل لا کے تحفظ سے آپ کو خاص تعلق خاطر تھا، اسی لئے آپ نظام دارالقضاء کے بھی بڑے مؤید تھے؛ تاکہ مسلمان شرعی اُصولوں کے مطابق اپنے معاشرتی نزاعات کا فیصلہ کراسکیں، آپ نے اس موضوع پر ایک کتاب بھی لکھی ہے اور اپنے عہد اہتمام میں دارالعلوم دیوبند میں دارالقضاء کا شعبہ بھی قائم فرمایا تھا۔

وہ خطابت وتقریر کے بادشاہ تھے، ان کا انداز اپنی نوعیت میں اچھوتا اور منفرد تھا، جس میں سمندر کی وسعت اور آبشار کا ترنم سمویا ہوتا تھا، عام مقرروں کی طرح جوش وخروش، جذباتیت، ہاتھ پاؤں کے اشارات کی بہتات، الفاظ کی ادائے گی میں عجلت، لب ولہجہ میں اُتار چڑھاؤ اور پُرشکوہ الفاظ کی کثرت بالکل نہ تھی، مشکل سے مشکل مسئلہ کو انتہائی عام فہم بنا کر پیش کرتے، حکمتوں اور نکتہ سنجیوں کا تسلسل رہتا، رواں اور ٹھہر ٹھہر کر بولتے، آواز میں متانت اور یکسانیت، ہاتھوں کے اشارے خفیف اور بہت کم، گھنٹوں بولتے اور نشست بدلنے کی نوبت نہ آتی، حال ومقام اور مخاطب کی رعایت کا خاص لحاظ رکھتے، کہیں کہیں معمولی ظرافت بھی ہوتی —— راقم الحروف کا تجربہ ہے کہ وہ واحد مقرر تھے جن کی تقریر سننے کے بعد ہر عام وخاص محسوس کرتا کہ اس نے علم وحکمت کے کچھ نئے موتی چنے ہیں اور ان کی تقریر سے ایسا سماں بندھ جاتا کہ پھر کسی اور کی تقریر کانوں کو جچتی نہیں تھی، وہ بسا اوقات تین تین گھنٹے اور اس سے بھی زیادہ بولتے مگر مجال نہ تھی کہ کوئی اُکتاہٹ پیدا ہو۔

کسی موضوع کو پھیلانے اور سمیٹنے کی حیرت انگیز صلاحیت تھی، ہم لوگوں کی بخاری شریف ختم ہوئی تو آخری حدیث پر تقریر فرمائی، اس کے صرف ایک جز پر ڈھائی گھنٹہ مبسوط

تقریر کی، چند سال پہلے مکہ مسجد میں ''قرآن مجید'' کے خصائص پر صرف ۴۵ منٹ خطاب فرمایا؛ مگر ایسے نکتے بیان کئے کہ کان و دل ان سے آج تک ناآشنا تھے، فرمایا: تورات کتاب اللہ تھی، انجیل نقش خداوندی تھا، قرآن مجید کتاب بھی ہے، نقش بھی ہے اور کلام بھی، پھر یہ ساری باتیں خود قرآن مجید سے ثابت کیں، قرآن کی حفاظت اور اس کی ابدیت پر بھی بالکل نئے انداز سے روشنی ڈالی —— آپ کا آخری خطاب جو اس حقیر نے مسجد عامرہ، عابد روڈ ''**خلق الانسان علمہ البیان**'' کی تشریح سے متعلق تھا، بیان کا مفہوم اور اس کا انسان کی خصوصیت ہونا اس دل نشیں انداز میں واضح فرمایا، جو کہیں اور نہ مل سکا، ان کے تقریری نکات کو کوئی کہاں تک شمار کرائے؟ وہ اس میدان کے بحرِ بیکراں تھے، جہاں سے کوئی شخص اور کبھی بھی تہی دامن واپس نہ ہوتا تھا۔

مقرر کی حیثیت سے ان کی شہرت اس قدر غالب رہی کہ عام طور پر لوگ ان کی تصانیف سے واقف نہیں ہیں ؛ حالاں کہ کی کتابوں کی تعداد سو تک جاتی ہے، ان کی بعض کتابیں نہایت اہم اور اپنے موضوع پر منفرد ہیں، مثلاً منکرین حدیث —— جو صرف قرآن کو حجت سمجھتے ہیں اور حدیث کو دین کا ماخذ تسلیم نہیں کرتے —— کی رد میں بہت سی علمی اور تحقیقی کتابیں لکھی گئی ہیں، مگر قوت استدلال اور مختلف جہتوں سے حضرت قاری صاحبؒ کی تصنیف ''حجیت حدیث کا قرآنی معیار'' اپنے موضوع پر ایک منفرد اور اچھوتی کتاب ہے۔

کافروں سے معاشرت، لباس اور وضع قطع میں تشبہ اسلام کی نظر میں ایک ناپسندیدہ عمل ہے؛ لیکن اس کی حدیں متعین کرنا دشوار ہے، اس موضوع پر ان کی ''**التشبہ فی الاسلام**'' ایک بے نظیر کتاب ہے، اسی طرح ان کی اہم کتابوں میں مذہب اور سائنس، فطری حکومت، فلسفۂ نماز، آفتاب رسالت، مسلک دارالعلوم دیوبند وغیرہ ہیں، انھوں نے جامعہ ملیہ دہلی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ وغیرہ میں جدید موضوعات پر اہم علمی اور فکری مقالات پیش ہیں اور ان کی بعض کتابیں علی گڑھ سے بھی شائع ہو چکی ہیں —— تاہم یہ ضرور ہے کہ چوں کہ کلام اور معقولات

ان کا خاندانی موضوع رہا ہے؛ اس لئے ان کی تحریریں بعض اوقات بھاری بھرکم اصطلاحات سے بوجھل ہوجاتی ہیں۔

ان کے افادات کا ذکر ناقص رہے گا، اگر ان کی گرانمایہ مجالس کا ذکر نہ کیا جائے — عصر کے بعد آپ کے یہاں مجلس ہوتی تھی، جس میں ہر عام وخاص کو شرکت کی اجازت تھی اس حقیر کو بھی اس میں حاضری کی سعادت حاصل ہوتی رہتی تھی، یہ مجلس مختلف علوم وفنون کا ایک جامع درس ہوتا تھا، مسائل کے استحضار، حاضر جوابی اور بروقت مطمئن کرنے کی جو صلاحیت ان کو حاصل تھی، شاید ہی ان کے معاصرین میں کسی اور کو حاصل رہی ہو، تفسیر وحدیث، فقہ وکلام، فلسفۂ وتصوف، ادب وشاعری اور مسائل حاضرہ کوئی موضوع ایسا نہ تھا، جو یہاں زیر بحث نہ آئے اور قاری صاحب اس کی وضاحت نہ فرمائیں۔

راقم الحروف نے ایک بار رویت باری کے موضوع پر ان کی مجلس میں ایسی وضاحت سنی کہ اہل سنت والجماعت کے مسلک کی اس سے بہتر ترجمانی نظر سے نہ گذری، حدیث جبرئیل جس میں ''احسان'' کی حقیقت بتائی گئی ہے، میں آیا ہے کہ ''اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو'' اس کو بڑی عمدہ تمثیل سے واضح کیا پھر افلاطون کے فلسفہ کا تفصیل سے ذکر کیا، ان کی مجالس کا ایک حصہ مخدوم گرامی حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین صاحبؒ کے ہاتھوں مرتب ہوچکا ہے، اگر ان کی تمام مجلسیں مرتب کردی جائیں اور چھپ جائیں تو بجائے خود علم کا ایک ذخیرہ ہوگا۔

شعر وسخن کا بھی بڑا لطیف ذوق تھا، اُردو، فارسی اور عربی تین زبانوں میں اشعار کہتے تھے اور خوب کہتے تھے، ان کے کلام کا مجموعہ ''عرفان عارف'' کے نام سے شائع ہوچکا ہے، آنکھ کی کہانی'' اور اپنی اہلیہ کی وفات پر'' جذبات الم'' ان کی عمدہ نظمیں ہیں، میر اور بعض دوسرے استاذان فن کے کلام پر تضمین بھی کی ہے۔

عام مشاعروں میں شرکت کا مزاج نہ تھا، مگر سنجیدہ اور باوقار محفلوں میں شریک ہوتے تھے، دارالعلوم دیوبند میں ایک بار سردار علی جعفری آئے تو ان کے اعزاز میں مہمان خانہ میں خواص کی ایک نشست رکھی گئی، جس میں مولانا عامر عثمانی مرحوم کو بھی دعوت دی اور خود بھی شریک ہوئے —— اپنے مواعظ میں بھی کبھی کبھی ازراہ تذکرہ اپنے اشعار سنایا کرتے تھے۔

طبیعت میں خشونت اور خشکی نہ تھی، عام باتوں میں بھی اکثر ظرافت کے ادبی جملے کہہ جاتے، ایک بار حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے فرمایا: سنا ہے کہ اجلاس صد سالہ میں ''دستار بندی'' بھی ہوگی، آپ نے فرمایا ''دستار'' ہوگی ''بندی'' نہیں ہوگی —— یہ ذکاوت ان کی فطرت میں تھی، ان کی کم عمری کے زمانہ میں ایک بار قادیان میں علماء اسلام اور مرزا غلام احمد قادیانی کے متبعین کے درمیان مناظرہ ہوا، قاری صاحب اس وقت کم عمر تھے، ان سے کہا گیا کہ مناظرے تو بڑے کریں گے؛ لیکن مرزا صاحب کی زندگی کے قابل اعتراض پہلوؤں پر ابتداء میں تم ایک تقریر کردوگے، اس کی تیاری کرلو، قادیان پہنچنے پر یہ شرط طئے ہوئی کہ مرزا صاحب کی شخصیت زیر بحث نہ لائی جائے، اب ان کی تیاری بالکل بے محل تھی، مگر انھوں نے تقریر اس طرح شروع کی کہ ''اگر یہ شرط طئے نہ پاچکی ہوتی تو میں یہ اور یہ کہتا'' اس طرح وہ سب کچھ کہہ ڈالا، جو کہنا تھا۔

وہ ابتداء میں شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ سے بیعت ہوئے، پھر مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ سے سلوک وارشاد کی تربیت حاصل کی، پھر مولانا اشرف علی تھانویؒ کی طرف رُجوع ہوئے اور ان ہی سے خلافت پائی، مولانا تھانویؒ جیسے مردم شناس اور مردم گر کی رائے ان کے بارے میں بہت وقیع تھی، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ بھی آپ کا بہت احترام کرتے تھے، مولانا مفتی محمد شفیع صاحبؒ اور مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نیز دوسرے ہم عصر علماء نے ان کے بارے میں بڑے معزز القاب استعمال کئے ہیں، تبلیغی جماعت کے مؤسس مولانا محمد الیاس صاحبؒ بھی بہت چاہتے تھے اور تبلیغی جماعت کے قیام کے ابتدائی زمانہ میں آپ کی تقریر کے لئے خصوصی

جلسے رکھواتے تھے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے بھی جہاں کہیں آپ کا ذکر کیا ہے، بڑے احترام کے ساتھ کیا ہے، وہ اپنے اور بیگانے سب کے محبوب تھے، اس وقت جتنے مشاہیر علماء ہیں، سبھی ان سے معتقدانہ ملتے تھے، ان کے اخیر دور میں ان کے کچھ قریبی لوگوں کی عاقبت نا اندیشی اور بعض معاندین کی دیرینہ سازشوں کے نتیجہ میں دارالعلوم میں جو ناخوشگوار حالات پیدا ہوئے، اس نے ان کی شخصیت کو ایک گونہ مجروح کردیا؛ تاہم اس کے باوجود ذاتی طور پر وہ اب بھی متفق علیہ تھے۔

اخلاق کریمانہ، تواضع اور کسر نفسی کی جو کیفیت ان میں دیکھی، میری گنہگار آنکھوں نے اس مقام ومرتبہ کے کسی اور شخص کے اندر شاید ہی دیکھی ہو، وہ بے حد بردبار اور انتہائی حلیم شخصیت کے مالک تھے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ ان کے زمانۂ اہتمام میں ہندوستان کے علمی کواکب وانجم پر مشتمل تھی، ہر رکن اپنی جگہ ایک انجمن تھا اور ہر شخص علم ومعرفت کے ایسے مقام پر تھا کہ لوگ عزت بچانے کے خوف سے نہیں؛ بلکہ عقیدت واحترام سے ان سے محبت کیا کرتے تھے۔

ایک واقعہ جو خود اس حقیر کا دیدۂ وشنیدہ ہے، یہ ہے کہ ایک صاحب جو علم وفضل کے اعتبار سے تو ان کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے؛ لیکن میدان سیاست کے شہسوار تھے اور اپنے مخالفین کو شکست دینے میں ہی نہیں پروپیگنڈہ کے ذریعہ انھیں ذلیل ورسوا کرنے میں بھی طاق تھے، وہ حیدرآباد آئے، بڑی گرم تقریر کی، یہاں تک کہ نام لئے بغیر حضرت قاری صاحب کو گیدڑ تک کہا، اس کے ہفتہ دو ہفتہ کے بعد قاری صاحب بھی حیدرآباد تشریف لائے، مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب مرحوم کی خواہش پر مسجد عامرہ میں خطاب فرمایا، حسبِ معمول بڑا عالمانہ خطاب ہوا، ایک صاحب نے ان صاحب کے بارے میں سوال کرلیا، آپ نے فرمایا: مولوی......سلمہ بھی تو ہمارے ہی آدمی ہیں، جیسے افراد بیمار پڑتے ہیں، ویسے ہی ادارے بھی بیمار ہوتے ہیں اور ہر شخص کی حیثیت کے لحاظ سے ان کی بیماری ہوتی ہے، دُعاء کریں کہ اللہ تعالیٰ دارالعلوم کو صحت عطا فرمادے —— اس کے سوا اس موضوع پر آپ نے کچھ نہیں کہا، ہم

جیسے لوگوں کو واقعی حیرت بھی ہوئی اور عبرت بھی کہ اہل علم کی کیا شان ہوتی ہے اور قاری صاحبؒ کا تحمل کس درجہ کا ہے!

قضیہ دارالعلوم میں جن لوگوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان میں ایک ممتاز صاحبِ علم اور صاحبِ مصنف بھی شامل تھے، جن کا تعلق لکھنؤ سے تھا، افسوس کہ انھوں نے معرکہ کو گرم کرنے اور حضرت قاری صاحب کو خطاوار ثابت کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور ان کے رسالہ کے جو صفحات فکر دیوبند کی تائید اور رد بریلویت کے لئے وقف رہا کرتے تھے، وہ اب بانی دارالعلوم کے پوتے اور مسلک دیوبند کے سب سے بڑے ترجمان کے خلاف کمان سنبھالے ہوئے تھے، آخر آخر میں ان کو کچھ خیال آیا اور انھوں نے قاری صاحبؒ کے نام ایک مکتوب لکھا، جس میں ایک طرح کی معذرت بھی تھی، قاری صاحب نے اس کا جواب عنایت فرمایا، دونوں خطوط آپ کی وفات کے بعد اسی رسالہ میں شائع ہوئے، ان دونوں مکتوبات سے فریقین کا اصل مزاج ظاہر ہوتا ہے اور کوئی شبہ نہیں کہ قاری صاحب کے جواب سے ان کی شرافت نفس، بلندی اخلاق اور تحمل و بردباری بھی پوری طرح واضح اور بے غبار ہے۔

قاری صاحب آخر دم تک اپنے بزرگوں کی روایات کے امین رہے، میں جب جنوبی افریقہ گیا تو وہاں کے علماء سے معلوم ہوا کہ جشن صد سالہ کی نسبت سے قاری صاحب کا ڈربن کی جامع مسجد میں خطاب ہوا اور لوگوں سے تعاون کی اپیل کی گئی، کچھ تاجروں نے درخواست کی کہ ہم لوگ دارالعلوم کے پورے سال کے اخراجات؛ بلکہ اس سے زیادہ برداشت کر لیتے ہیں؛ تاکہ دارالعلوم کو عام چندہ کی ضرورت نہ پڑے، قاری صاحب نے غور سے ان کی بات سنی، ان کا شکریہ ادا کیا اور خوش اُسلوبی سے معذرت فرمادی، آپ نے کہا کہ ہمارے بزرگوں نے اس بات سے منع کیا ہے کہ کچھ خاص لوگوں کے تعاون پر ادارہ کو چلایا جائے، ہم لوگوں کا طریقہ عام مسلمانوں کے تعاون سے دارالعلوم کے کاز کو جاری رکھنا ہے؛ اس لئے اس وقت صد سالہ تقریبات کے سلسلہ میں آپ حضرات سے جو تعاون ممکن ہو، وہ فرمائیں اور یہ ارادہ ترک کردیں —— دارالعلوم کا ایک اُصول یہ ہے کہ مہتمم اور تمام کام کرنے والے باتنخواہ ملازم ہوں

گے، آپ کے کچھ متوسلین —— جو مدراس کے رہنے والے تھے —— نے پیشکش کی کہ آپ دارالعلوم سے تنخواہ لینا چھوڑ دیں، ہم لوگ آپ کی کفالت کریں گے، آج کل لوگ ایسے موقع کو بہت غنیمت سمجھتے ہیں؛ تاکہ ادارہ کا ان پر احسان نہ رہے، خود ان کا احسان ادارہ پر ہو؛ بلکہ فخریہ بلا تنخواہ کام کرنے کا ذکر بھی کرتے ہیں؛ لیکن آپ نے دارالعلوم کے دستور کو سامنے رکھتے ہوئے معذرت فرمائی کہ ہم دارالعلوم کے ملازم کی حیثیت سے دنیا سے جانا چاہتے ہیں۔

جب دارالعلوم پر آپ سے اختلاف رکھنے والی انتظامیہ کا قبضہ ہوگیا اور لوگ گویا پرسہ دینے کے لئے آپ کے پاس پہنچے تو دیکھا کہ آپ کے چہرہ پر طمانینت ہے اور اس واقعہ کا کوئی تاثر نہیں، استاذ محترم مولانا انظر شاہ صاحب کی روایت کے مطابق آپ نے فرمایا کہ جب تک اللہ تعالیٰ کو ہم لوگوں سے کام لینا منظور تھا، اللہ نے ہم لوگوں سے کام لیا، اب ہم لوگوں میں اس کی اہلیت باقی نہیں رہی ہوگی؛ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ ذمہ داری دوسروں سے متعلق کردی ہوگی، پھر جب ذکر آیا کہ تمام کمروں اور دفاتر کے تالے توڑ دیئے گئے تو فرمایا کہ تالے توڑنے کی کیا ضرورت تھی، انھیں کنجیاں پہنچا دو، خواہ مخواہ دارالعلوم کے تالوں کا نقصان ہوگا۔

غالبًا قاری صاحب کے تعلق مع اللہ اور صبر و برداشت کا نتیجہ ہے کہ جن جن لوگوں نے انھیں تکلیف پہنچائی اور انھیں بے آبرو کرنے کی کوشش کی، خود ان کا انجام بہتر نہیں ہوا اور جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے، قاری صاحب کی عظمت اور محبت حلقۂ دیوبند کے دلوں میں بڑھتی جاتی ہے۔ وللہ عاقبة الأمور۔

آخر وہ گھڑی آ پہنچی کہ وہ رُخصت ہوگئے اور ان کے ساتھ ایک تاریخ گذر گئی —— اس وقت ان کی عمر ۸۸ سال تھی، ضعف و نقاہت اور پے بہ پے صدمات نیز ناموافق حالات نے ان کو اس قدر علیل کر دیا تھا کہ پہلے ہی سے اس دن کا اندیشہ تھا، وہ گو اس دنیا سے جا چکے ہیں؛ لیکن ان کے کارنامے ہمیشہ ان کو زندہ رکھیں گے۔

❁ ❁ ❁

مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور دفاع عن الدین ٭

کسی بھی مذہب کی ترجمانی کے لئے دو باتیں ضروری ہیں: اول یہ کہ وہ جن افکار ونظریات کا داعی ہو، ان کو دلائل سے ثابت کیا جائے اور ان کی معقولیت، قانونِ فطرت سے ہم آہنگی اور افادیت کو نمایاں کیا جائے، دوسرے: جو نظریات اس کے مغائر اور اس سے متضاد ہوں، ان کے غلط ہونے اور عقل ونقل کے موافق نہ ہونے کو بھی دلائل سے واضح کیا جائے، اسی لئے قرآن مجید میں جہاں عقیدۂ توحید کو کائناتی شواہد سے ثابت کیا گیا ہے، وہیں شرک کے رد پر بھی دلیلیں پیش کی گئی ہیں، جیسے آخرت کے ثبوت کے لئے خدا کی بے پناہ قدرت وطاقت کے حوالے سے استدلال کیا گیا ہے، وہیں انکار آخرت کی تردید بھی کی گئی ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ خدا نے انسان جیسی عظیم مخلوق کو بے کار اور عبث پیدا کیا ہو؟ جہاں رسول اللہ ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید کی اعجازی شان کو واضح کیا گیا ہے، وہیں جو لوگ آپ کی نبوت ورسالت کا انکار کرتے تھے، ان کی تردید بھی کی گئی ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں تصرف کا پورا پورا حق ہوتا ہے، اس لئے اللہ جسے چاہے اپنی رسالت سے نواز سکتا ہے۔ **الله يعلم حيث يجعل رسالته ۔**

اسی لئے ہر عہد میں اُمت کے اکابر علماء اور اصحابِ نظر نے دونوں پہلوؤں پر توجہ دی ہے، انھوں نے ایک طرف اسلامی تعلیمات کو پیش فرمایا، ان کی مصلحتوں اور حکمتوں پر روشنی ڈالی اور احکام شریعت کے اسرار ورموز سے پردہ اُٹھایا، دوسری طرف اسلام کے خلاف ہونے والی یورشوں کا مقابلہ کیا اور مخالف اسلام نظریات وافکار پر مدلل رد فرمایا۔

٭ حکیم الاسلام عالمی سیمینار، منعقدہ: ۱۷/نومبر ۲۰۰۶ء، دار العلوم وقف دیوبند میں پیش کیا گیا مقالہ۔

غیر مسلموں کی طرف سے پیش آئے پھر اسلام کے خلاف جو فتنے اُٹھتے رہے ہیں، وہ بھی دو قسم کے رہے ہیں، ایک وہ جو، دوسرے: ان لوگوں کی طرف سے جن کے افکار اُمت کے سوادِ اعظم یعنی اہل سنت والجماعت کے نظریات سے متصادم تھے، تاہم ان کا شمار مسلمانوں میں کیا گیا ہے، جیسے معتزلہ، خوارج، روافض کے بعض گروہ، ان دونوں طرح کے مخالفین کا مقابلہ علماءِ حق کرتے رہے ہیں؛ البتہ بعض حضرات کی زیادہ توجہ داخلی اختلافات کی طرف رہی؛ تاکہ اُمت کو صحیح فکر وعمل پر قائم رکھا جائے اور اس میں کوئی انحراف نہ آنے پائے اور بعض حضرات کی زیادہ توجہ بیرونی فتنوں پر رہی؛ کیوں کہ بیرونی فتنوں کا مقابلہ درحقیقت دینِ حق اور اسلام کا دفاع ہے اور اُمت کو ارتداد وضلال سے بچانا ہے۔

ہندوستان میں جن شخصیتوں نے اس دوسرے محاذ پر کام کیا ہے، ان میں نمایاں مقام حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کا ہے، شاہ صاحبؒ نے یوں تو روافض اور اہل بدعت پر بھی رد کیا ہے اور تقلید کے مسئلہ میں افراط وتفریط پر بھی قلم اُٹھایا ہے؛ لیکن ان کی اصل کاوش بیرونی حملوں سے مدافعت کی رہی ہے، شاہ صاحبؒ نے محسوس کیا کہ اب جو دور آرہا ہے، وہ عقلیت پرستی کا دور ہوگا، اس میں شریعت کے ہر حکم کو عقل کی ترازو میں تولنے اور حکمت ومصلحت کی کسوٹی پر کسنے کی کوشش کی جائے گی، اسی پس منظر میں انھوں نے ''حجۃ اللہ البالغۃ'' جیسی شہرہ آفاق کتاب تالیف فرمائی اور اس میں عقائد وعبادات سے لے کر معاشرت ومعاملات، معاشی نظام اور جرم وسزا وغیرہ تک، احکامِ شرعی کے باہمی ارتباط، عقل وحکمت سے ان کی ہم آہنگی، انسانی فطرت اور ضرورت سے ان کی مطابقت اور ان کے مادی وروحانی فوائد پر تفصیل سے روشنی ڈالی، اس طرح مغرب کی طرف سے اسلام پر جو یلغار ہونے والی تھی؛ گویا قبل از وقت اس کے مقابلہ کے لئے ہتھیار تیار کئے گئے، شاہ صاحب کے بعد جس شخصیت نے اس کام کو آگے بڑھایا، ان میں نمایاں ترین نام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کا ہے،

انھوں نے آریہ سماجی اور عیسائی فتنے کے مقابلہ پر خصوصی توجہ دی اور اپنی زیادہ تر کاوشیں مسلمانوں کو ان فتنوں سے بچانے میں صرف کیں، شاہ ولی اللہ صاحبؒ اور حضرت نانوتویؒ کا ایک مشترکہ مزاج یہ بھی رہا ہے کہ انھوں نے اہل سنت والجماعت کے فروعی اختلاف میں نسبتاً نرمی کا پہلو اختیار کیا اور اسلام کی مدافعت اور اس کی فکری تائید وتقویت کو اپنی فکری جدوجہد کا اصل موضوع بنایا۔

پھر ماضی قریب میں جو شخصیت ولی اللہی افکار اور قاسمی علوم کی امین اور شارح وترجمان رہی ہے، ان میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا نام نامی سرفہرست ہے، وہ واقعی اقبال کے اس شعر کے مصداق تھے :

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہوتو فولاد ہے مومن

یوں تو حلقۂ دیوبند کے سربراہ اور شارح وترجمان ہونے کی حیثیت سے انھوں نے داخلی فتنوں پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور جن گروہوں کی فکر میں ایک درجہ انحراف پایا جاتا تھا، ان پر بھی نصح کے ساتھ رد فرمایا ہے؛ چنانچہ آپؒ کی فکر کے بارے میں کلیدی کتاب وہ ہے، جو آپ نے دیوبند کے مزاج و مذاق اور اس مسلک و مشرب کے اعتدال اور میانہ روی کی نسبت سے لکھی ہے، اور واقعہ ہے کہ اس موضوع پر قلم اُٹھانا آپؒ ہی کا حق تھا؛ کیوں کہ فکر دیوبند آپ کی روح میں اس طرح رچ اور بس گئی تھی جیسے گلاب میں اس کی رنگت اور موتیا میں اس کی خوشبو؛ اس لئے کوئی شبہ نہیں کہ آپ فکر قاسمی کے سب سے بڑے نقیب وترجمان تھے اور زندگی بھر اس ترجمانی کا حق ادا کرتے رہے۔

لیکن آپ کی زیادہ توجہ اپنے ان دونوں بزرگوں کے مزاج کے مطابق بیرونی فتنوں کی طرف رہی، آپ نے فتنۂ قادیانیت کی رد میں بھی کوششیں فرمائی ہیں اور خود پنجاب میں اس

موضوع پر مؤثر خطابات فرمائے ہیں، جب مسلم پرسنل لاء کے خلاف حکومت ہند نے بال و پر نکالنے شروع کئے اور مغرب زدہ مسلمانوں نے بھی شریعت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو آپ نے اپنے رفیق خاص حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے ساتھ مل کر اس کا بھرپور مقابلہ کیا؛ اس لئے آپ کی زیادہ تر تالیفات دعوت واصلاح اور اسلام کی حقانیت کے ثابت کرنے سے متعلق ہیں، دین حق کو عقل و استدلال کی قوت کے ساتھ سمجھانا اور مسلمانوں کو بصیرت وشعور پر مبنی ایمان سے ہمکنار کرنا آپ کی فکرونظر اور جہدوعمل کا خاص ہدف تھا، حضرت قاری صاحبؒ کے فکرومزاج اور علمی ودعوتی مذاق پر اس تحریر سے روشنی پڑتی ہے، جو آپؒ نے حضرت نانوتویؒ کے علوم کی تسہیل کے لئے ''مجلس معارف القرآن'' کی تاسیس کے پس منظر میں لکھی ہے، اس تحریر کا آغاز اس طرح ہوتا ہے :

> دین عقیدہ وعمل کے مجموعہ کا نام ہے، عقیدہ سے عمل کا وجود ہوتا ہے اور عمل سے عقیدہ کا رسوخ ہوتا ہے، جیسے درخت کے بیج سے شاخوں اور برگ و بار کا وجود ہوتا ہے اور پھر شاخیں جوں جوں پھیلتی اور بڑھتی ہیں، جڑ کا رسوخ اور اندرونی پھیلاؤ بڑھتا جاتا ہے، مجموعۂ عقائد کا نام ایمان ہے اور مجموعۂ عمل کا نام اسلام، اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے، ایمان تخم کی طرح دل کی گہرائیوں میں مخفی رہتا ہے، جسے عقل وبصیرت کی آنکھ دیکھتی ہے اور اسلام برگ وبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا ہوتا ہے، جو سر کی آنکھ سے نظر آتا ہے، حدیث نبوی ﷺ میں اس حقیقت کو اس طرح واشگاف فرمایا گیا ہے کہ: **الإیمان سر والإسلام علانیة** ''ایمان (دل میں) چھپی ہوئی چیز ہے اور اسلام (ہاتھ پیر پر) کھلی ہوئی چیز ہے''۔
>
> ایمانی عقائد، اعمال کے ردوقبول کا بھی معیار ہیں کہ ان کے

بغیر بڑے سے بڑا عمل بھی رد، نا قابل قبول اور اکارت ہے اور یہی کسی مذہب کے حق و باطل کے پہچاننے کا بھی معیار ہیں؛ کیوں کہ اساسی عقائد ہر مذہب میں گنے چنے چند ہی ہوتے ہیں، لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا، جس کی تحقیق دشوار ہو؛ اس لئے کسی دین کے سمجھنے یا قبول کرنے کا مختصر راستہ اس کے عقائد ہی کا دیکھنا ہے کہ وہ مخالف عقل تو نہیں ہیں، نیز صاحب شریعت تک ان کی سند بھی متصل ہے یا نہیں؟ اس لئے کم سے کم یہ ناگزیر اور ضروری ہے کہ عقائد اور ایمان میں ایک ماننے والے کو بصیرت حاصل ہو اور وہ دین اور شریعت پر خواہ اُصول کا حصہ ہو یا کلیات کا، سمجھ بوجھ کر جھکے اور ان پر دلائل اور حقیقت شناسی کے ساتھ جمے، اگر عقائد کا معاملہ محض سنے سنائے پر مبنی ہو، خود اپنی تحقیق یا سمجھ بوجھ کو اس میں دخل نہ ہو تو اسے صورتِ ایمان تو کہا جا سکتا ہے؛ لیکن حقیقت ایمان باور نہیں کیا جا سکتا، اسی بناء پر محقق علماء میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا ہوا ہے کہ ایمان تقلیدی جس میں حجت و برہان اور بصیرت کا دخل نہ ہو؛ بلکہ محض باپ دادا سے سنی سنائی ایک نقل ہو معتبر بھی ہے یا نہیں؟ ایک جماعت ادھر گئی ہے کہ ایمان تقلیدی معتبر بھی نہیں جب تک کہ وہ دلائل و براہین سے تحقیقی نہ بن جائے۔

اسی بناء پر قرآن حکیم نے دین و ایمان کے بارے میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی ہے، جس کی جیتی جاگتی تصویر حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا وجودِ باجود اور ان کا مثالی ایمان ہے، جو صاحب شریعت کے سامنے حاضر رہ کر بھی اپنے ایمان کو تحقیقی بنا کر ہی دل میں جگہ دیئے

ہوئے تھے،قرآن حکیم نے اس کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا :

أدعو إلى الله على بصيرة أنا ومن اتبعني وسبحان الله وما انا من المشركين ۔

بلاتا ہوں اللہ کی طرف سمجھ بوجھ کر میں اور جو میرے ساتھ ہے اور اللہ پاک ہے اور میں نہیں شریک بنانے والوں میں ۔

پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں اولیت کے ساتھ اور ان کے بعد کے لوگوں کے بارے میں تبعیت کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا :

والذين اذا ذكروا بآيات ربهم لم يخروا عليها صما و عميانا ۔

اور وہ لوگ کہ جب ان کو سمجھایئے ان کے رب کی باتیں، نہ پڑیں ان پر بہرے اندھے ہوکر۔

اس کلامِ خداوندی سے ظاہر ہے کہ ایمان خواہ اجمالی ہو یا تفصیلی ،اس کی بنیاد بصیرت وتحقیق پر ہوتی ہے؛ گو اس کے درجات حسب استعداد اور مختلف ہوں،جس کا ثمرہ فراستِ ایمانی ہے جو ہر مؤمن کا طغرائے امتیاز ہوتی ہے،اسی لئے حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں ارشاد فرمایا گیا:**اتقوا فراسة المؤمن فانه ينظر بنور الله،** (الحدیث) ’’مؤمن کی فراست سے ڈرتے رہو؛ کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

جس سے صاف واضح ہے کہ ایمان دار میں بقدر ایمان بصیرت وفراست اور نورِ حق کا وجود لازمی طور پر ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جس حقیقت کا ثمرہ بصیرت ہو وہ بے بصیرت حقیقت نہیں ہوسکتی؛ کہ بے

بصیرتی سے بصیرت پیدا نہیں ہوسکتی ،جس کا حاصل وہی ایمان تحقیقی ہے نہ کہ سنا سنایا ایمان ، اسی لئے اس دین میں عقل و بصیرت کی عظمت وفضیلت بیان فرما کر گویا اس کی دعوت دی گئی ہے اور اسی لئے قرآن حکیم نے جگہ جگہ آیاتِ الٰہی میں غور وفکر اور تدبر وتذکر اور حجت طلبی کی طرف بلایا ہے، جو دوسرے عنوان سے اسی بصیرت ویقین کے پیدا کئے جانے کا امر ہے،اسی ایمانی حقیقت کو جو عقل وبصیرت اور تحقیقی حجت لئے ہو،آیات وروایات میں کہیں حلاوت ایمان سے ، کہیں بشاشت ایمان سے ، کہیں طعم ایمان سے ، کہیں تفقہ فی الدین سے اور کہیں فہم سلیم سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ بات قابل لحاظ ہے کہ آپ کا لب ولہجہ جرح وتنقید کے موقع پر بھی نہایت نرم اور فریق مخالف کے احترام پر مبنی ہوتا ہے،مثلاً آپ کی کتاب ''اسلام کا اخلاقی نظام'' ایک عیسائی پادری کے اعتراضات کے رد میں ہے، انھوں نے اسلام پر چار اعتراضات کئے ہیں اور اس ضمن میں خاص کر پیغمبر اسلام ﷺ کے سلسلہ میں نہایت ہی دل آزار لب ولہجہ اختیار کیا ہے، آپؒ نے ان اعتراضات کے تفصیلی وتحقیقی جوابات دیئے ہیں ؛ لیکن اپنے اُسلوب اور طرز تخاطب میں ہمیشہ اس بات کو ملحوظ رکھا ہے کہ مخالف کی گفتگو کا مواد کچھ بھی ہو؛لیکن ہم رحمت اللعالمین ﷺ کی اُمت ہیں ؛ اس لئے ہم فریق مخالف کے معیار پر اُتر کر گفتگو نہیں کر سکتے ؛ چنانچہ آپ اپنے جوابی مکتوب کے شروع میں تمہیدی گفتگو کرتے ہوئے رقم طراز ہیں :

گرامی نامہ سے آپ کے ذوق تحقیق کے ساتھ انکساریٔ طبع کی روش سے خوشی ہوئی ، اختلاف دین کے باوجود اگر طبائع میں یہ جوہر ہو تو

> غیر مذہب کے انسانوں میں خیر خواہی اور موعظت ونصیحت کا جذبہ قائم رہ سکتا ہے، جو نیک راہ سامنے آجانے اور حق بینی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے؛ البتہ آپ کی تحریر میں الزام واعتراض کے موقعوں پر جگہ جگہ متانت وسنجیدگی کا رشتہ ہاتھ سے چھوٹ چھوٹ گیا ہے، حتیٰ کہ بعض جگہ استہزاء وتمسخراور تحقیر وتوہین کا رنگ بھی آگیا ہے، اگر جواب میں بھی رد والزام کے موقعوں پر کہیں ایسا رنگ نظر آئے تو اسے اپنی ہی تحریر کا آوردہ اور ردعمل سمجھا جائے، پھر بھی انشاء اللہ مقتداؤں کی توہین یا استہزاء کا کوئی ایک کلمہ بھی اس تحریر میں آپ کو نہیں ملے گا اور اگر کہیں ایسا ہوگا بھی تو وہ آپ ہی کے دعووں پر بطور فرض والزام کے ہوگا۔

اس کتاب میں عیسائی پادری نے اسلام کے خلاف چار سوالات اُٹھائے ہیں، ان میں ایک یہ ہے کہ اسلام کے پاس اخلاقی تعلیمات ہیں ہی نہیں، دوسرے: رسول اللہ ﷺ کے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے، تیسرے: حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی اس روایت کو پیش کیا گیا ہے کہ جس نے ''لا الہ الا اللہ'' کہا وہ جنت میں داخل ہوگا، گو وہ چوری اور زنا کا مرتکب ہو، چوتھے: ان کا دعویٰ ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے؟ اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے بائبل کا قرآن پر تفوق ظاہر کرتے ہوئے بائبل کے بعض احکام کا ذکر کیا ہے، جیسے چوری مت کر، زنا مت کر، آپؒ نے ان سوالات کے شافی وکافی جوابات دیئے ہیں، سب سے پہلے آپ نے اخلاق وافعال کے فرق پر روشنی ڈالی ہے، آپؒ نے لکھا ہے کہ اخلاق دراصل قلب کے اندر پیدا ہونے والے مادے صبر وشکر، سخاوت وشجاعت، مروت وعجز، حیا اور غنا وغیرہ سے عبارت ہیں، افعال ان کے آثار ہیں، گویا اخلاق جڑ ہیں اور اعمالِ صالحہ اس سے پھوٹنے والی شاخیں ہیں، اس پس منظر میں آپؒ نے بتایا ہے کہ

قرآن نے اعمالِ صالحہ کی تشریح کے ساتھ ساتھ اخلاقی صلاحیتوں کے پروان چڑھانے کی کوشش بھی کی ہے۔

پھر آپؒ نے اسلام کے نظام اخلاق کی وسعت کو بتانے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ننانوے اسماء حسنیٰ کو قرآن وحدیث سے نقل کیا ہے اوران کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہی اسماء حسنیٰ اخلاق کی بنیاد ہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**تخلقوا باخلاق اللہ**'' چنانچہ فرماتے ہیں :

> یہی حق تعالیٰ کے وہ اُصولِ اخلاق، رحم وکرم، حلم وصبر، عفوودرگذر، بڑائی وعظمت، قدرت وقوت، محبت، عدل وانصاف، علیمی وخبیری، وسعت واحاطہ، یکتائی، غنا نورانیت، ہدایت، بزرگی، حفظ ونگہبانی، نفع وضرر رسانی کی طاقت، انعام وانتقام، سلب وعطا، ثبات واستقلال، مصدریت کمالات، تقدس وپاکی، حکومت وملوکیت، لطافت وستھرائی، علوشان، اعزاز وتذلیل وغیرہ ہیں، جن کی اُصولی تعداد ننانوے تک پہنچتی ہے؛ جنھیں حدیث نے ''اسماء الٰہیہ'' کے نام سے تعبیر کیا ہے اورقرآن نے ''اسماء حسنیٰ'' کے لقب سے یاد کیا ہے، یہی وہ پاکیزہ اخلاق خداوندی ہیں؛ جنھیں حاصل کرنے کے لئے نبی کریم ﷺ نے اُمت کوامر فرمایا کہ: ''**تخلقوا باخلاق اللہ**'' (اوران ہی اخلاقِ الٰہیہ سے مخلوق کی اخلاقی تکمیل کے لئے نبی کریم ﷺ مبعوث ہوئے) چنانچہ خود ہی حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**بعثت لاتمم مکارم الاخلاق**'' (میں بھیجا گیا ہوں اس لئے کہ پاکیزہ اخلاق کوحد کمال تک پہنچا دوں)۔

پھر آپؒ نے لے پالک کے بارے میں شرعی حکم، حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے آپ ﷺ کے

نکاح کی مصلحت اوراس سے متعلق بعض روایتوں کی توضیح وتشریح نمبروار دس فقروں میں بیان فرمائی ہے، جو بہت ہی اہم اور چشم کشا ہے اوراس میں بہت سے اہم نکات واضح کئے گئے ہیں، اس سلسلہ میں آپ نے ایک اُصولی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے، جو آپ ہی کے الفاظ میں اس طرح ہیں :

> حقیقت یہ ہے کہ جب کسی قوم کے ہاتھ میں مستند دین نہ رہے اورتحریف شدہ کتاب پر دین کا دارومدار رہ جائے، جس کی سند ہو، نہ روایت ہو، اور جس میں وقتاً فوقتاً خواہشات قوم اورحسب ضرورت زمانہ ترمیم وتنسیخ بھی عمل میں آتی رہی ہوتو اس قوم میں دینی مذاق اور خدا اوراس کے پیغمبروں کے معاملات کوصحیح صحیح سمجھنے اور حدود کو قائم رکھنے اورادب واحترام کا ذوق کہاں سے آئے؟ (ص:٦٧)

اس جواب کے ذیل میں آپ نے اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ’’**واللہ احق ان تخشاہ**‘‘ کی بھی بڑی عمدہ توضیح فرمائی ہے، حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ والی حدیث کا جواب دیتے ہوئے آپؒ نے فرمایا ہے :

> حدیث ابوذر رضی اللہ عنہ جواز معصیت کے لئے نہیں آئی ؛ بلکہ ایمان کی خاصیت بتانے کے لئے آئی ہے کہ وہ سبب نجات ہے اوراس میں معصیت حارج نہیں ہوسکتی، خواہ نجات کومؤخر ہونا پڑے اورعذاب بھگت کرآدمی کونجات ملے، مگر ملے گی ضرور۔ (ص:۱۷۳)

اسی ذیل میں آپ نے عیسائیوں کے عقیدۂ کفارہ اورعملی زندگی میں اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی ناخدا ترسی کا بھی ذکر فرمایا ہے، چوتھا اعتراض کہ ’’اسلام نے زور زبردستی سے مسلمان بنانے اور کفارکوقتل کرنے کی اجازت دی ہے‘‘ کے جواب میں آپ نے آیت قتال کے پس منظرکوواضح فرمایا ہے، نیز مسلمانوں کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ کس طرح لوگوں

نے رضا کارانہ خواہش و مرضی سے اسلام قبول کیا ہے۔(دیکھئے: کتاب ہذا:۱۹۹)

آپ کی تالیفات میں ایک اہم کتاب ''مقالات طیب'' ہے، جو چار مقالات پر مشتمل ہے، اس میں پہلا مقالہ جو چھیالیس صفحہ پر مشتمل ہے، ''اسلام عالمی مذہب ہے'' کے عنوان پر ہے، یہ مقالہ عصری افکار کے پس منظر میں اسلام کے تعارف پر نہایت اہم ہے، جس میں تین دعوؤں پر بحث کی گئی ہے :

(۱) اسلام عالمی دین ہے۔

(۲) اسلام دائمی دین ہے۔

(۳) اسلام تنہا مدارِ دین ہے۔

اس میں آپ نے بہت ہی مدلل انداز میں اسلام کی آفاقیت اور عالمگیریت کو ثابت کیا ہے اور اس بات پر زور دیا ہے کہ اسلام میں سارے فیصلے اُصولوں کی بنیاد پر ہوتے ہیں، نہ کہ قوم پرستی کی بنیاد پر؛ کیوں کہ قومیت خواہ رنگ ونسل کی بنیاد پر ہو یا علاقہ وطن کی اساس پر، وہ انسانوں کو تقسیم کرتی ہے، آپ نے اس میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ کوئی بات محض قومیت یا آبائیت کی وجہ سے قابل قبول نہیں ہوسکتی ؛ بلکہ اس پر عقلی یا نقلی دلیل ضروری ہے، آپ نے اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ اسلام بنیادی طور پر مساوات کا قائل ہے؛ چنانچہ اس نے تحصیل علم میں کوئی امتیاز رکھا نہ عبادت میں اونچ نیچ، نہ قانون میں تفریق اور نہ حقوق میں جانب داری، یہاں تک کہ :

> اس کے یہاں قانون کی نگاہ میں مسلم اور ذمی بھی برابر ہیں، جس میں کوئی امتیاز روا نہیں رکھا گیا۔(ص:۱۸)

اس مقالہ میں یہودیت ونصرایت اور اسلام کے مزاج کو سمجھاتے ہوئے تفصیل سے دونوں کے نظریاتی فرق پر روشنی ڈالی گئی ہے، اسی ذیل میں ایک جگہ فرماتے ہیں :

> جس کا حاصل یہ نکلا کہ ایک یہودی، یہودی نہیں بن سکتا ہے جب

تک کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا انکار نہ کرے، ایک نصرانی، نصرانی نہیں بن سکتا جب کہ وہ محمد ﷺ کا انکار نہ کرے، ایک ہندو، ہندو نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ غیر ہندی پیغمبر کا انکار نہ کرے، یعنی تفریق اقوام کو اعتقاداً وعملاً قبول نہ کرلے؛ لیکن ایک مسلم، مسلم نہیں بن سکتا جب تک ان کے سارے پیغمبر کا اقرار کرکے ان کی تصدیق نہ کرے، نام بنام مذکور ہوں تو نام بنام، اجمالی طور پر بلا ذکر نام مذکور ہوں تو اجمالی اور کلی تصدیق نہ کرے؛ چنانچہ اسلام نے پیغمبروں کو کبھی نہیں جھٹلایا، اس کے نزدیک پیغمبر کبھی غلط گوئی نہیں کرسکتے۔ (ص:۳۴)

آپؒ نے اسلام کی 'رحمت عامہ' کے ذیل میں اسلام کے نظامِ عدل پر بھی بڑی بصیرت افروز گفتگو کی ہے، پھر اس کے ضمن میں اس بات پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ نجات کے لئے مسلمان ہونا ضروری ہے اور غیر مسلم کوئی بھی، کتنا بھی اچھا کام کرے دوزخ میں ہی داخل ہوگا تو ایسا کیوں ہے؟ اور کیا یہ تعصب نہیں ہے؟ آپ نے اسلام کے اُصول مساوات اور مغرب کے تصورت مساوات پر بھی روشنی ڈالی ہے، آپ نے ایک اُصولی اور بنیادی حقیقت پر توجہ دلائی ہے کہ ''تقسیم عمل اور تقسیم وظائف میں فرق استعداد و قابلیت کے لحاظ سے ہوسکتا ہے، مساوات کا تعلق حقیقتاً انسان کے اختیاری افعال سے ہے، غیر اختیاری اُمور سے نہیں'' (ص:٦٨) نیز آپ نے تاریخی حقائق اور مثالوں سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی نظریات اور اس کے منصفانہ اُصول سے اقوام عالم نے بھی خوشہ چینی کی ہے۔

'مقالاتِ طیبہ' میں ایک اور اہم مقالہ 'دو علمی سوال اور ان کے جواب' کے عنوان سے شامل ہے، پہلا سوال ہے: ''**ولو كان من عند غير الله لوجدوا فيه اختلافاً كثيراً** '' کہ اس میں اختلاف نہ ہونے کو کلام الٰہی ہونے کی دلیل قرار دیا گیا ہے؛ حالاں کہ مطلق اختلاف تو کلامِ الٰہی میں بھی موجود ہے اور جہاں تک تاویلات وتوضیحات کے بعد تعارض رفع

کرنے کی بات ہے تو یہ کلام بشر میں بھی ممکن ہے۔

دوسرا سوال قرآن مجید میں قسم سے متعلق ہے، حضرت قاری صاحبؒ نے متکلمانہ انداز میں ان دونوں سوالات کے جواب دیئے ہیں، جو بتیس صفحات پر مشتمل ہے۔

مذاہب کے درمیان معجزات کا مسئلہ ہمیشہ سے زیر بحث رہا ہے، قاری صاحبؒ کا خطاب اس موضوع پر بڑا مفید اور مدلل ہے، جو''معجزہ کیا ہے؟'' کے نام سے شائع ہوا ہے اور اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔

اس دور میں مستشرقین کی جانب سے اسلام کے خلاف جن شکوک وشبہات کو اُبھارا گیا ہے اور ان سے بہت سے مغرب زدہ مسلمان بھی متاثر ہوئے ہیں، ان میں ایک حدیث رسول اللہ ﷺ کی حجیت اور اس کے اعتبار واسناد کا مسئلہ بھی ہے، اس موضوع پر آپؒ کی کتاب ''حدیث رسول کا قرآنی معیار'' نہایت ہی بصیرت افروز اور منفرد نوعیت کی حامل ہے، جس میں حدیث کی مختلف اقسام —— خبر عزیز، خبر قریب، خبر متواتر —— کی قرآن مجید سے حجیت اور راوی کی مطلوبہ صفات کے بارے میں قرآن کی وضاحتوں وغیرہ پر بڑی عمدہ روشنی ڈالی گئی ہے، خاص طور پر جو لوگ قرآن کو حجت مانتے ہیں اور حدیث کا انکار کرتے ہیں، ان کے فکری انحراف کے علاج کے لئے یہ اکسیر کا درجہ رکھتی ہے۔

آج کل مغربی تہذیب کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان میں مردوں کے لئے داڑھی اور عورتوں کے لئے پردہ کے مسائل بھی ہیں؛ چنانچہ آپ کی تالیف '' داڑھی کی شرعی حیثیت'' میں آپ نے فکری اور فقہی دونوں جہتوں سے گفتگو کی ہے، ایک طرف آپ نے بتایا ہے کہ مردوں کے لئے داڑھی مقتضیات فطرت میں سے ہے اور تمام مذاہب میں داڑھی رکھنے کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا ہے، دوسری طرف آپ نے اسلامی نقطۂ نظر سے داڑھی کی اہمیت کو بیان کیا ہے، نیز قرآن وحدیث، آثار صحابہ اور فقہاء کی تصریحات سے یہ بات ثابت

کی ہے کہ داڑھی کی کم از مقدار ایک مشت ہے۔

اسی طرح پردہ کے موضوع پر آپ کا رسالہ ''شرعی پردہ'' جو ۱۲۶؍صفحات پر مشتمل ہے نہایت اہم ہے، اس کتاب میں آپ نے مسئلہ حجاب کی اہمیت اور اس کی علت اور بے حیائی کے نقصانات ، نیز پردہ کے نقطۂ نظر سے مشرقی اور مغربی تہذیب کا موازنہ جیسے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور اس سلسلہ میں مغرب کے موجودہ حالات پر بعض اعداد و شمار بھی نقل کئے ہیں، نیز پردہ پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں اور ان کے جو نقصانات بتائے جاتے ہیں ، ان کا بھی تفصیلی رد فرمایا ہے، اس رسالہ میں خواتین اسلام کے علمی اور اصلاحی کارنامے کا بھی بڑا تفصیل سے ذکر آگیا ہے ؛ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک طویل اقتباس نقل کئے جانے کے لائق ہے :

> صاحب بدائع الصنائع کی بیوی اپنے دور میں ایسی فقیہ سمجھی گئی ہیں کہ ایک درجہ میں فتویٰ کا مدار ان پر ہو گیا تھا، اس فقیہ خاتون کے باپ نے اپنی بیٹی کے فضل و کمال کو دیکھ کر اعلان کیا تھا کہ جو شخص اپنے ممتاز علم اور راسخ تفقہ کا ثبوت دے گا ، اس سے لڑکی کی شادی کی جائے گی ، صاحب بدائع نے اس اعلان پر کتاب 'بدائع الصنائع' تصنیف کر کے پیش کرائی ، جو صاحبزادی کے باپ کو پسند آئی اور نکاح کر دیا، پھر خاوند و بیوی کے علم و کمال نے یہاں تک قلوب پر سکہ جمایا کہ اس زمانہ میں کوئی فتویٰ اس وقت تک معتبر نہ سمجھا جاتا تھا، جب تک اس پر صاحب بدائع ، ان کی علامہ بیوی اور خسر کے دستخط نہ ہو جاتے تھے۔
>
> امام طحاوی کی صاحبزادی وہ اعلیٰ تعلیم رکھتی تھیں کہ امام ممدوح حدیث و فقہ کا املاء بھی ان ہی کے قلم سے کراتے تھے، خود بولتے

تھے اور صاحب زادی قلم بند کرتی رہتی تھیں۔

سعید بن مسیّب کی عالمہ صاحبزادی کے فضل وکمال کی تمام اسلامی قلم رو میں شہرت پھیل گئی، خلیفہ وقت نے نکاح کا پیام دیا، مگر نامنظور ہوا، نکاح ایک غریب عالم و فاضل سے ہوا، ان جیسی سینکڑوں عالم وفاضل خواتین اسلام کی سوانح عمریاں مستقل کتابوں میں درج کی گئی ہیں، پھر صحابیات میں کتنی ہی وہ خواتین ہیں جن کے فضل وکمال کو لسانِ نبوت پر سراہا گیا ہے، ایک حضرت عائشہؓ ہی کو حضور ﷺ نے نبوت کے آدھے علم کا حامل اور امین بتلایا ہے، کیا اِن علم پرور خواتین اور ان جیسی دوسری ہزار ہا قابل ذکر خواتین نے اپنا پردہ فروخت کرکے علم کی متاع خرید کی تھی؟ نہیں؛ بلکہ امام طحاویؒ کی تو وفات کا سبب ہی اس عالم صاحبزادی کا حجاب وانفعال ہوا ہے، صاحبزادی سے مسائل فقہ کا املاء کرا رہے تھے، اس میں بعض نسوانی مسائل کا ذکر آیا، جس میں بعض مسائل جماع ومباشرت سے متعلق تھے، جن میں یہ لفظ بھی املاء میں آیا کہ ''**اذ نجامعھن یکون کذا**'' (جب ہم عورتوں سے جماع کرتے ہیں تو ایسا ہوتا ہے، مثلاً غسل واجب ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ) صاحبزادی نے یہ مسئلہ لکھا اور غیر اختیاری طور پر کچھ ہلکا سا شرم آمیز تبسم کیا، اس پر امام طحاوی کی نظر پڑ گئی، بے حد منفعل ہوئے اور اسی انفعال سے مغلوب ہوکر وفات پا گئے، ظاہر ہے کہ حیاء دار سے حیاء کی جاتی ہے، اس سے جہاں امام موصوف کی محجوبیت اور پردہ داری نمایاں ہوتی ہے، وہیں صاحبزادی کی حیاء وعفت اور پردہ داری کا ثبوت فراہم ہوتا

ہے کہ حجاب کی کس حد پر پہنچی ہوئی تھیں، جس نے باپ پر انفعال کا یہ غیر معمولی اثر ڈالا کہ وہ جان بر نہ ہو سکے۔

اس سے اوپر کے طبقات میں ازواجِ مطہراتؓ، عام صحابیاتؓ اور پھر قرون اسلاف کی عام خواتین اتقیاء پر نظر ڈالو اور غور کرو کہ آیا ان کے علوم کی گہرائیاں زیادہ تھیں، جب کہ پردہ وحجاب اپنی اعلیٰ حدود پر پہنچا ہوا تھا، یا آج کی مسلم خواتین علوم وکمالات میں بڑھی ہوئی ہیں، جب کہ ہر نہج کی بے حجابی اور آزادی دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، اگر تعلیم میں حجاب حائل تھا تو حضرت عائشہ صدیقہؓ پردہ میں بیٹھ کر اور بلا کسی اسکول یا مدرسہ میں گئے ہوئے اتنی زبردست عالمہ کیسے ہوگئیں کہ بڑے بڑے علماء صحابہ رضی اللہ عنہم پس پردہ ان سے مسائل حل کرتے تھے اور علوم نبوت کا نصف حصہ ان کے حصہ میں آگیا، حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ عارف منصب نبوت تھیں، جنھوں نے اول وحی پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھبرا جانے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ڈھارس اور تسلی دی اور علاج بتایا کہ یہ معرفت کی بات ہے تو کسی عارف ہی سے اس کا علاج کرایا جائے تو ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں، پھر دوسری صحابیاتؓ جن میں ایک سے ایک اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور بعد کے قرون میں جیسے حضرت رابعہ بصریہؒ، رابعہ عدویہؒ وغیرہ، کہ علماء وعرفاء میں اعلیٰ علم رکھتی تھیں اور مشاہیر عارفات میں سے تھیں، آخر وہی پاکباز عورتیں تھیں جو پردوں میں عفت کے ساتھ خانہ نشیں تھیں، حافظ ابن عساکر جیسے مشہور محدث نے جن اساتذہ سے علم حاصل کیا ہے، ان میں ۸۰ سے زیادہ عورتیں شمار

کرائی ہیں، حفید ابن زہرا کی بہن اور بھانجی علم طب اور فن حکمت میں مشاہیر زمانہ میں سے ہوئی ہیں، یزید بن ہارون کی لونڈی ان کی آخری عمر میں جب کہ وہ ضعیف البصر ہو چکے تھے خود کتب حدیث سے احادیث کو یاد کرتی، انتخاب کرتی اور اپنے آقاء کو حدیثوں پر مطلع کرتی۔

ابن سماک کوفی مشہور عالم کی لونڈی ان کی تقریروں میں اصلاح دیا کرتی تھی اور انھوں نے فن خطابت میں اپنی باندی ہی سے استفادہ کیا، حضرت معاذۂ عدویہ صدیقہ عائشہؓ کی شاگرد ہیں، مشہور مرتاض و نفس کش خاتون گذری ہیں۔

حضرت فاطمہ نیشاپوری ذوالنون مصریؒ کے شیوخ میں گذری ہیں۔

حضرت رابعہ شامیہ علوم معرفت میں مشاہدہ کے درجہ پر پہنچ گئی تھیں، جنات اور حوریں انھیں آنکھوں سے نظر آتے تھے۔

حضرت اَمۃ الجلیل اولیاء کبار سے ہیں، مشائخ وقت معرفت کے مسائل دقیقہ ان سے حل کیا کرتے تھے۔

عفیرہ عابدہ کے پاس ان کے علوم و کمالات اور قربِ الٰہی کے سبب عبادِ زمانہ دُعاء کرانے کے لئے حاضر ہوا کرتے تھے۔

حضرت شعوانہ ایسی جلیل القدر عالم باطن تھیں کہ فضیل ابن عیاضؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے اور دُعاء کے خواہشمند ہوتے۔

آمنہ رملیہ مشہور عارفہ ہیں، بشر بن حارث اور امام احمد بن حنبل

امام علوم ان سے نیازمندانہ پیش آ کر دُعاء کے خواستگار ہوئے۔

حضرت سیدہ نفسیہ کی جلالت قدر کے سبب امام شافعیؒ ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے، حضرت ست الملوک اپنے زمانہ کی مقبول بارگاہ حق تھیں، بڑے بڑے علماء و مشائخ ان کی عظمت کرتے اور استفادہ کے خواہش مند رہتے۔

یہ بطور نمونہ ان چند مشاہیر عورتوں کے اسماء گنا دیئے گئے ہیں، ان جیسی ہزارہا فاضلہ، عالمہ عورتیں اُمت کے ہر قرن میں پیدا ہوئیں، جنھوں نے اپنے فضل میں مردوں کی نوع کو مات دے دی، جن کے لئے کتاب 'صفۃ الصفوۃ' میں مستقل باب رکھا گیا ہے، جس میں ان فاضلات و عالمات کی سوانح عمریاں درج کی گئی ہیں، پھر فنون دین ہی نہیں فنون عصر 'شاعری' ادبیات اور بلاغۃ و معانی میں بھی عورتیں بڑی بڑی فاضلہ گذری ہیں، مسماۃ نہانی جو والدۂ شاہ سلیمان کی مصاحب خاص اور حسن و جمال میں بے نظیر تھی، اس درجہ کی ادیب اور شاعرہ تھی کہ اس نے اپنے نکاح کی شرط ہی یہ قرار دی تھی کہ جو اس کے درج ذیل ادیبانہ قطعہ کا جواب لکھ کر لائے گا، وہ اس سے شادی کرلے گا، قطعہ یہ تھا :

ازمردِ برہنہ روئے زرمی طلبم　　در خانۂ عنکبوت پر می طلبم
من از دہنِ مار شکر　　وز پشۂ مادہ شیر نر می طلبم

میں خالی ہاتھ مرد سے زر چاہتی ہوں۔
اور مکڑی کے جال میں پَر چاہتی ہوں۔
میں سانپ کے منھ سے شکر چاہتی ہوں۔
اور مچھر کی مادہ سے شیر نر چاہتی ہوں۔

مردوں میں سے کوئی شاعر اس کا جواب نہ دے سکا، ایک سعد اللہ خاں وزیر آگے آیا، جس نے اس قطعہ کا برجستہ جواب دیا :

علمے است برہنہ زر کہ تحصیل زر است
تن خانۂ عنکبوت دل بال و پر است
زہر است جفائے علم و معنی شکر است
ہر پشہ از و چشید آں شیر نر است

ترجمہ : علم خالی ہاتھ سے ہے جس سے زر حاصل ہوتا ہے، تن خاکی مکڑی کا ایک جال ہے، جس میں کوئی حقیقت نہیں، دل اس کے لئے پر اور بازو ہے جس سے پرواز کرتا ہے اور عرش تک جا پہنچتا ہے، راہ علم کی محنت سانپ کا زہر ہے اور اس کی معنویت جو اس کے اندر مخفی ہے شکر ہے، جس سے روح تک شیریں ہوجاتی ہے، مچھر (یعنی کمزور سے کمزور انسان بھی) اسے چکھ لے تو وہی شیر نر ہے۔

ظاہر مسماۃ نہانی کی یہ قابلیت پردہ دری کی رہین منت نہ تھی؛ بلکہ پردہ پوشی اور وہی شاہی حرم سرا کے پردوں میں رہ کر تھی، جس کا پلہ بھی کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا، ریاض الفردوس میں ایک درجن ایسی فاضلہ عورتوں کے تذکرے ملتے ہیں جو فضلاء وقت تھیں اور مردان سے استفادہ کرتے تھے، مگر یہ سب کچھ اسی دور کی تاریخ ہے جو آج کی بے حیائی اور بے پردگی سے بہت دور تھا اور ان تمام علوم وفنون میں صنف نازک نے اپنے پردہ کو محفوظ رکھ کر ہی ترقی کی تھی، ایسی

مثالیں بعد کے قرون میں بکثرت ملتی ہیں، جن میں پردہ کے تحفظ کے ساتھ علوم وفنون کی گرم بازاری قائم رہی۔

ان کے یہ سارے علمی وعملی کمالات معاذ اللہ پردہ دری کے نتائج نہ تھے؛ بلکہ پردہ داری اور پاک دامنی کے ثمرات تھے، ہویٰ وہوس کے نہیں؛ بلکہ ہدیٰ وتقویٰ کے، پس ان جیسی صدہا اور بے شمار فاضل و پاکباز عورتیں آخر پردہ میں رہ کر کس طرح زیور علم سے آراستہ ہوگئیں، یا اگر بفحوائے کریمہ ''واذکرن مایتلیٰ فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ '' خانگی تعلیم مسلمان بچیوں کے لئے ناکافی ہوتی تو اس قدر کافی علم ومعرفت اور فقہ ان جیسی ہستیوں کو کیسے میسر آ گیا۔

مسلمانوں پر فرقہ واریت کا الزام لگایا جاتا ہے، اس موضوع پر بھی آپ کا رسالہ 'اسلام اور فرقہ واریت' (صفحات: ۸۰) نہایت اہم رسالہ ہے، جس میں آپ نے اسلام کی عالمگیریت اور اس کے علاقائی، قبائلی اور سیاسی تعصّبات سے بالاتر ہونے کی بات بڑے مدلل انداز میں پیش فرمائی ہے، اس ذیل میں ایک جگہ ہندوستان کے فضائل پر بھی بڑی اچھی گفتگو آ گئی ہے؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

اللہ کا پہلا دار الخلافہ جس میں اولین خلیفۂ خداوندی آدم علیہ السلام نازل ہوئے ، ہندوستان ہے ؛ کیوں کہ آدم جنت سے سراندیپ کے جزیرہ میں دجنی کی وادی میں اُترے ہیں ، جو ہند میں ہے ؛ چنانچہ ابن حاتم اور حاکم نے ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت نقل کی ہے اور اسے صحیح کہا ہے کہ :

اول ما اھبط اللہ آدم الی ارض الھند (وفی لفظ) بدجنی ارض بالھند ۔ (سبحۃ المرجان)

سب سے پہلے اللہ نے آدم کو زمین ہند میں اُتارا اور ایک لفظ میں ہے، دجنی میں اُتارا جو سرزمین ہند میں ہے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت میں 'سراندیپ' کا لفظ بھی موجود ہے، اس وادی کی فضیلت میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :

خیر وادٍ فی الناس وادی مکۃ و وادٍ نزل بہ آدم بارض الھند ۔

بہترین وادی لوگوں کی وادئ مکہ ہے (جس میں بیت اللہ ہے) اور وہ وادی جس میں آدم سرزمین ہند میں اُترے۔

آدم علیہ السلام نے اول ہندوستان ہی کو اپنا وطن بنایا، گویا دنیا کی پہلی آبادی ہندوستان سے شروع ہوئی، آدم علیہ السلام اول النبیین ہیں، اس لئے پہلا دارالنبوۃ ہندوستان ٹھہرتا ہے، جیسا کہ آخری دارالنبوۃ حجاز ہے، اول با آخر نسبتے دارد۔

جنت سے دو ہی انسان زمین پر اُترے ہیں، آدم علیہ السلام ہندوستان میں اور حواء (زوجۂ آدم علیہ السلام) سرزمین حجاز میں، خدا کا پہلا قانون، ہندوستان ہی میں آیا اور یہیں سے دین شروع ہوا، جس کی تکمیل بالآخر حجاز نے کی، جبرئیل امین اور روح القدس کا پہلا ورود ہند میں ہوا جو وحی لے کر اُترے، پہلی اذان ہندوستان میں ہوئی، جس میں توحید کا اعلان ہوا، جیسا کہ روایات میں موجود ہے، اول النبیین کو آخر النبیین کی بشارت ہند ہی میں دی گئی، یعنی سرزمین ہند پہلا

دارالتبشیر ہے، طبری کی روایت میں ہے کہ آدم حواء علیہما السلام کو لے کر حجاز سے لوٹے تو اسی وادی میں آئے، جس میں نزول ہوا تھا اور وہیں رہنے کے لئے گھر بنایا، یعنی ہندوستان پہلے نبی کا وطن ہے ''وکفی بہ فخراً'' آدم علیہ السلام کی قبر بھی دجنی میں ہے اور بنص حدیث ثابت ہے کہ آدمی کی قبر اس جگہ بنتی ہے، جہاں سے اس کے خمیر کے لئے مٹی لی جاتی ہے، اس لئے کہا جاتا ہے کہ خاکِ ہند ہی نے پیغمبری کی بنیاد رکھی، آدم علیہ السلام نے چالیس حج کئے اور ایک حج کے لئے بیل پر سوار ہو کر گئے ہیں، جیسا کہ سبحۃ المرجان نے روایت نقل کی، نیز کھیتی باڑی کے لئے پہلا جانور سرخ رنگ کا بیل اور گائے ہی اللہ نے آدم علیہ السلام کو عنایت فرمایا ہے، گویا بیل کی نسل ہند ہی سے شروع ہوئی ہے، شاید اسی لئے ہندوستان میں اس جانور کی عظمت زیادہ کی جاتی ہے کہ یہ اولین حیوانات بھی ہے اور اسے اول النبیین سے ایک خاص نسبت بھی حاصل ہے۔

انبیاء علیہم السلام میں فہم ادریس معروف ہے، گویا فہم کی تیزی حضرت ادریس علیہ السلام کا ممتاز وصف ہے، اس لئے ان پر علوم حکمت خصوصیت سے اُتارے گئے۔

پس اگر حجاز اس لئے مقدس ہے کہ خاتم النبیین کا مولد و منشا اور مہبط وحی قرآنی ہے، اگر شام اس لئے مقدس ہے کہ وہ انبیاء بنی اسرائیل کا مولد و منشا ہے، اگر مصر اس لئے مقدس ہے کہ اسے موسیٰ علیہ السلام سے نسبت حاصل ہے اور اگر عراق اس لئے مقدس ہے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے نسبت ہے، تو بلاشبہ ہندستان اس

لئے مقدس ہے کہ اسے آدم علیہ السلام سے نسبت ہے اور پہلی وحی کا مہبط ہے، پہلا دار النبوۃ اور دار الخلافہ ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بنص روایت طبرانی وہ حضرت شیث علیہ السلام کا وطن ہے جو آدم علیہ السلام کے جلیل القدر بیٹے اور ان کے خلیفہ ہوئے، جنھوں نے آدم علیہ السلام کے جنازہ کی نماز پڑھائی ہے اور اس لئے مقدس ہے کہ بروایت ابن عباس رضی اللہ عنہ (جس کو سبحۃ المرجان نے نقل کیا ہے) وہ نوح علیہ السلام کا وطن ہے، سینکڑوں اہل اللہ کے مشکوفات بھی ہیں، جس سے ہندستان کے مختلف انبیاء کی قبروں اور آثار کا انکشاف ہوا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب صاحبؒ (اول صدر مدرس دارالعلوم دیوبند) نے فرمایا کہ گنگا کے دہانے پر مجھے انوارِ نبوت محسوس ہوئے، کسی نبی کا جسم مدفون ہے، یا آثارِ نبوت ہیں، حضرت مولانا رفیع الدین صاحبؒ مجددی نقشبندی خلیفۂ ارشد حضرت شاہ عبد الغنی محدث دہلویؒ اور اولین مہتمم دارالعلوم دیوبند کا مکاشفہ ہے کہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند کی قبر عین کسی نبی کی قبر میں واقع ہے۔

نماز اسلام کا اہم ترین رکن ہے؛ بلکہ کلمہ شہادت کے بعد رکن اعظم ہے، نماز کی اہمیت اس کی کیفیت اور افعالِ نماز کی مصلحت وحکمت اور اسرار ورموز پر آپ کی کتاب 'فلسفۂ نماز' (صفحات: ۱۶۰) بڑی ہی چشم کشا اور نہایت ہی نادر مضامین کی حامل کتاب ہے، اس میں فلسفہ اور مذہب کا تعلق، انسانی بدن میں جمادات، حیوانات اور نباتات کا اجتماع اور نماز کی تاثیر اور اس میں تربیتی پہلو وغیرہ جیسے نکتوں پر ایسی نفیس گفتگو کی گئی ہے کہ کہیں اور دیکھنے کو نہیں ملی،

حقیقت یہ ہے کہ اس کتاب میں آپ کا قلم امام غزالیؒ، عزالدین بن عبدالسلامؒ اور شاہ ولی اللہ کا ہم رکاب نظر آتا ہے۔

آپ کا ایک اہم خطبہ ''مذاہب عالم میں اسلام کے تین بنیادی امتیازات'' کے عنوان سے ہے جو پچاس صفحات سے زیادہ پر مشتمل ہے، اس خطبہ میں بتایا گیا ہے کہ ''عقل ونقل اوراستناد'' تینوں باتیں اسلام کو حاصل ہیں، اس ذیل میں آپ نے حفاظت قرآن اور اس کی ظاہری وباطنی شہادت، حدیث کی حفاظت وحجیت، اسلام کا قانون وراثت، تعدد ازدواج اور ہندوستان میں اسلام کی آمد اور اس کی مقبولیت جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے، یہ بھی آپ کے اہم خطبات میں ہیں۔

برصغیر میں جن لوگوں نے انکارِ حدیث کے فتنے کو کھڑا کیا، ان کی قیادت کرنے والوں میں ایک پروفیسر غلام جیلانی برق بھی تھے، جن کی کتاب 'دوقرآن' اور 'دواسلام' نے ایک زمانہ میں پورے برصغیر میں دھوم مچا رکھی تھی، دوقرآن میں یہ بات دکھائی گئی ہے کہ ایک خدا کا قولی قرآن ہے اور وہ ہے مصحف مقدس اور ایک خدا کا فعلی قرآن ہے اور وہ ہے کائنات، پھر اس پس منظر میں مطالعہ کائنات کی اہمیت کو بتاتے ہوئے دین کے بہت سے مسلمہ حقائق کا انکار بلکہ ان کا استہزاء کیا گیا ہے، آپ نے اس کا جواب ''ایک قرآن'' (صفحات: ۱۲۶) کے نام سے لکھا ہے اور اس میں یہ بات واضح کی ہے کہ مادی تمدنی ترقی کے مقابلہ روحانی تمدنی ترقی زیادہ اہم ہے، یہی انبیاء کی دعوت کا مقصد رہا ہے اور قرآن مجید نے اس کو بار بار تاکید واہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے، اس رسالہ میں 'ان الارض یرثھا عبادی الصالحون'' پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کی صحیح مراد متعین کی گئی ہے، اس کا خلاصہ خود مؤلف کے الفاظ میں اس طرح ہے :

(۱) آیاتِ تکوین کی رو سے صحیفۂ کائنات کا مطالعہ ضروری

ہے ؛ لیکن معرفت صانع کے لئے ، نہ کہ محض معرفت مصنوعات اور مادہ کی توڑ پھوڑ سے صنعتی کاروبار چلانے کے لئے۔

(۲) مادی اقتدار ضروری ہے ؛ لیکن قانونِ فطرت کو نافذ العمل بنانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کے لئے نہ کہ استبداد و تعیش اور اعلاء کلمۃ الفسق کے لئے۔

(۳) استخلاف فی الارض ضروری ہے ؛ لیکن مادی حوائج سے غنی بن کر کامل بننے کے اور بنانے کے لئے ، نہ کہ وفورِ اسباب سے اپنی محتاجگی کو بڑھانے اور دنیا کی نقالی کرنے کے لئے۔

(۴) مدنیت اور تمدنی اکتشافات بقدرِ ضرورت ضروری ہیں ؛ لیکن تعاونِ باہمی میں ازدیاد کے لئے نہ کہ مادیت میں غلو اور فناء فی العیش ہو جانے کے لئے۔

(۵) تسخیرِ کائنات ضروری ہے ؛ لیکن روحانی تصرفات کی مشق بہم پہنچانے اور صورتوں کے راستہ سے حقائق تک پہنچنے کے لئے ، نہ کہ مادی تصرفات میں محصور اور محدود رہ کر صورت پرستیوں اور مختلف الاشکال ڈیزائنوں میں غرق ہو جانے کے لئے۔

(۶) اعداء اللہ کی تخویف کے لئے امکانی تیاری (اعداد مستطاری) ضروری ہے ؛ لیکن دشمن کی نقالی یا اس کی طرح عَدد اور عُدد پر کلیتًا اعتماد کے ساتھ نہیں ؛ بلکہ فی الجملہ ان اشیاء کی رعایت رکھ کر ، قوت قلب ، حوصلۂ یقین اور حکیمانہ تدابیر کی ضرورت کے ساتھ۔

(۷) اور بالآخر یہ تمام اُمور ، تمدن ، سیاست ، امارت ، تسخیر ،

تکوین وغیرہ ضروری ہیں، مگر رضائے الٰہی اور قربِ حق کے لئے، نہ کہ رضائے نفس اور ارضائے غیر کے لئے۔

(۸) اور خلاصہ یہ ہے جب کہ تمام دینی مقاصد کی تحصیل بغیر اتباع نبوی ﷺ کے ناممکن ہے جو حقیقتاً عملی قرآن ہے، تو بطور تفنن طبع اگر تعددِ قرآن کا نظریہ موزوں ہے تو ''تین قرآن'' کے عنوان کے ساتھ؛ تا کہ کتاب اللہ علمی قرآن ہو، کائنات اللہ برہانی اور تمثیلی قرآن ہو اور رسول اللہ ﷺ کی ذات اقدس عملی قرآن ہو، نہ کہ ''دو قرآن'' کے نظریہ کے ساتھ، جس میں تمثیلی قرآن تو سرے سے حذف ہو جائے اور عملی قرآن باقی بھی رہے تو تلبیس کے ساتھ اور غیر واقعی ہو کر، یعنی بجائے ذاتِ نبوی ﷺ کے کائنات آ جائے، جس سے کوئی اسوہ اور عملی نمونہ اخذ نہیں کیا جا سکتا، بہر حال اس مضمون کی جملہ تفصیلات اور آخر میں اس نمبر وار خلاصہ سے یہ مخفی نہیں رہتا کہ میرا مقصد مسلمانوں کی مادی، صنعتی، عسکری اور دوسری انواع کی قوت وشوکت یا حسب ضرورت دنیا کی ترقی یافتہ وسائل کے استعمال سے گریز یا انکار کرنا نہیں؛ بلکہ انھیں آیاتِ تکوین کا مدلول کہے جانے، ان کے معیارِ کفر واسلام ہونے اور انھیں مقصد حیات کہہ کر اپنی ترقی کا میدان بنا لینے یا غلو وافراط اور مبالغوں سے ان میں منہمک اور فنا ہو جانے پر نکیر وانکار کرنا ہے۔

آپ کی ایک تالیف ''خاتم النبیین'' (صفحات: ۸۵) ہے، یہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر ایک انوکھی کتاب ہے، جس میں ختم نبوت کی دلیلوں کے علاوہ نبوت محمدی کے تمام انبیاء سے

فائق ہونے نیز تمام انبیاء کے کمالات ومعجزات کے جامع ہونے کا تذکرہ ہے۔

اس سلسلہ میں آپ کی ایک قابل ذکر تالیف ''اُصولِ دعوت اسلام'' بھی ہے، یہ دعوتِ دین کی اہمیت وافادیت اور دعوت کے طریقۂ کار کے سلسلہ میں شرعی اُصول واحکام پر نہایت ہی اہم تحریر ہے اور دریا بہ کوزہ کا مصداق ہے، اس میں آپ نے دعوتی اسفار، دعوت کی انواع، مدعوین کی قسموں، داعی کے اوصاف وغیرہ جیسے موضوعات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، اس اہم فریضہ سے غفلت پر افسوس کا اظہار کیا ہے اور کار دعوت کے لئے ایک لائحہ عمل بھی پیش کیا ہے، نیز تمہیدی طور پر مذاہب عالم کا مختصر جائزہ بھی لیا گیا ہے، جس میں عیسائی مذہب، لامی وبتتی مذہب اور یہودی مذہب کا خصوصی تذکرہ ہے۔

جن لوگوں نے حضرت قاری صاحبؒ کے خطبات کو سننے اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کی سعادت حاصل کی ہے، وہ بخوبی واقف ہیں کہ ان مواقع پر آپ کی زبان سے ایسا لگتا تھا کہ علم وفکر کا آبشار جاری ہے اور اس میں جہاں دعوت واصلاح اور موعظت وتذکیر کی باتیں ہوتی تھیں، وہیں احکام دین کا باہمی ارتباط، قانون فطرت سے ان کی مطابقت، ان کے اسرار ومصالح اور ان کی عقلی توضیحات پر بھی بڑی حکیمانہ گفتگو ہوتی تھی، جو قلب وروح کے ساتھ ساتھ دماغ کو بھی مطمئن کرتی تھی۔

حضرت حکیم الاسلامؒ کے وہ خطبات جو ''خطبات حکیم الاسلامؒ'' کے عنوان سے دس جلدوں میں طبع ہو چکے ہیں، میں بھی بہت سے خطبات کا موضوع متکلمین کے طرز پر اسلام کی صداقت وحقانیت کو ثابت کرنا اور معاندین کے اعتراضات کا جواب دینا ہے، اور ضمنی طور پر تو تقریباً ہر خطبہ میں اس طرح کے مضامین آ گئے ہیں، یہاں چند اہم خطبات کے صرف عناوین ذکر کئے جاتے ہیں:

☆ راہِ اعتدال　　　　خطبات حکیم الاسلام　　　　جلد سوم

☆ معرفت باری	خطبات حکیم الاسلام	جلد سوم
☆ تسکین فطرت	خطبات حکیم الاسلام	جلد سوم
☆ خطبۂ طیبہ	خطبات حکیم الاسلام	جلد سوم
☆ اسلام — عالمی مذہب ہے	خطبات حکیم الاسلام	جلد چہارم
☆ نبوت وملوکیت	خطبات حکیم الاسلام	جلد پنجم
☆ افادات علم وحکمت	خطبات حکیم الاسلام	جلد ہفتم
☆ مسلم پرسنل لا	خطبات حکیم الاسلام	جلد ہشتم
☆ اسلام اور آزادی	خطبات حکیم الاسلام	جلد ہشتم
☆ اشتراکِ مذہب	خطبات حکیم الاسلام	جلد ہشتم
☆ نبی اُمی ﷺ	خطبات حکیم الاسلام	جلد دہم
☆ رہنمائے انقلاب	خطبات حکیم الاسلام	جلد دہم
☆ اسلامی آزادی کا مکمل پروگرام	خطبات حکیم الاسلام	جلد دہم
☆ تکمیل انسانیت	خطبات حکیم الاسلام	جلد دہم

اس سلسلہ میں آپ کے دو اہم خطبات صدارت بھی قابل ذکر ہیں، ایک ''فکر اسلامی کی تشکیل جدید'' کے عنوان سے ہے، جو آپ نے دسمبر ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ دہلی میں دیا تھا، اس خطبہ میں آپ نے فکر وتعقل کی اہمیت، قواعد و اُصول اور جزئیات کی افادیت، ضمیر کی آزادی اور حریت رائے، نیز اسلام کی عالمگیریت پر بڑی حکیمانہ روشنی ڈالی ہے۔

دوسرے: نومبر ۱۹۷۳ء میں مسلم پرسنل لاء کنونشن بمبئی کا خطبہ صدارت —— جو نہایت ولولہ انگیز اور تاریخی خطبہ ہے —— جس میں قانون شریعت کی اہمیت اور اس کے اعتدال وتوازن پر نہایت ہی عالمانہ طور پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اسلام کی حفاظت و مدافعت کے پہلو سے جو علمی و تالیفی خدمات آپ نے انجام دی ہیں، ان کے علاوہ تحریکی اعتبار سے بھی آپ کی خدمات نہایت ہی اہمیت کی حامل ہیں، جن میں سب سے جلی عنوان ’’ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ‘‘ کا ہے، ہندوستان میں آزادی سے پہلے معمارانِ قوم یہ وعدہ کرتے آرہے تھے کہ آزادی کے بعد مسلمانوں کے پرسنل لا کو تحفظ دیا جائے گا، پھر جب دستور بنا تو مذہب پر عقیدہ، اس پر عمل اور مذہب کی تبلیغ کی آزادی کو بنیادی حق تسلیم کیا گیا؛ لیکن بدقسمتی سے آہستہ آہستہ حکومت کا تیور بدلنے لگا، مسلم پرسنل لا کے خلاف سرکاری ذمہ داروں کے بیانات کے ذریعہ تبدیلی کا راستہ کھولنے کی کوشش کی گئی، اس موقع پر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی رفاقت کے ساتھ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے دارالعلوم دیوبند میں اس موضوع پر اجلاس طلب کیا، جس میں علماء اور دانشور دونوں شریک ہوئے۔

پھر نومبر ۱۹۷۲ء میں اس اجلاس کی تحریک پر بمبئی کا وہ عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، جس کے بارے میں بزرگوں کا تصور تھا کہ خلافت تحریک کے بعد ایسا ہمہ مسلکی، ہمہ جماعتی اور ہمہ علاقائی اجلاس منعقد نہیں ہوا، اس اجلاس کی صدارت کے لئے آپ ہی کا انتخاب عمل میں آیا، اس اجلاس نے بورڈ کی تشکیل کا فیصلہ کیا، بورڈ کی تشکیل مسلکی اور جماعتی کشاکش کی وجہ سے بہت دشوار کام تھا؛ لیکن حضرت قاری صاحبؒ کی بالغ نظر، معتدل اور مرنجان مرنج شخصیت کی شکل میں ایک ایسی ہستی موجود تھی، جن کی صدارت پر تمام لوگوں کا اتفاق ہوگیا اور پھر آپ کی وفات تک آپ ہی کی قیادت میں تحفظ شریعت کا یہ کارواں نہایت ہی کامیابی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا اور ایمرجنسی جیسے پُرافتاد حالات میں بھی آپ کی حکیمانہ قیادت میں اس نے سفر جاری رکھا۔

حقیقت یہ ہے کہ خارجی فتنوں کا مقابلہ اور دین حق کا دفاع آپ کی کاوشوں کا خاص ہدف تھا اور اس معاملہ میں بھی آپؒ دیوبند کے اصل مزاج و مذاق اور فکر و نظر کے نمونہ تھے؛

کیوں کہ دارالعلوم کے قیام کے بعد سے جب بھی اسلام کے خلاف کوئی فتنہ اُٹھا، علماء دیو بند اس کا مقابلہ کرنے میں پیش پیش رہے، اس ملک میں ہندو انتہاء پسندی کی تحریک اُٹھی، عیسائی مبلغین ملک کی گلیوں اور کوچوں میں لوگوں کو دعوت ارتداد دینے لگے، انگریزوں کی مدد سے قادیانیت کے فتنہ نے ایک سیل بلاخیز کی طرح اپنے بال و پر پھیلائے، الحاد اور نیچریت ایک طوفان بن کر نئی نسلوں کے دل و دماغ پر چھانے لگی، اشتراکیت اور کمیونزم نے علمی لباس پہن کر اور اسلامی لبادہ اُوڑھ کر مسلمانوں کو متاثر کرنا شروع کیا، انکارحدیث کا فتنہ ایک زبردست علمی یلغار کے ساتھ اُٹھا، قانون شریعت کی معقولیت، فطرت انسانی سے اس کی ہم آہنگی اور موجودہ دور میں اس کی نافعیت پر سوالیہ نشانات اُٹھائے گئے، خود رسول اللہ ﷺ کی سیرت مبارکہ پر حرف گیری کی گئی، ان فتنوں کے مقابلہ کے لئے جو لوگ اُٹھے، یا جنھوں نے اس کاروانِ تحفظ دین کی سالاری کی وہ یا تو علماء دیو بند تھے، یا وہ لوگ جو دیو بند کی فکر سے متاثر تھے۔

دین پر استقامت اور حمیت ایمانی کا امتزاج اور اس کے ساتھ ساتھ اسلام کی ایسی ترجمانی جو دل و دماغ دونوں کو متاثر کرتی ہو، علماء دیو بند کا مزاج رہا ہے اور آج بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ ہماری توجہ فروعی اور داخلی اختلافات سے زیادہ دفاعِ اسلام پر ہو؛ کیوں کہ فروعی اختلافات میں اُلجھ جانے والے لوگ اکثر خارجی فتنوں کی طرف توجہ نہیں کر پاتے، یہی فکر، دیو بند کے سرخیل حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی زندگی کا پیغام ہے، یہی مکتب دیو بند کے بانی ومؤسس حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کوششوں کا اصل ہدف رہا ہے اور یہی حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی زندگی کی اصل دعوت ہے۔

❁ ❁ ❁

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر !

مشہور مؤرخ علامہ عبدالرحمان بن خلدون نے لکھا ہے :

انتہائی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ باوجودیکہ دین عربی ہے، صاحب شریعت ﷺ عربی ہیں ،مگر اس اُمت میں حاملین علم کی اکثریت غیر عربیوں کی رہی ہے اور یہ بالاتری ان کو علوم شرعیہ اور علوم عقلیہ ہر دو میں حاصل ہے، بہت کم علماء ہیں جو عرب تھے اور وہ اگر اپنے نسب اور خاندان کے لحاظ سے عربی تھے، تو بھی زبان ،سکونت اور اساتذہ کے لحاظ سے وہ عرب نہ تھے۔(مقدمہ،فصل:۳۵،ص:۵۴۳)

واقعہ ہے کہ یہ تاریخ کا ایک عجوبہ بھی ہے اور اسلام کا اعجاز ، اس کی صداقت کی دلیل اور اس کے عالمگیر ہونے کا ثبوت بھی — اللہ کی یہ عجیب قدرت ہے کہ علمی وفکری یا سیاسی اعتبار سے اس اُمت کی تقدیر کبھی کسی خاص قوم اور کسی خاص جگہ سے وابستہ نہیں رہی، اس نے ہر دور میں اپنے لئے ایک نیا پیمانہ اور نیا پیکر تلاش کرلیا ہے اور اس میں ہند اور علماء ہند کا بھی بڑا حصہ رہا ہے ، پھر ہندوستان میں بھی دہلی ،لکھنؤ ، خیرآباد ، بدایوں ، عظیم آباد ، لاہور ، دکن اور مختلف شہروں اور علاقوں کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے کسی زمانہ میں مسلمانوں کی علمی وفکری قیادت اور اپنے خون جگر سے اسلامی ورثہ کی حفاظت کی ہے۔

اس لحاظ سے کچھ شبہ نہیں کہ گذشتہ صدی ہجری میں دوآبہ کا علاقہ — جسے ہم مغربی یوپی کہتے ہیں — ہندوستان کا دل وجگر رہا ہے، اس نے وقت کے ہر فتنہ کے مقابلہ میں قائدانہ کردار ادا کیا، اس نے علوم اسلامی کی حفاظت کے باب میں ایک نئی تاریخ کو جنم دیا، اس

نے بالخصوص مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک کی شکل میں احیاءِ اسلام کی ''طریق نبوی'' سے قریب تر ایسی جدوجہد کو وجود بخشا، جس کا فیض گوشہ گوشہ میں پہنچ رہا ہے اور دردمند علماء اور داعیوں کا ایک ایسا کارواں تیار کر دیا، جس کی کاوشوں نے الحاد و دہریت کی فضا میں اسلام کی طرف لوٹنے کی ایک لہر پیدا کر دی —— اسی کارواں کے ایک راہرو بلکہ راہبر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ بھی تھے۔

وہ ۱۱؍رمضان المبارک ۱۳۱۵ھ کو پیدا ہوئے، مولانا محمد یحییٰ کاندھلویؒ —— جو حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے شاگرد رشید تھے —— والد ماجد تھے اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب کاندھلویؒ عم محترم، ان حضرات کی برکت سے پورا گھر دین داری وخدا ترسی کا نمونہ بھی تھا اور علم وفضل کی آماجگاہ بھی، پھر تعلیم وتربیت کی طرف مولانا یحییٰ صاحب نے اس قدر توجہ دی کہ خود مولانا کاندھلوی کے الفاظ میں ان پر کنواری لڑکی کی طرح نگاہ رکھی، اس بات پر خاص توجہ تھی کہ کہیں ''صاحبزادیت (جو اکثر صاحبزادوں کو کسی کام کا نہیں رکھتی)'' پیدا نہ ہو جائے اور طبیعت میں تواضع وانکسار اور جفاکشی باقی رہے؛ چنانچہ واقعہ ہے کہ بچپن کی تربیت نے ان اوصاف کو گویا ان کی فطرت کا جزو بنا دیا تھا۔

۱۳۳۴ھ میں فارغ ہوئے، اس کے بعد مدرسہ مظاہر علوم میں مدرس ہوئے، ۱۳۴۶ھ میں حج کیا، اس موقع سے مدینہ منورہ میں احسان وسلوک میں اپنے استاذ اور شیخ مولانا سہارنپوری کی اجازت سے سرفراز ہوئے اور مدرسہ میں صحیح بخاری کا درس متعلق ہوا، پھر کامل ستائیس برس تک اسی منصب جلیل (شیخ الحدیث) پر فائز رہے، یہاں تک کہ ضعف بصارت اور درازی عمر کے باعث باضابطہ تدریس کا سلسلہ چھوڑ دیا اور اخیر عمر تک مدرسہ کی سرپرستی کرتے رہے، مدینہ منورہ میں قیام کا اشتیاق تھا، وہیں تدفین کے بھی آرزومند تھے، چند سال پہلے وہاں کی شہریت ملی، جب سے اکثر اوقات وہیں گذارتے تھے، صحت ادھر ایک دو سال سے زیادہ ہی متأثر تھی، مگر جب بیمار پڑے اور علالت نے زور پکڑا تو حالت جیسی بھی ناگفتنی ہو، مدینہ کا رُخ کیا کہ

مبادا ایسا نہ ہو کہ مدینہ میں تدفین کا شرف حاصل نہ ہوسکے، اللہ تعالیٰ نے یہ دُعاء بھی سن لی اور وہیں پیوندِ خاک ہوئے —— ''پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کی خمیر تھی'' —— اس وقت عمر ۸۷ سال تھی اور وفات بھی اسی دن ہوئی، جس دن آقائے مدینہ ﷺ کی وفات ہوئی، یعنی دوشنبہ —— نوراللہ مرقدہ۔

علمی فضل وکمال کا پوچھنا ہی کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے ان کی عمر میں بڑی برکت دی اورانھوں نے بڑے علمی کام کئے، ان کا سب سے مایہ ناز اور یادگار کارنامہ ''مؤطا امام مالک'' کی شرح ہے، یہ مؤطا موجودہ مستند کتبِ حدیث میں اولین ہے اورشاہ ولی اللہ کے نزدیک صحیح بخاری پر بھی فائق ہے، ہندوستان میں پہلے بھی فارسی اورعربی میں ''المسوی'' اور ''المصفی'' کے نام سے شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے اس کی شرحیں لکھی تھیں، ان شرحوں پر اسرار شریعت کا رنگ غالب ہے اور بیان وتشریح کے لحاظ سے مختصر ہے، مولانا کاندھلوی نے فقہ الحدیث کے نقطۂ نظر سے ایک مبسوط اورشایانِ شان شرح ''اوجز المسالک'' کے نام سے چھ جلدوں میں لکھی اور خوب لکھی، علمی حلقہ میں اس کتاب کو غیر معمولی پذیرائی حاصل ہوئی اورعرب علماء نے بھی تحسین کی۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کتاب کی بیگانوں نے بھی تحسین کی ہے، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی پر مولانا کاندھلویؒ نے سخت تنقیدیں کی ہیں، انھیں مولانا مودودی نے پاکستان میں اسلامی قانون کے نفاذ کے لئے کیا حکمت عملی اختیار کی جائے؟ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک مقالہ لکھا ہے اوراس میں فقہ وحدیث کی مختلف اہم کتابوں کا حوالہ دیا ہے کہ اُردو زبان میں ان کا ترجمہ ہونا چاہئے، ان میں موطا امام مالک کی ان تینوں شروح کے ترجمہ کی رائے دی ہے، اورکتابوں کے ساتھ مصنفین کے نام بھی لئے ہیں اور اِس کتاب کے بارے میں لکھا ہے ''سہارنپور کے ایک عالم کی اوجز المسالک'' —— اس کتاب کا مقدمہ علوم الحدیث اوررجال کے موضوع پر بجائے خود ایک اہم کتاب ہے۔

''اوجز المسالک'' کے علاوہ اپنے استاذ مولانا خلیل احمد صاحبؒ کی شرح ابوداؤد ''بذل المجہود'' میں بھی ان کا کافی تعاون شامل رہا ہے، صحیح بخاری کے ابواب وتراجم کی بحث جیسی اہم اور دقیق ہے، وہ اہل علم کی نظر سے مخفی نہیں، اس پر بھی عربی زبان میں آپ کی ایک نہایت ہی مفید، جامع اور معلومات افزاء تالیف ''الابواب والتراجم'' ہے، بخاری کے تراجم اوراحادیث کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے میں مولانا کاندھلوی نے بڑی کاوش فرمائی ہے، جوان کی ذہانت وطباعی کا نمونہ ہے، نام سے ایسا لگتا ہے کہ اس میں صرف تراجم ابواب پر گفتگو ہوگی ،مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ بخاری کی ایک مکمل شرح ہے اور صرف اس کتاب سے استفادہ کر کے ایک باخبر استاذ صحیح بخاری کا درس دے سکتا ہے، اس کتاب کی صحیح قدر وہی جان سکتا ہے جس نے خود صحیح بخاری کا درس دیا ہو۔

اُردو زبان میں بھی متعدد اہم علمی تصانیف ہیں، اخیر دور میں ''شریعت وطریقت کا تلازم'' کے نام سے ایک بڑی نفیس کتاب لکھی، جس میں علم تفسیر، علم حدیث، فقہ، اجتہاد وتقلید، تصوف اور اصطلاحاتِ تصوف سے بحث کی ہے، ائمہ اور فقہاء سلف کے اختلافات اور نظریاتی مشاجرات پراس زمانہ میں جس نازیبا اور نامناسب انداز میں بحث کی جاتی ہے اور بزرگوں کی شان میں گستاخانہ لب ولہجہ روا رکھا جاتا ہے، اس کی رد میں ''اختلاف ائمہ'' کے نام سے بڑا جامع اور متوازن رسالہ لکھا ہے، جس میں اس بات پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ فقہاء کو ان کے اختلافات کی بناء پر برا بھلا کہنا نہیں چاہئے اور اُن مسائل میں غلطی کو اجتہادی غلطی تصور کرنا چاہئے، جن میں دلائل شرعیہ کی رُو سے دو مختلف نظریات کی گنجائش ہے، مولانا نے اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ کی ''رفع الملام عن الائمہ الاعلام'' اور شاہ ولی اللہ صاحبؒ کی ''الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف'' سے استفادہ کرنے کے علاوہ اپنی طرف سے کچھ اضافہ بھی کیا ہے اور اُردو زبان میں شاید خاص اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے۔

مختلف عبادات کے فضائل پر انھوں نے جو مجموعہ مرتب کیا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے وہ قبولیت عطا فرمائی، جس کی مثال کم ملتی ہے، بہ ظاہر یہ ایک عام سی کتاب معلوم ہوتی ہے؛ لیکن

حقیقت میں یہ ایک عالمانہ تالیف ہے، جس میں شارحین حدیث کے اقوال کا احاطہ اوران میں روایات کے تطبیق پیدا کرنے نیز تعارض کو دفع کرنے کی کوشش کی گئی ہے، متن میں زیادہ تر متداول حدیثیں ذکر کی گئی ہیں ؛ لیکن فوائد کے ذیل میں بعض واقعات ایسے آ گئے ہیں ، جو ’’**کلمو الناس علی قدر عقولھم**‘‘ سے ہم آہنگ معلوم نہیں ہوتے۔

اپنے بزرگوں سے بڑا تعلق تھا، ان کے معاملہ میں لب ولہجہ بہت متین ہوتا، ان کا نام لیتے تو نہایت ادب واحترام اور القاب کے ساتھ، ان کے باہمی اختلافات اور مشاجرات پر اپنی زبان نہ کھولتے اور سبھوں کو یکساں طور پر مخلص تصور کرتے ، اللہ نے ان کو اکابر اہل علم کی صحبت سے استفادہ کا موقع بھی دیا، اپنے والد بزرگوارؒ، مولانا محمد الیاس صاحبؒ، مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا خلیل احمد صاحبؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کے علاوہ تھوڑی سی صحبت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کی بھی حاصل ہوئی اور اللہ نے دل کی زمین ایسی رکھی تھی کہ سبھوں سے فیضیاب ہوئے۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ، مولانا خلیل احمد صاحب اور مولانا حسین احمد صاحب سے خاص تعلق تھا اور گویا ان حضرات پر وارفتہ تھے —— اپنی کتابوں میں بزرگوں کے واقعات اوران کے معمولات بہ کثرت نقل کرتے ہیں، رمضان کے رسالہ میں تو انھوں نے قریب قریب تمام ہی اکابر دیوبند کے معمولات کو جمع کیا ہے اور ’’اکابر کا رمضان‘‘ کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس کی وجہ سے فطری طور پر ان حضرات کے حق میں لب ولہجہ ترش ہو جاتا تھا، جو تنقید کے معاملہ میں غیر محتاط واقع ہوئے ہیں، ان ہی میں مولانا مودودی بھی ہیں، مولانا مودودی پر تنقید ان کو مولانا حسین احمد صاحب کی طرف سے گویا ورثہ میں ملی تھی ؛ چنانچہ اس موضوع پر ان کے مکاتیب کا مجموعہ کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے۔

مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کے آپ شروع ہی سے سرگرم معاون

ومددگار رہے، اور کہنا چاہئے کہ آپ نے ان کی زبان کا کام کیا، ان ہی کے حکم سے فضائل کی کتاب مرتب کی، جو آج تبلیغی جماعت کے لئے بنیاد اور اساس کی حیثیت رکھتی ہے، اور وہی گویا جماعت کا واحد لٹریچر ہے، اسی طرح تبلیغی جماعت پر پڑنے والے اعتراضات اور شبہات کا جواب بھی لکھا، اہل علم کے حلقہ کو ہمیشہ اس کام کی طرف دعوت دی اور ان کے علمی مشاغل کے ساتھ دعوت کو جوڑا، نازک وقتوں میں گتھیاں سلجھائیں، مولانا محمد الیاس صاحب کے بعد دونوں امیر مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسن صاحبؒ کے انتخاب کے وقت بنیادی کردار ادا کیا اور ہر طرح کے اختلاف وانتشار سے جماعت کو بچائے رکھا۔

راقم الحروف نے خود دیکھا ہے کہ بعد عصر جب بیعتِ سلوک لیتے تو اعلان فرما دیتے کہ جو لوگ جماعت سے متعلق ہوں، وہ مولانا انعام الحسن صاحب امیر تبلیغی جماعت ہی سے بیعت ہوں اور ان ہی سے تعلق بھی رکھیں، تبلیغی احباب کو موقع بہ موقع اطاعت امیر کی تلقین بھی کرتے رہتے۔

اخیر عمر میں ان کو جو مرجعیت حاصل ہوئی، اس نے ہندوستان کی قدیم خانقاہوں کی یاد تازہ کردی، تبلیغی جماعت کے کاموں کی وسعت اور پھیلاؤ کی وجہ سے پوری دنیا کے دعوتی وفود ان کی خدمت میں حاضر ہوتے، ادھر خود ان کے مسترشدین اور متوسلین کی تعداد بھی بے شمار تھی، بڑے بڑے علماء بھی ان سے کسبِ فیض کرتے؛ چنانچہ رمضان المبارک میں اعتکاف کی غرض سے آنے والوں کی اتنی کثرت ہوتی کہ مسجد کی اچھی خاصی وسعت کے باوجود بہت سے لوگوں سے معذرت کرنی پڑتی، رمضان المبارک میں حاضرین اور معتکفین کی تعلیم وتربیت پر خاص نظر ہوتی اور ان کا پورا وقت مصروف رکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے دل بھی خوب دیا تھا اور برکت بھی خوب دی تھی، اتنا بڑا ہجوم رہتا، مگر پھر بھی کھانے کا بڑا اچھا اور معقول اہتمام، وہ درویشی میں شاہی کی بہترین مثال تھے، عام دنوں میں بھی ان کا دسترخوان وسیع رہتا، جب بھی کوئی تقریب ہوتی، عام دعوت ہوتی، جب

''اوجز المسالک'' کی تالیف پایۂ تکمیل کو پہنچی تو ہندوپاک کے مشاہیر علماء کو دعوت دی اوران کی ضیافت فرمائی۔

تجربہ ہے کہ اکثر اہل شہراور پڑوسی لوگوں سے بدگمان ہوتے ہیں، دن رات کا ساتھ عقیدت کی آگ کو بجھادیتا ہے، یہ ایک فطری بات بھی ہے، مگر مولاناؒ کا معاملہ اس سے مختلف تھا، اہل شہر بھی ان کے گرویدہ تھے، میں نے خود دیکھا کہ دہلی اور دیوبند والے تو مصافحہ کی قطار میں کھڑے ہیں ہی، سہارنپور کے لوگ بھی اسی صف میں کھڑے ہیں، یہاں تک کہ اژدحام کی کثرت کی وجہ سے اہل شہر کو روز کی آمد سے روک دینا پڑا۔

ان کی علمی خدمات، پھر ذکر وشغل اور ریاضتیں، لوگوں سے ملاقاتیں، دعوت وتبلیغ کے موضوع پر گفتگو، خصوصی مجلس وغیرہ دیکھ کر واردین کو حیرت ہوتی تھی کہ ان کے وقت میں کس قدر برکت ہے؟ اور مفلوج ومعذور ہونے کے باوجود قویٰ کس قدر مضبوط ہیں؟ یہ برکت اس لئے تھی کہ بزرگوں کی طرح وہ وقت کے معاملہ میں بہت منظّم اور مرتب آدمی تھے، ہر کام کے لئے ایک وقت مختص تھا اور اس وقت میں وہی کام انجام دیتے تھے —— مشہور ہے کہ جو وقت ان کے علمی کاموں اور تصنیف وتالیف کا ہوتا، ممکن نہ تھا کہ کوئی بڑا سے بڑا آدمی بھی اس میں دخل انداز ہوجائے، یا وہ خود کسی دوسرے کام میں مصروف ہوجائیں۔

''اتباع سنت'' ان کی عادت بن چکی تھی، کُرتا ہمیشہ نصف پنڈلی تک ہوتا، جوتے پہننے، جوتے اُتارنے اور مسجد میں داخل ہونے وغیرہ میں بھی حتی المقدور سنتوں کا اہتمام ہوتا —— اب تک ان کی صورت آنکھوں میں ہے، دیوبند میں پڑھتا تھا، پہلی دفعہ جمعرات کو حاضر ہوا، مصافحہ کیا اور بیٹھ گیا، غالباً ''موت کی یاد'' نامی کتاب ایک صاحب پڑھ رہے تھے، مجلس میں علماء بھی تھے عوام بھی، دولت مند بھی اور غریب بھی، عرب بھی اور عجم بھی، رنگ سانولا، داڑھی نہ بالکل سفید نہ سیاہ، جسم لحیم وشحیم مگر مفلوج، صرف مصافحہ کے بقدر ہاتھ اُٹھ سکتا تھا، کپڑے کا رنگ سرمئی، سر منڈا ہوا اور بالکل صاف، سر پر غالباً گول ٹوپی تھی، آواز میں اب بھی کرختگی، منکرات

کے معاملہ میں کوئی نرمی نہیں، میرے بعد چند آدمیوں نے مصافحہ کیا، پھر ایک صاحب بڑھے، کوئی عہدہ دار تھے، مگر داڑھی ندارد تھی، ہاتھ کھینچ لیا اور فرمایا: جسے سنت رسول سے تعلق نہ ہو، مجھے اس سے کیا تعلق؟ انھوں نے معذرت کی، آئندہ کے لئے توبہ کیا اور پھر مصافحہ ہوا، —— اس ایک حاضری کے بعد کئی بار حاضری ہوئی اور ہر دفعہ دل کھنچتا گیا —— علم و اخلاق اور دعوت و اصلاح کا یہ حسین امتزاج اللہ کے یہاں جا چکا، وہ تو دنیا میں راضی برضا تھے ہی، اُمید ہے کہ انھوں نے بھی اللہ کو راضی پایا ہوگا —— مگر آج ان کے جانے سے ایک بزم برہم ہو چکی اور ایک عالم تاریک ہو گیا :

رفتم و از رفتنِ من عالمے تاریک شد
من مگر شمعم ، چوں رفتم ، بزم برہم ساختم

❁ ❁ ❁

مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ

فقہی خدمات اور فقہی مزاج و مذاق

گذشتہ صدی میں برصغیر میں جو چند اہم ترین شخصیتیں گذری ہیں اور جنھوں نے علمی دنیا پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں، ان میں ایک شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ کی شخصیت بھی ہے، انھوں نے اپنی پوری زندگی مطالعہ و تحقیق، تعلیم و تدریس اور تصنیف و تالیف میں ایسی یکسوئی کے ساتھ گذاری اور اللہ نے ان کے کام میں اتنی برکت عطا فرمائی، جس سے متقدمین اور سلفِ صالحین کی یاد تازہ ہوتی ہے، اور اسی لئے ان کی 'آپ بیتی' علماء کے لئے ایک نقش موعظت اور درس عبرت ہے، جس سے خشیت الٰہی، ورع و احتیاط اور علمی انہماک، نیز اپنے بزرگوں سے تعلق اور ان کے غایت درجہ توقیر و احترام کا سبق لیا جاسکتا ہے۔

مولانا کاندھلوی جس لقب سے معروف ہوئے اور جو ان کے نام کا حصہ بن گیا، وہ ہے ''شیخ الحدیث'' — انھیں حدیث کے فن سے عشق بھی تھا اور گہری مناسبت بھی، اور اللہ تعالیٰ نے حدیث سے جو اشتغال انھیں میسر فرمایا اور جتنا طویل عرصہ تک تعلیم و تعلم اور تصنیف و تالیف کی جہت سے وہ اس فن کی خدمت میں مشغول رہے، وہ ایسی سعادت عظمیٰ ہے، جو کم ہی لوگوں کو میسر آتی ہے، ۱۳۳۲ھ میں آپ نے مشکوٰۃ شریف پڑھی، اس وقت سے لے کر تادم آخر فن حدیث سے آپ کا اشتغال رہا :

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

چنانچہ آپ کی تصنیفات کی تعداد ۹۱ ہے، ان میں سے ۴۸ کا تعلق براہ راست حدیث

سے ہے اور بعض اور کتابیں بھی بالواسطہ اس فن سے متعلق ہیں، پھر آپ کی وہ تالیفات جو حجم اور ضخامت کے اعتبار سے دوسری تالیفات پر مقدم ہیں، یعنی: اوجز المسالک اور الابواب والتراجم، ان کا تعلق بھی حدیث ہی سے ہے، اور اس موضوع پر آپ کی تالیفات نے عرب وعجم کے علماء سے خراج تحسین حاصل کیا ہے، اس لئے آپ کا اصل اور محبوب موضوع حدیث کا فن تھا، اور آپ کی علمی خدمت کا بھی غالب حصہ اسی فن سے متعلق ہے۔

لیکن فقہ کا موضوع بھی آپ کے فیض رسا سے محروم نہیں ہے، چنانچہ ''فہرست تالیفات شیخ'' میں فقہ واُصولِ فقہ کے موضوع پر چھ کتابوں کا ذکر آیا ہے :

(۱) اختلاف الأئمۃ۔

(۲) جزء المناط۔

(۳) جزء اختلافات الصلاۃ۔

(۴) جزء رفع الیدین۔

(۵) داڑھی کا وجوب۔

(۶) شذرات: ہدایہ، نور الانوار۔ (فہرست تالیفات شیخ: ۳۸۴/۳)

ان میں سے 'جزء رفع الیدین' کو بھی اگر حدیثی تالیفات میں رکھا جائے، جیسا کہ مؤلف کتاب مولانا سید محمد شاہد سہارن پوری نے صلاۃ الاستسقاء، صلوٰۃ الخوف وغیرہ کے اجزاء کو رکھا ہے، تو غالباً زیادہ مناسب ہوگا، اس طرح ۵ کتابیں باقی رہ جاتی ہیں، جن میں سے میرے علم کے مطابق دو کتابیں '' اختلاف الأئمہ اور داڑھی کا وجوب '' زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں اور بقیہ تحریریں ابھی تشنۂ طبع ہیں، مگر متعدد تالیفات جن کو قرآن یا حدیث سے متعلق تالیفات میں رکھا گیا ہے، ان کا بھی گہرا تعلق فقہ سے ہے، افسوس کہ آپ کی بہت سی تالیفات اور حدیثی اجزاء ابھی تک طبع نہیں ہوسکے، اس لئے ان کا سرسری تعارف کرانا بھی دشوار ہے، اسی پس منظر میں فقہ کے مختلف شعبوں میں پہلے آپ کی تالیفات کا ذکر کیا جاتا ہے، پھر فقہی احکام سے متعلق آپ کے ذوق اور طریقۂ فکر پر روشنی ڈالی جائے گی۔

فقہ سے متعلق آپ کی تالیفات درج ذیل پہلوؤں پر ہیں: اُصولِ فقہ، فقہ القرآن، فقہ الحدیث، فقہی احکام۔

اُصولِ فقہ

اُصولِ فقہ کے موضوع پر آپ کی دو کتابوں کا ذکر ملتا ہے، اختلاف الائمہ، جزء المناط، اس کے علاوہ فن حدیث میں جن کتابوں کا ذکر ہے، ان میں ایک ''اُصولِ حدیث علی مذہب الحنفیہ'' بھی ہے، جیسا کہ معلوم ہے'' مناط'' کے معنی علت حکم کے ہیں، یہ اصطلاح شوافع اور مالکیہ کے یہاں زیادہ استعمال ہوتی ہے اور اجتہاد کے تین مراتب مقرر کئے جاتے ہیں، تنقیح مناط، تخریج مناط اور تحقیق مناط، مولانا کاندھلویؒ نے'' جزء المناط'' نامی رسالہ اسی موضوع پر لکھا ہے، جو پندرہ صفحات پر مشتمل ہے — حنفیہ اور علماء عراق کے نزدیک حدیث کے قبول ورد کے معیارات فقہاء حجاز سے کسی قدر مختلف ہیں؛ لیکن ان اُصولوں کو اس طرح واضح نہیں کیا گیا، جو ان کا حق تھا، بلکہ یہ اُصول زیادہ تر اُصولِ فقہ کی کتابوں کا حصہ بنے رہے، مولانا عبدالحی فرنگی محلی لکھنویؒ نے اسی پس منظر میں'' الرفع والتکمیل'' اور'' الأجوبۃ الفاضلۃ'' تالیف فرمائی، بظاہر اسی پس منظر میں آپ نے بھی'' اُصولِ حدیث علی مذہب الحنفیہ'' کے عنوان سے ایک مختصر رسالہ مرتب فرمایا ہے، مگر افسوس کہ یہ دونوں کتابیں طبع نہیں ہوئی ہیں۔

''اختلاف الأئمۃ'' نامی رسالہ طبع ہو چکا ہے، یہ آپ کے سلسلہ وار مضامین کا مجموعہ ہے، جو آپ کے بقول نامکمل ہے، ورنہ آپ کے ذہن میں اس موضوع پر چار، پانچ سو صفحات کی کتاب تھی؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ محفوظ ہو گیا ہے، وہ بھی بہت قیمتی اور نافع ہے، کیوں کہ اسباب اختلاف کے موضوع پر اُردو زبان میں کوئی قابل ذکر تحریر نہیں ملتی اور اسباب اختلاف کے مطالعہ سے ایک طرف علمی بصیرت اور ادلہ شرعیہ میں ترجیحات کے بارے میں علم بھی حاصل ہوتا ہے اور دوسری طرف سلف صالحین سے حسن ظن باقی رہتا ہے اور اختلاف رائے میں ان کے اخلاص اور جذبۂ حق طلبی کا ادراک ہوتا ہے، جو خاص کر اس عہد میں بہت ضروری ہے، کیوں کہ کچھ خدا ناترس اور حقیقت ناشناس لوگ اس اختلاف رائے کو سلف سے

بدگمانی بلکہ ان کے حق میں طعن وتشنیع کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔

یہ کتاب ۸۰صفحات پر مشتمل ہے، مصنف نے اس کتاب میں بنیادی طور پر اختلاف آراء کو تین حصوں پر تقسیم کیا ہے، اختلاف روایات، یعنی احادیث میں بظاہر اختلاف وتعارض پائے جانے کے اسباب، دوسرے اختلاف آثار، یعنی صحابہ وتابعین کے اقوال وافعال میں تعارض اور تیسرے اختلاف مذاہب، یعنی ائمہ مجتہدین میں اختلاف رائے کا سبب، احادیث میں اختلاف کے مصنف نے دس اسباب صفحہ۳ تا صفحہ۳۴ تک بیان کیا ہے، پہلا سبب: لوگوں کے احوال کا اختلاف، دوسرا سبب: کسی مخصوص شخص کے لئے آپ نے کوئی حکم دیا اور بعض حضرات نے اسے عام سمجھ لیا، تیسرے: آپ نے کوئی عام حکم دیا اور بعض حضرات نے اسے مخصوص سمجھ لیا، چوتھے: مختلف راویوں کا اپنے فہم کے مطابق آپ کے فرمودات ومعمولات کو نقل کرنا، پانچویں: بعض حضرات نے حضور کے عمل کو اتفاقی سمجھا اور بعض نے ارادی، چھٹے: حضور ﷺ کے ایک ہی عمل کی علت مختلف لوگوں نے الگ الگ سمجھی، ساتویں: یہ اختلاف کہ حضور کے ارشاد میں لغوی معنی مراد ہے، یا اصطلاحی معنی؟ آٹھویں: حکم نبوی کو کسی نے واجب سمجھا اور کسی نے مستحب، نویں: بعض احکام آپ نے غور وفکر اور تنبہ کے لئے دیئے؛ لیکن بعض حضرات نے اسے مستقل حکم سمجھ لیا، دسویں: امر نبوی کی نوعیت کے بارے میں اختلاف، مثلاً یہ کہ یہ حکم بطور تشریع کے ہے، یا بطور علاج کے اور ممانعت بطور حرمت کے ہے یا شفقت کے؟

اسی طرح آثارِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف کے مصنف نے آٹھ وجوہ ذکر کئے ہیں، جو صفحہ۳۴ تا ۵۸ پر پھیلے ہوئے ہیں، تیسری بحث یعنی فقہاء مجتہدین کے درمیان اختلاف پر گفتگو غالباً نامکمل ہے اور اس میں اختلاف کے دو بنیادی اسباب کا ذکر کیا گیا ہے، ایک حدیث کے قبول ورد کرنے میں اُصول ومعیارات کا اختلاف، دوسرے متعارض روایات کے درمیان ترجیح کے اُصول میں اختلاف۔

واقعہ ہے کہ یہ رسالہ مختصر اور نامکمل ہونے کے باوجود ایک گراں قدر علمی تحفہ اور اہل علم واصحابِ ذوق کے لئے چشم کشا ہے، یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ مصنف نے اس موضوع کی

پچھلی کتابوں خاص کر شاہ ولی اللہؒ کی تحریروں سے استفادہ نہیں کیا ہے اور یہ ساری باتیں مؤلف کی اپنی رشحات فکر ہیں؛ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں صرف قال نہیں ''اقول'' بھی ہے، اور بعض اسباب مصنف کے تتبع اور استقراء کا نتیجہ ہیں، نیز جن اسباب کا ذکر کیا گیا ہے، کثرت سے ان کے شواہد بھی ذکر کئے گئے ہیں، جس سے مضمون عام فہم بھی ہو گیا ہے اور ذہن اسے قبول بھی کرتا ہے، مصنف نے جہاں بعض ایسے غیر مقلدین کو پیش نظر رکھا ہے، جو سلف کے بارے میں بدگمانی سے کام لیتے ہیں، وہیں منکرین حدیث کو بھی سامنے رکھا ہے اور بہت سے اعتراضات وشبہات کا اُصولی جواب دے دیا ہے، واقعہ ہے کہ یہ اپنے موضوع پر ایک مفید اور نافع تحریر ہے اور اگر یہ کام پورا ہو گیا ہوتا تو شاید اس موضوع پر ایک بے نظیر کام ہوتا، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء**۔

فقہ القرآن

قرآن پر مولانا کی ایک تالیف ''تبویب احکام القرآن'' کا ذکر ملتا ہے، جس کا آپ نے خود اپنی ''آپ بیتی'' (۱۶۹/۲) میں ذکر کیا ہے، اس کتاب میں غالباً ''احکام القرآن للجصاص'' کی فقہی ابواب کی ترتیب پر فہرست سازی کا کام کیا گیا ہے؛ لیکن ابھی تشنۂ طبع ہے؛ اس لئے اس بارے میں کوئی وضاحت نہیں کی جاسکتی۔

فقہی احکام

فقہ کے موضوع پر آپ کی جن کتابوں کا ذکر ملتا ہے، ان میں ایک شذرات ہیں، یہ آپ کی درسی یادداشتیں ہیں، اس میں ہدایہ کے شذرات ۱۰ صفحات پر، نورالانوار کے ۱۰ صفحات پر اور چند صفحات درمختار اور حسامی پر ہیں اور ابھی یہ سب مخطوطہ کی صورت میں ہیں، جہاں تک اس حقیر کی رسائی نہیں ہو سکی۔

آپ کی فقہاء کے اختلافات پر گہری نظر تھی: چنانچہ آپ کی تحریروں میں عام طور پر اختلاف آراء کے استیعاب کی کوشش کی جاتی ہے، آپ نے ''جزء اختلافات الصلاۃ'' کے عنوان سے نماز کی چار رکعتوں میں فقہاء کے اختلاف کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی تعداد دو سو سے زیادہ ہے، یہ رسالہ ۳۲ صفحات پر ہے اور ابھی تک تشنۂ طبع ہے، کاش یہ طبع

ہو جاتا تو بڑا اہم کام ہوتا، مصنف نے اپنی بعض اور کتابوں میں بھی اس کا ذکر کیا ہے اور مؤلف کا مقصود اس طرف متوجہ کرنا ہے کہ رفع یدین، قرأت فاتحہ خلف الامام اور آمین بالجہر جیسے چند مسائل کو بہت اہمیت دے دینا مناسب نہیں، کہ اختلاف بہت سے مسائل میں ہے اور یہ اختلاف محمود ہے نہ کہ مذموم اور مخلصانہ ہے نہ کہ نفس پرستانہ اور مجادلانہ، اس کے علاوہ مصنف نے شروح حدیث میں مسائل فقہیہ پر جو کلام کیا ہے، اگر ان کو فقہی ابواب کی ترتیب سے جمع کر دیا جائے، تو یقیناً کئی جلدوں میں یہ ذخیرہ طبع ہو سکے گا اور ایک بہت ہی قیمتی چیز ہوگی۔

داڑھی رکھنا واجب ہے اور احادیث میں کثرت سے اس کی تاکید وارد ہوئی ہے، چنانچہ داڑھی اور اس کی مقدار سے متعلق آپ خاص طور پر لوگوں کو تنبیہ فرماتے تھے اور بیعت لیتے ہوئے بھی اس کا ذکر کرتے تھے، اس سلسلہ میں ''داڑھی کا وجوب'' کے نام سے آپ نے تیس صفحات کا ایک رسالہ تحریر فرمایا ہے، جس میں کتاب وسنت اور فقہاء کے ارشادات کی روشنی میں داڑھی کی اہمیت اور شرعی احکام پر روشنی ڈالی گئی ہے، یہ آپ کی بہت مقبول کتابوں میں سے ہے، اُردو کے علاوہ عربی، انگریزی، تامل اور ملائی زبان میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، سعودی عرب کے مشہور عالم شیخ بن بازؒ نے اس کو عالم عرب میں تقسیم کرائے اور جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ نے بھی اس کے سات ہزار نسخے خرید کئے، نیز تخریج وتعلیق کے ذریعہ متعدد اہل علم نے اس کتاب کی خدمت کی ہے۔

فقہ الحدیث

جیسا کہ شروع میں عرض کیا گیا، آپ کا اصل موضوع فن حدیث تھا، اور فن حدیث میں بھی آپ کی زیادہ توجہ احادیث احکام پر تھی؛ کیوں کہ ایک تو آپ مدرس تھے اور مدرسین کو زیادہ تر حدیث کے فنی پہلو سے سابقہ پیش آتا ہے، دوسرے: آپ نے حدیث کی جن کتابوں کی خدمت فرمائی، وہ بھی فقہی اُسلوب پر مرتب کی ہوئی کتابیں ہیں، ان میں پہلی کتاب 'سنن ابوداؤد' ہے، آپ کے محبوب استاذ مولانا خلیل احمد سہارن پوریؒ نے جس کی مبسوط شرح 'بذل المجہود' کے نام سے تالیف فرمائی، اس اہم اور جامع ترین شرح کی تالیف میں آپ شروع سے

آخر تک اپنے استاذ کے ساتھ شریک ومعاون رہے، پھراس کے بعد مؤطا امام مالک کی موجودہ شروح میں سب سے مفصل شرح ''اوجز المسالک'' مرتب فرمائی، جو پہلے تو ہندوستان میں فارسی رسم الخط میں چھ ضخیم جلدوں میں شائع ہوئی تھی، اور ابھی تک دستیاب ہے، پھر یہی شرح عالم عرب سے پندرہ جلدوں میں اشاعت پذیر ہوئی، اس کتاب نے علماء، اصحابِ ذوق، عرب، عجم، سلطان اور درویش سبھوں سے خراج تحسین حاصل کیا ہے اور مالکی علماء وفقہاء نے حیرت کا اظہار کیا کہ امام مالک کے نقطۂ نظر کو جس قدر منقح طریقہ پر اور شرح وبسط نیز مستند ومعتبر نقول کے ساتھ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، مالکیہ کے یہاں بھی اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔

اسی طرح 'لامع الداری' اور 'الکوکب الدری' جن کی ترتیب کا کام آپ کے والد ماجد مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ نے انجام دیا تھا، ان پر آپ کے حواشی نہایت اہم ہیں اور خاص کر کوکب کے حاشیہ میں کثرت سے کتب فقہیہ کی نقول ذکر کی گئی ہیں اور قول راجح کی نشاندہی کی گئی ہے، اسی طرح بخاری کے ابواب وتراجم پر آپ کی فاضلانہ تالیف اور اس موضوع کی سب سے مفصل تالیف ''**الابواب والتراجم لصحیح البخاری**'' بھی فقہ الحدیث کے سلسلہ میں ایک عظیم الشان خدمت ہے، مصنف نے تراجم بخاری کے پس منظر کو واضح کرنے کے لئے بعض ایسے فقہی اختلاف کی طرف متوجہ کیا ہے اور انھیں ڈھونڈ کر نکالا ہے کہ عام طور پر ان کا ذکر نہیں ملتا؛ بلکہ سچ پوچھئے تو مدرس کے لئے یہ کتاب ایجاز واختصار کے ساتھ ایک کافی وشافی تالیف ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فقہ الحدیث کے اعتبار سے اوجز المسالک ایک شاہکار کتاب اور ''ورق ورق روشن'' کے مصداق ہے، کتنے ہی مقامات پر تفصیلی بحثیں ہیں اور ہر موضوع پر تمام گوشوں کا احاطہ کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے، جیسے ''**نھی عن الصلاۃ بعد العصر**'' (اوجز المسالک:۲/۱۱۔۴۰، ط:ہند) کو دیکھا جائے، پہلے نکات اختلاف کی تنقیح ہے، پھر مکروہ اوقات کی تعداد اور ان نمازوں کے ممنوعہ اوقات میں سے ہر ایک پر تفصیل سے مختلف مذاہب اور ان مذاہب میں پائے جانے والے اقوال اور پھر ان میں سے راجح قول پر گفتگو کرتے ہوئے

دلائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور دلائل پر ردوقدح کے ذیل میں محدثانہ کلام کیا گیا ہے۔

اسی طرح صلاۃ کسوف کی بحث اور اس میں خواتین کے شریک ہونے اور نہ ہونے کے سلسلہ میں اہل علم کی آراء اور ان پر دلائل (اوجز المسالک:۳۰۲/۲)، جمع بین الصلاتین کے مسئلہ میں تفصیل کے ساتھ ائمہ مجتہدین کے مذاہب و دلائل اور اس مسئلہ میں صاحبین کے نقطۂ نظر کے بارے میں امام نووی کی غلط فہمی پر تنبیہ (اوجز:۵۰/۲) بہت اہم ہیں، —— اختلاف مطالع کی بحث رؤیت ہلال کے سلسلہ میں جو اہمیت رکھتی ہے وہ ظاہر ہے، اس پر بھی مصنف نے تفصیل سے گفتگو کی ہے، کثرت سے فقہاء کی عبارتیں پیش کی ہیں اور کہا ہے کہ اختلاف مطالع کے واقع ہونے میں کوئی اختلاف نہیں، اختلاف روزہ کے سلسلہ میں اس کے معتبر ہونے اور نہ ہونے میں ہے: **ليس المعنى أنهم لايقولون بإختلاف المطالع بل المعنى أنهم لم يعتبروا في باب الصوم** (۳/۷-۶) —— اسی طرح یوم عرفہ کے ذیل میں افضل الایام اور یوم عرفہ کو جمعہ آنے کی بابت احادیث بڑی خوبی سے جمع کی گئی ہیں، اور ان اُمور کی بابت تمام اقوال کو جمع کرنے کی سعی کی گئی ہے (۳/۷-۲۲۶) —— اسی طرح باب العقیقہ میں عقیقہ سے متعلق دس مباحث پر روشنی ڈالی گئی ہے اور قریب قریب عقیقہ سے متعلق تمام ہی ضروری احکام کا احاطہ کرلیا گیا ہے (دیکھئے: اوجز:۲۷۲/۴)، یہ تو بطور نمونۂ ومثال کے کچھ اشارات کئے گئے ہیں، ورنہ یہ کتاب ایسے کتنے ہی لعل و گہر سے معمور ہے۔

اسی طرح 'لامع الاراری' کے حاشیہ پر شرح کے ذیل میں احادیث احکام کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے اور اس سے تراجم بخاری کا مقصد ومنشاء متعین کرنے میں بھی فائدہ اُٹھایا گیا ہے، اس طرح کی مثالیں پوری کتاب میں پھیلی ہوئی ہیں، کسی خاص تجسس وجستجو کے بغیر اتفاق سے اس وقت میرے سامنے بخاری کا ایک ترجمہ ''**باب ذبيحة الأعراب**'' ہے، جس پر لامع کے مؤلف نے گفتگو نہیں کی ہے، آپ نے اس ترجمۃ الباب کی وجہ ''**نهى رسول الله صلى الله عليه وسلم عن معاقرة الأعراب**'' والی حدیث کو قرار دیا ہے، اس طرح کی بہت سی توجیہات 'الابواب والتراجم' اور 'لامع الدراری' کے حواشی میں ملتی ہیں، جو احادیث

احکام پر وسیع نظر، گہرے تدبر اور غور وفکر کے بغیر نہیں جانی جاسکتی ہیں، اس لئے واقعہ ہے کہ 'فقہ الحدیث' پر آپ کی نگاہ گہری بھی تھی اور وسیع بھی۔

فقہی مزاج و مذاق

مولانا کاندھلویؒ کے فقہی مزاج و مذاق اور طرز فکر کو چند نکات میں اس طرح ذکر کیا جاسکتا ہے۔

۱- آپ فتنۂ ونفس پرستی کے اس دور میں تقلید کو ایک بڑی ضرورت خیال کرتے تھے، یہ بات آپ کی مختلف تحریروں کے بین السطور سے واضح ہونے کے علاوہ — جہاں تک مجھے یاد ہے — '' شریعت وطریقت کے تلازم'' نامی تالیف میں صراحتاً بھی ذکر کی گئی ہے، افسوس کہ یہ کتاب اس وقت مجھے دستیاب نہیں۔

۲- خود آپ کا مزاج و مذاق یہ تھا کہ آپ پوری بصیرت کے ساتھ متصلب حنفی تھے اور پوری طرح حنفیت پر قائم تھے، یہ بات تو آپ کے یہاں ملتی ہے کہ جن مسائل میں مشائخ احناف کا اختلاف ہو، ان میں سے ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دی جائے؛ لیکن اس کی شاید ہی کوئی مثال مل سکے کہ آپ نے فقہ حنفی سے کسی اور فقہ کی طرف عدول کی راہ اختیار کی ہو اور چوں کہ آپ نے فقہ وفتاویٰ کی بجائے تدریس وتالیف کی راہ اختیار کی تھی؛ اس لئے آپ کو اس کی چنداں حاجت نہیں تھی؛ کیوں کہ ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول کی ضرورت فتاویٰ میں عام طور پر نئے مسائل کے حل اور اپنے عہد کی مشکلات کو دفع کرنے میں ارباب افتاء کو پیش آتی ہے۔

۳- فقہ حنفی کی تقلید کے ساتھ دوسرے ائمہ کا احترام، ان سے حسن ظن اور ان کی طرف سے حسن تاویل وتوجیہ کا بھی آپ کے یہاں بہت زیادہ لحاظ ہے؛ بلکہ اس سلسلہ میں آپ کا اُسلوب علماء کے لئے اسوہ کا درجہ رکھتا ہے۔

۴- بعض مصنفین کی کوشش ہوتی ہے کہ مخالف نقطۂ نظر کو بالکل ہی بے بنیاد اور بے دلیل ثابت کردیں، فقہی اختلافات میں آپ کا طریقہ اس سے مختلف ہے، آپ نہایت انصاف

کے ساتھ تمام اہل علم کی آراء کو پیش کرتے ہیں اور ان کے دلائل کو واضح فرماتے ہیں۔

۵- فقہی اختلافات فقہ کا ایک اہم فن ہے، کہا جاتا ہے کہ امام محمد نے اختلاف الفقہاء پر لکھنے کا آغاز کیا، پھر امام شافعی نے اس نہج کو اختیار کیا، پھر امام طبری اور امام طحاوی وغیرہ متعدد اہل علم نے اس فن کو آگے بڑھایا، آپ کو اس موضوع سے بڑا تعلق تھا اور آپ نے اوجز المسالک میں جس شرح وبسط کے ساتھ نیز نامانوس مسائل میں بھی کتابوں کی ورق گردانی کر کے تمام آراء کو نقل اور اکٹھا کرنے کا اہتمام کیا ہے، اس کی مثال کم ملتی ہے۔

۶- پھر آپ کا طریقہ یہ ہے کہ ہر دبستانِ فقہ کی رائے اسی مذہب کے مصنفین کی کتابوں سے نقل کرتے ہیں اور مذہب کے صحیح ومعتبر اقوال کو تلاش کرنے کی بھرپور سعی کرتے ہیں، یہ بڑی اہم بات ہے؛ کیوں کہ عام طور پر آسانی کے لئے لوگ ایک مذہب کے حاملین کی کتابوں سے دوسرے مذہب کے نقطۂ نظر کو نقل کر دیتے ہیں؛ حالاں کہ اس میں بھول چوک کا کافی امکان ہوتا ہے، فقہاء حجاز کی کتابوں میں امام ابوحنیفہؒ کی طرف ایسی رائیں منسوب کر دی گئی ہیں، جو محض غلط فہمی پر مبنی اور دوسروں کے لئے بدگمانی کا موجب ہیں، اسی طرح امام مالک کی طرف دوسرے مکاتب فقہ کی کتابوں میں بعض ایسی آراء منسوب ہوگئی ہیں، جو ہرگز امام جلیل کے شایان شان نہیں، اس لئے اہل علم کا طریقہ یہی ہونا چاہئے کہ کسی بھی فقہ کے نقطۂ نظر کو ان کی اصل کتابوں سے نقل کیا جائے۔

۷- حدیث کی متداول کتابیں ان علماء کی مرتب کی ہوئی ہیں، جن کا تعلق حجاز کی درسگاہ سے تھا، عراق کی درسگاہِ علم وفن کی زیادہ توجہ معانی حدیث اور اخذ واستنباط پر تھی، اس لئے کتب حدیث کی تالیف پر ان کی توجہ کم ہوئی، مولانا کاندھلوی نے اپنی شروح حدیث میں اس بات کا خاص اہتمام کیا ہے کہ احادیث وآثار میں سے حنفیہ کے زیادہ سے زیادہ مؤیدات کو جمع کر دیں، اس طرح آپ کی شروحِ حدیث حنفی مستدلات کا گویا ایک موسوعہ بن گئی ہے۔

کلمۂ آخریں

ضرورت ہے کہ آپ کی فقہی تحقیقات ومباحث (جو مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی ہیں)

کی پہلے مرحلہ میں فہرست سازی کی جائے، اور پھر انھیں یکجا اور مرتب کیا جائے؛ تاکہ لوگوں کو استفادہ میں سہولت ہو، اور مدرسین کی طرح فقہی موضوعات پر کام کرنے والے اہل علم نیز ارباب افتاء بھی آپ کے فیوض سے مستفید ہوسکیں — اللہ تعالیٰ آپ کی وسیع علمی خدمات کو قبول فرمائے اور بہتر سے بہتر اجر سے سرفراز فرمائے۔

❁ ❁ ❁

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

نگہ بلند ، سخن دلنواز ، جاں پرسوز
یہی ہے رخت سفر میر کارواں کے لئے

یہ غالباً ۱۹۷۲ء کی بات ہے، جب میں جامعہ رحمانی مونگیر میں شرح وقایہ وغیرہ پڑھتا تھا، اس وقت مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی —— رحمہم اللہ —— کی تحریروں سے مجھے عشق سا تھا، مولانا آزاد کے یہاں شکوہ الفاظ تھا، مولانا دریا آبادی کے قلم کے تیکھے پن اور چبھتے ہوئے طنز پر سر دھننے کو جی چاہتا تھا، مولانا مودودی کے یہاں سلاست اور استدلالی اُسلوب متاثر کرتا تھا اور مولانا ندوی کے یہاں خوبصورت الفاظ اور بربط دل کو چھیڑنے والا قلم ملتا تھا، ان میں صرف مولانا آزاد ہی تھے، جو مرحوم ہو چکے تھے؛ اس بقیہ ان بزرگوں کی تازہ نگارشات کا ایک انتظار سا رہتا تھا۔

ان ہی دنوں اطلاع ملی کہ مولانا علی میاں صاحبؒ اور مولانا محمد منظور نعمانیؒ تشریف لا رہے ہیں، مولانا نعمانیؒ کی شخصیت بھی ہم لوگوں کے لئے کچھ کم پُرکشش نہ تھی اور ''الفرقان'' کی وجہ سے مولانا سے بھی ایک خاص اُنس تھا، مولانا کے مناظروں کے قصوں کو خاص طور پر ہم ایک دوسرے کو سناتے اور مولانا کی حاضر جوابی کے سنے سنائے قصے نقل کرتے تھے، اس لئے یہ خبر ایک مژدۂ جاں فزا سے کم نہ تھی، آخر ایک دن جمال پور (مونگیر سے قریب کا ریلوے اسٹیشن) سے ایک کار آئی اور خانقاہ رحمانی میں آکر رُکی، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ عام طور پر کسی کے استقبال کے لئے باہر نہیں نکلتے تھے؛ لیکن آج مولانا نے خود آگے بڑھ کر آنے والے مہمان کا خیر مقدم کیا، مولانا نعمانیؒ اپنی علالت کی وجہ سے نہیں آسکے؛ لیکن مولانا علی میاں صاحبؒ تشریف لائے، متوسط قد و قامت، فراخ جبیں، کھلا ہوا رنگ، سفید ریش، جس میں اس وقت

چندسیاہ بال بھی تھے، لبوں پر تبسم کھیلتا ہوا اور چہرہ سے معصومیت نمایاں، سفید کرتا، چوڑا پائجامہ، بادامی رنگ کی اوسط درجہ کے کپڑے کی شیروانی اور اسی کپڑے کی کشتی نما چوڑی پٹی والی ٹوپی، یہ تھا اُس وقت مولانا کا سراپا، نہ عبا، نہ قبا، نہ جبہ و دستار، نہ خدم وحشم، ہر ہر ادا سے سادگی نمایاں، مولانا کا یہ حلیہ اس وقت ہم جیسے طلبہ کے لئے خلاف توقع تھا کہ مشائخ اور میکشانِ معرفت کا مانوس و مروج شکوہ وجلال بھی نہ تھا اور نہ وضع قطع پر اس جدیدیت کی کوئی چھاپ تھی، جس کا آپ کی تحریروں سے گمان ہوتا تھا۔

یہ مولانا کی پہلی زیارت تھی، مونگیر میں مولانا کی تشریف آوری کی مناسبت سے متعدد پروگرام ہوتے رہے، ٹاؤن ہال میں عوامی جلسہ ہوا، یہ وسیع ہال اور اسکا گرد و پیش باذوق سامعین سے بھرا پڑا تھا اور غیر مسلم بھی اچھی خاصی تعداد میں تھے، اس نسبت سے پیام انسانیت تحریک پر مبنی خطاب ہوا، خانقاہ کی لائبریری کے وسیع اور خوبصورت ہال میں علماء، خواص اور شہر کے دانش وروں کا نمائندہ اجتماع منعقد ہوا، جامعہ رحمانی کے دارالحدیث کے ہال میں اساتذہ وطلبہ سے مولانا کا وہ اہم ترین خطاب ہوا، جو مولانا کے طلبہ سے خطابات کا مجموعہ ''پاجا سراغِ زندگی'' میں شامل ہے، اس موقع سے طلبہ کی طرف سے راقم الحروف ہی نے سپاس نامہ لکھا اور مولانا کی خدمت میں پیش کیا۔

اساتذہ اور منتہی جماعتوں کے طلبہ کی ایک خصوصی نشست مولانا سے تبادلۂ خیال کی غرض سے رکھی گئی، اس مجلس میں، میں بھی شریک تھا اور کوشش کر کے میں نے ٹھیک مولانا کے سامنے نشست حاصل کی تھی، اس وقت کسی مصنف سے ملنے، قریب سے دیکھنے اور بات کرنے کو ہم لوگ بہت بڑا اعزاز سمجھتے تھے اور مولانا تو سرخیلِ اہلِ قلم تھے، اس لئے میں نگاہ جمائے بڑے غور سے مولانا کی ایک ایک ادا اور چہرے پر نمایاں ہونے والے نقوش کو دیکھتا اور غور کے کانوں ایک ایک حرف سنتا۔

مولانا کے خطاب کا انداز سیدھا سادہ تھا؛ البتہ مرادفات کی کثرت تھی، تبادلۂ خیال کی

مجلس میں بھی مولانا نے مختصر گفتگو فرمائی، اپنے بعض تجربات پر بھی روشنی ڈالی، اس وقت مسلم پرسنل لاء کا مسئلہ پورے ملک میں زیر بحث تھا، حاضرین نے متعدد سوالات اسی سلسلہ میں کئے اور مولانا نے جوابات دیئے، امیر شریعت مولانا منت اللہ صاحبؒ نے بھی ان سوالات کا جواب دینے میں مولانا کا تعاون کیا۔

یہ مولانا سے پہلی ملاقات تھی، جس نے قلب وذہن پر گہرے نقوش چھوڑے، ۱۹۷۵-۱۹۷۶ء میں راقم الحروف دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث کا طالب علم تھا، ندوہ کا پچاسی سالہ جشن نہایت کامیابی اور نیک نامی کے ساتھ منعقد ہو چکا تھا، اس زمانے میں دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ میں پورے ملک کا دل ودماغ جمع تھا اور شاید اس عہد کا کوئی ممتاز صاحب علم ہو جو اس مجلس میں نہ ہو، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ، مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ، مولانا محمد منظور نعمانیؒ، مولانا فضل اللہ حیدرآبادیؒ (مؤلف ''فضل اللہ الصمد'') مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ، مولانا حامد انصاری غازی، حکیم زماں حسینی (کلکتہ) اور نہ جانے کتنے ہی اصحاب علم وفن اور ارباب لوح وقلم تھے جن سے شوریٰ کا اجلاس آراستہ ہوتا تھا، ان شخصیتوں میں علمی اعتبار سے نمایاں حیثیت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی تھی، دارالعلوم کا مہمان خانہ اس زمانہ میں کچھ زیادہ بڑا نہیں تھا؛ لیکن ارکان شوریٰ کا علمی قد وقامت اتنا دراز اور بلند تھا کہ اس کا ایک خاص وقار قائم تھا، مسائل وفور عقیدت سے حل نہیں کئے جاتے تھے؛ بلکہ ایک ایک مسئلہ پر خاصی رد وقدح اور آزادانہ بحث ہوتی تھی اور تہذیب وشائستگی کے دائرہ میں رہتے ہوئے نوک جھوک کی بھی نوبت آجاتی تھی۔

اس سال جب شوریٰ کا اجلاس ہوا تو مولانا ندویؒ بھی تشریف لائے، عصر سے مغرب تک کا وقفہ ایسا ہوتا تھا، جس میں تمام مہمان، مہمان خانہ کے کھلے صحن میں کرسیوں پر بیٹھ جاتے تھے، ہر مہمان کے ارد گرد کچھ اساتذہ وطلبہ کا حلقہ بن جاتا اور ان سے استفادہ کیا جاتا، ان حضرات میں مولانا اکبرآبادیؒ کسی قدر زیادہ؛ بلکہ بے تکان بولتے، اس میں علمی گفتگو بھی ہوتی

اور بذلہ سنجی بھی، مولانا منت اللہ صاحبؒ اور مفتی عتیق صاحبؒ کا رُعب نمایاں ہوتا اور طلبہ عام طور سے اپنے مسائل ان ہی کے سامنے پیش کرتے، مولانا ندویؒ کم بولتے، ایک ایک ادا سے تواضع وانکساری اور عجز وفروتنی نمایاں ہوتی، طلبہ سے گفتگو میں دعوتی اور تذکیری رنگ غالب رہتا اور طلبہ بھی ایک باوقار محقق کی نظر سے آپ کو دیکھتے اور بڑے ادب واحترام کے ساتھ پیش آتے۔

دیوبند سے فراغت کے بعد قضاء کی تربیت کے سلسلہ میں ایک سال امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ میں رہنے کا اتفاق ہوا، اسی زمانہ میں امارت شرعیہ کے زیر اہتمام جامعہ رحمانی مونگیر میں ایک عظیم الشان ''مدارس اسلامیہ کنونشن'' منعقد ہوا، جس میں پورے ملک سے مختلف مکاتبِ فکر اور معروف دینی درس گاہوں کے نمائندے اور ذمہ داران شریک تھے، کنونشن کے پہلے دن مغرب بعد کی نشست نصاب تعلیم پر اظہار خیال کے لئے مخصوص تھی، اس اجلاس سے ڈاکٹر فضل الرحمٰن گنوری (مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) سید حامد حسین صاحبؒ (جنرل سکریٹری جماعت اسلامی ہند) اور حضرت مولانا علی میاںؒ کا خطاب تھا، یہ تینوں ہی تقریریں نہایت مدلل، بھرپور اور ولولہ انگیز تھیں، بالخصوص مولانا کا خطاب جو آخری خطاب تھا، دینی مدارس کے مقاصد، نصابِ تعلیم کی تاریخ، ملا نظام الدین کے نصاب میں عہد بہ عہد ہونے والی تبدیلیوں اور عصر حاضر کی ضرورتوں کے لحاظ سے نصابی تقاضوں پر نہایت ہی پُرمغز اور بصیرت افروز تقریر تھی، شاید ہی سامعین میں کوئی شخص ہو جو متاثر نہ ہوا ہو، اس سے پہلے مولانا کے جو خطبات سنے تھے وہ سادہ انداز کے تھے؛ لیکن آج کا خطاب پر جوش، مربوط، مدلل اور سلیس تھا، جو غور وفکر کے لئے صحیح نہج فراہم کرتا تھا۔

حیدرآباد آنے کے بعد میں نے پہلی بار مولاناؒ کو ایک تفصیلی مکتوب ''نصابِ تعلیم'' کے بارے میں لکھا، مولانا نے اس مکتوب سے اتفاق کرتے ہوئے تحسین فرمائی اور تحریر فرمایا کہ اگر موقع ہو تو ندوہ یا رائے بریلی آؤ، اخراجات سفر میرے ذمہ ہوں گے، تاہم میں اس وقت نہیں جاسکا؛ البتہ خطوط وقتاً فوقتاً لکھتا رہا، ایک بار میں تبلیغی جماعت کے ساتھ سہ روزہ میں گیا تھا،

جہاں بعض رفقاء کو غلو میں مبتلا دیکھا، اس سے طبیعت کو گرانی ہوئی کہ ایک ایسی جماعت جس کو اصحابِ حق نے قائم کیا ہے اور علماءِ حق کے زیرنگرانی اس کا کام چل رہا ہے، اس کے افراد ایسی بےاعتدالیوں کا شکار ہوجائیں تو اس سے مستقبل میں بڑے نقصان کا اندیشہ ہے، ان ہی دنوں مولانا کو خط لکھ رہا تھا تو میں نے اصلاح واطلاع حال کی نیت سے نمبر وار جماعت کی بابت چار باتیں جو میری نگاہ میں قابل اصلاح تھیں، لکھیں اور مولانا سے خواہش کی کہ چوں کہ اس جماعت سے عام مسلمانوں کو بہت نفع پہنچ رہا ہے، اس لئے عام لوگوں سے تو اس طرح کچھ کہنا مناسب نہیں؛ لیکن آپ سے چوں کہ جماعت کے اکابر بھی تعلق رکھتے ہیں؛ اس لئے مناسب ہوگا کہ حکمت کے ساتھ ان کو توجہ دلا دیں، چند ہی دنوں میں مولانا کا جواب آ گیا، مولانا نے ان اُمور سے اتفاق کیا اور تحریر فرمایا کہ انشاء اللہ مرکز کے ذمہ داروں کو توجہ دلاؤں گا، یہ بھی لکھا کہ جس ترتیب اور تجزیہ کے ساتھ آپ نے ان کوتاہیوں کا ذکر کیا ہے اور نصح ومحبت کی زبان استعمال کی ہے، وہ بہت خوب ہے؛ البتہ جماعت میں لوگ فقہ کے اس جزئیہ پر عمل کرتے ہیں کہ ''خارج صلاۃ کا لقمہ معتبر نہیں''۔

''جدید فقہی مسائل'' کا پہلا ایڈیشن طبع ہوا تو سب سے پہلے میں نے مولانا کی خدمت میں اس کا ایک نسخہ ارسال کیا، مولانا نے فوراً جواب سے سرفراز کیا اور حوصلہ افزائی کے کلمات تحریر فرمائے، مراسلت اور خطوط کے جواب میں حضرت والا کے مشفقانہ گرامی ناموں نے ملاقات کا اشتیاق اور بڑھا دیا، آخر ایک بار عزیز گرامی مولانا حسنین احمد ندوی (مقیم ابوظبی) اور ایک اور صاحب کے ساتھ رائے بریلی حاضری ہوئی، ہم لکھنؤ پہنچے، وہاں سے رائے بریلی کی بس پکڑی، رائے بریلی اُترے تو دوپہر کا وقت ہو چکا تھا، جی چاہا کہ کھانا کھالیں، پھر آگے بڑھیں؛ لیکن مولانا سے جلد سے جلد ملاقات کی خواہش تاخیر کی روادار نہ تھی؛ اس لئے فوراً ہی رکشہ لیا اور ''تکیہ'' کی طرف چل پڑے، خیال تھا کہ وہیں کسی ہوٹل میں کچھ کھالیں گے؛ چنانچہ ظہر سے کچھ پہلے ہم لوگ ''تکیہ'' یعنی مولانا کی خانقاہ پہنچے۔

مولانا کی شخصیت کی نسبت سے گمان تھا کہ یہ کوئی خوبصورت جگہ ہوگی، پُرشکوہ عمارتیں ہوں گی، دربار ہوگا، دربان ہوں گے، حاضری کے آداب ہوں گے؛ لیکن یہاں تو معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا، چھوٹا سا گاؤں، اکثر مکانات خس پوش، ندی کے کنارے ایک مسجد، جو اوسط درجہ کی تعمیر کا نمونہ ہے، ایسی تعمیر نہیں کہ چلنے والوں کو ایک لمحہ رک کر دید کی دعوت دے، یہیں پر مردانی مہمان خانہ ہے، جس میں چند کمرے ہوں گے، یہ بھی عام سیدھی سادی مسقّف عمارت ہے، دوسری طرف زنان خانہ کا حصہ ہے، اب کیا حال ہے نہیں کہہ سکتا، اس وقت یہ بھی ایک پرانی اور ظاہری کشش سے محروم عمارت تھی ، بس یہی اس بندۂ خدا کی خانقاہ اور عبادت گاہ، تھی جس کی علمی عظمت اور علوِّ مرتبت کی گونج مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک سنی جاتی تھی اور قصور و محلات کی پروردہ نازنینوں کی جبین احترام بھی جس کی قدم بوسی کے لئے بے تاب رہتی تھیں۔

جب ہم لوگ پہنچے تو لوگ کھانے سے فارغ ہوکر ہاتھ دھو رہے تھے، ہمیں بھی دعوت دی گئی؛ حالاں کہ ہم لوگ بھوکے تھے؛ لیکن ہم نے تکلف سے کام لیا، مگر یہ تکلف بڑا صبر آزما ثابت ہوا؛ کیوں کہ جب نماز سے فارغ ہونے کے بعد لوگ اپنے اپنے بستر پر گئے اور ہم لوگ ہوٹل کی تلاش میں نکلے تو بڑی مایوسی ہوئی، کھانے کے ہوٹل تو کجا؟ یہاں تو معمولی سا چائے خانہ بھی نہیں، آخر ایک چھوٹی سی دکان ملی، جس کی پوری کائنات لکڑی کے ایک ڈبہ میں سمائی ہوئی تھی، ہم لوگوں نے پوچھا کہ کیا کچھ کھانے کی چیز ہے؟ پہلے تو اس نے نفی میں جواب دیا؛ لیکن پھر ہماری کیفیت دیکھ کر اس نے کچھ سوچا اور تلاش کر کے بسکٹ کا ایک ڈبہ نکالا، یہ چائے میں کھانے کے بسکٹ تھے، جو لکڑی کی طرح سخت ہوگئے تھے اور پرانے ہونے کے وجہ سے اس پر سفیدی سی جم گئی تھی، مرتا کیا نہ کرتا، ہم لوگوں نے یہی بسکٹ لیا اور ندی کے کنارے کبھی پانی میں بھگوکر اور کبھی یوں ہی کھا کر کسی طرح ان سے بھوک کا مداوا کیا۔

عصر کی نماز ادا کی، عصر کے بعد مولانا کی مجلس ہوتی اور واردین سے ملاقات فرماتے؛ چنانچہ ہم لوگ بھی حاضر مجلس ہوئے، مولانا کھلی چارپائی پر بیٹھے ہوئے تھے، صرف ایک تکیہ لگا

ہوا تھا، مولانا کو اپنا نام بتایا تو پہچان نہ سکے، مولانا کا ذہن خانقاہ رحمانی مونگیر کے مولانا سیف اللہ مرحوم کی طرف گیا، میں نے ''جدید فقہی مسائل'' کا حوالہ دیا تو چونکے اور ایک سے زیادہ بار دریافت کیا کہ کیا وہ کتاب آپ ہی کی ہے؟ میں نے اثبات میں جواب دیا تو بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ میں نے سمجھا تھا کہ آپ میرے ہم عمر یا قریب العمر ہوں گے، ایک دوبار اسی فقرہ کو دہرایا، پھر مختلف موضوعات پر گفتگو فرماتے رہے اور متوجہ رہے، مغرب کے بعد بھی تھوڑی دیر مولانا کے قریب بیٹھنے کی سعادت حاصل ہوئی، مولانا شفقت فرماتے رہے، چند سوالات بھی کئے، ان میں ایک سوال اب بھی ذہن میں ہے، دریافت فرمایا کہ علماء ہند کے فتاویٰ میں کن کے فتاویٰ آپ کو زیادہ پسند ہیں؟ میں نے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے فتاویٰ کا ذکر کیا، مولانا نے اس کی وجہ پوچھی، میں نے عرض کیا: ایک تو اُسلوب تحریر کی سلاست اور عبارت کا آسان ہونا، دوسرے: اپنے عہد کے تقاضوں کی رعایت، تیسرے: رائے قائم کرتے ہوئے محض جزئیات پر اکتفاء کرنے کی بجائے اُصول شرع پر نظر رکھنا، مولانا نے میری بات سے اتفاق فرمایا، اور ذکر کیا کہ مولانا الیاس صاحبؒ کے پاس جب کوئی شخص دیہات میں نماز جمعہ کے بارے میں استفتاء کرنے آتا تو آپ اسے مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے پاس بھیجتے اور فرماتے کہ دیوبند اور سہارنپور جانے کی ضرورت نہیں، یہ مسئلہ یہیں پوچھ لو؛ کیوں کہ آپ کو معلوم تھا کہ مفتی کفایت اللہ صاحب اس مسئلہ میں متوسع ہیں اور ''مصر'' کی تعریف میں وسعت برتتے ہیں، پھر مولانا نے فتاویٰ رحیمیہ کے بارے میں دریافت فرمایا، میں نے عرض کیا کہ تفصیلی اور تحقیقی فتاویٰ ہیں؛ لیکن یہ تفصیل وتحقیق زیادہ تر ان مسائل کے بارے میں ہے، جو احناف اور غیر مقلدین اور دیوبندیوں اور بریلویوں کے درمیان اختلافی ہیں، عصر نو کے جو مسائل ہیں، ان کے جوابات عام طور پر مختصر ہیں۔

مولانا سے یہ ملاقات علمی اور تربیتی اعتبار سے بڑی نافع اور مفید رہی، اسلامی تحریکات پر بھی گفتگو ہوئی، عالم اسلام کی اہم شخصیات کے بارے میں مولانا سے بہت کچھ سننے کو ملا، دینی

مدارس کے نصابِ تعلیم کے بارے میں بھی مولانا کے نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع میسر آیا، میں نے مولانا سے درخواست کی کہ جیسے ندوہ نے عربی ادب وانشاء کا بہتر نصاب مرتب کیا ہے اورفقہ پر بھی ''الفقه الميسر'' کے نام سے ایک اچھی کتاب مرتب ہوگئی ہے، اسی طرح علم کلام پر بھی ایک اچھی نصابی کتاب کی ضرورت ہے، جس میں اہل سنت والجماعت کے تینوں دبستانِ فکر اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کا نقطۂ نظر وضاحت سے مذکور ہو اور وہ آج کے دور میں اُٹھنے والے مخالف اسلام فتنوں کے رد پر بھی مشتمل ہو، مولانا نے بہت توجہ سے ان گذارشات کو سنا اور فرمایا کہ یہ نہایت اہم بات ہے، جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے اور میں نے یہ کام ندوہ کے ایک کہنہ مشق استاذ کے حوالے کر رکھا ہے، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ استاذ مولانا ابوالعرفان ندویؒ (سابق نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) تھے، ان کا علم واقعی مستحضر اور ہمہ جہت تھا اور اگر وہ اس موضوع پر قلم اُٹھاتے تو شاید اس کا حق ادا کرتے؛ مگر افسوس کہ یہ کام ہو نہیں پایا۔

رائے بریلی کے قیام میں مولاناؒ کے معمولات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا، فجر کے لئے مولانا ندویؒ اور حاضرین شب کے آخری پہر بیدار ہو جاتے اور وضو کرتے، تمام لوگ تہجد ادا کرتے، قرآن مجید کی تلاوت کرتے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق جہراً اور سراً ذکر کرتے، اس وقت پوری خانقاہ کلمہ طیبہ اور اللہ کے ذکر سے گونج اُٹھتی، پھر اول وقت میں نماز فجر ادا کی جاتی، نماز فجر کے ساتھ ہی تقریباً سبھی لوگ سو جاتے اور ایسا لگتا کہ گویا رات کا منظر ہے، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ آرام کرنے کے بعد لوگ بیدار ہوتے، تلاوت کرتے، نماز چاشت ادا کرتے اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق مطالعہ یا ذکر میں مصروف ہو جاتے، اہل ذوق کے لئے ایک چھوٹا موٹا کتب خانہ بھی موجود ہے، جس سے لوگ حسب توفیق استفادہ کرتے ہیں، صبح دس بجے سے بارہ بجے تک معمول تصنیف وتالیف یا اپنے مسودات پر نظر ثانی کا تھا، میں نے دیکھا کہ مولانا ایک چارپائی پر لیٹ گئے، سرہانے کی کرسی پر کچھ کتابیں تھیں، بازو میں ایک نوجوان قلم کاغذ لے کر بیٹھ گئے، مولانا لیٹے لیٹے املاء کراتے اور یہ نوجوان لکھتے جاتے، مولانا اس

وقت کی اتنی حفاظت فرماتے کہ کوئی بڑے سے بڑا شخص آجائے؛ لیکن مولانا اپنے اس معمول میں کوئی خلل واقع نہ ہونے دیتے، مجھے یاد ہے کہ میں جن دنوں مولانا کے یہاں مقیم تھا، اسی درمیان ایک دن ارون نہرو آئے، کانگریس پارٹی میں اس وقت ان کا ستارۂ تقدیر بام عروج پر تھا، انھوں نے اندرا گاندھی کے لئے وقت دینے کی خواہش کی، جو اسی علاقہ کے انتخابی دورہ پر آئی ہوئی تھیں، مولانا نے ملاقات سے معذرت کردی اور ملاقات نہ ہوسکی۔

تصنیف و تالیف کے کام سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر کا کھانا ہوتا، کھانے کے بعد نماز ظہر اور نماز کے بعد وقفہ آرام، پھر عصر بعد لوگوں سے ملاقات، مغرب بعد خطوط کے جوابات، مہمانوں کے ساتھ گفتگو اور متفرق کام، نماز عشاء کے بعد استراحت، میں نے چند دنوں کے قیام میں یہی معمول دیکھا اور غالباً رمضان المبارک کے علاوہ اخیر عمر میں روز کے معمولات اسی طرح تھے۔

اس چندروزہ قیام میں بہت سی باتوں نے قلب پر گہرے نقوش چھوڑے، سب سے بڑھ کر مولانا کا استغناء اور متاعِ دنیا سے بے نیازی، یہ وہ زمانہ تھا کہ مولانا کی شہرت دنیا کے کونہ کونہ تک پہنچ چکی تھی، ایک طرف مصر وحجاز اور نجد وشام کی باوقار تحقیقی اکیڈمیاں اور تعلیمی ادارے آپ کی سربراہی کو اپنے لئے وجہ اعزاز سمجھتی تھیں، تو دوسری طرف امریکہ کا اسلامی سنٹر آپ کی سربراہی کو اپنے لئے تمغہ افتخار تصور کرتا تھا، خود ہندوستان میں جہاں دینی درسگاہیں اور اسلامی تحریکیں اپنے کسی اجتماع یا مشاورت میں مولانا کی تشریف آوری کو اپنی کامیابی تصور کرتی تھیں، وہیں عصری درس گاہیں اور یونیورسٹیاں بھی آپ کے سامنے جبین احترام خم کرنے کو اپنے لئے سرمایہ وقار سمجھتی تھیں، آپ کے آستانہ پر شاہان مملکت بھی آئے اور رؤساء زمانہ نے بھی جبین سائی کی؛ لیکن آپ کی فقرودرویشی اور دنیا سے ترک تعلق کا حال یہ تھا کہ ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، اس میں معمولی سا مکان، رہن سہن بھی معمولی، سونے کے لئے معمولی سی چار پائی، مہمانوں کے لئے عام قسم کا بستر، واردین کا کھانا گھر میں ہی بنتا اور خواتینِ خانہ کھانا پکاتیں، میں نے دستر خوان پر دیکھا کہ کئی پلیٹیں ہیں اور ہر پلیٹ ایک دوسرے سے جداگانہ، کوئی چینی

کی، کوئی اسٹیل کی، کوئی تام چینی کی اور کوئی المونیم کی، کوئی بڑی اور کوئی چھوٹی، کوئی پھول دار اور کوئی سادہ، اس سے دستر خوان کی سادگی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

مولانا کے استغناء کا پہلو یہ بھی ہے کہ اصحابِ زر کے سامنے کبھی نہ بچھتے؛ بلکہ اہل دین اور اہل علم کی قدردانی فرماتے، میں نے اپنے زمانۂ قیام میں دیکھا کہ ہمیشہ دائیں جانب مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحبؒ کو اور بائیں جانب اس حقیر طالب علم کو دستر خوان پر بٹھایا، یہ استغناء مولانا کے سوا میری ان گنہگار آنکھوں نے کہیں اور نہ دیکھا...... اسی طرح اپنے وقت کی حفاظت اور معمولات کی پابندی کا جو اہتمام مولانا کے یہاں دیکھا، سوائے مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے کہیں اور نظر نہ آیا، مولانا کے یہاں زبان کی حفاظت کا بھی بڑا اہتمام تھا، کم بولتے، جب بولتے تو کلمہ خیر کہتے، شکوہ و شکایت طنز و تعریض اور تمسخر و استہزاء وغیرہ کا آپ کے یہاں کوئی گذر نہ تھا، ذکر اور درود شریف کی کثرت فرماتے، جتنی دیر خاموش رہتے ہونٹوں میں حرکت رہتی اور ذکر کرتے رہتے۔

مولانا کا ایک نمایاں وصف اعتدال و میانہ وری، زبان و قلم میں احتیاط اور تنقید میں نصح و خیر خواہی تھا؛ اسی لئے برصغیر اور عالم اسلام میں اُٹھنے والی تمام اہم تحریکات سے مولانا کا تعلق تھا اور ہر دبستانِ فکر اور گروہ کے لوگ آپ کو محبت اور وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے، آپ نے تحریک پیامِ انسانیت کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنا اور اس قربت کو دعوت دین کے لئے استعمال کرنا تھا، یہ نہایت اہم تحریک تھی، جس کے لئے آپ نے بہت سے اسفار کئے، افسوس کہ اس تحریک کو علماء اور قائدین کا وہ تعاون حاصل نہیں ہوسکا جو اس کا حق تھا، آپ مجلس مشاورت کے بانیوں میں تھے اور جب فرقہ وارانہ منافرت اپنے شباب پر تھی اس وقت آپ نے اس تحریک کو پروان چڑھانے میں سرگرم کردار ادا کیا؛ مگر افسوس کہ مسلم تنظیموں کی باہمی چپقلش کے نتیجے میں جلد ہی اس کا شیرازہ بکھر گیا، اب بھی یہ مجلس تقسیم کے ساتھ قائم ہے؛ لیکن اس کی مثال ایسے سوکھے ہوئے درخت کی ہے، جو

زندگی سے عاری اور پھل دینے سے بانجھ ہو چکا ہے، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے آپ مؤسسین میں تھے، پھر حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی وفات کے بعد باتفاق رائے آپ کو صدر منتخب کیا گیا، طویل عرصہ تک آپ کی قیادت میں بورڈ نے اپنے سفر طے کیا اور شاہ بانو کیس اور بابری مسجد کی شہادت جیسے واقعات سے نمٹنے کی کوششیں آپ ہی کے زیر قیادت ہوئیں۔

مذہبی تنظیموں میں آپ ابتداء مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے؛ بلکہ آپ اس کے بانیان میں تھے؛ لیکن فکری ہم آہنگی نہ پائے جانے کی وجہ سے آپ خاموشی کے ساتھ دبے پاؤں جماعت سے علاحدہ بھی ہوئے؛ لیکن جماعت کی مخالفت میں کوئی مہم نہیں چلائی؛ البتہ اخیر دور میں مولانا مودودی کے رد میں ایک اہم کتاب تالیف کی، جو سنجیدگی، متانت، جذبۂ نصح وخیر خواہی اور زبان و بیان میں انصاف واحتیاط کی بہترین مثال ہے اور اپنے موضوع پر چشم کشا ہے، پھر آپ کا تعلق مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک دعوت وتبلیغ سے قائم ہوا اور مولانا کی زندگی میں آپ نے پوری سرگرمی کے ساتھ اس کام میں شرکت فرمائی اور دارالعلوم ندوۃ العلماء اس تحریک کو فروغ دینے کی کامیاب کوشش کی؛ چنانچہ آج بھی ندوہ میں یہ ایک مقبول دینی تحریک ہے، مولانا کی مختلف مجلسوں اور بعض تحریروں سے جو بات اخذ ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ سب سے زیادہ تحریک الاخوان المسلمون سے متاثر تھے اور حسن البنا شہید کے بڑے ثنا خواں اور ان کی اصابت فکر سے متاثر تھے، مولانا کا خیال تھا کہ یہ تنظیم علم وعمل، ذکر وفکر، عبارت وسیاست کی جامع تحریک ہے، طویل تجربہ کی روشنی میں مولانا کی رائے تھی کہ اس دور میں اسلام کو نافذ کرنے کے لئے وہ طریقۂ کار موزوں ہیں جو امام ابو یوسفؒ اور شیخ احمد سرہندیؒ نے اختیار کیا، جس میں جہاد بالسیف کے بجائے جہاد باللسان اور مزاحمت کے بجائے نصح ودعوت کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔

مولانا کے یہ وہ اوصاف ہیں جو علمی سربلندی کے ساتھ ساتھ آپ کے عمل اور کردار کی بلندی، تعلق مع اللہ اور اخلاقی عظمت کو نمایاں کرتی ہیں، جن کی اس دور کے طبقۂ علماء میں بھی کمی

محسوس کی جاتی ہے اور مشائخ طریقت میں بھی۔

راقم الحروف کا عرصہ سے اپنی اصلاح وتربیت کے سلسلہ میں مولاناؒ کی طرف جھکاؤ تھا، اس موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے میں نے مولانا پاریکھ صاحب سے خواہش کی کہ میں مولانا سے بیعت کا شرف حاصل کرنا چاہتا ہوں، مولانا پاریکھ صاحب نے آپ سے ذکر کیا، آج کل بعض مشائخ لوگوں کو خود ان سے بیعت ہونے کی صراحتاً یا اشارۃً دعوت دیتے ہیں؛ مگر مولانا نے پہلے اپنے بعض معاصرین کا تذکرہ کیا، پھر میرے اصرار پر از راہ شفقت قبول فرماتے ہوئے اگلے دن صبح کے وقت اپنی خدمت میں بلایا اور حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ کے واسطہ سے سلاسل اربعہ میں بیعت فرمائی، کچھ نصیحتیں بھی کیں، پھر مجھ سے فرمایا کہ مشکوٰۃ شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف مواقع کی جو دُعائیں اوراذکار مذکور ہیں ان کو دیکھ جایئے اور سنتوں کا نیز ان اذکار وادعیہ کا اہتمام کیجئے، پھر مجھ سے دریافت فرمایا کہ اذکار کے بارے میں آپ کا کیا مذاق ہے؟ آپؒ کے سوال کرنے کی وجہ سے مجھے ہمت ہوئی اور میں نے کہا کہ جو اذکار حدیث سے ثابت ہیں، ان کو پڑھنے میں تو بہت انشراح ہوتا ہے، اور طبیعت لگتی ہے، لیکن جو اذکار حدیث سے ثابت نہ ہوں، محض بزرگوں سے ثابت ہوں تو بزرگوں کے احترام میں ادنیٰ کمی کئے بغیر ان اذکار کی طرف زیادہ رغبت نہیں ہوتی، میں نے یہ بات ڈرتے ڈرتے کہی؛ لیکن مولانا خوش ہوئے اور فرمایا کہ یہ تو عین ایمان ہے کہ مومن کو سنت ثابتہ سے محبت ہو، حقیقت یہ ہے کہ یہ میری زندگی کا بہت مبارک اور مسعود لمحہ تھا۔

میں نے مولانا کے سامنے اپنی ایک کوتاہی بھی رکھی کہ لکھنے پڑھنے میں تو طبیعت خوب لگتی ہے اور جماؤ کی کیفیت رہتی ہے، برخلاف اس کے ذکر اور عبادت میں طبیعت کو وہ رغبت نہیں ہوتی ہے، فرائض تو بہر حال فرائض ہیں، جن سے مفر نہیں؛ اس لئے ان کا تو کسی حد تک اہتمام کرلیتا ہوں؛ لیکن نوافل کے بارے میں بار بار ارادہ کرتا ہوں؛ مگر اس پر قائم نہیں رہ پاتا، اسی طرح تلاوت اور اذکار پر بھی جو اہتمام چاہئے وہ نہیں کر پاتا ہوں، آپ نے فرمایا علم اور علمی کام افضل العبادات ہے، اس لئے علمی کاموں میں اگر آپ کی طبیعت لگتی ہو تو یہ خوش

آئند بات ہے، آپ جب بھی لکھنے پڑھنے کا کام شروع کریں تو تجدید نیت کرلیں، اس طرح آپ کا یہ عمل عبادت بن جائے گا، بلکہ ممکن ہے کہ دوسری نفل عبادتوں کے مقابلہ یہ زیادہ باعث اجر ثابت ہو جائے — مولانا کی فکر ونظر کا یہی توازن اور اعتدال ہے کہ ایک طرف مسند رشد وہدایت کو آپ کی ذات سے رونق حاصل تھی تو دوسری طرف علم وتحقیق کی بزم بھی آپ پر نازاں تھی، نہ علمی انہاک نے خانقاہی اشغال کو متاثر کیا اور نہ خانقاہ کے ذکر وشغل نے علم وتحقیق کے میدان میں آپ کے قدم روکے۔

چھوٹوں کو اونچا اُٹھانا اور خوردوں کی حوصلہ افزائی کرنا مولانا کا خاص مزاج تھا؛ چنانچہ روانگی سے پہلے جب میں نے اس سفر میں آخری دفعہ مصافحہ کیا تو بہت دُعائیں دیں اور بار بار دریافت فرمایا کہ آپ اس وقت جہاں ہیں، کیا وہاں مطمئن ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا، مولانا نے فرمایا کہ اگر آپ کسی وسیع الاثر ادارہ میں کام کرتے تو آپ کو بھی نفع ہوتا اور آپ سے دوسروں کو بھی زیادہ نفع پہنچتا، میں خاموش رہا، پھر مولانا نے صراحتاً فرمایا کہ اگر آپ چاہیں تو ندوہ میں خدمت کریں، یہاں آپ کو زیادہ وسیع ماحول ملے گا، یہ یقیناً مولانا کی ہمت افزائی تھی، میں نے اپنے حالات کے تحت معذرت کی تو فرمایا: خیر! اگر آئندہ کبھی قصد ہو یا حیدرآباد کے حالات آپ کے لئے موزوں نہ رہیں تو مجھ سے رابطہ کریں، مولانا کی اس پیشکش میں یقیناً میری صلاحیت کو کوئی دخل نہیں؛ بلکہ یہ مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور وسیع القلبی کی بات ہے کہ ایک ایسے شخص کو جو عمر اور تجربہ کے اعتبار سے تہی دامن تھا اور گمنامی میں پڑا ہوا تھا، انھوں نے ایک اہم تاریخی درس گاہ میں خدمت کی پیشکش فرمائی اور اس میں تکلف اور مروجہ پروٹوکول کو دخل نہیں دیا کہ پہلے اُمیدوار کی طرف سے پیش کش ہو، تب اس پر غور کیا جائے، کاش! دینی درس گاہوں اور تنظیموں میں ایسی کشادہ قلبی اور وسیع الظرفی عام ہو جائے!!

ہماری یہ چندروزہ ملاقات ایسی یادگار ملاقات تھی، جس کی حلاوت اور لذت آج بھی تازہ ہے اور جسے میں اپنی زندگی کا ایک اہم واقعہ تصور کرتا ہوں۔

راقم الحروف نے جب ''قاموس الفقہ'' کی پہلی جلد مرتب کی اور سید جمیل الدین

صاحب (ندوہ ایجنسی حیدرآباد) نے اسے شائع کیا تو یہی زمانہ تھا جب سید جمیل الدین صاحب کے زیر اہتمام حیدرآباد میں ادب اسلامی کا سیمینار منعقد ہوا، اس موقع سے دارالعلوم سبیل السلام میں ایک خصوصی اجلاس رکھا گیا، جس میں حضرت والا کے ہاتھوں ''قاموس الفقہ'' کی رسم اجراء انجام پائی، نیز اس اجلاس میں مولانا نے مؤطا امام مالکؒ کا افتتاحی درس دیا، اس درس میں آپ نے حدیث کی حجیت، اس کی اہمیت اور حدیث وفقہ میں امام مالکؒ کی خدمات پر بڑی اچھی روشنی ڈالی اور اس مدرسہ کے بارے میں اور اونچے کلمات کہے؛ بلکہ مولانا محمد رضوان صاحبؒ سے علاحدگی میں فرمایا کہ اگر آپ کچھ نہ سمجھیں تو میں کہوں کہ یہ جنوب کا ندوہ تیار ہورہا ہے!

راقم الحروف نے اس موقع سے ایک منظوم سپاس نامہ مولانا کی خدمت میں پیش کیا تھا، جس میں تلمیحاً مولانا کی تصانیف کی طرف بھی اشارہ تھا، مولانا نے سپاس نامہ قبول کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر یہ میرے بارے میں نہ ہوتا تو میں بہت داد دیتا، اسی دن شام کو دکن ایکسپریس سے مولانا کی روانگی تھی، وہاں بھی مصافحہ کا شرف حاصل ہوا، اس موقعہ سے بھی از راہ شفقت حوصلہ افزاء کلمات فرمائے، اتفاق سے چند اشعار اس منظوم سپاس نامہ کے ذہن میں رہ گئے وہ درج کرتا ہوں :

چمن پہ، گل پہ، روش پہ، یہ کیا نکھار آیا — خوشا کہ بزم میں پھر حاصل بہار آیا
مئے ''عزیمت ودعوت'' (۱) کا قدح خوار آیا — ''عروجِ حضرتِ انساں'' (۲) کا راز دار آیا
نسیم رقص کرے، سازِ دل ہو نغمہ سرا — صبا لچک! کہ گلستان میں پائے یار آیا
مہک شمیم! اور غنچوں کو تشنہ کام نہ چھوڑ — کلی! چٹک کہ تری بزم میں نکھار آیا

''قلم میں جس کے شہیدوں کے خوں کی سرخی ہے'' (۳)
مشامِ جان کرو وا، وہ مشک بار آیا

---

(۱) تاریخ دعوت وعزیمت۔ (۲) انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر۔
(۳) سیرت سید احمد شہیدکی تالیف اور سید صاحب سے نسبی تعلق کی طرف اشارہ ہے۔

وہ پاسبانِ شرع ، پاسبانِ دین متیں (۱) وہ رزم باطل و حق کا ستیزہ کار آیا
وہ ’’مرتضیٰ‘‘ (۲) کا شناسا، وہ حق کا نورمبیں وہ اپنے وقت کا حیدر ، وہ ذوالفقار آیا
’’نماز وروزہ وحج کا حکیم ورمز شناس‘‘ (۳) وہ ’’رزم مشرق ومغرب‘‘ (۴) کا شہسوار آیا
لکھی ہے جس نے ’’حیات نبی‘‘ (۵) وہ نوک قلم وہ حق شناس ، وہ انساں کا غمگسار آیا (۶)

طلب کا دامن دل کھول خالؔد عاصی !
کہ روح و دل کے لئے ابر گہر بار آیا

دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد میں ۱۹۹۶ء میں ادب اسلامی کا سیمینار منعقد ہوا ، اس قافلہ علم وادب میں ظاہر ہے کہ بڑا حلقہ ندوی فضلاء اور اصحابِ قلم کا تھا اور میر کارواں کی حیثیت سے مولانا کی موجودگی اس قافلہ کے مرتبہ و اعتبار اور عظمت و وقار میں اضافہ کررہی تھی ، وہ آخری موقع تھا جب آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ، سبیل السلام کی عظیم الشان نوتعمیر شدہ مسجد عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے کھلے صحن میں افتتاحی اجلاس منعقد ہوا ، جس میں علماء واصحاب نظر اور خواص کی نمائندہ تعداد شریک تھی ، اس موقع سے مولانا نے عام معمول کے اعتبار سے مختصر خطاب فرمایا ، جس کی وجہ ضعف اور کبرسنی تھی ؛ لیکن آپ نے جو کچھ فرمایا اس کا ایک ایک لفظ درد و سوز میں ڈوبا ہوا تھا اور سامعین کے بربط دل کو چھیڑ رہا تھا ، اس موقع سے تلاوت قرآن مجید کے لئے سورہ علق کی ابتدائی آیات منتخب کی گئی تھیں ، مولانا نے ان ہی آیات کو اپنے خطاب کا موضوع بنایا اور اس نکتہ پر زور دیا کہ اسلام کا کمال یہی ہے کہ اس نے علوم کا رشتہ رب سے جوڑا ہے ، جو علم رب سے مربوط ہو وہ نافع ہے اور جو علم وادب رب سے مربوط نہ ہو وہ غیر نافع ہے ، مولانا اپنے اس خطاب میں اقبال کی اس نظم کو ترنم میں پڑھا :

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا ، وہ ہنر کیا ؟

---

(۱) آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی قیادت کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) مولانا کی تصنیف ’’المرتضیٰ‘‘۔
(۳) آپ کی تالیف ’’ارکان اربعہ‘‘ کی طرف اشارہ ہے۔ (۴) اسلام اور مغربیت کی کشمکش وغیرہ۔
(۵) یعنی ’’نبی رحمت‘‘ (۲ رجلدیں)۔
(۶) تحریک پیام انسانیت کی طرف اشارہ ہے۔

آپ اپنی وفات کے کئی ماہ پہلے سے علیل اور ایک حد تک فریش تھے؛ لیکن رمضان المبارک کے بابرکت مہینہ اور جمعہ کے مبارک ومسعود دن میں جب وفات ہوئی اور دنیا کے کونے کونے تک خبر پہنچی تو اس خبر نے ایک سکتہ سا طاری کر دیا، گویا یقین ہی نہ آتا تھا کہ جس شخص نے اپنوں اور بے گانوں سبھوں کے قلوب کو فتح کر رکھا ہے، موت نے خود اسے فتح کرلیا ہے، استغناء، دنیا سے بے نیازی، قناعت، فقرودرویشی، تعلق مع اللہ اور اس کے ساتھ علم وتحقیق اور شعروسخن کی محفلوں کی قیادت وسیادت، تواضع وانکسار، عجزوفروتنی، خلق اللہ کے ساتھ رحم دلی اور دل داری، بزرگوں کا احترام، معاصرین کا اعتراف، خوردوں کے ساتھ شفقت، حمیت ایمانی اور غیرت اسلامی، بندگانِ خدا کے درمیان محبوبیت اور مقبولیت کا جو امتزاج اس زمانہ میں آپ کی ذات میں دیکھا گیا، ماضی قریب میں اس کی مثال ملنی دشوار ہے اور مستقبل قریب میں بہ ظاہر اس سے بھی دشوار تر، اقبال کا یہ شعر جو شاعر نے خود اپنے بارے میں کہا ہے، مولانا کے بارے میں بے ساختہ زبان پر آتا ہے :

سر آمد روز گارے ایں فقیرے
دیگر دانائے راز آید کہ ناید

❁ ❁ ❁

امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ❁

نہنگوں کے نشیمن جس سے ہوتے تھے تہ و بالا

ہندوستان پر ایک طویل وقت ایسا گذرا ہے کہ اس کے بام و در پر مسلمانوں کے عروج واقتدار کا سورج چمکتا تھا، پھر وہ وقت آیا کہ تخت اقتدار کی جگہ تختۂ دار نے لے لی، اس صورتِ حال کے خلاف اول ان لوگوں نے جدو جہد کی، جو کل تک تاج وتخت کے وارث اور حکومت کے دیوان وایوان کے مالک تھے، مگر وقت آچکا تھا کہ سنتِ الٰہی اپنا رنگ دکھائے اور یہ لوگ اپنی غفلت کوشیوں اور عیش وعشرت کی سرمستیوں کی سزا پائیں، بالآخر وہی ہوا اور لال قلعہ پر مسلمانوں کے اقتدار کا جو محض علامتی نشان باقی رہ گیا تھا، وہ اس سے بھی محروم کر دیئے گئے، ہمتیں ٹوٹ گئیں، حوصلے پست ہوگئے اور دست و بازو کے ساتھ دل ودماغ نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔

ان حوصلہ شکن حالات میں صرف علماء ربانی رہ گئے تھے، جن کو اس ملک میں دین وشریعت کی حفاظت کے جذبہ نے اب بھی بے چین کر رکھا تھا، انھوں نے مشہد بالاکوٹ کو اپنے لہو سے لالہ زار کیا اور ملک کے طول وعرض کو اپنے خون جگر کا امین بنایا، یہ قربانیاں رنگ لائیں اور وقت نے بتادیا کہ اسلام اپنے بقاء کے لیے تاج شاہی اور سطوت سلطانی کا محتاج نہیں، ہزار ظلم وستم کے باوجود مسلمان اپنی متاع ایمان پر جسم وجان کو ترجیح دینے تیار نہ ہوئے، ابھی نصف صدی گذری ہوگی کہ جبری اقتدار کے پاؤں لرزنے لگے اور صدی پوری ہوتے ہوتے ان کو رخت سفر باندھنا پڑا۔

لیکن اس کے بعد جو حالات پیش آئے، وہ مسلمانوں کے لئے کچھ کم حوصلہ شکن نہ تھے، وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں پیش پیش رہے اور سب سے بڑھ کر قربانی دی؛ لیکن آزادی سے

❁ ہفت روزہ ''نقیب'' پھلواری شریف پٹنہ کی خصوصی اشاعت کے لئے لکھا گیا مضمون۔

عین قبل تقسیم ملک اور بناء پاکستان کی تحریک نے زور پکڑا اور مسلمانوں کی صف اول کے بعض قائدین بھی اس تحریک کے مؤید ہوگئے، ملک کا بٹوارہ ہوا اور آزادی کے شایانِ شان استقبال کے لئے ''ابیر وگلال،، کے رنگ کو ناکافی جان کر انسانی خون سے ہولی کھیلی گئی اور مٹی اور تیل کے چراغوں کے بجائے مظلوموں کے گھر کو جلا کر چراغاں کیا گیا —— مسلمانوں کی قیادت کا ایک حصہ تو پہلے ہی پاکستان کے حصہ میں جا چکا تھا، دوسروں نے جب اپنے ہی گھر میں اپنی قربانیوں پر اہل وطن کی یہ عنایت دیکھی تو ان کو بھی رخت سفر باندھنے ہی میں عافیت محسوس ہوئی۔

اب ملک میں معدودے چند آدمی اس صف کے باقی رہ گئے، ان کے ساتھ ایک بے سروسامان، منتشر، خستہ حال اور خانماں برباد قوم تھی، جس کا ہر گھر ماتم کدہ بنا ہوا تھا، بعضے تو وہ تھے کہ ان کو اپنی مظلومیت پر ایک اشکبار آنکھ ہی کی حسرت تڑپا رہی تھی، ان کی اجتماعیت اور تنظیم نو کا تصور بھی دشوار تھا، رہبرانِ قوم کی طاقت ہمیشہ ان کی قوم ہوتی ہے، جب قوم اس طرح اجتماعیت سے محروم ہو اور رہنما وہ ہوں، جن کو قوم کے وقتی جوش وخروش نے اپنوں ہی کے اعتماد سے محروم کردیا ہو اور بقول مولانا آزاد اس کی زبان اور ہاتھ تراش لئے گئے ہوں تو ان حالات میں وہ دوسروں سے بھی آنکھیں نہیں ملا سکتا، اسے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اس سے اس کی زبان چھین لی گئی ہو اور اس کے ہاتھ پاؤں شل ہوگئے ہوں —— اسی کیفیت سے اس وقت کے بچے کھچے ہندوستانی مسلمان اور ان کے آزردہ ودل گرفتہ رہنما دوچار تھے!

اب ولولہ انگیز تقریروں، خواب وخیال پر مبنی نعروں، آتشیں اور رزمیہ نغموں اور ترانوں کا دور گذر چکا تھا اور ایسی تازہ دم قیادت مطلوب تھی جو اُمت کے زخم کا مرہم بن سکے، ان کے ہوش وحواس کو جمع کرسکے، نیا اعتماد اور نیا حوصلہ پیدا کرسکے، صبر وثبات کا سبق دے، ماتم سنجی کی بجائے خود اعتمادی پیدا کرے، دینی مراکز کو تقویت پہنچائے اور جوش کی جگہ ہوش اور غیر حقیقت پسندانہ نعروں کی جگہ تدبر اور طویل مدتی منصوبہ بندی اور تعمیر کو لائحہ عمل بنائے —— آزادی کے بعد قیادت کی اس ضرورت کو جن لوگوں نے پورا کیا، میرے حقیر مطالعہ کے مطابق ان میں سر فہرست مجاہد ملت مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی تھے، رحمہ اللہ تعالیٰ۔

اوراسی سلسلہ کا دوسرا سب سے اہم نام ''حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی'' کا تھا، جو آزاد ہندوستان میں پارلیمانی سیاست سے دور رہ کران کے دینی اور تہذیبی اقدار کی حفاظت کی لڑائی بڑے تدبر سے لڑے، برصغیر میں جہاں کہیں مسلمانوں کو کوئی کانٹا چبھا، انھوں نے اپنے دل میں اس کی چبھن محسوس کی اور قوت بھران کی مدد کی، اُمت کے مسائل پر سوچنا، سوچ کر بولنا اوراظہار حق میں جرأت اور حسن تدبر کو ہم دوش رکھنا ان کا خاص وصف تھا، جزاہ اللہ خیر الجزاء۔

۹/جمادی الثانیہ ۱۳۳۲ھ کو پیدا ہوئے، والد ماجد مولانا سید محمد علی مونگیری کے علاوہ اساتذۂ وقت مولانا عبدالصمد رحمانی، مولانا عبداللطیف صاحب علی گڑھیؒ، مولانا حیدر حسن خان محدثؒ اور مولانا محمد عارف صاحب ہرسنگھ پوریؒ سے استفادہ کیا، آخرالذکر سے ہی بیعت ہوئے اوران ہی سے خلافت پائی۔

آزادی کی جدوجہد میں آپؒ زمانہ طالب علمی ہی میں شریک ہوگئے اور سنت یوسفی زندہ فرمائی، اس دور میں آپ نے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی فکرونظر کا خاص اثر قبول کیا—— ۱۹۳۷ء میں آزادی سے پہلے بہار میں الیکشن ہوئے، آپ نے بھی اس الیکشن میں حصہ لیا اور منتخب ہوئے، یہ وہ زمانہ تھا جب مولانا سید ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب کی نگاہ جوہر شناس کی آپ پر خاص عنایت تھی اوران کی تربیت نے آپؒ کی صلاحیت کو دوآتشہ کردیا تھا، اسی دور سے آپ کی قائدانہ صلاحیت اُبھری، ۱۹۳۸ء میں بہار کی کانگریسی وزارت نے ''زرعی انکم ٹیکس'' لگایا اور مسلم اوقاف کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کیا، مولانا سجاد صاحبؒ نے اس کی شدت سے مخالفت کی اور بہار اسمبلی میں مولانا رحمانی نے اس موضوع پر نہایت مدلل اور مبسوط تقریر فرمائی، (جو ''خطبات امیر شریعت'' میں شریک اشاعت ہے)؛ چنانچہ اپریل ۱۹۳۸ء میں مولانا ابوالکلام آزاد بحیثیت حَکَم تشریف لائے، مولانا سجاد صاحبؒ سے گفتگو فرمائی، اس گفتگو میں مولانا نے آپ کو بھی شریک رکھا اوراس طرح اوقاف کی اراضی اس ٹیکس سے مستثنیٰ ہوگئیں۔

کانگریسی وزارت نے اسی زمانہ میں اوقاف بل پیش کیا، اس میں شرعی نقطۂ نظر سے

متعدد خامیاں تھیں، امارت شرعیہ نے اس میں بالواسطہ ترمیمات پیش کیں اور مولانا منت اللہ صاحبؒ نے اسمبلی میں شرعی موقف واضح کیا؛ چنانچہ بل پر غور مکرر کے لئے جو کمیٹی بنائی گئی، اس میں امارت کے نمائندہ ہونے کی حیثیت سے آپ بھی شریک کئے گئے — ۱۹۳۹ء میں بہار اسمبلی میں ''ڈوری بل'' پیش ہوا، جس میں مہر اور جہیز کو جرم قرار دیا گیا، اس بل کے مضمرات پر بھی آپ نے مدلل خطاب فرمایا اور اسمبلی کے سامنے اسلامی نقطۂ نظر پیش کیا؛ چنانچہ بالآخر مسلمانوں کو اس قانون کے اطلاق سے مستثنیٰ کیا گیا — حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کی نگرانی میں آپ اسی طرح ایوان کے اندر اور ایوان سے باہر ملی مسائل کی ترجمانی کرتے رہے۔

امیر شریعت ثالث مولانا شاہ قمر الدین صاحبؒ کی وفات کے بعد صوبہ بہار کے علماء اور ارباب حل وعقد نے آپ کو چوتھا امیر منتخب کیا اور وقت نے بتایا کہ وہ اپنے اس انتخاب بلکہ حسن انتخاب میں اللہ کی طرف سے منصور تھے، حضرت مولانا سجاد صاحب کی تربیت اور خود اپنی تعمیری فکر اور قائدانہ صلاحیت کی وجہ سے امارت کے نصب العین سے پہلے سے آپ کا گہرا رشتہ تھا، بلکہ ملی اور ملکی مسائل میں آپؒ اس کی ترجمانی اور نمائندگی کرتے رہے تھے، امارت آپ کے پاس ایسے وقت آئی جب اس کی بنیاد قائم ہو چکی تھی اور اب اس کی توسیع کی طرف توجہ کی ضرورت تھی۔

کسی بھی ادارہ پر دو ادوار آتے ہیں، ایک اس کے قیام واستحکام کا، دوسرا اس کی توسیع کا، امارت ایک حد تک پہلے دور سے گذر چکی تھی، نظام امارت کی تاسیس اور اس کے لئے قوم کے دل ودماغ کو تیار کرنا ایک اہم اور دشوار کام تھا، یہ کام خود امارت کے مؤسس حضرت مولانا سجاد صاحبؒ کر چکے تھے، امارت کا سب سے اہم محکمہ ''دارالقضاء'' رہا کیا ہے، خوش قسمتی سے اس کو پہلا قاضی شریعت قاضی نور الحسن صاحب پھلوارویؒ کی شکل میں ملا، جنھوں نے نہایت ذہانت اور قابلیت کے ساتھ دارالقضاء کی عملی صورت گری فرمائی اور اس کو اتنا منضبط اور مرتب فرما دیا کہ بعض اوقات خود انگریزی عدالتوں سے دارالقضاء میں مقدمات منتقل کئے جاتے

تھے،(تاریخ امارت:۱۵۹)امارت شرعیہ کے دارالافتاء کی ساکھ بھی مولانا سجاد صاحبؒ کی زندگی ہی میں قائم ہوگئی تھی اور صوبہ و بیرون صوبہ سے استفتاء آنے لگے تھے، اس شعبہ کے لئے مولانا عبدالصمد رحمانیؒ کے علاوہ علامہ کشمیری کے شاگرد مولانا شاہ محمد عثمان غنیؒ اور مولانا محمد عباس صاحب پھلواروی (والد مولانا عبداللہ عباس ندویؒ) جیسے علماء کی خدمات حاصل رہیں، امارت کے شعبۂ انتظام کو قاضی سید حسین احمد صاحب (ایم، پی) جیسے منتظم مزاج ناظم کی خدمات نے چار چاند لگائے۔

اس کا شعبۂ تبلیغ اس قدر فعال تھا کہ نہ صرف مسلمانوں میں امر بالمعروف کا فریضہ انجام دیتا تھا؛ بلکہ غیر مسلموں میں دعوت اسلام کا کام بھی کیا جاتا تھا، ۴۶ء تک امارت شرعیہ کے مبلغین کے ذریعہ جن لوگوں نے اسلام قبول کیا، ان کی تعداد سات سو تر سٹھ ہے اور بقول مولانا عبدالصمد رحمانی ''بحمد اللہ یہ تعداد یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے'' (تاریخ امارت:۱۸۶)، کسی تحریک اور فکر کے لئے ایک اہم ضرورت اس کے ترجمان اور نمائندہ لٹریچر کی ہوتی ہے، یہ ضرورت حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نے اس طرح پوری فرمائی کہ آج تک کفایت کر رہی ہے، پندرہ روزہ ''امارت'' اور اس کے بعد ''نقیب'' بھی ابتدائی دور ہی سے چھپ رہا تھا، امارت کے بارے میں شکوک وشبہات کے جتنے کانٹے تھے اور اہل علم و دانش کو خدشات وشبہات تھے، مولانا سجاد صاحبؒ نے ان سب کا ازالہ فرما دیا، تقسیم ملک کے بعد بعض سیاسی جماعتیں بالخصوص مسلم لیگ جو امارت کے ساتھ حریفانہ رقابت رکھتی تھی، رخت سفر باندھ چکی تھی اور حضرت مولانا سجاد صاحب کے سوز دروں، ملک اور صوبہ کے ممتاز علماء کی تائید بلکہ تحسین اور امارت شرعیہ کے قیام اور اس کے نظام میں ریاست کی دو وسیع الاثر خانقاہوں —— خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف اور خانقاہ رحمانی مونگیر —— کا تعاون، یہ تمام باتیں تھیں، جس نے عوام کے دلوں میں ایک درجہ میں امارت کی جڑیں مضبوط کر دی تھیں، غرض کہ مولانا سجاد صاحب، ان کے رفقاء کار اور پہلے تینوں امراء شریعت نے امارت شرعیہ کے قیام اور ایک حد تک استحکام کا مرحلہ پورا کر دیا تھا، مگر مولانا سجاد صاحبؒ کے بعد اس میں ایک گونہ اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اور اب اس تحریک کو

ایسے بالغ نظر، عالی حوصلہ، وسیع الذہن اور فعال شخصیت مطلوب تھی، جو ایک طرف ملی مسائل کی ترجمانی میں جرأت اور شرعی خطوط پر اُمت کی زندگی کی تشکیل کے سلسلہ میں اس کی روایت کو بھی آگے بڑھائے، دوسری طرف اس کی خدمات کے دائرہ کو بھی وسیع کرے —— اور شبہ نہیں کہ اس وقت آپ ہی کی شخصیت تھی، جو اس ضرورت کو پورا کر سکتی تھی۔

آپ نے سب سے پہلے دارالقضاء کی توسیع پر توجہ فرمائی اور اپنے پہلے ہی حکم میں اضلاع اور کمشنری کی حد تک دارالقضاء کو وسعت دینے اور قضاءت کی تربیت کے نظم کی طرف توجہ دلائی، اگست ۱۹۵۸ء میں دو ہفتے خانقاہ رحمانی مونگیر میں تربیت قضاء کا کیمپ منعقد کیا اور صوبہ میں علماء کی ایک ایسی ٹیم تیار کردی، جو فریضۂ قضا انجام دینے کی اہل ہو؛ چنانچہ آپ کے عہد میں نظام قضاء کو جو وسعت حاصل ہوئی اور صوبہ بہار سے گذر کر شمالی ہند اور جنوبی ہند کی مختلف ریاستوں میں دارالقضاء قائم ہوئے، وہ کسی صاحب نظر کے لئے محتاج اظہار نہیں، وفات سے چند سال پہلے تربیت قضاء کا ایک اور کیمپ بھی آپ نے قائم فرمایا، جو نہایت نتیجہ خیز اور ثمر آور رہا اور پورے ملک سے علماء نے اس میں شرکت کی۔

امارت شرعیہ کے دارالافتاء کو بھی آپ کے دور میں وسعت حاصل ہوئی اور اب وہ ملک کے دو تین اول درجہ کے دارالافتاء میں ایک ہے، چوں کہ ایک زمانہ میں امارت شرعیہ میں کوئی قابل ذکر کتب خانہ موجود نہیں تھا؛ اس لئے آپ نے اس شعبہ کو براہ راست اپنی نگرانی میں ''خانقاہ رحمانی''، منتقل کردیا تھا؛ تاکہ مفتی حضرات وہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کرسکیں، بعد کو خود امارت شرعیہ کے دفتر میں بھی شعبۂ افتاء کا ایک حصہ رکھا، امارت شرعیہ کا ایک اہم شعبہ ''تحفظ مسلمین'' ہے، اس شعبہ کی خدمات پورے ملک میں اعتماد و اعتبار کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں، بہار اور بیرون بہار جہاں بھی فسادات ہوئے ہوں، قدرتی مصائب و آفات آئے ہوں یا مسلمانوں کے لئے قانونی مسائل پیدا ہوں، آپ کی زیر سرپرستی امارت نے اس میں مدد کا ہاتھ بڑھایا اور اس خوبی سے قوم و ملت کی خدمت کی کہ ہر ایک نے اس کی خدمت پر آفریں کہا،

امارت کے شعبۂ تنظیم کو بھی آپ کے دور میں بڑی وسعت حاصل ہوئی اور ریاست کے تمام علاقوں میں مسلمانوں کی تنظیم کی گئی اور نقباء مقرر کئے گئے۔

معنوی ترقی کے ساتھ ساتھ آپ کے عہد میں امارت شرعیہ نے ظاہری ترقی بھی کچھ کم نہیں کی، آپ ہی کے دور میں امارت شرعیہ کی شاندار عمارت بنی، سجاد ہاسپیٹل کی عمارت کا بڑا حصہ مکمل ہوا، پالی ٹیکنیک کے لئے بنیاد رکھی گئی، امارت کا نمائندہ ''نقیب'' پندرہ روزہ سے ہفت روزہ ہوا اور ملکی صحافت میں اس کو خاص مقام حاصل ہوا، بیت المال کا نظام مستحکم ہوا، اس کے ذریعہ اسلام کے نظام امارت کا ایک اہم شعبہ ''اعانت محرومین'' میں خاصی وسعت پیدا ہوئی، آزاد ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں امارت اور اس کے نظام قضاء کی افادیت، اہمیت اور ضرورت کا احساس پیدا ہوا اور وہ ملک کی صفِ اول کی بااثر تحریکوں میں سے ایک بن گئی۔

مردم گری اور جوہر شناسی آپ کا خاص وصف تھا اور آپ کے اسی خاص وصف نے امارت شرعیہ اور جامعہ رحمانی کے نظام کو بڑی تقویت پہنچائی، قضا جو امارت کا سب سے اہم شعبہ تھا، آپ نے اس کے لئے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کا انتخاب فرمایا، جو ذہانت، تفقہ، معاملہ فہمی اور فکر امارت کی ترجمانی و نمائندگی میں اپنی مثال آپ تھے، جہاں مولانا قاضی نور الحسن صاحب نے مولانا سجاد صاحبؒ کی سرپرستی میں نظام قضا کا نقشہ بنایا، وہیں مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ نے آپ کی سرپرستی میں اس کو بام عروج تک پہنچا دیا، امارت کا 'انتظامی اور مالیاتی شعبہ' جو پورے نظام کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتا ہے، کے لئے آپ نے موجودہ نائب امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب کی خدمات حاصل کیں، جو منصوبہ بندی، گہرائی کے ساتھ مسائل پر غور کرنے اور صبر و تحمل کے ساتھ لوگوں کو ساتھ لے کر چلنے کی خاص صلاحیت کے مالک ہیں، ''نقیب'' کی ادارت کے لئے مرحوم شاہد رام نگری کو مقرر فرمایا، جو غالباً ماضی قریب میں مولانا عثمان فارقلیط اور مسلم صاحب مرحوم کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل پر اظہار خیال میں اپنی مثال نہیں رکھتے تھے، افتاء کے لئے آپ نے ہمیشہ باصلاحیت اور عمیق النظر علماء کا انتخاب کیا اور خود ان کے کاموں کی نگرانی فرمائی ——

نائب امیر شریعت حضرت مولانا عبدالصمد رحمانی نائب کی وفات کے بعد موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب دامت برکاتہم (۱) کو نائب امیر شریعت مقرر فرمایا، اس وقت بہت سے لوگوں کو اس انتخاب کی اہمیت سمجھ میں نہ آپائی؛ لیکن آپ کی وفات کے بعد جس حسن وخوبی کے ساتھ امارت کے کام کو آپ نے جاری رکھا اور بعض نازک مسائل میں جس حسن تدبیر، فراست اور صبر واستقامت کا ثبوت دیا، اس نے لوگوں کی آنکھیں کھول دیں اور ان کو آپ کے اس حسن انتخاب کا اندازہ ہوا۔

مسلم پرسنل لاء ہندوستان میں شریعت اسلامی کا بچا کھچا سرمایہ ہے، بدخواہوں کی نظر میں شروع سے مسلمانوں کا یہ تشخص کھٹکتا رہا ہے، ۱۹۶۳ء میں نوبت یہاں تک آگئی کہ حکومت نے مسلم پرسنل لا میں تبدیلی کے لئے ایک باضابطہ کمیٹی تشکیل دینا چاہی، چنانچہ پورے ملک سے اس کے خلاف آواز اُٹھائی گئی، لیکن سب سے پہلے آپ ہی نے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام ۲۸ / جولائی ۱۹۶۳ء کو انجمن اسلامیہ ہال پٹنہ میں ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد کی، جس کی صدارت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کارگذار صدر جمعیۃ علماء ہند نے فرمائی اور مولانا ابواللیث اصلاحی امیر جماعت اسلامی ہند نے اس کا افتتاح کیا، پھر آپ ہی کی تحریک اور خصوصی کوشش سے ۱۳-۱۴ / مارچ ۱۹۷۲ء کو دارالعلوم دیوبند میں مزید وسعت کے ساتھ مختلف جماعتوں کا نمائندہ اجلاس منعقد ہوا اور اسی اجلاس کی پہل پر ۲۷-۲۸ / دسمبر ۱۹۷۲ء کو بمبئی میں وہ عظیم الشان اور فقید المثال کنونشن منعقد ہوا، جو ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

اسی کنونشن میں بورڈ کی تشکیل ہوئی اور آپ ہی نے بورڈ کے سلسلہ میں تجویز پیش فرمائی، پھر اپریل ۱۹۷۳ء میں حیدرآباد میں بورڈ کا پہلا اجلاس ہوا، آپ باتفاق رائے بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور تاوفات نہایت حسن وخوبی سے اس فریضہ کو انجام دیتے رہے، بورڈ

---

(۱) ۸/ جمادی الاخریٰ ۱۴۱۹ھ میں آپ کی وفات ہوگئی۔

میں آپ کی مدبرانہ قیادت، اصابت رائے اور حق گوئی کا ہر شخص کو اعتراف تھا، آپ نے مسلسل سعی کے ذریعہ ''تبنیت'' کے قانون سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کرایا، وقف کے بعض قوانین کی اصلاح کرائی، نفقہ مطلقہ سے متعلق آپ کی زیر قیادت مہم کے نتیجہ میں حکومت نے تبدیلی کی، پھر عدالت کے فیصلہ نے اسے بے اثر کر دیا، تو آپ کی زیر قیادت ''تحفظ شریعت'' کی وہ ملک گیر تحریک اٹھی کہ ملت اسلامیہ ہند کی تاریخ میں خلافت تحریک کے بعد شاید ہی اس کی کوئی اور مثال نہ ملے، بابری مسجد کے مسئلہ پر جب بعض مسلم حلقوں کی طرف سے اس طرح کا اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں وہ مسئلہ کی نزاکت کو نظر انداز کر کے مصالحت نہ کر لیں یا مسجد کا مسجد کا سودا نہ کر لیں، تو آپ نے نہایت جرأت کے ساتھ اس کا نوٹس لیا اور بورڈ کی مجلس عاملہ کا اجلاس بلا کر مسجد کی شرعی حیثیت کو اُجاگر فرمایا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لئے شاید سب سے نازک وقت وہ آیا، جب ایمر جنسی نافذ کی گئی اور فیملی پلاننگ کے لئے جبر کی راہ اختیار کی گئی، ایسے نازک وقت میں جب خوف و ہراس کی کیفیت اور قید و بند کی صعوبت نے اچھے اچھوں کی زبان گونگ کر دی تھی، آپ نے نہایت پامردی کے ساتھ حکومت کے خلاف اپنے موقف کا اظہار کیا، پھر ایک مرحلہ پر یہ بات سامنے آئی کہ مسلم پرسنل لا پر کوئی مستند مجموعہ مدون ہونا چاہئے، چنانچہ خاص اپنی نگرانی میں آپ نے مختلف اصحاب فتاویٰ اور ماہرین فقہ کے ذریعہ اس کام کو سرانجام دیا، جو اخیر تک جاری رہا، یہ آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آپ کا سب سے بڑا کمال بورڈ کو گروہی اور جماعتی اختلافات سے ماوراء رکھ کر آگے بڑھانا، مختلف اعتقادی، فقہی، سیاسی، تحریکی اور تنظیمی مکاتب فکر کو ایک ساتھ لے کر چلنا اور قدم قدم پر عدم توازن سے دامن بچاتے ہوئے صبر و تحمل کے ساتھ ان کو مجتمع رکھنا ہے۔

قومی اور ملی مسائل میں دو باتیں آپ کا خاص امتیاز تھیں، ایک: جرأت و ہمت، دوسرے: مصلحت شناسی اور دور اندیشی، آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کے اندر

ایک طرح کا احساس کمتری پیدا ہوگیا تھا، لوگ اسلام کے بارے میں زبان کھولنے میں شرم اور جھجک محسوس کرتے تھے اوران کوخوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں ان کوفرقہ پرست اور مسلم لیگی کا لقب نہ دے دیا جائے، اس احساس کودور کرنے اور خود اعتمادی پیدا کرنے کی طرف آپ نے خاص توجہ دی، ۱۹۵۸ء میں دربھنگہ میں ایک جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام کا نعرہ دیا اور فرمایا ''اگر میں اسلام کو بہتر سمجھتا ہوں تو کیا برادران وطن کواسلام کی افادیت کا گرویدہ بنانے کی کوشش نہیں کروں گا؟ کیا یہ میری خواہش نہیں ہوگی کہ ہندوستان کا قانون اسلام کے مطابق ہو؟ کیا مجھے اس سے خوشی نہیں ہوگی کہ ہندوکوڈ بل کا معتد بہ حصہ ہدایہ اور شرح وقایہ سے لیا گیا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کی یہ ذمہ داری ہے کہ ہندوستان کے قانون کواسلام سے قریب تر کرنے کی جائز اور پُر امن کوشش کرے'' —— حالاں کہ آپ کے اس طرح کے بیانات پر ہندی اور انگریزی اخبارات نے آپ کے خلاف بڑی مہم چلائی؛ لیکن آپ کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا۔

آزادی کے بعد فسادات کا جو بھیانک سلسلہ شروع ہوا، اس نے مسلمانوں کی کمر ہمت توڑ کر رکھ دی اور آزادی کے کئی سال بعد بھی بہار اور مشرقی علاقے کے مسلمانوں کی ہجرت کا سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ میں رانچی میں بھیانک فساد ہوا، اس موقع سے آپ نے مسلمانوں کو ''اپنی حفاظت آپ'' کا نعرہ دیا اور مسلمانوں کو آواز دی کہ وہ بزدلی کے بجائے حوصلہ سے کام لیں، اس نعرہ نے مسلمانوں میں خود اعتمادی اور دلیری پیدا کی اوران میں رونے اور ماتم کرنے کی بجائے خود اپنی حفاظت کا حوصلہ پیدا ہوا۔

بہار کے بعض اسکولوں میں ''رام دھن'' کا ترانہ شروع ہوا، اس میں مشرکانہ تصورات بھی موجود تھے، آپ نے واضح اعلان فرمایا کہ مسلمان طلبہ ایسے ترانوں میں شریک نہ ہوں، آپ ہی کے زمانۂ امارت میں امارت شرعیہ نے سرکاری نصابِ تعلیم کا جائزہ لیا اوراس میں ان عناصر کی نشاندہی کی، جن سے مسلمانوں کی دل آزاری ہوتی تھی، بنگلہ دیش بننے کے بعد بنگلہ دیش میں غیر بنگالی مسلمانوں پر جومظالم ڈھائے گئے، اس وقت کے ماحول میں اس پر کچھ کہنا

آسان نہیں تھا، آپ نے اس سلسلہ میں اس وقت کی وزیر اعظم اندرا گاندھی کے نام نہایت بصیرت افروز خط لکھا اور انھیں اس انسانی فریضہ کی طرف توجہ دلائی، خود شیخ مجیب الرحمٰن کو خط لکھا کہ وہ ان کو خیر سگالی وفد کے ساتھ بنگلہ دیش آنے کی اجازت دیں۔

ایمرجنسی ۱۹۷۶ء کے درمیان سرکاری جبر واستبداد کی فضا میں آپ نے جس استقامت کے ساتھ ملت کی رہنمائی کی اور حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کی، وہ آپ ہی کا حصہ ہے، اس موقع سے آپ نے بیان بھی جاری فرمایا، خاندانی منصوبہ بندی پر رسالہ بھی تالیف کیا اور (سی، آئی، ڈی) افسران کی تحقیق پر پوری وضاحت کے ساتھ ان کے سامنے اپنا موقف رکھا —— امارت شرعیہ کی نئی عمارت کے افتتاح کے موقع سے پٹنہ کے بعض فرقہ پرست عناصر نے امارت کے خلاف ایک مہم سی چلا رکھی تھی، یاد آتا ہے کہ آپ نے اس موقع سے وزیر اعلیٰ اور دوسرے وزراء وسیاسی قائدین کی موجودگی میں برجستہ فرمایا:

> چاہے مجھے گولی ماردی جائے، میں جس بات کو حق سمجھتا ہوں، اس کو حق سمجھنے سے باز نہیں رہوں گا۔

مسلم پرسنل لا کے بارے میں ایک موقع سے فرمایا:

> میں اس کے لئے تیار ہوں کہ ہماری گردنیں اُڑادی جائیں، ہمارے سینے چاک کردیئے جائیں، مگر ہمیں یہ برداشت نہیں کہ مسلم پرسنل لا کو بدل کر ایک غیر اسلامی لا ہم پر لاد دیا جائے، ہم اس ملک میں ایک باعزت قوم اور مسلم قوم کی حیثیت سے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

لیکن ہمت اور حوصلہ مندی اگر شعور اور دوراندیشی سے عاری ہو تو فائدہ کم پہنچاتی ہے اور نقصان زیادہ، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان دونوں کا حسین امتزاج بنایا تھا، اس وقت دسیوں واقعات اور مثالیں آپ کی اس مدبرانہ صلاحیت کی نگاہوں میں ہیں؛ لیکن ایک دو باتیں بے ساختہ قلم پر آیا چاہتی ہیں —— آپ جب امیر بنے تو خود مسلمانوں میں بعض لوگ بے اطمینانی کے شکار تھے اور وہ سمجھتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ امارت ایک حلقہ کی نمائندہ بن کر رہ جائے، ایسے

موقع پر عام طور پر لوگ منفی ردعمل کا شکار ہوجاتے ہیں؛ لیکن آپ نے نہایت مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے فرمایا :

> امارت شرعیہ ہر مسلک ومشرب کے مسلمانوں کا ادارہ ہے، یہ کسی خاص مسک کی تنظیم نہیں ہے، اہل حدیث ہوں یا بریلی، دیوبندی ہوں یا ندوی —— میں یقین دلاتا ہوں کہ اس نظام میں انھیں اپنی انفرادیت کے محفوظ رکھنے کا موقع ملے گا۔

امیر شریعت بننے کے بعد بعض ہندی اور انگریزی اخبارات میں امارت کے خلاف بڑے سخت اور اشتعال انگیز مضامین آئے اور بعضوں نے اسے متوازی حکومت قرار دیا، اس موقع پر آپ نے صبر وحکمت سے کام لیتے ہوئے یہ تدبیر فرمائی کہ پٹنہ میں ایک ''نمائندہ کانفرنس'' منعقد کی، امارت کے مقاصد بیان کئے، صحافیوں کو جی بھر کر سوال کرنے کا موقع دیا اوران کی تسلی فرمائی، یہ تدبیر مفید ثابت ہوئی اور چند اخبارات کے پروپیگنڈوں کا بھرم کھل کر رہ گیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ کو جس دانش مندی اور شعور کے ساتھ آپ لے کر چلے اور رہبری فرماتے رہے، وہ آپ ہی کا حق تھا، ایمرجنسی کے دوران صدر بورڈ حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فیملی پلاننگ کے سلسلہ میں ایک ایسا بیان دے دیا جو بظاہر جمہور علماء کی رائے اور خود بورڈ کے موقف کے خلاف محسوس ہوتا تھا، اس بیان نے دین ودانش کے حلقوں میں بڑی بے چینی اور برہمی پیدا کردی، مجھے خوب یاد ہے کہ اس موقع سے آپ نے بڑے ضبط سے کام لیا اور حضرت قاری صاحب کو اس سلسلہ میں خط لکھ کر وضاحت کی خواہش کی، پھر قاری صاحب کے وضاحتی جواب کی ایسی تشریح فرمائی کہ بورڈ کا موقف برقرار رہے اور قاری صاحب کی ذات پر بھی کوئی حرف نہ آئے، آپ کی اس ''حکیمانہ تدبیر'' نے واقعہ ہے کہ ایک بڑے فتنہ کو ٹال دیا، پھر اس واقعہ کے بعد جب رانچی کا اجلاس ہوا اور بعض ارکان نے بورڈ کے عہدۂ صدارت کے لئے کچھ اور نام پیش کئے تو آپ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اس کا رُخ موڑ دیا؛ کیوں کہ مختلف مصلحتوں کا تقاضا یہی تھا کہ حضرت قاری صاحب اب بھی اس عہدہ پر برقرار ہیں۔

قومی، ملی اور تحریکی کاموں کے ساتھ اکثر علمی کاموں کا رشتہ باقی نہیں رہ پاتا ہے؛ لیکن آپ نے مشغولیات کی کثرت اور عدیم الفرصتی کے باوجود علم وداب کی جو خدمت انجام دی، وہ بھی ایک کارنامہ ہے، فقہ آپ کا خاص موضوع تھا، اس موضوع پر ''قانون شریعت کے مصادر اور نئے مسائل کا حل، مسلم پرسنل لا اور قضاء کی تاریخی حیثیت'' پر آپ کی تحریریں نہایت اہمیت کی حامل ہیں، مسلم پرسنل لا کے موضوع پر ''مذہب، اخلاق اور قانون، مسلم پرسنل لا — بحث ونظر کے چند گوشے، اور خاندانی منصوبہ بندی'' اُردو زبان کا بنیادی لٹریچر ہے، منکرین حدیث کی رد میں آپ کا رسالہ ''کتابت حدیث'' بڑے پایہ کی چیز ہے اور اس موضوع پر اُردو میں لکھی جانے والی کتابوں میں صف اول میں جگہ پانے کے لائق ہے۔

آزادی سے پہلے قومی مسائل پر تعلیم ہند، ہندوستان اور صنعت وتجارت اور وقف بل وغیرہ کتابیں تالیف تحریر فرمائیں اُردو صحافت کی بھی خدمت کی، عرصہ تک ''مسلم ان ڈی پنڈنٹ پارٹی'' کے ہفت روزہ ترجمان ''الہلال'' کے علاوہ مونگیر سے طبع ہونے والے مؤقر رسالہ ''الجامعۃ'' کی ادارت کے فرائض انجام دیئے —— مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کے مکتوبات مرتب فرمائے اور اس ذیل میں جن معروف اور غیر معروف شخصیتوں کا ذکر آیا ہے، نہایت محنت اور تحقیق وتلاش سے ان پر سوانحی نوٹس سپرد قلم کئے، مصر وحجاز کے اسفار پر نہایت معلومات افزا اور دلچسپ روداد قلم بند کی، تصوف میں ''نسبت اور ذکر وشغل'' کے نام سے آپ کا قیمتی مکتوب مطبوعہ ہے۔

آپ کی تحریر سہل، شگفتہ، عام فہم اور رواں ہوا کرتی تھی، خطاب میں بھی یہی رنگ تھا، جس میں جوش پر ہوش کا رنگ غالب ہوتا اور مخاطب کی سطح کی رعایت ہوتی، معلوم نہیں، اپنی زندگی میں کتنی تقریریں کی ہوں گی، مگر افسوس کہ وہ محفوظ نہیں ہوسکیں، ہاں، تیس تقریروں کا ایک مجموعہ ''خطبات امیر شریعت'' کے نام سے طبع ہو چکا ہے، جن میں بعض نہایت علمی اور فکری رنگ کی ہیں اور اسی میں آپ کی وہ مشہور تقریر بھی ہے، جو آپ نے وقف کے موضوع پر بہار اسمبلی میں فرمائی تھی۔

آپ کی مصروفیات کا ایک اہم حصہ خطوط کے جوابات تھے، اس کثرت سے ڈاک آتی تھی کہ خاصا وقت اس کے جواب میں لگ جاتا، بڑا سے بڑا اور چھوٹا سے چھوٹا کوئی جواب سے محروم نہ ہوتا، ان میں بہت سے مکتوبات علمی، فقہی اعتبار سے نہایت اہم ہیں اور بعض تاریخی نوعیت کے حامل ہیں، خدا کرے یہ طبع ہو جائیں تو ایک قیمتی چیز ثابت ہو — حقیقت یہ ہے کہ اپنی ذہانت وفطانت، معاملہ فہمی، ذوق تحقیق اور تعمق فکر کے ساتھ شگفتہ قلم اور آسان و رواں زبان کا جو ملکہ آپ کو ودیعت ہوا تھا، اس کے اعتبار سے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف ہی آپ کا اصل میدان تھا؛ لیکن مردانِ کار اور مردان ہمت کی کمی اور قوم کی ضرورت واحتیاج نے آپ کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ اپنی زمانہ شناس اور فعال شخصیت کے ذریعہ قوم کی رہبری ورہنمائی کے اس خلاء کو پُر کریں — آپ کے علمی کارناموں ہی کا ایک حصہ جامعہ رحمانی جیسی درس گاہ کا قیام اور اس کے لئے پورے صوبہ سے ممتاز اور کہنہ مشق اساتذہ کا انتخاب؛ بلکہ مستقبل کے لئے استاذ سازی اور مردم گری ہے، جو ہندوستان کے شمالی مشرقی علاقوں کی اہم اور بافیض درس گاہوں میں ایک ہے۔

جن لوگوں نے آپ کو دور سے دیکھا ہے، انھوں نے آپ کو رہبر قوم اور عالم کی حیثیت سے جانا اور پہچانا ہے؛ لیکن جن لوگوں نے آپ کو قریب سے دیکھا ہے — اور میں بھی بحمد اللہ اس سعادت سے سرفراز ہوں — انھوں نے آپ کی روحانی کیفیات، فرائض وواجبات کی محافظت، سنن ونوافل کی مواظبت، اذکار واوراد کا اہتمام، آہ سحر گاہی، نالۂ نیم شبی، نماز سے والہانہ عشق، ہر مسئلہ میں دُعاء اور رجوع الی اللہ، امر بالمعروف کا جذبہ، اصلاح وتزکیہ کی سعی، خلق خدا کے ساتھ فیاضی وفراخ چشمی، ضرورت مندوں کی حاجت روائی اور انفاق کو بچشم سر دیکھا ہے اور اس کا تجربہ کیا ہے۔

عبادت وریاضت کے اس ذوق کے ساتھ بلند اخلاقی، وسیع القلبی، مرتبہ شناسی، عیب پوشی، غلطی کرنے والوں سے درگذر، مخالفین کے بارے میں زبان واظہار میں احتیاط، چھوٹوں

پر شفقت، دوستوں اور ہم عمروں سے مروت، بڑوں اور بزرگوں کا پاس ولحاظ، بیماروں سے ہمدردی، مظلوموں اور کمزوروں کی مدد کا جذبہ، علم کی قدر افزائی اور اختلاف فکر ونظر کے باوجود رواداری کے اتنے مظاہر اور واقعات چشم خیال کے سامنے ہیں کہ اس مختصر تحریر میں ان کا ذکر ممکن نہیں ——— میں نے ان میں خصوصیت سے یہ کیفیت دیکھی کہ اجنبی دور سے دیکھ کر سہم جاتا؛ لیکن جوں جوں قربت ہوتی جاتی، محبت گھر کرتی جاتی اور یوں خیال ہو؛ تا کہ کوئی مسئلہ اجتماعی ہو یا انفرادی، دینی ہو یا دنیوی، حل نہ ہو سکا تو حل کی آخری منزل تو آپ کی ذات ہے ہی!

واقعہ ہے کہ بہتوں کو دیکھنے کا موقع ملا؛ لیکن جو عالمانہ وقار آپ کے اندر دیکھا، شاید کہیں اور نظر نہیں آیا اور جس شفقت ومحبت کا احساس آپ سے پایا، کسی سے نہ پایا، آج بھی صورت نگاہوں میں ہے، کشادہ جبیں، سرخ وسپید رنگ، سفید اور گھنی داڑھی، بڑی آنکھیں، بلند ناک، سر بڑا، قد دراز، دل کی طرح سینہ بھی فراخ، جسم لحیم وشحیم، پیشانی پر سجدہ کا ہلکا سا نشان، سفید وشفاف دانت، رُخسار پر چیچک کے ایک دو ہلکے نشان، سر پر سفید عمامہ یا دو پلوں کی کھڑی ٹوپی، سفید کرتا، اور کبھی کبھی اس پر شیروانی، چلنے میں وقار اور بولنے میں ٹھہراؤ اور قرار، ہاتھ میں عصا اور آنکھوں پر چشمہ، پورا وجود تقدس اور وقار کی تصویر اور اپنے قول وعمل سے دین وشریعت کی تنویر۔

رحمه الله رحمةً واسعةً۔

❁ ❁ ❁

مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ — کچھ ناقابل فراموش یادیں

بچپن کی بات ہے، شاید سات آٹھ سال کی عمر رہی ہو، جمعہ کا دن تھا، ایک روز پہلے ہی سے دروازے اور صحن کی صفائی جاری تھی اور گھر میں ہماہمی کا ماحول تھا، میری دادی مرحومہ (جو شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن صاحبؒ سے بیعت تھیں اور جن سے میں نے قرآن مجید کے ابتدائی چند پارے پڑھے ہیں) زیادہ تر نماز اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہتی تھیں، میری والدہ، چچی اور گھر میں کام کرنے والی خادمہ پکوان کیا کرتی تھیں؛ لیکن آج خلافِ معمول خود میری دادی بھی کھانا پکانے میں مصروف تھیں، لوگوں سے پوچھا کہ ماجرا کیا ہے؟ بتایا گیا کہ آج ''حضرت مولانا'' آرہے ہیں، ہمارے خاندان میں کئی ممتاز علماء رہے ہیں؛ لیکن ان سبھوں کو مولوی کہا جاتا تھا، خود قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کو لوگ 'مولوی مجاہد' ہی کہتے تھے، جو ممتاز اور سن رسیدہ علماء ہوتے ان کو مولانا کہا جاتا؛ لیکن جب مطلق مولانا یا حضرت مولانا کہا جاتا تو حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ہی مراد ہوتے اور قاضی صاحب کی وجہ سے گھر میں اکثر ان کا ذکر خیر ہوتا رہتا تھا۔

دن کے دس بجے ہوں گے، دیکھا کہ ایک قافلہ چلا آرہا ہے، اس زمانے میں دیہات وقریہ جات میں موٹر بہت کم چلتی تھی، قریب کا سفر رکشا اور دور کا بیل گاڑی سے طے ہوتا تھا اور ٹائر گاڑی زیادہ آرام دہ اور باوقار سواری سمجھی جاتی تھی، آگے آگے ٹائر گاڑی پیچھے دو تین بیل گاڑیاں، کچھ سائیکل سوار اور لوگوں کی ایک خاصی تعداد پیادہ پا، زیادہ تر پڑھے لکھے، سنجیدہ، متین اور سفید پوش، نیز تقریباً چالیس پچاس مولوی حضرات بھی اس قافلہ میں شریک تھے، ٹائر گاڑی پر جو بزرگ بیٹھے تھے، دیکھتے ہی ان کی طرف نگاہ کھینچتی تھی اور دل کوشش ہوتی تھی، اونچا قد، گٹھا ہوا لحیم وشحیم جسم، چہرہ سرخ وسپید، گھنی اور بڑی سفید داڑھی، سر پر عمامہ، جسم پر عبا

اور ہاتھ میں عصا، وقار ومتانت ایک ایک ادا سے ظاہر اور جمال وجلال کی ملی جلی کیفیت چہرہ مہرہ سے ہویدا — یہ شخصیت تھی امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی اور یہ پہلا موقع تھا جب انھیں دیکھنے کا موقع ملا۔

ہجوم وازدحام ایسا تھا کہ ہم جیسے بچوں کے لئے قریب پہنچنے کا کوئی موقع نہیں تھا، لوگوں کی کثرت اور مسجد کے ناکافی ہونے کو دیکھتے ہوئے جناب دبیر احمد صاحب مرحوم (جو میرے رشتہ کے دادا ہوتے تھے) کے بڑے اور مستطیل دروازہ کے سامنے کشادہ صحن میں شامیانے نصب کئے گئے، لوگ اتنے تھے کہ صحن کے علاوہ آزو بازو کے راستے بھی نمازیوں سے بھر گئے، مغربی سمت میں جامع مسجد کا چوبی منبر رکھا گیا، خطبہ سے پہلے مولانا اس منبر پر کھڑے ہوئے اور قریب نصف گھنٹہ خطاب فرمایا، پھر جمعہ کا خطبہ دیا، اس کے بعد نماز پڑھائی، خطاب میں کیا فرمایا؟ یہ تو یاد نہیں اور نہ ایسی باتوں پر توجہ دینے کا اس وقت زیادہ شعور تھا؛ لیکن اتنا خوب یاد ہے کہ پورا مجمع گوش برآواز اور عقیدت واحترام کے جذبہ سے سرشار تھا، ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بادشاہ اپنی رعایا کو خطاب کر رہا ہو اور تھے بھی تو بادشاہ، کہ امیر شریعت تھے، وہ اصل میں مدرسہ قاسم العلوم حسینہ دوگھرا کی دعوت پر آئے تھے، وہیں سے ایک دن کے لئے میرے قصبہ جالے (ضلع دربھنگہ) تشریف لائے، شب میں میرے ہی غریب خانہ پر قیام رہا، لوگوں کا تانتا بندھا ہوا تھا، ملاقات کرنے والوں اور دُعاء کی درخواست کرنے والوں کا، تعویذ لینے والوں اور بیعت کرنے والوں کا۔

اس کے چند دنوں بعد مجھے میزان الصرف شروع کرائی گئی اور دو تین سال کے بعد جب میں ہدایۃ النحو پڑھنے لگا تو قاضی صاحبؒ کی رائے پر جامعہ رحمانی مونگیر میں داخلہ ہوا، مولانا رحمانیؒ کا معمول مغرب سے عشاء تک خطوط لکھانے کا تھا، عشاء کی اذاں ہوتی تو وضو کرتے اور وضو کر کے سیدھے مسجد تشریف لے جاتے، وضو کے وقت کچھ طلبہ بھی آجاتے، کوئی پانی رکھ دیتا، کوئی پاؤں پر پانی ڈالنے میں مدد کرتا، کوئی تولیہ پیش کرتا اور کوئی جوتی سیدھی کر کے

سامنے رکھ دیتا، مختلف طلبہ اپنی سعادت سمجھ کر اس وقت پہنچ جاتے، ان پہنچنے والوں میں ایک میں بھی ہوتا، قاضی صاحبؒ کی نسبت سے تعارف بھی ہو گیا تھا؛ اس لئے میرے ساتھ خصوصی شفقت کا معاملہ فرماتے، کہیں سے آم یا نیا پھل آتا تو تلاش کر کے بلواتے اور عنایت کرتے، مولانا محمد ولی رحمانی صاحب نے جب انٹر یا بی، اے، پاس کیا تو مولانا نے مٹھائی منگوائی اور اساتذہ کو تقسیم کیا، عصر کے بعد اپنے برآمدے میں چہل قدمی کر رہے تھے اور میں کسی قدر دور سے گذر رہا تھا، آواز دی: ''یاولد، یاولد'' میں آیا تو مٹھائی عنایت فرمائی۔

بار بار آمد و رفت کی وجہ سے میں کسی قدر بے تکلف بھی ہو گیا تھا؛ بلکہ بہت سے اساتذہ سے بڑھ کر، ایک بار مجھے مٹھائی کا ایک ٹکڑا عنایت کیا، میں نے کہا: ''**خلقنا من کل شئ زوجین**'' تو مسکرانے لگے اور ایک ٹکڑا اور دے دیا، میں نے پھر عرض کیا: **اللہ وتر ویحب الوتر**'' ہنسنے لگے اور فرمایا کہ ایک مٹھائی واپس کر دو، پھر مزید ایک ٹکڑا عنایت فرمایا، طلبہ کے ساتھ مولانا کی بڑی شفقت ہوتی، ہمیشہ انھیں ''بچو!'' کہہ کر پکارتے، کسی کی تکلیف اور پریشانی سامنے آتی تو بے چین ہو جاتے، مختلف طلبہ محسوس کرتے کہ آپ کو سب سے زیادہ محبت ان ہی سے ہے، ایسا ہی سمجھنے والوں میں میں بھی تھا، جس سال میں ہدایہ اولین یا مشکوٰۃ شریف پڑھ رہا تھا، بخار میں مبتلا ہوا اور بخار اتنا طویل ہوتا گیا کہ کمزوری بھی حد سے بڑھ گئی، آپ سفر پر تھے، منتظمین نے مجھے علاقہ کے ایک طالب علم کے ساتھ گھر بھیج دیا، گھر پہنچنے کے بعد بھی ایک ڈیڑھ ماہ ڈاکٹروں کا تختۂ مشق بنا رہا، تشخیص الگ الگ اور اسی لحاظ سے دوائیں جدا جدا، مولانا جب سفر سے واپس آئے تو مجھے نہ پا کر میرے بارے میں دریافت کیا اور یہ ان کی بڑائی اور اعلیٰ ظرفی ہے کہ مجھ جیسے گمنام طالب علم کو انھوں نے خود خط لکھا، یہ خط کیا تھا! اس کے ایک ایک لفظ سے محبت اور شفقت کا اظہار ہوتا تھا، تاسف اور فکر مندی بھی، دُعائیں بھی، نیک تمنائیں بھی اور اس خواہش کا اظہار بھی کہ آں عزیز خانقاہ آجائیں، میں اپنی نگرانی میں آپ کا علاج کراؤں گا، میرے والد مرحوم خط دیکھ کر بڑے متاثر ہوئے، مولانا کا ذکر خیر کرتے رہے اور مجھ سے فرماتے رہے کہ مولانا کا تم پر بہت حق ہے، اسے یاد رکھنا، اس زمانہ میں مولانا رحمانیؒ اور مولانا

سید اسعد مدنیؒ کے درمیان زیادہ موافقت نہ تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہونے کی وجہ سے والد صاحب کا جھکاؤ مولانا سید اسعد مدنیؒ کی طرف تھا، مولانا رحمانی کے بارے میں کوئی مخالفانہ بات تو نہیں بولتے؛ لیکن کچھ زیادہ میلان بھی نہیں تھا؛ مگر اس خط نے انھیں پگھلا کر رکھ دیا اور وہ ان کی اعلیٰ ظرفی، وسیع القلبی اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت سے بے حد متاثر ہوئے۔

جب میں ہفتم عربی میں تھا تو انجمن طلبہ کے سالانہ جلسہ کے لئے میں نے ''شرعی پنچایت — فقہ حنفی اور فقہ مالکی'' کے عنوان سے ایک مقالہ لکھا، جو آٹھ دس صفحات پر مشتمل تھا، اس مقالہ میں دارالکفر میں نظام قضاء کے قیام پر فقہ حنفی کی تصریحات اور ہندوستان میں اس کا ممکن العمل ہونا، فقہ مالکی میں شرعی پنچایت سے متعلق شرائط اور ان کی تکمیل کی دشواریاں، نیز ایک مذہب فقہی سے دوسرے فقہی مسلک کی طرف عدول کی شرائط اور اس مسئلہ میں ان کے فقدان پر گفتگو کی گئی تھی، امیر شریعت جلسہ کے صدر تھے، اساتذہ کرام نے تو اس کی خوب داد دی ہی، امیر شریعت نے بھی بڑی حوصلہ افزائی فرمائی، مقالہ پڑھتے وقت بھی اور اپنے صدارتی کلمات میں بھی۔

واقعہ ہے کہ ان میں چھوٹوں کا حوصلہ بڑھانے کا خاص مزاج تھا اور اپنی ذاتی زندگی میں خود مجھے متعدد بار اس کا تجربہ ہوا، ایک زمانہ میں علی گڑھ کا اقلیتی کردار سلب کرلیا گیا تھا، اس سلسلہ میں تحریک چل رہی تھی، اس تحریک میں یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کے ذمہ داران بھی جگہ جگہ کا سفر کررہے تھے، یہ وفد مونگیر بھی آیا، ٹاؤن ہال میں بہت بڑا جلسہ ہوا، جناب اختر الواسع (موجودہ صدر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز جامعہ ملیہ دہلی) نے بڑا ہی مؤثر اور مرصع خطاب کیا، جس کی تعریف ہر شخص کی زبان پر تھی، بعد کو یہ وفد آپ کی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا، اتفاق سے میں بھی آیا اور پیچھے بیٹھ گیا، امیر شریعت نے ہمیں قریب بلایا اور ان لوگوں سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا: یہ ہمارے اختر الواسع ہیں، ایک بار حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے داماد مولانا

سید رشید الدین حمیدیؒ اور مولانا رحمت اللہ صاحبؒ تشریف لائے، یہ تشریف آوری اچانک تھی، امیر شریعت کی رائے تھی کہ کسی طالب علم کی بھی تقریر ہو، مولانا نے اچانک میرے نام کا اعلان کرادیا، میں بہت گھبرایا مگر اُٹھے بغیر چارہ نہیں تھا، میں نے مولانا رحمانی اور حضرت مدنی کے تعلقات اور قادیانیت اور فتنہ ارتداد کے سد باب میں مولانا مونگیری اور خانقاہ رحمانی کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے دس پندرہ منٹ کچھ عرض کیا، یہ کیسے عرض کر پایا، مجھے خود اس پر حیرت ہے، مولانا رحمت اللہ صاحبؒ نے بار بار میری اس ٹوٹی پھوٹی تقریر کا حوالہ بھی دیا، امیر شریعت بہت خوش ہوئے، بعد کو مجھ سے حوصلہ افزائی کے کلمات بھی کہے اور بار بار دُعائیں بھی دیتے رہے۔

ایک دفعہ مونگیر سے قریب کھڑ کپور میں جلسہ تھا، مولانا کی طبیعت علیل تھی، تعلیم کے شباب پر ہونے کی وجہ سے اساتذہ کے ساتھ جانے کا موقع نہیں تھا، مولانا نے مولانا عبدالسبحان رحمانی (استاذ جامعہ رحمانی مونگیر، جو مجھ سے ایک سال سینئر تھے) اور مجھ کو اپنے ساتھ لے گئے، ہم دونوں کی تقریر کرائی، اخیر میں خود مختصر خطاب فرمایا، راستہ میں ہم لوگوں کی اصلاح اور فائدہ کی باتیں بھی کہتے رہے، پھر جب واپس آئے تو تنہائی میں بلاکر پانچ روپے عنایت فرمائے، میں لینے سے گریز کر رہا تھا؛ لیکن آپ کے اصرار پر لے لیا — ایک بار میں امتحان ہال میں تھا، میں کوئی پرچہ لکھ رہا تھا، جس میں جہاد کے کسی واقعہ کو لڑائی کرنے سے تعبیر کیا گیا تھا، آپ نے میری کاپی اُٹھائی، ایک نظر ڈالی، اس تعبیر پر آ کر رُک گئے اور فرمایا کہ ''جہاد'' نہ کہ لڑائی، لڑائی اور جہاد میں بڑا فرق ہے، لڑائی مذموم فعل ہے اور جہاد ایک عبادت ہے اور قانونی عمل ہے۔

جب دورہ حدیث کا سال آیا تو مؤطا امام مالک کا درس آپ سے متعلق ہوا، یہ درس فجر کے بعد متصلاً آپ کے حجرہ میں یا حجرہ سے متصل اندرونی برآمدہ میں ہوا کرتا تھا، عام طور پر عبارت میں پڑھتا تھا، مولانا نے شروع میں کتاب اور مصنف کے بارے میں ایک گونہ تفصیل سے گفتگو فرمائی، پھر حدیثوں پر مختصر گفتگو کرتے اور خاص طور پر موعظت کے پہلو کو اُجاگر

فرماتے، کوئی ایک ماہ درس ہوا ہوگا؛ لیکن اس میں تعلیم کے علاوہ تربیتی فوائد بہت حاصل ہوئے، جماعتی زندگی کس طرح گزاری جائے، عوام کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے، بزرگوں کے رہن سہن کا کیا انداز تھا؟ آپ ان پہلوؤں پر توجہ دلاتے اور آئندہ کے کاموں کے سلسلہ میں طلبہ کی ذہن سازی کرتے اور اپنے اساتذہ کا بھی خوب ذکر خیر فرماتے، دارالعلوم کے مشہور اساتذہ مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ اور مولانا اعزاز علی صاحبؒ کے علاوہ مفتی محمد شفیع صاحبؒ کا بڑی محبت سے ذکر فرماتے، مفتی صاحبؒ کے طریقۂ تدریس نیز تمام سلف صالحین کے احترام وتوقیر کے سلسلہ میں انھیں بہت سراہتے اور جب ان کا ذکر کرتے تو ''میرے محبوب استاذ'' کا لفظ بھی کہتے۔

جس سال ہم لوگ دورۂ حدیث میں پہنچے تو میرے خاص استاذ حضرت مولانا سید شمس الحق صاحبؒ (۱) (جن کے درس کی محدثانہ عدل گستری اور ولی اللہی وسیع النظری نے مجھے بہت متاثر کیا) سے فرمایا کہ اس سال آپ کی جماعت میں زندگی رہے گی، خوب توجہ دیجئے گا؛ کیوں کہ اس میں خالد بھی ہے، مولانا نے فرمایا کہ ہاں؛ لیکن مجھے ان سے ایک سخت شکایت ہے کہ وہ فجر کے بعد کے سبق میں اونگھتے بہت ہیں، مولانا شمس الحق صاحب — جو بہت ہی نیک، صالح طینت اور متبع سنت نیز تمام فنون پر حاوی استاذ تھے — خود ہی مجھ سے سبق میں اس کو بیان فرمایا کہ حضرت نے تمہارے بارے میں یوں کہا تھا؛ لیکن میں نے تمہاری فلاں شکایت کی ہے۔

مونگیر کے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ بھلائے نہیں بھولا جاتا، جو لطیفہ بھی ہے اور مولانا رحمانیؒ کی خوش اخلاقی کی ایک مثال بھی، ایک سال ایسا ہوا کہ شعبان میں والد صاحب مرحوم نے منی آرڈر کے ذریعہ کرایہ کی رقم روانہ فرمائی، منی آرڈر پہنچنے میں کسی قدر تاخیر ہوئی، سالانہ امتحان ختم ہوگیا، ارادہ تھا کہ ایک دو روز رُک جاؤں گا، پیسے آجائیں تو رختِ سفر باندھوں گا؛ لیکن تعطیل ہوتے ہی طلبہ نے بستر باندھا اور ایسا لگا کہ آج شام سے کل صبح تک پورا

---

(۱) ۱۳؍ذوقعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵؍نومبر ۲۰۰۷ء کو مولانا کی وفات ہوگئی۔

مدرسہ خالی ہو جائے گا، کمرہ کے تمام رفقاء رُخصت، جماعت کے تمام ساتھی روانہ، اس منظر نے آتش شوق کو اور بھڑکا دیا کہ جلد سے جلد گھر پہنچا جائے، طلبہ کا تو کیا ذکر اساتذہ کے پاس بھی اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ آدمی ان سے قرض لے اور پھر کبھی کسی سے قرض لیا بھی نہیں تھا؛ اس لئے طبیعت میں حجاب بھی تھا، سوچ سوچ کر میں اور میرے بھانجے عزیزی ڈاکٹر سید حسنین احمد ندوی قاسمی (حال مقیم ابوظہبی) آپ کے پاس حاضر ہوئے، مجلس میں مختلف لوگ موجود تھے، باتیں ہوتی رہیں، ہم لوگ پیچھے بیٹھے رہے، جب ایک ایک کر کے سارے لوگ اُٹھ گئے اور پھر بھی ہم لوگ جم کر بیٹھے رہے تو امیر شریعتؒ نے منشاء معلوم کیا، پیسوں کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی اور زبان کھولے نہیں کھلی؛ لیکن کچھ جواب دینا تھا؛ اس لئے میں بول پڑا کہ تعویذ لینا ہے، آپ نے استفسار فرمایا: کس چیز کا تعویذ؟ اب میرے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا؛ کیوں کہ درحقیقت نہ تعویذ لینا تھا اور نہ گھر سے اس کا مطالبہ آیا تھا، میں کچھ جواب نہیں دے سکا، آپ مسکرائے، دریافت فرمایا: چھٹی ہوگئی ہے؟ میں نے عرض کیا: جی ہاں! پھر پوچھا: کرایہ نہیں آیا ہے؟ میں نے عرض کیا: منی آرڈر روانہ ہو چکا ہے؛ لیکن پہنچا نہیں ہے، پھر دریافت فرمایا: ٹکٹ اور اخراجات کتنے ہوتے ہیں؟ اس زمانہ میں ہاف ٹکٹ اور کچھ کھاتے پیتے چار روپیہ میں ہم لوگ مونگیر سے اپنے گاؤں (جالے، ضلع دربھنگہ، بہار) پہنچ جاتے تھے، میں نے یہی بات عرض کی، آپ نے پانچ پانچ روپئے کے دو نوٹ نکالے، ایک مجھے عنایت فرمایا اور ایک عزیزی حسنین سلمہ کو، اور ہنستے ہوئے فرمایا کہ اس وقت آپ کو اسی تعویذ کی ضرورت ہے، ہم لوگوں نے مصافحہ کیا اور شکر گذاری اور شرمساری کے ملے جلے احساسات کے ساتھ واپس آئے، اس وقت ان روپیوں سے جو مسرت ہوئی، اس کا اندازہ بھی نہیں کیا جا سکتا، اب تک یہ واقعہ آنکھوں میں ہے اور بے ساختہ دل سے دُعاء نکلتی ہے کہ الٰہا! تیرے بندے نے جس طرح کتنے ہی ضرورت مندوں کو بامرام و شادکام کیا ہے، اسی طرح تو بھی اپنے اس عبد صالح کو تا ابد اپنی رحمتوں اور عنایتوں کے سایہ میں رکھ۔

مولانا رحمانیؒ کے روزمرہ کے معمولات بالکل متعین سے تھے اور وقت کی حفاظت کا

اس قدر اہتمام تھا کہ کم ہی اس کی مثال ملے گی ، روزانہ شب کے تین ساڑھے تین بجے بیدار ہوتے ، وضو کرتے ، تہجد پڑھتے ، ذکر فرماتے ، فجر کی اذاں کے بعد ہاتھ میں عصا لئے ہوئے اور ٹھنڈک کے موسم میں گرم عبا پہنے اور رومال باندھے ہوئے اساتذہ اور طلبہ کے کمروں کے سامنے سے گذرتے اور نماز کی طرف متوجہ کرتے جاتے ، طلبہ کو بیدار کرنے کے لئے کمرہ کے اندر داخل نہیں ہوتے ؛ بلکہ دروازہ پر دستک دیتے اور ''بچو! اُٹھ جاؤ ، بچو! اُٹھ جاؤ'' کی صدا لگاتے ، آپ کی آواز سنتے ہی تمام طلبہ اُٹھ کھڑے ہوتے ، فجر کی نماز کبھی خود پڑھاتے ، کبھی حافظ ظہور احمد صاحب مرحوم اور بعض دفعہ اونچی جماعت کے کوئی خوش آواز مجود حافظ طالب علم ، آپ کی قرأت کا لحن کان میں رس بھرتا ، جن آیتوں میں استفہام یا ندا ہو ، ان کو اس طرح پڑھتے کہ لب و لہجہ سے بھی استفہام اور ندا کا اظہار ہوتا ، نماز کے بعد تھوڑی دیر مسجد میں ہی گھومتے رہتے ؛ تاکہ تمام اساتذہ اور طلبہ تلاوت میں مصروف رہیں ، پھر اندر تشریف لے جاتے ، سبق ہوتا تو پڑھاتے ، جن لوگوں کو خصوصی ملاقات کرنی ہوتی ، انھیں وقت دیتے ، اسی درمیان بسکٹ کے ساتھ چائے دی جاتی ، سبق کے لئے آنے والے طلبہ بھی اس چائے نوشی میں شریک رہتے ، ساڑھے سات آٹھ بجے ناشتہ کا معمول تھا ، جس میں واردین بھی ساتھ ہوتے تھے اور گاہے اساتذہ بھی ، ناشتہ کے بعد دوپہر تک لوگوں سے ملاقات ، تعویذ کے خواہش مندوں کو تعویذ دینا اور وقت بچا تو حسبِ ضرورت کچھ لکھانا ، یا کسی سے مشورہ کرنا ہوا تو مشورہ کرنا ؛ لیکن عام طور پر واردین کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی کہ زیادہ تر یہ پورا وقت ان کی ملاقات میں گزر جاتا ، دوپہر بارہ بجے کے آس پاس کھانا تناول فرماتے ، ظہر تک قیلولہ کرتے اور ظہر کی نماز ادا کرنے کے بعد پھر بیٹھ جاتے ، عصر تک مختلف ملکی و ملی مسائل پر تبادلہ خیال ہوتا ، کبھی کوئی علمی تحریر لکھاتے ، خصوصی مہمانوں کو ملاقات کے لئے وقت دیا جاتا ۔

عصر کی نماز کے بعد مجلس ہوتی ، جس میں اساتذہ اور خواص شریک ہوتے ، کبھی کبھی ہم جیسے طلبہ بھی آگے پیچھے بیٹھ جاتے ، اس میں لوگ متنوع قسم کے سوالات کرتے اور آپ اس کے جوابات دیتے ، بعض دفعہ بزرگوں کے واقعات سناتے ، کبھی ہلکے پھلکے لطائف کا ذکر آجاتا ،

تمام حاضرین کو چائے پیش کی جاتی، جو اکثر پودینہ اور دارجلنگ کی نفیس پتی کی وجہ سے بڑی لذیذ اور خوشبودار ہوتی، مغرب کے بعد ڈاک کا جواب لکھاتے، جواب لکھانے کا ایک حیرت انگیز طریقہ یہ تھا کہ بیک وقت تین تین خوش رقم افراد خطوط لکھتے رہتے اور آپ انھیں ایک ساتھ الگ الگ خطوط لکھاتے، کسی میں کسی شرعی مسئلہ کا حل ہوتا، کسی خط میں ملی مسائل سے متعلق گفتگو ہوتی اور کسی میں تعویذ اور دُعاء کا ذکر ہوتا؛ لیکن کیا مجال کہ ایک دوسرے سے التباس ہوجائے، جس خط کا مضمون جہاں سے چھوڑا ہے، وہیں سے آگے لکھاتے، خط کی زبان بہت سلیس، رواں اور خوبصورت ہوتی۔

راقم الحروف جب جامعہ رحمانی سے فارغ ہوکر مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے حسب مشورہ دیوبند گیا تو چند ہی روز گذرے تھے کہ پہلی شوریٰ کے اجلاس میں شرکت کے لئے امیر شریعتؒ تشریف لائے، وہ مہمان خانہ کی قدیم عمارت میں گیٹ کے بالکل سامنے والے کمرہ میں قیام فرماتے تھے اور انھیں کا کمرہ معزز ارکان شوریٰ، اساتذہ کرام اور ضرورت مند عملہ وطلبہ کے لئے مرکز ہوتا تھا، اس وقت دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ میں پورے ملک کا دل ودماغ جمع تھا اور ہر رکن اپنی ذات سے ایک انجمن تھا؛ لیکن خود اس مجلس شوریٰ کا دماغ مولانا رحمانیؒ تھے، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا محمد منظور نعمانی—— جو مسائل کو طے کرنے میں پیش پیش رہتے تھے —— بار بار آپ کے کمرہ میں تشریف لاتے تھے۔

دیوبند میں میرے داخلہ کو ابھی ماہ ڈیڑھ ماہ ہوا تھا اور اساتذہ سے بھی تعارف نہیں تھا، اس سال جامعہ رحمانی میں دورۂ حدیث میں تقریباً ۹۷ فیصد نمبر حاصل ہوا تھا، جو دورہ کے قیام کے بعد اس وقت تک غالباً سب سے زیادہ نمبر کا ریکارڈ تھا، اب امیر شریعت کی بڑائی اور خورد نوازی یہ تھی کہ وہ دیوبند میں ہر ملنے والے سے میرا تعارف کراتے اور میرے نمبرات کا خاص طور پر ذکر فرماتے، مجھے شرمندگی بھی ہوتی اور ڈر بھی لگتا کہ اگر کہیں اس تعریف کے جواب میں لوگوں نے سوال کرنا شروع کردیا تو میری جہالت آشکارا ہوجائے گی اور مولاناؒ کا حسن ظن بھی

جاتا رہے گا، اتفاق کہ مولانا محمد منظور نعمانیؒ سے جب امیر شریعت نے تعارف کرایا تو انھوں نے چند سوالات کر لئے، یہ سارے سوالات حدیث کی حجیت اور انکار حدیث سے متعلق تھے، ہماری خوش قسمتی یہ ہے کہ ان ہی دنوں میں نے مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی تدوین حدیث، مولانا بدرعالم میرٹھیؒ کی ترجمان السنۃ کا مقدمہ اور شیخ سباعیؒ کی ''السنۃ ومکانتہا فی التشریع الاسلامی'' کا مطالعہ کیا تھا؛ اس لئے ان کے سوالات کا مناسب جواب دے پایا، مولانا نعمانی بہت خوش ہوئے اور بیس روپے انعام بھی عنایت فرمائے، حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس جواب اور انعام پر جتنی خوشی ہوئی، غالباً اس سے زیادہ مسرت امیر شریعت کو ہوئی، جس کا ان کے چہرے کے نقوش سے اظہار ہوتا تھا۔

اسی تعارف میں ایک لطیفہ یہ ہوا کہ طحاوی کا سبق مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ کے یہاں عشاء کے بعد ہوا کرتا تھا، درس مفصل اور مدلل ہوتا تھا اور مولانا کی شان خطابت اس میں اور بھی رنگ بھر دیتی تھی، امیر شریعت نے مجھ سے فرداً فرداً ہر استاذ کے درس کے بارے میں پوچھا، میں نے حضرت مولانا محمد شریف حسین دیوبندیؒ (بخاری وترمذی) حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ (ابوداؤد شریف) اور شاہ صاحبؒ (طحاوی) کے درس کی تعریف کی؛ لیکن امیر شریعت کے آنے سے ایک دن پہلے یہ واقعہ پیش آیا کہ میں نے طحاوی کے درس میں ایک سوال لکھ کر دیا اور سامنے ہی بیٹھا ہوا تھا، یہ سوال 'تحفۃ الاحوذی' یا 'بدایۃ المجتہد' سے اخذ کیا گیا تھا؛ چوں کہ میں ایک سال پہلے بھی دورہ پڑھ چکا تھا؛ اس لئے اس سال حنفیہ کی شروح میں عینی اور فیض الباری اور دوسرے مذاہب کی شروح میں فتح الباری اور تحفۃ الاحوذی نیز اسباب اختلاف میں بدایۃ المجتہد کا بڑے اہتمام سے مطالعہ کرتا تھا، اس وقت کتب حدیث کی تقسیم کے سلسلہ میں اساتذہ میں کچھ آویزشیں بھی تھیں، شاید اسی پس منظر میں شاہ صاحب کو خیال ہوا کہ کسی نے اس کو اعتراض کے لئے تیار کر کے بھیجا ہے، مولانا نے ایک نظر پرچی پر ڈالی اور فرمایا کہ میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس پردہ زنگاری میں کون چھپا ہے؟ مجھے بڑی شرمندگی ہوئی اور اپنے آپ میں ملامت بھی کہ میرا سوال استاذ کے ئے باعث تکدر ہوا۔

اتفاق سے اس کے چند ہی دنوں پہلے ان کے درس میں ایک اور بات پیش آئی کہ حضرت الاستاذ نے علامہ ابن تیمیہؒ کے افکار پر تفصیل سے گفتگو کی اور علامہ کے سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی تحسین واعتراف کا بھی ذکر کیا اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کی اسی درجہ تنقید واختلاف کا بھی اور اخیر میں کہا کہ ممکن ہے علامہ ابن تیمیہؒ کی بعض وہ کتابیں مولانا حسین احمد مدنیؒ کے ہاتھ آئی ہوں، جو علامہ کشمیریؒ تک پہنچ نہ پائی ہوں، شاہ صاحب نے اپنے خطاب میں یہ بات بھی کہی کہ مولانا مودودی پر علامہ ابن تیمیہؒ کے افکار کی چھاپ ہے، میں شاہ صاحب کی بائیں طرف پہلی بنچ پر بیٹھا ہوا تھا؛ چوں کہ ان کو درسگاہ آنے میں کسی قدر تاخیر ہو جاتی تھی، اس لئے مطالعہ کی غرض سے ابن تیمیہ کی ''رفع الملام'' رکھے ہوا تھا، سبق شروع ہوا تو کتاب طحاوی کے بیچ میں رکھ دی، جب درس ختم ہوا اور میں نے کتاب اُٹھائی تو ''رفع الملام'' نیچے گر گئی اور بعض شر پسند لڑکوں نے علامہ ابن تیمیہؒ کا مولانا مودودی سے رشتہ جوڑتے ہوئے مجھے مودودی کہنا شروع کر دیا، اتفاق کہ دوسرے دن شاہ صاحب کے درس میں برسبیل تذکرہ مولانا مودودی کا ذکر چل نکلا اور انھوں نے بہت تفصیل سے ان کے افکار پر تبصرہ فرمایا، اس سے مجھے خیال ہوا کہ شاید بعض لڑکوں نے مولانا کو غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے۔

امیر شریعت سے شاہ صاحب کے درس کے بعض پہلوؤں کی تعریف کرتے ہوئے میں نے ان واقعات کا ذکر کر دیا، سوء اتفاق کہ ابھی میری بات ختم ہوئی تھی کہ شاہ صاحب تشریف لے آئے اور امیر شریعت نے بھی اسی وقت ان کو ٹوک دیا، پھر میری جامعہ رحمانی کی نسبت اور مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ کے برادر زادہ ہونے کا بھی ذکر فرمایا، اب میرا تو حال یہ تھا کہ کاٹو تو خون نہیں، شاہ صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا کہ میں تو انھیں شرح وقایہ وغیرہ کا طالب علم سمجھتا تھا، جو صرف درس سننے کو دورہ حدیث میں آ گیا ہو؛ کیوں کہ میں اس وقت پتلا دبلا اور بے ریش تھا، بات آئی گئی ہوگئی، پھر گاہے عصر کے بعد باغ کشمیری میں حضرت الاستاذ سے ملاقات ہو جاتی تو ہمیشہ مجھ سے امیر شریعت کی خیر وعافیت دریافت فرماتے۔

میں نے دیوبند پہنچنے کے بعد امیر شریعت کو خط لکھتے ہوئے برسبیل تذکرہ دیوبند کی

ٹھنڈک کا بھی ذکر کیا تھا، اب خورد نوازی اور جزئیات پر نظر کا حال دیکھئے کہ دیوبند آتے ہوئے دلی میں ہمارے لئے بہت ہی خوبصورت اونی سوئیٹر اور موزے خرید فرمائے اور جیسے ہی ملاقات ہوئی اپنے خادم مولانا عبدالرحمٰن صاحب سے فرمایا کہ خالد کے گرم کپڑے لاکر دو، جب وہ سوئیٹر اور موزے لائے تو مفلر کی کمی کا احساس ہوا، دوبارہ انھیں پیسے دیئے اور فرمایا کہ خوب گرم خوبصورت مفلر لائیے اور دیکھئے میری عمر کے لحاظ سے نہ لائیے گا، ان کی عمر کے لحاظ سے ڈیزائن منتخب کیجئے گا، میرے لئے یہ ضرورت بھی تھی اور نعمت غیر مترقبہ بھی اور دیوبند کی ٹھنڈک بھی تصور سے ماوراء تھی، اس لئے آپ کے لئے دل ہی دل میں بہت دُعاء کی اور مجھے خوب یاد ہے کہ جب میں اپنے کمرے پہنچا تو جذبۂ امتنان سے میری آنکھیں نم تھیں۔

اتفاق کہ اس سال بھی دوبارہ میری طبیعت خراب ہوئی — غالباً اس کی وجہ بھینس کا گوشت تھا — اور تقریباً تین چار مہینہ بیماری کا شکار رہا، جو بالآخر یرقان ثابت ہوا، رجب میں مجلس شوریٰ کے اجلاس کی مناسبت سے مولانا تشریف لائے اور میری کیفیت دیکھ کر ان کا چہرہ فق سا ہوگیا، سالانہ امتحان قریب تھا، اس لئے مُصر تھا کہ امتحان دے کر ہی گھر جاؤں گا، مولانا نے فرمایا کہ تم امتحان دے کر مونگیر آجاؤ، وہیں تمہارا علاج ہوگا اور مزید مجھے سفر کے اخراجات اور اضافہ کے ساتھ کچھ رقم عنایت فرمائی؛ حالاں کہ گھر سے بھی رقم آئی تھی، کچھ دنوں پہلے مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ تشریف لائے تو انھوں نے بھی رقم دی تھی؛ لیکن یہ سب پیسے علاج اور پرہیز کی نذر ہوگئے تھے، امتحان دیتے ہی پٹنہ آیا، یہاں چچی اماں کی موجودگی کی وجہ سے پرہیز کی سہولت تھی اور علاج بھی زیادہ بہتر طور پر ہوسکتا تھا، اسی لئے امیر شریعت سے فون پر اجازت لے کر ایک ڈیڑھ ماہ قاضی صاحبؒ کے پاس ہی میں مقیم رہا، وہ بھی برابر خبر گیری کرتے رہے، عید گھر پر کی اور مونگیر پہنچا، صحت میں بہتری دیکھ کر بہت خوش ہوئے، اس وقت ''ادارۃ المباحث الفقہیہ جمعیۃ علماء ہند'' کے ذمہ دار حضرت مولانا محمد میاں صاحب دیوبندیؒ تھے، انھوں نے دو سوال نامے جاری فرمائے تھے، ایک خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق؛ کیوں کہ ایمرجنسی میں سنجے گاندھی کی مہم جوئی کی وجہ سے یہ موضوع بڑی اہمیت اختیار کر گیا تھا، دوسرے

ایسے علاقوں میں نمازوں کی ادائیگی کا مسئلہ، جہاں بعض نمازوں کے اوقات نہیں آتے ہوں، مجھے یہ سوال نامے عنایت کیا اور فرمایا کہ ان دونوں کا تفصیلی اور مدلل جواب لکھو۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں تو آپ کا نقطۂ نظر واضح تھا ہی اور اس موضوع پر آپ کا رسالہ بھی آچکا تھا؛ لیکن اوقات نماز کے سلسلہ میں اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ اوقات شرط کے درجہ میں ہیں؛ لہٰذا جن نمازوں کا وقت نہیں آئے، وہ نمازیں فرض ہی نہیں ہوں گی، اس کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم (جو اس وقت ناظم امارت شرعیہ تھے اور اب امیر شریعت ہیں) کے نام میرے بارے میں ایک خط بھی لکھا کہ ایک سال کے لئے مطالعہ وتحقیق کی غرض سے ان کا تقرر کیا جاتا ہے اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا جاتا ہے، اس وقت بحیثیت وظیفہ یہ ایک معقول رقم تھی؛ کیوں کہ عام طور پر مدرسوں میں دو ڈھائی سو روپے تنخواہ ہوا کرتی تھی، میں نے یہ دونوں مقالے لکھے، جن میں سے ایک کسی قدر اضافہ کے ساتھ ''اسلام اور فیملی پلاننگ'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے، دوسرا مقالہ محفوظ نہیں رہا، طویل الاوقات علاقوں میں نماز کے سلسلہ میں میں نے جو موقف اختیار کیا، وہ یہ کہ اوقات کی حیثیت شرط کی نہیں؛ بلکہ علامت کی ہے اور علامت پر کسی چیز کا وجود موقوف نہیں ہوتا؛ کیوں کہ ایک علامت کی جگہ دوسری علامت لے سکتی ہے، مولانا نے میرے نقطۂ نظر کو سنا اور فرمایا کہ اس میں ہماری اور آپ کی رائے مختلف ہے اور اس میں کچھ حرج نہیں، غور وفکر اور تحقیق کے بعد جو رائے بنتی ہو، وہ امانت ہے اور اس کا اظہار کرنا چاہئے—— اختلافی مسائل میں امیر شریعت یہی مزاج اپنے متعلقین میں پیدا کرتے تھے؛ چنانچہ ان کے قریبی لوگوں میں فکری توسع اور تحملِ اختلاف کا مزاج نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔

اس سلسلہ میں مولانا رحمانی کے شورائی مزاج کا تذکرہ کرنا بھی مناسب معلوم ہوتا ہے، جو اہل علم کے لئے اُسوہ ونمونہ ہے، مولانا رحمانی کا مزاج یہ تھا کہ جب بھی کوئی اہم مسئلہ پیش نظر ہو

،خواہ شرعی ہو یا ملی اور سیاسی ، اس پر بار بار بحث کرتے ، مختلف مجلسوں میں اس مسئلہ کو اُٹھاتے ، جامعہ کے اساتذہ سے گفتگو کرتے ، دوسرے معتمد اور معتبر علماء اور اہل دانش سے مناقشہ فرماتے ، یہاں تک کہ بعض دفعہ ہم جیسے طلبہ کے سامنے بھی از راہ تربیت اس مسئلہ کو اُٹھاتے ، اپنی رائے پیش فرماتے ، اگر کوئی تائید کرتا تو اس سے تائید کے وجوہ واسباب پوچھتے ، اگر کوئی اختلاف کرتا تو اس کے نقطۂ نظر کو توجہ سے سنتے ، اس پر جرح کرتے اور اگر مخالف نقطۂ نظر معقول ہوتا تو اسے قبول بھی کر لیتے تھے، اسی شورائی مزاج اور قبول حق کے لئے ہر وقت تیار رہنے کی وجہ سے ان کی رائے بہت نپی تلی ہوتی اور عام طور پر ان کے معاصرین ان کی اصابت رائے کے معترف ہوتے ۔

مولانا رحمانی کی خواہش تھی کہ میرا تقرر ’دار العلوم دیو بند‘ میں ہو جائے ، وہ اس کے لئے بہت کوشاں تھے اور اجلاس صد سالہ کی تیاری کی وجہ سے اس وقت افراد کار کی ضرورت بھی تھی ؛ لیکن چوں کہ اس کام کے لئے دیو بند اور اس کے اطراف کے بعض فضلاء کا نام بھی آ گیا تھا ؛ اس لئے اس میں کامیابی نہیں ہو سکی اور مولانا نے مجھ سے فرمایا کہ ممکن ہے کہ اسی میں خیر ہو اور ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے تم کو وسیع تر ماحول میں کام کرنے کا موقع ملے ، اس طرح دو سال امارت شرعیہ میں رہا، ایک سال کے بعد باضابطہ شعبہ قضاء میں تقرری ہوگئی ؛ لیکن تدریس کی طرف میلان اور ہر وقت اپنے بزرگوں کے سامنے رہنے کی وجہ سے دباؤ کی کیفیت کے باعث طبیعت میں جماؤ پیدا نہ ہو سکا ، اسی دوران مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقل صاحبؒ اور ان کے خویش محبّ گرامی جناب رحیم الدین انصاری صاحب نے حیدر آباد کے لئے طلب فرمایا اور دار العلوم میں تدریس ، آندھرا پردیش امارت کے تحت کار قضاء اور ماہنامہ حسامی کی ادارت کی پیشکش کی ، مجھے ایسا لگا کہ میرے ذوق کی تینوں چیزیں اس پیشکش میں جمع ہوگئی ہیں ، اس لئے گو تنخواہ وہی تھی جو امارت شرعیہ بہار میں مل رہی تھی ؛ لیکن اس کے باوجود میں نے خاموشی سے حیدر آباد کے لئے رخت سفر باندھا اور امیر شریعت سے اس لئے عرض کرنے کی جرأت نہیں ہوئی کہ وہ یقیناً منع فرماتے اور ان کے صراحتاً منع کرنے کے بعد پھر میرا پٹنہ چھوڑنا

بڑی احسان ناشناسی کی بات ہوتی۔

میں حیدرآباد پہنچا اور چند ہی دنوں بعد حضرت والا کو معذرت اور ندامت کا خط لکھا، جلد ہی مولانا کا جواب آیا کہ آپ ماشاءاللہ عاقل، بالغ اور ذی شعور آدمی ہیں، آپ کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق حاصل تھا، اس لئے معذرت کی کوئی بات نہیں، ان فقروں میں جو ناراضگی چھپی ہوئی ہے، وہ محتاج اظہار نہیں، خط پڑھ کر میں بے چین ہوگیا اور دوسرے ہی دن ایک تفصیلی خط لکھا اور بڑی منت سماجت کے ساتھ عفو خواہ ہوا، پھر چند ہی روز میں مولانا کا جواب آیا، جس میں محبت اور تسلی کے الفاظ تھے اور ایک فقرہ یہ بھی تھا کہ آپ کی تسلی کے لئے لکھتا ہوں کہ اگر مجھے کوئی تکلیف پہنچی ہو تو میں نے معاف کیا، پھر تاکید کی کہ مولانا عاقل صاحب بھی اپنے ہی حلقہ کے آدمی ہیں، جہاں بھی کام کریں، توجہ اور دلجمعی کے ساتھ کریں، مجھے اس خط سے بے حد خوشی ہوئی اور اطمینان قلب ہوا۔

اس کے ڈیڑھ دو سال کے بعد حیدرآباد میں مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس عام ہوا، آپ کی تشریف آوری ہوئی، اس موقعہ سے مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کی خواہش پر مسلم پرسنل لا کی شرعی، فقہی اور آئینی حیثیت نیز جن عائلی مسائل پر مغرب کی طرف سے اعتراض کیا جاتا ہے، ان کے جوابات کے سلسلہ میں دوسو یا اس سے کچھ زیادہ صفحات پر ''مسلم پرسنل لا — ایک نظر میں'' کے نام سے اس حقیر کی تالیف منظر عام پر آئی تھی، مولانا مرحوم ہی نے اسے شائع فرمایا تھا، ان کی خواہش تھی کہ بورڈ کے اجلاس میں اس کی رسم اجراء عمل میں آئے، ہم دونوں کتاب لے کر امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپ نے بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، مجلس استقبالیہ نے آپ کی ایماء پر اس کے غالباً چار سو نسخے خرید کر لئے، جو اہم شخصیتوں کو تقسیم کئے گئے، پھر رسم اجراء کے سلسلہ میں آپ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے میرا تعارف کراتے ہوئے زور دے کر کہا کہ یہ رحمانی ہیں رحمانی، اور کتاب کا ایک نسخہ بھی ان کے حوالے کیا، قاری صاحبؒ نے ٹائٹل پر نظر ڈالی، جس پر میرے نام کے ساتھ قوسین میں

''فاضل دیوبند'' لکھا ہوا تھا اور فرمایا کہ: ''فاضل دیوبند بھی تو ہیں''؟ پھر قاری صاحبؒ کے ہاتھوں اجلاس عام میں رسم اجراء ہوئی اور خود امیر شریعت نے رسم اجراء کے ساتھ کچھ تعارفی کلمات ارشاد فرمائے، نتیجہ یہ ہوا کہ تمام نسخے ہاتھوں ہاتھ نکل گئے اور چند ہی نسخے ریکارڈ کے طور پر باقی رہ پائے۔

حیدرآباد میں چند سال کے بعد دوسرا سفر ''بورڈ کے اجلاس منعقدہ چنئی'' کے بعد ہوا، ورنگل میں دارالقضاء کا قیام اور حیدرآباد میں تحفظ شریعت کا جلسہ تھا اور مولانا رحمانی بہت مصروف تھے، اس وقت تک حیدرآباد کے مضافات (بارکس، کوتہ پیٹ) میں میرا مکان بن چکا تھا، امیر شریعت نے قاضی صاحبؒ سے خواہش کی کہ میں کچھ دیر کے لئے خالد کے یہاں جاؤں گا؛ البتہ پہلے خبر نہ ہو، ورنہ تکلف میں پڑ جائے گا، قاضی صاحب نے خاموشی سے مجھے اطلاع کردی اور مولانا محمد رضوان القاسمی صاحب مرحوم اپنی جیپ سے امیر شریعتؒ کو لے کر میرے غریب خانہ پر پہنچے، ایک تو یہ جیپ خود بہت فرسودہ قسم کی تھی، جو امیر شریعت کے شایانِ شان ہرگز نہیں تھی، پھر میرا مکان امیر شریعت کے جائے قیام سے بہت دور شہر کے بالکل کنارے، ایک گاؤں نما محلّہ میں، پھر اس وقت میری نہ کوئی حیثیت اور نہ کوئی تعارف؛ لیکن یہ ان کی شفقت اور بڑائی تھی کہ ان سب کو جھیلتے ہوئے یہاں تک پہنچے، میں نے صبح کے ناشتہ کا انتظام کرلیا تھا اور محلّہ کے دو چار ذمہ دار حضرات کو بھی بلا لیا تھا، جس میں خاص طور پر قابل ذکر جناب شریف غالب صاحب ہیں، مولانا نے ناشتہ کیا، دیر تک بیٹھے رہے اور پورے مکان میں گھوم کر دیکھا، میرا بڑا لڑکا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی اس وقت چھوٹا سا تھا، اسے دیر تک گود میں بیٹھائے رہے، سبھوں کو دُعائیں دیں اور محلّہ کے لوگوں سے میرے بارے میں فرمایا کہ ''ان کا آپ کے محلّہ میں قیام کرنا آپ کے لئے باعث رحمت ہے، آپ انھیں معمولی نہ سمجھیں، ایک وقت آئے گا کہ نہ صرف آپ کے محلّہ؛ بلکہ آپ کے شہر کی پہچان ان سے ہوگی'' دو تین گھنٹے کے بعد واپس تشریف لے گئے اور میں دیر تک مولانا کی عالی ظرفی اور اپنی کم ظرفی کے بارے میں سوچتا رہا کہ میں تو پٹنہ سے اطلاع کئے بغیر حیدرآباد آ گیا اور مولانا کا ظرف یہ ہے کہ حیدرآباد

تشریف لائے تو کثرت مشاغل اور محبین کے ہجوم کے باوجود خود ہی اس حقیر کو اپنی تشریف آوری سے عزت بخشی۔

حیدرآباد سے مولانا رحمانی اور قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ گلبرگہ مدعو تھے، جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ اور جناب عبدالرحیم قریشی صاحب بھی سفر میں ساتھ لے لئے گئے، اچانک امیر شریعت کا حکم ہوا کہ ''خالد بھی ساتھ چلیں'' حالاں کہ میں نے کپڑے وغیرہ بھی بدلے نہیں تھے، اسی حال میں ساتھ نکل جانا پڑا، گلبرگہ میں ہفت گنبد کے میدان میں بہت ہی عظیم الشان جلسہ ہوا، امیر شریعت، قاضی صاحب اور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ صاحب کا خطاب تھا، میز بانوں میں مولانا محمد حسین صاحب مرحوم (امام مسجد محبس) اور جناب قمر الاسلام (رکن اسمبلی کرناٹک) کی تقریریں تھیں، میز بانوں کی تقریریں جوں ہی مکمل ہوئیں، حضرت امیر شریعت نے اناؤنسر سے فرمایا مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے نام کا اعلان کردو، میرے لئے یہ اچانک اعلان، اپنے بزرگوں کی موجودگی میں اور اتنا بڑے مجمع میں، ایک بڑے امتحان سے کم نہیں تھا اور چوں کہ جلسوں میں اعلان اور تعمیل کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہوتا؛ اس لئے کوئی موقع معذرت چاہنے اور منھ چھپانے کا بھی نہیں تھا؛ اس لئے ''مرتا کیا نہ کرتا'' کی کیفیت کے ساتھ مائیک پر آ گیا اور ''اسلام میں عورتوں کے حقوق'' پر قریب نصف گھنٹہ کچھ عرض کیا، موضوع کے انتخاب میں جلسہ کی مناسبت بھی پیش نظر تھی اور اپنی سہولت بھی، بہر حال اللہ تعالیٰ نے آبرو رکھ لی، امیر شریعت اور جناب ابراہیم سلیمان سیٹھ کی تحسین نے حوصلہ بڑھایا، یہ انداز تھا مولانا رحمانی کی تربیت اور چھوٹوں کو اوپر اُٹھانے کا۔

اس کے بعد امیر شریعت ہمیشہ بورڈ کے اجلاس میں مدعو خصوصی کی حیثیت سے مجھے بھی طلب فرمایا کرتے تھے، یہ حاضری ہی میرے لئے کچھ کم سعادت اور اعزاز کی بات نہیں تھی، کانپور کے اجلاس میں چند مرحوم ارکان کی جگہ نئے ارکان کا انتخاب تھا، اس موقع سے جن حضرات کا انتخاب کیا گیا، ان میں ایک نام اس حقیر کا بھی تھا، یہ انتخاب میرے لئے بے شان وگمان تھا اور یقیناً امیر شریعت کی ایماء پر ہوا تھا، اس موقع سے مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ

نے ان سے کہا کہ مولانا محمد رضوان القاسمی صاحبؒ ان سے کافی بڑے ہیں، بہتر ہوگا کہ پہلے ان کو موقع دیا جائے، آئندہ کبھی خالد کو رکن بنا دیجئے گا اور واقعہ ہے کہ مجھے بھی یہ بات بے موقع معلوم ہو رہی تھی، مگر مولاناؒ اپنی رائے پر قائم رہے اور فرمایا کہ مجھے اندازہ ہے کہ بورڈ کے کاموں کے سلسلہ میں کون زیادہ مفید ہوسکتا ہے؟ — بہرحال میں نے حیدرآباد پہنچ کر شکریہ کا خط لکھا، حضرت والا کا جواب آیا کہ صرف شکریہ ادا کرنا کافی نہیں، آپ کو کام کرنا ہوگا، بورڈ میں بہت سے علمی اور قلمی کام بھی ہوں گے، ان میں جہاں ضرورت ہو تعاون کریں۔

''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی تدوین وترتیب کے وقت میرے پاس بھی مسودہ کی قسطیں آتی رہتی تھیں، ایک قسط پر میں نے تفصیلی تبصرہ لکھا، ان دنوں امیر شریعت کا حیدرآباد کا سفر تھا، میں نے سوچا دست بدست پیش کردوں؛ چنانچہ ایک لفافہ میں رکھ کر آپ کے سپرد کیا، مولانا نے ایک نظر ڈالی اور مسکراتے ہوئے فرمایا کہ اس مسودہ کے ساتھ آپ لوگوں کو جوابی لفافہ مع رجسٹرڈ ڈاک ٹکٹ کے ساتھ بھیجا گیا ہے، آخر یہ کس لئے ہے؟ پھر فرمایا کہ میں سفر میں ہوں، اس لئے ڈاک سے بھیج دینا زیادہ مناسب ہے، مولانا نے مجھ سے تو فرمایا ہی، ساتھ ساتھ مولانا محمد رضوان صاحب سے بھی خواہش کی کہ مولوی خالد کو ایک مہینہ کے لئے مونگیر بھیج دیں؛ تا کہ یہ اس کام میں تعاون کرسکیں، اس وقت دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد (جہاں مجھ سے تدریس اور تعلیمی انتظام وانصرام کی خدمت متعلق تھی) میں مدرسین ضرورت سے بھی کم تھے اور بعض اور مصلحتیں بھی تھیں؛ اس لئے مونگیر جانا نہیں ہوسکا۔

اس کے بعد سے اکثر وبیشتر بورڈ کے اجلاس میں، یا کسی کانفرنس اور سیمینار میں مولانا سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا رہتا، نصیحتوں سے مستفید ہوتا، دُعائیں لیتا، کچھ ڈانٹ سنتا اور کچھ حوصلہ افزائی کی سوغات وصول کرتا، آپ کو پہلی بار زیادہ کمزور ونحیف اس وقت دیکھا جب آپ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں دارالامارت کی پہلی منزل کا ۲۰؍نومبر ۱۹۸۳ء کو افتتاح کررہے تھے، اس موقع پر بہار کے گورنر جناب اخلاق الرحمٰن قدوائی اور چیف منسٹر بھی

آئے ہوئے تھے اور فرقہ پرست عناصر کی طرف سے بعض منفی بیانات بھی آئے تھے، حضرت امیر شریعت نے تحریری خطبہ پڑھنے سے پہلے چند جملے زبانی کہے، جو جوش سے بھرپور تھے، غالباً اس میں یہ فقرہ بھی تھا: ''میں صاف صاف کہنا چاہتا ہوں، کوئی میری گردن بھی اُڑا دے تو حق کہنے سے نہیں رُک سکتا؛ کیوں کہ حق کہنا اور لوگوں کو حق کی طرف دعوت دینا خدا نے ہماری ڈیوٹی بنائی ہے'' آپ نے اپنے خطبہ میں قمر نالندوی کا میرؔ کی زمین میں کہا ہوا یہ شعر پڑھا :

باندھتی ہے ابد کے منصوبے
کیا کلیجہ ہے عمر فانی کا ؟

اس وقت جس کیفیت کے ساتھ آپ نے یہ شعر پڑھا، اس نے بہت سے اہل تعلق کو بے چین کردیا، پھر شام کے اجلاس عام میں آپ خود شریک جلسہ نہیں ہوسکے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس (جو اس وقت نائب امیر شریعت تھے) نے آپ کی ایماء پر جلسہ کی صدارت فرمائی، اس کے بعد سے جب بھی ملاقات ہوتی، صحت میں انحطاط کا احساس پیدا ہوتا؛ لیکن تادم آخریں کبھی ان کی ہمت اور عزم پر بوڑھاپا نہیں آیا اور بہت سارے اہم کام اسی زمانہ میں انجام پائے۔

کسی مناسبت سے دہلی کے ایک پروگرام میں ملاقات ہوئی، میں نے ''قاموس الفقہ'' کی تیسری جلد پر مقدمہ لکھنے کی درخواست کی، آپ نے اسے قبول فرمالیا؛ لیکن مسودہ کی کمپوزنگ میں دیر ہوتی جارہی تھی، میں نے ایک بار پھر اس سلسلہ میں عریضہ لکھا تو جواب میں معذرت آئی کہ اب مشاغل اتنے بڑھ گئے ہیں کہ موقع نکلنا مشکل ہے، میں نے دوبارہ اصرار بلکہ عزیزانہ ناز کے ساتھ عریضہ لکھا کہ آپ کو ضرور ہی مقدمہ لکھنا ہے، شفقت نامہ موصول ہوا ''چلئے! آپ ہی جیتے، میں ہی ہارا، مسودہ بھیج دیں، اللہ کو منظور ہوا تو لکھ دوں گا'' یہ بات غالباً جمادی الاخریٰ یا رجب ۱۴۱۱ھ کی ہے۔

اس زمانہ میں کویت، عراق جنگ چل رہی تھی، اس حقیر کو شعبان کے اواخر میں مولانا

محمد رضوان القاسمیؒ اور مولانا بدرالحسن قاسمی کے ساتھ عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی ، یہ حضرات تو اس سے پہلے متعدد بار حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہو چکے تھے؛ لیکن اس حقیر کا یہ پہلا سفر تھا، کویت سے عراقی قبضہ ختم کیا جا چکا تھا؛ لیکن ابھی عراق کے حکمراں بھی اور رعایا بھی سعودی عرب ہی میں مقیم تھے،۴؍رمضان المبارک کو ہم لوگ جدہ میں جناب عبدالوحید صاحب (حال مقیم امریکہ) کے دولت خانہ پر بیٹھے ہوئے تھے کہ امیر شریعت کی وفات کی اطلاع ملی ، یہ اطلاع ہم سبھوں کے لئے نہایت ہی اندوہناک اور غم انگیز تھی ، میرے اپنے احساسات یہ تھے کہ والد مرحوم کی وفات کے بعد شاید ہی کسی کی وفات سے ایسا صدمہ پہنچا ہو، کچھ دیر بعد عمرہ کا احرام باندھ کر مکہ گیا، آپؒ کی طرف سے عمرہ کیا اور اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان اور گنہگار ہاتھوں سے خدا کے حضور اپنے محسن و مشفق مربی کے لئے خوب دُعائیں اور التجائیں کیں ،اس واقعہ کو بھی کتنے ہی سال گذر گئے ؛ لیکن ایسا لگتا ہے کہ کل کا واقعہ ہے ، ملت کی کشتی چل رہی ہے اور چلتی رہے گی کہ یہ خیر اُمت ہے اور اس کو خدا نے اپنے دین کے لئے منتخب کیا ہے ؛ لیکن کیوں کر کہوں کہ اس ناخدا کی کمی آج تک محسوس ہوتی ہے اور طوفان جتنا بڑھتا جاتا ہے ، یہ احساس بھی بڑھتا جاتا ہے۔

❁ ❁ ❁

مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ ❀

ایک دُھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے !

متوسط قد و قامت، جسم لحیم و شحیم، سانولا چہرہ اور اس پر معصومیت کا نکھار، داڑھی کے صرف چند بال، پیشانی کسی قدر چھوٹی، آنکھوں سے بلا کی ذہانت آشکار، سر کے بال باوجود سن رسیدہ ہونے کے سیاہ اور کسی قدر گھنے، لباس فقیرانہ، رہن سہن دُرویشانہ، جسم بیماری میں گھلا ہوا اور دل و دماغ اُمت کے درد میں، حق گوئی میں شمشیر آبدار اور دوستوں کے لئے حریر و دیباج کی طرح نرم و بردبار، گفتگو میں شبنم کی ٹھنڈک اور قند و نبات کی مٹھاس، تقریر و خطاب میں دلوں کو رُلانے اور آنکھوں کو نم کرنے والا سوز و گداز، ہر مجلس میں میر مجلس اور ہر محفل میں زیب محفل، سیاست کی رزم ہو یا دانشوران کج خیال کا جمگھٹا، ہر میکدہ میں اس طرح نظر آنے والے کہ گویا ساقی ہو نہ کہ میکش اور رہبر ہو نہ کہ راہی، اُمت پر کہیں کوئی آفت آئے اور سینہ اس کی کسک سے معمور، پھر دنیا میں کہیں کسی مسلمان پر پڑے چوٹ اس کی آپ کے سینہ پر محسوس، جوہر شناس اور صلاحیتوں کے قدرداں، تعصب، تنگ نظری اور مسلکی گروہ بندی سے ماوراء، رزم حق و باطل میں شمشیر اور حلقہ یاراں میں بریشم کی طرح نرم —— ان شمائل و خصائل کو اپنے ذہن میں ترتیب دیں اور شخصیت، فکر و نظر اور کردار و عمل کی جو تصویر ذہن میں اُبھرے، اس پر لکھ دیں ''مجاہدالاسلام قاسمیؒ''۔

ملتِ اسلامیہ ہند کے سب سے باوقار اور متفق علیہ پلیٹ فارم آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے صدر عالی قدر، آل انڈیا ملی کونسل کے بانی اور ذمہ دار اعلیٰ، اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی

❀ پیش لفظ مع اضافہ: چند اہم فقہی مباحث، تالیف: حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ۔

ومؤسس اور سکریٹری جنرل، مجمع الفقہ الاسلامی جدہ کے رکن، رابطہ عالم اسلامی کے تحت قائم مجمع الفقہ الاسلامی مکہ مکرمہ کے ممبر، امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ، جھارکھنڈ کے قاضی القضاۃ اورنائب امیر شریعت، الامین ایجوکیشنل ٹرسٹ بنگلور کی جانب سے کمیونٹی لیڈرشپ ایوارڈ پانے والے، انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹیو اسٹڈیز نئی دہلی کی جانب سے شاہ ولی اللہ ایوارڈ کے حامل، ''افمی'' (امریکن فیڈریشن آف مسلمس) کی طرف سے سید ابوالحسن علی ندوی ایوارڈ یافتہ، ''میسی'' (مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف ساؤتھ انڈیا) کی جانب سے بہترین اسلامی شخصیت ایوارڈ حاصل کرنے والے، شریعتِ اسلامی کی تطبیق کے لئے قائم حکومت کویت کی اعلیٰ مشاورتی کمیٹی کی طرف سے فقہی ایوارڈ، سعودی عرب، کویت، مصر، عرب امارات، جنوبی افریقہ، امریکہ، برطانیہ، ایران، پاکستان، بنگلہ دیش، بخارا، سمرقند و برونائی اور مختلف بیرونی ممالک کے دعوتی وعلمی اسفار سے سرفراز، عہدے اور مناصب کی آپ سے زینت تھی، نہ کہ آپ کی عہدوں سے۔

پیدائش عیسوی سے ۱۹۳۶ء، وطن ہندوستان کی معروف مردم خیز اور علم وعمل سے عطر بیز سرزمین بہار کے ضلع دربھنگہ میں قصبہ جالے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ خلجیوں کے عہد سے ہی اسلام کی آمد سے سرخرو ہوا، مسلم دورِ حکومت میں بھی عہدۂ قضاء اس خاندان کی شناخت رہا ہے اور اسی نسبت سے جس محلّہ میں آپ کا مکان ہے، وہ 'قاضی محلّہ' کہلاتا ہے، والد ماجد حضرت مولانا عبد الاحد صاحبؒ شیخ الہند کے ممتاز تلامذہ میں تھے، انھوں نے دارالعلوم دیوبند سے امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی، بہار ہی میں مدتوں حدیث کی اعلیٰ کتابوں کا درس دیا، تدریس کے علاوہ تقریر ومناظرہ میں بھی اپنے عہد کے ممتاز لوگوں میں تھے، شیخ الہند کے بعد حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ سے اصلاحی تعلق رہا، عرصہ تک امارت شرعیہ کے رکن رکین رہے، ان کی حضرت حاجی منور علی صاحبؒ خلیفہ اجل حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ بانی مدرسہ امدادیہ سے قرابت بھی تھی، والدہ مولوی محمد جمیل صاحب کی صاحبزادی تھیں، ان کی والدہ بی بی

نجوم فاطمہ سید عبد الفتاح صاحب (نستہ) کی صاحبزادی تھیں ، جو اپنے وقت کے صاحب معرفت بزرگوں میں سے تھے۔

ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، عربی کی متوسطات کی تعلیم مدرسہ محمود العلوم دملہ، مدرسہ امدادیہ دربھنگہ اور دار العلوم مئوناتھ بھنجن میں حاصل کی ،۱۹۵۱ء تا ۱۹۵۵ء دار العلوم دیوبند میں آپ کو استاذ الاساتذہ علامہ بلیاویؒ، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، حضرت مولانا فخر الحسنؒ مرادآبادیؒ، حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ، حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ اور دیگر اکابر علماء اور نادرۂ روزگار اساتذہ سے استفادہ کا شرف حاصل ہوا اور مراسلت نیز مضامین پر اصلاح کے ذریعہ گاہے گاہے سید القلم مولانا مناظر احسن گیلانیؒ سے بھی آپ نے استفادہ فرمایا تھا۔

دیوبند سے فراغت کے بعد مولانا حسین احمد مدنیؒ کی ایماء پر جامعہ رحمانی مونگیر تشریف لے گئے ،۱۹۵۵ء-۱۹۶۲ء جامعہ رحمانی مونگیر میں عربی کی ابتدائی کتابوں سے لے کر منتہی کتابوں تک کا درس دیا، پھر چند سال کے وقفہ کے بعد ۱۹۶۹ء میں امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی خواہش پر دوبارہ ایک سال تدریس کی خدمت انجام دی اور ابوداؤد وغیرہ کے اسباق آپ کے ذمہ رہے، اہم بات یہ ہے کہ جس توجہ سے آپ نے اونچی کتابیں پڑھائیں، اسی انہماک والتفات کے ساتھ ابتدائی کتابوں کے درس کا بھی اہتمام کیا، اسی لئے جن شاگردوں نے آپ سے ابتدائی کتابیں پڑھی ہیں، ان پر بھی آپ کی تعلیم وتربیت کے نقوش اتنے ہی گہرے ہیں جتنی اونچی کتابیں پڑھنے والوں پر۔

مولانا منت اللہ رحمانی صاحبؒ کی جوہر شناس نگاہ نے آپ کی خداداد صلاحیت کو بھانپ کر ایک ایسے وقت میں امارت شرعیہ کا شعبۂ قضاء اور شعبۂ انتظام آپ کے حوالہ کیا، جب امارت شرعیہ کا سارا نظام عملاً مفلوج ہوگیا تھا اور عرصہ سے دار القضاء کسی ایسے صاحب نظر اور فقہ اسلامی کی روح کے شناسا قاضی سے خالی تھا، جو اس جلیل القدر عہدہ کی اہمیت کو پورا کرتا ؛ چنانچہ شوال ۱۳۸۱ھ مطابق ۱۹۶۱ء سے وفات تک مسلسل آپ بہار واُڑیسہ کے قاضی القضاۃ

رہے اور مولانا سید نظام الدین صاحب کے امیر شریعت منتخب ہونے کے بعد نائب امیر شریعت بھی نامزد کئے گئے۔

آپ کی ملی وقومی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا، امارت شرعیہ میں آپ اس وقت آئے جب کام کرنے والوں کو بیٹھنے کے لئے باقاعدہ بوریا بھی میسر نہیں تھا اور امارت کا دائرہ اثر پٹنہ اور صوبہ کے کچھ مخصوص علاقوں تک محدود ہوکر رہ گیا تھا، بیت المال خالی تھا، دارالقضاء کا کام پھلواری شریف تک محدود ہوکر رہ گیا تھا اور پورے صوبہ میں صرف ایک دو مقامات پر دارالقضاء قائم تھے، آپ کی کوششوں سے موجودہ امیر شریعت حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب دامت برکاتہم تشریف لائے اور انتظام وانصرام کا شعبہ ان سے متعلق ہوا، قضاء کے نظام کی توسیع اور زیادہ سے زیادہ مقامات پر دارالقضاء کے قیام کے لئے آپ نے شبانہ روز جدوجہد کی، اس اہم اور نازک کام کے لئے افراد کار تیار کئے، امارت شرعیہ کا وفد لے کر گاؤں گاؤں پہنچے، قریہ قریہ کو امارت کی تنظیم سے منسلک کیا، مکاتب قائم کئے، لوگوں کے باہمی نزاعات کا تصفیہ کیا اور مدتوں کی مقدمہ بازیاں چند ساعتوں کی کوشش سے ختم ہوئیں، دورہ کے ذریعہ شہر شہر گاؤں گاؤں پہنچے، آپ کی اس جدوجہد کا یہ فائدہ ہوا کہ ہر عام وخاص کی امارت سے وابستگی بڑھی اور امارت کے تمام شعبوں کو استحکام حاصل ہوا، دارالقضاء میں مقدمات کی آمد بڑھی، دارالافتاء میں سوالات کی کثرت ہوئی، بیت المال کو استحکام حاصل ہوا، مسلمانوں میں آپ اپنی تعلیم کے نظم کا مزاج پیدا ہوا اور بہار واُڑیسہ میں امارت کی آواز مسلمانوں کے مسائل کے لئے ایک ایسی نمائندہ آواز سمجھی گئی کہ حکومتیں بھی اسے اہمیت دینے پر مجبور ہوئیں اور اربابِ اقتدار کو بھی ان بوریہ نشینوں کی بارگاہ میں حاضری کے سوا چارہ نہ رہا۔

پھر بہار کے خوں آشام ہندو مسلم فسادات میں امارت نے مظلوم وستم رسیدہ مسلمانوں کے مالی واخلاقی، سیاسی اور قانونی مدد میں اتنا جرأتمندانہ کردار ادا کیا کہ ہندوستان میں شاید ہی اس کی مثال مل سکے، بھاگلپور کے انسانیت سوز فسادات؛ بلکہ پولیس ایکشن میں امارت اور اس کے ذمہ داروں نے جس طرح اپنی راحتوں کو تج کر دن رات کام کیا، وہ ملت کے لئے خدمت

کا ایک نمونہ ہے ، ان تمام کاموں میں حضرت قاضی صاحبؒ کی منصوبہ بندی اور اقدامی صلاحیت ،خوش تدبیری ،انتھک محنتوں اور عملی کاوشوں کا بڑا حصہ تھا۔

''خدمتِ خلق'' گوامارت شرعیہ کے مقاصدواہداف میں داخل ہے؛ لیکن عام طور پر یہ کام مقامی ریلیف تک محدود تھا، آپ ہی کی تحریک پر مولانا سجاد ہاسپٹل کا پروگرام بنا، آپ نے اس کی منصوبہ بندی کی ، اس کے لئے مناسب وسائل کا نظم کیا اور اپنے رفقاء کے تعاون سے اس کام کو عملی جامہ پہنایا، اس طرح امارت شرعیہ سے انسانی بنیادوں پر خدمتِ خلق کے کام کی ایک نئی روایت قائم ہوئی ، اس وقت الحمد للہ بہار جیسی پسماندہ ریاست میں یہ ہسپتال غریب لوگوں کے لئے عصری اور طبی مدد کا ایک بہت بڑا وسیلہ ہے!

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبد الرحمٰن صاحبؒ کا عہد امارت گو مختصر رہا؛ لیکن خاموشی کے ساتھ ٹھوس اور تعمیری کام کے اعتبار سے یہ امارت کا یادگار عہد ہے، آپ ہی کے عہد میں امارت نے مسلمان نوجوانوں کے لئے ٹیکنیکل تعلیم کی طرف توجہ کی ، جس کی ابتداء پھلواری شریف میں 'مولانا منت اللہ رحمانی ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ' کے قیام سے ہوئی ، جس نے سینکڑوں بے روزگار نوجوانوں کے لئے روزگار فراہم کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، اب دربھنگہ، ساٹھی ، کٹیہار اور اُڑیسہ میں بھی امارت نے اسی نوعیت کے انسٹی ٹیوٹ قائم کئے ہیں اور کئی جگہ پر اس کی کوشش ہو رہی ہے، ٹیکنیکل تعلیم کے اس پورے نظام کے اصل منصوبہ ساز اور پھر اس کے لئے مطلوبہ مالی اور افرادی وسائل کی فراہمی کے ذمہ دار اصل میں حضرت قاضی صاحبؒ ہی تھے اور شاید ہی کوئی حقیقت پسند اور واقف احوال اس سے انکار کر سکے ، فسادات کی ہلاکت خیزیوں اور سیلاب کی تباہ کاریوں کے موقع پر امارت شرعیہ نے جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں ، اس کے علاوہ شمالی بہار میں کالا آزار کی بیماری سے نمٹنے کے لئے آپ کی تحریک اور کوششوں سے امارت شرعیہ کے زیر اہتمام جو میڈیکل کیمپ قائم ہوئے ، خدمتِ خلق کے نقطۂ نظر سے وہ بھی ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، جس سے بے شمار غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کو نفع پہنچا ہے۔

نظام قضاء کی توسیع امیر شریعت رابعؒ کا خاص ہدف تھا اور واقعہ ہے کہ ان کے عہد

امارت میں صوبوں اور بیرون صوبہ قضاء کے نظام کو جو وسعت حاصل ہوئی، وہ امارت کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اس تحریک میں جہاں امیر شریعت رابع کی توجہات اور موجودہ امیر شریعت سادس کی انتظامی صلاحیتوں کا حصہ ہے، وہیں حضرت قاضی صاحبؒ اس تحریک کے روح رواں، اس کا دماغ اور اس کی زبان بن کر رہے، امیر شریعت رابع نے امیر منتخب ہونے کے بعد خانقاہ رحمانی مونگیر میں تربیت قضاء کا پہلا کیمپ رکھا، پھر دوسرا کیمپ امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں منعقد ہوا، اس میں صوبہ بہار کے علاوہ مختلف صوبوں اور مختلف مکاتب فکر کے اہل علم نے شرکت کی، اس تربیتی کیمپ کی منصوبہ بندی اور علمی اعتبار سے مسائل قضاء کی تفہیم اور کار قضاء کی تربیت کا پورا کام آپ ہی کے ذریعہ انجام پایا اور اس میں شبہ نہیں کہ اس تربیتی کیمپ نے گہرے اثرات ڈالے اور بہار کے علاوہ مختلف شہروں میں دارالقضاء کا نظام عملی طور پر قائم ہو گیا۔

لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کے وقتی پروگرام کے ذریعہ مستقل طور پر افراد سازی کا کام انجام نہیں پاسکتا تھا، اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے قضاء وافتاء کی تربیت کے لئے ایک مستقل ادارہ کی تشکیل ''المعہد العالی لتدریب القضاء والافتاء'' کے نام سے امارت ہی کے زیر انتظام فرمائی، جو نہایت ہی کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے اور اس وقت تربیت قضاء وافتاء کے لئے پورے ملک کا مرجع بنا ہوا ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کے تحفظ، ان کی قانونی مدد، دعوت واصلاح، تحفظ شریعت اور کتنی ہی قومی اور اصلاحی خدمت ہے، جسے آپ نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے انجام دیا ہے۔

قانونِ شریعت کا جو فہم اور عقلی اور منطقی طور پر اسلام کے قانون معاشرت کو سمجھانے کا جو خداداد ملکہ آپ کو حاصل تھا، حقیقت یہ ہے کہ آپ کے معاصرین میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی؛ اس لئے مسلم پرسنل لا بورڈ کی تحریک میں آپ نے شروع سے سرگرم رول ادا کرتے رہے ہیں، متبنیٰ بل کا قضیہ ۱۹۷۲ء میں کھڑا ہوا اور امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی تحریک پر

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے مسلم پرسنل لا کے موضوع پر دارالعلوم میں قائدین اُمت اور علماء واہل دانش کا پہلا اجلاس طلب کیا تو اس کی تیاری کے لئے بزرگوں کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی اور آپ نے تقریباً ایک ماہ دارالعلوم میں قیام کرکے مسلم پرسنل لا بورڈ کے تمام پہلوؤں پر بحث کا خاکہ مرتب کیا، ان نکات کو متعین کیا جو مسلم پرسنل لا کے مخالفین کا خاص ہدف ہیں، یہیں سے 'مسلم پرسنل لا کنونشن ممبئ' کی تیاری کا آغاز ہوا، جس کی مجلس داعیان کے ایک رکن آپ بھی تھے۔

ممبئ میں مسلم پرسنل لا کے مسئلہ پر جو عظیم الشان کنونشن منعقد ہوا، وہ اُمت کی اجتماعیت کی ایک ایسی مثال تھی کہ خلافت تحریک کے بعد اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کنونشن کی تیاری اور اس کے لئے فضاء کی ہمواری میں آپ نے نمایاں خدمات انجام دیں، پھر بورڈ کی تشکیل کے بعد شروع ہی سے آپ اس کے رکن تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین رہے، حضرت مولانا رحمانی بورڈ کے جنرل سکریٹری منتخب ہوئے اور آپ نے ان کا دست و بازو بن کر کام کیا اور ہمیشہ اس تحریک کے سب سے مؤثر وکیل اور ترجمان رہے، شاہ بانو کیس کے نتیجہ میں جو تحریک اُٹھی، اس میں آپ نے پورے ملک کا دورہ کیا، مولانا رحمانی کے بعد عام رجحان یہی تھا کہ جنرل سکریٹری کے عہدہ کے لئے آپ کی شخصیت ہی سب سے موزوں ترین شخصیت ہے، بابری مسجد کی شہادت کے واقعہ کے بعد مسلمانوں کے مجروح دلوں پر مرہم رکھنے اور ان کی پست ہوتی ہوئی ہمتوں کو اونچا اُٹھانے میں آپ نے اہم کردار ادا کیا۔

بورڈ کے دوسرے صدر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی وفات کے بعد آپ کی سنگین اور مسلسل علالت کے باوجود ساری اُمت اسلامیہ ہند کی نگاہ آپ پر مرکوز تھی اور اس طرح اتفاق رائے سے آپ بورڈ کے تیسرے صدر منتخب ہوئے، بورڈ کی صدارت کے عہدہ پر فائز ہونے کے بعد آپ نے بورڈ کے کردار کو فعال بنانے پر خصوصی توجہ دی، اس کے مرکزی دفتر کو عصری سہولتوں سے آراستہ کیا، مسلم پرسنل لا سے متعلق فقہی و قانونی کتابوں پر مشتمل لائبریری بھی قائم کی گئی۔

صدر بورڈ منتخب ہونے کے بعد اجلاسِ بنگلور میں آپ نے جو خطبۂ صدارت دیا، وہ بورڈ کی تاریخ میں سنہری حرفوں میں لکھے جانے کے لائق ہے، اس میں آپ نے سنگھ پریوار کے نمائندوں کو خصوصاً اور عام برادران وطن کو عموماً کھلے اور بے غبار لفظوں میں اسلام کی آفاقی سچائی کو قبول کرنے اور خدا کی آواز پر لبیک کہنے کی دعوت دی، اُردو اور انگریزی اخبارات، نیز الیکٹرانک میڈیا نے نہایت نمایاں طریقہ پر حق و راستی کی اس للکار کو پوری اہمیت کے ساتھ لوگوں تک پہنچایا۔

ہندوستان میں مختلف جماعتیں اور تنظیمیں کام کر رہی ہیں، ان میں بعض جماعتیں تو سیاسی ہیں، بدقسمتی سے ملی مفادات کے مقابلہ سیاسی اور گروہی مفادات کی فکر نے ان میں ایسے فاصلے پیدا کر دیئے ہیں جیسے دریا کے دو کنارے؛ حالاں کہ دونوں کے ہاتھوں میں قوم وملت کی سربلندی کا جھنڈا ہے؛ لیکن ان میں وسیع تر مفادات کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ مل بیٹھنے اور شانہ بشانہ ہو کر آگے بڑھنے کی صلاحیت نہیں، قومی اور ملی مسائل کی ترجمانی کرنے والی کچھ غیر سیاسی مذہبی تنظیمیں بھی ہیں؛ لیکن یہ مخصوص مذہبی پس منظر اور نقطۂ نظر کی حامل ہیں؛ اس لئے وہ مسلمانوں کے ایک مخصوص گروہ کی نمائندگی کرتی ہیں، دوسرے حلقہ کے لوگوں کو ان سے تعلق نہیں؛ بلکہ ایک دوسرے کی تفسیق اور بعض اوقات تکفیر پر کمر بستہ رہتے ہیں، اُمت کا ایک بہت بڑا طبقہ ایسا بھی ہے جس کو کسی تنظیم یا تحریک سے تعلق نہیں، یہ سیدھے سادھے مخلص اور گروہی تنگ نظریوں سے بلند عام مسلمان ہیں۔

مسلم پرسنل لا بورڈ نے تحفظ شریعت کی مہم کی حد تک ان گروہوں کو جوڑا ہے؛ لیکن اُمت کے دوسرے سیاسی، تعلیمی، ثقافتی اور معاشی مسائل کو اس نے اپنی کوششوں کا ہدف نہیں بنایا ہے؛ تا کہ ان مسائل میں فکر ونظر کا اختلاف بورڈ کی وحدت کو متاثر نہ کرے، اسی پس منظر میں ۱۹۶۵ء میں مجلس مشاورت کی تشکیل عمل میں آئی تھی؛ لیکن افسوس کہ مشاورت کی بعض دستوری خامیوں، تنظیموں کے جماعتی تحفظات اور بتدریج مخلص اور فعال قائدین سے محرومی،

نیز بعض اہم جماعتوں کی اس وفاق سے علاحدگی کے سبب مجلس مشاورت ایک کاغذی تحریک بن کر رہ گئی اور قوم وملت کے مسائل کی ترجمانی میں عملاً اس کا کوئی کردار باقی نہیں رہا۔

اس خلا کو محسوس کرتے ہوئے آپ نے آل انڈیا ملی کونسل کی ۱۹۹۲ء میں تشکیل فرمائی، جس میں ملک گیر سطح پر مختلف صلاحیتوں کو جمع کیا گیا اور ایک جامع پروگرام کے ساتھ اُمت کی ہمہ جہت ترقی کو ہدف بنایا گیا، وحدت کلمہ کی بنیاد پر اُمت کو جوڑنا، جہاں پہلے سے کوئی اچھا کام ہورہا ہو، اس کو تقویت پہنچانا، جہاں نہیں ہورہا ہو، وہاں براہ راست یا بالواسطہ کام کرنا اور ایک ہی طرح کی کوششیں مختلف سمتوں سے ہورہی ہوں تو ان کو باہم مربوط کرنے کی کوشش کرنا کونسل کا بنیادی مقصد ہے، واقعہ یہ ہے کہ ملی کونسل کے پلیٹ فارم نے نفرت کی بجائے وحدت، تصادم کی بجائے تعاون اور اُمت کی مختلف ضروریات کے لحاظ سے مختلف صلاحیتوں کو اُبھارنے اور باصلاحیت نوجوانوں کی ایک تازہ دم ٹیم تیار کرنے کا ایسا کام کیا ہے، جس کے دوررس اثرات محسوس کئے جارہے ہیں، ٹاڈا قانون کی تنسیخ، انتخابی سیاست میں مسلمانوں کا ووٹ متحد کرنے اور مردم شماری کے موقع پر مسلمانوں کو متوجہ کرنے، نیز دینی اور عصری تعلیم میں ان کو آگے بڑھانے اور کسی بھی سیاسی اور مذہبی مسئلہ پر حکومت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا جو کام کونسل نے کیا ہے، وہ ہندوستان کی ملی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، اسی سلسلہ کی ایک ملک گیر کوشش کاروانِ آزادی اور کاروانِ اتحاد کی صورت میں ہوچکی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ ان تمام کوششوں کے پیچھے جو دل تڑپتا اور جو دماغ سوچتا تھا اور جس کی سخن دل نواز نے سوئے ہوئے کو بیدار اور نہ چلنے والوں کو چلنے پر مجبور کیا تھا، وہ آپ ہی کی شخصیت تھی اور یہ آپ ہی کی کوشش تھی، جس نے مختلف مسلک ومشرب، مزاج و مذاق اور فکر وذہن کے لوگوں کو دوش بدوش کھڑا کردیا تھا، گو آپ کی علالت اور بہت سے علاقوں میں مقرر ذمہ داران کے تساہل کی وجہ سے کونسل کی سرگرمیوں میں اب وہ جوش وخروش نظر نہیں آتا جو ابتداء قیام کے زمانہ میں تھا؛ لیکن کونسل کی اہمیت اور ضرورت آج بھی ہے، بہرحال ملی کونسل کے پلیٹ فارم سے جو کچھ بھی کام ہوا ہے، وہ آپ کی ملی خدمات کا ایک زریں باب ہے۔

افراد سازی اور مردم گری آپ کا خاص مزاج تھا، اور امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ میں شروع ہی سے اس کو آپ نے خصوصی اہمیت دی؛ چنانچہ انفرادی طور پر کتنے ہی قضاۃ ہیں جو آپ سے تربیت پا کر ملک کے مختلف علاقوں میں قضاء کا کام انجام دے رہے ہیں، زندگی کے آخری دہے میں آپ نے دو ایسے اداروں کی تشکیل کی، جس نے دینی مدارس کے فضلاء اور نوجوان علماء کی تربیت میں ایک انقلابی کردار ادا کیا ہے، ان میں ایک تو 'اسلامک فقہ اکیڈمی' کا قیام ہے، جس میں اس وقت ملک بھر کے ذہین اور باصلاحیت اصحابِ علم شریک ہیں، اکیڈمی کے ذریعہ نئے اور اہم مسائل پر مسلسل سیمینار ہو رہے ہیں اور ان سیمیناروں نے کیسی کیسی صلاحیتوں کو اُبھارا اور گمنام اصحاب علم کو متعارف کرایا ہے اور ایک نیا علمی جوش اور ولولہ عطا کیا ہے، اس کی شہادت کے لئے اکیڈمی کے فقہی مجلّات کافی ہیں۔

دوسرے: امارت شرعیہ کے تحت ''المعہد العالی للتدریب فی القضاء والافتاء'' کا قیام ہے، جس کے تحت قضاء اور افتاء کی تربیت کا ایک مستقل اور معیاری انتظام ہو گیا ہے اور اس وقت ملک کے کونہ کونہ اور دوسرے ملک سے اصحابِ علم و فضل یہاں آ کر کسبِ فیض کر رہے ہیں، یہ دونوں ادارے جو اصل میں آپ ہی کی فکر کا عکس جمیل ہیں، گو ان کی عمر زیادہ نہیں ہے؛ لیکن کم مدت میں ان اداروں کے ذریعہ افراد سازی کا قابل قدر کام انجام پایا ہے اور اُمید ہے کہ مستقبل میں اس کے دور رس اور گہرے اثرات مرتب ہوں گے۔

اس کے علاوہ دینی تعلیم کا فروغ اور اس کے معیار کو بہتر بنانے کی سعی و کوشش آپ کی زندگی کا خاص مشن رہا ہے، بہار و اُڑیسہ میں درجنوں مدارس آپ کی سرپرستی میں کام کر رہے تھے اور بعض قدیم اور بڑے مدارس وہ تھے، جو تمام بنیادی اُمور میں آپ ہی کے مشورہ سے قدم اُٹھاتے تھے، بہار کے وہ مدارس جو سرکار سے ملحق نہیں ہیں، ان کے معیار تعلیم کو اونچا اُٹھانے اور نصاب و نظام میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی غرض سے حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے زیر سرکردگی 'آزاد دینی مدارس بورڈ' کا قیام عمل میں آیا تھا، اس وقت آپ جامعہ رحمانی میں مدرس

تھے، آپ نے اس بورڈ کے قیام اور پھر اس کے انتظام و انصرام میں سرگرم رول ادا کیا تھا، مگر افسوس کہ مدارس کی باہمی آویزش کی وجہ سے یہ وفاق زیادہ دنوں تک متحرک نہ رہ سکا، پھر آپ ہی کی تحریک پر امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ کے زیر اہتمام ’جامعہ رحمانی مونگیر‘ میں ’مدارس اسلامیہ کنونشن‘ منعقد ہوا، تقریباً ڈیڑھ سو مدارس کے نمائندے شریک ہوئے، پورے ملک سے مختلف مکتبِ فکر کے مدارس اور دینی تعلیم کے ماہرین اکٹھا ہوئے اور دینی مدارس کے نصاب و نظام کے سلسلے میں بڑی مفید تجاویز منظور ہوئیں، نیز ’’مدارسِ اسلامیہ کونسل‘‘ کا قیام عمل میں آیا، اس اجلاس کے محرک بھی آپ ہی تھے اور مجلس استقبالیہ کے صدر اور کرتا دھرتا بھی؛ لیکن بدقسمتی سے یہ کونسل محض ایک کاغذی ادارہ بن کر رہ گئی اور عملی طور پر اس نے کوئی کام نہیں کیا۔

امیر شریعت خامس حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ کے عہد میں امارت شرعیہ کے زیر اہتمام پھر بہار کے دینی مدارس کا ایک اہم اجتماع منعقد ہوا، اس اجتماع میں ’’وفاق المدارس اسلامیہ بہار‘‘ کی تشکیل عمل میں آئی، موجودہ امیر شریعت اس وفاق کے سرپرست ہیں اور آپ اس کے پہلے صدر اور روح رواں تھے، یہ اجلاس اور وفاق اصل میں آپ ہی کی توجہ اور تحریک کا نتیجہ ہے، جس میں بہار کے دوسو سے زیادہ آزاد دینی مدارس شریک ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ اس وفاق نے بہار کے مدارس کے گرتے ہوئے تعلیمی معیار کو اونچا اُٹھانے کی سعی کی ہے اور پورے ملک میں اس کو ایک قابل تقلید وفاق تصور کیا جا رہا ہے۔

آپ نے کل ہند سطح پر بھی مدارس کے نظام تعلیم و تربیت کی اصلاح و ترقی اور حکومت کے ناپاک عزائم سے مدارس کی حفاظت کے لئے دینی مدارس کا وفاق قائم کرنے کی کوشش فرمائی اور اس سلسلہ میں آل انڈیا ملی کونسل کے تحت دہلی میں ایک نمائندہ اجتماع منعقد ہوا؛ لیکن افسوس کہ بعض حلقوں نے تعاون کے بجائے تصادم اور مخالفت کی راہ اختیار کی، اس طرح ایک اہم کام جو ہونا چاہئے اور جس سے معیار تعلیم کو اونچا اُٹھانے میں بڑی مدد ملتی، تشنۂ تکمیل رہا۔

ایک بہت ہی اہم مسئلہ دیہات اور قریہ جات میں مسلمان بچوں اور بچیوں کے لئے بنیادی دینی تعلیم کے انتظام کا ہے، حقیقت یہ ہے کہ اس مقصد کے لئے مکاتب کا قیام اس وقت

بڑی دینی جامعات کے قیام سے بھی زیادہ ضروری ہے اوراس کے بغیر آئندہ نسل کے ایمان کی حفاظت اوران کی اسلامی شناخت کا برقرار رکھنا دشوار ہو جائے گا،اس جانب قاضی صاحب کی خاص توجہ تھی اوراس پیغام کو آپ نے امارت شرعیہ کے پلیٹ فارم سے دیہات دیہات پہنچایا تھا؛ چنانچہ آپ نے امارت کے زیر اہتمام بہار واُڑیسہ میں دوسو سے زیادہ مکاتب قائم کئے تھے۔

غرض کہ پورے ملک میں عموماً اور بہار میں خصوصاً دینی تعلیم کے فروغ، مدارس کے استحکام اور نظام تعلیم کی اصلاح وترقی آپ کی کوششوں کا خاص ہدف رہا ہے اوراس سے دور رس فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے۔

جہاں آپ نے دینی تعلیم کے فروغ میں کوششیں کی ہیں، وہیں مسلمانوں کے لئے ماڈرن ایجوکیشن پر بھی آپ کی پوری توجہ تھی،آپ نے اپنے قصبہ جالے ضلع دربھنگہ (بہار) میں ایک بہت وسیع ایجوکیشنل کیمپس قائم کیا ہے،جس میں پرائمری اسکول سے لے کر ڈگری کالج اور ٹیچر ٹریننگ کالج تک ہر سطح کی تعلیم کا نظم کیا گیا تھا،افسوس کہ حکومت بہار کی بے توجہی کی وجہ سے یہ ادارے پنپ نہیں سکے؛ لیکن نتیش کمار کے چیف منسٹر بننے کے بعد سے یہ گلشنِ خزاں رسیدہ دوبارہ بہار بہ دوش ہو رہا ہے۔

امارت شرعیہ کے تحت اس کے مرکزی احاطہ میں نیز پورنیہ، دربھنگہ اور ساٹھی وغیرہ میں مختلف ٹیکنیکل ادارے قائم ہوئے ہیں،جس کی وجہ سے بے روزگار نوجوانوں کو روزگار کے مواقع حاصل کرنے میں بڑی آسانی بہم پہنچی ہے،ان اداروں کے قیام اوراس کے لئے وسائل کی فراہمی میں حضرت قاضی صاحب کا بنیادی رول تھا،ملک کے بعض دوسرے علاقہ میں بھی کونسل کے تحت ماڈرن اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اداروں کے قیام کے لئے آپ پوری قوت کے ساتھ کوشاں تھے اور جو لوگ پہلے سے اس کام کو کر رہے تھے،آپ نے ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی فرمائی۔

تعلیم کے مسئلہ کو آپ ہمیشہ انسانی نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے اور برادرانِ وطن کو قریب کرنے کی کوشش کرتے تھے؛ چنانچہ جدید تعلیم کے ان اداروں سے جہاں مسلمان بچے استفادہ

کررہے ہیں، وہیں غیر مسلم بچوں کو بھی ان سے استفادہ کے مواقع حاصل ہیں، گویا دینی اورعصری اور مسلمانوں اور غیر مسلم بھائیوں ـــ ـوں کے لئے آپ نے علم کی شمع جلائی اوران کو نورتعلیم سے آشنا کرنے کی تدبیر فرمائی۔

حضرت قاضی صاحبؒ کوتقریر وخطاب کا خاص ملکہ تھا، بے ساختہ، تصنع سے پاک، دلوں میں اُتر جانے اور کانوں میں رس گھولنے والی آواز، موقع ومحل اور مخاطب کے اعتبار سے الفاظ کا انتخاب، آورد کی بجائے آمد، قصہ کہانی سے بچتے ہوئے کتاب وسنت کے ٹھوس دلائل اورصحابہ کے واقعات، نیز اپنے عہد کے حالات پران کی تطبیق، یہ آپ کی تقریروں کے نمایاں پہلو ہیں، اگراس عہد کے دوتین سب سے مؤثر خطباء کے نام لکھے جائیں تو شاید ان میں سرفہرست آپ ہی کا نام ہوگا۔

آپ کے خطاب کا امتیازی پہلو یہ ہے کہ جو کچھ کہتے تھے، وہ حالات کی رعایت کے ساتھ، علماء ہوں تو علمی اور فنی گفتگو، جدید تعلیم یافتہ لوگ ہوں تو ان کی زبان واصطلاحات میں، عوام ہوں تو ان کے فہم کے مطابق، موضوع بھی عوامی اورزبان بھی آسان سے آسان تر، جوش کی جگہ جوش اور ہوش کی جگہ ہوش، کہیں شعلہ اور کہیں شبنم؛ لیکن ہر بات جذبۂ دروں کی شمولیت کی وجہ سے ’’ازدل ریزد بردل خیزد‘‘ کا مصداق، اگر مجمع میں برہمی اور بکھراؤ کی کیفیت پیدا ہوجائے تو اس کوسنبھالنے کی خاص صلاحیت اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمائی تھی، مثلاً: مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس احمد آباد کی ایک نشست میں ایک صاحب نے کسی قدر غیر متوازن تقریر کردی اور احناف اور غیر مقلدین کے درمیان زیر بحث ایک اختلافی مسئلہ چھڑ گیا، جس سے اچھا خاصا تکدر پیدا ہوگیا اور بڑی بدنظمی کی کیفیت ہوگئی، خود صدر اجلاس حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ مضطرب ہوگئے، ان کی ایماء پر قاضی صاحب نے اسٹیج سنبھالا اورصرف چند منٹ کے دردانگیز خطاب نے نہایت ہی اعتدال اور توازن کے ساتھ اس کیفیت کا ازالہ بھی فرمادیا، ساتھ ہی ساتھ آپ نے بلاتاخیر دوسرے ایجنڈے کو چھیڑ دیا اور گفتگو کا رُخ موڑ کر رکھ

دیا، اس موقع سے حاضرین میں سے شاید ہی کوئی ہو جس کی آنکھ نم نہ ہوئی ہو۔

کئی دہائیوں سے یہ صورت حال تھی کہ مسلمانانِ ہند کا جب بھی کوئی قومی، علمی اور مذہبی اجتماع ہو اور اس میں آپ شریک ہوں تو آپ کے خطبہ کی حیثیت اس اجتماع کے کلیدی خطاب کی ہوتی ہے، اس نسبت سے آپ امریکہ، برطانیہ، ساؤتھ افریقہ، خلیجی ممالک، برصغیر میں پاکستان و بنگلہ دیش وغیرہ تشریف لے جاتے تھے اور ہندوستان میں تو شاید ہی کوئی ایسا علاقہ ہو جہاں اس حیثیت سے آپ کا قدم نہ پہنچا ہو، مسلمانوں کی فکر، ان کے درد میں گھلاؤ اور گاؤں گاؤں پہنچ کر ان سے گفتگو اور اس کے لئے اپنی صحت سے بے نیازی ہی کے نتیجہ میں آپ کی صحت کی وہ کیفیت ہوگئی، جو بہ ظاہر آپ کے لئے سفر آخرت کی سواری ثابت ہوئی۔

آپ کا اصل میدان علم و تحقیق تھا، اگر متبحر عالم کی تعریف ایسے شخص سے کی جائے، جس سے گفتگو کرتے ہوئے انسان پر اپنا جہل واضح ہو جائے، تو یقیناً آپ کی شخصیت کو اس کا مصداق قرار دیا جا سکتا تھا، جن حضرات نے آپ کو قریب سے دیکھا اور آپ کی مجلسوں میں بیٹھنے کا شرف حاصل کیا ہے اور علمی مسائل میں اسے آپ سے تبادلہ خیال کا موقع ملا ہے، وہ یقیناً اس کا اعتراف کریں گے، مشکل مسائل کو سہل طریقہ پر بیان کرنے اور اس کی روح تک پہنچ کر مسئلہ کو سمجھانے کا خاص ملکہ اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا تھا، گو ملی مشغولیات کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ توجہ دینے کا موقع نہیں مل پایا اور تالیف برائے تالیف کے آپ قائل نہیں تھے، اس کے باوجود آپ کا جو کچھ علمی سرمایہ لوح و قلم نے محفوظ کیا ہے، وہ ''کم'' کے اعتبار سے بھی اور اس سے زیادہ ''کیف'' کے اعتبار سے ایک گنج گراں مایہ ہے!

اسلام کا عدالتی نظام فقہ اسلامی کا نہایت ہی اہم موضوع ہے اور عربی زبان میں اس پر درجنوں کتابیں مختلف عہد میں لکھی گئی ہیں، اُردو زبان کا دامن قریب قریب اس سے بالکل ہی خالی تھا اور یہ کام ہے بھی نازک اور مشکل، ایک طرف قانون قضاء پر نگاہ ہو، دوسرے کار قضاء انجام دینے کا علمی تجربہ ہو اور تیسرے ہندوستان کے مخصوص حالات اور محدود وسائل

کے پس منظر میں ان فقہی آراء کی تطبیق کی صلاحیت ہو، جو اس موضوع پر عمیق نظر اور احوال زمانہ سے گہری واقفیت کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے یہ سعادت آپ کی قسمت میں لکھی تھی؛ چنانچہ آپ نے اس موضوع پر ''اسلامی عدالت'' کے نام سے ایک نہایت ہی جامع کتاب تالیف کی، جس میں ادب قضاء کی تمام بحثیں دفعہ وار اور حوالہ جات کے اہتمام کے ساتھ جمع کردی گئی ہیں، کتاب کا مقدمہ فقہ کے اُصولی مباحث اور قضاء کی تاریخ سے متعلق ہے، جو اپنے علمی مواد کے اعتبار سے اہل علم کے لئے نہایت قیمتی چیز ہے، اس کتاب کا امتیازی پہلو قضاء سے متعلق نئے مسائل، نیز ان مسائل کی عقدہ کشائی ہے، جن پر ہندوستان اور ان جیسے ملکوں میں مسلمانوں کے مقرر کئے ہوئے قاضی کے لئے عمل کرنا دشوار ہے، آپ نے فقہاء کی عبارتوں میں غواصی کرکے اور شریعت کے مقاصد کو سامنے رکھ کر اسے حل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کا عربی ترجمہ ''النظام القضائی الاسلامی'' کے نام سے بیروت سے شائع ہو چکا ہے۔

نظام قضاء سے طویل وابستگی کے سبب اسلام کے عائلی قوانین آپ کی فکر و نظر کی خاص جولانگاہ ہیں، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت عائلی قوانین کا جو مجموعہ مدون ہوا ہے، اس میں آپ کا بھی نمایاں حصہ ہے، اس کے علاوہ قاضی شریعت امارت شرعیہ بہار و اُڑیسہ کی حیثیت سے آپ نے سینکڑوں فیصلے کئے ہیں، یوں تو یہ فیصلے زندگی کے مختلف شعبوں کے مقدمات سے متعلق ہیں؛ لیکن اکثر مقدمات معاشرتی مسائل ہی کے ہیں، ان سے اس راہ کے نو واردوں کو فصل خصومات کے طریقہ کار کے متعلق واضح اور عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے، یہ فیصلے ابھی تک کتاب کی صورت میں طبع نہیں ہوئے ہیں؛ لیکن سہ ماہی ''بحث و نظر'' میں ان کی ایک اچھی خاصی تعداد طبع ہو چکی ہے، ان فیصلوں کو اس حقیر نے خصوصی شمارہ کی حیثیت سے شائع کردیا ہے؛ لیکن ان کے علاوہ بہت سارے فیصلے تشنۂ طبع ہیں۔

ہندوستان میں اگر تین چار مصروف ترین دارالافتاء کو شمار کیا جائے تو ان میں ایک دارالافتاء امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ بہار بھی ہوگا، یہاں کا دارالافتاء بھی قدیم زمانہ سے کارکرد ہے، بانی امارت شرعیہ حضرت ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ ـــــ جن کو علامہ کشمیری جیسے

جوہر شناس بزرگ نے ''فقیہ النفس'' کا لقب دیا ہے ––– خود بھی فتاویٰ دیا کرتے تھے، قاضی صاحبؒ نے ایک جلد میں ان فتاویٰ کو جمع کیا ہے اور اس کو اپنی بیش قیمت تعلیقات سے مزین فرمایا ہے، جن میں کہیں کہیں صاحب فتاویٰ پر استدراک بھی ہے، جہاں یہ فتاویٰ مولانا سجاد صاحب کی گہری فقہی بصیرت کے شاہد ہیں، وہیں مرتب کے عمق نظر اور وسعت مطالعہ کی دلیل بھی۔

تقریباً پانچ سال آپ سخت علالت سے دوچار رہے؛ لیکن اس علالت میں ایک خیر کا پہلو یہ تھا کہ متعدد علمی کام جو یکسوئی اور کامل توجہ کا طالب تھا اور جس کا حاصل ہونا آپ کی ملی سرگرمیوں کی وجہ سے بظاہر دشوار تھا، اس کو اس بیماری کے زمانہ نے پورا کرایا؛ چنانچہ قضاء کے موضوع پر نہایت ہی اہم کتاب ''صنوان القضاء'' پر اسی زمانہ میں آپ نے تعلیق و تحقیق کا کام کیا ہے، جو چار جلدوں میں کویت کی وزارت اوقاف سے طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے، یہ کتاب تو اپنی جگہ اہم ہے ہی، آپ کی مبسوط تعلیقات نے اس کی اہمیت میں مزید اضافہ کر دیا ہے، دوسرا اہم کام ''وزارۃ الاوقاف'' کویت سے طبع ہونے والی ''الموسوعۃ الفقھیہ'' کے ترجمے کا ہے، جسے آپ کی نگرانی میں انجام دیا جا رہا تھا اور آپ بہ نفس نفیس اس پر آخری نظر ڈالتے تھے، اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) نے اس کام کا بیڑہ اُٹھایا تھا، آپ کی وفات کے بعد یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے، جو یقیناً تو اُردو کے کتب خانہ میں ایک عظیم الشان اضافہ ہے۔

آپ کی تصنیفی اور فقہی خدمات میں ایک اہم عنوان سہ ماہی ''بحث ونظر'' کا اجراء ہے، جو اُردو زبان میں اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے، اس میں فقہ کی اُصولی بحثیں فقہی مسائل پر تحقیقی مقالات، اہم فتاویٰ و مقدمات کے فیصلے، اہم علمی شخصیتوں اور کتابوں کا تعارف اور نو طبع شدہ کتابوں پر تبصرہ کے علاوہ ملکی و ملی مسائل پر تجزیاتی شذرات بھی اداریہ کی شکل میں موجود ہوتے ہیں، یہ رسالہ اہل علم اور اصحابِ دانش کے لئے نہایت قیمتی اثاثہ ہے اور محض وقتی رسالہ نہیں؛ بلکہ مستقل دستاویز ہے، یہ رسالہ آپ ہی کی ادارت میں شائع ہوتا تھا، جس نے اہم موضوعات پر قلم اُٹھانے والے تازہ دم فضلاء کی تربیت بھی کی ہے اور ان کو متعارف بھی کرایا ہے، بحمد اللہ اب بھی راقم سطور کی ادارت میں یہ جریدہ جاری ہے۔

حضرت قاضی صاحب کی فکر کا امتیاز عدل اور اعتدال ہے، اعتقادات کے باب میں آپ کے یہاں اہل سنت والجماعت کے سلف صالحین کی رائے پر تصلب ہے؛ لیکن اختلاف رائے کے باوجود اُمت کی اجتماعیت کی اور ہندوستان میں مسلمانوں کے مشترک مسائل کے لئے زیادہ سے زیادہ اجتماعی قوت کی فراہمی کی فکر آپ کو بے چین رکھتی تھی، فقہی مسائل میں آپ کا ذوق خالصتاً اعتدال پر مبنی تھا، آپ اس تجدد اور اباحیت کے سخت مخالف تھے، جو اجتہاد کے نام پر شریعت کی نصوص تک کو خاطر میں نہیں لاتے اور اس لئے تقلید کو ایک ضرورت قرار دیتے تھے؛ لیکن دوسری طرف اس تقلید جامد کے بھی آپ قائل نہیں تھے، جس میں حالات کی تبدیلی کو نظر انداز کرتے ہوئے صرف فقہاء کی جزئیات پر جمود اختیار کیا جائے، یہاں تک کہ لوگ شریعت کو بوجھ اور نا قابل عمل سمجھنے لگیں، اجتہاد کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ یہ کہنا درست نہیں کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے؛ کیوں کہ فقہاء نے قضاء وافتاء کے لئے زیادہ مستحق اس شخص کو قرار دیا ہے، جو اجتہاد کی صلاحیت رکھتا ہو تو اگر مطلق باب اجتہاد بند ہو تو پھر یہ بات بے معنی ہو کر رہ جائے گی؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی واضح کیا ہے کہ فی زمانہ صلاحیت اجتہاد کی حامل شخصیتیں مفقود ہیں، نئے مسائل کے بارے میں آپ کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ انفرادی اجتہاد کی بجائے ان مسائل پر اجتماعی غور وفکر کی راہ اختیار کی جائے اور اسی پس منظر میں آپ نے اسلامک فقہ اکیڈمی قائم فرمائی۔

اہل علم فقہیات میں قاضی صاحبؒ کے مزاج و مذاق اور فکر ونظر کے اعتدال کو سمجھنا چاہیں تو شرعی رخصتوں اور اس کے ذیل میں آنے والی تلفیق کی بحث کو ملاحظہ کریں، جو آپ کے مضامین کے مجموعہ ''چند اہم فقہی مباحث'' میں شامل ہے، کہ کس طرح افراط وتفریط سے بچتے ہوئے رائے قائم کی گئی ہے؛ چنانچہ منصوص مسائل میں آپ کا رویہ نہایت احتیاط کا تھا، سود کے بارے میں جو احتیاط آپ نے اختیار کی ہے، اس سے بھی یہ حقیقت واضح ہے، جو مسائل اجتہادی ہیں اور ائمہ متبوعین اور سلف صالحین کے درمیان مختلف فیہ رہ چکے ہیں اور ان میں فقہ حنفی ہی پر قائم رہنے میں بدلے ہوئے حالات کی وجہ سے تنگی یا اباحیت کا اندیشہ ہے، کے

بارے میں آپ کا رجحان تھا کہ علماء اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ بہ قدر ضرورت سلف کی رائے سے استفادہ کر سکتے ہیں؛ کیوں کہ یہ دین کے مقابلہ بے دینی کو اختیار کرنا نہیں ہے؛ بلکہ یہ اختلاف کو اُمت کے لئے رحمت بنانا ہے اور تمام ہی سلف صالحین کے اجتہادات ہمارا اثاثہ اور سرمایہ ہیں، غرض کہ اگر آپ کے فقہی مزاج اور فکری مذاق کو ایک لفظ میں بیان کیا جائے تو اس کی تعبیر فکر ولی اللّٰہی کے سوا کچھ اور نہیں ہوسکتی۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں افراط وتفریط کی راہ چلنا آسان ہے اور اعتدال کی راہ پر قائم رہنا دشوار؛ کیوں کہ علمی، افراط وتفریط جذباتیت، شدت پسندی اور بے اعتدالی کو جنم دیتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے، اس لئے اگر کوئی شخص گروہی تنگ نظری اور جماعتی تعصب سے خالی ہو کر وہ بات کہتا ہو، جو انصاف کی ہو اور جس کی ضرب افراط پسند اور تفریط پسند لوگوں پر پڑتی ہو تو ان کا رویہ جارحانہ ہو جاتا ہے، امام ابوحنیفہؒ سے لے کر شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک کون ہے جو اس فکری جارحیت کا ہدف نہ بنا ہو؟ قاضی صاحبؒ نے بھی اس سنت کو پورا کیا؛ لیکن جن لوگوں کی تاریخ پر نظر ہے، وہ جانتے ہیں کہ یہ بے ثبات گھٹائیں ہیں، جو چھٹ جاتی ہیں اور جو فکر کتاب وسنت سے ہم آہنگ اور اُمت کے لئے نافع ہوتی ہے، وہی باقی رہتی ہے۔

ہندوستان میں مختلف مناصب پر فائز ہونے کے علاوہ اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ نے آپ کو اپنا رکن، انٹرنیشنل فقہ اکیڈمی جدہ نے اکسپرٹ ممبر، المجمع العلمی العالمی دمشق نے رکن اور الہیۃ الخیریہ العالمیہ نے آپ کو اپنا رکن اعزازی بنایا تھا، ۲۰؍محرم ۱۴۲۳ھ مطابق ۲؍اپریل ۲۰۰۲ء شب جمعہ کو طویل علالت کے بعد آپ کی وفات ہوئی؛ حالاں کہ آپ کی وفات کو عرصہ گذر چکا؛ لیکن دین کے مختلف محاذ پر آپ نے جو گرانقدر خدمات انجام دی ہیں اور آپ کی وفات سے جو خلاء پیدا ہوا ہے، اس کو آج تک محسوس کیا جا رہا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی حسنات کو قبول فرمائے اور جن کاموں کو انھوں نے شروع کیا تھا، اس کو جاری وساری رکھے۔ آمین

❁ ❁ ❁

امیرِ بزمِ معرفت

(مولانا قاری امیر حسن صاحب مظاہریؒ)

اس کی اُمیدیں قلیل ، اس کے مقاصد جلیل
اس کی ادا دلفریب ، اس کی نظر دل نواز

اللہ تعالیٰ نے انسان کے وجود میں ظاہر کو بھی رکھا ہے اور باطن کو بھی، ظاہر کا اثر باطن پر پڑتا ہے اور باطن کا اثر ظاہر پر، انسان کے جسم کے اوپر زخم ہو جائے، چوٹ لگ جائے، تو اصل تکلیف تو جسم کے ظاہری حصہ کو پہنچتی ہے؛ لیکن انسان کا دماغ بھی اس کے اثر کو محسوس کرتا ہے اور انسان کا دل بھی اس تکلیف سے بے سکون ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک شخص کا جگر متاثر ہو اور وہ زہریلے مادہ کو چھاننا چھوڑ دے تو انسان کے جسم کا اوپری حصہ بھی زرد نظر آنے لگتا ہے، آنکھیں بھی زرد پڑ جاتی ہیں؛ اس لئے ظاہر و باطن دونوں کا درست ہونا ضروری ہے اور دونوں کی بیماریوں کا علاج ناگزیر ہے، جیسے جسمانی اعتبار سے انسان کے وجود کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی ایک انسان کا ظاہر ہے اور ایک باطن، جس عمل کے لئے شریعت نے جو طریقہ متعین کر دیا ہے اور جو وضع مقرر فرما دی ہے، اس کا تعلق انسان کے ظاہر سے ہے، جیسے: جب نماز پڑھی جاتی ہے تو رُکوع وسجدہ کیا جاتا ہے، جب انسان حج کرتا ہے تو طواف وسعی کرتا ہے، ان افعال کا حق تو یہ ہے کہ ان کو کرتے ہوئے بندہ پوری طرح اپنے مالک کی طرف متوجہ رہے؛ لیکن اگر غفلت و بے توجہی کے ساتھ کوئی انسان ان افعال کو کر گذرے تب بھی ظاہر کے لحاظ سے عمل وجود میں آجاتا ہے، انسان کا باطن اس کا قلب ہے اور قلب کے افعال حرکات وسکنات سے نہیں؛ بلکہ کیفیات سے متعلق ہوتے ہیں، جیسے اللہ کی

محبت، ایسی محبت کہ جب وہ عبادت کرے تو اسے محسوس ہو کہ گویا اس کا خدا اس کے سامنے ہے، ایسی محبت کہ خدا سے ملاقات کا بے پایاں شوق اس کے دل میں موج زن ہو، خدا کے احکام پر عمل کرنے میں اسے لطف آتا ہو، اس کا سینہ خشیت سے معمور ہو، جب وہ کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہو تو اسے ایسا لگتا ہو کہ گویا آگ کے شعلوں کو اس نے اپنے ہاتھوں سے پکڑ لیا ہے، اس میں بندگی کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ اسے اپنا وجود سب سے حقیر اور کم تر محسوس ہو، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے دُعاء سکھائی: ''**اللھم اجعلنی فی عینی صغیرا وفی أعین الناس کبیراً**''— اسی سے انسان کے اندر تواضع، کسر نفسی، اللہ کے بندوں کی تعظیم وتوقیر، نرم خوئی اور نرم گفتاری کا مزاج پیدا ہوتا ہے۔

شوق وخوف، اللہ کے لئے محبت ونفرت، تواضع وکسر نفسی، خلق خدا پر شفقت، اخلاص، ریاء ونمود سے دوری، سنتِ نبوی کی محبت، یہ قلبی کیفیات اور باطنی اعمال ہیں، جو ہر مسلمان سے مطلوب ہیں، انسان جب ان کیفیات سے آراستہ ہوتا ہے تو اس میں خدا کے سامنے آہ وزاری اور مخلوق کے سامنے جھکاؤ و بچھاؤ کی کیفیت اس طرح رچ بس جاتی ہے، جیسے موتیا میں اس کی خوشبو اور گلاب میں اس کی خوش رنگی، ان باطنی کیفیات کو حاصل کرنے کا نام ''احسان'' ہے اور باطن کی بیماریوں کے علاج کا نام ''تزکیہ'' — احسان ایک مثبت تعبیر ہے، جس کا معنی نفس کو بہتر جذبات اور اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنا ہے، اور تزکیہ منفی تعبیر ہے، جس کے معنی نفس انسانی کو غلبہ خواہشات کی آلائش سے پاک وصاف کرنا ہے، پھر جیسے قرآن مجید میں 'تشریح قرآن' کا کوئی فنی نام نہیں رکھا گیا؛ بلکہ بعد کو اہل علم نے اس کا نام 'علم تفسیر' رکھا، یا جیسے رسول اللہ ﷺ کے فرمودات ومعمولات کو بعد میں اہل فن نے 'علم حدیث' کا نام دیا، اسی طرح قرآن وحدیث سے اصلاح وتربیت کو اخذ کر کے احسان وتزکیہ کے لئے جو طریقہ وجود میں آیا، اسے ''تصوف'' کا نام دیا گیا۔

پھر ہر فن میں کچھ وہ لوگ ہوتے ہیں، جو پایۂ کمال کو پہنچے ہوئے ہوتے ہیں، کچھ ان سے کم تر درجہ کے ناقص لوگ بھی ہوتے ہیں اور کاملین وناقصین کے ساتھ مزوّرین یعنی دھوکہ باز بھی

ہوتے ہیں، دوسرے اور تیسرے درجہ کے لوگوں کی وجہ سے اس فن کی اہمیت وضرورت اور نافعیت وافادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اسی طرح تصوف بھی ہے، تصوف میں کاملین کم، ناقصین ان سے زیادہ اور یہ تیسرے قسم کے لوگ سب سے زیادہ ہوئے، جنھوں نے تصوف کو شریعت سے آزاد، اتباعِ سنت کے نور سے محروم اور بدعات وخرافات کا سرچشمہ بنادیا، برصغیر میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، ان کا خاندان اوران کے علمی وفکری اخلاف 'مشائخ دیوبند' کی خدمات کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کے چشمۂ صافی کو بدعات وخرافات کی گندگیوں سے پاک وصاف کرنے کی بھرپور کوشش کی، زیادہ تر بزرگوں نے تو عملی طور پر اس کام کو انجام دیا؛ لیکن حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فکری اور علمی جہت سے بھی تصوف کے ان اشغال کو ثابت کیا، جو کتاب وسنت کی صراحتوں یا اشاروں سے ثابت ہیں اوران اشغال کی نفی میں بھی کسی تکلف کو راہ نہیں دیا، جو مزاجِ شریعت سے ہم آہنگ نہیں تھے، حضرت تھانوی کی ''التشرف''اور بیان القرآن پر تعلیق ''مسائل السلوک'' اس کی بہترین مثال ہے، یہاں تک کہ دیوبند کے دو چوٹی کے بزرگ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اس سلسلہ میں اپنے شیخ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ کی آراء کو بھی خاطر میں نہیں لائے اور جو باتیں خلافِ شریعت محسوس ہوئیں، ان سے اختلاف فرمایا، تصوف کے سلسلہ میں سلسلۂ ولی اللہی کی خدمات کی اہمیت اس حقیر کو خاص کر اس وقت محسوس ہوئی، جب اس کو ترکی اور مصر وشام سے تعلق رکھنے والے بعض سلاسل تصوف کے اشغال ومعمولات کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ۔

حلقۂ دیوبند کی تیسری پشت میں جن مشائخ کو نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ پوری دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی اوران کی روشنی نے مشرق سے مغرب تک کے علاقوں کو روشن اور درخشاں کردیا، ان میں ایک حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ تھے، ان کی قیامگاہ طالبین وسالکین کا مرجع وماؤیٰ بنی رہتی تھی، اس حقیر کے لئے سعادت وخوش بختی کی بات ہے کہ زمانۂ طالب علمی میں اس کی گنہگار آنکھوں نے اس منظر کو دیکھا ہے، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خلفاء میں بڑی ہی باکمال شخصیتیں گزری ہیں، ان میں ایک ممتاز اور نہایت جلیل القدر شخصیت

جن کی طرف دل کھنچتا تھا اور جن کو دیکھنے سے آنکھیں سیر نہیں ہوتی تھیں ، سیدی وسندی حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب مظاہری نوراللہ مرقدہ تھے۔

حضرت قاری صاحبؒ اپنے خالق کے پاس جاچکے ہیں ؛ لیکن ان کا سراپا آج بھی آنکھوں میں ایسا بسا ہوا ہے کہ گویا ان کی ذاتِ والا صفات سامنے جلوہ فگن ہے، نہایت کُھلا ہوا رنگ ، دودھ کی طرح سفید داڑھی ، کشادہ اور چمکتی ہوئی پیشانی ، آنکھوں سے ذہانت اور خشیت جھانکتی ہوئی ، ناک کھڑی ، لب بہت باریک سرخی لئے ہوئے ، چہرے کا مجموعہ ایسا کہ گویا چاند کا ٹکڑا یا گلاب کا پھول ، پانچ کلیوں کی کام دار ٹوپی اور اس پر سفید رومال ، متوسط قد وقامت ، نحیف ونزار جسم ، نازک سی انگلیاں ، ہتھیلیاں ایسی کہ جیسے روئی کے گالے ، جسم پر سفید جبہ اور سفید شلوار ، نصف پنڈلی تک ، پورا سراپا سنت کے مطابق ، نرم دم گفتگو ، گرم دم جستجو ، تقریر کرتے تو سادہ الفاظ میں ؛ لیکن ہر لفظ لوحِ قلب پر نقش ہوتا چلا جاتا ، خصائل وشمائل کے اس مجموعہ کا تصور کیجئے اور اس پر حضرت قاری صاحبؒ کا نام لکھ دیجئے۔

اس حقیر نے قاری صاحبؒ کا نام تو بہت پہلے سے سن رکھا تھا ؛ لیکن پہلی بار زیارت کا شرف اس وقت حاصل ہوا ، جب ایک بار مولانا محمد رضوان القاسمی صاحبؒ کے ساتھ ممبئی کا سفر ہوا ، جب ٹرین پر چڑھے تو معلوم ہوا کہ حضرت قاری صاحب بھی اسی ٹرین میں ہیں اور گلبرگہ تشریف لے جارہے ہیں ، ہم لوگ اپنی کوچ سے اُترے اور ایک دو کوچ کے فاصلے سے آگے کی کوچ میں سوار ہوئے ، وہ بھی سادہ سلیپر کلاس ہی تھا ، ایک یا دو رفقاء ساتھ تھے ، مولانا محمد رضوان صاحبؒ سے پہلے سے تعارف تھا ، مولانا مرحوم نے میرا تعارف کرایا اور حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی نسبت ذکر کی ، بڑی محبت کا اظہار فرمایا اور قاضی صاحبؒ سے اپنی ملاقات کا بھی تذکرہ کیا ، تھوڑی دیر کا ساتھ رہا ، اسی میں متعدد دُعائیں ذکر فرمائیں ، میں نے اسے نوٹ کرلیا ، پہلی ہی ملاقات میں عام مزاج کے برخلاف طبیعت کو بڑی کشش ہوئی اور بے حد

محبت واحترام کا جذبہ لے کر واپس ہوا، اس کے بعد جب بھی حضرت کی حیدرآباد تشریف آوری ہوتی، کوشش ہوتی کہ مدرسہ فیض العلوم پہنچا جائے اور عصر کی نماز میں شرکت کی جائے؛ کیوں کہ قاری صاحبؒ کا معمول عصر کے بعد کچھ بیان فرمانے کا تھا؛ مگر یہ ملاقات وزیارت دور دور کی ہوتی، مصافحہ سے آگے گفتگو کی نوبت نہیں آتی۔

اس حقیر کا اصلاحی تعلق حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ سے تھا، جب آپ کی وفات ہوگئی تو طبیعت میں تقاضہ ہوا کہ کسی اور بزرگ کے ہاتھ میں ہاتھ رکھنا چاہئے، اپنی اصلاح سے غافل نہ رہنا چاہئے، نگاہِ انتخاب مختلف بزرگوں کی طرف اُٹھتی رہی؛ لیکن دل کا سب سے زیادہ میلان حضرت قاری ہی صاحبؒ کی طرف رہا اور اس طرح حضرت سے بیعت کا شرف حاصل ہوا، اس کے بعد حضرت کی شفقتیں بڑھتی گئیں، اکثر حیدرآباد کے سفر کے درمیان غریب خانہ پر تشریف لاتے اور ناشتہ تناول کر کے سرفراز فرماتے، اہلیہ بھی آپ سے بیعت ہوگئیں، اکثر ایسے مواقع پر ناشتہ کے بعد تھوڑی دیر خواتین کے لئے پردہ سے بیان بھی فرماتے، جس میں بڑی عمدہ اور خواتین کے لئے مفید نصیحتیں ہوتیں، ایک لطیفہ بھی قابل ذکر ہے، ایک دفعہ لائبریری میں پندرہ بیس مرد حضرات بھی جمع ہوگئے اور پردہ کے پیچھے اڑوس پڑوس کی خواتین بھی، قاری صاحبؒ نے اپنے خطاب میں فرمایا کہ اس زمانہ میں جو شخص غیر محرم سے اپنی نگاہوں کی حفاظت کر لے اور اپنی بیوی کا ''عاشق'' ہو جائے، وہ اللہ کا ولی ہے، میری اہلیہ ازراہِ مزاح ہمیشہ اس جملہ کو یاد دلاتی رہتیں۔

بارہا ایسا ہوا کہ ڈاکٹروں نے قاری صاحبؒ کو کہیں جانے سے منع کر دیا، اس حقیر نے درخواست کی کہ خواہش تو ہے کہ غریب خانہ پر تشریف لائیں؛ لیکن آپ کی صحت زیادہ عزیز ہے، فرمانے لگے: تھوڑی دیر کے لئے آجاؤں گا، دوستوں کے یہاں جانے سے طبیعت بحال ہوتی ہے، وفات سے کچھ عرصہ پہلے دہلی میں مولانا محمد ابراہیم مدراسی کے مکان پر مقیم تھے، میں نے قاری صاحبؒ کے حفید سعید مولانا قطب الدین سلمہ کو فون کیا، انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نے گفتگو سے منع کیا ہے، میں نے کہا: گفتگو کی زحمت نہ دیں؛ البتہ سلام پہنچا دیں،

جب انھوں نے سلام پہنچایا اور میرے بارے میں کہا کہ وہ فون پر ہے تو قاری صاحب نے فرمایا کہ دوستوں سے گفتگو کی ممانعت تھوڑا ہی ہے، مجھ سے بات کراؤ، پھر کئی منٹ تک گفتگو کرتے رہے؛ حالاں کہ آواز میں ضعف کی وجہ سے میرا جی چاہتا تھا کہ اب بات روک دیں؛ لیکن ادب مانع تھا، یہی حضرت قاری صاحبؒ سے آخری گفتگو تھی، مجھ سے ہمیشہ فرمایا کرتے تھے کہ صبح وشام آیۃ الکرسی اور معوذتین پڑھنے کا ضرور اہتمام کریں: کیوں کہ یہ حاسدین سے حفاظت کے لئے اکسیر ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ عزت وسر بلندی اور شہرت وناموری عطا فرماتے ہیں، وہ لوگوں کے محسود بن جاتے ہیں۔

حضرت قاری صاحبؒ کی اس حقیر پر شفقت ومحبت اور لطف وعنایت کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ مسائل شرعیہ میں اس حقیر پر بہت اعتماد فرماتے تھے، اِدھر صورتِ حال یہ تھی کہ حیدرآباد میں ان کے متوسلین کے درمیان کوئی نزاع ہوجاتی، ازدواجی یا کاروباری مسائل پیدا ہوتے، حلال وحرام کے بارے میں تحقیق کی ضرورت ہوتی تو عموماً انھیں اس حقیر سے مراجعت کا حکم دیتے؛ بلکہ دہلی، لکھنؤ، ممبئی، علی گڑھ وغیرہ سے بھی قاری صاحبؒ کے حوالہ سے علماء اور عوام کا فون آتا رہتا تھا کہ فلاں مسئلہ درپیش ہے، حضرت قاری صاحب نے آپ سے رُجوع کرنے کا حکم دیا ہے، قاری صاحبؒ کے اس اعتماد واعتبار پر مجھے غیر معمولی روحانی مسرت کا احساس ہوتا تھا۔

'المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد' کو شروع سے قاری صاحبؒ کی دُعائیں اور نیک تمنائیں حاصل رہیں، اس کی مرکزی عمارت کا افتتاح قاری صاحب نے فرمایا اور درسگاہ کا بھی، جب مرکزی عمارت کا افتتاح کیا تو صرف دو منزلیں ایک حد تک مکمل ہوئی تھیں، فرش کا کام ابھی باقی تھا اور صورتِ حال یہ تھی کہ نہ پانی کی سہولت تھی اور نہ لائٹ کی، نہ ٹیلیفون میسر تھا، نہ راستہ تھا، پانی ٹینکر سے منگوایا جاتا تھا، لوگوں کے افتادہ اور ناہموار پلاٹ سے راستہ کا کام پورا ہوتا تھا، لائٹ 'حیدرآباد مینجمنٹ اسکول' کی طرف سے ملی تھی، وہ بھی پورے وقت نہیں، اور وولٹیج

بھی بہت کم، ٹیلیفون کی رسائی نہیں تھی، اور موبائل کا نٹ ورک کام نہیں کرتا تھا، لوگ وہاں معہد کی بلڈنگ کی تعمیر کو ایک جنون خیال کرتے تھے اور شاید وہ اپنے خیال میں حق بجانب بھی تھے، یہ پوری صورتِ حال اس حقیر نے قاری صاحب کے سامنے رکھی، جو طلبہ اس وقت تھے — اور بڑی تکلیف میں تھے — قاری صاحبؒ نے ان کو نصیحت فرمائی کہ آپ اس ادارہ کی تاریخ بنا رہے ہیں اور تاریخ بنانے والوں کو صبر وثبات قدمی کے مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کے اولین رفقاء کی کیفیت تھی؛ اس لئے آپ حضرات مشقت برداشت کریں گے تو آئندہ نسلوں کے لئے اللہ ساری سہولتیں پیدا فرمادیں گے، پھر بڑے الحاح کے ساتھ ادارہ کے لئے اور اس کی ایک ایک ضرورت کے لئے دُعاء فرمائی اور پھر کچھ اسی طرح یہ ساری ضروریات بہتر طریقہ پر پوری ہوتی گئیں کہ میں آج بھی سوچ کر حیرت زدہ ہوں، سات آٹھ سال کے عرصہ میں چار منزلہ عمارت مکمل ہوئی، مسجد بنی، درسگاہ کی الگ عمارت تیار ہوگئی، ڈھائی ایکڑ کے قریب زمین حاصل ہوئی، بہترین سڑک بن گئی، لائٹ اور فون کی سہولت مہیا ہوگئی اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ معہد کو جو نیک نامی حاصل ہوئی، وہ اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے کہ نہ صرف ہندوستان کے کونے کونے سے طلبہ یہاں تک پہنچے؛ بلکہ امریکہ، کناڈا، برطانیہ، جنوبی افریقہ، ماریشس، سری لنکا اور بعض دوسرے علاقوں کے طلبہ نے بھی یہاں سے استفادہ کیا، جب کہ بہتوں کو قانونی مسائل کی وجہ سے روکنا پڑا، پھر اس قلیل عرصہ میں جو علمی کام یہاں سے انجام پائے، وہ ستر پچھتر ہزار صفحات سے کم نہیں ہیں، نیز ابھی تک فضلاء کے تیس سے زائد مقالات شائع ہو چکے ہیں، جن میں بعض چھ سات سو صفحات پر مشتمل ہیں اور ان کی بڑے بڑے اہل علم نے داد دی، میں ان سب کو اللہ تعالیٰ کا فضلِ خاص اور حضرت قاری صاحبؒ کی دُعاؤں کا اثر سمجھتا ہوں۔

جب بھی اس حقیر نے معہد کے لئے دعوت دی، قاری صاحبؒ نے قبول فرمایا، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ڈاکٹر نے بات کرنے سے منع کر دیا تھا، اس لئے میں نے درخواست کی کہ صرف دُعاء فرما دیجئے اور اساتذہ آپ سے مصافحہ کرلیں؛ لیکن قاری صاحبؒ جب معہد پہنچے

تو آدھ گھنٹہ سے بھی زیادہ خطاب فرمایا اور اساتذہ کے علاوہ طلبہ کو بھی مصافحہ کی سعادت بخشی، معہد کے کئی اساتذہ بھی قاری صاحب سے ارادت کا تعلق رکھتے تھے، جب بھی کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو میں قاری صاحب کو فون کرتا اور دُعاء کی درخواست کرتا، بین الاقوامی قرآن مجید سیمینار کے موقع سے دُعاء کی درخواست کی اور قاری صاحبؒ نے ہاتھ اُٹھا کر دُعاء فرمائی اور ایک دُعاء بتاکر اس کے اہتمام کی بھی تلقین کی، بحمد اللہ یہ سیمینار بڑی کامیابی کے ساتھ منعقد ہوا۔

قاری صاحبؒ سے جب اس حقیر نے بیعت ہونے کی درخواست کی تو یہ بھی عرض کر دیا کہ تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کا مشغلہ رہتا ہے، اور کچھ ملی کاموں میں بھی ہاتھ بٹانا پڑتا ہے ؛ اس لئے زیادہ وقت اذکار و اوراد میں نہیں لگا پاتا، قاری صاحب نے فرمایا کہ میں زیادہ مشغول تو نہیں تھا ؛ لیکن کمزور تھا ؛ اس لئے حضرت رائے پوریؒ نے مجھے حسب سہولت معمولات پر عمل کرنے کی رائے دی تھی ؛ چنانچہ اس حقیر کو قاری صاحب نے کلمہ طیبہ اور اسم ذات کو پڑھنے کی اور سنتوں کی حتی المقدور پیروی کرنے کی تلقین کی اور فرمایا کہ جتنا آسانی سے پڑھ سکو پڑھ لو، ذکر کی کثرت ان لوگوں سے کرائی جاتی ہے، جو دنیا کے کاموں میں مشغول ہوں، علماء جو درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور فتویٰ نویسی وغیرہ میں مشغول ہوں، ان کے لئے حسبِ سہولت اوراد کا پڑھنا کافی ہے ؛ البتہ جو بھی کام کرے، اسے اخلاص کے ساتھ انجام دینے کی کوشش کرے —— میں اپنی نااہلی اور کم ظرفی کی وجہ سے زیادہ استفادہ تو نہیں کر سکا ؛ لیکن جب بھی قاری صاحب سے ملاقات ہوتی اور کچھ دیر ان کی صحبت میں بیٹھنے کا موقع میسر آتا تو ایک نشاط سا محسوس ہوتا۔

مجھے حضرت قاری صاحبؒ سے باضابطہ پڑھنے اور زیادہ ان کی صحبت میں رہنے کا شرف حاصل نہیں ہو سکا ؛ لیکن تھوڑا بہت جو ملاقات کا موقع میسر آیا، اس میں ایک سنہرا وقت ’میل وشارم‘ میں اعتکاف کا تھا، ایک ہی بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی، وہ بھی چند روز

کے لئے، اس دوران قاری صاحبؒ کا مجاہدہ دیکھ کر حیرت ہوئی، نقاہت اس قدر کہ اُٹھنا بیٹھنا دشوار، آواز پر بھی ضعف کا اثر؛ لیکن پوری تراویح کھڑے ہوکر ادا فرماتے، تراویح کے بعد بیان فرماتے اور اس میں علم ومعرفت کے ایسے نکات آجاتے جو کتابوں میں نظر نہیں آتے ہیں، الفاظ سادہ، لب ولہجہ دھیما؛ لیکن ایسا لگتا تھا کہ ہر لفظ دل کی گہرائیوں میں اُترا جارہا ہے، بار بار آنکھیں آنسوؤں سے وضو کرتیں، اللہ کی محبتَ بڑھتی اور اتباعِ سنت کا شوق کروٹیں لیتا، اس درمیان اس حقیر کے ساتھ حضرت کی خاص شفقتیں رہیں، قاری صاحبؒ نے منتظمین سے فرمایا کہ میرا انتظام مدرسہ کے کسی کمرہ میں کردیا جائے؛ کیوں کہ مسجد میں بہت اژدحام ہے اور اِن کا اعتکاف نفل ہے، مسجد میں دو معتکف حجرہ کی شکل میں بنے ہوئے تھے، ایک میں حضرت قاری صاحبؒ تھے، اور ایک میں پروفیسر نادر صاحب (علی گڑھ) اور مولانا محمد ابراہیم افریقی، کھانے اور سحری کا خصوصی انتظام قاری صاحب کے حجرہ میں ہوتا تھا، اس موقعہ پر قاری صاحب اپنے ان دو رفقاء کے ساتھ اس حقیر کو بھی یاد فرمالیتے، جس دن واپس ہوا، اس دن اس حقیر کو سو روپے بطور ہدیہ کے عنایت فرمایا اور اپنا واقعہ ذکر فرمایا کہ وہ مدینہ منورہ میں رُک جانا چاہتے تھے؛ مگر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے فرمایا کہ میں تو یہاں مرنے کے لئے آگیا ہوں، پیارے! تم لوگ ہندوستان جاؤ اور وہاں کام کرو، وہاں کام کا موقع بھی ہے اور کام کی ضرورت بھی ہے، پھر مجھے رخصت کرتے ہوئے سو ریال دیئے اور فرمایا کہ یہ میری طرف سے ہدیہ ہے اور قرض جتنا چاہو لے لو، میں نے کہا کہ یہ ہدیہ میرے لئے تبرک ہے اور قرض کی ضرورت نہیں۔

قاری صاحبؒ کی شفقت وعنایت ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب بھی میری کوئی نئی تحریر شائع ہوتی اور اسے آپ کی خدمت میں پیش کرتا تو بڑی حوصلہ افزائی فرماتے اور دُعائیہ کلمات کہتے، جب اس حقیر نے آسان اور عام فہم زبان میں قرآن مجید کے ترجمہ اور حواشی کا کام شروع کیا اور اس کے لئے استخارہ کیا تو خواب میں دو بزرگوں کو دیکھا، حضرت مولانا

قاری محمد طیب صاحبؒ کو اور حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ کو، اور وہ اس طور پر کہ میں نے اپنے ہاتھ میں گُڑ کے ڈھیلے لے رکھے ہیں، میں نے اسے حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ کی خدمت میں پیش کیا اور انھوں نے میرے ہاتھ سے لے کر حضرت قاری محمد طیب صاحبؒ کی طرف بڑھا دیا، اسے میں نے فالِ نیک سمجھا کہ حضرت قاری امیر حسن صاحبؒ کا اس کو لینا انشاءاللہ اس کی قبولیت کا اشارہ ہے، اور قاری محمد طیب صاحبؒ کا ان کے ہاتھ سے قبول فرمانا گویا علمی اور فکری اعتبار سے اس کی توثیق وتائید ہے، خدا کرے اس کی یہی تاویل ہو اور اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کام کو مکمل کرائیں، قاری صاحب سے جب اس کا ذکر کیا تو فرمایا: انشاءاللہ ترجمہ مقبول ہوگا۔

قاری صاحبؒ کی بہت سی باتیں وہ ہیں، جو قلب و ذہن کو متاثر کرتی تھیں؛ لیکن میرے تجربہ میں جو باتیں آئیں، ان کا تذکرہ مناسب محسوس ہوتا ہے، قاری صاحب کا سب سے اہم وصف تواضع اور بےنفسی ہے، بعض علماء ومشائخ کی زبان پر بھی — تحدیث نعمت کے طور پر — ایسے فقرے آجاتے ہیں کہ جس سے ان کی بڑائی کا اظہار ہوتا ہے؛ لیکن قاری صاحب کے یہاں یہ بات چھوکر بھی نہیں گذری تھی، اگر کبھی کسی نے کوئی تعریف کی بات کہی تو گفتگو کا موضوع بدل دیتے یا اس خوبی کو اپنے بزرگوں کی طرف منسوب فرما دیتے، کئی بار ایسا ہوا کہ خطاب کے بعد جب ملاقات کی تو فرمانے لگے: آپ ماشاء اللہ قضاء و افتاء کا اور تدریس کا کام کرتے ہیں، اگر کوئی غلطی ہوگئی ہو یا کوئی قابل اصلاح بات ہو تو بتا دیجئے، مجھے بےحد شرمندگی ہوتی اور عرض کرتا کہ یہ ناکارہ تو آپ کی مجلس میں اپنی اصلاح کے لئے حاضر ہوتا ہے۔

آپ کا اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، تخاطب کا انداز، ہر عمل تواضع کا مظہر ہوتا، اپنے معاصرین کا ذکر بھی اس درجہ احترام کے ساتھ کرتے، جیسے اپنے اساتذہ کا کیا کرتے تھے، میں نے بارہا حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور بعض اور بزرگوں کا تذکرہ ان کی زبان سے سنا، جو عمر اور نسبت کے اعتبار سے ان کے معاصر تھے؛

بلکہ بعض ان لوگوں کا، جو عزیز کے درجہ میں ہیں، جیسے حکیم کلیم اللہ صاحب (علی گڑھ)، ان سب کا تذکرہ بے حد احترام اور القاب و آداب کے ساتھ فرماتے۔

اسی تواضع کا ایک پہلو یہ ہے کہ جب بھی خطاب فرماتے، اپنے کسی بزرگ کی کتاب سے اس کی ابتداء کرتے، آدھا ایک صفحہ پڑھ کر پھر اس کی تشریح کرتے اور اپنی بات کہتے۔

قاری صاحب کا مزاج گمنامی اور اپنے آپ کو چھپا کر رکھنے کا تھا، اس کا اندازہ آپ کے بزرگوں کو بھی تھا؛ چنانچہ حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اپنے ایک مکتوب میں آپ کو لکھا یا: ''میرے نزدیک تو ان لوگوں کی بہت قدر ہے، جو زیادہ چھپ کر رہتے ہیں، یہ صفت آپ میں پہلے ہی سے موجود ہے'' —— رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: جو اللہ کے لئے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ اسے بلندی عطا فرماتے ہیں: ''من تواضع لله رفعه الله'' یہی کیفیت حضرت قاری صاحبؒ کی تھی کہ جتنا انھوں نے اپنے آپ کو مٹایا اور اپنے بڑوں کے سامنے اپنے آپ کو جھکایا اور بچھایا، اسی قدر اللہ نے ان کے چھوٹوں کے دل میں ان کی محبت ڈال دی اور اخیر کا زمانہ تو ایسا تھا کہ وہ اصلاح و ارادت کی جہت سے ہندوستان کے بڑے بڑے علماء، دانشوران اور دعوت و تبلیغ سے مربوط لوگوں کا مرجع بن گئے تھے۔

قاری صاحبؒ کا دوسرا امتیازی وصف اپنے بزرگوں سے بے حد تعلق، انتہائی درجہ کی محبت اور غیر معمولی عقیدت تھی، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، حضرت مولانا وصی اللہ صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ، حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ، حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ کے تذکرہ سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ پرتاب گڑھی اور حضرت خواجہ مجذوب صاحبؒ کے اشعار بھی کثرت سے سناتے۔

قاری صاحب کا تیسرا اہم وصف سلف صالحین کی طرح 'تعلق مع اللہ' تھا، جب بھی کوئی شخص آتا اور اپنی مصیبت ذکر کرتا تو دُعا کی تلقین فرماتے، اس حقیر سے کئی بار فرمایا کہ جب ہم

لوگ ہردوئی میں تھے تو ناظم صاحب (حضرت مولانا ابرارالحق صاحبؒ) نے پہلے ہی تحریر لکھالی تھی کہ تنخواہ کے مطالبہ کا حق نہیں ہوگا، اتفاق سے اتنی تنگی ہوئی کہ کئی مہینے گذر گئے، اساتذہ کو تنخواہ نہیں مل سکی، اسی دوران شاہ عبدالغنی صاحب پھولپوریؒ تشریف لائے، ہم لوگوں نے ان کے سامنے صورتحال رکھی، انھوں نے ''**حسبنا الله ونعم الوكيل**'' پڑھنے کی ہدایت دی، ہم لوگوں نے پڑھنا شروع کیا، پھراس کے بعد کبھی ایسی تنگی پیدا نہیں ہوئی، پھر قاری صاحب نے قرآن مجید کے سیاق وسباق سے اس آیت کی اہمیت سمجھائی اور شاہ ولی اللہ صاحب کی 'تفہیمات الٰہیہ' کا بھی حوالہ دیا۔

قاری صاحبؒ کی ایک اہم خصوصیت جس کا اس حقیر کو بارہا تجربہ ہوا، وہ ہے ان کا مستجاب الدعوات ہونا، عام طور پر جو دُعاء فرماتے، وہ قبول ہوتی، معہد کی مالی مشکلات میں بھی ہم نے اس کا تجربہ کیا، تعمیری مسائل اور دوسری ضروریات میں بھی اور بعض گھریلو تقریبات میں بھی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، میں نے بہت پہلے سستے داموں اپنی قدیم رہائش سے قریب ایک زمین خریدی تھی، جب معہد کا قیام عمل میں آیا اور قبا کالونی کی چڑھائی پر اس کی عمارت بنی تو خیال ہوا کہ اگر اس سے قریب کوئی زمین تعمیر کے لئے مل جاتی تو بڑا اچھا ہوتا، اس وقت ایک نشیبی زمین تھی اور سڑک بھی بنی ہوئی نہیں تھی؛ اس لئے بہت کم قیمت میں مل گئی، اس کی نشان دہی عزیزی مولانا محمد اشرف علی قاسمی سلمہ (استاذ معہد) نے کی تھی، بہرحال کچھ قرض لے کر میں نے وہ زمین خرید کرلی کہ کبھی سہولت ہوگی تو پہلے کی زمین فروخت کر کے یہاں پر مکان تعمیر کرلوں گا؛ لیکن بہ ظاہر ایسا موقف نہیں تھا، میری ایک کتاب 'کویت' سے شائع ہوئی تھی، جس کی رائلٹی کے طور پر ساٹھ ستر ہزار روپے ملے تھے، اس میں سے چالیس ہزار سے اوپر رقم بچی ہوئی تھی، جس سے بنیاد کا کام بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

میں حضرت قاری صاحبؒ کو لے کر معہد جارہا تھا، راستہ میں وہ زمین دکھائی اور عرض

کیا کہ مکان بنانے کے لئے لی گئی ہے، دُعاء فرمایئے کہ مکان بن جائے؛ تاکہ میں مدرسہ سے قریب ہوجاؤں، قاری صاحب نے گاڑی رکوائی، زمین کے ناہموار ہونے کے باوجود وہاں تشریف لائے، دیر تک دُعاء فرمائی اور بار بار کہا کہ اے اللہ! غیبی مدد کا معاملہ فرمایئے، —— پھر مجھ سے کہا کہ تعمیر شروع کرادیجئے، اللہ پورا کریں گے، میں نے عرض کیا: حضرت! میرے پاس صرف چالیس پچاس ہزار روپے ہیں، اس سے تو شاید بنیاد کا کام بھی پورا نہ ہوپائے، قاری صاحبؒ نے فرمایا: آپ کام شروع تو کرایئے، اللہ پورا کریں گے اور وہی پورا کیا کرتے ہیں، اس بات کو انھیں نے ایک سے زائد دفعہ فرمایا، پھر جب مدرسہ سے واپسی ہوئی اور وہاں سے گذر ہوا تو پھر یہی بات فرمائی، مجھے خیال ہوا کہ اللہ کے ایک بندہ صالح کا بار بار یہ کہنا عبث نہیں ہے، اس میں کوئی مصلحت ضرور ہوگی؛ چنانچہ میں نے کام شروع کرادیا اور مختلف حضرات سے اس طور پر قرض کی بات کی کہ ادائے گی میں تاخیر ہوسکتی ہے؛ لیکن وہ قرض کا مطالبہ نہیں کریں گے، میں اپنی سہولت سے ادا کروں گا؛ چنانچہ اسی وعدہ کے ساتھ متعدد دوستوں نے قرض عنایت کیا، یا تعمیری سامان فراہم کیا اور اللہ کا شکر ہے کہ چھ ماہ یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ میں مکان تیار ہوگیا، بعد کو میں نے اپنی وہ زمین فروخت کر کے جو بہت پہلے خرید کی تھی، زیادہ تر قرض ادا کردیا اور مکان بھی میرے ارادے سے بڑھ کر راحت بخش میسر ہوگیا، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل اور قاری صاحبؒ کی دُعائے مستجاب کا اثر ہے کہ مکان بھی بن گیا اور سوائے ایک قرض کے سارے قرض بھی ادا ہوگئے۔

قاری صاحب کی تواضع، سادگی اور عوامی بیان کی وجہ سے عام طور پر ان کی علمی گہرائی کی طرف ذہن نہیں جاتا تھا؛ لیکن بعض اوقات بڑے علمی مضامین نہایت سادہ انداز پر آپ کے خطاب میں آجایا کرتے تھے، ایسی ہی باتوں میں سے ایک یہ ہے کہ فرماتے تھے: سب سے زیادہ ادب واحترام اور مباحات میں اطاعت والدین کی ہے؛ کیوں کہ والدین کی اطاعت کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً مذکور ہے، اس کے بعد اساتذہ کا درجہ ہے،

جیسے والدین انسان کی جسمانی نشو ونما کا ذریعہ ہیں، اسی طرح اساتذہ معنوی اور ذہنی نشو ونما کرتے ہیں، اس کے بعد درجہ شیخ کا ہے؛ لیکن آج کل معاملہ اس کے برعکس ہے، لوگ سب سے زیادہ تعظیم اور اطاعت شیخ کی کرتے ہیں، اس سے کم اساتذہ کی اور سب سے کم والدین کی۔

ایک بار خواتین سے خطاب کرتے ہوئے تسبیح فاطمی کا ذکر کیا اور فرمایا کہ حضرتِ فاطمہؓ نے رسول اللہ ﷺ سے اُمورِ خانہ داری کو انجام دینے کی مشقت اور تعب کا ذکر فرمایا تھا اور حضور ﷺ نے اس کے مقابلہ میں ''سبحان اللہ، الحمد للہ، اللہ اکبر'' کی تسبیحات سکھائی تھیں، اس سے معلوم ہوا کہ اگر خواتین گھر کے کام کاج سے تھک گئی ہوں اور سوتے وقت اِن تسبیحات کو پڑھ لیں تو انشاء اللہ وہ راحت و آرام محسوس کریں گی اور آخرت میں تو اجر ہوگا ہی، حقیقت یہ ہے کہ یہ نکتہ اس سے پہلے میں نے کہیں نہ پڑھا تھا اور نہ سنا تھا۔

یہ بات بار بار فرماتے کہ تصوف 'شریعت کی اطاعت، سنت کی اتباع اور معاملات کی درستگی' کا نام ہے، تصوف کے بعض اشغال جن کا صراحتاً قرآن وحدیث میں ذکر نہیں ملتا، ان کے بارے میں فرمایا کہ ان کی حیثیت انتظام وتدبیر کی ہے، جیسے دینی تعلیم کی اہمیت ثابت ہے ؛لیکن مدارس کا مروجہ نظام تجربہ اور تدبیر پر مبنی ہے، اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوریؒ ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اور حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ کی حاضری اور گفتگو کا ذکر فرماتے اور کہتے کہ جب ان حضرات نے شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے دریافت کیا کہ آپ کے یہاں جو ذکر کی مجلس ہوتی ہے، اس کی کیا اصل ہے؟ تو انھوں نے پہلوتہی سے کام لیتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگ بڑے بڑے کام کر رہے ہیں، یہ اتنی صلاحیت نہیں رکھتے ؛ اس لئے میں نے ان کی اصلاح کے لئے یہ طریقہ اختیار کیا ہے، پھر مولانا نعمانی نے بار بار اپنے تردد کا اظہار کیا تو فرمایا کہ یہ بطور علاج وتدبیر کے ہے اور علاج کا تعلق تجربہ سے ہوتا ہے۔

اگرچہ حضرت قاری صاحبؒ کا تصنیف وتالیف سے زیادہ شغف نہیں تھا؛ بلکہ انھوں نے

تدریس واصلاح کے ذریعہ خدمت انجام دی؛ لیکن آپ کے ملفوظات ''کلماتِ صدق وعدل'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں جو مولانا احمد علی صاحب اور مولانا محمد وسیم صاحب کے مرتب کئے ہوئے ہیں، یہ بڑے ہی چشم کشا اور دل کو چھونے والے ملفوظات ہیں، ایک دفعہ کتاب اُٹھائیے تو جی چاہتا ہے کہ پوری کتاب پڑھ جائیے، اس حقیر نے کئی بار اس مجموعہ کا مطالعہ کیا اور اس طور پر کہ جیسے ایک پیاسا تپش کے ماحول میں اپنی پیاس بجھانے کے لئے بار بار پانی پیتا ہے!

قاری صاحب کا دعوت و اصلاح میں بھی اپنا رنگ تھا، میٹھے بول، نرم لب و لہجہ اور مخاطب کے احترام کی پوری رعایت کے ساتھ اصلاح کی کوشش، اس کی کئی مثالیں میری نظر سے گذریں، دو ایسے حضرات جن میں سے ایک داڑھی نہیں رکھتے تھے اور ایک کی داڑھی بہت چھوٹی اور خشخشی تھی، میرے ملنے والوں میں تھے، یہ میرے ساتھ الگ الگ ملاقاتوں میں حضرت قاری صاحبؒ سے ملے، قاری صاحبؒ نے بڑی محبت کے ساتھ ایک دو جملوں میں نصیحت فرمائی اور انھیں دُعائیں بھی دیں، نتیجہ یہ ہوا کہ اسی دن سے انھوں نے داڑھی رکھنا اور بڑھانا شروع کردیا، نہ بار بار ٹوکنے کی نوبت آئی نہ غصہ کرنے اور برہم ہونے کی۔

ایک بڑے صاحب ثروت شخص تھے، جن کے یہاں اچھا خاصا عملہ کام کیا کرتا تھا، مگر داڑھی نہیں رکھتے تھے، بعض بزرگوں نے انھیں اس گناہ سے منع کیا اور نہی عن المنکر میں کسی قدر درشتی پیدا ہوگئی، جو بعض اوقات مطلوب ہوتی ہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان صاحب پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا، اتفاق سے بعد میں حضرت قاری صاحبؒ وہاں تشریف لے گئے، اتباعِ سنت پر خطاب فرماتے ہوئے داڑھی کی اہمیت اور داڑھی نہ رکھنے کی وعید کو بیان فرمایا اور ذکر کیا کہ اس کا تعلق قانون سے زیادہ محبت سے ہے، آدمی کو جس سے محبت ہوتی ہے، اس کی ہر چیز محبوب ہوجاتی ہے؛ چوں کہ مجمع میں دونوں طرح کے لوگ موجود تھے، اس لئے فرمایا: لیکن داڑھی رکھنے والے داڑھی نہ رکھنے والوں کو حقیر نہ سمجھیں؛ کیوں کہ انجام معلوم نہیں، پھر مثال دی کہ

جب ہندوستان آزاد ہوا اور فرقہ وارانہ جنون اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو بہت سے داڑھی والوں نے حالات سے ڈر کر داڑھیاں منڈالیں کہ کہیں قتل کر دیا جاؤں ، اور بہت سے داڑھی نہ رکھنے والوں نے یہ سوچ کر داڑھی رکھ لی کہ جب مرنا ہی ہے تو مسلمانوں کی صورت پر مریں گے ،تو دیکھئے داڑھی نہ رکھنے والے انجام کے اعتبار سے داڑھی رکھنے والوں سے بہتر ثابت ہوئے ؛ اس لئے ہوسکتا ہے کہ آج آپ کا کوئی بھائی داڑھی رکھے ہوا نہ ہو؛ لیکن انجام کار وہ دین پر آجائے اور ایک شخص آج داڑھی رکھے ہوا ہے؛ لیکن ہدایت کے بعد گمراہی میں مبتلا ہوجائے ، اس لئے کسی بھی مسلمان کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے ، قاری صاحب کے اس دردمندانہ خطاب کا ان پر ایسا اثر پڑا کہ وہ اپنے تمام عملہ کے ساتھ مجلس کے بعد حاضر ہوئے ، توبہ کی اور عزم کیا کہ آئندہ ہم سب سنت کے مطابق داڑھی رکھا کریں گے۔

'میل وشارم' میں ایک صاحب آئے ،انھیں سورۂ یٰسین یاد نہیں تھی ،قاری صاحب نے انھیں اس کی تلقین فرمائی اور پھر اپنی زبان سے انھیں بسم اللہ کے بعد ''یٰسن و القرآن الحکیم '' پڑھایا اور جب انھوں نے زبانی سنایا تو فرمایا کہ آپ ماشاء اللہ دو آیتوں کے حافظ ہوگئے ،کیا عجب کہ حفظِ قرآن کے اجر میں آپ بھی شامل ہوجائیں ،آپ اسی طرح روزانہ ایک ایک ، دو دو آیتیں یاد کرتے چلے جائیں — قاری صاحبؒ کا یہ محبت آمیز لب ولہجہ اور دردمندانہ اُسلوب دل کو موم بنا دیتا تھا۔

یہ نرم خوئی تو اپنی جگہ؛ لیکن جہاں ضرورت سختی اور درشتی کی ہوتی ، وہاں نرم روی کو راہ نہیں دیتے تھے ، ایک بڑے عالم کے صاحبزادے کا نکاح تھا ،لڑکی والوں کا قاری صاحب سے ارادت کا تعلق تھا ، نکاح مدرسہ فیض العلوم کی مسجد میں تھا اور قاری صاحب سے گذارش کی گئی تھی کہ وہ نکاح پڑھائیں ؛ لیکن معلوم ہوا کہ لڑکی والوں کی طرف سے کھانے کا انتظام ہے ، قاری صاحب کو یہ بات بہت گراں گذری اور آپ نے نکاح نہیں پڑھایا ، ایک دوسرے عالم — جن کو بیرونِ ریاست سے حیدرآباد آنے کی دعوت دی گئی تھی — انھوں نے خطاب کیا اور خطبہ دیا ، نکاح میں ، میں بھی شریک تھا ، عصر کے بعد نکاح ہوا اور مغرب کے بعد میں قاری

صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت تک قاری صاحب پر ناراضگی قائم تھی، فرمایا کہ علماء بھی ایسی باتوں کو رواج دیں گے اور سنت کے خلاف عمل کریں گے تو عوام کی اصلاح کیسے ہوگی؛ پھر مجھ سے دریافت فرمایا کہ کیا نکاح کے موقع سے لڑکی والوں کی طرف سے کھانا کھلانا ثابت ہے؟ میں نے کہنا چاہا کہ مصنف عبدالرزاق میں روایت موجود ہے کہ حضرت فاطمہؓ کے نکاح کے موقع پر حضور ﷺ نے کھانے کا اہتمام فرمایا تھا؛ لیکن قاری صاحب پر اس وقت ایک جلال کی کیفیت تھی اور چہرہ سرخ ہوگیا تھا؛ اس لئے مجھے زبان کھولنے کی ہمت نہیں ہوئی، میں نے صرف اتنا عرض کیا کہ اس طرح کی رسم بنالینا مناسب نہیں اور خاص کر علماء اور خواص کو تو اس سے بچنا ہی چاہئے۔

قاری صاحبؒ کا سن پیدائش ۱۹۲۶ء ہے، ابتدائی تعلیم مدرسہ کرامتیہ جونپور میں حاصل کی، ۱۳۵۵ھ میں مدرسہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخلہ لیا اور متوسطات سے دورۂ حدیث شریف تک یہیں سے کسبِ فیض کیا، ۱۳۶۳ھ میں فارغ ہوئے اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہیؒ کے مشورہ سے ہردوئی میں تدریسی خدمت میں مصروف ہوگئے، آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی مظفر حسین تھا، جو اگرچہ عالم دین نہیں تھے؛ لیکن پابند صوم وصلوٰۃ تھے، زمانۂ طالب علمی ہی میں شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ سے بیعت ہوئے، ان کی وفات کے بعد مولانا محمد زکریا صاحبؒ سے اصلاحی رشتہ قائم فرمایا، ۲۸/رمضان المبارک جمعہ کے دن عصر کی اذان کے بعد ۱۳۸۵ھ میں انھوں نے قاری صاحب کو اپنی خلافت واجازت سے سرفراز فرمایا، اس وقت تک آپ نے بہت کم لوگوں کو اجازت دی تھی، تقریباً ستر سال مدرسہ اشرف المدارس ہردوئی سے بہ حیثیت صدر مدرس وابستہ رہے اور حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ کے حسبِ حکم ضرورت کے مطابق اس کی شاخوں میں بھی تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دیئے، خاص کر مدرسہ فیض العلوم حیدرآباد میں زیادہ دنوں قیام ہوتا تھا؛ اسی لئے حیدرآباد سے بڑا تعلق تھا، ہر سال کئی بار یہاں ورودِ مسعود ہوتا اور اِن دنوں لوگ کھنچے کھنچے فیض العلوم کی طرف آتے

اور آپ کی صحبت سے فائدہ اُٹھاتے، حیدرآباد میں آپ کے تلامذہ اور متوسلین کی بڑی تعداد ہے؛ اس لئے اہل شہر سے خاص اُنس تھا اور معلوم ہوا کہ ممبئی کے آخری سفر میں بھی حیدرآباد آنا چاہتے تھے۔

جیسے حضرت قاری صاحب اپنے بزرگوں سے بے حد محبت رکھتے تھے، اسی طرح وہ خود بھی اپنے بزرگوں کے محبوب اور منظورِ نظر تھے، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ بے حد شفقت کا معاملہ فرماتے تھے اور بہت سی دفعہ اپنے کمرے میں سلاتے تھے، حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ نے اپنا خصوصی جبہ قاری صاحب کو عنایت فرمایا اور آپ کے بارے میں بڑے بلند کلمات کہا کرتے تھے، انھوں نے ایک خط میں قاری صاحب کو لکھا ہے کہ: ''میرے لئے اعتکاف میں آپ جیسے لوگوں کا آجانا ہی موجب کامیابی اور مجمع کے لئے خیر و برکت ہے'' ایک خط میں لکھتے ہیں: ''یہ سیاہ کار آپ کی محبت کو اپنے لئے ذخیرہ آخرت اور وسیلۂ نجات سمجھتا ہے'' ایک موقع پر لکھتے ہیں: ''تم جیسے مخلصوں کی آمد کو یہ ناکارہ اپنے لئے موجب سعادت سمجھتا ہے'' ایک خط میں لکھا: ''آپ کو تشریف لانے کے لئے اجازت کی بھی ضرورت نہیں'' ''البيت بيتكم'' جب چاہیں شوق سے تشریف لاویں، آپ کی آمد میرے لئے موجب مسرت و فرحت؛ بلکہ موجب عزت ہے''۔

حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحبؒ ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں کہ جو چیز اللہ پاک نے آپ کو عطا فرمائی ہے، اس سے بہت سے مجاز بیعت محروم ہیں، حضرت مولانا منور حسین صاحبؒ نے قاری صاحبؒ کو ایک خط میں تحریر فرمایا کہ آپ پر مجھے رشک آتا ہے، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ آپ سے بے حد محبت بھی فرماتے اور بڑا اکرام بھی کرتے، اور اوقات کی سخت پابندی کے باوجود آپ کو کسی بھی وقت آنے کی اجازت تھی۔

انسان کی زندگی جیسی گذرتی ہے، اس کا خاتمہ بھی اسی طرح ہوتا ہے، وفات سے چند دنوں پہلے سے کثرت سے یہ شعر پڑھا کرتے تھے:

بس ، اتنی سی حقیقت ہے فریب خوابِ ہستی کی
کہ آنکھیں بند ہوں اور آدمی افسانہ ہوجائے

قاری صاحبؒ خاص طور پر ہر دُعاء میں حسن خاتمہ کی دُعاء بھی شامل رکھتے ؛ چنانچہ خاتمہ بھی ویسا ہی ہوا، جس شب وفات ہوئی، اس روز بھی معمول کے مطابق عشاء کی نماز پڑھی، تہجد کے وقت اُٹھے، ضعف کا غلبہ؛ لیکن طبیعت میں نشاط تھا؛ اس لئے لیٹے لیٹے ذکر کرتے رہے، اچانک طبیعت خراب ہوئی تو دو دفعہ بیعت کے الفاظ دہرائے ''توبہ کی میں نے کفر سے، شرک سے، فسق سے، اور ہر گناہ سے'' چوں کہ قاری صاحب بیمار کو کثرت سے ''یا سلام'' پڑھنے کی تلقین کرتے تھے، اس لئے حاضرین نے ''یا سلام'' پڑھنے کی درخواست کی، انھیں اندازہ نہیں تھا کہ اب دم آخریں آچکا ہے؛ چنانچہ قاری صاحب ''یا سلام'' پڑھنے لگے، ''سلام'' اللہ کا نام ہے، اس میں دنیا کی مصیبتوں سے سلامتی بھی شامل ہے اور موت کے بعد کی ابتلاؤں سے حفاظت کی التجاء بھی، اسی کلمہ پر وفات ہوئی اور اخیر وقت تک ہوش وحواس قابو میں رہے، جو لوگ اس وقت موجود تھے ان کا تاثر ہے کہ وفات کے چند منٹ پہلے سے آپ کی خوابگاہ میں نہایت تیز خوشبو محسوس کی گئی، جو وفات کے بعد بھی کچھ لمحات تک باقی رہی، یہ بہ قول اِن حضرات کے ایسی خوشبو تھی کہ اس جیسی خوشبو کبھی سونگھنے میں نہیں آئی، یہ ۲۳ / ربیع الاول ۱۴۳۳ھ، مطابق ۱۶ / فروری ۲۰۱۲ء کی تاریخ اور جمعہ کی شب تھی، بہر حال جو شخص اپنی پوری زندگی ہدایت واصلاح کی خوشبو بکھیرتا رہا، وہ اپنے سفر آخرت کے وقت خوشبو بہ داماں تھا اور اس کی زبان پر اپنے خالق ومالک کا نام نامی تھا، جمعہ کی شب، استجابت دُعا کا وقت، توبہ اور اللہ کے نام پر وفات، اس سے بڑھ کر خوش بختی اور حسن خاتمہ کیا ہوگا، اللہ ہم لوگوں کو بھی اس سے سرفراز فرمائیں!

وفات کے دس منٹ کے اندر ہی اس حقیر کو اطلاع ملی ؛ حالاں کہ اگر کوشش کی جاتی تو بذریعہ ہوائی جہاز ممبئی پہنچ کر نماز جنازہ میں شرکت کی جاسکتی تھی، مگر دل ودماغ پر ایسا تاثر پیدا ہوا کہ کچھ سوچ بھی نہیں پایا؛ البتہ ایک گنہگار بندہ اپنے بزرگ ومربی کے لئے مالک وپروردگار

سے جو دُعائیں کرسکتا تھا، وہ کی گئیں، بار بار یہ احساس ستاتا تھا کہ جب کوئی مسئلہ درپیش ہوتا تو قاری صاحبؒ کو فون کر کے دُعاء کی درخواست کیا کرتا تھا، ان کی دُعاء اور حوصلہ افزائی کے کلمات سے ایک نیا حوصلہ ملتا تھا، اب جب کوئی مرحلہ سامنے آئے گا تو کس سے دُعاء کی درخواست کروں گا، اللہ تعالیٰ قاری صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے اور مجھ جیسے کوتاہ عمل اور کوتاہ علم شخص کو ان کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین یارب العالمین۔

❁ ❁ ❁

پیکرِ ابرار
(شیخ طریقت مولانا ابرار الحق حقیؒ)

جس ساز کے نغموں سے حرارت تھی دلوں میں

کھلا ہوا رنگ، کشیدہ قامت، ہلکی داڑھی، لانبا کرتا، نصف پنڈلی یا اس سے کچھ نیچے تک پاجامہ، سر پر پانچ کلیوں کی ٹوپی، آنکھیں فراخ اور اس پر عینک، ہاتھ میں عصا، ایک ایک شئ سے نفاست و نظافت نمایاں اور ایک ایک عمل سنت نبوی کا ترجمان، جلال و جمال کی ایسی آمیزش کہ حاضرین پر رعب بھی طاری ہوتا اور محبت کی لَو بھی تیز ہوتی، ان شمائل و خصائل کے مجموعہ کا نام تھا ''حضرت مولانا شاہ ابرار الحق حقی نور اللہ مرقدہ''۔

وہ یوپی کے شہر ہردوئی میں ۲۰/دسمبر ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے، والد ماجد جناب محمود الحق صاحب حضرت مولانا اشرف علی تھانوی صاحبؒ کے مجاز صحبت تھے، اس لئے خالص دینی ماحول میں آپ کی نشوونما ہوئی، آپ کا نسبی سلسلہ شاہ عبدالحق محدث دہلویؒ سے ملتا ہے، اسی نسبت سے ''حقی'' کہلائے، تعلیم کا آغاز مشہور صاحب معرفت بزرگ مولانا اصغر حسین دیوبندیؒ کے ذریعہ ہوئی، صرف ۸/سال کی عمر میں حفظ قرآن کی تکمیل کا شرف حاصل کیا، جب دس سال کی عمر ہوئی تو جامعہ مظاہر علوم سہارنپور میں داخل ہوئے، اور نحومیر وغیرہ سے تعلیم کی ابتداء فرمائی، مولانا سید عبداللطیف صاحبؒ ناظم مظاہر علوم، حضرت مولانا عبدالرحمٰن کامل پوریؒ، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلویؒ، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب خلیفۂ خاص حضرت تھانوی، مولانا مفتی سعید احمد صاحب صدر مفتی اور حضرت الاستاذ مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی —— رحمہم اللہ —— جیسے اکابر علماء سے تلمذ کا شرف حاصل ہوا، تحریک دعوت و تبلیغ کے

دوسرے اور تیسرے امیر مولانا محمد یوسف صاحبؒ اور مولانا انعام الحسنؒ، آپ کے رفقاء درس میں ہیں، ۱۳۵۶ھ میں جب آپ کی عمر ۱۷/سال تھی، دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے، پھر دو سال معقولات پڑھی اور ہمیشہ اول درجہ سے کامیابی حاصل کرتے رہے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ جامعہ مظاہر علوم سہارنپور اور مدرسہ جامع العلوم کانپور میں تدریس کی خدمت انجام دی، پھر حضرت تھانویؒ کی ایماء پر مدرسہ اسلامیہ فتح پور میں آپ کے علم کا فیض جاری ہوا اور مرشد تھانویؒ ہی کے مشورہ سے ''اشرف المدارس ہردوئی'' قائم فرمایا، جس میں عرصہ تک خود بھی متوسطات تک کی کتابوں کا درس دیتے رہے اور یہیں سے آپ نے پورے ہندوستان میں قرآن مجید کی باتجوید صحیح تعلیم کی تحریک شروع فرمائی، یہیں سے ۱۳۷۰ھ میں آپ نے حضرت تھانویؒ کی قائم کی ہوئی ''مجلس دعوۃ الحق'' کا احیاء فرمایا، اس مجلس کا دائرہ نہ صرف ہندوستان؛ بلکہ افریقہ اور یورپ تک وسیع ہوا، جس کی برکت سے سینکڑوں مکاتب وجود میں آئے اور بے شمار اصلاحی اجتماعات کا سلسلہ شروع ہوا۔

زمانۂ طالب علمی ہی سے صلاحیت کے ساتھ ساتھ صالحیت اور تعلق مع اللہ کا رنگ آپ پر غالب تھا، حضرت تھانویؒ کے صحبت یافتہ لوگوں سے خصوصی مناسبت تھی، اور تھانہ بھون آمد ورفت کا بھی معمول تھا، چنانچہ حضرت تھانویؒ سے بیعت ہوئے، اور ۱۳۶۱ھ میں جب آپ فتح پور میں مدرس تھے اور عمر صرف ۲۲/سال تھی، خلافت سے بھی سرفراز ہوئے؛ حالاں کہ حضرت تھانویؒ اس سلسلہ میں جس قدر محتاط تھے، اہل علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں، اس کے باوجود اس کم عمری میں آپ پر آپ کے شیخ کا اعتماد آپ کی صالحیت کے اندازہ کے لئے کافی ہے، اس کے بعد بھی آپ نے خواجہ مجذوب صاحب، مولانا کامل پوری، مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری اور شاہ وصی اللہ صاحب رحمہم اللہ سے اصلاح وتربیت کا تعلق قائم رکھا، اور حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہیؒ سے بھی ان کی وفات تک مشورہ کا اہتمام فرماتے رہے۔

مولانا ہردوئیؒ کے متوسلین اور آپ سے اصلاحی تعلق رکھنے والے پوری دنیا میں پھیلے

ہوئے ہیں، اور اہم بات یہ ہے کہ آپ کے حلقۂ اصلاح میں عوام تو ہیں ہی، ساتھ ہی ایک بڑی تعداد چوٹی کے علماء، سربرآوردہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص اور تعلیمی وتحریکی کاموں کے ذمہ داروں کی ہے؛ چوں کہ آپ کو تربیت کا خاص ذوق تھا اور آپ اس معاملہ میں ایک گونہ سخت گیری اختیار کرتے تھے؛اس لئے آپ کے متوسلین کے اندر بھی اتباع سنت کا ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔

یوں تو آپ جامع الاوصاف شخصیت کے مالک تھے، لیکن بعض ایسی خصوصیات ہیں جن میں آپ اپنے معاصرین میں امتیاز واختصاص رکھتے تھے، اس سلسلہ میں تین باتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

پہلی بات ہے قرآن مجید سے تعلق، آپ کے یہاں اس بات کا بہت اہتمام تھا کہ قرآن مجید کو صحیح تلفظ اور تجوید کی رعایت کے ساتھ پڑھا جائے، اسی پس منظر میں آپ نے نورانی قاعدہ کو بعض اضافوں کے ساتھ شائع فرمایا اور آپ ہی کے ذریعہ پوری دنیا میں اس کتاب کی تعلیم کا رواج ہوا، آپ کی براہ راست اور بالواسطہ کوششوں سے تعلیم قرآن اور حفظ قرآن کے ہزاروں مدارس ومکاتب قائم ہوئے، اور آج نہ صرف ہندوستان بلکہ پوری دنیا میں تجوید کی رعایت کے ساتھ قرآن مجید کے پڑھنے پڑھانے کا جو اہتمام ہو رہا ہے، اس میں آپ کے فیض رسا کا بڑا حصہ ہے، بلکہ سچ پوچھئے تو یہ آپ کی تجدیدی خدمت ہے !

تعلیم قرآن کے ساتھ ساتھ آپ نے قرآن مجید کی عظمت لوگوں کے دلوں میں بٹھائی، عام طور پر لوگ حفظ قرآن کو اپنی کم فہمی کی وجہ سے کمتری کی نظر دیکھتے تھے، آپ اس پر نکیر فرماتے اور حفظ قرآن کا اعزاز کرنے کو کہتے، گذشتہ بیس پچیس سال میں اس کا اثر محسوس کیا جاسکتا ہے کہ آج متمول حضرات، جدید تعلیم یافتہ لوگ اور تجارت پیشہ اصحاب کے اندر بھی خود حفظ کرنے اور بچوں کو حفظ کرانے کا ذوق پروان چڑھا ہے، اسی طرح عموماً لوگ شعبۂ حفظ کے اساتذہ کی تنخواہیں کم رکھتے ہیں اور حفظ کی درسگاہوں کے لئے وہ اہتمام نہیں کرتے، جو شعبۂ عربی کی درسگاہوں کے لئے کیا جاتا ہے، آپ اس پر ناراضگی کا اظہار کرتے، اور مدارس کے

ذمہ داروں کو اس رجحان میں تبدیلی لانے کی تلقین فرماتے۔

دوسری اہم بات منکر اور برائیوں کی اصلاح ہے، معروف اور بھلائی کی دعوت دینا آسان ہوتا ہے؛ کیوں کہ اس سے نفس پر چوٹ نہیں پڑتی؛ لیکن منکرات سے روکنا نسبتاً دشوار ہوتا ہے اور اس سے بعض اوقات مدعو کے مادی مفادات پر ضرب بھی پڑتی ہے، اسی لئے یہ ایک حقیقت ہے کہ منکر کی اصلاح پر کم توجہ دی جارہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ معاشرہ میں برائیاں بڑھتی جارہی ہیں، مولانا کی اس پہلو پر خصوصی توجہ تھی، آپ کے اکثر مواعظ میں اصلاح منکرات کا موضوع آجایا کرتا تھا، آپ نے اس موضوع پر مختلف رسائل بھی تحریر فرمائے ہیں، اور آپ کی جو ''مجالس'' مرتب ہوئی ہیں، ان میں بھی ان پر بہت زور دیا گیا ہے۔

تیسری بات سنت نبوی ﷺ کی اتباع ہے، آپ کے یہاں ایک ایک عمل کے بارے میں سنتوں کی تحقیق، اس پر عمل اور پھر اس کی تلقین کا خصوصی اہتمام تھا، آپ کے ہر بیان میں اس پر زور دیا جاتا تھا، نمازوں کے بعد ایک ایک سنت کی تلقین کرائی جاتی تھی، اور جو اُمور خلافِ سنت ہوتے، ان کے بارے میں پوری سختی برتی جاتی تھی، اس اہتمام کی وجہ سے آپ کو ''محی السنہ'' سے یاد کیا جاتا ہے، کہ واقعی آپ اپنے عہد میں احیاءِ سنت کے سب سے بڑے علمبردار تھے۔

عام طور پر ہم لوگ کسی عمل کی تلقین کرتے ہوئے اپنے بزرگوں کا حوالہ دیتے ہیں، اس سے ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس بزرگ سے تعلق رکھنے والے ہیں وہ تو اسے بڑی محبت کے ساتھ قبول کرتے ہیں اور جن لوگوں کو ان بزرگوں سے مناسبت نہیں ہوتی یا اختلاف ہوتا ہے، ان کو اس عمل کی طرف رغبت نہیں ہوتی، اس لئے آپ سنت کی طرف سنت ہونے کی حیثیت سے دعوت دیتے اور براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قول وفعل کا حوالہ دیتے، کیوں کہ آپ کو آپ کے شیخ ومربی حضرت تھانویؒ نے نصیحت فرمائی تھی :

> کام مسلکی اور جماعتی بنیاد پر ہرگز نہ کرنا، اس سے لوگ بدکتے ہیں،
> بلکہ ''سنت'' کے عنوان سے کرنا، یہ مت کہہ دینا کہ یہ ''بدعت'' ہے،
> یا اس کو حضرت تھانویؒ نے یا حضرت گنگوہیؒ نے منع فرمایا ہے؛ بلکہ

یہ کہنا کہ سنت ہے، حضور ﷺ نے اس کو کیا ہے، یا یہ خلاف سنت ہے، حضور اقدس ﷺ نے اسے ناپسند کیا ہے۔

(ماہنامہ ''مظاہر علوم'' سہارنپور، جون ۲۰۰۵ء صفحہ ۳۵-۳۶)

آپ خاص کر علماء اور اساتذۂ مدارس کو سنتوں کے اہتمام کی بڑی تاکید فرماتے تھے۔

اس حقیر کی محرومی کی بات ہے کہ اسے حضرت والا سے قریب ہونے، قریب رہنے، اور زیادہ استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا، حج کے موقع سے ایک دو بار دور ہی سے زیارت کا موقع ملا؛ البتہ علالت کے درمیان جب بمبئی سے حیدرآباد تشریف لائے اور بنجارہ ہلز میں اپنے ایک مخلص کے یہاں مقیم ہوئے تو محبّ گرامی مفتی عبدالمغنی مظاہری صاحب زیدت حسناتہ کی وساطت سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، مولانا اس وقت بیمار تھے اور لوگوں سے زیادہ دیر ملاقات کی اجازت نہیں تھی؛ لیکن آپ کی شفقت اور خورد نوازی ہے کہ پندرہ بیس منٹ اپنے تخت (جس پر آرام فرماتے تھے) کے بازو کرسی پر بیٹھائے رہے، مختلف چھوٹے چھوٹے رسائل اور دُعاؤں کی پرچیاں جو زیراکس کی ہوئی تھیں، عنایت فرمائیں، راقم الحروف پہلے سے گھبرایا ہوا تھا کہ نہ معلوم کیا امتحان ہو اور کس بات پر ڈانٹ ڈپٹ کی نوبت آجائے؟ لیکن اس کے برخلاف آپ نے بہت ہی شفقت اور محبت کا معاملہ فرمایا، اخیر میں میں نے درخواست کی کہ اس گنہگار کو کچھ نصیحت فرمائی جائے، مولانا نے بڑی اہم نصیحت کی جو علماء کے لئے خاص طور پر قابل توجہ ہے، آپ نے فرمایا:

> نیکی اور معروف کی دعوت کا کام بڑی حد تک ہو رہا ہے؛ لیکن منکر اور برائی کو روکنے کی کوشش آٹے میں نمک کے برابر ہے اور اس کو صحیح طور پر اہل علم ہی کر سکتے ہیں، آپ بھی اس کی طرف توجہ دیں، اور اپنے زبان وقلم کے ذریعہ نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کی کوشش کریں۔

میں مصافحہ کرتے ہوئے رخصت ہوا اور مولانا کے اس ارشاد پر دیر تک غور کرتا رہا، تو واقعی آپ کی اس نصیحت کی اہمیت اور اس کی ضرورت ذہن پر نقش ہوتی چلی گئی؛ چنانچہ اس

کے بعد سے کوشش رہتی ہے کہ جہاں کہیں خطاب کا موقع ملے، اس علاقہ میں جو منکرات پائے جاتے ہیں، ان کے بارے میں روشنی ڈالی جائے۔

ہندوستان میں ماضی قریب میں جو علماء و مشائخ گذرے ہیں، ان میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ایک گل سدا بہار تھے، وہ علم کے غواص بھی تھے، اور تزکیہ و اصلاح کے معالج نباض بھی، وہ مفسر قرآن بھی تھے، اور اپنے عہد کے بے مثال فقیہ بھی، وہ متکلم بھی تھے اور صوفی بھی، واعظ بھی تھے اور مزکی و مربی بھی، ان کے میکدۂ علم و معرفت میں ہر بادہ خوار کو اس کے ظرف کے مطابق شراب علم و معرفت ملتی تھی، ان کی مثال گنّے کے درخت کی تھی کہ جہاں سے چوسا جائے، وہاں سے پینے والے کو رس مل جائے، وہ ایسے چراغ عالم تاب تھے جس کے نور سے کتنے ہی دیئے روشن ہوئے، اس شبستان نور کی آخری کرن حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ تھے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو نور سے بھر دے، علالت کا سلسلہ تو کئی سال سے تھا اور معتقدین و محبین کو ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا تھا، یہاں تک کہ ۸؍ربیع الثانی ۱۴۲۶ھ، مطابق ۱۷؍مئی ۲۰۰۵ء سہ شنبہ شب ۹؍بجے یہ چراغ آخریں بھی بجھ گیا، اگلے دن عیدگاہ میں نماز جنازہ ہوئی، اور سیدی وسندی عارف باللہ حضرت مولانا قاری امیر حسن صاحب دامت برکاتہم کی امامت میں نماز جنازہ ادا کی گئی۔

واقعہ ہے کہ حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ کی وفات نے ایک ایسا خلا پیدا کیا ہے کہ شاید مدتوں پُر نہ ہو سکے؛ لیکن آپ کا پیغام آج بھی زندہ ہے اور خاص طور آپ کی جو مجالس ''مجالس ابرار'' کے نام شائع ہوئی ہیں، ان میں آپ کی فکر اور آپ کی دعوت کو پڑھا اور سمجھا جا سکتا ہے، شاید آپ کی دعوت کا لب لباب یہی تین باتیں ہیں: قرآن کے ساتھ تعلق، سنتوں کا اہتمام، اور برائیوں کو روکنے کی کوشش، اللہ تعالیٰ ہم تہی دامان علم و عمل کو حضرت مرحوم کے نقش قدم پر چلنے اور آپ کی تعلیمات کی رہنمائی میں سفر زندگی کو طے کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اللهم ارحمه واغفر له و أجزه عنا و عن سائر المسلمين۔

❁ ❁ ❁

صدیقِ وقت

(قاری محمد صدیق صاحب باندویؒ)

خاکی ونوری نہاد ، بندۂ عالی صفات
ہر دو جہاں سے غنی ، اس کا دلِ بے نیاز

بچپن سے جن بزرگوں کا ذکر عقیدت ومحبت کے ساتھ سنا تھا اور اساتذہ کی مجلسوں میں ان کا تذکرہ رہتا تھا، ان میں ایک حضرت مولانا قاری محمد صدیق صاحبؒ بھی تھے، دل میں ملاقات کا اشتیاق تھا؛ لیکن آنکھیں شرف دید سے محروم تھیں، غالباً شوال یا ذوقعدہ ۱۳۹۹ھ کی بات ہے، جب میں حیدرآباد آچکا تھا اور دارالعلوم حیدرآباد میں مدرس تھا، اس وقت دارالعلوم 'مگر کی باؤلی' نامی محلّہ کے ایک نہایت خستہ مکان میں واقع تھا، اچانک دوپہر میں ایک بزرگ تشریف لائے، لمبا سا سفید کرتا، سفید دھاری دار لنگی، پانچ کلی والی ٹوپی، سفید سیاہ خانوں والا ایک عام سا رومال، قدرے لحیم وشحیم، متوسط قد وقامت، کھلا ہوا رنگ، چہرہ پر چیچک کے چند ہلکے سے نشانات، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، سفید اور گھنی داڑھی، غالباً ذوالحجہ کی تعطیل ہوچکی تھی اور میں دفتر میں کچھ لکھنے پڑھنے کا کام کر رہا تھا، کبھی دیکھا نہیں تھا؛ لیکن دیکھتے ہی ان کی طرف طبیعت میں ایک کھنچاؤ سا محسوس ہوا، پھر ایک طالب علم نے بتایا کہ آپ ہی حضرت قاری صدیق صاحب باندوی ہیں۔

حضرت قاری صاحب کی تشریف آوری اصل میں محبّ گرامی مولانا عبد اللہ طیب صاحب کی نسبت سے تھی، یہ سن کر دل کی کلیاں کھل اُٹھیں، مصافحہ کی سعادت حاصل کی، ایک صاحب نے تعارف کروایا کہ یہ حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کے بھتیجے ہیں، قاری

صاحب نے سنتے ہی گلے لگالیا، دیر تک پیٹھ تھپکتے رہے اور بار بار فرماتے رہے کہ قاضی صاحب واقعی ''مجاہد اسلام'' ہیں، اس وقت مدرسہ میں نہ ذمہ داران تھے نہ اساتذہ، مولانا وہیں پر لیٹ گئے، ایک اینٹ کونے میں رکھی تھی، اسی کو رومال میں لپیٹا اور سر کے نیچے رکھ لیا، یہ حضرت قاری صاحب سے پہلی ملاقات تھی اور اس ملاقات نے ان کی محبت وعظمت کے نقوش اور گہرے کردیئے، ان کے درویشانہ رنگ اور فقیرانہ مزاج کو دیکھ کر ان بزرگوں کا نقشہ سامنے آ گیا، جن کے بارے میں ہم کتابوں میں پڑھا کرتے تھے۔

قاری صاحبؒ سے دوسری ملاقات کا شرف اس وقت حاصل ہوا، جب آپ کسی پروگرام میں حیدرآباد تشریف لائے ہوئے تھے اور مجلس علمیہ کے سابق دفتر، واقع محبوب بازار، چادرگھاٹ میں علماء کی ایک مخصوص نشست رکھی گئی تھی، میں نے جھجکتے ہوئے ملاقات کی کہ نہ معلوم قاری صاحب پہچان سکیں گے یا نہیں؟ لیکن قاری صاحب نے مصافحہ کرتے ہوئے فوراً دریافت فرمایا: آپ مولوی خالد صاحب ہیں؟ میں نے اثبات میں جواب دیا اور ایک کنارے بیٹھ گیا، پھر پوچھا کہ کیا اسباق آپ سے متعلق ہیں؟

پھر اپنی تالیفات 'تسہیل النحو وتسہیل الصرف' کا ذکر کیا اور بار بار دریافت فرماتے رہے کہ اس میں کوئی بات لائق اصلاح یا قابل مشورہ ہو تو بتائیں، میں نے عرض کیا کہ آپ کی گرانقدر تالیفات قابل استفادہ ہیں اور ان سے ہم جیسوں کو بہت نفع ہوتا ہے، مجھ جیسے طلبہ اس سلسلہ میں کیا مشورہ دے سکتے ہیں؛ لیکن قاری صاحبؒ بار بار فرماتے رہے، تو ہمت کر کے میں نے عرض کیا کہ تسہیل الصرف میں بعض افعال لازمہ کی بھی مجہول کی گردان ذکر کی گئی ہے، اس سلسلہ میں ذہن میں اشکال آیا تھا، فرمانے لگے: آپ نے بہت اچھا سوال کیا، مجھے اندازہ تھا کہ آپ نے گہری نظر کے ساتھ مطالعہ کیا ہوگا، پھر فرمایا کہ فعل لازم بھی بعض اوقات اپنے 'صلات کی وجہ سے متعدی بن جاتا ہے' اس وقت بچوں کو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا فعل مجہول کیوں کر بنائیں، اس لئے میں نے ایسا کیا ہے، اس کے بعد پھر مسکرا کر فرمانے لگے کہ اور کوئی

بات ہوتو کہیں، میں نے عرض کیا کہ ایک درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جیسے آپ نے نحو، صَرف اور منطق وغیرہ کے لئے طلبہ کی موجودہ استعداد کو سامنے رکھتے ہوئے کتابیں مرتب فرمادی ہیں، اسی طرح علم کلام پر بھی 'تسہیل الکلام' مرتب فرمادیجئے، جس میں آسان وعام فہم انداز میں علم کلام کی قدیم کتابوں کے مضامین بھی آجائیں، صفات باری کے سلسلہ میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کا نقطۂ نظر اور مختلف مذاہب فقہیہ کی طرح ان سب کا مبنی برحق ہونا، نیز اشاعرہ وماتریدیہ کے درمیان پائے جانے والے اختلافی مسائل اور موجودہ فرق باطلہ کے افکار کے مقابلہ اہل سنت والجماعت کا نقطۂ نظر، نیز ختم نبوت اور امام مہدی وغیرہ کے بارے میں بھی گفتگو آجائے؛ تاکہ وہ موجودہ دور کے اعتبار سے علم کلام کی ضرورت کو پوری کرے، قاری صاحب میری اس گزارش سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ آپ نے ماشاء اللہ اس موضوع کو سمجھا بھی ہے اور اللہ نے آپ کو مشکل مضامین کو آسان الفاظ میں لکھنے کا اچھا سلیقہ بھی عطا فرمایا ہے؛ اس لئے آپ ہی اس کو لکھ ڈالئے، بہرحال بات آئی گئی ہوگئی؛ لیکن دل میں بار بار خیال آتا ہے کہ اللہ نے کبھی موقع دیا تو اس موضوع پر قلم اُٹھایا جائے۔

اس کے بعد گاہے گاہے حضرت قاری صاحب سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، ایک بار ایسا ہوا کہ میں اپنے آبائی قصبہ جالے، ضلع دربھنگہ (بہار) میں موجود تھا، وہاں سے قریب 'بالا ساتھ' نامی قریہ میں جامعہ قاسمیہ کے نام سے ایک بڑی دینی درسگاہ قائم ہے، حضرت مولانا عبد الحنان صاحبؒ اس کے بانی وذمہ دار تھے اور قاری صاحب کے عاشقوں میں تھے، وہاں بڑے پیمانہ پر مدرسہ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، اس حقیر کو بھی خطاب کے لئے مدعو کیا گیا؛ لیکن حاضری کے لئے اصل وجہِ کشش حضرت قاری صاحب کی شخصیت تھی، جو اس جلسہ میں تشریف لائے تھے، عوام کے علاوہ خواص اور بالخصوص علماء کا بڑا مجمع اکٹھا تھا اور کافی وسیع وعریض ڈائس، ہجوم کی وجہ سے قدم رکھنا مشکل تھا، حضرت قاری صاحب اسی درویشانہ شان کے ساتھ ڈائس پر تشریف لائے، مولانا عبد الحنان صاحبؒ اہم شخصیتوں کا تعارف کراتے جاتے تھے، میری باری آئی تو نام لیتے ہی قاری صاحب نے فرمایا ''ان کا کیا تعارف کراؤ ہو، یہ تو ہمارے مولوی

خالد صاحب ہیں'' پھر میرا ہاتھ تھام لیا اور وہاں لے کر آئے، جہاں ان کی جگہ تھی، مجھے اپنے بازو میں بٹھایا، طلبہ حفظ کی دستار بندی تھی، مجھ سے فرمانے لگے کہ میری طرف سے آپ دستار باندھ دیں، میں نے عرض کیا: حضرت! یہ تو چھوٹا منھ بڑی بات ہو جائے گی اور مدرسے والوں کی بھی دل شکنی ہوگی؛ کیوں کہ سب لوگ آپ کے ذریعہ دستار بندی کی سعادت حاصل کرنا چاہتے ہیں، البتہ میں آپ کی خدمت میں دستار پیش کرتا جاتا ہوں، آپ دستار باندھ دیں؛ چنانچہ ایسا ہی ہوا، مولانا کا فقرہ کہ: ''یہ تو ہمارے مولوی خالد ہیں'' ایسا حلاوت بخش تھا کہ آج تک اس کی مٹھاس محسوس کرتا ہوں اور اُمید رکھتا ہوں کہ شاید آخرت میں بھی یہ جملہ کام آجائے۔

مولانا کی زندگی میں بڑی آرزو تھی کہ دولت کدہ پر حاضری کا شرف حاصل کروں، مگر اللہ کی طرف سے یہ بات مقدر نہیں تھی؛ لیکن بارہا مختلف مقامات پر قاری صاحب کا خطاب سننے اور ان کے ملفوظات سے فائدہ اُٹھانے کا شرف حاصل ہوتا رہا، ان کے خطبات میں نہ جوش وخروش ہوتا تھا، نہ رونا گانا، نہ لطائف وظرائف، نہ آواز کی شعلہ فشانی، مضامین بھی سیدھے سادھے، اصلاحی انداز کے، الفاظ بھی سادہ اور عام فہم، اُسلوب بیان بھی نہایت سادہ اور تکلف سے خالی؛ لیکن ان سب کے باوجود ان کے کلام میں ایک خاص قسم کی تاثیر محسوس ہوتی تھی، قلب میں رقت پیدا ہوتی تھی اور دل میں عمل کا جذبہ کروٹ لینے لگتا تھا، یقیناً یہ ان کے اخلاص اور سوز دروں کا کرشمہ تھا، جب دل میں درد کی آگ سلگی ہوئی ہو تو حرارت الفاظ کی ضرورت باقی نہیں رہتی اور جب روح کا رشتہ اللہ سے قائم ہو تو الفاظ میں مصنوعی روح ڈالنے کی حاجت نہیں پڑتی، یہ کیفیت جن دو تین گنی چنی شخصیتوں میں دیکھی، ان میں یقیناً ایک حضرت قاری صاحبؒ کی شخصیت تھی۔

قاری صاحب ۱۳۴۸ھ، مطابق ۱۹۲۳ء ہتھورا ضلع باندہ (یوپی) میں پیدا ہوئے، والد ماجد کا اسم گرامی سید احمد، دادا کا عبد الرحمٰن اور والدۂ ماجدہ کا خیر النساء تھا، سلسلۂ نسب

حضرت حسین رضی اللہ عنہ سے ملتا ہے، یہ گھرانہ اپنے علاقہ میں دین داری اور پرہیزگاری میں امتیازی حیثیت کا حامل تھا، چھ سات سال کی عمر میں والد کی شفقت اور دس سال کی عمر میں دادا کے سایۂ عاطفت سے محروم ہوگئے، پھر تعلیم وتربیت کے مراحل ماں کی ممتا کے زیرسایہ انجام پذیر ہوئے، حفظ قرآن کا آغاز اپنے جدامجد سے کیا، پھر مولانا امیر الدین صاحب سے حفظ کی تکمیل کی اورانھیں سے فارسی کی تعلیم بھی حاصل کی، یوں تو طلب علم کا جذبۂ بے پایاں آپ کو مختلف شہروں میں لے گیا؛ لیکن پانی پت اور مظاہر علوم سہارنپور خاص طور پر قابل ذکر ہیں، جہاں سے آپ نے علوم اسلامی کی تکمیل فرمائی، اس کے بعد بھی معقولات اور بعض اور علوم کی پیاس نے آپ سے مختلف کوچہ ہائے علم کی آبلہ پائی کرائی، فراغت کے بعد کچھ عرصہ دوسرے اداروں میں خدمت کی؛ لیکن جس شہر کی فضاؤں میں آپ کا بچپن گذرا اور جوانی تک پہنچے، وہ علاقہ خود علم سے محروم اور دین سے دور تھا، قاری صاحب کو شدت سے اس حقیقت کا احساس تھا، یہاں تک کہ یہاں فتنۂ ارتداد پھیلنے لگا تھا، اس صورتِ حال نے قاری صاحب کو تڑپا کر رکھ دیا اور کسی بنے بنائے گلشن کا حصہ بننے کی بجائے آپ نے اس بات کو ترجیح دی کہ زمین شور کو آبیار کیا جائے اور یہاں رشد وہدایت کا شجرۂ طوبیٰ لگانے کی کوشش کی جائے؛ چنانچہ ہتھورا اور اس کے آس پاس آپ نے تبلیغی مساعی شروع کیں اور اس طرح ۱۹۵۱ء میں آپ نے مدرسہ کی بنیاد رکھی، جو شروع میں ''مدرسہ خزینۃ العلوم'' کہلایا اور اب ''جامعہ اسلامیہ عربیہ ہتھورا'' ہے، اور ایک گم نام گاؤں میں قائم ہونے والی اس جامعہ کا شہرہ آج ہندوستان ہی میں نہیں؛ بلکہ اگر کہا جائے کہ اقصاءِ عالم میں ہے تو غلط نہیں ہوگا، اب یہ جامعہ تعارف سے بالاتر ہے اور یقیناً قاری صاحب کے لئے بہترین صدقۂ جاریہ ہے!

قاری صاحب کا سب سے امتیازی وصف داعیانہ دردمندی اور پوری اُمت کے لئے فکر مندی ہے، یہ درد انھیں گلی گلی، کوچہ کوچہ لے جاتا تھا، پختہ مکانوں کے ساتھ ساتھ کچی جھونپڑیوں میں پہنچاتا تھا، شہرت ومقبولیت کے بام عروج پر پہنچ جانے کے باوجود معمولی تقریبات میں بھی

شرکت سے کوئی عار نہیں تھی ،لوگ اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسہ والوں کی خوشامد کرتے ہیں؛ لیکن قاری صاحب کا حال یہ تھا کہ وہ لوگوں کی خوشامد کرتے تھے اور کہتے تھے :

بھائی مولوی نقد پیسوں کا چندہ مانگتے ہیں ،تم سے خدا کے واسطے نقدی طور پر بچوں کی بھیک مانگتا ہوں ، ان کو قرآن پڑھاؤں گا ، دین کی باتیں بتاؤں گا۔

بعض لوگوں نے کہا کہ ہمارے بچے بکریاں چرا لیتے ہیں یا مزدوری کر کے کچھ کما لیتے ہیں ،آپ کے حوالہ کرنے میں ہمارا نقصان ہے ،قاری صاحب فرماتے کہ وہ پیسے بھی ہم تم کو دے دیں گے ،ایک بار عوام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

ہم تو آپ کے پیر دھو کر پینے کو تیار ہیں اور اگر کوئی کہے کہ دس جوتے لگائیں گے اور دس سنتوں پر عمل کریں گے ،تم ہم اس سودے کو بھی سستا سمجھیں گے ،آپ یہ سب کرنے کو تیار تو ہوں۔

اسی دردمندی کا اثر تھا کہ آپ کی بات اور آپ کا عمل ،ردعمل اور انتقام کے جذبہ سے خالی ہوتا تھا ، کئی بار ایسا ہوا کہ آپ کے جلسہ پر لوگوں نے پتھر پھینکے ؛ لیکن آپ نے نہ صرف صبر و برداشت سے کام لیا ؛ بلکہ فرمایا کہ آپ لوگ کوئی جوابی کارروائی نہ کریں ؛ کیوں کہ پتھر کھانا بھی حضور کی سنت ہے ؛ اسی لئے آپ مناظرہ سے خود بھی بچتے تھے اور لوگوں کو بھی کہتے تھے کہ مناظرہ سے گریز کا راستہ اختیار کرو ،لوگوں کو قریب کرنے کے لئے عبادت کرنے ،ہدیہ دینے اور ملاقاتیں کرنے کی ترغیب فرماتے تھے ، جو لوگ مخالف ہوتے ان کے بارے میں بھی تنابز بالالقاب کو پسند نہیں فرماتے تھے ،ایک سفر میں بعض حضرات نے بریلوی بھائیوں کا ذکر کرتے ہوئے بار بار کہا: ''ان لوگوں ،ان لوگوں'' قاری صاحب کو یہ لب ولہجہ پسند نہیں آیا ،فرمانے لگے :

کیا ''ان لوگوں ،ان لوگوں'' لگا رکھا ہے؟ کیا وہ مسلمان نہیں ہیں؟ خود کو بھی کبھی دیکھا اور سوچا کہ کیا کیا کرتے ہیں؟

اسی دردمندی کا نتیجہ تھا کہ اُمت کے انتشار کو آپ بالکل پسند نہیں فرماتے تھے ، باندہ

میں رؤیت ہلال کا فیصلہ جو لوگ کیا کرتے تھے، ان کا تعلق دوسرے مسلک سے تھا، کبھی وہ ہلالِ عید کی رؤیت کا اعلان نہیں کرتے اور قاری صاحب کا موقف اس کے برخلاف ہوتا؛ لیکن قاری صاحب اختلاف سے بچنے کے لئے گو روزہ کھولنے کا حکم دیتے؛ لیکن فرماتے کہ عید کی نماز اگلے دن سب لوگوں کے ساتھ پڑھی جائے؛ تاکہ مسلمانوں کی وحدت متاثر نہ ہو۔

قاری صاحب کی دردمندی اور محبت صرف مسلمانوں ہی سے نہیں تھی؛ بلکہ برادرانِ وطن سے بھی تھی، اس لئے اپنے علاقہ کے غیر مسلم بھائیوں سے بھی رشتہ داروں کا سا تعلق رکھتے تھے، شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کی خوشی وغم میں بھی شرکت فرماتے تھے، اسی لئے برادرانِ وطن انھیں ''ہتھورا والے بابا'' کہتے تھے، قاری صاحب کی رواداری کا حال یہ تھا کہ جب الٰہ آباد سے بہ راہ باندہ ممبئی کے لئے ٹرین منظور ہوئی، جس میں قاری صاحب کی کوششوں کا بھی دخل تھا تو آپ نے اس علاقہ کی مشہور شخصیت ''تلسی داس'' کے نام پر اس کے لئے ''تلسی ایکسپریس'' کا نام تجویز فرمایا۔

اسی دردمندی اور دلنوازی کا نتیجہ تھا کہ بڑے اور چھوٹے، پڑھے لکھے اور جاہل واَن پڑھ، مختلف علاقوں کے رہنے والے اور مختلف مسالک سے تعلق رکھنے والے قاری صاحب سے یکساں طور پر محبت کرتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ خود قاری صاحب ان سے زیادہ محبت فرماتے ہیں، یہ یقیناً ''اُسوۂ محمدی'' کا عکس ہے کہ اصاغر صحابہ بھی محسوس کرتے تھے کہ حضور ﷺ کو وہ سب سے زیادہ محبوب ہیں۔

قاری صاحب کا دوسرا نمایاں وصف ان کا اعتدال تھا، اس سلسلہ میں دو باتوں کا ذکر کرنا مناسب ہوگا، ایک: دعوت وتبلیغ کی وہ تحریک جس کو حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے ایک خاص شکل میں مروج فرمایا، قاری صاحب بہ دل وجان اس کام کی افادیت کے معترف تھے اور لوگوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے تھے؛ لیکن اس معاملہ میں بھی افراط وتفریط کو ناپسند فرماتے تھے؛ چنانچہ قاری صاحب کے یہ فقرے واقعی اس سلسلہ میں حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں :

افراط وتفریط دونوں مذموم ہیں، نہ یہ صحیح اور نہ وہ صحیح، اعتدال ہونا چاہئے، تبلیغ والوں کی غلطی ہے کہ وہ مہینہ کے تین دن اور سال کا چلہ لگا کر اپنے کو بہت قابل اور علماء سے مستغنی سمجھتے ہیں، جو چلہ نہ لگائے وہ گویا دین کا کام نہیں کر رہا، ہر ایک سے چلہ کا مطالبہ کرتے ہیں، نہ مخاطب دیکھتے ہیں نہ موقع ومحل، ان کے نزدیک مدرسہ والے بھی گویا کچھ نہیں کر رہے ہیں، ایک چلہ لگا کر اپنے کو بہت قابل سمجھتے ہیں اور یہ بات چند سالوں سے ہوگئی ہے، ورنہ پہلے جو لوگ جماعتوں میں نکلتے تھے، ہمیشہ اپنے کو علماء کا محتاج سمجھتے تھے۔

اسی طرح پڑھے لکھے لوگوں کی غلطی ہے کہ وہ اس کام سے جڑتے نہیں، تعاون نہیں کرتے اور جماعت کی اس قسم کی غلطیوں کی وجہ سے پورے تبلیغی کام ہی کو سرے سے غلط کہتے ہیں، افراد کی غلطی کی وجہ سے جماعت کا کام تھوڑا ہی غلط ہو جائے گا، ہزاروں لاکھوں کی اس کے ذریعہ اصلاح ہوئی ہے؛ البتہ افراد کی غلطی پر تنبیہ کی جائے ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے، کام کو بدنام نہ کیا جائے۔

مدرسہ کے زمانۂ تعلیم میں اجتماع میں شرکت کی بات سامنے آئی تو فرمایا:

وہ اجتماع ہے اور یہ (مدرسہ کا نظام) اجتماع نہیں ہے؟ دین پڑھنا پڑھانا، اس میں ثواب نہیں ملے گا؟ یہ اجتماع بھی تو اللہ کو محبوب ہے، اس کی اہمیت کیا کم ہے؟ اجتماع کی اہمیت ہے، مگر ایام تعطیل میں شرکت کریں اور کچھ وقت لگائیں۔

ایک صاحب مدرسہ بند کر کے لمبے عرصہ کے لئے جماعت میں چلے گئے، انھوں نے بیعت کرنے کی درخواست کی تو آپ نے انکار فرما دیا اور فرمایا:

مدرسہ بند کر کے جماعت میں جانے کے لئے کس نے آپ سے کہا

تھا اور کس سے پوچھ کر گئے تھے؟ میں آپ کو بیعت نہیں کروں گا، کیا مدرسہ چلانا دین نہیں؟ مدرسہ میں کیا سکھایا اور پڑھایا جاتا ہے؟ وہ دین کی تبلیغ نہیں ہے؟ وہ بھی تو تبلیغ ہی ہے! کیا میں تبلیغ کا حامی نہیں ہوں؟ تبلیغ کے فروغ کے لئے کیا میں کوشش نہیں کررہا ہوں؟ مدرسہ کے ساتھ بھی تو تبلیغ کا کام ہوسکتا ہے۔

قاری صاحب اس بات پر بھی زور دیتے تھے کہ دعوت وتبلیغ کے کام میں مقصد اصل ہے اور بزرگوں کے مقرر کئے ہوئے اُصول اس کے تابع ہیں، اُصول پر اتنا اصرار نہ کرنا چاہئے کہ اصل مقصد متاثر ہوجائے۔

دوسری قابل ذکر بات 'تصوف' کی ہے، قاری صاحب کا خاندان شروع سے بزرگوں سے تعلق رکھتا تھا، جن اساتذہ سے آپ نے پڑھا، وہ سب اپنے زمانہ کے معروف مشائخ تھے اور خاص کر جس ہستی کی صحبت اور تربیت نے آپ کو متاثر کیا، یعنی حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ، ان کا قاری صاحب کے بارے میں بیان تھا کہ اگر قیامت کے دن حق تعالیٰ مجھ سے پوچھیں گے کہ دنیا سے کیا لائے؟ تو میں حافظ صدیق احمد صاحب کو پیش کردوں گا، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ احسان وسلوک میں قاری صاحب کا مقام کتنا بلند تھا، اسی لئے لوگوں نے دیکھا کہ تمام علماء ومشائخ کے دلوں میں آپ کی محبت تھی؛ لیکن اس سلسلہ میں بھی آپ کے یہاں اعتدال تھا، آپ فرماتے تھے: ''الف، ب پڑھانے والے کا جو مقام ہے، وہ کسی کا نہیں''۔

جو لوگ بیعت ہونا چاہتے، ان کو تاکید کرتے کہ اپنے علاقے کے علماء ومشائخ سے ربط رکھیں، ایک معلم صاحب کے خط کے جواب میں فرمایا:

معمولات کا علم ہوا، اس میں تو کافی وقت صرف ہوتا ہوگا، اللہ پاک خیر وبرکت عطا فرمائے، درس وتدریس میں زیادہ وقت لگائیے۔

ایک صاحب کو تحریر فرمایا:

اس چکر میں نہ پڑیئے، ذکر میں جہر یا سر کی کوئی پابندی نہیں، جس

طرح جی لگے اسی طرح ذکر کیجئے؛ البتہ اتنا خیال رکھئے کہ اگر لوگ سورہے ہوں تو ذکر جہری نہ کیجئے کہ لوگوں کی نیند خراب ہوگی، ایسے وقت ذکر سری ہی افضل ہے۔

ایک بار بعض اساتذۂ مدارس نے عرض کیا کہ ہم لوگ فلاں صاحب سے تسبیحات وغیرہ معلوم کرلیا کرتے تھے، اب کوئی نہیں تو فرمایا :

یہ جو (مدرسہ کے لئے) روڑہ پتھر آپ لوگ کررہے ہیں، یہ کم نہیں ہے، اگر اخلاص کے ساتھ ہو۔

اور یہ بھی فرمایا کہ ’’فسبح بحمد ربک ‘‘(النصر:۳) کا حکم تو حضور ﷺ کو اخیر عمر میں دیا گیا، قاری صاحب علماء کے لئے اس بات کو پسند فرماتے تھے کہ وہ ضروری حد تک تسبیحات کا معمول رکھیں اور زیادہ وقت مطالعہ وتدریس اور دینی کاموں میں گذاریں اور اپنے آپ کو اتنا مشغول رکھیں کہ غیر ضروری باتوں کا وقت ہی نہ مل پائے ، اس کے ساتھ ساتھ خود قاری صاحب کا معمول روزانہ تہجد، نوافل اور بہ کثرت تسبیحات واستغفار کے پڑھنے کا تھا۔

یہی مزاج اعتدال آپ کا تعلیم وتعلم کے سلسلہ میں بھی تھا، آپ نے پوری عمر مدارس ومکاتب کے قیام میں اور علوم اسلامیہ کی تدریس میں گذاری؛ لیکن آپ عصری تعلیم کے بھی مخالف نہیں تھے؛ بلکہ چاہتے تھے کہ تصحیح نیت کے ساتھ یہ علوم حاصل کئے جائیں؛ چنانچہ ایک موقع پر فرمایا :

یہ جو اسکول اور کالج کی تعلیم ہے، اس کی قدر کرنی چاہئے اور یہاں جو تعلیم دی جاتی ہے اور جو ہنر سکھایا جاتا ہے، اس کو ہم دل سے لیں اور دل سے سیکھیں اور تصحیح نیت کے ساتھ سیکھیں، اور یہی جذبہ ہمارا ہو کہ ہم دوسروں کو نفع پہنچائیں گے۔

دینی مدارس ومکاتب کو آپ اُمت کی شہہِ رگ قرار دیتے تھے اور دینی تعلیم وتربیت کو

بے حد اہمیت دیتے تھے :

درس و تدریس اور پڑھنے پڑھانے کو لوگ معمولی کام سمجھتے ہیں، اس کی اہمیت کا لوگوں کو اندازہ نہیں، ہم اس کو اذکار و اشغال اور نوافل سے افضل سمجھتے ہیں۔

قاری صاحب اس بات پر خاص توجہ دلاتے تھے کہ اصل یہ نہیں ہے کہ کون اونچی کتابیں پڑھاتا ہے اور کون نیچی ؛ بلکہ اخلاص نیت کے ساتھ دین کی خدمت اصل مقصود ہے ؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

بہت سے قاعدہ بغدادی پڑھانے والے کل قیامت کے روز امام بنے ہوں گے اور آگے آگے چل رہے ہوں گے اور بخاری شریف، حدیث شریف پڑھانے والے کل پریشان ہوں گے اور ناظرہ پڑھانے والوں کا دامن پکڑ رہے ہوں گے، اصل چیز تو اخلاص ہے، سچ کہتا ہوں کہ اخلاص کی بنا پر قاعدہ بغدادی پڑھانے والا بخاری شریف پڑھانے والوں سے بھی بڑھ سکتا ہے۔

عام طور پر جو علماء دعوت و اصلاح کے میدان میں آئے ہیں، علم سے ان کا رشتہ کمزور ہو جاتا ہے؛ لیکن مولانا کے یہاں بیک وقت دعوت و اصلاح کا کام بھی پوری قوت کے ساتھ ہوتا تھا اور اتنے ہی اہتمام کے ساتھ علمی خدمات سے بھی آپ کو شغف تھا، تدریس و خطاب کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بھی آپ کو خاص ذوق تھا، آپ کی زیادہ تر تصنیفات درسِ نظامی کے مروجہ فنون کی تسہیل اور نصابی کتابوں کی تشریح پر ہیں، تسہیل التجوید، تسہیل المنطق، تسہیل النحو، تسہیل الصرف، اسعاد الفہوم، تسہیل السامی اور تسہیل الترتیل، نیز بخاری کی کتاب الایمان اور کتاب العلم کی شرح 'تسہیل الباری' کے نام سے اسی سلسلہ کی تالیفات ہیں، اصلاحی اور دعوتی تالیفات میں ''حق نما، احکام وصیت، فضائل نکاح، سیرت سید المرسلین، فضائل علم

وعلماء'' اہم کتابیں ہیں اور آداب المعلمین اور آداب المتعلمین تو اساتذۂ وطلبہ کے لئے ''خضرراہ'' کا درجہ رکھتی ہیں۔

اس کے علاوہ قاری صاحب کو شعر وسخن کا بھی بڑا اچھا ذوق تھا اور غالبًا یہ ذوق آپ کو اپنے استاذ اور شیخ، بلند پایہ شاعر وادیب حضرت مولانا اسعد اللہ صاحبؒ سے ورثہ میں ملا تھا؛ چنانچہ آپ کے بہت سے نعتیہ اشعار زبان زد ہیں اور عام طور پر جلسوں میں پڑھے جاتے ہیں، ایک بار مصرعہ طرح طے ہوا: ''یا الٰہی نزع کے عالم میں آسانی نہ ہو'' قاری صاحب نے اس پر کیا خوب مصرع کہا ہے، فرماتے ہیں :

گر مری منزل میں آگے کو پریشانی نہ ہو
یا الٰہی نزع کے عالم میں آسانی نہ ہو

علم وعمل کی جامعیت، سوز دروں اور خلوص بے کراں، وسعت قلبی اور خلق اللہ سے محبت، اعتدال ومیانہ روی، جہد مسلسل اور یقین محکم کا اگر کوئی جسمانی پیکر تیار ہو اور آپ اسے حضرت مولانا قاری محمد صدیق باندویؒ کا نام دے دیں تو یقیناً مبنی برحقیقت ہوگا۔

بقول ضیاء نعمانی :

الحاج شاہ حضرتِ اسعد کے فیض سے
ترشا ہوا کمال کا ہیرا کہیں جسے

❁ ❁ ❁

امیر شریعت مولانا ابوالسعود احمد باقویؒ ٭

جو خود سلگتے تھے اوروں کی روشنی کے لئے

انسان اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پانے اور اپنی فکر وعمل کو درست رکھنے میں اپنے خالق ومالک کی ہدایت ورہنمائی کا محتاج ہے، اس ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں عطاء فرمائی ہیں، کتاب اللہ اور رجال اللہ، کتاب اللہ سے مراد وہ الہامی کتابیں ہیں، جو اللہ کی طرف سے مختلف انبیاء پر اُتاری جاتی رہی ہیں، اور 'رجال اللہ' سے مراد اللہ کے نیک بندے ہیں؛ چنانچہ قرآن مجید آخری کتاب ہے، جو اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتاری گئی، اسی طرح رجال اللہ کی حیثیت سے اپنے اپنے دور میں اللہ کے پیغمبر بھیجے جاتے رہے، نبوت کا یہ سلسلہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوگیا؛ لیکن انسانیت کو چوں کہ ہمیشہ ہدایت کی ضرورت ہے، اس لئے کتاب اللہ کے سلسلہ میں تو یہ انتظام ہوا کہ خود خالق کائنات نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لے لیا، یہ کتاب قیامت تک کے لئے محفوظ ہے اور انسانیت کو ہمیشہ اس سے روشنی ملتی رہے گی، جب کہ رجال اللہ کی ضرورت اس طرح پوری کی گئی کہ اُمت کے علماء کو فکر وعمل کی اصلاح کے سلسلے میں انبیاء کا وارث قرار دیا گیا :

إن العلماء ورثة الأنبياء ، إن الأنبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهما ، إنما ورثوا العلم ، فمن أخذ به فقد أخذ بحظ وافر ۔ (ترمذی عن ابی الدرداء، باب ماجاء فی فضل الفقہ علی العبادۃ، حدیث نمبر: ۲۶۸۲)

اسی طرح ایک روایت میں ہے: ''**علماء أمتي كانبياء بني اسرائيل**'' اگرچہ اس کو عام طور پر محدثین نے غیر معتبر قرار دیا ہے؛ لیکن اگر صحیح ہو تو اس ارشاد سے ایک نکتہ یہ بھی

٭ ''بڑے حضرت'' سیمینار منعقدہ: ۶-۷/مئی ۲۰۱۱ء، دارالعلوم سبیل الرشاد بنگلور کے لئے لکھی گئی تحریر۔

اخذ کیا جاسکتا ہے کہ بنی اسرائیل کے انبیاء اس قوم کی خاص خاص ٹکڑیوں کی طرف بھیجے گئے اورانھوں نے بنیادی طور پر ان ہی کی اصلاح کو اپنی کوششوں کا مرکز بنایا تھا؛ لہٰذا اُمت کے علماء کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ خدمتِ دین کے کسی ایک شعبہ کو یا کسی ایک علاقہ کو اپنی محنتوں کا ہدف بنائیں، اگرچہ دین کے تمام کاموں سے محبت رکھیں اور پوری اُمت کی فکر فرمائیں۔

چنانچہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سے آج تک ہر دور اور ہر علاقہ میں ایسی ممتاز دینی وعلمی شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں، جن کی روشنی نے ہزاروں دلوں کو روشن کردیا اور جنھوں نے دعوت واصلاح کی ایسی انگیٹھی سلگائی کہ کتنے ہی قلوب نے ان سے ایمان کی حرارت حاصل کی، ماضی قریب میں بھی ہمارے ملک میں اس شان اور مقام کی مختلف شخصیتیں گزری ہیں، ان میں چند نام ــــ جو سرفہرست رکھے جانے کے لائق ہیں، ــــ میں ایک داعی اسلام استاذ الاساتذہ امیر شریعت حضرت مولانا ابوالسعود احمد باقویؒ تھے، وہ جامع الصفات شخصیت کے مالک تھے، ان کا فیض نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ ہندوستان سے سے باہر بھی جاری ہوا، وہ داعی بھی تھے ،صاحب نظر مفتی بھی اور مصنف بھی، شعروسخن کا بھی اعلیٰ ذوق رکھتے تھے، مدرس ایسے باکمال کہ سینکڑوں نہیں ہزاروں نے ان کے خرمن درس سے خوشہ چینی کی، کئی کتابوں کے مصنف، تزکیہ واصلاح کی راہ کے رہبر ومقتدیٰ؛ لیکن انھوں نے خاص طور پر تعلیم وتربیت اور دعوت وتبلیغ کو اپنی کوششوں کا محور بنایا اور میدان کار کے طور پر جنوبی ہند اور خاص کر کرناٹک اور مضافات کے ان علاقوں کو منتخب فرمایا، جو دینی اعتبار سے زمینِ شور کے درجہ میں تھا۔

اس حقیر کو متعدد بار آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی ہے، گندمی؛ لیکن کھلتا ہوا رنگ، درمیانہ سے کسی قدر کم قد وقامت، دہرا بدن، گھنی داڑھی، کشادہ پیشانی، فراخ آنکھیں اور اس پر موٹی سی عینک، سر ہمیشہ عمامہ کی سنت سے آراستہ، سفید لمبا کرتا اور سفید ہی لنگی، ہاتھ میں عصا، سامنے دیکھتے ہوئے وقار کے ساتھ چلتے، آنے والے چھوٹے ہوں یا بڑے، سب سے مسکرا کر ملتے، گفتگو میں سادگی اور خلوص، خطابت میں دردمندی وخیر خواہی، جس کی وجہ سے

سیدھے سادھے الفاظ بھی سننے والوں کے دلوں پر دستک دیتے ، جس مجلس میں ہوتے ، اپنی عالمانہ وضع قطع اور متانت ووقار کی وجہ سے صاف پہچانے جاتے ، یہ ہے آپ کا سراپا!

حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ آپ کے بڑے قدر شناس تھے اور حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نہایت عقیدت و نیاز مندی کے ساتھ ہمیشہ آپ کا ذکر کرتے ؛ اس لئے یہ متعین کرنا مشکل ہے کہ میں نے پہلی بار کب آپ کا اسم گرامی سنا اور کب آپ کی زیارت سے مشرف ہوا ؟ —— جب بھی بنگلور حاضری ہوئی ، خواہ سبیل الرشاد کی دعوت پر یا کسی اور ادارہ کی ، ممکن نہیں تھا کہ آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل کئے بغیر واپسی ہوجائے ؛ لیکن کلکتہ میں جب پہلی بار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا عظیم الشان اجلاس حضرت مولانا علی میاںؒ کے عہد صدارت میں منعقد ہوا تو کورومنڈل ایکسپریس (جو ہاوڑہ سے مدراس جاتی ہے) سے واپسی ہوئی ، حسن اتفاق دیکھئے کہ جس بوگی میں اس حقیر کو سیٹ ملی ، اسی میں حضرت مولاناؒ ، مولانا نیر ربانی مرحوم اور صاحب زادہ گرامی مولانا مفتی اشرف علی صاحب کے ساتھ سوار تھے۔

چنانچہ کلکتہ سے سے وجئے واڑہ تک ایک ساتھ سفر ہوا اور کم وبیش ۲۴ گھنٹہ ساتھ رہنے کا موقع ملا ، میرا وقت زیادہ تر آپ ہی کی صحبت میں گزرا ، اس مختصر سفر میں آپ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ، آپ کی منکسر المزاجی ، تواضع اور خوش اخلاقی کا تو مشاہدہ کیا ہی ، اندازہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تفقہ کے جوہر گراں مایہ سے بھی نوازا ہے اور فقہ وفتاویٰ کی کتابوں پر گہری نظر ہے ، کئی مسائل تو برسبیل تذکرہ آپ نے خود ذکر کئے اور موقع سے فائدہ اُٹھا کر کئی باتیں اس حقیر نے بھی اپنے علم کے لئے دریافت کیں ، اور تجربہ ہوا کہ غیر معمولی دعوتی و اصلاحی نیز انتظامی مشغولیات کے باوجود آپ کا علم مستحضر اور آپ کا مطالعہ تازہ ہے ، خاص کر تدریس وفتویٰ نویسی سے اعتناء کی وجہ سے فقہی ماٰخذ پر وسیع نظر ہے۔

آپ ایک علمی و دینی خاندان کے چشم و چراغ تھے ، والد ماجد حافظ عبدالستار صاحب ، دادا مولانا ابراہیم صاحب اور ان کے والد حافظ محمد لبے ، اسم گرامی ابوالسعود احمد ، احمد ہی تخلص

بھی فرماتے تھے، ۱۱/ربیع الاول ۱۳۲۹ھ، مطابق ۱۹۱۲ء، روز پیر کو تملناڈو کے ایک قصبہ ڈیلیج پور میں پیدا ہوئے، آپ کے برادر بزرگ مولانا محمد ابراہیم صاحب عالم دین ہیں اور برادر خورد مولانا محمد اسماعیل صاحب بھی علوم اسلامی کے ماہر اور کامیاب ومقبول استاذ؛ بلکہ استاذ الاساتذہ تھے، مجھے بھی ان کا نیاز حاصل کرنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے، آپ کے چاروں فرزندان حضرت مولانا مفتی محمد اشرف علی باقوی، مولانا محمد ولی اللہ رشادی، مولانا امداد اللہ رشادیؒ اور مولانا محمد لطف اللہ رشادی ممتاز علماء میں ہیں، میں نے حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کو بارہا کہتے ہوئے سنا کہ ہندوستان میں مجھے سب سے زیادہ حضرت مولانا ابوالسعود صاحب کے خاندان پر رشک آتا ہے کہ آپ اور آپ کے تمام بھائی بھی عالم، تمام صاحبزادے بھی عالم اور سب کے سب صرف عالم ہی نہیں؛ بلکہ علم وفضل میں امتیازی حیثیت کے حامل۔

آپ کی فراغت جنوبی ہند کی معروف بافیض دینی درسگاہ جامعہ باقیات الصالحات ویلور سے ۱۹۳۷ء میں ہوئی، آپ نے بڑے لائق اور اپنے اپنے فن کے ممتاز اساتذہ سے کسب فیض کیا، جن میں مولانا عبدالجبار صاحب باقوی، علامہ ضیاء الدین احمد امانی، مولانا حسن باشا باقوی، مولانا قاری سید محمد عرب مدنی، مولانا عبدالعلی باقوی، استاذ الاساتذہ مولانا سعید باقوی اور مولانا عبدالصمد باقوی قابل ذکر ہیں، علامہ ضیاء الدین احمد امانی آپ کے استاذ ومربی بھی تھے، ان ہی کی بڑی صاحبزادی سے آپ کا عقد ہوا، جو نہایت نیک سیرت، پابند دین وشریعت اور صاحب توکل وقناعت خاتون تھیں، یقیناً آپ کی زریں خدمات میں ان کی رفاقت وغم گساری اور مشکل حالات میں صبر وبرداشت کا بھی نمایاں حصہ تھا، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی کے مجاز مولانا سعید احمد کیرانویؒ سے تزکیہ واصلاح کی راہ میں خلافت حاصل تھی، علم وعمل کا یہ آفتاب تقریباً ۸۸ سال اپنے علم وعمل کی روشنی پھیلاتے ہوئے اس طرح غروب ہوا، کہ اس کی کرنیں آج بھی جہالت کی تاریک فضاؤں کو روشن کررہی ہیں۔

فراغت کے بعد آپ کی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا دور اسلامی ہائی

اسکول میل وشارم میں دینیات کی تدریس کا، ۱۷ سال آپ نے یہ خدمت انجام دی اور اپنے فریضہ کواس طرح انجام دیا کہ نہ صرف مسلمان؛ بلکہ غیر مسلم اساتذہ وطلبہ بھی آپ کے معتقد تھے اور پورے شہر کے لئے آپ احترام وعقیدت کا مرکز بنے ہوئے تھے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ کے استاذ مولانا امانی نے گورنمنٹ اسکول میں ملازمت کی ترغیب دی؛ لیکن آپ نے قبول نہیں فرمایا اور کم تنخواہ والی اس غیر سرکاری ملازمت کو ترجیح دی۔

دوسرا دور وہ ہے، جب آپ اپنے مادر علمی باقیات الصالحات کے انتظامی اُمور کی ذمہ دار ہوئے اور وہاں اہتمام کی خدمت انجام دی، یہ دور ۱۹۵۲ء تا ۱۹۶۰ء آٹھ سالوں پر مشتمل ہے، آپ کے آنے کے بعد مدرسہ میں بڑی ترقیاں ہوئیں، طلبہ کی تعداد بڑھی، مالی وسائل میں اضافہ ہوا اور ادارہ کی گرتی ہوئی ساکھ بہتر ہونے لگی، آپ نے انتظامی اُمور کے ساتھ ساتھ تدریس وفتاویٰ نویسی کے فرائض بھی انجام دیئے، آپ کو ان مشاغل کے ساتھ ساتھ دعوت کے کاموں سے غیر معمولی دلچسپی تھی، دین سے غفلت کی وجہ سے آپ اسے نہ صرف ضروری سمجھتے تھے؛ بلکہ مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک دعوۃ وتبلیغ کو پورے جنوبی ہند میں پہنچانے کے لئے پوری سرگرمی اور جوش وعمل کے ساتھ کوشاں تھے؛ چوں کہ یہ تحریک جنوبی ہند میں ابھی ابھی پہنچی تھی؛ اس لئے بہت سے اہل علم کو غلط فہمی تھی اور ادارہ کے بعض اساتذہ اور ذمہ داروں کو کچھ تحفظات تھے، اس نے آخر ایک فتنہ کی شکل اختیار کرلی، آپ ہر حال میں مستقیم وثابت قدم رہے اور اختلاف سے بچتے ہوئے اس ذمہ داری سے استعفیٰ دے دیا۔

اس کے بعد آپ کی زندگی کا تیسرا دور ۱۴؍ستمبر ۱۹۶۰ء دار العلوم سبیل الرشاد کی تاسیس سے شروع ہوتا ہے، ۱۵؍شوال ۱۳۸۰ھ میں آپ نے سبیل الرشاد کی بنیاد رکھی، حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ نے اپنے درس سے مدرسہ کی ابتداء فرمائی، شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے بہ شمول تبلیغی جماعت اور مظاہر علوم سہارنپور کے اکابر علماء کی دُعائیں اس ادارہ کے شامل حال رہیں، یہ آپ کے ارادہ کی برکت تھی کہ بے سروسامانی کے باوجود علم کے اس باغ نے بہت تیزی سے نشو ونما پائی اور اس کا دائرۂ فیض روز روز بڑھنے لگا، یہاں تک کہ

۱۰شوال ۱۲۸۶ھ مطابق ۲۲؍جنوری ۱۹۶۶ء کو پہلی بار ساٹھ طلبہ نے یہاں سے سندِ فراغت حاصل کی اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے فضلاء کی دستار بندی فرمائی۔

"سبیل الرشاد" یوں تو ایک دینی درسگاہ ہے؛ لیکن حقیقت میں جنوبی ہند کے لئے اس نے ایک تعلیمی تحریک کی حیثیت سے کام کیا ہے، سبیل الرشاد کی بحیثیت درسگاہ خصوصیات میں سے یہ ہے کہ وہ تعلیم کے ساتھ دعوت کے امتزاج کا اور مسلک و مشرب میں اعتدال و میانہ روی کا نقیب ہے اور یہ اس کے بانی گرامی کی سوچی سمجھی فکر اور کوشش کا نتیجہ ہے، مولانا الیاس صاحب کی دینی تحریک سے تعلق کی وجہ سے آپ 'باقیات الصالحات' کو خیر باد کہنے پر مجبور ہوئے؛ اس لئے آپ نے شروع ہی سے اس درسگاہ میں دعوتی کام کو شامل رکھا، جو ابھی بھی قائم ہے، اس درسگاہ میں طلبہ کی تربیت پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے، آپ نے طلبہ کے لئے ایسا نظام العمل بنایا کہ طلبہ اسباق کی حاضری اور نماز باجماعت کے علاوہ اذکار و تسبیحات، تلاوت قرآن مجید، نماز اشراق اور صلوٰۃ الاوابین کا بھی اہتمام کریں، اس کے علاوہ سورۂ یٰسین، سورۂ واقعہ، الم سجدہ، سورۂ ملک اور ایک پارہ کی تلاوت آپ نے تمام طلبہ پر لازم قرار دی تھی، یہ معمولات وہاں اب بھی قائم ہیں، مولانا کا مزاج یہ تھا کہ فروعی اختلافات میں شدت نہ برتی جائے اور اُمت کی وحدت و اجتماعیت کو اولیت دی جائے؛ چنانچہ یہ رنگ اب بھی رشادی فضلاء میں دیکھا جاسکتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آپ نے جہاں مسلمانوں میں اصلاحی خدمت انجام دی ہے، اسی طرح غیر مسلموں میں دعوت کے کام کو بھی آپ بے حد اہمیت دیتے تھے، میل وشارم میں قیام کے درمیان آپ روزانہ عصر کے بعد قرب و جوار کی غیر مسلم آبادیوں میں پہنچ کر کسی میدان میں مغرب و عشاء کی نماز ادا فرماتے اور بڑی حکمت کے ساتھ تمل زبان میں ان پر اسلام کی دعوت پیش فرماتے، اس دعوتی مہم میں چٹائیاں اور پٹرومکس بھی ساتھ لے کر جاتے تھے، کم وبیش پانچ سو لوگوں کو آپ کی دعوت پر دینِ ہدایت میں آنے کی سعادت حاصل ہوئی، آپ نے اس کے لئے ایک مستقل ادارہ "انجمن تبلیغ الاسلام" قائم فرمایا تھا، جو لوگ اسلام

قبول کرتے، آپ ان کی ضروریات کو پورا کرتے اور دینی تربیت کی بھی فکر فرماتے۔

آپ ہمہ جہت طور پر اُمت کے مسائل کی فکر کرتے تھے، اسی کا ایک حصہ 'امارت شرعیہ کرناٹک' کا قیام ہے، ۱۹۷۶ء میں مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری کے زیر صدارت تمام مسالک و مکاتبِ فکر کے علماء و مشائخ کا اجتماع منعقد ہوا، جس نے باتفاق رائے آپ کو ریاست کرناٹک کا اولین امیر شریعت منتخب کیا؛ چنانچہ ۹ ر جمادی الاولی ۱۳۹۴ھ مطابق یکم جنوری ۱۹۹۷ء کو ایک عظیم الشان اجلاس میں اس کا اعلان کیا گیا، جس کی صدارت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ نے فرمائی اور جس میں خطاب کرنے والوں میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ بھی شامل تھے، آپ نے مولانا محمد یوسف شرقی کو قاضی اور مولانا محمد زکریا عمری کو معین قاضی شریعت مقرر فرمایا، پھر دارالقضاء کی خوبصورت عمارت تعمیر کرائی جس کا افتتاح حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے ہاتھوں ہوا اور اسی موقع سے دوروزہ تربیت قضاء کیمپ منعقد ہوا، جس میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے مربی کے فرائض انجام دیئے، امارت شرعیہ اور دارالقضاء کی تحریک کو بہار سے بنگلور پہنچانے میں آپ کے جن نیاز مندوں نے نمایاں طور پر حصہ لیا، ان میں سرفہرست ڈاکٹر ممتاز احمد خان بانی 'الامین تحریک' ہیں۔

اگرچہ دعوتی و انتظامی سرگرمیوں کی وجہ سے آپ کو یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی خدمت کا زیادہ موقع نہیں ملا؛ لیکن آپ نے جو کچھ لکھا ہے، وہ آپ کی علمی بصیرت اور داعیانہ جذبات کا شاہد عدل ہے، ان میں سے چار کتابیں طبع ہو چکی ہیں، ایک: ''احکام نکاح'' جس میں فقہ حنفی کی مستند کتابوں سے نکاح، طلاق، عدت اور نفقہ و میراث وغیرہ کے مسائل ذکر کئے گئے ہیں، یہ بعض اداروں میں داخل نصاب بھی ہے، دوسری تالیف ''باب القرآن'' ہے، یہ دراصل ناظرۂ قرآن مجید سے پہلے حروف کی شناخت اور قواعد تجوید کی وضاحت پر مبنی ۳۲ صفحات کا رسالہ ہے، جس کے پڑھنے کے بعد پارۂ عم پڑھنا آسان ہو جاتا ہے، قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا محمد زکریا کاندھلویؒ جیسے اہل علم نے اس کی تحسین فرمائی ہے، آپ کا تیسرا

رسالہ ''تجوید القرآن'' کے نام سے ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے، جس میں تجوید کی اہمیت اور تجوید کے ضروری اُصول پر روشنی ڈالی گئی ہے، آپ کی چوتھی تالیف ''مخصوص دُعائیں اور مقبول وظائف'' کے نام سے ہے، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ ماثور اوراد واذکار کا مجموعہ ہے اور عوام و خواص کے لئے یکساں طور پر مفید ہے، آپ کے مقالات وفتاویٰ ان کے علاوہ ہیں، ضرورت ہے کہ یہ تمام تحریریں یکجا طور پر شائع کی جائیں اور انھیں زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک پہنچایا جائے؛ تاکہ ان کا نفع عام و تام ہو، ان تصنیفات کے علاوہ آپ کی ایک اہم تحریری یادگار وہ ہے، جو فتاویٰ کی شکل میں دارالعلوم سبیل الرشاد کے شعبہ افتاء کے ریکارڈ میں محفوظ ہے، ان میں سے چند فتاویٰ اس حقیر کی نظر سے گذرے ہیں، جو آپ کی فقہی بصیرت کو ظاہر کرتے ہیں، ضرورت ہے کہ دارالعلوم ان فتاویٰ کے مجموعہ کو مرتب کرے؛ تاکہ عام لوگوں کو استفادہ کا موقع ملے اور اہل علم ونظر کی آنکھوں کا سرمہ بن سکے۔

آپ کی چند خصوصیات ایسی ہیں، جن میں طبقہ علماء کے درمیان آپ کی امتیازی شان نظر آتی ہے، اور اس لائق ہیں کہ دینی مدارس سے تعلق رکھنے والے لوگ اس کو اپنے لئے سرمہ چشم بنائیں۔

ان میں پہلی بات 'تعلق مع القرآن' ہے، جب بھی کوئی وقت فارغ ملتا، آپ تلاوتِ قرآن مجید کا اہتمام کرتے، بعض اوقات ایک دن میں سترہ پارے تلاوت کر جاتے، حضر میں اور سفر میں ہر جگہ جو خالی وقت ملتا، آپ کی زبان تلاوت قرآن مجید سے تر رہتی، حفظ اتنا پختہ کہ کسی سابق اطلاع کے بغیر تراویح میں جو پارہ سنانے کو کہا جاتا، بروقت سنا دیتے، روزانہ اچھا خاصا وقت تلاوت کے معمول کے لئے وقف ہوتا، یہ ایسا وصف ہے جو آج علماء تو کیا حفاظ کی زندگی سے بھی رخصت ہو چکا ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف رمضان المبارک میں قرآن مجید دیکھنا اور پڑھنا کافی ہے، تعلق مع القرآن ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ آپ نے سبیل الرشاد میں تجوید کے ساتھ قرآن مجید کی تعلیم پر بہت زور دیا، مستقل شعبۂ تجوید بھی قائم فرمایا اور پورے

علاقہ میں تصحیح قرآن کی تحریک چلائی، آج بھی بحمد اللہ سبیل الرشاد کے فضلاء قرآن مجید پڑھنے میں امتیازی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں، الفاظ قرآن کی طرف توجہ کرنے کے ساتھ ساتھ آپ نے معانی قرآن پر بھی توجہ کی اور تفسیر قرآن کی تعلیم کو مدارس میں خصوصی اہمیت کے ساتھ رواج دینے کی کوشش فرمائی؛ چنانچہ سبیل الرشاد کی غالباً یہ انفرادیت ہے کہ وہاں دورۂ حدیث کے ساتھ ساتھ دورۂ تفسیر کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔

آپ کا دوسرا نمایاں وصف 'اُمت کے مسائل کے لئے فکرمندی' تھا، اگر آپ باقیات الصالحات ویلور سے نکلنے کے بعد تملناڈو ہی میں مدرسہ قائم فرماتے تو شاید زیادہ آسانی سے ادارہ کو ترقی حاصل ہوتی؛ لیکن آپ کے ذہن میں یہ بات تھی کہ بنگلور اور کرناٹک کا علاقہ دین سے بے بہرہ اور دینی اداروں سے خالی ہے، اور یہاں دینی درسگاہ کی ضرورت ہے؛ اسی لئے آپ نے ایسے علاقہ میں کام شروع کیا، جس کو اس وقت لوگ دینی اعتبار سے ایک وادی سنگلاخ تصور کرتے تھے —— اسی طرح پورے جنوبی ہند میں دراصل آپ ہی کے ذریعہ تبلیغی جماعت کا کام شروع میں ہوا اور اسے فروغ بھی حاصل ہوا، آپ جہاں جاتے وہاں کے برادرانِ وطن کی ہدایت کے لئے بھی فکرمند ہوتے، اُمت کے مسائل اور ان کی دینی ضرورتوں کے لئے فکرمندی کی وجہ سے تملناڈو کے علاقہ میں دعوتِ دین کے کام کو خاص طور پر پذیرائی حاصل ہوئی۔

مولانا کا تیسرا نمایاں وصف آپ کا توکل ہے، آپ اہل زر پر نظر رکھنے اور ان کے سامنے دست سوال دراز کرنے کے بجائے ہمیشہ اللہ کے سامنے دست دُعاء پھیلاتے اور ضروریات کے لئے نماز حاجت کا اہتمام فرماتے، اسی توکل کے ساتھ آپ نے سبیل الرشاد کی زمین حاصل کی اور اسی شان کے ساتھ اس کی عالیشان تعمیرات کے نقوش صفحۂ زمین پر اُبھرے، کئی بار ایسا ہوا کہ خزانہ بالکل خالی تھا، آپ نے دُعاء کی اور جتنی رقم کی ضرورت تھی، اتنی ہی اللہ نے بھیج دی، اسی توکل کی وجہ سے اپنی ذات کے معاملہ میں بھی قناعت سے کام لیتے، جب آپ میل وشارم میں غیر مسلموں میں دعوت کا کام کرتے تھے تو اسکول کے منتظمین نے آپ کو ماہانہ ایک سو روپے الاؤنس کی پیشکش کی اور اس زمانہ میں یہ رقم معمولی رقم نہیں تھی؛

لیکن آپ نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ اگر اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کہہ دیں کہ اس محنت کا معاوضہ تم نے دنیا میں لے لیا تو میں کیا کروں گا؟—اس قناعت کا پہلو یہ بھی ہے کہ جب آپ کے استاذ اور خسر مولانا ضیاء الدین احمد امانی نے آپ کو سرکاری ملازمت اختیار کرنے کی ترغیب دی، جس میں تنخواہ زیادہ ہوتی اور سرکاری سہولتیں حاصل ہوتیں تو آپ نے اس کی بجائے ایک پرائیوٹ اسکول میں کم تنخواہ پر مدرس دینیات کا فریضہ انجام دینے کو ترجیح دی۔

علم کے بافیض ہونے کے لئے ضروری ہے کہ انسان کے اندر تحمل و بردباری ہو؛ تاکہ لوگ اس کے قریب آسکیں اور اس سے فیضیاب ہوسکیں، آپ کے اندر یہ شان بدرجۂ اتم موجود تھی، کوئی شخص احکام شریعت کی خلاف ورزی کرتا تبھی آپ ناراض ہوتے؛ ورنہ ہر چھوٹے بڑے کے معاملہ میں بڑی ہی بردباری سے کام لیتے، طلبہ کے ساتھ آپ کی شفقت ومحبت آپ کے تمام ہی شاگردوں کی نوک زبان ہے، ہر شخص سے مسکرا کر ملتے، کسی طالب علم کو ''تُو'' یا ''اَرے'' سے بھی خطاب نہیں کرتے، کسی طالب علم پر بہت غصہ آتا تو زیادہ سے زیادہ 'احمق' کہتے، اس سے سخت الفاظ گویا آپ کی ڈکشنری ہی میں نہیں تھے، یہ زبان کی احتیاط ہی ہے کہ حالاں کہ آپ نے اپنے مادر علمی باقیات الصالحات کی پوری دلجمعی کے ساتھ خدمت فرمائی، اس کے باوجود آپ کو وہاں سے استعفیٰ دینا پڑا؛ لیکن آپ کبھی اپنی زبان پر حرف شکایت نہیں لائے؛ یہاں تک کہ جب ویلور سے قریب آپ کے خاندان کے لوگوں نے ایک جگہ کی پیشکش کی؛ تاکہ وہاں مدرسہ قائم کیا جائے تو آپ نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ یہاں سے اتنا قریب باقیات الصالحات موجود ہے، یہاں پر کسی اور ادارہ کی ضرورت نہیں، آپ اپنے متعلقین کو بھی ہمیشہ سمجھاتے کہ مخالفین کے ساتھ اُلجھنے سے گریز کیا جائے، کاش، آج علماء اسے پیش نظر رکھیں۔

آپ کا تعلیمی نظریہ وہی تھا، جو ہندوستان کے اکثر بزرگ علماء کا رہا ہے کہ دینی مدارس کو دینی تعلیم کے لئے خالص رکھا جائے، اس کے ساتھ صنعتی تربیت یا ووکیشنل کورس کا اختلاط نہ ہو؛

لیکن آپ عصری تعلیم کے مخالف بھی نہ تھے، خود آپ نے مدراس یونیورسٹی سے افضل العلماء اور منشی فاضل کا کورس کیا اور انگریزی زبان سے بھی بہت اچھی طرح واقف تھے۔

اپنی علمی لیاقت، اخلاقی بلندی، فکر کی گہرائی اور زمانہ کی نباضی کی صلاحیت کی وجہ سے ملک کے اکثر اہم اداروں اور تنظیموں میں آپ کو ذمہ دارانہ حیثیت حاصل تھی، آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نائب صدر، آل انڈیا ملی کونسل کے سرپرست، دارالعلوم دیوبند کے رکن شوریٰ، ندوۃ العلماء لکھنؤ کے رکن منتظمہ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی مجلس شوریٰ کے رکن، مدرسہ باقیات الصالحات ویلور کی مجلس تعلیمی کے رکن، ریاست کرناٹک کے پہلے امیر شریعت اور جنوبی ہند کی مختلف دینی درسگاہوں اور ملی اداروں کے سرپرست اور ذمہ دار تھے، نہ جانے کتنے مدارس ومکاتب آپ کی تحریک پر قائم ہوئے اور نہ معلوم دور دراز دیہات وقریہ جات کے کتنے ماہ وانجم ہیں کہ جنھوں نے آپ کی تحریک پر تعلیمی سفر شروع کیا اور آج ان کی روشنی سے پورا علاقہ ضیاء بار ہے۔

جس طرح انسان کی زندگی گذرتی ہے، اسی کیفیت پر اس کی موت بھی آتی ہے، آپ کی زندگی اس کی کھلی ہوئی مثال ہے، آپ کی نماز اور تکبیر اولیٰ کبھی فوت نہیں ہوتی تھی، وفات سے ایک ہفتہ پہلے ماہ رمضان المبارک آپ سے رخصت ہوا، پورے ماہ آپ نے باوجود بے حد ضعف ونقاہت کے روزے بھی رکھے اور تراویح بھی ادا کی، عید الفطر کے بعد جب صحت زیادہ بگڑی تو ہسپتال میں داخل کئے گئے؛ لیکن ۵؍شوال مطابق ۲۴؍فروری ۱۹۹۶ء کو باصرار دولت خانہ کو واپس آگئے اور کہا کہ ہاسپیٹل میں میں اپنے رب سے ملنا نہیں چاہتا، گھر پہنچ کر آپ نے کپڑے تبدیل کئے، عمامہ زیب سر فرمایا، اپنا حجرہ صاف کرایا، اپنے بچوں سے وداعی ملاقات کی، انھیں نصیحت فرمائی اور کچھ اس طرح پُرسکون ہو کر لیٹ گئے کہ گویا زندگی بھر کی تھکا دینے والی جد وجہد کے بعد اب رحمت خداوندی کے سایہ میں راحت وآرام کی سانس لینی ہو، اس طرح ۶؍شوال ۱۴۱۶ھ مطابق ۲؍فروری ۱۹۹۶ء کو وفات ہوئی اور تعلیم

وتعلم کی جو بستی آپ نے خود بسائی تھی اور فکر ونظر کا جو گلشن خود اپنی محنت سے آراستہ کیا تھا، وہیں قیامت تک کے لئے آسودۂ خواب ہو گئے، دیکھنے والوں نے نقل کیا ہے کہ جیسے زندگی میں ہمیشہ متبسم رہتے تھے، موت کے بعد بھی دیکھنے والوں کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے زیرلب مسکرا رہے ہوں، بقول علامہ اقبالؒ :

نشان مردِ مومن با تو گویم
چوں مرگ آید ، تبسم بر لب اوست

❁ ❁ ❁

مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ ❁
ایک جامع کمالات شخصیت

دوہرا بدن، اوسط قد وقامت، کھلا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، سفید اور ہلکی داڑھی، آنکھیں بڑھاپے کی غماز اور موٹے چشمہ کی حامل، دوپلی ٹوپی، سفید کرتا نصف پنڈلی تک اور اس سے کچھ نیچے تک پائجامہ، گاہے اس کرتے پر شیروانی بھی زیب تن، ہاتھ میں عصائے پیری، مہمان نواز، نرم خو، نرم گفتار، بڑوں کا بے حد احترام کرنے والے، خوردوں پر نہایت شفیق ومہربان، تواضع وانکسار کا پیکر، ذکر اور اتباعِ سنت کا خاص اہتمام، سادہ مزاج، سادہ دل اور سادہ زبان، اچھے مقرر اور اس سے بڑھ کر مایۂ ناز مصنف، زود قلم اور خوش رقم، زندگی بھر لوح وقلم کی رفاقت رکھی اور مختلف موضوعات پر ہزاروں صفحات لکھے، وقت کی حفاظت کے باب میں علماء کے لئے اسوہ اور سادہ وخاموش طریقہ پر علم وتحقیق کے کام کے لئے بہترین نمونہ، ان شمائل وخصائل کو اپنے ذہن میں ترتیب دیں، یہ تھے مخدوم محترم حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ۔

دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم الشان درسگاہ کے سینئر مفتی، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے صدر عالی قدر، امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ وجھارکھنڈ کے معزز رکن شوریٰ اور مختلف دینی درسگاہوں کے سرپرست اور نہ جانے کتنے علماء، ارباب افتاء اور اہل قلم کے استاذ ومربی۔

آپ کی تاریخ پیدائش ۲۱؍شعبان ۱۳۴۴ھ مطابق ۷؍مارچ ۱۹۲۶ء ہے، دربھنگہ شہر سے

❁ مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ کی ''آپ بیتی'' پیش لفظ، اضافہ کے ساتھ۔

پانچ کیلومیٹر کے فاصلہ پر پورانو ڈیہہ نامی گاؤں آپ کا وطن ہے، والد ماجد کا اسم گرامی منشی شمس الدین مرحوم، جو ریلوے ملازم تھے اور اپنی دین داری میں علاقہ میں معروف، ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں ہوئی، عربی و فارسی کی تعلیم مدرسہ محمودیہ راج پور نیپال اور مدرسہ وارث العلوم چھپرہ میں حاصل کی، متوسطات اور منتہی کتابیں مدرسہ مفتاح العلوم مئو ضلع اعظم گڑھ میں پڑھیں اور یہی نسبت آپ کے نام کا جزو ہے، پھر کچھ دنوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں زیر تعلیم رہے، مدرسہ محمودیہ اور مدرسہ وارث العلوم میں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ امیر شریعت خامس بہار واُڑیسہ، جامعہ مفتاح العلوم مئو میں محدث جلیل حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ اور مولانا عبداللطیف نعمانیؒ، نیز ندوہ میں حضرت مولانا عطا شاہؒ، حضرت مولانا محمد ناظم ندویؒ، حضرت مولانا حمید الدین صاحبؒ اور مولانا محمد اسحاق سندیلوی آپ کے خاص اساتذہ تھے، اس کے علاوہ آپ کو علامہ سید سلیمان ندویؒ سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کی طبیعت میں اپنے اکابر کا بڑا احترام واکرام تھا، آپ کی زبان ہمیشہ ان کے ذکر خیر سے تر رہتی تھی، اسی لئے آپ بھی ہمیشہ اپنے اساتذہ اور بزرگوں کے محبوب اور منظور نظر رہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ کی آپ کے ساتھ خاص شفقت وعنایت تھی، آپ محدث اعظمیؒ کے بہت چہیتے تھے، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ بھی آپ سے بے حد محبت کرتے تھے اور آپ کو خاص کر اخیر زمانے میں ان کا خاص اعتماد واعتبار حاصل تھا، اپنے ان بزرگوں کے بعد بھی آپ نے اُن مراکز سے اپنے تعلقات کو پوری طرح استوار رکھا، جو ان حضرات سے منسوب تھے، مئو ہمیشہ آمد ورفت رکھا کرتے اور خانقاہ رحمانی مونگیر بھی اہتمام کے ساتھ آتے جاتے اور بعض دفعہ اعتکاف بھی فرماتے۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے اپنی تدریسی زندگی کا آغاز کیا، ندوہ میں مزید کسبِ علم کے لئے مقیم تھے کہ ان ہی دنوں مولانا محمد اویس ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء نے اپنے وطن کی ایک دینی عربی درسگاہ مدرسہ معدن العلوم نگرام میں صدارت تدریس کی پیشکش کی، مفتی

صاحب نے اپنے بزرگوں کے مشورہ سے اس پیشکش کو قبول کرلیا؛ لیکن جلد ہی ملک آزاد ہوا اور فتنہ وفساد کا ایسا دور دورہ ہوا کہ لوگ امن وآشتی کے لئے ترسنے لگے، ان حالات میں آپ کے اعزہ اس بات کے لئے بالکل تیار نہیں ہوئے کہ آپ کو دور جانے دیں؛ چنانچہ بہار ہی میں تدریس کی خدمت انجام دینی شروع کی، بہار کے ضلع مونگیر میں سادات کا ایک قصبہ ''سانحہ'' کے نام سے ہے، یہاں آپ نے تدریس شروع کی، درمیان میں کچھ دنوں آپ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل بھی گئے، یہاں آپ نے مدرسہ کو ترقی دی اور یہیں سے آپ کی تصنیفی زندگی کا آغاز ہوا۔

۱۳۷۵ھ کی بات ہے، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ نے خانقاہ رحمانی کے عظیم الشان اور خوبصورت کتب خانہ کی تعمیر مکمل کرائی، اس موقع سے آپ نے کتب خانہ کی افتتاحی تقریب رکھی، جس میں ملک کے ممتاز علماء کو مدعو فرمایا، ان مہمان علماء میں سب سے نمایاں نام حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کا ہے، اس موقع سے امیر شریعت حضرت مولانا رحمانیؒ کی خواہش پر مفتی صاحبؒ نے ایک مقالہ پڑھا، جو اہل علم موجود تھے، انھوں نے اس کی بہت پذیرائی کی، حضرت قاری صاحبؒ بھی اس تحریر سے بہت متاثر ہوئے اور آپ سے دارالعلوم دیوبند آنے اور خدمت کرنے کی خواہش فرمائی — یہاں سے مفتی صاحبؒ کی زندگی میں نیا باب کھلتا ہے، جس نے ان کے علمی افادہ کے دائرہ کو وسیع سے وسیع تر کردیا۔

۴؍صفر ۱۳۷۶ھ کو دارالعلوم دیوبند میں شعبۂ تبلیغ میں آپ کی تقرری عمل میں آئی اور آپ کو ''جماعت اسلامی کے دینی رجحانات'' کے عنوان پر لکھنے کو کہا گیا؛ چنانچہ آپ نے اس موضوع پر دو حصوں میں ایک تحریر مرتب کی، جو معتدل اور متوازن لب ولہجہ کی حامل ہے، پھر چند ہی ماہ بعد آپ کا تبادلہ دارالافتاء میں کردیا گیا اور فتاویٰ نویسی کی خدمت آپ سے متعلق ہوئی، دارالعلوم دیوبند کا کتب خانہ بہت ہی غیر مرتب شکل میں تھا، عام طور پر اہل علم کو اس کی شکایت تھی، حضرت مہتمم صاحب بھی اس کے لئے فکرمند تھے، حضرت مفتی صاحبؒ کی کتابوں

پر نظر اور مطالعہ کے ذوق کو دیکھتے ہوئے ۱۳۸۲ھ میں کتب خانہ کی ترتیب کی ذمہ داری آپ سے متعلق ہوئی، اسی دور میں آپ نے اس کتب خانہ کے مخطوطات کا تعارف لکھا، جو دو ضخیم جلدوں میں ہے اور طبع ہو چکا ہے، بحمد اللہ مفتی صاحبؒ نے اس کام کو بھی بہتر طور پر انجام دیا اور بکھری ہوئی موتیوں کو خوبصورتی کے ساتھ پرونے کی خدمت سرانجام دی، مفتی صاحب نے کتب خانہ کی ترتیب کا کام اس خوش اُسلوبی سے انجام دیا کہ دوسرے ادارے بھی آپ سے اس بارے میں مشورہ لیا کرتے تھے، ۱۹۷۵ء میں جب دارالعلوم ندوۃ العلماء نے ۸۵ سالہ جشن منایا تو مخطوطات کی فہرست سازی میں تعاون کے لئے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے آپ کو کئی ماہ کے لئے ندوہ بلایا اور وہاں بھی مفتی صاحبؒ نے یہ کام بہت ہی عمدگی کے ساتھ انجام دیا۔

دارالعلوم میں آپ مختلف علمی کام انجام دیتے رہے، ایک زمانہ میں فضلاء کی فکری و قلمی تربیت کے لئے ''شعبۂ مطالعہ علوم قرآنی'' کا قیام عمل میں آیا تھا، آپ ہی اس کے ذمہ دار مقرر ہوئے، اس شعبہ میں متعدد باصلاحیت فضلاء کی تربیت ہوئی، جن میں مولانا سید محمد ولی رحمانی، مولانا ریاست علی شیر کوٹی، مولانا محمد رضوان القاسمیؒ، مولانا شاہین جمالی، مولانا ابراہیم گجراتی اور مولانا سمیع اللہ گونڈوی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، افسوس کہ یہ مفید شعبہ چند ہی سالوں میں بند ہو گیا۔

۱۳۹۶ھ میں دارالعلوم کے عربی ترجمان ''الداعی'' کے لئے نگراں کمیٹی بنائی گئی، آپ بھی اس کمیٹی میں شامل تھے، ۱۳۹۴ھ میں رؤیت ہلال کمیٹی بنی، اس میں بھی آپ کی شرکت تھی، ۱۳۹۴ھ ہی میں دارالقضاء کا قیام عمل میں آیا تو آپ اس کمیٹی کے بھی رکن تھے، ۱۳۹۶ھ میں دارالعلوم کے ایک ممتاز فاضل کو حضرت نانوتویؒ کے علوم پر کام کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی، آپ اس کام کے نگراں مقرر کئے گئے۔

۱۳۸۵ھ سے دارالعلوم کی انتظامیہ میں تبدیلی —— یعنی ۱۴۰۲ھ —— تک رسالہ ''دارالعلوم'' کا اداریہ لکھنے کی ذمہ داری آپ ہی کی تھی اور یہ اداریئے زبان و بیان کے اعتبار

سے بھی اور مسائل کے تجزیہ کے لحاظ سے بھی پورے ملک میں شوق سے پڑھے جاتے تھے، آپ نے ایک عظیم الشان خدمت ترتیب فتاویٰ کی انجام دی، جو یقیناً آپ کا روشن کارنامہ ہے، ۱۴۰۳ھ سے دوبارہ دارالافتاء میں آپ کی واپسی ہوگئی اور نہایت بہتر طریقہ پر آپ اس فریضہ کو انجام دیتے رہے؛ بلکہ نئے مسائل سے متعلق جوابات زیادہ تر آپ ہی کے قلم سے ہوتے تھے۔

حضرت مفتی صاحبؒ اچھے خطیب بھی تھے، زمانہ طالب علمی میں جنگ آزادی میں بھی شریک ہوئے اور اس کی آزمائشوں اور ابتلاؤں سے بھی گذرے، ’سانحہ‘ کے زمانۂ قیام میں جمعیۃ علماء ہند کے تحریکی کاموں سے بھی متعلق رہے۔

آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ابتداء قیام سے رکن تاسیسی اور ادھر عرصہ سے اس کی مجلس عاملہ کے بھی رکن تھے، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آپ ابتداء قیام سے ہی رکن تھے اور اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد جب اکیڈمی کی تنظیم نو ہوئی، اس میں آپ باتفاق رائے صدر منتخب ہوئے، تحریک امارت شرعیہ سے آپ کا تعلق بہت قدیم تھا اور آپ شروع سے امارت کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے۔

لیکن آپ کا اصل مزاج علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کا تھا اور اس معاملہ میں مفتی صاحبؒ کی زندگی علماء کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، یوں تو آپ زمانہ طالب علمی ہی سے قلمی ذوق رکھتے تھے؛ لیکن آپ کی پہلی باضابطہ تصنیف سانحہ کے زمانۂ قیام میں ”اسلام کے نظام مساجد“ کے نام سے منصۂ شہود پر آئی، جس کی اہل علم کے درمیان بے حد پذیرائی ہوئی، اس کے علاوہ اسلام کے مختلف شعبۂ ہائے حیات پر آپ کی مقبول عام وخاص تصنیفات میں ”اسلام کا نظام امن، اسلام کا نظام عصمت وعفت، اسلامی نظام معیشت اور اسلام کا نظام جرم وسزا“ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، دارالعلوم دیوبند سے مفتی صاحبؒ کا فکری تعلق بھی تھا اور قلبی وروحانی تعلق بھی، اس لئے دارالعلوم سے متعلق بھی آپ کی کئی تحریریں ہیں، جو جشن صدسالہ کے موقع سے طبع ہوئیں، جن میں سے ”مشاہیر علماء دیوبند، دارالعلوم — ایک عظیم مکتبہ فکر،

دارالعلوم دیوبند — قیام اور پس منظر'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

''امارت شرعیہ'' کا نظام آپ کی فکر کا ایک اہم حصہ ہے؛ چنانچہ اس موضوع پر آپ نے ''امارت شرعیہ — کتاب وسنت کی روشنی میں'' نامی رسالہ تالیف فرمایا، جس میں دارالکفر میں نظام امارت پر گفتگو کی گئی ہے، نیز امارت شرعیہ کی تاریخ پر آپ ہی کے قلم سے ایک مفصل کتاب ''امارت شرعیہ — دینی جدوجہد کا روشن باب'' ہے، جو امارت کی پوری تاریخ کا نقشہ کھینچتی ہے، سیرت، تاریخ اور شخصیات پر تالیف کا مفتی صاحبؒ کو خاص ذوق تھا، اس سلسلہ میں ''مصائب سرور کونین — اسوۂ حسنہ'' بڑی مؤثر کتاب ہے، اسی طرح صحابہ اور سلف کے واقعات پر ''تاریخی حقائق'' اور اسلامی تاریخ کی یادگار مسجدوں پر ''تاریخ مساجد'' اہم کتابیں ہیں، حضرت مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ماضی قریب میں اپنے علمی وتحقیقی ذوق کے معاملہ میں امتیازی شان کے حامل صاحب قلم گذرے ہیں، افسوس کہ ان کی حیات اور تذکرہ پر کسی صاحب نے قلم نہیں اُٹھایا تھا، مفتی صاحب نے ''حیاتِ گیلانیؒ'' کے نام سے مولانا کا مفصل تذکرہ لکھا ہے۔

حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ کی خواہش پر آپ نے دارالعلوم کے شعبۂ تبلیغ سے تعلق کے زمانہ میں دینی عقائد کے نام سے اہل سنت والجماعت اور علماء دیوبند کے عقیدہ کو مرتب فرمایا اور جماعت اسلامی کی فکر پر قلم اُٹھایا، یہ دونوں رسالے دارالعلوم دیوبند سے شائع ہو چکے ہیں، حضرت مفتی صاحبؒ کا اکابر علماء اور معروف اصحابِ قلم سے علمی ارتباط رہا ہے اور اس سلسلہ میں آپ نے ان سے مراسلت بھی کی ہے، یہ خطوط بہت سے علمی مضامین، اپنے عہد کے حالات اور کتابوں سے متعلق تبصروں پر مشتمل ہیں، مکتوب الیہ کے علاوہ دوسرے اہل علم کے لئے بھی ان کی افادیت تھی، اسی پس منظر میں آپ نے اپنے نام آئے ہوئے ان مکتوبات کو ''مشاہیر علماء ہند کے علمی مراسلے'' کے نام سے مرتب فرمایا ہے۔

آپ کا سب سے یادگار کارنامہ دارالعلوم دیوبند کے مفتی اول حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانیؒ کے فتاویٰ کی ترتیب کا کام ہے، جو غالباً سولہ ضخیم جلدوں میں، کتاب اللقطہ پر ختم

ہوتا ہے اور جس نے پوری دنیا میں شہرت وقبولیت حاصل کی ہے، کاش ترتیب فتاویٰ کا یہ سلسلہ جاری رہتا اور فتاویٰ کی جو امانت بوسیدہ رجسٹروں کے دفینہ میں ہے، وہ بھی سفینوں میں آجاتی تو اہل علم اور عام مسلمانوں کے لئے زندگی کے بہت سے مسائل میں خضر طریق مہیا ہو جاتا، آپ کے علمی کارناموں میں ایک اہم کام حضرت امیر شریعت مولانا رحمانی کی خواہش پر ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کی ابتدائی ترتیب کا کام ہے، گو اس کام میں بہت سے علماء اور اربابِ افتاء کی شرکت رہی ہے؛ لیکن اس کے ابتدائی مسودہ کی ترتیب کی سعادت آپ ہی کے حصہ میں آئی، جس کے نگرانِ اعلیٰ امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ تھے۔

غالباً آپ کی آخری تالیف آپ کی خودنوشت سوانح ہے، جسے اس حقیر کی خواہش پر کتب خانہ نعیمیہ دیوبند نے ''زندگی کا علمی سفر'' کے نام سے شائع کیا ہے، یہ نہایت دلچسپ تالیف ہے، جو بہت سے بزرگوں سے متعارف کراتی ہے، ایک طالب کا اپنے اساتذہ سے اور ایک کارکن کا اپنا ذمہ داروں سے کیسا ربط وتعلق ہو، نیز مشکل حالات اور ناموافق ماحول میں بھی انسان کس طرح اپنے کام کو جاری رکھے، اس سلسلہ میں قاری کو روشنی ملتی ہے، مفتی صاحب کے حکم پر اس حقیر نے اس کتاب پر اپنا پیش لفظ لکھا تھا، یہی پیش لفظ کسی قدر اضافہ کے ساتھ اس وقت قارئین کے سامنے ہے۔

آپ کے ان علمی کاموں کے علاوہ جو منظر عام پر آچکے ہیں، دو چیزیں ایسی ہیں، کہ انھیں مرتب ہو کر شائع ہونا چاہئے، ایک تو آپ کے فتاویٰ جو ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور جن کی ترتیب وطباعت کے سلسلہ میں راقم الحروف بار بار حضرت مفتی صاحبؒ سے تحریک کرتا رہا ہے، دوسرے آپ کے مقالات جو مختلف رسائل میں شائع ہوئے ہیں اور جن کی تعداد خود مفتی صاحبؒ نے اپنی آپ بیتی میں ۱۳۱ لکھی ہے، یہ دونوں چیزیں کئی جلدوں میں طبع ہوں گی، اور اہل علم اور اصحابِ ذوق کی چشم محبت کا سرمہ بنیں گی۔

مفتی صاحبؒ کو جیسے اللہ تعالیٰ نے علمی کاموں کی توفیق عطا فرمائی، اسی طرح ان

کاموں کو مقبولیت اور شہرت سے بھی سرفراز فرمایا، ندوۃ المصنفین دہلی جو ایک زمانے میں علماء دیوبند کا سب سے مؤقر تصنیفی واشاعتی ادارہ تھا، نے آپ کی کئی تحریروں کو شائع کیا ہے، آپ کی اکثر کتابیں ہند و پاک میں کئی کئی بار طبع ہو چکی ہیں، ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' کا انگریزی ترجمہ بھی شائع ہوا، اسی کتاب کا فارسی ترجمہ ''حجاب وعفت از دیدگاہ اسلام'' کے نام سے تہران (ایران) سے شائع ہو چکا ہے اور جدید حلقہ میں اس کی خاصی پذیرائی ہوئی ہے، حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا نظام مساجد، نظام امن اور نظام عفت وعصمت، ایسی کتابیں ہیں کہ انھیں عربی میں بھی طبع ہونا چاہئے، یہاں اس بات کا ذکر مناسب ہوگا کہ چندسال پہلے اس حقیر کا سعودی عرب کا سفر ہوا، ایک صاحب نے بتایا کہ انھوں نے کچھ اہم کتابیں انگریزی زبان میں تلخیص کے لئے منتخب کی ہیں، ان میں ایک ''اسلام کا نظام عفت وعصمت'' بھی ہے، جس کا انگریزی خلاصہ انھوں نے بنگلور سے شائع کیا ہے، ایک زمانہ میں معارف اور برہان اُردو کے دوسب سے زیادہ مؤقر جرائد تھے، مفتی صاحبؒ برہان کے مستقل مضمون نگاروں میں تھے۔

حضرت مفتی صاحب ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے بزرگوں اور اہل دل مصلحین کے دامن تربیت سے باندھے رہے، علامہ سید سلیمان ندویؒ اور امیر شریعت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحبؒ سے خصوصی اصلاحی تعلق رکھا اور اذکار و اوراد کے سلسلہ میں ان کی نصیحتوں پر عامل رہے، پھر سید صاحب کی ایماء پر ۱۹۴۷ء میں حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بیعت ہوئے، حضرت مدنیؒ کے وصال کے بعد ۱۳۸۵ھ میں حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے بیعت کی تجدید فرمائی، ۱۳۹۵ھ میں ایک صاحب نسبت اور صاحب علم بزرگ حضرت مولانا شاہ فضل اللہ حیدرآبادیؒ (حفید: حضرت مولانا سید محمد علی مونگیریؒ) نے آپ کو خرقۂ خلافت سے سرفراز فرمایا، پھر رمضان المبارک ۱۳۹۶ھ میں حضرت قاری صاحب نے بھی آپ کو اجازت بیعت دی،، مفتی صاحبؒ کی سادگی اور انکساری کہ انھوں نے عمومی طور پر بیعت کا سلسلہ شروع نہیں کیا۔

حضرت مفتی صاحب کو مجھے قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے، مفتی صاحبؒ میں متعدد خوبیاں ایسی جمع ہوگئی تھیں، جو کم ہی ایک شخصیت میں جمع ہو پاتی ہیں اور جو خاص کر علماء کے لئے اُسوہ ونمونہ کا درجہ رکھتی ہیں۔

پہلی بات مفتی صاحبؒ کی سادگی ہے، معمولی سا کپڑا، عام قسم کی عینک، سیدھی سادھی جوتی، سفر میں تھیلا بھی معمولی، جہاں ٹھہرایئے ٹھہر جائیں، جہاں بٹھایئے بیٹھ جائیں، عامی سے عامی بھی دعوت دے تو قبول کرلیں، نہ ہٹو، نہ بچو، نہ خدم وحشم کی فوج، نہ گفتگو میں کوئی تکلف، نہ نشست و برخواست میں کوئی تصنع —— یہی ہمارے بزرگوں کا طریقہ تھا، سلف کے اس طرز عمل کو مفتی صاحب کی زندگی میں زندہ وتابندہ دیکھا جاسکتا ہے۔

سادگی سے ہی قریب دوسرا وصف 'تواضع وانکسار' کا ہے، مفتی صاحبؒ اپنے عہد کے بڑے مصنفین اور اصحابِ قلم میں تھے، ملک و بیرون ملک ان کی تحریروں کو قبول عام حاصل ہوا، برصغیر کی سب سے بڑی درسگاہ میں منصب افتاء پر فائز تھے؛ لیکن کہیں سے کبر اور برتری کا احساس چھو کر بھی نہیں گیا تھا، بڑے ہوں، معاصر وہم عمر ہوں، یا شاگرد اور خرد، ہر ایک کے ساتھ تواضع، جھکاؤ اور بچھاؤ کی کیفیت، چھوٹوں سے بھی ایسی بے تکلف گفتگو جیسے دوست کسی دوست سے کرتا ہے۔

تیسری چیز وقت کی حفاظت اور اپنے علمی مشاغل کا اہتمام ہے، مفتی صاحبؒ نے فتاویٰ نویسی، کتب خانہ کی ترتیب اور ترتیب فتاویٰ کے دشوار کام کے ساتھ ساتھ جس طرح اپنے تصنیفی شغل کو جاری رکھا، کتابیں اور مقالات لکھتے رہے اور علمی مجالس کو رونق بخشتے رہے، وہ ایک قابل تقلید عمل ہے، میں نے مفتی صاحب کو دیکھا ہے کہ سفر کی حالت میں ہیں، کہیں پلیٹ فارم پر رکنا پڑا، ٹرین آنے میں دیر ہے تو بیگ سے کاغذ نکالا، جیب سے قلم، اور لکھنے میں مشغول ہوگئے، اپنی جائے اقامت میں تو اور زیادہ اہتمام کے ساتھ لکھنے پڑھنے کا کام سرانجام دیتے، اسی لئے ان کے وقت اور قلم میں برکت تھی۔

چوتھی قابل ذکر بات یہ ہے کہ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ علم وتحقیق کے کام اور لوح وقلم

کی خدمت کے لئے ضروری ہے کہ بارونق شہر ہو، علمی چہل پہل ہو، بڑا کتب خانہ ہو اور علمی ماحول ہو؛ لیکن مفتی صاحبؒ نے 'سانحہ' جیسے کوردہ دیہات اور ایک ابتدائی مدرسہ میں رہ کر بھی تصنیف وتالیف کا اچھا خاصا کام کیا اور وہیں اسلام کا نظام مساجد اور نظام عفت وعصمت مرتب فرمائی، جس کی علامہ سید سلیمان ندویؒ، مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمیؒ جیسے اکابر علماء اور مولانا عبدالماجد دریابادیؒ جیسے ادیب نے داد دی اور جسے ندوۃ المصنفین جیسے وقیع اور باوقار ادارہ نے شائع کیا، اس میں نوجوان فضلاء کے لئے سبق ہے، اگر انسان عزم محکم کا مالک ہو اور عمل پیہم کا خوگر، تو وہ علم وتحقیق کے مراکز سے دور رہ کر بھی بہتر سے بہتر کام انجام دے سکتا ہے اور اگر بے توفیقی کسی پر سایہ فگن ہو جائے تو عین مراکز علم میں رہتے اور کتابوں سے بھری الماریوں کے درمیان بیٹھتے ہوئے بھی کوئی کام نہیں کرسکتا۔

مفتی صاحب کی کتابیں تو یہ حقیر جامعہ رحمانی کی طالب علمی کے زمانہ میں ہی پڑھ چکا تھا؛ لیکن ملاقات کی سعادت اس وقت حاصل ہوئی، جب دارالعلوم دیوبند میں حاضری ہوئی، دارِ جدید کے احاطہ میں مدنی گیٹ سے بائیں جانب فوقانی منزل میں ان کی قیامگاہ تھی، وہیں سامنے دوسری جانب استاذ گرامی حضرت مولانا محمد حسین صاحب بہاریؒ کی قیامگاہ تھی، اکثر دونوں میں مہذب نوک جھوک بھی ہوتی رہتی تھی، مولانا بہاری کی وفات کے بعد مفتی صاحب اسی کمرہ میں منتقل ہو گئے تھے، پہلی ہی ملاقات میں مفتی صاحب کی سادگی اور خوش اخلاقی نے بے حد متاثر کیا، مفتی صاحب کے بڑے صاحبزادے مولانا ڈاکٹر احمد سجاد قاسمی سے اس حقیر کا گہرا دوستانہ تعلق تھا اور ان کا کمرہ پڑھے لکھے احباب کی آماجگاہ رہتا تھا، اس نسبت سے مفتی صاحب کے کمرہ میں بھی کثرت سے آمد ورفت ہوتی رہتی تھی، جب بھی کمرہ میں حاضری ہوتی، ممکن نہ تھا کہ مفتی صاحب کچھ کھلائے پلائے بغیر واپس ہونے دیں، مفتی صاحب کی مہمان نوازی کی وجہ سے ان کے کمرہ میں بے تکلف احباب کی نشست خوب جمتی تھی اور اڑوس پڑوس تک بھی قہقہوں کی گونج پہنچ جاتی تھی، حکیم عزیز الرحمٰن صاحب مئویؒ اور مولانا ازہر شاہ قیصرؒ خاص

ہم نشینوں میں تھے اور ہم عمر اور ہم مزاج ہونے کی وجہ سے باہم بڑے بے تکلف بھی تھے۔

طالب علمی کے زمانہ میں مفتی صاحب سے جو ربط قائم ہوا، وہ بڑھتا ہی گیا، آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی نشستوں میں ہمیشہ ملاقاتیں ہوا کرتیں، جس کے رکن وہ اول دن سے تھے، پھر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام کے بعد اس کے سیمیناروں میں بھی پابندی سے مفتی صاحبؒ تشریف لاتے، حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمی صاحبؒ کی وفات کے بعد جب آپ بہ اتفاق رائے اکیڈمی کے صدر منتخب ہوئے تو اکیڈمی کی وجہ سے ہر ماہ دو ماہ پر ملاقات کا سلسلہ رہتا تھا، مفتی صاحبؒ اکیڈمی کی میٹنگوں میں، سیمیناروں میں اور حسب ضرورت اکیڈمی کے دفتر میں تشریف لایا کرتے تھے، کبھی مفتی صاحبؒ سے ملاقات کے لئے یا کسی انتظامی مشورہ کی غرض سے میں بھی دیو بند حاضر ہوتا رہتا تھا۔

تقریباً آٹھ سال مفتی صاحبؒ کے زیر سرپرستی اکیڈمی کی خدمت کا موقع ملا، لوگ اندیشہ میں مبتلا تھے کہ شاید قاضی صاحبؒ کے بعد اکیڈمی کا سفر جاری نہ رہ سکے؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بانی اکیڈمی حضرت قاضی صاحبؒ کے اخلاص اور حضرت مفتی صاحبؒ کی دُعاؤں کی برکت ہے کہ اکیڈمی نے پوری آب و تاب کے ساتھ اپنا علمی سفر جاری رکھا اور اس کے کام میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی گئی، اللہ کرے کہ یہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہے اور اُمت کے مسائل کو حل کرنے میں اپنا کردار ادا کرتی رہے۔

اداروں اور تنظیموں میں اگر چھوٹوں کو اپنے بڑوں کا اعتماد حاصل ہو تو کام میں سہولت ہوتی ہے اور کھل کر کام کرنے کا موقع ملتا ہے، مفتی صاحبؒ کا اس حقیر کے ساتھ یہی معاملہ تھا، وہ مجھ پر بے حد اعتماد کرتے تھے، بعض دفعہ میں ان کی طرف سے کوئی تحریر لکھتا اور وہ بغیر پڑھے دستخط کر دیتے، اکیڈمی کی مشاورتی نشستوں میں کہہ دیتے کہ ناظم صاحب جو طے کریں گے اس کے مطابق عمل ہوگا، ان کے اس اعتماد و اعتبار کی وجہ سے ہم خدام کو کھل کر کام کرنے کا موقع ملا۔

مفتی صاحبؒ مجھ پر ذاتی اور شخصی حیثیت میں بے حد محبت وشفقت فرماتے تھے، اسی لئے نہ صرف اکیڈمی کے بارے میں خیر خواہانہ جذبات رکھتے تھے، جس کے ذمہ دار وہ خود تھے؛ بلکہ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد سے بھی بڑا تعلق خاطر تھا، دو بار باوجود کمزوری اور پیرانہ سالی کے معہد تشریف لائے اور ایک بار جلسۂ سالانہ کی صدارت بھی فرمائی، دیوبند سے فارغ ہونے والے باصلاحیت طلبہ کو فراغت کے بعد معہد آنے کا مشورہ دیتے تھے، آخری ملاقات جب ان کے دولت خانہ پر ہوئی تو اس وقت وہ بڑی حد تک معذور ہو چکے تھے؛ لیکن وہ اپنی محبت میں مجھ سے بار بار کہتے رہے کہ مجھے معہد لے چلو، میں وہاں ٹھیک ہو جاؤں گا، مگر ان کی صحت اس لائق نہیں تھی کہ وہ کوئی مختصر سفر بھی کر سکیں، چہ جائیکہ اتنا لمبا سفر، کسے معلوم تھا کہ اب انھیں اس چھوٹے سے گاؤں سے سیدھے آخرت ہی کا سفر کرنا ہے؟

مفتی صاحبؒ کی اس حقیر پر جو بے پایاں شفقت تھی اور وہ اس عاجز کی نسبت سے جس محبت اور حسن ظن کا اظہار کرتے تھے، اس کا اندازہ ایک اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے، جو انھوں نے اس حقیر کی تالیف ''قاموس الفقہ'' کی تقریظ میں تحریر فرمایا ہے :

> اس وقت خاکسار کے سامنے'' قاموس الفقہ'' کی ایک جلد ہے، اسے پڑھ کر اور دیکھ کر حیرت ہے کہ شخص واحد نے اتنا اہم علمی کام تنہا کیسے انجام دیا، سینکڑوں کتابیں اس کے سامنے ہیں، ان کتابوں سے احکام ومسائل نکال کر ان پر بحث و تحقیق کر رہا ہے، کتبِ فقہ میں جتنے الفاظ آئے ہیں، اس نے ان سب کو حروف تہجی کے اعتبار سے جمع کر دیا ہے، اور اس لفظ سے متعلق جس قدر بحثیں آئی ہیں، ان کو ایک خاص ترتیب سے یکجا کر دیا ہے، اگر کہا جائے کہ ایک ایک لفظ پر ایک مستقل کتاب لکھ دی ہے، تو اس میں ذرہ بھر مبالغہ نہیں ہوگا، بحث و تحقیق عالمانہ اور محققانہ ہے، کوئی ضروری گوشہ چھوٹنے نہیں پایا ہے، بہت سارے الفاظ پر مقالے لکھے گئے ہیں

اور اتنے دل پذیر اور سلیقہ سے کہ شروع کرنے کے بعد چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا ہے، جب تک ختم نہ کردے......۔

سچ پوچھئے تو یہ کتاب علم الفقہ کی جیتی جاگتی انسائیکلو پیڈیا ہے اور یقین ہے کہ یہ کتاب بہت ساری کتابوں کے مطالعہ سے بے نیاز کردے گی اور پڑھنے والا اس ایک کتاب کو پڑھ کر سینکڑوں کتابوں سے بے نیاز ہوجائے گا، انشاء اللہ......۔

اس کتاب کے مرتب و مؤلف عزیز گرامی قدر مولانا خالد سیف اللہ رحمانی زید مجدہ ہیں، جو المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے بانی واستاذ ہیں، بہت سارے کاموں کے ساتھ یہ علمی کام وہ کرتے ہیں، ان کا علم متحضر ہے، دماغ بیدار ہے، ذہن ثاقب ہے، جو کام حکومت وقت کے کرنے کا تھا اور جہاں بیسیوں اہل علم کے تعاون کی ضرورت تھی ، اسے اس اللہ تعالیٰ کے نیک بندے نے تنہا خاموشی کے ساتھ انجام دیا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ موصوف عزیز کو ہر شر وفتنہ سے محفوظ رکھے، ان کی اس خالص علمی خدمت کو قبول فرمائے اور ان کے لئے سرمایۂ عاقبت بنائے، آمین۔ (قاموس الفقہ:۱/۱۵۹-۱۶۰)

وفات سے ایک دوسال پہلے اپنی کبرسنی اور معذوری کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند کی خدمت سے باعزت طور پر سبکدوش ہوگئے اور صاحبزادہ کے اصرار پر اپنے گاؤں ہی میں مقیم ہوگئے؛ چنانچہ کم وبیش دوسال کے عرصہ میں متعدد بار یہ حقیر بہار کے سفر کے دوران خدمت میں حاضر ہوا اور اس محبت وشفقت اور مہمان نوازی کا لطف اُٹھایا، جو مفتی صاحب کے مزاج کا حصہ تھا۔

حضرت مفتی صاحب نے ۳۱/مارچ ۲۰۱۱ء، جمعرات کو ۳ بجے دن میں آخری سانس لی

اوراپنے جان آفریں سے جاملے ، اگلے دن نماز جنازہ ہوئی اور صاحبِ نظر عالم ومصنف پروفیسر سعود عالم قاسمی (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) نے نماز پڑھائی ، جوعرصہ تک ان کے دامن تربیت سے وابستہ رہ چکے ہیں، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے ،ان کی وفات پرایسا محسوس ہوا، جیسے کسی بزرگ خاندان کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ہو،محبّ گرامی برادرم مولانا احمد سجاد صاحب کوفون کیا تو انھوں نے بھی یہی کہا کہ جس قدر تعزیت کا مستحق میں ہوں ، اسی قدر آپ بھی ہیں —— اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اوران کی علمی اور دینی خدمات کوان کے لئے صدقۂ جاریہ بنائے۔**اللهم اغفر له وارحمه ۔**

❁ ❁ ❁

امیر ملت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقلؒ

ہو بہو کھینچے گا ؛ لیکن عشق کی تصویر کون ؟
اُٹھ گیا ناوک فگن ، مارے گا دل پر تیر کون ؟

ایمرجنسی ختم ہونے کے بعد ۱۹۷۷ء میں بہار اور موجودہ جھارکھنڈ کے شہر رانچی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا اجلاس ہوا ، یہ وقت تھا جب بورڈ کے مؤسسین باحیات تھے ، حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ، حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ اور دوسرے اکابر علماء ڈائس پر موجود تھے ، یہ تمام شخصیتیں دیدہ وشنیدہ تھیں ؛ لیکن بہت سی صورتیں جنھیں اس سے پہلے دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور جنھیں ان ہی بزرگوں کی صف میں بیٹھایا گیا تھا ، ان میں ایک شخصیت سب سے ممتاز نظر آتی تھی اور اپنی عالمانہ وضع ، قطع ، بزرگانہ وقار اور معصوم شکل وصورت کی وجہ سے مرکز توجہ بنی ہوئی تھی ، سفید کرتا ، سفید پائجامہ ، سفید شیروانی ، سفید عمامہ اور اس پر چکن کا سفید رومال ، قد درازی مائل ، رنگ کھلا ہوا اور ہاتھ میں عصا ، بار بار نظر ان ہی کی طرف جاتی اور لوگ ایک دوسرے سے ان کے نام اور مقام کے بارے میں سرگوشیاں کرتے ، یہ شخصیت تھی حضرت مولانا محمد حمید الدین حسامی عاقلؒ کی ۔

حسن اتفاق دیکھئے کہ دوسرے ہی سال اور انھیں کی دعوت پر یہ حقیر حیدرآباد حاضر ہوا اور قریب سے گفتگو اور ملاقات کا موقع ملا ، پہلی ہی ملاقات میں مولانا کی شفقت ومحبت اور خورد نوازی نے اسیر بنالیا ، جب سے تادمِ وفات ۳۰ ؍ سال سے زیادہ کا عرصہ ہوتا ہے ، نجی نشستوں میں مشورہ کا موقع بھی ملا ، جلسوں اور کانفرنسوں میں آپ کے ساتھ شرکت کی سعادت بھی حاصل ہوئی ، حضر میں بھی دیکھا اور سفر میں بھی ساتھ رہا ، ہر ملاقات نے محبت وتعلق کو بڑھایا

اور جذبۂ احترام میں اضافہ کیا۔

مولانا کی شخصیت ایک ہمہ گیر شخصیت تھی ، وہ ایک خوش بیان واعظ اور روح کی بیماریوں کو پہنچاننے والے معالج و مصلح بھی تھے کہ کتنے ہی لوگوں نے آپ کے ذریعہ رشد وہدایت کی راہ بلکہ منزل پائی ہے، ان میں کلمہ گو بھی ہیں اور ایک بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو ایمان سے محروم تھے اور آج اپنے علم وعمل کے اعتبار سے خاندانی مسلمانوں کے لئے بھی سرمایۂ رشک ہیں، آپؒ ایک صاحب عزیمت قومی وملی قائد بھی تھے اور سیاسی وسماجی مسائل میں اپنی بے باکانہ اور حکیمانہ رہنمائی کے ذریعہ اُمت کے لئے خضر طریق کا کام کرتے تھے، نہ خانقاہی مشاغل ملی قیادت میں حارج اور نہ قائدانہ ذمہ داریاں اصلاح وتزکیہ کی خدمت میں رکاوٹ ، آپؒ ایک بلند پایہ عالم اور مصنف بھی تھے اور کئی اہم اصلاحی وتذکیری کتابیں آپؒ کی رشحۂ قلم ہیں، سخن فہم وسخن شناس شاعر بھی تھے، آپ کی نعتیں عشق رسول میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھیں، مگر شرعی حدود سے متجاوز بھی نہیں۔

امارت ملتِ اسلامیہ آندھرا پردیش کے امیر تھے، درالعلوم حیدرآباد جیسی اہم درسگاہ کی تاسیس اور اس کی ترقی ان کی تعلیمی کوششوں کا حسین عملی پیکر ہے، وہ روز اول سے تحریک تحفظ شریعت کے قافلہ کے رکن رکین تھے اور اس نسبت سے آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین رہے، آپ نے حیدرآباد اور آندھرا پردیش کے مسلمانوں کی میدان سیاست میں بھی جرأت مندانہ رہنمائی فرمائی، مسلم متحدہ محاذ کے بانیوں میں ہیں، پھر جب گذشتہ دنوں مسلم یونائیٹڈ فورم قائم ہوئی تو اس کے بھی صدر ہوئے، آل انڈیا ملی کونسل کے سیاسی بازو ملی پولیٹکل فارم کی صدارت کے لئے پورے ہندوستان کے علماء وقائدین کی نظر انتخاب آپ ہی پر پڑی ، اُمورِ سیاست میں بھی آپ کی متوازن اور جرأت مندانہ رائے کو خصوصی اہمیت دی جاتی تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی دینی، ملی اور اصلاحی خدمات کا دائرہ بہت وسیع تھا؛ لیکن جو

باتیں مولانا کی شخصیت کو ان کے معاصرین سے ممتاز کرتی ہیں اور جن کی وجہ سے خود اس حقیر کے دل پر مولانا کی محبت اور احترام کا نقش ثبت ہے، ان کی طرف مختصر اشارہ کرنا مناسب محسوس ہوتا ہے۔

مولانا کا ایک قابل تقلید وصف ان کی سادگی اور انکساری تھی ، مجھے کئی بار مولانا کے ساتھ سفر کرنے کا موقع ملا ، وہ علم وفضل اور ورع وتقویٰ کے اعتبار سے تو ہم جیسے تہی دامان علم وعمل سے کہیں بلند تھے ہی، سن وسال کے اعتبار سے بھی بزرگ اور قریب قریب میرے والد کی عمر کے تھے؛ لیکن انھوں نے کبھی بھی اپنی بزرگی اور بڑائی کو محسوس نہیں کرایا، گفتگو میں بے تکلفی ، سلوک میں رعایت ،نشست و برخواست میں دوستوں کی طرح رہنے کی تلقین ، اگر کسی معروف آدمی سے پروگرام کے لئے وقت لینا ہوتو بعض دفعہ ضرورت مندوں کے جوتے گھس جاتے ہیں اور کئی چکر لگانے پڑتے ہیں ؛ لیکن مولانا کی زندگی میں ایسے تکلف اور تصنع کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی ، متعارف شخص آئے یا غیر متعارف شخص ، وقت ہے تو فوراً آمادگی ، وقت نہیں ہے تو ڈائری سامنے رکھ دیتے ، مجھے بارہا معہد کے سالانہ جلسہ میں مدعو کرنے کے لئے وقت لینا پڑا، میں نے فون کیا کہ جلسہ کی صدارت آپ کو کرنی ہے ، اس سلسلہ میں آپ سے آکر ملنا چاہتا ہوں ؛ لیکن مولانا نے باصرار روک دیا اور فرمایا کہ محض اتنی سی بات کے لئے تکلیف نہ کریں ، تاریخ اور وقت لکھادیں ، میں نوٹ کر لیتا ہوں اور جب وقت دے دیتے تو کسی یاددہانی کی ضرورت نہیں پڑتی ، یہ مولانا کی بڑائی اور ان کے اخلاص کی بات تھی ۔

مولانا کا دوسرا وصف جس نے مجھے بہت متاثر کیا ہے ، وہ ان کی جرأت وعزیمت کا پہلو تھا ، ہم لوگ بعض اوقات ڈر کر کوئی بات زبان پر نہیں لاتے ہیں اور اسے ''مصلحت'' کا نام دیتے ہیں ؛ لیکن مولانا کے یہاں دین کے معاملہ میں کوئی مداہنت نہیں تھی ، ایمرجنسی ۱۹۷۶ء کے درمیان ایسے ایسے لوگ —— جو اسٹیج پر شیر بن کر للکارتے ؛ بلکہ چنگھاڑتے تھے اور اپنی تقریروں میں الفاظ اور جذبات کا طوفان برپا کردیتے تھے ، —— حکومت کے جور وجفا کے سامنے رُک نہیں سکے ، شاید گیدڑوں کو بھی ان کی بزدلی پر شرمسار ہونا پڑا ہو؛ لیکن مولانا نے

پوری جرأت کے ساتھ علانیہ نس بندی کی مخالفت کی ، اس کی پاداش میں سنت یوسفی ادا کی اوراس وقت جیل کی تنہائی کو گلے لگایا، جب اہلیہ محترمہ ایک جان لیوا بیماری میں مبتلا تھیں، یہاں تک کہ اس درمیان مولانا کی اہلیہ کی وفات ہوگئی ،مولانا کا یہ کردار ہمیشہ برقرار رہا؛ حالاں کہ اس کی وجہ سے آپ کو بعض آزمائشوں اور دشواریوں سے بھی گذرنا پڑا؛ اسی لئے حکومت سے آپ کے تعلقات اکثر و بیشتر تلخ ہی رہتے تھے، جہاں حق گوئی کے معاملہ میں آپ نے حکومت کے سامنے مداہنت نہیں کی ، وہیں عوامی جذبات جو ناسمجھی پر مبنی تھے،اس نے بھی آپ کو متاثر نہیں کیا،اس کی عملی مثال پاکستان کے سابق وزیراعظم ذوالفقارعلی بھٹو کے پھانسی چڑھائے جانے اورصدام حسین کے کویت پرحملہ کرنے کے وقت دیکھنے کو ملی۔

تیسرا اہم پہلواُمت کی اصلاح کے لئے مولانا کی فکراور دردمندی ہے،اس حقیر کودکن (تلنگانہ،مرہٹواڑہ،کرناٹک حیدرآباد) کے بہت سے اضلاع میں جانے کا اتفاق ہوا ہے،اب اس پورے علاقوں میں سڑکوں کا جال بچھ چکا ہے اور عام طور پر جلسہ کے میزبانوں کی طرف سے سواری کا معقول نظم ہوتا ے، بہت سے ایسے دیہاتوں میں پہنچنے کا موقع ملا ، جواب بھی بہت کوردہ ہیں ،لوگوں نے بتایا کہ آج سے ۲۵ ،۳۰ سال پہلے حضرت مولانا عاقل صاحبؒ یہاں تشریف لائے تھے،اس وقت سواری اورسڑک کا معقول انتظام نہیں تھا،اس لئے فلاں جگہ تک بس سے آئے اور وہاں سے بیل گاڑی کے ذریعہ یہاں پہنچے، یا فلاں جگہ سے پیدل یہاں تک آئے،آج کی دنیا سہولتوں اورآسانیوں کی دنیا ہے؛لیکن آج سے ۲۵،۳۰ سال پہلے ایسی صورت حال تھی کہ دوردراز کے دیہاتوں میں نہ مدارس ومکاتب تھے، نہ علماء ومقررین کی آمد تھی ، نہ دینی تنظیموں ، جماعتوں اورتحریکوں کی رسائی تھی ،اس وقت مولانا نے گاؤں گاؤں اورقریہ قریہ پہنچ کراُمت کی اصلاح کی کوشش کی اوران کوارتداد کے فتنہ سے بچایا۔

مولانا کا چوتھا نمایاں وصف عبادت کا اہتمام تھا،سفر ہو یا حضر، نہ صرف نماز پنج گانہ کا اہتمام کرتے ؛ بلکہ تہجد کی بھی پابندی فرماتے ،مولانا کے رفقائے سفر کا بیان ہے کہ اکثر سفر میں اپنے رفقاء کے سوجانے کا انتظار کرتے اوران کے سونے کے بعد پھر نماز ودُعاء کا اہتمام کرتے ،

ہر وقت پاک رہنے کی کوشش کرتے ، درود شریف کثرت سے پڑھتے ، احترام کا حال یہ تھا کہ عصا اور جوتا بھی اس طرح رکھتے کہ اس کا سر قبلہ کی طرف نہ ہو، دینی کتابوں کا بے حد احترام کرتے ، اوابین اور اشراق بھی بہت اہتمام سے ادا فرماتے ، سفر ہو یا حضر، جو خالی وقت گذرتا، لبوں میں حرکت ہوتی رہتی اور زبان اللہ کے ذکر سے تر رہتی ، ایک ایک عمل میں اتباعِ سنت کی فکر کرتے ، کھانے میں حلال وحرام کا بے حد خیال رکھتے ، مشتبہ چیز سے بھی اپنے آپ کو بچاتے ، نظافت اور صفائی ستھرائی تو گویا ان پر ختم تھی ، کہیں کسی پروگرام میں جاتے تو کھانا یہاں تک کہ پانی بھی ساتھ لے کر چلتے ، رسول اللہ ﷺ سے ان کی محبت ایسی تھی جو کسی مرد مومن کے شایانِ شان ہو، جب آپ ﷺ کی سیرت بیان کرتے تو خود بھی آبدیدہ ہوتے اور سامعین بھی اشکبار ہوئے بغیر نہیں رہ پاتے ۔

مولانا کو صحابہ اور اہل بیت سے عشق کے درجہ میں محبت تھی ، بڑے ہی عظمت کے ساتھ ان کا نام لیتے ، خلفاء راشدین اور حضرات حسنین رضی اللہ عنہم پر ان کا بیان سننے کے لائق ہوتا ، روافض کا رد بھی خوب فرماتے اور اہل بیت کی توقیر میں کوئی فرق نہ آنے دیتے ، نیز ایسے واقعات کا ذکر کرتے کہ دل میں گداز پیدا ہوتا اور ان بزرگوں کی محبت بڑھتی ، فقہاء، محدثین ، صوفیا، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ ، خواجہ معین الدین چشتیؒ اور ہندوستان کے دوسرے اہل دل اور اہل علم کے تذکرے بھی ایسی ہی محبت سے فرماتے ، عام طور پر جو لوگ روافض یا مبتدعین کی رد میں بات کرتے ہیں، ان میں ردِ عمل کے طور پر اعتدال کا دامن چھوٹ جاتا ہے؛ لیکن مولانا کا دامن اس بے اعتدالی سے بالکل پاک تھا۔

وہ میدان خطابت کے شاہ بے تاج تھے ، ان کے اندر گرمانے کی بھی صلاحیت تھی اور نرمانے کی بھی ، ہنسانے کی بھی اور رُلانے کی بھی ، موقع اور محل کے لحاظ سے حکمت بھی اور جرأت بھی ، اپنی زندگی کے اخیر سالوں میں مختصر خطاب کرنے لگے تھے ؛ لیکن پہلے کئی کئی گھنٹے خطاب کرتے تھے ، ۲۷ / رمضان المبارک ، ۱۵/ شعبان ، ۲۷/ رجب اور ۱۰/ محرم کو

''میدانِ خلوت'' یا ''مسجد چوک'' میں متعلقہ موضوع پر کئی کئی گھنٹے طویل خطاب ہوتا؛ لیکن خطاب اتنا ہمہ رنگ ہوتا کہ لوگ اکتاتے نہیں، خاص طور پر ظریفانہ رنگ حاوی رہتا، مزاح اور لطائف کی آڑ میں سماجی برائیوں پر بڑی تیکھی اور کھلی تنقید کرتے اور لوگ اسے سنتے سہتے، اگر کوئی اور شخص اس کو اپنی زبان پر لاتا، تو شاید لڑائی کی نوبت آجاتی، اسی رنگ میں حکومت پر بھی بڑا سخت نقد کرتے اور اس میں کسی خوف اور خطرہ کو بالکل خاطر میں نہ لاتے۔

ایمرجنسی (۱۹۷۶ء) کے زمانہ میں جب سنجے گاندھی نے برتھ کنٹرول کی تحریک چلائی تھی اور نعرہ دیا ''دوسرا بچہ ابھی نہیں، اور دو کے بعد کبھی نہیں'' تو اس وقت مولانا کا نعرہ تھا ''دوسرا بچہ ابھی ابھی، اور بارہ کے بعد کبھی کبھی'' ایمرجنسی کے جبر وتشدد کی فضا میں یہ نعرہ نوک زبان بن گیا تھا اور آخر اسی نعرہ نے آپ کو جیل تک پہنچایا؛ لیکن آپ کے پائے استقامت میں کوئی تزلزل نہیں آیا، مولانا سے اس وقت کے وزیر داخلہ جناب آصف پاشا نے کہا کہ اگر آپ یہ لکھ کر دے دیں کہ میں حکومت کی پالیسی میں کوئی مداخلت نہیں کروں گا، تو آپ کی رہائی ہوسکتی ہے، مولانا نے کہا کہ حکومت لکھ کر دے دے کہ وہ مذہبی احکام ومعاملات میں کوئی دخل نہیں دے گی، تو میں لکھ کر دے سکتا ہوں، وزیر صاحب نے معذرت کی، مولانا نے کہا کہ پھر تو میرے لئے بھی یہ لکھنا ممکن نہیں، ریاست کے وزیر داخلہ '' جانا ریڈی'' کے زمانہ میں دینی مدارس پر دھاوے ہوئے، مولانا نے اس وقت بیان دیا اور اخبارات نے نقل کیا کہ یہ جانا ریڈی نہیں ہے، ''انجانا ریڈی'' ہے۔

مولاناؒ مزاح میں بڑی بڑی باتیں کہہ جاتے تھے، ایک بار خواتین کے بازو کھلے بلاوز پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا کہ پہلے لوگ لڑنے کے لئے آستین چڑھایا کرتے تھے؛ لیکن آج کل خواتین پہلے سے آستین چڑھائے ہوتی ہیں، ایک سفر میں میں اور ایک عالم دین جن کی دو بیویاں تھیں اور وہ ان کے درمیان عدل نہیں کر پا رہے تھے، سفر میں ساتھ تھے، مولانا نے جب اپنا توشہ سفر کھولا، جو بڑا عمدہ اور لذیذ ہوا کرتا تھا، تو غالباً پوڈنگ کا میٹھا تھا جو بڑا خوش رنگ تھا،

اُن عالم صاحب نے میٹھے کے رنگ کی تعریف کی، مولانا نے فرمایا کہ ایک بادشاہ نے دوسری شادی کی، شادی کے بعد جب پہلی بیوی کے گھر آیا، تو بیوی نے کھانے کا بڑا اہتمام کیا اور کئی رنگ کے میٹھے بادشاہ کے سامنے رکھ دیئے، بادشاہ نے ہر ایک میں سے چکھا اور پھر کہا کہ ان کے رنگ الگ الگ ہیں مگر ذائقہ تو ایک ہی ہے، بیوی نے کہا: سرکار! فرق صرف رنگ ہی کا ہوتا ہے، مزا ایک ہی ہوتا ہے، وہ دوسرے عالم صاحب بہت شرمندہ ہوئے، اس طرح مولانا ہنسی مذاق میں بعض سچائیوں کی طرف بڑے ہی تیکھے انداز میں اشارہ کردیتے تھے، ایک موقع پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے ایک معزز اور سینئر رکن نے بعض اُمور پر تنقید کرتے ہوئے وفورِ جذبات میں کہا کہ میں بورڈ کی رکنیت سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں، لوگوں کو ان کی یہ گفتگو غیر متوقع اور عجیب محسوس ہوئی، مولانا نے اس کے بعد ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آپ کو غصہ ہونے کا تو حق ہے، مگر یہ زنانہ انداز کا غصہ اچھا نہیں معلوم ہوتا، تمام لوگ تو ہنسے ہی، وہ خود بھی ہنس پڑے اور بات آئی گئی ہوگئی۔

سیاست کے بارے میں مولانا کا طریقہ کار ہمیشہ سے یہ رہا کہ مسلمانوں کے مفاد کو معیار بناکر وہ تائید بھی کرتے اور مخالفت بھی، اس معاملہ میں ان کے یہاں اپنوں اور بیگانوں کا کوئی فرق نہیں تھا، اسی لئے اکثر حکومت کے خلاف ان کی آواز اُٹھتی تھی، یہاں تک کہ جب ان کے داماد جناب رحیم الدین انصاری اُردو اکیڈمی کے صدر بنائے گئے، تب بھی حکومت پر ان کی تنقید جاری رہی، ان کی اس جرأت مندی کا راز یہ تھا کہ انھوں نے کبھی حکومت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور کوئی رعایت حاصل نہیں کی؛ حالاں کہ اگر وہ چاہتے تو حکومت طشت میں سجا کر انھیں عہدے پیش کرتی۔

اس حقیر کے ساتھ ان کا تعلق غیر معمولی محبت اور شفقت کا تھا، معہد کا جلسہ ہو اور ان کی صدارت نہ ہو، یہ بات ناقابل تصور تھی، وہ جب بھی تشریف لاتے، بڑے حوصلہ افزا کلمات فرماتے اور میرے تئیں بڑی ہی محبت کا اظہار کرتے، اس موقع پر اس حقیر کی تالیف

''قاموس الفقہ''پر ان کی تقریظ کا ایک اقتباس پیش کرنا مناسب ہوگا :

مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے — جن کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فقہ پر کافی عبور عطا فرمایا ہے، قدیم وجدید فقہی مسائل پر جن کی گہری نظر ہے، دقیق سے دقیق مسائل کو وہ نہ صرف حل کرتے ہیں؛ بلکہ حوالوں کے ساتھ اس کو قابل قبول بناتے ہیں، آنحضرت ﷺ کے ارشاد''**من یرد اللہ بہ خیراً یفقھہ فی الدین**''(جس کے لئے اللہ تعالیٰ خیر کا ارادہ کرتا ہے اس کو تفقہ کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتا ہے) کے مصداق ہیں، — سے اللہ تعالیٰ نے خیر کا ارادہ فرمایا ہے اور ان کو فقہ اور علوم اسلامی میں ید طولیٰ عطا فرمایا ہے، چنانچہ مولانائے محترم کی کتابوں نے علماء وفقہاء اور عوام کے طبقے میں یکساں مقبولیت حاصل کی ہے۔

حضرت خالد سیف اللہ رضی اللہ عنہ کے نام کی برکت ہمارے مولانا خالد سیف اللہ صاحب کو حاصل ہوئی ہے کہ وہ اگر میدان جہاد میں سیف اللہ (اللہ کی تلوار) تھے، تو یہ ان کے خادم اور ہم نام میدان علومِ دینیہ میں سیف اللہ بنے ہوئے ہیں، ان لوگوں کے خیالات کے چھکے چھڑا رہے ہیں، جو اپنی نادانی سے قرآن وحدیث کو چودہ سو سالہ قدیم اور موجودہ دور میں ان کے احکام کو ناقابل عمل ٹھہرا کر نوجوانوں کے ذہنوں کو تشکیک کا شکار کر رہے ہیں اور فقہ کو اس دور کے مسائل کے حل اور جدید چیلنجز کا جواب دینے سے قاصر سمجھتے ہیں،...... مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے — جو صاحبِ تصانیف کثیرہ ہیں اور زیر نظر کتاب''قاموس الفقہ'' کے مؤلف ہیں — اس عظیم تالیف کی تقریظ کے لئے مجھ خاکسار سے خواہش کی، جو مولانا کی اعلیٰ ظرفی اور فطری انکساری وتواضع کی

دلیل ہے، میں کتاب کے بارے میں کچھ لکھنے کا اپنے کو اہل نہیں
پاتا؛ کیوں کہ ہم نے تو فقہ پڑھی ہے؛ لیکن مولانا تو اس سمندر کے
غواص ہیں اور ہر قسم کے تعارفی کلمات سے بے نیاز۔

مولانا کی سب سے بڑی یادگار ''جامعہ اسلامیہ دارالعلوم حیدرآباد'' ہے، جس کی آپ نے ۱۹۷۵ء میں بنیاد رکھی اور نہایت بے سروسامانی میں اس کا آغاز کیا، اب یہ مدرسہ جامعہ بن چکا ہے، ایک وسیع وعریض احاطہ میں اس کی خوبصورت اور جاذب نظر عمارتیں لائق دید ہیں اور ماشاء اللہ اس کا فیضان نہ صرف دکن؛ بلکہ پورے ہندوستان میں جاری وساری ہے، اس کے علاوہ مولانا کا ایک قابل رشک کارنامہ برادرانِ وطن میں دعوت کا کام ہے، بہت سے لوگوں نے آپ کے ہاتھوں پر اسلام قبول کیا ہے، یہاں تک کہ جب آپ جیل میں تھے، تو جیل کا ایک سپاہی راما راؤ بھی آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہوا، ان اسلام قبول کرنے والوں کے ساتھ آپ کا سلوک بے حد مشفقانہ ہوتا تھا، ان میں سے بعض وہ ہیں جن کی آپ نے بچپن سے جوانی تک تعلیم وتربیت اور سرپرستی فرمائی اور آج ان کا خاندان علماء اور حفاظ کا خاندان ہے، مولانا اسلام قبول کرنے والوں کو سرٹیفکٹ بھی جاری کرتے تھے اور بحمد اللہ اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے؛ حالاں کہ اس کی وجہ سے بعض اوقات آزمائشوں سے گذرنا بھی پڑتا تھا۔

۱۳۴۹ھ مطابق ۳؍ جولائی ۱۹۲۸ء میں آپ کی ولادت ہوئی، آپ کے والد ماجد علامہ محمد حسام الدین فاضلؒ تھے، جو سادات میں سے تھے اور ان کے جد امجد مولانا تاج الدین کو ایک بڑے عالم کی حیثیت سے اورنگ زیب عالمگیر نے ''خان'' کا خطاب دیا تھا؛ لیکن بطور کسر نفسی کے نام کے ساتھ ''سید'' نہیں لگاتے تھے، علامہ حسام الدین بڑے علماء میں تھے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ دینیات کے پروفیسر تھے، مولانا عاقل صاحبؒ نے زیادہ تر تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی، جامعہ نظامیہ سے مولوی، منشی اور منشی فاضل کیا، ۱۹۵۳ء میں جامعہ عثمانیہ میں شعبۂ دینیات سے بی، اے کیا اور ۱۹۶۵ء میں عربی سے اس طرح ایم، اے کیا کہ پوری

ریاست میں اول درجہ سے کامیاب ہوئے، پھر ۱۹۵۷ء میں پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لیا اور فخر الدین رازی کی کتاب ''کتاب الامامۃ'' پر ڈاکٹر عبد المعید خاں سابق ڈائریکٹر دائرۃ المعارف العثمانیہ کی زیرنگرانی پی، ایچ، ڈی کا مقالہ لکھا؛ لیکن والد ماجد کے سانحہ وفات کی وجہ سے اسے پورا نہیں کر سکے، ۲۱/ربیع الاول ۱۳۷۷ھ کو آپ کے والد ماجد کی وفات ہوئی، آپ اس وقت اپنے والد ماجد کی جگہ عثمانیہ یونیورسٹی میں استاذ ہو سکتے تھے؛ لیکن آپ نے ملازمت اختیار نہیں کی اور متوکلاً علی اللہ اپنے والد ماجد کی طرح رشد و اصلاح کی خدمت کا آغاز کیا، ۱۹۵۷ء میں ایک معزز خاندان کی خاتون سے مسنون طریقہ پر آپ کا عقد مسنون ہوا اور ۱۹۷۶ء میں رفیق حیات کی وفات ہوگئی، اس وقت آپ جیل میں تھے؛ البتہ سخت علالت کی حالت میں آپ کو عارضی طور پر رہا کر دیا گیا تھا، اس کے بعد آپ نے اپنے بچوں کی خاطر دوسرا عقد نہیں فرمایا اور تقریباً ۳۵ سال کا عرصہ اسی طرح گذار دیا۔

۱۹۷۲ء میں جب ممبئی میں مسلم پرسنل لا کنونشن ہوا تو اس کی مجلس داعیان میں آپ بھی تھے، اسی وقت سے آپ مسلم پرسنل لا بورڈ کی مجلس تاسیسی اور مجلس عاملہ کے رکن رکین تھے، بورڈ کے قیام سے پہلے ہی ۱۹۶۸ء میں آندھرا پردیش میں امارت ملت اسلامیہ کا قیام عمل میں آیا، جس میں آپؒ پیش پیش تھے، اس موقع پر پہلے امیر کی حیثیت سے مفتی عبد الحمید صاحبؒ، شیخ الجامعہ نظامیہ کا انتخاب ہوا اور آپ معاون امیر منتخب کئے گئے، پھر ۱۹۷۷ء میں مفتی صاحب کی وفات کے بعد آپ باتفاق رائے دوسرے امیر منتخب ہوئے، یوں تو دار القضاء ۱۹۷۵ء میں قائم ہو چکا تھا؛ لیکن آپ نے اس کے استحکام کی طرف خصوصی توجہ دی اور ۱۹۷۸ء میں آپ ہی کی دعوت پر دار القضاء کی خدمت کے لئے یہ حقیر حیدر آباد پہنچا۔

ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ۳۰/سال سے زیادہ عرصہ سے راقم الحروف دار القضاء میں بحیثیت قاضی فصل خصومات کی خدمت انجام دے رہا ہے، اس درمیاں مولانا کے بعض قریبی عزیزوں کے مقدمات بھی دار القضاء میں آئے اور بعض اہل تعلق کے بھی؛ لیکن مولانا نے کبھی بھی دار القضاء کے کام میں کوئی دخل نہیں دیا اور دار القضاء کے کسی کارکن کو یہ سوچنا نہیں پڑا کہ

کہیں اس مقدمہ میں فلاں شخص کے خلاف کارروائی کی وجہ سے باز پرس ہوگی، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ حقیر مولانا ہی کی دعوت پر اور دارالقضاء کے کام کے لئے حیدرآباد حاضر ہوا؛ چنانچہ ایک سال دارالعلوم حیدرآباد میں استاذ رہا، اس وقت یہ ادارہ ''مگر کی باؤلی'' نامی محلّہ میں واقع ایک خستہ حال پرانی عمارت میں تھا، طلبہ بہت کم تھے اور متوسطات تک تعلیم تھی، میری طبیعت وہاں لگ نہیں پائی، اس لئے میں نے وہاں سے دارالعلوم سبیل السلام منتقل ہونا چاہا، جہاں پہلے سے کچھ شناسا موجود تھے، مولانا نے بادلِ ناخواستہ میری درخواست قبول فرمائی؛ لیکن وعدہ لیا کہ دارالقضاء کے کام کو نہیں چھوڑو گے؛ چنانچہ وہ دن ہے اور آج کا دن، میں اس خدمت کو انجام دے رہا ہوں؛ لیکن اہم بات یہ ہے کہ دارالعلوم چھوڑنے کے باوجود مولانا کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آیا اور ہمیشہ ان کی محبت وشفقت شریک حال رہی، ظاہر ہے کہ یہ ان کی عالی ظرفی تھی۔

مولانا کے والد ماجد مولانا حسام الدین فاضلؒ کو مدینہ منور کے ایک بزرگ شیخ عبدالقادر شبلی مدنیؒ سے تصوف کے سلسلہ قادریہ میں اجازت حاصل تھی، مولانا عاقل صاحبؒ نے اپنے والد ماجد سے تربیت حاصل کی اور ان کی خلافت سے سرفراز ہوئے؛ چنانچہ سینکڑوں اہل طلب آپ کے دامن تربیت سے وابستہ تھے، نیز ہر ہفتہ کو بعد نماز مغرب ذاکرین ومتوسلین کے لئے وعظ فرماتے تھے، اس مجلس میں خاص کر شیخ شہاب الدین سہروردی کی معروف کتاب ''عوارف المعارف'' کا درس بھی دیتے اور موقعہ کی مناسبت سے مولانا مثنوی کے اشعار کی بھی ترجمانی کرتے جاتے۔

ادھر کچھ عرصہ پہلے مولانا جگر کے عارضہ میں مبتلا ہوئے، آپریشن بھی ہوا اور ہر طرح کا علاج بھی، شوگر پہلے سے دامن تھامے ہوئی تھی، اس لئے ''مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی'' —— یہ حقیر بیماری کے درمیان بار بار حاضر خدمت ہوتا رہا، ایک دن مولانا نے اپنے پرانے کاغذات میں سے میری ایک تحریر نکال کر دی، جو میں نے بہت پہلے مولانا کے لئے لکھی تھی، اور اسے غیر مسلموں کے اجتماع میں پڑھا جانا تھا، جب بھی ملاقات ہوتی ہاتھ پکڑ کر مولانا دیر تک

دُعائیں دیتے اوراپنے لئے دُعاء کی خواہش فرماتے ، آخری بارانھیں اس صبح کو دیکھا، جس دن شب میں وفات ہوئی ، ہوش نہیں تھا؛ لیکن لوگ بتاتے ہیں کہ ''اللہ اللہ'' کی آواز لبوں سے آرہی تھی ، آخر موت وحیات کی اس کشمکش میں موت نے غلبہ حاصل کیا اور ۲۵/ربیع الاول ۱۴۳۱ھ ، مطابق ۱۲/مارچ ۲۰۱۰ء جمعہ کی شب تقریباً ۴/بجے بندہ اپنے مالک کے حضور چلا گیا، جمعہ کے معاً بعد مکہ مسجد میں نماز جنازہ ہوئی، مجمع اتنا بڑا کہ رمضان المبارک کے آخری جمعہ سے کم نہ تھا، جنازہ دیدار کے لئے رکھا گیا؛ لیکن عقیدت مندوں کا ہجوم بے قابو ہورہا تھا،اس لئے فوراً ہی اُٹھالیا گیا، ہاتھوں ہاتھ جنازہ نے کئی کلومیٹر کا سفر طے کرتے ہوئے مولانا کے آبائی قبرستان ''حسامی چمن'' تک پہنچا اور وہاں دوسری نمازِ جنازہ پڑھی گئی ، یہ اژدحام اس کے باوجود تھا کہ رات کے آخری حصہ میں وفات ہونے کی وجہ سے اخبارات میں خبر شائع نہ ہوسکی تھی ، ٹی وی کی اطلاع اور سینہ بہ سینہ موبائل کے ذریعہ خبروں کی ترسیل کی بنا پر ہی اتنے سارے لوگ جمع ہوگئے ، اِن آنے والوں میں اچھی خاصی تعداد ، تلنگانہ ، آندھرا ، مرہٹوارہ اور کرناٹک حیدرآباد کے اضلاع کے علماء اورنمائندہ شخصیتوں کی بھی تھی ،جس خدانے اپنے بندوں کے دلوں میں دین کےاس خادم کی ایسی محبت ڈال دی تھی ، یقین ہے کہ اس نے عالم بالا میں بھی اس کو اپنی محبوبیت سے نوازا ہوگا۔

مولانا کے دعوتی اسفار واقعی قابل رشک ہوتے تھے، سال کے ۳۶۵ دنوں میں اندازہ ہے کہ کم وبیش چارسو خطابات ہوتے تھے اور دوسو سے زیادہ نزدیک ودور کے اسفار، بہت دفعہ ایسا ہوتا کہ دن میں اپنے دولت خانہ سے نکلے، شام کو اس جگہ پہنچے ، جہاں وعظ کہنا ہے، مغرب سے عشاء تک کچھ آرام کیا ، کچھ لوگوں سے ملاقات کی ،عشاء کے بعد خطاب کیا اور لوٹ گئے ، تین چار بجے گھر پہنچے ، تہجد پڑھی ، کچھ دیر آرام کیا ، فجر کے بعد معمولات انجام دیئے اور پھر دوسرے سفر کے لئے نکل پڑے ، اسی لئے انھوں نے بیٹھے بیٹھے موٹر میں سوجانے کا ملکہ حاصل کرلیا تھا اور یہی ان کے لئے وقفہ آرام ہوتا تھا ، اب اس تھکے ہوئے مسافر کو کم آرامی سے نجات مل چکی ہوگی اور بستر راحت پر آسودۂ خواب ہونے کا موقع ملا ہوگا۔

❁ ❁ ❁

ذکرِ عزیز

(مولانا عبدالعزیز صاحبؒ حیدرآبادی)

اب سے تیس پینتیس سال پہلے حیدرآباد میں علماء دیوبند خال خال تھے، فکر دیوبند کے مدارس بھی ابتدائی مرحلے میں تھے، کسی مدرسہ میں دورۂ حدیث تک تعلیم نہیں ہوتی تھی، اس حلقہ کے مقررین بھی بہت کم آتے جاتے تھے، شہر کی عمومی فضا بھی کچھ زیادہ موافق نہیں تھی؛ البتہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی قائم کی ہوئی دعوت وتبلیغ کی محنت جاری تھی اور اس کے بہتر اثرات مرتب ہو رہے تھے، ان حالات میں کچھ بزرگوں نے مل کر ''مجلس علمیہ'' کی بنیاد رکھی، جب یہ حقیر ۱۹۷۸ء میں حیدرآباد آیا تو اس وقت بزرگ عالم دین —— جن میں اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا بے پایاں جذبہ پایا جاتا تھا —— حضرت مولانا شریف حسین ترمذیؒ مجلس علمیہ کے ناظم تھے اور ایک نہایت فعال اور باصلاحیت شخصیت مولانا سید اکبر الدین قاسمیؒ ان کے نائب، اس وقت یہی جماعت علماء دیوبند کے اکٹھا ہونے اور اہم مسائل پر غور وفکر کرنے کا پلیٹ فارم تھی، مجلس نے مسلک دیوبند کی اشاعت اور دفاع میں جہاں لٹریچر شائع کئے، وہیں ملک کے مختلف علاقوں سے اس حلقہ کے علماء کو مدعو کرنے اور شہر واضلاع میں ان کے خطاب رکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور اس کے بڑے مفید اثرات مرتب ہوئے۔

مجلس میں جب کبھی مشاورتی نشست منعقد ہوتی تو مولانا ترمذی صاحب کے بعد ایک دوسری بزرگ شخصیت سب سے زیادہ نمایاں محسوس کی جاتی، گفتگو میں سلیقہ کے اعتبار سے، اصابت رائے اور اپنی رائے کو مدلل انداز میں پیش کرنے کے لحاظ سے اور وقار ومتانت کی جہت سے، وہ عمر میں بھی مولانا ترمذی صاحب کے بعد سب سے بزرگ نظر آتے تھے، لوگ ان کا خاص طور پر احترام کرتے؛ گویا وہ مجلس کی دوسری اہم شخصیت سمجھے جاتے، یہ تھے حضرت

مولانا عبدالعزیز صاحبؒ؛ چنانچہ جب مولانا ترمذی کی وفات ہوئی تو لوگوں کو اگلا ناظم منتخب کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی، ہر ایک کی زبان پر ان ہی کا نام تھا، اس وقت سے لے کر اب تک وہی ناظم مجلس علمیہ منتخب ہوتے رہے۔

مولانا کی زندگی میں اس حقیر نے جو کیفیات دیکھی ہیں اور جن کو نوجوان علماء اپنے لئے نقش راہ بنا سکتے ہیں، یہاں ان کا ذکر کرنا مناسب ہوگا :

اول : یہ کہ اکثر اوقات ان کی رائے گہرے تجربہ پر مبنی ہوتی، وہ جذبات میں ڈوب کر نہ سوچتے تھے، نہ بولتے تھے؛ بلکہ غور وفکر کے بعد معاملہ کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر رائے قائم کرتے تھے، جو عام طور پر درست ثابت ہوتی بھی، اسی لئے مجلس علمیہ میں زیادہ تر فیصلے ان ہی کے مشورہ پر ہوا کرتے تھے۔

ان کا دوسرا وصف : اپنے چھوٹوں کے ساتھ شفقت ومحبت کا معاملہ تھا، جو سلوک مولانا ترمذی صاحبؒ کا نوجوان فضلاء کے ساتھ تھا، مولانا نے اس کو پوری طرح باقی رکھا، ان کے خوردوں کے لئے ان سے ملاقات کرنا اور ان سے بات کرنا بالکل آسان تھا، نہ ہٹو بچو، نہ تکلف، نہ لب ولہجہ میں ایسی تلخی کہ آدمی گفتگو کرتے ہوئے گھبرائے، نہ مزاج ایسا آتشیں کہ ملنے جلنے والوں کو وحشت ہو، ہر ایک کے ساتھ محبت وشفقت سے پیش آتے، دعوت دینے والوں کے یہاں بھی جاتے اور بعض اوقات ان لوگوں کے یہاں بھی چلے جاتے، جن کی طرف سے کوئی دعوت نہیں ہوتی، شہر کے اہل مدارس کو بھی اس کا تجربہ تھا اور اضلاع کے خدام دین کو ان سے زیادہ، ان کے اس طرز عمل سے چھوٹوں کا حوصلہ بڑھتا تھا اور کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، آج کل یہ وصف کم ہوتا جا رہا ہے اور بڑوں اور چھوٹوں کے درمیان اتنا فاصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اپنے بزرگوں سے استفادہ آسان نہیں ہوتا۔

تیسرا وصف : آپ کی کشادہ قلبی اور وسیع النظری تھی، اپنے حلقہ کے جن مدارس میں بھی مدعو کیا جاتا، اہتمام کے ساتھ تشریف لے جاتے اور اس کو بڑی اہمیت دیتے، المعہد العالی الاسلامی

کے قیام کو گیارہ سال سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے، ہر سالانہ اجلاس میں آپ نے شرکت فرمائی، اپنے ہاتھوں سے اسناد تقسیم کیں، بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ ضعف کا غلبہ تھا، تو صرف چند کلمات ہی کہے؛ لیکن شرکت ضرور فرمائی، معہد کے طلبہ کے جو مقالات شائع ہوتے، وہ میں نیازمندانہ ان کی خدمت میں پیش کرتا، مجھے فون کر کے حوصلہ افزائی کرتے اور بعض اوقات ملاقات کے وقت حوصلہ افزاء کلمات کہتے، یہ جملہ خاص طور سے کہتے کہ ماشاء اللہ آپ کے بچے تحقیقی مضامین لکھتے ہیں —— قرآن مجید سیمینار منعقدہ ۲ تا ۴ ربیع الاول کو اس حقیر نے شرکت کی گزارش کی تھی، مولانا شہر میں اسی ارادہ سے تشریف لائے؛ لیکن ضعف کی وجہ سے پروگرام کی جگہ تک نہیں آسکے، مگر اپنے صاحبزادے کو بھیجا اور یہ بھی کہا کہ جو کتابیں طبع ہوئی ہیں، انھیں لے کر آنا، مولانا جب کسی ادارہ کے پروگرام میں جاتے تو مدرسہ بیت العلوم سوریا پیٹ —— جس کے وہ ذمہ دار تھے —— کا زبان پر نام تک نہیں لاتے اور جس ادارہ میں گئے ہوں، اس کی اور ذمہ داران ادارہ کی ستائش فرماتے۔

چوتھا اہم وصف : ان کی سادگی اور بے تکلفی تھی، جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے، جو پیش کر دیا جاتا کھا لیتے، جب صحت بہتر تھی تو دو دو سو کلومیٹر بلکہ اس سے زیادہ کا سفر بھی سائیکل موٹر سے کرتے تھے اور دور دراز علاقوں کے مدارس تک پہنچتے تھے، ان کی ہمت دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، کمزور ہونے کے بعد بھی ان کی یہ کیفیت باقی رہی، مشقت برداشت کر کے اپنے دوستوں کی خواہش پوری کرتے اور تکلیف دہ سفر طے کر کے ان کی دعوت پر لبیک کہتے۔

پانچواں اہم وصف : مسلک دیوبند پر استقامت ہے، اس سلسلہ میں ان کے یہاں کسی تساہل کی گنجائش نہیں تھی، پوری جرأت کے ساتھ اپنی بات کہتے اور اس بات کے لئے بے چین رہتے کہ اپنے حلقہ کے علماء اجتماعات رکھیں، جلسے منعقد کریں، قرآن وحدیث کے درس دیں؛ تاکہ عوام کی صحیح رہنمائی ہو، جب حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ اور مولانا اسعد مدنی صاحبؒ کے درمیان دارالعلوم کے قضیہ میں اختلاف ہوا اور جب جمعیۃ علماء کے سلسلے میں دو گروہ ہو گئے، اِن دونوں مواقع پر مولانا کو ہم نے بے حد بے چین و بے قرار پایا، وہ چاہتے

تھے کہ کسی طرح ٹوٹے ہوئے دل جڑ جائیں اوراس کے لئے انھوں نے اپنی صلاحیت کے مطابق کوششیں بھی کیں؛اس لئے کہ اس کووہ پوری جماعت کا نقصان سمجھتے تھے۔

مولانا کا چھٹا قابل ذکر وصف تھا : ان کا تحمل اورزبان کی حفاظت، وہ مختلف تنظیموں کے سربراہ تھے، تنظیمی اُمور پر جب مشورہ ہوتا ہے تو عام طور پر کچھ کرواہٹیں پیدا ہو ہی جاتی ہیں اوراگر یہ اپنے چھوٹوں کی طرف سے ہوں تو زیادہ گراں گزرتی ہیں، مولانا ایسی صورت حال سے بار بار دوچار ہوتے تھے، اوربعض دفعہ ایسی باتیں سامنے آجاتی تھیں، جو ان کے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے یقیناً نامناسب ہوتی تھیں؛لیکن مولانا نہایت بردباری کے ساتھ ان کو سنتے تھے، اگر کوئی بات جواب دینے کی ہوتی تو جواب دیتے، اوربعض اوقات خاموش رہنے کو ترجیح دیتے، میں نے اس بات کو خاص طور پر محسوس کیا کہ وہ سامنے بھی اور پیچھے بھی اپنی زبان کی خوب حفاظت کرتے تھے، نہ مجلس میں کوئی غیر مہذب بات ان کی زبان سے نکلتی تھی اور نہ کسی کے پیچھے نازیبا کلمات ان سے سنے جاتے تھے، یہ وہ وصف ہے جو آج کل اچھے اچھوں میں نہیں ہوتا؛لیکن اجتماعی کاموں کے سربراہ کے لئے یہ بے حد ضروری وصف ہے!

وہ مدّور ضلع نلگنڈہ (سابق ضلع ورنگل) میں فروری ۱۹۳۵ء میں پیدا ہوئے، ان کے والد ماجد مولانا محمد امام صاحبؒ حضرت تھانویؒ سے بیعت تھے اور جامعہ نظامیہ کے فضلاء میں تھے، وہ دارالعلوم دیوبند کی اُس آخری جماعت میں تھے، جس نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ سے بخاری شریف پڑھنے کا شرف حاصل کیا، انھوں نے بخاری کا کچھ حصہ مولانا مدنیؒ سے پڑھا اور کچھ حصہ حضرت مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ سے، مولانا کو حضرت مولانا ابرار الحق صاحبؒ (ہردوئی) اورحضرت مولانا قاری امیر حسن مدظلہ سے بھی تلمذ کا شرف حاصل تھا، آپ نے ۱۹۵۷ء میں فارغ ہونے کے بعد نظام آباد سے اپنی خدمات کا آغاز فرمایا، پھر سوریاپیٹ والوں کی خواہش پر ۱۹۶۲ء میں یہاں تشریف لائے اور ۱۹۶۴ء میں مدرسہ بیت العلوم کی بنیاد رکھی، نہایت تنگی کی حالت میں آپ نے دیہات کی اس دینی درسگاہ کو پروان چڑھایا اور تنگی

وترشی کے ساتھ اسے آگے بڑھایا، آپ کی دعوتی کوششوں اور تعلیمی محنتوں کی وجہ سے یہ پورا علاقہ بڑی حد تک بدعات سے محفوظ ہے، اس مدرسہ سے فیض اُٹھانے والے بہت سے طلبہ نے مرکزی درسگاہوں سے فراغت حاصل کی اور آج ملک و بیرون ملک ان کا فیض جاری ہے، وہ اپنی گونا گوں صلاحیتوں کی وجہ سے بہت سے اداروں کے ذمہ دار تھے، دارالعلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کے رکن، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے نائب صدر، جمعیۃ علماء ہند کے رکن عاملہ، مجلس علمیہ کے ناظم، مجلس ختم نبوت کے صدر اور بہت سے دینی مدارس کے سر پرست۔

اس حقیر پر بھی مولانا کی بڑی شفقتیں تھیں، یہ مولانا کے اعتماد کی بات ہے کہ انھوں نے اپنے چھوٹے صاحبزادے عزیزی مولانا اطہر مظاہری سلمہ کو دارالعلوم سبیل السلام میں یہ کہہ کر داخل کیا کہ ان کو میں تمہارے حوالے کر رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ یہ خصوصی طور پر تمہاری تربیت میں رہے —— اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ سے دین کی خوب خوب خدمت لے —— اب بھی گویا ان کا سراپا آنکھوں کے سامنے ہے، درمیانہ قد و قامت، سانولا لیکن کھلتا ہوا رنگ، کسی قدر گھنی اور سفید داڑھی، زلف اور اس پر دو پلی ٹوپی، بغیر کالر کا سفید اور لمبا کرتا، سفید شلوار، دوہرا جسم، ہر ملنے والے سے مسکرا کر ملتے اور کم سے کم خیر و عافیت ضرور پوچھتے، جہاں بیٹھتے اپنی وجاہت اور متانت کی وجہ سے پہچانے جاتے، ہم عمروں کے دوست اور چھوٹوں کے لئے سراپا شفقت ومحبت، افسوس کہ دہلی سے واپس آتے ہوئے ہوائی جہاز میں ہی بیمار ہوئے اور بارہ اپریل ۲۰۱۱ء کو صبح میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو عزت و شہرت عطا فرمائی اور جس بلند مقام سے نوازا گیا، اس کے تحت آپ سوریا پیٹ سے حیدرآباد منتقل ہو سکتے تھے، جہاں زیادہ سہولتیں میسر ہوتیں اور زیادہ راحت کے ساتھ آپ کام کر سکتے؛ لیکن آپ نے اس قصبہ کو کبھی نہیں چھوڑا اور علماء کے لئے ایک مثال چھوڑی کہ وہ جہاں چٹائی بچھالیں، صبر واستقامت کے ساتھ رہیں اور اپنی خدمت جاری رکھیں؛ چنانچہ اسی خاک میں آسودۂ خواب ہوئے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور جنت میں بلند درجات سے نوازے۔

❁ ❁ ❁

عاشقِ رسول مولانا ڈاکٹر عبداللہ عباس ندویؒ

شمع روشن بجھ گئی ، بزم سخن ماتم میں ہے !

اوسط قد و قامت ، کسی قدر بھاری بدن ، کھلا ہوا رنگ ، گھنی داڑھی ، سفید کرتا ، سفید چوڑا پاجامہ، دو پلی ٹوپی ، اور شیروانی زیب تن ہوتی تو اسی کی مناسبت سے کشتی نما ٹوپی ، آنکھ پر موٹا سا چشمہ، سادہ طبیعت ، کم گو، متواضع اور منکسر المزاج ، ہر شخص سے مسکرا کر ملتے اور بڑوں کی طرح چھوٹوں کی بھی قدردانی فرماتے ، اس سراپا کو تصور میں لائیے ، یہی ہیں مولانا عبداللہ عباس ندویؒ۔

ان کے والد مولانا محمد عباس پھلواروی ؒ ایک صاحب نظر مفتی تھے ، جنھوں نے بہت عرصہ تک امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں فتاویٰ نویسی کا فریضہ انجام دیا، ان کے یہ فتاویٰ ''فتاویٰ امارت شرعیہ'' کی جلدوں میں شریک اشاعت ہیں ، ان کے خانوادہ کے مورث اعلیٰ شاہ مجیب اللہ قادری جعفری زینبی تھے ، جو معروف صاحب نسبت بزرگ تھے اور '' تاج العارفین'' کہلاتے تھے ، خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف پٹنہ ان ہی سے منسوب ہے ، مولانا ندوی بہار کے مردم خیز قصبہ پھلواری شریف ، پٹنہ میں ۱۳۴۳ھ میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم پھلواری شریف میں حاصل کی اور اعلیٰ دینی تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ، جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ، ان میں مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے ، مغربی دانش گاہوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا ؛ چنانچہ یونیورسٹی آف لیڈس ، انگلینڈ سے سامی زبانوں میں پوسٹ گریجویشن اور فلسفہ لسانیات پر پی ، ایچ ، ڈی کیا ، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے معتمد تعلیم ہونے کے علاوہ سعودی عرب میں ادارہ نشریات شرقیہ کے وکیل ، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کے شعبوں منظمات اسلامیہ واقلیات مسلمہ کے ذمہ دار ، پھر رابطہ کے مشیر اعزازی ، جامعہ اُم القریٰ ،

مکہ مکرمہ کے استاذ اور لینگوسٹک سوسائٹی کیمبرج کے ممبر رہے۔

ان کی تصنیفات کی تعداد دو درجن کے قریب ہے، ان کی تالیفات میں ''عربی میں نعتیہ کلام، **ترجمات معانی القرآن و تطور فهمه عند العرب** (شائع کردہ: دارالارشاد بیروت اور رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ)، **المذاهب المنحرفة فی التفسیر** (شائع کردہ: دارالارشاد، جدہ)، قرآن کریم، تاریخ انسانی کا سب سے بڑا معجزہ اور تاریخ تدوین سیرت خصوصیت سے قابل مطالعہ ہیں، مفردات قرآن پر آپ کی عربی انگریزی قاموس ''**قاموس ألفاظ القرآن الكريم**'' اور ''**تعليم لغة القرآن الكريم**'' بڑی اہم ہے، جن میں سے اول الذکر کے دس ایڈیشن اور ثانی الذکر کے آٹھ ایڈیشن دنیا کے مختلف ملکوں سے شائع ہو چکے ہیں، آپ نے نصابی کتابوں پر بھی خصوصی توجہ فرمائی؛ چنانچہ ''**دروس الأطفال**'' اور ''**أساس اللغة العربية**'' (تین حصے) عربی زبان میں اور ''آسان فقہ'' اور ''تفہیم المنطق'' اُردو زبان میں اسی سلسلے کی تالیفات ہیں، قرآن اور سیرت آپ کی تصنیف وتالیف کا خاص میدان تھا، آپ کی تحریر میں بلا کی روانی و برجستگی اور خوبصورتی و رعنائی تھی، خوبصورت تعبیرات، موقع کے لحاظ سے کہیں شبنم کی خنکی اور کہیں شعلہ کی حرارت، تکلف وتصنع سے خالی، بارہا ایسا ہوا کہ ان کا اداریہ یا کوئی اور تحریر اس ارادہ سے شروع کی کہ چند سطریں پڑھی جائیں؛ لیکن شروع کرنے کے بعد پورا کئے بغیر چھوڑ نہیں سکا، ہم لوگوں نے جن اہل قلم کو دیکھا، ان میں چند بہت ہی اچھے لکھنے والوں میں ایک مولانا مرحوم تھے۔

اس حقیر نے پہلی بار مولانا مرحوم کا نام نامی اس وقت سنا، جب آپ کی کتاب ''چند دن دیارِ غیر میں'' دارالاشاعت رحمانی مونگیر (بہار) سے شائع ہوئی، وہ ہم لوگوں کی طالب علمی کا زمانہ تھا، یہ اصل میں یوروپ کا سفر نامہ ہے، اس وقت مطالعہ وغیرہ کا زیادہ شعور نہیں تھا؛ لیکن چوں کہ اس کتاب میں مختلف مقامات اور وہاں کے حالات کا ذکر تھا؛ اس لئے خاصی دلچسپی پیدا

ہوگئی اور پوری کتاب پڑھ ڈالی، ملاقات کا اشتیاق تو اسی وقت سے تھا؛ لیکن یہ سعادت بہت بعد کو حاصل ہوئی اور اس کے بعد بھی گاہے گاہے سرسری سی ملاقات ہی ہو پاتی تھی؛ البتہ جب دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد نے 'خطبات حیدرآباد' کا سلسلہ شروع کیا تو پہلے خطبات کے لئے مولانا محمد رضوان القاسمیؒ کے ذہن میں مولانا کا نام نامی آیا، مولانا نے مجھ سے بھی بطور خاص مشورہ کیا، اور سیرت سے متعلق مولانا عبداللہ عباس صاحبؒ کی تحریروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے بھی اس کی پوری تائید کی، اس طرح خطبات حیدرآباد کے سلسلے کا آغاز ہوا، مولانا نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاقی پہلو اور افراد سازی کی صلاحیت پر خطبات دیئے، جو ''پیغمبر اخلاق وانسانیت'' کے نام سے شائع ہو چکے ہیں، اس موقع سے مولانا کو کسی قدر قریب سے دیکھنے اور ان کی ذاتی زندگی کی خوبیوں کو جاننے کا اتفاق ہوا، میں نے دیکھا کہ باوجودیکہ وہ مکہ وسعودی عرب میں مرفہ الحال زندگی گذار رہے ہیں، ان کے رہن سہن میں بہت ہی سادگی ہے، وہ اپنے چھوٹوں سے بھی اس طرح ملتے کہ گویا وہ ان کا دوست ہو، ہر آنے والے سے ملاقات کرتے اور جو بھی ملاقات کرتا، ان کی محبت کی خنکی ساتھ لے کر واپس ہوتا۔

مولانا نے خطبات کے سلسلہ میں خواہش فرمائی کہ کوئی ہوٹل یا مکان کرایہ پر لے لیا جائے؛ تاکہ وہ اپنی اہلیہ کے ساتھ آئیں اور ان کو اپنے مزاج کا کھانا مل جائے، جس میں زیادہ مرچ اور تیل نہ ہو، ان کی آمد ورفت جہاز سے ہوئی، مولانا رضوان صاحب مرحوم کے کافی اصرار کے باوجود انھوں نے اخراجاتِ سفر قبول نہیں کئے؛ البتہ جو مکان مہیا کیا گیا تھا، اس میں قیام فرمایا، کہنے لگے کہ جب میں یونیورسٹیوں میں لکچر کے لئے بلایا جاتا ہوں تو میں وہاں پیسہ لینے میں کوئی تکلف نہیں کرتا؛ کیوں کہ وہ پیسے گورنمنٹ ادا کرتی ہے اور اگر پیسے نہیں لئے جائیں تو ذمہ داروں کی جیب میں چلے جاتے ہیں؛ لیکن دینی مدارس اور اداروں کے اسفار میں میں پیسے نہیں لیتا اور یہ کوئی بڑائی کی بات نہیں ہے، چوں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے گنجائش دی ہے؛ اس لئے میں ایسا کرتا ہوں۔

اس موقع سے کئی بار میں نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے ان کی

آواز رندھ جاتی تھی اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے تھے، اس سے ان کے جذبۂ حب رسول کا اندازہ ہوا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات والا صفات سے بے حد عشق ومحبت، ان کی ان تمام ہی تحریروں سے ظاہر ہے، جو انھوں نے سیرت سے متعلق لکھی ہیں، نیز ان نعتیہ اشعار سے بھی، جس میں انھوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو محبت واحترام کی سوغات پیش کی ہے، مثلاً مولانا جامی کے مشہور شعر :

زمہجوری بر آمد جان عالم ترحم یا نبی اللہ ترحم

پر اس طرح تضمین فرماتے ہیں :

منم رسوا حقیر و بے نوایم فگندہ سر ز انبار گناہم
مگر در لحن جامی می سرایم زمہجوری بر آمد جان عالم
ترحم یا نبی اللہ ترحم

غور کیجئے ان اشعار میں کس قدر وارفتگی، بچھاؤ، احساسِ کم مائیگی اور محبت و درد کا جذبہ کارفرما ہے!

چنانچہ مولانا کے محبوب موضوعات دو تھے، ایک: قرآن مجید، دوسرے: سیرت نبوی، اور آپ کی زیادہ تر تالیفات ان ہی دو موضوعات پر ہیں، اعجاز قرآن کے موضوع پر راقم الحروف کو براہ راست بھی ان کے خطبہ سے استفادہ کا موقع ملا ہے۔

وہ ایک اچھے مؤلف اور محقق ہونے کے ساتھ ساتھ مایۂ ناز مدرس بھی تھے، ندوہ میں ادیب اول رہے، جامعہ ام القری کے مقبول اساتذہ میں تھے، انھیں غیر عرب طلبہ کو عربی زبان پڑھانے میں بڑی مہارت حاصل تھی، اس کا ایک عملی نمونہ مجھے خود دیکھنے کا موقع ملا، جن دنوں وہ خطبات کے لئے مدعو تھے، ان ہی دنوں میں نے ان سے غیر عرب کو عربی پڑھانے کے طریقہ کے بارے میں دریافت کیا، ظہر کی نماز کے بعد مسجد کے برآمدہ میں وہ کچھ اساتذہ کو لے کر بیٹھ گئے، جن میں مولانا محمد رضوان صاحبؒ بھی تھے اور یہ حقیر بھی تھا، انھوں نے فرمایا کہ دو

تین ابتدائی تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو بلا لیجئے ، میں نے خیال کیا کہ شعبۂ عربی کے ابتدائی طلبہ کو طلب کر رہے ہیں؛ چنانچہ اعدادیہ اور اول عربی کے چند طلبہ کو بلایا، مولانا نے فرمایا: نہیں ، بالکل ابتدائی بچوں کو بلایئے جو عربی کی الف ، ب سے بھی واقف نہ ہوں ؛ چنانچہ نورانی قاعدہ اور ناظرہ قرآن پڑھنے والے چند چھوٹے بچوں کو بلالیا، مولانا نے دس منٹ ان سے عربی زبان میں سوال وجواب کیا، کوئی اُردو لفظ استعمال نہیں کیا اور اشاروں سے ان کو اپنی بات سمجھاتے رہے، مجھے حیرت ہوئی کہ اتنے کم وقت میں ان بچوں نے امر ونہی اور خبر کے آٹھ دس جملے سیکھ لئے ،اس وقت اس میدان میں مولانا کی تدریسی صلاحیت کا اندازہ ہوا۔

مولانا کو اپنے استاذ اور مربی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ سے بے حد تعلق تھا اور ان پر شیفتہ وفریفتہ تھے، ان کی کتاب ''میر کارواں'' کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا ایک ایک حرف محبت کا قلم خون جگر میں ڈبو کر لکھا گیا ہے، اپنے استاذ سے وفاداری اور استواری آپ کا ایسا وصف ہے، جس کی مثال آج کے دور میں کم ملتی ہے۔

یہی محبت ان کی ندوہ کے ساتھ تھی ، حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کی وفات کے بعد انھوں نے پوری کوشش کی کہ ندوہ میں کوئی فتنہ نہ کھڑا ہو؛ چنانچہ خود مجلس نظامت کی نشست بلائی ، اس میں ناظم کی حیثیت سے مولانا علی میاں صاحبؒ کے معتمد خاص حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی کا نام پیش فرمایا اور مہتمم کی حیثیت سے حضرت مولانا سعید الرحمٰن اعظمی کا اور اس طرح کسی معمولی اختلاف وانتشار کے بغیر ندوہ کا کاروانِ علم جادہ پیما رہا اور کوئی انتشار کی صورت پیدا نہیں ہوئی۔

مولانا کی زندگی میں ایک تلخ واقعہ اس وقت پیش آیا ، جب مکتبہ الفرقان لکھنؤ کی طرف سے ''معرکۂ کربلا اور اس کا پس منظر'' نامی کتاب سامنے آئی ،اس کتاب میں بڑی حد تک یزید اور قاتلانِ حسین رضی اللہ عنہ کی طرف سے مدافعت کا انداز اختیار کیا گیا ہے، جو اہل سنت والجماعت کے مسلک کے خلاف ہے اور جو واضح طور پر اہل بیت کے ساتھ

ناانصافی پر مبنی ہے،مولانا نے اس کتاب پر تبصرہ لکھا تو اہل بیت کی طرف دفاع کرتے ہوئے اموی صحابہ کے بارے میں بعض ایسے فقرے قلم سے نکل گئے، جو یقیناً مناسب نہیں تھے،یعنی ایک بے اعتدالی کے مقابلہ میں دوسری بے اعتدالی پیدا ہوگئی، اس واقعہ نے بڑے فتنہ کی صورت اختیار کر لی اور خود ندوہ یہاں تک کہ حضرت مولانا علی میاں صاحبؒ کو بھی اس کی لپیٹ میں لے لیا گیا۔

مولانا کی حقیقت پسندی اور جذبۂ اعتراف حق ہے کہ جوں ہی مولانا کو اپنی غلطی کا احساس ہوا، آپ نے فوراً رُجوع کا اعلان فرمایا اور کسی تذبذب کا مظاہرہ نہیں کیا، بہرحال شدہ شدہ یہ فتنہ رفع ہوا۔

ان کی خورد نوازی اور شفقت اس وقت دیکھنے میں آتی تھی، جب ندوہ جانا ہوتا تھا، بڑی محبت وشفقت سے ملتے، ایک بار کسی رسالہ میں میرا کوئی مضمون طبع ہوا جو انھیں پسند آیا تو خاص طور پر خط لکھ کر حوصلہ افزائی فرمائی، جب مجھے بزرگوں نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا جنرل سکریٹری منتخب کیا تو خط لکھ کر مبارک باد دی، اسی طرح عزیز القدر مولوی منور سلطان ندوی کا مقالہ ''ندوہ کی فقہی فکر اور فقہی خدمات'' (جسے انھوں نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں تخصص فی الفقہ کی سند حاصل کرنے کے لئے لکھا تھا) جب طبع ہوا تو اس موقع پر بھی بہت مسرور ہوئے اور خط کے ذریعہ خوشی کا اظہار فرمایا، خود میرا لڑکا محمد عمر عابدین سلمہ کا جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں داخلہ منظور ہوا تو جب بھی مکہ مکرمہ میں ملاقات ہوتی، ان پر بھی شفقت فرماتے رہے۔

عرصہ پہلے ان کو مکہ مکرمہ کی شہریت حاصل ہوگئی تھی؛ لیکن انھوں نے ہندوستان اور ہندوستانی مسلمانوں سے کبھی اپنا تعلق نہیں توڑا اور بیرونی شہریت کے حامل ہونے کا احساس نہیں ہونے دیا، اللہ تعالیٰ نے مکہ کی خاک پاک کو ان کے لئے مقدر کیا تھا، وہیں یکم ذوالحجہ ۱۴۲۶ھ مطابق یکم جنوری ۲۰۰۶ء کو وفات ہوئی، حرم مکی میں نماز جنازہ ہوئی اور وہیں

پیوند خاک ہوئے، کوما میں تھے؛ لیکن وفات سے ایک گھنٹہ پہلے زبان گویا ہوئی اور ''اللہ، اللہ'' کا ورد جاری ہوگیا، واقعہ ہے کہ مولانا مرحوم کی وفات نے علمی دنیا میں ایک بڑا خلا پیدا کر دیا ہے، اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، ان کے درجات بلند فرمائے، اور دنیا میں ان کا جن بزرگوں کے ساتھ محبت کا تعلق تھا، ان ہی کے ساتھ ان کا حشر فرمائے۔

❁ ❁ ❁

مولانا محمد حنیف ملیؒ

شیر مردوں سے ہوا پیشۂ تحقیق تہی

ہندوستان ان ملکوں میں ہے، جہاں اسلام کی روشنی بالکل ابتدائی دور میں پہنچی اور اس وقت سے آج تک اس ملک کے چپے چپے پر اسلامی نقوش کی تابندگی قائم ودائم ہے، اسی طرح ملک کے مختلف علاقوں میں اہم علمی اور دعوتی شخصیتیں بھی پیدا ہوتی رہی ہیں، جنھوں نے معرفت کے نور پھیلائے ہیں اور علم وتحقیق کی شمعیں روشن کی ہیں، ان خطوں میں ایک ممتاز اور نمایاں نام 'مالیگاؤں' کا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ مالیگاؤں مہاراشٹر کا علمی دارالخلافہ ہے تو بے جا نہ ہو، اس وقت یہاں جو آبادی ہے، عام طور پر ان کے آباء واجداد اتر پردیش کے علم خیز علاقہ اعظم گڑھ سے آئے تھے، مالیگاؤں بھی گویا دوسرا اعظم گڑھ ہے، وہی تہذیب، وہی ثقافت، کرتے، لنگیاں اور کشتی نما ٹوپیاں، رہن سہن میں سادگی، بے تکلفی اور مہمان نوازی، مدارس ومساجد کی کثرت، علماء کی فراوانی، ادبی ذوق، اسلامی شناخت اور شعائر دین کی حفاظت، مالیگاؤں کا مزید ایک امتیاز یہ ہے کہ وہاں عالمات کی تعداد علماء سے بھی بڑھ کر ہے۔

اس شہر میں بڑے علماء اور اصحابِ قلم پیدا ہوتے رہے ہیں، ماضی قریب کے علماء میں بڑی شخصیت حضرت مولانا عبدالحمید نعمانیؒ کی تھی، وہ عالم بھی تھے اور عالم گر بھی، وہ ادیب بھی تھے اور ادب نواز بھی، وہ گیسوئے قیادت کو بھی سنوارنا جانتے تھے اور تعلیم وتحقیق کے پیامی بھی تھے، ان کے شاگردوں میں ممتاز ترین شخصیت مولانا محمد حنیف ملیؒ کی تھی، پست قامت، گہرا سانولا رنگ، سفید وسادہ اور مالیگاؤں کی عام روایت کے خلاف لمبا کرتا، چوڑے پائنچوں کا پاجامہ، سر پر کشتی نما ٹوپی، آنکھ پر معمولی سی عینک، ہنس مکھ، خوش مزاج، سادہ وبے تکلف، دیکھنے میں ایک معمولی سے انسان؛ لیکن جب اسٹیج پر عوام وخواص سے مخاطب ہوتے تو ایسا لگتا کہ

حسین الفاظ کی خوبصورت بندشیں دست بستہ سامنے کھڑی ہیں، مضمون کی آمد بھی اور زبان وبیان کی رعنائی بھی، قلم اس سے زیادہ خوبصورت، ایسا کہ گویا الفاظ کا تاج محل تعمیر کیا گیا ہو اوراس کے رگ وریشے میں معنویت پیوست ہو، مولانا نے زیادہ نہیں لکھا؛ لیکن جو کچھ لکھا خوب لکھا، اُسلوبِ تحریر کے علاوہ خط بھی اتنا نفیس کہ خواہی نہ خواہی پڑھنے کو دل چاہے۔

اس حقیر نے سب سے پہلے مولانا کو اس وقت جانا، جب ۱۹۷۸یا۱۹۷۹ء میں امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کے زیر اہتمام جامعہ رحمانی مونگیر میں مدارس اسلامیہ کنونشن منعقد ہوا، اس کنونشن میں پورے ملک سے نامی گرامی شخصیتیں شریک ہوئیں، اس موقع سے ایک مجلّہ کی اشاعت کا بھی منصوبہ بنااور ملک کی ممتاز علمی ودینی شخصیتوں سے مضامین کی فرمائش کی گئی، پٹنہ کے ایک پختہ کار کاتب سے کتابت کرائی گئی، اور پروف ریڈنگ کی ذمہ داری اس حقیر سے متعلق کی گئی، اس موقع سے دینی مدارس کے نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم پر بڑے اچھے مضامین آئے؛ لیکن زبان وبیان اور موضوع سے متعلق افکار وخیالات کی بلندی کے لحاظ سے جو مضمون سب سے زیادہ پسند آیا اور دل کو بھایا، وہ ایک ایسا مضمون تھا، جس کے سرنامہ پر ''محمد حنیف ملی'' لکھا ہوا تھا، مسودہ بھی اتنا صاف ستھرا اور خوبصورت کہ کتابت شدہ تحریر سے بھی زیادہ اچھا نظر آتا تھا، یہ مولانا سے میرا پہلا تعارف تھا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے جب ''مرکز البحث العلمی'' بنائی، جس نے بعد کو ''مجمع الفقہ الاسلامی الہند'' کا پیکر اختیار کیا، تو اس کے لئے اصحابِ علم ونظر کی جو کہکشاں ترتیب دی، اس میں مولانا محمد حنیف ملی صاحب کا نام بھی شامل تھا، مولانا سے گاہے گاہے پروگراموں میں ملاقات ہوجاتی تھی اور وہ بڑے احترام اور شفقت کے ساتھ پیش آیا کرتے تھے۔

جب دارالعلوم سبیل السلام میں دعوۃ کا شعبہ شروع کرنے کی بات آئی، اس وقت اکیڈمی کے تیسرے سیمینار میں شرکت کے لئے مولانا محمد رفیع عثمانی بنگلور آرہے تھے، ہم لوگوں کی گزارش پر اس وقت مولانا عثمانی حیدرآباد تشریف لے آئے اور یہاں سے ہوتے ہوئے

بنگلور گئے ؛ چنانچہ جلسہ منعقد ہوا ، جس میں مولانا عثمانی نے بخاری شریف کا افتتاح کرایا اور مولانا محمد حنیف ملیؒ کو شعبۂ دعوت کے افتتاح کے لئے مدعو کیا گیا، انھوں نے برجستہ بہت ہی بلیغ خطاب فرمایا، اور دعوتِ دین کی اہمیت پر بصیرت مندانہ روشنی ڈالی۔

دارالعلوم حیدرآباد میں سعودی وزارتِ حج کے تعاون سے حج کانفرنس منعقد ہوئی ، سال کا اخیر حصہ ہونے کی وجہ سے مدرسہ والوں نے ختم بخاری کی تقریب بھی رکھ لی ، جس میں مولانا ملی نے آخری حدیث کا عربی زبان میں درس دیا ، یہ درس زبان و بیان اور علم و تحقیق دونوں اعتبار سے ایک مثالی درس تھا ، عرب علماء نے بھی اس کی خوب داد دی ، اسی طرح ہندوستان سے سعودی عرب کی دعوت پر علماء کا ایک وفد حج میں شریک ہوا ، وہاں اس وفد کو ایک پروگرام میں تاثرات وخیالات کا اظہار کرنا تھا ، حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ نے اس کے لئے مولانا ملی کا انتخاب فرمایا اور وہاں بھی انھوں نے بڑا اثر انگیز خطاب فرمایا۔

جب سبیل السلام میں صدر مدرس کی خدمت مجھ سے متعلق تھی ، تو ایک بار ادارہ کے ناظم مولانا محمد رضوان القاسمی صاحبؒ امریکہ کے سفر پر تھے ، اس موقعہ سے افتتاح بخاری کے لئے اس حقیر نے مولانا ہی کو مدعو کیا ، مولانا نے نہ صرف بخاری کی آخری حدیث پر جو روایتی باتیں کہی جاتی ہیں ، ان کو بہت ہی خوبصورتی کے ساتھ پیش فرمایا ؛ بلکہ امام بخاری کے فکری مذاق اور بخاری کی خصوصیات پر بعض طبع زاد نکتے بھی ذکر کئے ، جن کا ذکر عام طور پر نہیں ملتا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا ایک بلند پایہ عالم ، صاحبِ ذوق ادیب اور مجمع پر چھا جانے والے اور دلوں کے نہاں خانوں تک پہنچ جانے والے خطیب تھے ، انھوں نے کم لکھا ؛ لیکن جو کچھ لکھا خوب لکھا ، مدارس کا نظام تعلیم ، شاہ ولی اللہ اور علم حدیث ، نقش تحریر ، نقش جمیل ، نقش حریت ، نقوش چین ، نقوش نعمانی ، نقوش کوہ کن ، فیوض اربعین اور دعوت کا قرآنی اُسلوب وغیرہ ان کی تالیفی یادگاریں ہیں۔

وہ مالیگاؤں کے ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوہوئے ، عسرت کے ساتھ تعلیم حاصل

کی، ابتدائی تعلیم مدرسہ عین العلوم اور پرائمری اسکول میں حاصل کی، پھر جب ان کے استاذ و مربی مولانا عبدالحمید نعمانی نے ۱۹۵۲ء میں معہد ملت کی بنیاد رکھی تو وہاں جماعت اول سے ان کی تعلیم شروع ہوئی اور ۱۹۵۷ء میں یہیں سے دورۂ حدیث کی تکمیل فرمائی، پھر دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے، دوسال رہ کر یہاں دوبارہ دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی اور دارالعلوم سے فراغت کے بعد جو معہد ملت میں مسند تدریس پر بیٹھے تو تادم آخریں قال اللہ قال الرسول (ﷺ) کی خدمت کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، یہاں ۱۹۶۶ء میں بخاری شریف آپ سے متعلق ہوئی تھی اور اخیر وقت تک آپ ہی سے متعلق رہی۔

آپ کی شخصیت پر معہد ملت کے بانی مولانا عبدالحمید نعمانی کا خاص اثر تھا اور آپ کی تربیت نیز عربی زبان وادب کا ذوق پیدا کرنے میں مولانا نعمانی کا نمایاں حصہ تھا، معہد ملت مولانا کا مادر علمی بھی تھا اور ان کے محسن و مشفق استاذ کی یادگار بھی؛ اس لئے انھیں اس ادارہ سے عشق تھا، بعض دفعہ وہ قدر ناشناسی سے بھی دوچار ہوئے اور دل برداشتہ ہونے کی نوبت آئی؛ لیکن انھوں نے کبھی معہد ملت کو چھوڑنا گوارہ نہیں کیا، اس سلسلے میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ جب اس حقیر کو معلوم ہوا کہ مولانا وہاں آزردہ خاطر ہیں تو اس نے سبیل السلام میں مولانا کو شیخ الحدیث کی حیثیت سے آنے کی دعوت دی اور اس پر اصرار بھی کیا، ایک طرف مجھ سے تعلق اور دوسری طرف معہد ملت کے حوصلہ شکن حالات کی وجہ، انھیں کچھ دنوں تذبذب بھی رہا؛ لیکن گھر کی قربت اور معہد ملت سے محبت غالب آئی اور حالات بھی ایک حد تک موافق ہوگئے؛ اس لئے ان کی تشریف آوری نہیں ہوسکی۔

مولانا کی ایک اہم خصوصیت ان کی وہ سادگی تھی، جو سلف صالحین کا امتیاز رہی ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا ہے: ''ان کی اُمیدیں قلیل، ان کے مقاصد جلیل'' مجھے ایک ضرورت کے تحت مولانا کی زندگی میں مالیگاؤں جانا پڑا، مولانا سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے باصرار دولت خانہ پر مدعو کیا، جب حاضری ہوئی تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ مولانا کا مکان نہایت سادہ ہے، فرنیچر نہ ہونے کے درجہ میں ہے، بستر وغیرہ بھی معمولی اور ہر چیز زہد کا مظہر،

یوں تو ان کا لباس و پوشاک زاہدانہ زندگی کا عکاس تھا ہی، گھریلو زندگی بھی پوری طرح اسی رنگ میں رنگی ہوئی تھی؛ اسی لئے ان کو مہمان بنانا ذرا بھی بار خاطر نہ ہوتا تھا، جو سواری میسر آئی، اسے قبول کرلیا، جہاں بٹھایا گیا، بیٹھ گئے، جہاں سلایا گیا، سو گئے اور خورد و نوش کی جو چیز سامنے رکھی گئی، بلا تکلیف اور نشاط کے ساتھ تناول فرمالیا، یہ کیفیت آج طبقہ علماء اور خاص کر خطباء اور مقررین میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

مولانا ملیؒ حالاں کہ میرے بزرگوں میں تھے اور بعض اساتذہ کے ہم جماعت تھے؛ لیکن میرے ساتھ ان کا سلوک ایک برابر کے شخص کی طرح ہوتا تھا، وہ مجھ سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کی جانب سے بڑی قدر افزائی کا معاملہ رہتا تھا، اس میں ایک تو مزاجی مناسبت کا بھی دخل تھا اور دوسرے اس بات کو بھی کہ وہ عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ سے بے حد عقیدت رکھتے تھے اور قاضی صاحب بھی انھیں بہت چاہتے تھے، اتفاق ہے کہ قاضی صاحبؒ شوگر کے مریض ہوئے اور کینسر میں مبتلا ہوئے، مولانا ملی کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ شوگر کے اثر سے گردوں نے بے وفائی کی اور باب کینسر تک جا پہنچی، قاضی صاحب کو اطلاع ملی تو بہت بے چین ہوگئے، میں نے دو شخصیتوں کی بیماری پر ان کو جس قدر متفکر دیکھا، شاید کسی اور کی بیماری پر نہیں دیکھا، ایک مولانا ملی، دوسرے جناب عبدالرحیم قریشی، قریشی صاحب بحمد اللہ سلامت ہیں؛ لیکن مولانا ملی ان کی زندگی میں ہی رخصت ہوگئے اور مورخہ ۱۱ر فروری ۲۰۰۰ء کو فکر و نظر اور زبان و ادب کا یہ روشن چراغ اس فانی دنیا کے اُفق پر ہمیشہ کے لئے بجھ گیا، انھوں نے جس سادگی اور خلوص کے ساتھ ۴۰ سال تک علوم اسلامی تدریس کا فریضہ انجام دیا اور ۳۲ سالوں تک نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ درسِ بخاری کی سعادت حاصل کی، علوم اسلامی کا ایسا شہسوار اور دین وملت کا ایسا خدمت گزار کیوں کر رحمتِ الٰہی سے محروم رہ سکتا ہے؟

مولانا نے صرف معہد ملت ہی کی خدمت نہیں کی؛ بلکہ مرہٹوارہ کے علاقہ میں کتنے ہی مدارس قائم کئے اور درجنوں مدارس کی سرپرستی فرمائی، پورے مہاراشٹر میں خصوصاً اور پورے ملک

میں عموماً آپ کے تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں اور بالواسطہ آپ کا فیض جاری ہے، اس کے علاوہ آپ نے دوسرے محاذوں پر بھی علم کی زلفوں کو سنوارا اور ملی مسائل کی عقدہ کشائی کی، ۱۹۷۹ء میں معہد ملت سے گلشن جاری ہوا جس کے مرتبین مولانا ملی اور مولانا عبدالاحد ازہری تھے، ۱۹۸۱ء میں 'مجلس علم وادب' قائم کی اور اس سے کئی کتابیں شائع کیں، آپ کی تالیف 'نقش حریت' پر اُردو اکیڈمی کی طرف سے انعام بھی دیا گیا، تحریک دعوت وتبلیغ سے بھی آپ کی گہری وابستگی تھی اور اس نسبت سے آپ نے چین کا سفر بھی کیا، نقوشِ چین اسی سفر کی داستان ہے، آپ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے رکن تاسیسی اور ندوۃ العلماء لکھنؤ کی مجلس منتظمہ کے رکن بھی تھے، ہر جگہ آپ کی رائے کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور آپ کے مشوروں کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔

❁ ❁ ❁

مولانا عمید الزماں کیرانویؒ

مرا ساز گرچہ ستم رسیدۂ زخم ہائے عجم رہا
وہ شہید ذوقِ وفا ہوں میں کہ نوا مری عربی رہی

یہ حقیر جب دارالعلوم دیوبند حاضر ہوا، اس وقت دارالعلوم میں بڑے پائے کے اساتذہ تھے؛ لیکن جن کی شہرت، مقبولیت اور محبوبیت کا ستارہ غالباً سب سے بلند تھا، وہ تھے مولانا وحید الزماں کیرانویؒ، مولانا کیرانوی کا عربی زبان وادب کی تدریس اور طلبہ کی ذہنی تربیت میں ایک اجتہادی رنگ تھا، جیسے بے جان انجن میں اسٹیم بھر دیا جائے تو وہ دوڑنے لگتا ہے، اسی طرح مولانا کمزور سے کمزور طلبہ میں حوصلہ و ہمت کا اسٹیم بھرنے کا فن جانتے تھے؛ چوں کہ میں نے دارالعلوم میں صرف دورۂ حدیث کیا اور آب و ہوا راس نہ آنے کی وجہ سے کوئی اور کورس نہیں کرسکا، اس لئے انھیں دور دور ہی سے دیکھنے کی نوبت آئی؛ لیکن ان کی عقیدت اور آئیڈیل شخصیت کی حیثیت سے ان کا احترام ہمیشہ دل میں رہا، ان سے زیادہ ارتباط فراغت کے بعد پیدا ہوا اور مولانا کی ضیافت سے بھی اور شفقت وعنایت سے بھی مستفید ہونے کا موقع میسر آیا۔

یہ بات مجھے معلوم تھی کہ مولانا کا گھرانہ ایک علمی گھرانہ ہے اور عربی زبان وادب اس وقت اس خاندان کی پہچان ہے؛ لیکن اس سے زیادہ مولانا کے متعلقین سے واقفیت نہیں تھی، یہاں تک کہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے باضابطہ قائم ہونے کے بعد دہلی کی آمد ورفت شروع ہوئی، وہاں اکیڈمی کے دفتر سے قریب ہی تنظیم ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند کا دفتر بھی ہے، یہاں مولانا کے برادر خورد مولانا عمید الزماں کیرانویؒ سے پہلی بار ملاقات ہوئی، جو اپنے بھائیوں میں ترتیب کے اعتبار سے تیسرے نمبر پر تھے، ان میں اور ان کے برادر اکبر مولانا وحید الزماں کیرانوی صاحبؒ میں اس درجہ مماثلت تھی کہ اگر کوئی شخص مجھ سے مولانا کا تعارف کرائے بغیر

دریافت کرتا کہ بتاؤ یہ ہندوستان کے مشہور اساتذۂ ادب عربی وعلوم اسلامی میں سے کس کے بھائی ہوسکتے ہیں؟ تو غالباً میں مولانا وحید الزماں صاحبؒ ہی کا نام لیتا، وہی وقار ومتانت، ہر چیز میں نفاست اور خوش ذوقی، لباس و پوشاک، رہن سہن اور ملاقات وگفتگو میں نستعلیقیت، متوسط قد وقامت، گندمی لیکن کھلتا ہوا رنگ، سر سے پاؤں تک سفید لباس، صاف ستھری گفتگو، ایسی بات نہیں جس میں ہاں نہیں دونوں کی گنجائش ہو، علم کے قدرداں، نوجوان فضلاء کا حوصلہ بلند کرنے کی خاص لگن، غرض کہ بہت سی باتوں میں اپنے برادر بزرگ کی مثال اور مثیل۔

مولانا کی شفقت اور خورد نوازی کی وجہ سے بہت جلد مولانا سے ذہنی قربت ہوگئی، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ پر تنظیم ابنائے قدیم نے جو عظیم الشان سیمینار کیا، اس کے اصل دل ودماغ مولانا کیرانوی ہی تھے، مولانا نے اس سلسلہ میں مشورہ میں بار بار اس حقیر کو بھی شریک رکھا، جو محض ان کی محبت تھی، اور ان مقالات کا مجموعہ مرتب ہوا تو ترتیب قائم کرنے اور مضامین پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے کا بھی حکم فرمایا؛ چنانچہ میں نے کچھ مرکزی عنوانات کے تحت مقالات کی ترتیب قائم کردی، زیادہ تر یہ مجموعہ اسی ترتیب پر شائع ہوا ہے اور کچھ مقالات کے بارے میں ذاتی مشورے بھی دیئے، جن کو مولانا نے پسند فرمایا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی حیات میں بھی وہ اسلامک فقہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں مدعو ہوتے تھے؛ لیکن کبھی کبھی، قاضی صاحب کی وفات کے بعد میں ہمیشہ اصرار کے ساتھ انھیں شرکت کی دعوت دیتا تھا اور مولانا اپنی علالت کے باوجود بسر وچشم اسے قبول فرماتے تھے؛ بلکہ بعض دفعہ میری گذارش پر انھوں نے اپنے بنے بنائے دوسرے پروگرام کو ملتوی فرما کر اکیڈمی کے پروگرام میں شرکت کی، وہ مجھ سے ازراہ محبت فرماتے تھے کہ فقہ میرا موضوع نہیں ہے؛ لیکن میں اس میں دو وجہ سے شرکت کرتا ہوں، ایک آپ کی محبت اور دوسرے یہ کہ ہندوستان میں اس معیار کی کوئی اور علمی مجلس نہیں ہوتی؛ اس لئے یہاں کے مناقشات سے مجھے بہت نفع پہنچتا ہے، وہ ہمیشہ افتتاحی اجلاس میں اپنے تاثرات کا اظہار بھی فرماتے تھے اور اپنے حسن ظن کی وجہ سے خاص طور پر میرا ذکر کردیتے تھے، میں نے بعض اوقات ان سے

عرض کیا کہ آپ اپنی محبت میں تذکرہ کرتے ہیں؛ مگر لوگوں کو غلط فہمی ہوسکتی ہے اور مجھے شرمندگی ہوتی ہے؛ لیکن مولانا نے میری معذرت قبول نہیں فرمائی اور کہا کہ ''جو لوگ کام کریں، ان کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے، ہمارے یہاں افراد سازی کا کام جو تھم گیا ہے، اس کا سبب یہی ہے کہ بڑوں میں اپنے چھوٹوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا حوصلہ نہیں رہا''۔

ادھر صورت حال یہ ہے کہ ہر ماہ دو ماہ میں مجھے دہلی جانے کی نوبت آتی رہتی ہے، اکثر اسفار میں مولانا کے یہاں ضرور حاضری ہوتی؛ چوں کہ مولانا اُصولی مزاج کے آدمی تھے، اس لئے میں ہمیشہ اطلاع کر کے حاضر ہوتا تھا، وہ اس بات کو بہت پسند بھی کرتے تھے، مگر اس کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ عشائیہ کے بغیر واپسی کی اجازت نہیں ملتی تھی، مہمان نوازی مولانا کا نمایاں وصف تھا؛ حالاں کہ ان کے پاؤں میں تکلیف تھی اور وہ خاصی دشواری ہی سے چل پاتے تھے، نیز گھر میں کسی بچے کے موجود نہ ہونے کی وجہ سے خود ہی ساری چیزیں لانی اور لے جانی پڑتی تھیں؛ لیکن ممکن نہیں تھا کہ کوئی شخص ان سے ملاقات کے لئے آئے اور کچھ کھائے پیئے بغیر چلا جائے، ان مجلسوں میں ملی مسائل، ملی ادارے اور ملی شخصیات بھی بعض اوقات زیر بحث آتی تھیں، اس سلسلہ میں میرا تجربہ یہ ہے کہ ایک طرف ان کی رائے بے لاگ اور واضح ہوتی تھی، خواہ یہ دوسروں کے لئے قابل قبول ہو یا نہ ہو، دوسری طرف وہ کسی سے کدورت نہیں رکھتے تھے، اگر کبھی کسی کے ساتھ بدمزگی پیدا ہوگئی تو اسے فراموش کرنا جانتے تھے اور ایسا بھی ہوتا تھا کہ جب ان کو صورتِ حال سمجھ میں آجاتی تھی تو بعض دفعہ دوسرے نقطۂ نظر کے درست ہونے کا اعتراف کر لیتے تھے، مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ سیمینار کے موقع سے استاذ گرامی مولانا محمد سالم قاسمی اور مولانا سید اسعد مدنیؒ کے درمیان ہونے والی مصالحتی بات چیت کا ذکر ہوا اور لوگوں نے تجویز پیش کی کہ ان بزرگوں میں اتحاد ہوجائے اور دونوں دارالعلوم کو ایک کردیا جائے، اس وقت اس حقیر نے کہا کہ شخصیتوں کا اتحاد ضرور ہونا چاہئے؛ لیکن دارالعلوم اور دارالعلوم (وقف) کا انضمام نہ ہونا چاہئے، ورنہ یہ اتحاد پائیدار نہ رہ سکے گا، مولانا کو اس وقت میری یہ بات پسند نہیں آئی؛ لیکن کچھ عرصہ بعد مولانا کے سامنے جو حالات آئے،

اس کی روشنی میں انھوں نے فرمایا کہ اب میں نے سمجھا کہ تمہاری رائے زیادہ درست تھی۔

اپنے اصل مزاج کے اعتبار سے مولانا علم و تحقیق اور تدریس و تربیت کے میدان کے آدمی تھے اور انھوں نے فراغت کے بعد اسی منہج پر کام شروع کیا، دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ سے وابستہ رہے، حضرت نانوتویؒ کی تفسیر ''معوذتین'' کا عربی میں ترجمہ کیا، اس کے بعد انھوں نے ملی کاموں کی طرف ہجرت کی اور مولانا سید اسعد مدنیؒ اور مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے عربی دنیا میں نمائندہ کی حیثیت سے خدمت انجام دی، پھر عربی صحافت اور ریڈیو میں عربی مترجم اور اناؤنسر کی حیثیت سے متعلق ہوئے، یہاں تک کہ ۱۹۷۲ء میں سعودی سفارت خانہ کے شعبۂ صحافت واطلاعات ونشریات کے ذمہ دار مقرر ہوئے اور کم وبیش ۲۶ سال اس خدمت کو اس طرح انجام دیا کہ وہاں مسلمانانِ ہند کی بہتر و موثر نمائندگی بھی کرتے رہے، یعنی ان کا یہ وقت اس طرح گذرا کہ وہ سعودی سفارت خانہ کے ملازم ہی نہیں تھے؛ بلکہ ایک ملی نمائندہ بھی تھے، ابتداء میں تو شاید وہ خود اس ملازمت کے طلب گار رہے ہوں؛ لیکن اپنی لیاقت، دیانتداری اور شرافت کی وجہ سے وہ خود اس عہدے کے مطلوب بن گئے، مولانا بار بار اس سے سبکدوش ہونا چاہتے تھے؛ لیکن سفارت خانہ ان کی معذرت خواہی قبول کرنے پر تیار نہیں تھا، بہر حال شدہ شدہ ان کی یہ معذرت قبول کی گئی اور وہ ملی خدمت کے میدان میں اُترے۔

حالاں کہ وہ ایک طرح سے اس میدان کے نو وارد تھے؛ لیکن اپنی صلاحیت کی وجہ سے انھوں نے بہت جلد اپنی حیثیت منوالی؛ چنانچہ وہ تنظیم ابنائے قدیم کے کارگذار صدر منتخب ہوئے، اگرچہ کہ ان کے عہدہ میں '' کارگزار'' کا لفظ لگا ہوا تھا، مگر وہی اس تنظیم کے کرتا دھرتا اور دل ودماغ تھے، انھوں نے اس تنظیم کے تحت سہ ماہی 'ترجمان دارالعلوم' نکالا، جسے بڑی پذیرائی حاصل ہوئی اور جواَب بھی اسی شان واہتمام کے ساتھ نکل رہا ہے، تنظیم ہی کے تحت آپ نے 'معہد التخصص فی اللغۃ العربیۃ' قائم کیا، آپ ہی اس کے روح رواں تھے اور آپ ہی کی مقناطیسی شخصیت تھی جو طلبہ یہاں کھینچ کر لاتی تھی، اس ادارہ سے مختصر مدت میں اچھے فضلاء پیدا ہوئے، جو ملک و بیرون ملک سرگرم عمل ہیں، انھوں نے اپنے برادر بزرگ مولانا وحید الزماں صاحبؒ کی

مبسوط لغت ''القاموس الوحید'' کو بڑی عرق ریزی اور جانفشانی کے ساتھ مکمل کیا، اور اس پر بڑا ہی عالمانہ مقدمہ لکھا، جو عربی زبان ولغت کی تاریخ پر ایک دستاویز سے کم نہیں، جو لوگ قریب سے واقف ہیں انھیں اندازہ ہے کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں مولانا کا نمایاں حصہ ہے، عربی زبان میں مولانا کا خطاب نہایت برجستہ اور سلیس ہوا کرتا تھا اور الفاظ وتعبیرات پر بے حد کنٹرول تھا، مجھے اکیڈمی کے متعدد پروگراموں میں عرب مہمانوں کی مناسبت سے مولانا کا عربی خطاب سننے کا موقع ملا، جو زبان و بیان اور لب ولہجہ دونوں اعتبار سے نہایت عمدہ ہوتا اور بے ساختہ آفریں کہنے کو دل چاہتا، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی منتخب ہوئے، آل انڈیا مجلس مشاورت کے جنرل سکریٹری چنے گئے اور اس کی نشاۃ ثانیہ کی کوشش کی، تمام ملی تنظیموں اور اداروں —— خواہ وہ کسی مسلک کی ہوں —— سے ان کا قریبی ربط تھا، ادھر کچھ عرصہ سے دہلی ہی نہیں؛ بلکہ ہندوستان بھر میں یہ بات ناقابل تصور تھی کہ کوئی اہم مجلس یا سیمینار منعقد ہو اور وہ اس میں مدعو نہ ہوں، ملی خدمات کی فضا پر اتنے کم عرصہ میں چھا جانا کم شخصیتوں کو میسر آتا ہے اور یہ نتیجہ تھا مولانا کے خلوص، دیانت، اصابت رائے، شرافت اور وسیع النظری کا۔

مولانا سے آخری ملاقات یوں ہوئی کہ میں دلی میں مقیم تھا اور محبّ گرامی مولانا عتیق احمد بستوی آئے ہوئے تھے، انھوں نے اپنے کسی صاحب تعلق کے حوالہ سے نقل کیا کہ مولانا عمید الزماں صاحب نسیان کے غیر معمولی مرض میں مبتلا ہو گئے ہیں، مجھے اس خبر سے ایک جھٹکا سا لگا، میں نے مولانا کا فون ملایا؛ لیکن کسی نے فون نہیں اُٹھایا، میری تشویش اور بڑھ گئی، میں نے اکیڈمی کے شعبۂ علمی کے رفیق مولانا امتیاز احمد قاسمی کو ساتھ لیا اور مولانا کے دولت خانہ پر جا پہنچا، حسبِ معمول بڑے تپاک سے ملے، تواضع بھی فرمائی؛ لیکن بہت کھوئے کھوئے، زندگی سے مایوس، اس احساس سے لبریز کہ وہ ملت کی خدمت نہیں کر سکے اور یہ کہ انھیں اور پہلے اس میدان میں آنا چاہئے تھا، تقریباً آدھا گھنٹہ مولانا سے بات چیت ہوئی اور اس میں کئی بار ان کی بھول کا تجربہ ہوا، اس وقت جو تسکین وتسلی کی بات کرنی چاہئے تھی، وہ کی گئی؛ لیکن میں بڑے بوجھل قدم اور اضطراب انگیز کیفیت کے ساتھ واپس آیا، پھر بھی اندازہ نہیں تھا کہ یہ

آخری ملاقات ہوگی؛ مگر حیدرآباد واپسی کے بعد ماہ ڈیڑھ ماہ کے اندر ہی وفات کی اطلاع آ گئی ،طبیعت پر بڑا تاثر رہا، ایسا لگا کہ ایک شفیق سایہ سر سے اُٹھ گیا، شاید ان کی زندگی میں مجھے ان سے اپنی محبت و تعلق کا اس درجہ احساس نہیں تھا، جو ان کی وفات کے بعد ہوا۔

مولانا اتر پردیش کی مردم خیز اور معروف سرزمین کیرانہ کے رہنے والے تھے، جہاں مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ اور مولانا نظام الدین کیرانویؒ جیسی شخصیتیں پیدا ہو چکی ہیں، خود مولانا کا خاندان ایک علمی و دینی خانوادہ رہا ہے، اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ مولانا حسین احمد صاحب تھے، جن کی شادی ''مظاہر حق'' (شرح مشکوٰۃ المصابیح) کے مؤلف نواب قطب الدین کی پرنواسی سے ہوئی تھی، مولانا حسین احمد کے صاحبزادے مولانا اسماعیل صاحب اوران کے صاحبزادے مولانا مسیح الزماں صاحب تھے، مولانا مسیح الزماں صاحب علامہ شبیر احمد عثمانی اور علامہ بلیاوی جیسے نادرۂ روزگار علماء کے ممتاز تلامذہ میں تھے اور انھوں نے جنگ آزادی میں بھی حصہ لیا تھا، ان کے پانچ صاحبزادے ہوئے، استاذ الاساتذہ مولانا وحید الزماں صاحبؒ سب سے بڑے اور مولانا عمید الزماں صاحبؒ تیسرے نمبر کے، مولانا نے ابتدائی تعلیم کیرانہ اور مدرسہ عالیہ فتح پوری (دہلی) میں حاصل کی، پھر ۱۹۵۸ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۶۳ء میں سند فراغت حاصل کی، اس دوران یوں تو آپ نے تمام ہی اساتذہ سے استفادہ کیا؛ لیکن خاص کر اپنے برادر بزرگ مولانا وحید الزماں کیرانویؒ سے خصوصی طور پر استفادہ کیا اور عربی زبان وادب کا وہ ملکہ حاصل کیا کہ واقعی انھیں اپنے بھائی کا خلف رشید کہا جا سکتا ہے، بظاہر اس وقت قوم وملت کو ان کی بڑی ضرورت تھی اور ایک طرح سے ملی میدان میں جدو جہد کا سفر ابھی انھوں نے شروع ہی کیا تھا؛ لیکن اللہ کے فیصلوں کی مصلحتوں سے اللہ ہی واقف ہیں کہ انھیں ایک ایسا سفر درپیش ہوگیا، جس سفر سے کسی کی واپسی نہیں ہوسکتی اور مؤرخہ ۲۴؍ستمبر ۲۰۱۰ء روز جمعہ کو ساڑھے دس بجے دن مولانا اپنے خالق حقیقی سے جا ملے اور اگلے دن 'مقبرہ قاسمی' دیوبند میں سپرد خاک کئے گئے۔

❁ ❁ ❁

مولانا سید ذوالفقار احمد حسینیؒ ❁

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہوں جسے ؟

دارالعلوم ماٹلی والا گجرات میں اسلامک فقہ اکیڈمی (انڈیا) کا ساتواں فقہی سیمینار ۱۹۹۵ء میں منعقد ہو رہا تھا، اس پروگرام کی نسبت سے پہلی بار اس حقیر کا گجرات کا سفر ہوا، سیمینار سے دو دنوں پہلے ہی وہاں پہنچنا ہوا اور علاقہ کے اہم مدارس کو جانے کا موقع ملا، انھیں درسگاہوں میں ایک ’ جامعہ فلاح دارین ترکیسر (گجرات) ‘ بھی ہے، یہاں جب حاضری ہوئی تو دو بزرگوں کو موجود پایا، ایک حضرت مولانا ابرار احمد صاحب دھولیویؒ، جو اس وقت جامعہ ہذا کے شیخ الحدیث تھے، افسوس کہ پچاس سال سے کچھ اوپر عمر میں ہی ان کی وفات ہوگئی، دوسرے بزرگ ان سے بھی زیادہ سیدھے سادھے، گفتگو میں محتاط، لب ولہجہ میں نرم، کھلا ہوا رنگ ؛ لیکن چہرہ پر چیچک کے نشانات اور ہاتھ میں تسبیح ، بڑی محبت وشفقت سے ملے اور چائے سے ضیافت فرمائی ، یہ تھے حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ اور یہ تھی ان سے پہلی ملاقات، اس ملاقات میں کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد جامعہ کے استاذ ادب مولانا محمد حبیب الرحمٰن ندوی حیدرآباد تشریف لائے اور جامعہ کے ذمہ داروں کی طرف سے مجھے فلاح دارین میں محاضرہ اور طلبہ کے سالانہ پروگرام کی صدارت کی دعوت دی، یہ حقیر حاضر ہوا ’’ جدید مسائل اور ان کا حل ‘‘ پر محاضرہ ہوا اور اگلے دن جامعہ کے پروگرام میں خطاب ، حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحب اس وقت جامعہ کے شیخ الحدیث تھے، وہ ان دونوں پروگراموں میں شریک رہے، مجھے خود ان کی اس خورد نوازی سے شرمندگی ہوتی تھی ؛ لیکن انھوں نے نہ صرف دونوں

❁ پیش لفظ کتاب ’’ درِّ یسیر ‘‘ تالیف: مولانا محمد جنید فلاحی۔

خطاب میں شروع سے آخر تک شرکت فرمائی ؛ بلکہ اخیر میں دُعاء کرانے سے پہلے بے حد محبت کے الفاظ بھی کہے، میرے لئے ان کا یہ مشفقانہ برتاؤ صرف مسرت ہی کا باعث نہیں تھا؛ بلکہ ایک سبق بھی تھا کہ بڑوں کو اپنے چھوٹوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ کرنا چاہئے ؟

مولانا نے غالباً اگلے ہی سال اپنے فرزند ارجمند مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ کو میرے پاس بھیجا ، میں اس وقت جس مدرسہ میں خدمت کرتا تھا ، وہاں وہ وقت داخلہ کا نہیں تھا اور میں خلاف ضابطہ کام سے حتی المقدور بچنے کی کوشش کرتا ہوں ؛ اس لئے میں بہت پریشان ہوا اور مولانا سے صورتحال عرض کی کہ اب داخلہ کا وقت نہیں رہا، مولانا نے فرمایا کہ میں نے اسے مدرسہ میں داخلہ کے لئے نہیں بھیجا، آپ کی صحبت میں رہنے کے لئے بھیجا ہے، اس لئے چاہتا ہوں کہ آپ کے ساتھ رہے ؛ چنانچہ عزیزی سلمہ بڑی سعادت مندی کے ساتھ چھ سات ماہ اس حقیر کے ساتھ رہے اور میں جو علمی کام ان کے حوالہ کرتا رہا، تندہی کے ساتھ اسے انجام دیتے رہے، ان کو تو شاید مجھ سے کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا؛ لیکن مجھے بڑا نفع یہ ہوا کہ ایک بزرگ یعنی ان کے والد ماجد کی شفقت و محبت اور بڑھ گئی اور حسن ظن میں بھی اضافہ ہوا، یہی ہمارے لئے بڑی متاع گرانمایہ ہے!

چنانچہ جب معہد کا قیام عمل میں آیا تو ہم نے اپنے کچھ بزرگوں کو دُعاء کے لئے خطوط لکھے، سیدی وسندی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بہ شمول اکثر اکابر علماء کے حوصلہ افزاء جوابات وصول ہوئے ، ان خطوط نے حوصلہ بڑھایا ، ان ہی میں ایک مکتوب حضرت مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ کا تھا، اس گرامی نامہ میں ایک ایسی بات تھی ، جس کو ایک بالغ نظر ، زمانہ شناس اور تجربہ کار شخص ہی لکھ سکتا تھا ، مولانا نے معہد کے قیام پر مسرت کا اظہار کرتے ہوئے جو کچھ لکھا، اس کا خلاصہ یہ تھا کہ :

> یہ بات بہت بہتر ہے کہ آپ نے اس کو اپنے زیر اہتمام قائم
> کیا ہے اور آئندہ بھی اس کو اپنے ہی زیر انتظام رکھیں ؛ تا کہ

اس ادارہ میں علم وتحقیق کے کام کی طرف اولین توجہ باقی رہے
اور تعمیرات وغیرہ کو مقصد نہ بنالیا جائے۔

مولانا کی اس بات نے میرے دل کا غبار دھو دیا؛ کیوں کہ میں اندر سے سخت تذبذب کا شکار تھا اور سوچتا تھا کہ کہیں انتظام وانصرام کی ذمہ داریاں مجھے علمی کاموں سے دور نہ کردیں اور اس ادارہ کا قیام فائدہ کی بجائے نقصان کا سبب نہ بن جائے، پھر معہد کے قیام کے بعد سے ہی مولانا 'فلاح دارین' کے ممتاز فضلاء کو معہد میں مزید کسبِ علم کا مشورہ دیا کرتے تھے؛ اسی لئے اب تک تقریباً ہر سال ہی معہد میں وہاں کے ایک دو فضلاء کا داخلہ ہوتا رہا ہے۔

۲۰۰۲ء میں جب اسلامک فقہ اکیڈمی کے بانی و ذمہ دار حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات کے بعد ایک نئے انتظامی ڈھانچہ کی تشکیل عمل میں آئی اور بزرگوں نے جنرل سکریٹری کی ذمہ داری اس حقیر سے متعلق کی تو اس وقت اکیڈمی کے خلاف غلط فہمیوں کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں اور گجرات کے بھی بہت سے علماء اس سے متاثر تھے؛ چنانچہ راقم الحروف نے ذمہ داری سنبھالنے کے بعد اکیڈمی کے صدر حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحبؒ اور نائب صدر حضرت مولانا محمد برہان الدین صاحب کی قیادت میں ایک وفد کے ساتھ دیوبند اور سہارنپور کا سفر کیا، پھر اکیڈمی کے رکن حضرت مولانا محمد احمد دیولوی (مہتمم جامعہ علوم القرآن جمبوسر) کے ساتھ پورے گجرات کا سفر ہوا، یہ اسفار اپنے مقصد کے اعتبار سے بڑے کامیاب رہے، اس سلسلہ میں راقم الحروف کی حاضری فلاح دارین ترکیسر میں بھی ہوئی، یہاں مولانا نے تمام اساتذہ کو جمع فرمایا، ان دنوں اتفاق سے مولانا محمد خلیل راوت صاحب بھی آئے ہوئے تھے، وہ بھی شریک رہے اور مجھ سے خطاب کرنے کی خواہش فرمائی، میں نے اکیڈمی کے قیام کا پس منظر، اکیڈمی کا طریقۂ کار اور اس کے فقہی سیمینار وغیرہ پر تفصیل سے گفتگو کی اور سوالات کے جواب بھی دیئے، مولانا نے پوری بات توجہ سے سماعت فرمائی اور پھر اس کی بھرپور تائید وتحسین بھی کی۔

مولانا کی شفقت، ان کے عوامی اثرات اوران کی انتظامی لیاقت کا ایک خوشگوار تجربہ اکیڈمی کے سولہویں سیمینار منعقدہ برہان پور میں ہوا، یہ سیمینار مولانا کی ریاست مدھیہ پردیش میں ہورہا تھا اوراس کی دعوت دینے والوں میں مجی فی اللہ مولانا محمد رحمت اللہ قاسمی اورعزیزی الاعز مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ پیش پیش تھے، یہ سیمینار اپنے حسن انتظام کے اعتبار سے گذشتہ سیمیناروں پر فائق تھا، جس میں مولانا کی سرپرستی اوران کے اثرات کا بڑا دخل تھا، اس موقع سے مولانا نے خطبۂ استقبالیہ بھی پیش فرمایا، یہ خطبہ نہ صرف علمی، تاریخی بلکہ ادبی حیثیت سے بھی ایک شاہکار تھا، جسے بے حد پسند کیا گیا اور ہر طرف سے تحسین وآفریں کی صدا بلند ہونے لگی، مولانا کے تدریسی کمالات کا علم تو پہلے سے تھا، اس موقع سے پہلی بار آپ کے بلند ادبی ذوق کا بھی اندازہ ہوا۔

مولانا سے آخری ملاقات اکیڈمی کے انیسویں فقہی سیمینار (منعقدہ: ۱۲-۱۵/فروری ۲۰۱۰ء) کی مناسبت سے ہونے والے سفر گجرات میں ہوئی، اس سفر میں یہ حقیر 'جامعہ تعلیم الدین (ڈابھیل)' سے ہوتے ہوئے 'فلاح دارین (ترکیسر)' پہنچا، حسن اتفاق کہ حضرت مولانا عبد اللہ کاپودروی بھی موجود تھے، حسب معمول حضرت مولانا ذوالفقار صاحب کی شفقت اور بے کراں خوردنوازی سے شرمندہ ہوتا رہا، بعد نماز مغرب جامعہ کی مسجد میں اس حقیر کا خطاب رکھا گیا، خطاب سے پہلے میرے تعارف کے لئے مولانا خود مائک پر تشریف لائے، میں نے عرض کیا کہ آپ اس کی زحمت نہ فرمائیں، جامعہ میں میرے بھی متعدد شاگرد ہیں، ان میں سے کسی سے تعارف کروادیں، اگر ضرورت محسوس کریں، مگر مولانا نے ایک نہ سنی اورفرمایا کہ میں خود تعارف کراؤں گا، پھر تعارف میں بھی بے حد حسن ظن کا اظہار فرمایا، میں نے اپنی تقریر شروع کرنے سے پہلے درخواست کی کہ آپ آرام کے لئے تشریف لے جائیں، مگر میری عزت افزائی کے لئے مولانا شروع سے آخر تک تقریباً دو گھنٹے بیٹھے رہے، واقعہ ہے کہ مولانا کے اندر خوردنوازی اور چھوٹوں کے

ساتھ شفقت کی جو کیفیت دیکھی، شاید اس درجہ کے کسی اور عالم میں نہیں دیکھی۔

مولانا کو اللہ تعالیٰ نے غیر معمولی تدریسی صلاحیت، سلیقۂ تربیت اور شفقت وحوصلہ افزائی کے وافر جذبہ سے نوازا تھا، اس کا اندازہ مجھے ان کے شاگردوں سے مل کر ہوا، اولاد کو اپنے والدین سے فطری محبت ہوتی ہے؛ اس لئے سعادت منداولاد بہر صورت اپنے ماں باپ کی تعریف کرتی ہے، مرید اپنے شیخ کو صرف عقیدت کی آنکھوں سے دیکھتا ہے، وہ تنقید کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر ہی اس کوچہ میں قدم رکھتا ہے؛ لیکن شاگرد کا معاملہ اپنے استاذ کے ساتھ یہ نہیں ہوتا؛ کیوں کہ آنکھیں بند کر کے علم وتحقیق کی وادیاں طے نہیں کی جاسکتیں؛ اسی لئے جب ایک شاگرد اپنے استاذ کا ثنا خواں ہوتا ہے تو اس میں کم ہی مبالغہ ہوتا ہے، مولانا کے شاگردوں کو میں نے ان کا نہایت مداح اور بے حد معترف پایا، وہ ان کی تدریس سے بھی متاثر تھے، تربیت سے بھی اور خاص طور پر ان کے حسن اخلاق اور حسن سلوک سے بھی؛ اس لئے میرے دل میں مولانا کے لئے بڑی محبت وعقیدت کا جذبہ تھا۔

وہ نجیب الطرفین سادات میں تھے، ایک متدین نیز دین اور علم دین سے محبت رکھنے والے گھرانے میں آنکھیں کھولیں، کم عمری میں والد، والدہ اور بہن کی شفقت سے محروم ہوگئے، اس شکستہ دلی اور بے سہارگی کے تجربہ نے انھیں شفقت ومحبت اور صبر وتحمل کا پیکر بنا دیا تھا، دیوبند سے تعلیم مکمل فرمائی، مولانا حسین احمد مدنیؒ سے انھیں نہ صرف تلمذ کا شرف حاصل تھا؛ بلکہ ان کی خصوصی شفقتیں بھی حاصل تھیں، وہ ۱۴؍دسمبر ۱۹۴۰ء کو نرور میں پیدا ہوئے، اور ۱۹۶۷ء میں دارالعلوم دیوبند سے فراغت حاصل کی، ابھی طالب علمی کا مرحلہ طے ہی ہوا تھا کہ دیوبند میں جامعہ فلاح دارین ترکیسر کی طرف سے پروانۂ تدریس آگیا اور مولانا عبداللہ کاپودروی کی نگاہ جوہر شناس نے آپکڑا، وہیں سے 'ترکیسر' کے لئے عازم سفر ہوئے، یہاں تک کہ ۴۳ سال اسلامی علوم کا درس دیتے ہوئے ۲؍اپریل ۲۰۱۰ء کو عالم بقاء کی طرف

رخصت ہوئے، اس دوران متوسطات سے لے کر بخاری شریف تک درس نظامی کی اکثر کتابوں کا درس دیا، بیرونی ممالک سے بھی مطالبہ آیا؛ مگر پائے استقامت میں کوئی لرزش پیدا نہ ہوئی، اس حقیر کو وفات کے بعد ایک گھنٹہ کے اندر ہی اطلاع مل گئی تھی اور علالت کی اطلاع پہلے سے تھی، ایسا رنج ہوا جو اپنے کسی بزرگ خاندان کی وفات پر ہوسکتا ہے، خاص کر صاحبزادۂ ارجمند عزیزی الاعز مفتی محمد جنید فلاحی — بارک اللہ فی حیاتہ وخدماتہ ونفع بہ المسلمین — کے خیال نے بے چین کر دیا اور فون پر مسلسل کوشش کے باوجود اس وقت ان سے ربط نہ ہوسکا۔

راقم الحروف اس حادثہ کے کچھ ہی عرصہ بعد برطانیہ کے سفر پر گیا، وہاں مولانا کے متعلقین ومستفیدین نے ایک خصوصی پروگرام مولانا کی شخصیت پر رکھا، جن میں سرفہرست مولانا بشیر احمد خان پوری (سابق نائب مہتمم جامعہ فلاح دارین) تھے، ان کے علاوہ مولانا کے بعض رفقاء اور اکثر تلامذہ شریک تھے، میں نے اپنے خطاب میں تجویز پیش کی کہ آپ حضرات مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین کا مجموعہ مرتب کریں اور مولانا کی تحریروں کو بھی یکجا کریں، دل میں بار بار داعیہ پیدا ہوتا رہا کہ کاش! مولانا کی حیات پر کوئی مختصر یا تفصیلی تحریر بروقت آجاتی، کہ اسی درمیان عزیز گرامی قدر مولانا محمد جنید فلاحی سلمہ کا مقالہ بلکہ رسالہ پہنچا، اس سے بڑی خوشی ہوئی اور ایک ہی مجلس میں پورا رسالہ پڑھ گیا، اب ایک سعادت سمجھ کر اس رسالہ پر یہ سطریں لکھ رہا ہوں، یہ رسالہ اپنے اختصار کے بعد صاحب تذکرہ کے حالات میں سے مؤلف کے حسن انتخاب کا مظہر ہے، اُمید ہے کہ وہ اس ''متن'' کی شرح بھی لکھیں گے اور اپنے والد ماجد پر تفصیل سے قلم اُٹھائیں گے، یہی توقع ان کی روحانی اولاد یعنی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ان کے بے شمار شاگردوں سے بھی ہے۔ واللہ ولی التوفیق ۔

واقعہ ہے کہ مولانا ذوالفقار احمد صاحبؒ نہایت کامیاب مدرس، مخلص مربی، شخصیت کی تعمیر میں مہارت کے حامل، بلند اخلاق، بلند نگاہ، محبت وشفقت کے پیکر، صاحبِ ذوق

اور صاحبِ قلم عالم دین، استاذ، داعی اور مربی تھے اور ان سے استفادہ کرنے والے طلبہ ان کے اندر باپ کی شفقت اور ماں کی ممتا کو اس طرح پاتے تھے کہ گھر کی جدائی کا احساس کم ہو جایا کرتا تھا؛ اس لئے ان کی پاکیزہ اور مثالی زندگی پر مرتب ہونے والی یہ تحریریں تو تمام ہی لوگوں کے لئے مفید ہے؛ لیکن خاص طور پر علماء اور دینی درسگاہوں کے لئے تو چشم کشا ہے، وہ اس آئینہ میں اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں، اور صاحب تذکرہ کی زندگی سے سبق حاصل کر سکتے ہیں کہ ایک کامیاب استاذ، مقبول معلم اور بافیض مربی کی زندگی کیسی ہونی چاہئے؟ دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحب تذکرہ کی طویل دینی و علمی خدمات کو قبول فرمائے اور نئی نسل کو ان کے نقش قدم پر چلنے کا حوصلہ بخشے۔ آمین

❁ ❁ ❁

مولانا عبدالحنان قاسمیؒ

صدیوں میں کہیں پیدا ، ہوتا ہے حریف اس کا !

میرے گاؤں ’’ جالے‘‘ ضلع دربھنگہ (بہار) میں مسلمانوں کی کثیر آبادی ہے اور میرے بچپن میں بھی اس قصبہ میں ایک درجن سے زیادہ مسجدیں تھیں، اب ان کی تعداد میں اوراضافہ ہوگیاہے، ان میں سب سے بڑی مسجد قاضی محلّہ کی جامع مسجد ہے، جو میرے مکان سے چند فرلانگ کے فاصلہ پر ہے، عام طور پر قصبہ میں جب کوئی اہم عالم آتے تو جمعہ میں خطبہ سے پہلے ان کا خطاب رکھا جاتا اور ان سے نماز پڑھوائی جاتی؛ چنانچہ بچپن کا دور تھا اور غالباً میں ناظرہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا کہ جب جمعہ میں گیا تو دیکھا کہ ایک مولانا صاحب تقریر کررہے ہیں، سر پر دوپلی مگر کافی اونچی ٹوپی ، ہاتھ میں عصا ، نصف پنڈلی تک صاف وشفاف جبہ، رنگ خاصا کھلا ہوا ، پیشانی پر سجدہ کا دوہرا نشان ، گھنی داڑھی ، نکلتا ہوا قد اور طرح دار آواز ، بے حد وجیہ اور عالمانہ وقار کے حامل ، ہلکی پھلکی زبان میں غالباً شادی کے رسم ورواج پر بڑے مؤثر انداز میں روشنی ڈال رہے تھے اور جہاں قرآنی آیات آتیں، ان کی لحن کے ساتھ تلاوت کرتے تھے، میں بہت متاثر ہوا اور میں نے گھر پر جا کر اپنی والدہ سے کہا کہ آج ایک بہت بڑے مولانا صاحب کی مسجد میں تقریر تھی ، بعد کو معلوم ہوا کہ یہ ہیں قریب کے ایک اور گاؤں بالا ساتھ کے مولانا عبدالحنان قاسمی ۔

یہ پہلا موقع تھا جب مولانا کو دیکھنے کا موقعہ ملا، ان کی سسرال میرے گاؤں کے ایک معزز خاندان میں تھی اور اس خاندان سے ہم لوگوں کے تعلقات ایک خاندان کی طرح تھے، مولانا ۳؍جنوری ۱۹۳۴ء کو اپنے آبائی گاؤں ’’ بالا ساتھ‘‘ ضلع سیتامڑھی (بہار) میں پیدا

ہوئے، ابتدائی تعلیم والد ماجد سے حاصل کی، فارسی اور عربی کی تعلیم متوسطات تک مدرسہ محمود العلوم ''دملہ'' مدھوبنی اور مدرسہ امدادیہ لہریا سرائے دربھنگہ میں، مدرسہ امدادیہ میں اس وقت مولانا عبدالرحیم صاحب استاذ تھے، جو دارالعلوم دیوبند کے فاضل اور مولانا محمود حسن صاحبؒ کے شاگرد تھے، نیز امام المعقولات والمنقولات کہے جاتے تھے، مولانا کو ان سے خصوصی تلمذ کا شرف حاصل رہا، پھر ۱۹۵۳ء میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوئے اور ۱۹۵۷ء میں دورۂ حدیث شریف سے فراغت حاصل کی، فراغت کے بعد پہلے مظفرنگر کے ایک قصبہ میں تدریسی خدمت انجام دی اور یہاں بریلوی حضرات اور روافض کا جم کر مقابلہ کیا، اسی نسبت سے کئی بار عدالت میں بھی پیش ہونا پڑا، پھر آپ کے استاذ خاص مولانا فخر الحسن صاحبؒ کی خواہش پر مرادآباد کے ایک قصبہ میں دو سال تدریس کی خدمت انجام دی، پھر حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کی دعوت پر امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ کے شعبۂ تبلیغ سے وابستہ ہوئے، اس کے بعد ریاست گجرات کا رُخ کیا اور دارالعلوم چھاپی ضلع بناس کانٹھا (گجرات) میں ۱۹۶۲ء سے ۱۹۷۳ء تک بارہ سال تدریس کی خدمت انجام دی، تفسیر، حدیث اور فقہ کی منتہی کتابوں کا درس دیا دسمبر ۱۹۷۳ء میں جامعہ اسلامیہ ماٹلی والا بھروچ تشریف لائے اور حدیث کی اعلیٰ کتابیں آپ سے متعلق ہوئیں، ماٹلی والا میں آپ نے نہ صرف تدریس کی خدمت انجام دی؛ بلکہ پورے علاقہ میں زبردست دعوتی و اصلاحی خدمت بھی انجام دی اور ایک مقبول خطیب و داعی کی حیثیت سے ریاست گجرات میں خصوصاً اور ملک کے دوسرے علاقوں میں عموماً شہرت حاصل کی۔

انھیں اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے بے حد عقیدت تھی، حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا محمد زکریاؒ صاحب کاندھلویؒ اور مولانا ابرار الحق صاحب ہردوئیؒ سے اصلاحی تعلق رہا، خود ان کے والد ماجد جناب حسن توحید صاحب مرحوم بڑے دین دار اور عالم دوست بزرگ تھے، شاید ان ہی نسبتوں کا اثر تھا کہ مولانا سفر و حضر ہر جگہ تہجد اور نماز پنج گانہ میں تکبیر اولیٰ کا اہتمام کرتے تھے، کثرت سے تلاوت کا معمول تھا اور خوب ذکر کیا کرتے تھے، ان کے اصلاحی

اوردعوتی کاموں کی وجہ سے بیرونِ ملک میں بھی انھیں قبولیت حاصل تھی ، انھوں نے ایشیاء، یورپ ، افریقہ اور امریکہ کے مختلف ممالک کے اسفار کئے اور برطانیہ تو عرصہ سے ہر سال جانے کا معمول تھا، ان اسفار کے ساتھ متعدد بار حج وعمرہ کا سفر سعادت بھی فرمایا، ان کا اصل جوہر تو خطاب میں کھلتا تھا؛ لیکن تصنیف وتالیف کے کام سے بھی بے تعلق نہیں تھے؛ چنانچہ چھوٹی بڑی آٹھ کتابیں —— ہماری شادی ، قیام میلادی ، والدین کی شان ، افضل الکلام ، میراث المومنین وغیرہ —— شائع ہو چکی ہیں، آپ کی تقریر ہو یا تحریر، اس کا بنیادی موضوع رد بدعت اوراصلاحِ معاشرہ ہوا کرتا تھا۔

مولانا کی بعض خصوصیات وہ تھیں، جو انھیں معاصر اہل علم سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں ایک ان کا تواضع ہے، وہ بے حد منکسر المزاج ،ملنسار، ہر امیر وغریب کے ساتھ محبت سے ملنے والے اور ہر آنے والے کا خندہ پیشانی کے ساتھ استقبال کرنے والے تھے، یہی وجہ ہے کہ وہ عوام وخواص، علماء اور جدید تعلیم یافتہ ــ ـوں میں مقبول تھے، ان کی مقبولیت کا حال یہ تھا کہ ایک مرحلہ پر جب ’جمعیۃ علماء گجرات‘ میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا، تو باوجودیکہ وہ گجرات کے اصل متوطن نہیں تھے، ان کی صدارت پر لوگ متفق ہو گئے اور ایک پوری میقات انھوں نے حسن وخوبی کے ساتھ صدارت کے فرائض انجام دیئے۔

مولانا کا دوسرا نمایاں وصف اپنے مسلک کے سلسلہ میں تصلب تھا، ان کے علاقہ میں بریلویت کا بڑا غلبہ تھا، خاص کر ان کے گاؤں سے متصل ایک گاؤں ’’پوکھریرا‘‘ پورے علاقہ میں بریلوی مکتبِ فکر کی قیادت کرتا رہا ہے، مولانا نے حکمت اور جرأت کے ساتھ اس صورتِ حال کا مقابلہ کیا، یہاں تک کہ اس کے لئے جان کا جوکھم بھی مول لیا، اس کے نتیجے میں اب ’’بالا ساتھ‘‘ اور اس کے مضافات کے بہت سے علاقے بدعت اور مشرکانہ رسوم سے محفوظ ہو گئے اور علماء حق کو سربلندی حاصل ہوئی۔

مولانا کا سب سے بڑا کارنامہ ’’جامعہ اسلامیہ قاسمیہ بالا ساتھ‘‘ کا قیام ہے، جو نہایت کسمپرسی میں قائم ہوا اور مولانا کے اخلاص، جذبہ دروں اور سعی مسلسل کے باعث اس وقت ایک خوبصورت وسیع وعریض کیمپس میں تبدیل ہو چکا ہے، اور جنگل میں منگل یا دیہات میں شہر کا منظر پیش کرتا ہے، جہاں ابتدائی دینی تعلیم کا نظم بھی نہیں تھا اور رمضان المبارک میں تراویح کے لئے حفاظ فراہم نہیں ہوتے تھے، اب وہاں بہترین باتجوید قرآن مجید سنانے والے حافظوں کی ایک بڑی تعداد موجود ہے اور دورۂ حدیث شریف تک تعلیم ہو رہی ہے، اس جامعہ کا ایک بڑا کارنامہ پورے علاقہ میں؛ بلکہ دور دراز تک مکاتب کا قیام ہے، تعلیمی اعتبار سے پسماندہ اور معاشی اعتبار سے نہایت کمزور اس علاقہ میں اس وقت درجنوں مکاتب قائم ہیں اور کتنے ہی دیہاتوں میں اس جامعہ کی وساطت سے مسجدیں تعمیر ہو چکی ہیں، واقعہ ہے کہ یہ جامعہ اور اس کے تحت مکاتب کا قیام کام نہیں، کارنامہ ہیں اور یہ یقینی مولانا کے لئے بہترین صدقہ جاریہ ہے۔

مولانا کا ایک اہم وصف ان کا داعیانہ کردار تھا، وہ ایک مقبول خطیب ہونے کے باوجود یہ نہ دیکھتے کہ کس نے دعوت دی ہے اور کس نے نہیں دی ہے؛ بلکہ جہاں ضرورت ہوتی از خود پہنچ جاتے اور کوئی معمولی سے معمولی شخص یا گم نام سے گم نام ادارہ بھی دعوت دیتا فوراً قبول کر لیتے تھے، اس میں ہرگز اپنے وقار کے احساس کو رکاوٹ نہ ہونے دیتے، ایک بار میں ان کے دولت خانہ پر ملاقات کے لئے پہنچا ہوا تھا، بہت سے دیہاتوں سے لوگ مکاتب کے قیام کے لئے درخواستیں لے کر آئے ہوئے تھے، مگر اس سال مزید مکاتب کا قیام جامعہ کے بجٹ کے لحاظ سے ممکن نہ تھا، اس لئے مولانا نرمی اور محبت سے سمجھا سمجھا کر معذرت کر رہے تھے اور آئندہ کوشش کرنے کا وعدہ بھی، اسی درمیان ایک ایسے گاؤں کے صاحب نے اپنی درخواست بڑھائی، جہاں مسلمانوں کی آبادی بہت کم ہے، درخواست میں لکھا تھا کہ وہاں ہندو بھائیوں کی پوجا کے موقعہ پر سولہ بکرے چڑھائے گئے، جن میں دو ہندوؤں نے اور چودہ

مسلمانوں نے چڑھائے، مولانا درخواست پڑھ کر تڑپ گئے، مجھ سے بھی پڑھوایا اور پھر باوجود مالی دشواری کے وہاں کے لئے مکتب منظور فرمایا۔

مولانا کا قابل تقلید وصف وقت اور عہد کی پابندی تھی، وہ جہاں جانے کا وعدہ کر لیتے وہاں ضرور جاتے اور وقت پر پہنچتے، بعض اوقات سخت بیماری میں بھی وعدہ شکنی نہ ہوتی، اس حقیر نے اپنے آبائی گاؤں ''جالے'' میں لڑکوں کے لئے مدرسہ ''دارالعلوم سبیل الفلاح'' اور لڑکیوں کے لئے ''مدرسۃ الفالحات'' کی بنیاد رکھی ہے، ان اداروں کے جلسوں میں ہمیشہ ان کو دعوت دی جاتی؛ بلکہ ان ہی کی صدارت میں جلسہ ہوتا، ایک بار رات میں جلسہ تھا، اور شوگر کے بڑھے ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت نڈھال تھی؛ لیکن مولانا تیار تھے کہ اگر اخیر میں خطاب کرنا پڑے تو اخیر میں ہی خطاب کریں گے، آخر مولانا کی کیفیت کو دیکھتے ہوئے اس حقیر نے ایک دو مقرر کے بعد مولانا کا صدارتی خطاب کرا دیا اور اسی وقت اپنے گاؤں تشریف لے گئے۔

انھیں علماء دیوبند سے عشق تھا، مولانا حسین احمد مدنیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ، مولانا فخر الدین احمد صاحبؒ، مولانا فخر الحسن صاحبؒ، مولانا بشیر احمد خان صاحبؒ، مولانا محمد حسین بہاریؒ، مولانا محمد معراج الحق صاحبؒ، مولانا نصیر احمد خان صاحبؒ اور مولانا محمد نعیم صاحبؒ ان کے اساتذہ تھے، اس سے پہلے بہار کے مقامی مدارس میں بھی انھوں نے دیوبند کے ممتاز علماء سے استفادہ کیا تھا، ان کے علاوہ اپنی طبع سلیم کی وجہ سے بدعت سے خاص طور پر متنفر تھے، یہ سب وہ محرکات تھے جنھوں نے اپنے بزرگوں سے ان کی محبت کو دو آتشہ کر دیا تھا، بے حد محبت کے ساتھ ان کا ذکر کرتے، نجی مجلس ہو یا بڑے جلسے ہوں، ان کی گفتگو میں اپنے اساتذہ اور بزرگوں کا ذکر ضرور آتا تھا، پھر جامعہ قاسمیہ کے قیام کے بعد انھوں نے اپنے یہاں دیوبند کے اکثر بزرگوں کو دعوت دی اور یہ ان کے خلوص کی برکت تھی کہ راستہ کے نہایت ناہموار ہونے، نیز بالا ساتھ شہر کے کافی دوری پر واقع ہونے کے باوجود اکابر علماء یہاں تشریف لائے اور قرب وجوار کے لوگوں کو ان سے استفادہ کا موقع ملا۔

حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی فراغت اگرچہ ان سے چندسال پہلے کی تھی ؛ لیکن دونوں زمانہ درس کے اعتبار سے ہم عصر اور ہم درسگاہ تھے ، اس لئے بڑی بے تکلفی تھی اور سسرال کی طرف سے خاندانی تعلقات اس کے علاوہ ؛ اس لئے مولانا جب بھی '' جالے'' تشریف لاتے اگر قاضی صاحبؒ یا میرے والد ماجد مولانا زین العابدین صاحبؒ یا میرے پھوپھا مولوی وجیہ احمد صاحبؒ (جو اپنے ورع وتقویٰ میں ایک ممتاز شخصیت تھے) موجود ہوتے تو ضرور میرے غریب خانہ پر بھی تشریف لاتے ، اس لئے بچپن ہی سے مولانا سے خصوصی تعلق تھا۔

جب میں دارالعلوم سبیل السلام میں تھا تو وہاں ، ایک موقعہ پر افتتاحِ بخاری شریف کے لئے میری تحریک پر مولانا مجاہدالاسلام صاحبؒ کے ساتھ ساتھ مولانا کو بھی مدعو کیا گیا، اسی موقع سے مدرسہ کی موجودہ درسگاہ کی بلڈنگ کی بنیاد رکھی گئی ،مولانا نے بڑے الحاح کے ساتھ اس کی دُعاء کی اور مزاحاً مجھ سے کہا کہ میں جس عمارت کی بنیاد رکھتا ہوں ، وہ جلد تعمیر ہو جاتی ہے ؛ چنانچہ واقعتاً ایسا ہی ہوا اور کم وقت میں یہ تعمیر مکمل ہوگئی ، اس موقع سے ان کا خطاب پسند کیا گیا ، شہر میں بھی اصلاحِ معاشرہ کے موضوع پر کئی خطابات ہوئے اور مولانا کی اصلاحی باتوں کو لوگوں نے توجہ سے سنا۔

مولانا نے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا ساتواں فقہی سیمینار (۱۹۹۴ء) دارالعلوم ماٹلی والا بھروچ میں کرایا ، اس میں مولانا اور مولانا مفتی احمد دیولوی صاحب کی خصوصی کوششیں شامل تھیں ، اس سلسلہ میں جمعیۃ علماء ہند کے ایک حلقہ کی طرف سے شدید مخالفت ہوئی ؛ لیکن یہ مولانا کی استقامت کی بات تھی کہ وہ اپنی رائے پر جمے رہے اور اس سلسلہ میں آئندہ سامنے آنے والے امکانی خطرات کو بھی نظر انداز کر دیا ، مولانا کے اخلاق اور ان کی تعلیمی دعوتی خدمات کی وجہ سے مجھے ان سے بے حد محبت تھی ، اسی لئے '' جالے'' میں کوئی جلسہ ان کی تشریف آوری کے بغیر نہیں ہوتا تھا ، جالے میں سسرال ہونے کی وجہ سے میں ان سے کسی قدر ہنسی مذاق بھی کرتا تھا اور چٹکیاں بھی لیتا رہتا تھا ، وہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن بھی منتخب

ہوگئے تھے، اس نسبت سے مختلف شہروں میں ملاقات ہوتی رہتی تھی؛ بلکہ ایک بار مونگیر سے ''جالے'' تک کا سفر ساتھ ساتھ ہوا، وہ مہمان نوازی میں بڑے فراخ دل واقع ہوئے تھے اورمہمان کا اکرام کر کے بے حد خوش ہوتے تھے۔

مؤرخہ ۱۷ر جمادی الاولیٰ ۱۴۳۰ھ مطابق ۱۳ر مئی ۲۰۰۹ء کو کچھ عرصہ کی علالت کے بعد ان کی وفات ہوگئی، سنا کہ اس عاشق دین کے جنازہ کو بڑی دھوم سے اُٹھایا گیا اور ایک جم غفیر اس میں شریک رہا، یوں تو بہار ایک مردم خیز ریاست ہے اور پورے ہندوستان بلکہ بیرونِ ہند میں بھی اس کے کواکب وانجم بکھرے ہوئے ہیں؛ لیکن افسوس کہ خود اپنے علاقہ کو ان سے کوئی بڑا فائدہ نہیں پہنچتا، مگر مولانا نے اپنے علاقہ کی بھی ناقابل فراموش خدمت انجام دی اور اسے اپنی علمی اور اصلاحی فیضان سے مال مال کیا ہے، مقامِ مسرت ہے کہ انھوں نے ''جامعہ قاسمیہ'' کو اس مقام پر پہنچا دیا، اور ایسے افراد تیار کردیئے کہ انشاءاللہ یہ گلشن آئندہ بھی پھلتا پھولتا رہے گا، بالخصوص صاحبزادہ گرامی عزیزی مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سلمہ جو ایک متحرک، فعال اور حوصلہ مند نوجوان فاضل ہیں اور جنھیں مولانا کی زیرنگرانی جامعہ کے انتظام وانصرام کی بھرپور تربیت حاصل ہوچکی ہے، انشاءاللہ وہ اس کی خدمات میں تسلسل کو باقی رکھیں گے ـــــ اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی علمی وروحانی یادگاروں کو قائم رکھے۔ آمین

❁ ❁ ❁

جناب حاجی محمد شفیع پھلواروی ؒ

پریم جس کی زندگی ، خلوص جس کا پیرہن

قد لانبا، رنگ سفید، جسے بیماری نے زرد کردیا ہے، پیشانی کشادہ، ناک کھڑی، آنکھیں بڑی؛ مگر بڑھاپے کے نشتر سے نڈھال اور دھنسی ہوئی، روشن چہرہ، اس پر سفید اور گھنی ریش، سینہ چوڑا جس کا ظاہر خوب اور باطن خوب تر، کھدر کا سفید کرتا اور کپڑے کی اسی ''جنس عزت یاب'' کا پاجامہ (عزت یاب اس لئے کہ ہندوستانی قائدین کا آبائی یونیفارم یہی ہے) دوپلی ٹوپی، ہاتھ میں عصا، آنکھ پر ایک موٹا چشمہ، جسے وقت کے تیشے اکثر مجروح رکھتے ہیں، غم روزگار اور یاد ماضی کے زخم خوردہ، مرض اور بوڑھاپے کی ناتوانی سے چور، حالات وانقلابات سے رنجور، —— اس قد وقامت اور رنگ وروپ کو قرطاسِ ذہن پر جما لیجئے اور اس پر لکھ دیجئے ''حضرت شفیع پھلواروی ؒ''۔

لوگ قبروں پر پھول نثار کرنے کے عادی ہیں، شاید سوانح نگاری کے ''ضرورت سے زیادہ شائق'' آرزومند رہتے ہیں کہ جسم سے روح نکلے تو قلم میں روح ڈالی جائے، مگر بعض ''زندہ'' بھی اپنا حق منوا کر چھوڑتے ہیں اور ان کی صلاحتیں مجبور کردیتی ہیں کہ ان پر کچھ نہ لکھنا ناانصافی ہے، ضمیر کی اسی آواز اور دوسالہ رفاقت کے اسی تجربہ نے قلم کو راہ دیکھائی ہے۔

افسوس کہ شفیع صاحب کے ساتھ حالات نے وفا نہیں کیا اور زمانہ نے ان کے دل پر اتنے نشتر لگائے کہ کوئی اور ہوتا تو شاید ہی تاب لاسکتا، وہ بہت زکی ہیں، طباع ہیں، غضب کے فریس اور معاملہ فہم ہیں، بلا کا حافظہ ہے، بڑوں کے قدموں میں بیٹھے ہیں، بزرگوں کی گود میں کھیلنے کا موقعہ ملا ہے، مولانا سجاد سے دردمندی سیکھی ہے، مولانا شاہ محی الدین کی صحبت سے ارجمندی کا

درس لیا ہے، مولانا قاضی نورالحسن صاحب کے علمی عظمت وجلال نے روشنی دکھائی ہے، انھوں نے ہندوستان کا وہ موسم پایا ہے، جو بڑے بڑے علماء کی نکہت علم سے عطر بار اور بلند پایہ مفکرین کے نور بصیرت سے ضیا بار تھا، ان کے تجربات میں بحر ظلمات کا سکوت آمیز عمق ہے، ان کا مطالعہ وسیع ہے اور ان سب سے سوا ان کی خداداد ذکاوت وفراست ہے، دماغ اخاذ ہے، زبان صاف ستھری ہے، بول میٹھے ہیں، گفتگو میں روانی ہے، مزاج میں ظرافت ہے، لطائف کے گویا بادشاہ ہیں، برجستہ اشعار کا استعمال اور موزوں اور بروقت مصرعوں کی تخلیق میں بڑا درک حاصل ہے، حاضر جوابی میں طاق، بوڑھاپے اور زندگی کے نشیب وفراز نے مزاج میں ایک گونہ تندی پیدا کردی ہے اور تندی بحث وتمحیص کے دوران بسا اوقات ''تند'' ہوجاتی ہے، مگر یہ ان کی عمر وحالات کا تقاضہ ہے اور ایسی ساعتوں کا درجہ ان کے شب وروز میں بہرحال ''اتفاقات'' ہی کا ہے، مزاج میں ''ذکاوت حس'' بھی کچھ زیادہ ہی ہے، زودرنج بھی ہیں اور زودخوش بھی، سیاسی بصیرت بھی ہے اور ملکی نشیب وفراز سے واقفیت بھی، اکابر اور اصاغر میں جن کے مداح ہیں تو خوب ہیں اور جن سے اختلاف رکھتے ہیں تو وہ بھی کم نہیں، مگر اعتقاد بھی مخلصانہ اور اختلاف بھی خدا پرستانہ۔

وہ ایک تاریخ ہیں، انھوں نے جنگ آزادی بچشم سر دیکھی ہے، اور اس وقت کی سیاسی کشتیوں میں ایک حد تک خود بھی دلچسپی لی ہے، انھوں نے مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا آزاد سبحانیؒ اور مفتی کفایت اللہ صاحبانؒ جیسی نادرہ روزگار شخصیتوں کو دیکھا ہے، ان کی مجلسوں میں بیٹھے ہیں، محمد علی جناح کی تحریک پاکستان کے خلاف کام کیا ہے، بہار کے الیکشن ۱۹۳۷ء میں مسلم انڈی پینڈنٹ پارٹی کو کامیاب کرنے میں انتھک سعی کی ہے اور کامیاب ہوئے ہیں، افسوس کہ ہمارے ''آزاد دیش'' نے اپنے دامن کے ایسے گوہروں کو بھلا رکھا ہے۔

انیسویں صدی کی پہلی چوتھائی میں جو مسلم تحریکیں اٹھی ہیں، یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ بہار کے مرد خاموش، جن کے دل کو قدرت نے پاروں کی سیمابی اور پروانوں کا جنون دیا تھا—— مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحبؒ ——اس کے دل ودماغ تھے، انھوں نے اپنی کاوشوں کو اخلاص کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھا دیا اور اپنی مجاہدانہ خدمات کو خود اپنے قلم ایثار سے چن چن کر تاریخ

کے آئینہ شہرت و ناموری سے مٹاتے رہے، شفیع صاحبؒ کی بڑی سعادت اور خوش بختی تھی کہ قدرت نے ان کو ابوالمحاسن کے سایۂ حسنات میں جینے کا موقعہ دیا، وہ ان کے ساتھ رہے، باپ بیٹے کی طرح رہے، بے تکلف رہے، اس شان سے رہے کہ گویا آنکھوں کی ٹھنڈک ہیں اور خوشی وغم کے لمحات ان کے ساتھ گذارے، اس تعلق نے ان کو ایثار کا سبق سکھایا اور مکتب عشق کی پروانگی کا درس دیا۔

اگر کوئی شخص مجھ سے پوچھے کہ شفیع صاحب نے جن اکابر کو دیکھا، ان میں سب سے زیادہ کس کے معتقد تھے؟ تو شاید مبالغہ نہ ہوگا اگر میں مولانا سجاد صاحبؒ کا نام لوں، وہ مولانا سجادؒ کی زندگی پر ایک بہترین کتاب ہیں، ان کے ذاتی حالات اور اخلاق وعادات معلوم کرنے کے لئے ان سے بہترین ذریعہ میرے علم میں نہیں ہے، وہ جب مولانا کا ذکر کرتے ہیں تو الفاظ خود زبان پر آتے ہیں؛ بلکہ امڈتے ہیں، ایک کے بعد دوسرے واقعہ کا سلسلہ لگ جاتا ہے اور لگتا ہے کہ وہ یادوں کے ایک ایک زخم کو کرید کر اپنے کلیجہ کا لہو نچوڑ رہے ہیں۔

مولانا سجادؒ کے بعد ان کو جن بزرگوں کا سب سے زیادہ ثنا خواں پایا، ان میں مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے، وہ ان دونوں حضرات کی عزیمت و استقلال اور اخلاص کے بہت ہی مداح ہیں، میرے خیال میں مولانا آزادؒ سے عقیدت کے معاملے میں وہ ایک گونہ خوش اعتقاد بھی ہیں، انھوں نے ان حضرات کی مجاہدانہ حرارتوں اور قائدانہ صداقتوں کو ملاحظہ کیا ہے، اس لئے یہ انمول صورتیں ان کی نگاہوں میں اس طرح پیوست ہیں کہ مشکل ہی سے کوئی معاصر ان کی نگاہ میں جمتا ہے اور جس نے مولانا سجادؒ کا سوز دروں، مولانا حسین احمدؒ کی جرأت وبیباکی اور مولانا آزادؒ کی چہک اور خوشنوائی کو چشم سر سے دیکھا ہو، اس میں اس خیال کا پیدا ہو جانا شاید بے جا بھی نہ ہو۔

دوسری طرف ان کو اکثر جن پر نقد کرتے ہوئے پایا، ان میں محمد علی جناح اور اقبال خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ حضرات اس فکر سے وابستہ نہ تھے،

جس سے ہمارے شفیع صاحب اوران کے اکابر کا تعلق تھا وہ اقبال کے اشعار پرفنی اعتراضات بھی کرتے ہیں اور غالباً ان کو اس کا حق بھی حاصل ہے، وہ اقبال کی فکر وفلسفہ کو بھی نشانہ بناتے ہیں، جو یکسر بے جا بھی نہیں ہے اور بالکل بجا بھی نہیں۔

ان کا بیعت وارادت کا تعلق خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف سے ہے، جو بہار کی قدیم خانقاہوں میں ہے اور جہاں علم وعمل کے بہت سے گوہر مدفون ہیں، اسی خانقاہ کے سجادہ نشیں اور بہار واُڑیسہ کے دوسرے امیر شریعت مولانا سید شاہ محی الدین قادری سے بیعت ہوئے، شاہ صاحب صرف صوفی ہی نہیں تھے، مجاہد بھی تھے اور مولانا سجاد کے گویا عاشق تھے، شفیع صاحب کا اب بھی اس خانقاہ کے موجودہ سجادہ نشیں مولانا سید شاہ امان اللہ صاحب قادریؒ اور دوسرے اکابر سے ربط ہے، اس طرح بہار کی دوسری اہم اور ذی اثر خانقاہ، خانقاہ رحمانی سے بھی قدیم تعلق ہے، مولانا سید شاہ محمد علی مونگیریؒ کی زیارت کا شرف حاصل ہے اور موجودہ امیر شریعت مولانا سید شاہ منت اللہ رحمانی سے بھی عقیدت مندانہ تعلق ہے۔

امارت شرعیہ بہار واڑیسہ سے ان کا ربط بہت قدیم ہے؛ بلکہ کہنا چاہئے کہ موجودہ لوگوں میں سب سے قدیم ہے، انھوں نے امارت میں اس وقت سے کام شروع کیا، جب امارت چٹائیوں اور بوریوں پر تھی، امارت کا ابتدائی دور بہت صبر آزما تھا، آمدنی نہیں کے برابر تھی، اخراجات زیادہ تھے، کام بہت تھا، کارکن کم تھے اور فائلوں کی خانہ پری سے زیادہ دوڑ دھوپ کا کام تھا، اسلام معاند فتنے اُٹھ رہے تھے، ارتداد کی وبا پھیل رہی تھی، مسلم کُش فسادات ہو رہے تھے، نئی نئی تحریکیں جنم لے رہی تھیں، فرقہ وارانہ تناؤ اپنے شباب پر تھا، امارت کے رضا کاروں کو اس آتش کدہ میں اتر کر کام کرنا پڑتا تھا، مولانا سجاد صاحبؒ نے اپنے کاروان شوق کے دل میں جو بھٹی سلگائی تھی، محض اس کی حرارت تھی کہ لوگ اس خدمت کو انجام دے رہے تھے، شفیع صاحبؒ بھی انھیں مردان حق آگاہ میں تھے اور کسی سے کم نہ تھے، انھوں نے اپنی دوکان لٹادی اور دین کی خدمت میں ہمہ تن مصروف رہے، اب وہ اسی قافلۂ شوق کو روتے ہیں۔

مولانا قاضی نور الحسن صاحب کی صحبت، علم کی لگن اور محنت وجستجو نے ان کو قضاء وفصل خصومات کے کام کا سلیقہ دیا ہے، انھوں نے عربی نہیں پڑھی ہے اور کسی مدرس کے سامنے باضابطہ زانوئے تلمذ تہہ نہیں کیا ہے؛ مگر درمختار اور شامی کے ایسے بہت سے حوالے ان کے حافظہ میں ہیں، جو ان کے مقصد میں مفید ہیں یا فیصلہ میں جن کا حوالہ دینا پڑتا ہے، جرح وقدح میں بڑی مہارت ہے، جھوٹے وکلاء اور گواہ ان کے سامنے ٹِک نہیں سکتے، فیصلہ مفصل لکھتے ہیں، مدلل لکھتے ہیں، مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ مدظلہ، قاضی القضاۃ امارت شرعیہ بہار واُڑیسہ کے بعد دار القضاء کے مسائل، اس کی فقہی حیثیت اور اس سلسلہ میں اُٹھنے والے اشکالات پر شفیع صاحبؒ سے زیادہ تشفی بخش گفتگو شاید ہی کوئی اور صاحب کرسکیں۔

امارت شرعیہ کے دار القضاء کے لئے ان کی ذات آج بھی بہت اہم ہیں؛ لیکن دار القضاء میں ایک ایسا دور بھی گذرا ہے، جب وہی اس کی آبرو اور ریڑھ کی ہڈی تھے، ان کے نوشتہ فیصلوں کی بڑی تعداد ہے، گو باضابطہ قاضی نہ ہونے کی وجہ سے ان پر ان کا دستخط نہیں ہے، انھوں نے فیصلہ نویسوں کی تربیت کا بھی اہم کام دیا ہے، اس عاجز نے بھی تربیتِ قضاء حقیقت میں ان ہی سے پائی ہے، **فجزاہ اللہ خیر الجزاء**۔

یہ خوبیاں تو شفیع صاحبؒ کے اندر اکتسابی اور محنت سے حاصل کی ہوئی ہیں؛ مگر ان کا وہبی کمال شعر وسخن کا ذوق ہے، وہ سخن فہم وسخن داں بھی ہیں اور سخن سنج وسخنور بھی، وہ شاعر بنے نہیں ہیں؛ پیدا ہوئے ہیں، شعر گوئی گویا ان کی فطرت میں ہے، وہ زود گو بھی ہیں پُرگو بھی، سلیس اور رواں اشعار کہتے ہیں، ان کے یہاں الفاظ کا شکوہ بھی ہے اور معانی کے لعل وگہر بھی، وہ صرف خوبصورت الفاظ کی کھوکھلی دیوار تعمیر نہیں کرتے اور معانی کو ان الفاظ کے لباس سے عاری بھی نہیں رکھتے؛ اس لئے کہ ان کا خیال ہے کہ :

سماعت پر اثر صوت لسانی کا نہیں ہوتا
جو باہم ربط الفاظ و معانی کا نہیں ہوتا

وہ غزل بھی کہتے ہیں؛ مگر اشعار کو برہنہ نہیں کرتے اور جانِ غزل کے لب ورخسار

اور عارض وگیسو سے برسر عام نہیں کھیلتے محبوبوں سے شاعروں کا شکوہ بہت پرانا ہے، شاید ہی کسی پر شعر کہنے کی تہمت لگی ہو اور اس نے اس ''شکوۂ عزیز'' سے اپنی زبان تر نہیں کی ہو، شفیع صاحب بھی اپنی برادری سے کہاں کٹ سکتے تھے، مگر ذرا لب ولہجہ کی متانت اور حجاب تو دیکھئے، کہتے ہیں :

ہے تجاہل عارفانہ اور وہ بے التفات
سب خبر رکھتے ہوئے بھی کچھ خبر ہوتی نہیں

اب ''ہجر یار'' کا مرحلہ درپیش ہے، یہاں محبوب کو بے پردہ کرنا ضروری سمجھا جاتا ہے، اگر اب بھی چشم وابرو کا تذکرہ نہ ہو، تو بات کب بنتی ہے: مگر یہاں بھی دیکھئے کیسا کافر شعر کہا ہے، سہل ممتنع بھی، مختصر بھی، پُر معنی بھی اور ہزار پردوں میں چھپا ہوا، ''فراق وہجر'' کا نام 'غم کی کہانی' ہے فرماتے ہیں :

طولِ ہے غم کی کہانی ، مختصر ہوتی نہیں
شام آئی ہے تو آئی ہے سحر ہوتی نہیں

عشق کی معراج ''بے خودی'' ہے اس بے خودی کے مضمون کو بہتوں نے باندھا ہے، فارسی میں بھی، عربی میں بھی اور اُردو میں بھی، کہیں بے چینی کا ذکر کہیں اضطراب کا، کہیں بے قراری کا، کہیں آنکھیں نم، حزن وغم اور کہیں زیر وبم، مگر ہمارے شاعر کی بے خودی اور پرستاری دیکھئے کہ :

جیسے جیسے ہوتا جاتا ہے کوئی دل کے قریب
دل کہاں ہوتا ہے خود دل کو خبر ہوتی نہیں

الفاظ کی ابوالکلامیت بھی ان کے ہاں کچھ کم نہیں ہے، جب وہ عقیدت کے پھول نثار کرتے ہیں تو ان کا یہ رنگ اور بھی نکھر جاتا ہے، جی چاہے تو مولانا سجادؒ پر آپ کی نظم پڑھئے، بار بار پڑھئے اور سر دھنئے :

عزم بلند میں تیرے شاہیں کا حوصلہ
پرواز فکر تیری پر افشانی عقاب

کشکول کی طرح لئے تاج شہنشہی
رُخ پر رداء فقر کی ڈالے ہوئے نقاب
مشاطگئ فکر و تدبر کی اب نہیں
سلجھائے کون زلف سیاست کی پیچ و تاب

مولانا سجاد صاحبؒ کی زبان میں ایک گونہ لکنت تھی، اور شائد گفتگو بہت صاف اور واضح نہیں ہوتی تھی، ان کے بعض مخالفین اس کو ان کے خلاف تمسخر اور تنابز بالالقاب کا ہتھیار بھی بناتے تھے، مولانا سجاد کے ان مرثیہ گو نے اس کمزوری کو کس خوبی سے ''خوبی'' بنایا ہے، ملاحظہ فرمایئے :

حاصل تھیں تجھ کو حضرت موسیٰ کی لکنتیں
فرعون کو تھا عقدۂ مشکل تیرا خطاب

ان کی شاعری محض ماہ وش اور ماہ جبیں محبوباؤں، ساغر و مینا اور بادۂ وصہبا کی شیدائی نہیں ہے، وہ ملت کی دردمند ہے، ایمان و یقین کا پیغام اور اتحاد و اتفاق کا درس دیتی ہے، وہ اس انداز کی نصیحتیں بھی کرتی ہے کہ :

نجات انفرادی کے ہوئے افراد دیوانے
بکھر کر رہ گئے تسبیح سے تسبیح کے دانے

شفیع صاحبؒ سے اُٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے بہت کچھ سنا ہے، بار بار سنا ہے، مگر برا ہو میرے حافظہ کا اور خدا معاف کرے کہ طبیعت اتنی غیر شاعرانہ اور اشعار کی پرکھ کے معاملہ میں غیر عارفانہ واقع ہوئی ہے کہ نہ غزلیں یاد رہیں نہ ان کے منتخب مصرعے، مگر یہ چند اشعار محض اس لئے نقل کئے گئے کہ دیگ کے چند چاول پورے دیگ کا حال بتاتے ہیں، ''قیاس کن زگلستاں من بہارے را'' — ان کے اشعار کا ایک ضخیم مجموعہ موجود ہے، مگر شرمندۂ طبع نہیں ہوسکا ہے، حلقۂ ادب کی حرماں نصیبی اور زمانہ کی قدر ناشناسی کہ اس بوئے گل کو اب تک نسیم نہ مل سکی، خدا کرے کوئی ادب نواز اور سخن پرور اس کام کو کرنے کے لئے اُٹھ کھڑا ہو۔

شفیع صاحبؒ کو شاعری میں تلمذ مولانا محی الدین عمادی سے ہے، جو 'تمنا' تخلص رکھتے تھے،

شفیع صاحب اسی نسبت سے اپنے آپ کو تمنائی لکھتے ہیں :

مولانا تمنا عمادی کا نام سنتے ہی ہم جیسوں کو وحشت سی ہوتی ہے، موصوف شعر وسخن کی بزم میں جتنے دراز دست تھے، دین کے میدان میں اتنے ہی کوتاہ دست، حدیث کے منکر اور تفسیر بالرائی کے مرتکب، مغرب سے مسحور؛ البتہ خاندانی روایات سے مجبور، **واللہ ھو الحق وھو یھدی السبیل ۔**

یہ سب کچھ سہی؛ لیکن شعر وسخن کی بارگاہ میں ان کو داد نہ دینا ناانصافی ہوگی، شفیع صاحب کا تلمذ بھی بس اسی نوعیت کا ہے، ان کا نام بھی شفیع ہے اور تخلص بھی، ابتداء میں ملک کے اہم رسائل میں ان کی نظمیں چھپتی تھیں، مشاعروں میں ''جانِ مشاعرہ'' بن کر شریک ہوتے تھے۔

پیرانہ سالی، اس سے زیادہ کہنہ امراض اور اس سے بھی زیادہ فکر امروز نے ان کے قویٰ کمزور کر دیئے ہیں، ان سے ان کا مذاق اور ان کی چہک چھین لی ہے، کبھی پُر گو تھے، اب کہتے نہیں کہلائے جاتے ہیں، کبھی دولت مند وفیاض تھے، اب استغناء کی دولت باقی رہ گئی ہے، کبھی جانِ محفل بن کر رہتے تھے، اب گوشۂ گمنامی میں گم ہیں —— وضع قطع میں سادگی اور رہن سہن میں درویشی ہے، سنت کے متبع ہیں، عبادت کے پابند ہیں، حج کی سعادت سے بہرہ مند ہیں، پھلواری میں پیدا ہوئے، یہیں جوان ہوئے، بڑھاپے نے بھی یہیں اپنی گرفت میں لیا اور اب تک یہیں ہیں، قدم میں لرزہ پیدا ہوگیا ہے، مگر ہاتھوں میں اب بھی دم ہے اور قرطاس وقلم کے ساغر ومینا اب بھی ان کے گرد وپیش بکھرے پڑے رہتے ہیں، خدا اس امانت کو تادیر قائم رکھے :

ایں دُعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد

مزید

یہ تحریر محمد شفیع صاحبؒ کی حیات میں لکھی گئی تھی اور ان کی نظر سے بھی گذری تھی، آپ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے اور ۲۶/ جنوری ۱۹۸۳ء کو اللہ کو پیارے ہوگئے، انھوں نے پوری عمر دین وشریعت کی خدمت، خاص کر فریضۂ قضاء کی انجام دہی اور لوح وقلم کی مشاطگی میں صرف کی، تنگدستی کی مشقتوں سے بھی گذرے اور آزمائشوں میں بھی خوگر حمد ہونے کی وضع پر قائم رہے، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے۔

❁ ❁ ❁

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل......

تیسرا باب

مشفق اساتذہ اور محسن احباب

علم ومعرفت کا سورج

(استاذ گرامی مولانا سید شمس الحق صاحبؒ)

اس حقیر نے عربی زبان وقواعد کی بنیادی تعلیم اپنے والد مرحوم سے حاصل کی ہے، ان کے پڑھانے کا ایک خاص نہج تھا، وہ عربی گرامر کا ایک قاعدہ بتاتے، اسے لکھاتے اور اس کی مثالیں بکثرت قرآن مجید سے نکلواتے، اس طرح اس کو اچھی طرح ذہن نشین کرادیتے، کچھ دنوں مدرسہ قاسم العلوم حسینیہ دوگھرا، ضلع دربھنگہ (بہار) میں بھی پڑھنے کا موقع ملا، لیکن زیادہ تر تعلیم جامعہ رحمانی مونگیر میں ہوئی، میں جب مونگیر پہنچا تو میری عمر کچھ بارہ تیرہ سال کی رہی ہوگی، اس وقت جن اساتذہ کو دیکھا، ان میں سب سے بزرگ شخصیت شیخ الحدیث حضرت مولانا سید شمس الحق صاحبؒ کی تھی۔

وہ علم وعمل اور ورع وتقویٰ میں تو تھے ہی اپنی مثال آپ؛ لیکن ظاہری شباہت اور چال ڈھال میں بھی منفرد حیثیت کے حامل تھے، بہت ہی کھلا ہوا رنگ، دراز قامت، چھریرا بدن، بالکل سفید داڑھی، سر پر سفید دو پلی ٹوپی، پنڈلیوں تک بغیر کلر کا لانبا کرتا، کھلا ہوا پاجامہ، ہاتھ میں عصا، آنکھوں پر عینک، لمبوترا معصوم چہرہ، ہونٹوں پر اکثر تبسم نمایاں، چلتے تو تیز تیز، کسی قدر آگے کو جھکے ہوئے، مزاج کے اتنے نرم کہ اس سے زیادہ نرم خوئی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، شفیق اتنے کہ کیا چھوٹا اور کیا بڑا، ہر شخص ان سے مل سکتا تھا، ان کے ورع وتقویٰ اور عظمت کا جو نقش پہلے دن ثبت ہوا، اس میں آج تک ایک نقطہ کی کمی نہیں آئی۔

پہلے سال جو اسباق میں نے پڑھے، اس میں منطق کی مشہور کتاب ''کبریٰ'' بھی تھی،

عجیب بات ہے کہ بعد میں مجھے فلسفہ ومنطق سے جتنا بُعد ہوگیا، پڑھنے کے زمانہ میں اسی قدر اس سے دلچسپی تھی، دل لگا کر پڑھتا، سوالات کرتا اور بعد میں مذاکرہ کراتا، کئی طلبہ نے جو نیچے کی جماعتوں میں تھے، ''کبریٰ'' مجھ سے سبقاً سبقاً پڑھی، اس کتاب کا امتحان زبانی ہوتا تھا، اتفاق سے اس کا سالانہ امتحان حضرت الاستاذ کے پاس گیا، طلبہ خوش تھے؛ کیوں کہ آپ آسان امتحان لیا کرتے تھے، مولانا کے ایک صاحبزادے مولانا خورشید رحمانی ہیں، جو مجھ سے ایک سال آگے تھے، مولانا مزاحاً ان کو' گاندھی جی' کہتے تھے، جب مولانا نے امتحان لیا تو وہ بھی وہیں موجود تھے، مولانا نے واقعی بہت آسان امتحان لیا، کچھ تعریفات پوچھیں، کچھ سوالات عکس ونقیض کی بحثوں سے متعلق کئے، ایک آدھ عبارت کا ترجمہ کرایا، میں بتاتا جاتا اور مولانا اپنے صاحبزادے سے پوچھتے جاتے کہ گاندھی جی بات سمجھ میں آئی؟ وہ کہتے: ہاں ابا! اچھی طرح سمجھ میں آگئی، تمام سوال و جواب کے بعد پھر ان سے پوچھا کہ ان کو کتنا نمبر ملنا چاہئے؟ انھوں نے کہا: پورا نمبر دے دیجئے، میں واپس ہوا، مولانا نے مجھے سب سے زیادہ یعنی نوے نمبر دیئے اور عام طور پر وہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی نمبر دیا کرتے تھے، اس ملاقات نے ان کے تقدس کے ساتھ ساتھ ان کی شفقت ومحبت کا نقش بھی بیٹھا دیا۔

ہمیں باضابطہ مولانا سے پڑھنے کا شرف ششم عربی سے حاصل ہوا، اس جماعت میں جلالین اول کا سبق مولانا سے متعلق تھا، پھر ہفتم میں ہدایہ رابع پڑھنے کا موقع ملا، دورۂ حدیث میں بخاری شریف اول و دوم اور سنن اَبی داؤد، یہ مستقل اسباق تھے، بقیہ عارضی طور پر گاہے گاہے بعض اور کتابیں بھی آجایا کرتی تھیں۔

مولانا کی شخصیت کے کچھ علمی اور درسی پہلو ہیں اور کچھ عملی، اور دونوں ہی علماء کے لئے اسوۂ ونمونہ ہیں، ان کی عملی اور اخلاقی زندگی میں ایک اہم بات سنت کی اتباع ہے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، چلتے پھرتے، گفتگو اور تخاطب میں، ہر موقعہ پر ان کے عمل سے سنت نبوی ﷺ کو سمجھا اور جانا جاسکتا تھا، اپنی زندگی میں جن چند لوگوں کو نماز، جماعت اور صف اول کا بہت

زیادہ لحاظ کرتے ہوئے دیکھا، ان میں ایک حضرت الاستاذ تھے، مونگیر میں گرمی اور ٹھنڈک دونوں ہی بہت شدید ہوتی ہے، مگر ان کی نہ کبھی گرمی میں ظہر کی جماعت فوت ہوتی اور نہ ٹھنڈک میں فجر کی، اس کے ساتھ ساتھ سنن ونوافل کا اہتمام بھی حد درجہ تھا، اتنا وقت تو نہیں تھا کہ مولانا خود جماعتوں میں نکلتے ؛ لیکن جماعت سے گہری محبت رکھتے تھے، اور جامعہ رحمانی میں دعوت وتبلیغ کے کام کی پوری سر پرستی اور نصرت فرماتے تھے، ہم لوگ جب دورۂ حدیث شریف میں تھے، تو بہت سی دفعہ جمعرات کو پوری جماعت کو بخاری شریف لے کر چوبیس گھنٹے کی جماعت میں نکلتے، جس میں دعوت وتبلیغ کی محنت بھی ہوتی اور تہجد سے پہلے بخاری شریف کا درس بھی ہوتا، پھر صبح میں بھی اشراق کے بعد بخاری کا سبق پڑھاتے، خود بھی اللہ کے دربار میں دُعاء اور التجا کرتے اور ہم لوگوں سے بھی کراتے۔

ایک وصف میں نے مولانا کا ایسا دیکھا جو شاید اس درجہ کہیں اور نہیں دیکھا، اور وہ ہے زبان کی حفاظت، میں مولانا سے بہت قریب تھا، درس کے علاوہ کمرے میں بھی برابر حاضر ہوتا اور ان کی شفقت کی وجہ سے کسی قدر شوخ اور بے تکلف بھی تھا، ہر طرح کی باتیں ہوتیں، اس میں سنجیدہ اور مہذب قسم کے لطائف وظرائف بھی آجاتے ؛ لیکن اگر میں قسم کھاؤں کہ کافی عرصہ کی صحبت کے باوجود کبھی میں نے ان کی زبان سے کسی کی غیبت نہیں سنی تو حانث نہیں ہوں گا، نہ استاذ کی، نہ طالب علم کی، نہ عملہ کی، نہ عام مسلمانوں کی، اسی طرح میں نے ان کو کبھی کسی کے بارے میں تنابز بالالقاب کرتے ہوئے نہیں سنا، خواہ اس سے کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو، اور جس میں جو خوبیاں ہوں، اس کے اعتراف میں بھی کبھی کوتاہ نہیں پایا، عام طور پر ہمارے حلقہ میں تحریک اسلامی کے مؤسس مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ذکر آتا ہے تو لوگ حدود سے تجاوز کر جاتے ہیں، میں نے حضرت الاستاذ کو دیکھا کہ وہ ان کا ذکر بھی پورے احترام سے کرتے اور اگر کسی مسئلے میں ان سے اختلاف رائے کا اظہار کرتے، تو ان کی ان کتابوں کا بھی ذکر فرماتے جو اسلام کی مدافعت میں مفید اور مؤثر سمجھی گئی ہیں اور ان کتابوں کی خوبیوں کا اعتراف کرتے، یہ وصف شاید و باید ہی کسی اور معروف اور قابل ذکر شخصیت میں دیکھا ہوگا۔

مولانا کے مزاج میں حد درجہ سادگی اور انکساری تھی اور حدیث میں جو بات فرمائی گئی ہے: ''أهل الجنة بله'' کہ سادہ لوح لوگ جنتی ہوں گے، وہ واقعی اس کا مصداق تھے، اس سادگی کا ایک لطیفہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کے پڑھنے کے زمانہ میں مولانا کے دور کے ایک عزیز بھی پڑھ رہے تھے اور تھے تو نیچی جماعت میں؛ لیکن میرے ہم عمروں میں تھے، سر ان کا کسی قدر بڑا تھا، انھوں نے اپنا بال مونڈایا، بچے اپنے مزاج کے مطابق چھپ کر ان کے سر پر تھپڑ بازی کی مشق کرنے لگے، اتفاق سے ایک تھپڑ میں نے بھی لگا دیا، انھوں نے مولانا سے شکایت کر دی، مجھے اپنی اس ہلکی حرکت پر مولانا کا سامنا کرنے میں بڑی شرمندگی ہوئی اور خوف بھی، بہر حال میں مولانا کے پاس حاضر ہوا، مجھے دیکھتے ہی مولانا کہنے لگے: آپ تو ماشاء اللہ اچھے طالب علم ہیں، لکھنے پڑھنے میں لگے رہتے ہیں، کیا واقعی آپ نے اس کو تھپڑ مارا ہے؟ میں نے عرض کیا: مجھ سے غلطی ہوگئی، میں نے مذاق سے چپت ماردی تھی، مولانا ان سے مخاطب ہوئے اور کہنے لگے: ہاں، ہاں، میں پہلے سے سمجھ رہا تھا کہ یہ تو محنتی اور نیک طالب علم ہیں، انھوں نے تم کو تکلیف پہنچانے کے لئے تھوڑا ہی مارا ہے، مذاق سے مار دیا ہے، معاف کر دو —— غرض کہ ان کی سادہ لوحی کی وجہ سے ان کے سامنے جھوٹ بولنا چنداں دشوار نہ تھا، لیکن ایسے متقی شخص کے سامنے جھوٹ بولنے پر خود ضمیر ملامت کرتا تھا۔

یاد نہیں آتا کہ کبھی مولانا کو کسی طالب علم کی جسمانی سرزنش کرتے ہوئے دیکھا ہو، ایک بار کسی سنگین غلطی پر کسی طالب علم کے لئے سزا مقرر ہوئی اور مولانا سے کہا گیا کہ وہ ان کی سرزنش کریں، مولانا نے بمشکل پنکھے سے دو دفعہ مارا ہوگا، ان جیسے طالب علم کے لئے تو یہ مار ایک طمانچہ کے برابر بھی نہیں تھی، کبھی زبان سے بھی انھیں ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہوئے نہیں سنا، کسی بات پر فہمائش کرنی ہوتی تو زیادہ سے زیادہ کہتے: ''دیکھئے یہ اچھی بات نہیں'' اور بس۔

تواضع اور انکساری کا حال یہ تھا کہ کبھی کسی سے تُو اور تم سے گفتگو نہیں کرتے، کبھی میں نے ان کو آلتی پالتی بیٹھ کر درس دیتے ہوئے نہیں دیکھا اور نہ کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے، ہمیشہ متورک بیٹھتے، جامعہ رحمانی میں درسگاہ استاذ کے کمرہ ہی میں ہوا کرتی تھی اور ایک معمولی

سا ٹاٹ مدرسہ سے ملتا تھا، مالی حالات کی وجہ سے بعض اوقات اس ٹاٹ کی تجدید میں بہت عرصہ بیت جاتا تھا، ایک زمانہ میں ایسا ہوا کہ ٹاٹ پھٹتے پھٹتے بہت تھوڑا سا باقی رہ گیا، مگر مولانا اسی چھوٹے سے ٹکڑے پر بیٹھتے اور کبھی شکوہ سنج نہیں ہوتے، اگر لائٹ کم ہوتی تو یہ بھی دیکھا کہ کتاب لے کر بلب کے سامنے کھڑے ہوگئے اور نگاہ گڑا گڑا کر مطالعہ کیا، کھانا پینا بھی بہت سادہ تھا، جو کچھ مدرسے سے آتا، وہی تناول فرماتے۔

طبیعت میں خشکی نہیں تھی، مجلس میں بھی اور سبق میں بھی ہلکے پھلکے لطائف سناتے، حضرت مولانا سید محمد ولی رحمانی جب کانگریس پارٹی کی طرف سے ایم، ایل، سی منتخب ہوئے، تو دارالحدیث کے ہال میں ایک تہنیتی تقریب رکھی گئی، یہ زمانہ اندرا گاندھی کے عروج کا تھا، سب لوگوں نے تقریر کی، مولانا نے اپنی بات ایک لطیفہ سے شروع کی کہ دیہات کا ایک شخص شہر میں رہتا تھا، اس کے گاؤں سے ایک شخص شہر آیا، اس نے پوچھا: ہمارے یہاں سب لوگ اچھے ہیں؟ اس نے کہا، ہاں! اچھے ہیں ، کچھ دنوں پر معلوم ہوا کہ اس کی والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، اس نے اپنے دوست سے کہا کہ تم نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں سب خیریت ہے، حالاں کہ میری والدہ کا انتقال ہوگیا تھا، اس نے کہا کہ ہاں صحیح ہے، باقی سب خیریت ہے، پھر بعد میں اس کو اپنے والد کی اور اپنی بیوی کی بھی موت کی اطلاع ملی، وہ جب بھی پوچھتا تو آنے والا ایک ہی جواب دیتا کہ ہاں اور باقی سب خیریت ہے، مولانا نے فرمایا کہ کانگریس پارٹی کا بھی یہی حال ہے، کہ وہ ملک کو نقصان پہنچاتی ہے، مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی سے کام لیتی ہے اور کہتی جاتی ہے کہ باقی سب خیریت ہے۔

مولانا اپنے اساتذہ اور خاص کر علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا نام بڑے ہی احترام سے لیا کرتے تھے، اسی طرح ان کے یہاں تمام محدثین، فقہاء اور صوفیاء کا نہایت توقیر کے ساتھ نام لیا جاتا تھا، جب بخاری میں ’’قال بعض الناس ‘‘ پر بحث کرتے، تو امام ابو حنیفہؒ کی طرف سے

بھرپور وکالت بھی فرماتے اور امام بخاریؒ کا پورا پورا احترام بھی باقی رکھتے اور ان کی غلط فہمی کے اسباب بتا کر انھیں معذور ٹھہراتے، تلاوتِ قرآن اور ماثور اوراد و ادعیہ کا بھی بہت اہتمام کرتے۔

اس حقیر پر مولانا کے درس کا بڑا تاثر ہے، درس میں کتابوں اور شخصیتوں کے احترام کے ساتھ ساتھ ایک خاص وصف اسباق کی پابندی کا تھا، طوفان آئے، بارش ہو، مدرسہ میں کوئی پروگرام ہو، بڑی سے بڑی شخصیت آتے، لیکن مجال نہ تھی کہ ضابطہ میں مدرسہ کھلا ہو اور درس کا ناغہ ہو جائے، بعض دفعہ ہم لوگ چھٹی کے لئے زور لگاتے تو بڑی محبت سے فرماتے، اچھا ٹھیک ہے، کم سے کم ایک سطر پڑھ لیجئے؛ تاکہ سبق کی برکت سے محرومی نہ ہو جائے، پھر جب سبق شروع ہو جاتا، تو ہم لوگ خود کہتے کہ جب پڑھنا شروع ہی کر دیا ہے، تو پورا سبق ختم ہی کر لیں گے، اس پابندی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کے تمام اسباق کسی دوڑ بھاگ کے بغیر وقت پر مکمل ہو جاتے تھے، مجھے یاد نہیں کہ کبھی ایسا ہوا ہو کہ مقدار خواندگی نامکمل رہ گئی ہو، واقعہ ہے کہ اتنا زیادہ پابند ِ درس مدرس ہم نے نہیں دیکھا۔

حدیث کے علاوہ دوسری کتابوں کے درس میں مولانا کا مزاج طویل تقریروں کا نہیں تھا، زیادہ زور عبارت فہمی پر دیا کرتے اور اتنی گفتگو کرتے کہ عبارت سمجھ میں آجائے، اسی لئے سمجھانے کے ساتھ ساتھ ترجمہ بھی کراتے جاتے، اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کا ہدایہ ثالث کا سبق حضرت مولانا محمد اکرام علی صاحبؒ کے پاس تھا، وہ بڑے ہی محقق استاذ تھے، تمام مالہ و ماعلیہ پر پوری بحث کرتے، اشکالات ہوں تو ان کے جوابات بھی دیتے، کوئی بات مصنف نے ذکر نہیں کی ہے، تو اسے بھی بیان کر دیتے وغیر ذلک، اس لئے درس کی تقریر بہت لمبی ہوتی، فطری طور پر ان کے تحقیقی درس کا ذہن پر بہت تاثر ہوتا، حضرت الاستاذ کا درس نسبتاً مختصر ہوتا، اس لئے پڑھنے کے وقت اس کا تاثر کم ہوتا، مگر جب امتحان کا زمانہ آتا، تو اس وقت اندازہ ہوتا کہ مولانا شمس الحق صاحب کے پڑھائے ہوئے مضامین تو گرفت میں ہیں اور عبارتیں آسانی سے حل ہو جاتی ہیں اور مولانا اکرام علی صاحب کا درس ذہن میں کم محفوظ

رہ پاتا اور عبارت کا حل کرنا دشوار ہو جاتا، مولانا خود بھی یہی فرماتے کہ اصل عبارت کا حل کر دینا ہے، باقی حواشی و شروح، تو اسے طلبہ خود اپنی محنت سے حل کریں؛ کیوں کہ یہ زوائد ہیں۔

مولانا کا علم اتنا مستحضر تھا کہ کسی بھی فن کی کوئی کتاب ہو، کسی بھی وقت لے کر پہنچ جایئے، ایک نظر ڈالتے اور بہ آسانی سمجھا دیتے؛ چنانچہ ہم لوگ صرف مولانا ہی کی کتاب لے کر ان کے پاس نہیں پہنچتے؛ بلکہ کوئی بھی کتاب سمجھ میں نہ آتی تو حاضر ہو جاتے اور آپ آسان لفظوں میں اختصار کے ساتھ سمجھا دیتے، خود مولانا کی کسر نفسی کا حال یہ تھا کہ اگر کسی عبارت کے سمجھنے میں تامل ہوتا، تو بے تکلف دوسرے اساتذہ سے رُجوع فرماتے، ایک بار ہم لوگ ایک استاذ کے پاس غالباً جلالین کے دوسرے حصے کا سبق پڑھ رہے تھے، وہ مولانا کے لائق شاگردوں میں تھے، مولانا کو ایک مضمون میں تامل ہوا، وہ کتاب لے کر ان کے پاس پہنچ گئے اور ہم لوگوں کے سامنے ہی ان سے دریافت کرنے لگے، انھوں نے جھینپتے ہوئے اور اپنے استاذ کے احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے کچھ اظہار خیال کیا، مولانا نے فرمایا: ہاں! بس بات سمجھ میں آ گئی، میں نے اسے یوں سمجھا تھا، آپ کی بات درست ہے، ایسے تواضع اور انکساری کی بھی کوئی مثال آج مل سکتی ہے! بعض اوقات ایسا بھی ہوتا کہ جو طلبہ کتاب پڑھتے، خود ان ہی سے بعض عبارتوں کے بارے میں تبادلۂ خیال کرتے اور فرماتے کہ مجھے اس کے سمجھنے میں تشفی نہیں ہو رہی ہے، آپ لوگ بتائیں اس کا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہی کسر نفسی بلکہ بے نفسی تھی کہ ان کی ذات سب ہی لوگوں کے لئے نقطۂ اتفاق تھی۔

حدیث میں مولانا کے درس کا منہج عام اسباق سے مختلف ہوتا تھا اور اس میں حسب ضرورت تفصیل سے گفتگو کرتے تھے، احکام فقہیہ کے سلسلے میں مولانا کا ذوق یہ تھا کہ عام طور پر تو حنفیہ کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے؛ لیکن بعض مسائل میں اگر جمہور کی رائے حدیث سے قریب ہوتی تو ان کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے، یا ان لوگوں کی رائے کی جو موجودہ حالات میں دعوتی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے زیادہ موزوں ہوتی، مثلاً ظہر و عصر کے اوقات میں ان کا جھکاؤ صاحبین

کی رائے کی طرف تھا، آمین بالجہر اور رفع یدین کے مسئلہ میں ترجیح کے بجائے اختیار کا پہلو ان کے نزدیک راجح تھا، دیہات میں نماز جمعہ کے سلسلہ میں وہ امام شافعی کی رائے کو ترجیح دیتے تھے، ایک مجلس کی تین طلاقوں کے سلسلہ میں ان کا جھکاؤ علامہ ابن تیمیہؒ کے نقطۂ نظر کی طرف تھا، بالخصوص ہندوستان کے سماجی ماحول کے پس منظر میں، اسی طرح بعض اور مسائل میں ان کا نقطۂ نظر حنفیہ کی مشہور رائے سے کسی قدر مختلف ہوتا تھا، اگر اس کو ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ وہ ولی اللٰہی مزاج کے حامل تھے تو مناسب ہوگا۔

'فقہ الحدیث' پر بحث کرنے کا طرز بھی ان کا روایتی طریقۂ درس سے مختلف ہوتا تھا، عام طور پر لوگ مذاہب بیان کرتے ہیں، پھر ہر مذہب کی دلیل، پھر اپنے نقطۂ نظر کی ترجیح اور کوئی حدیث بظاہر خلاف ہو تو اس کی توجیہہ و تاویل، لیکن مولانا کا اُسلوب یہ تھا کہ وہ پہلے ایک موضوع پر مروی حدیثوں کو نقل کرتے تھے، مثلاً یہ کہ اس سلسلہ میں تین طرح کی روایتیں ہیں، ان روایتوں کو نقل کرنے کے بعد اس پر روشنی ڈالتے کہ کن فقہاء نے کس حدیث کو لیا ہے؟ پھر کسی نقطۂ نظر کو ترجیح دیتے، اس کی وجوہ پیش کرتے اور دوسری حدیثوں کی تاویل کرتے اور تاویل میں بھی تطبیق کو مقدم رکھتے اور اختلاف کو ہلکا بنا کر پیش کرتے، غرض کہ مولانا کے درس میں محدثانہ رنگ غالب ہوتا، اتفاق یہ ہے کہ میرے محبوب استاذ حضرت مولانا اکرام علی صاحبؒ کو حنفیت میں بڑا تصلب تھا، وہ ہر حدیث کو اسی رنگ میں پیش کرتے، ان کی تقریر بہت ہی تحقیقی اور علمی ہوتی اور ہر درس سے مطالعہ کا عمق اور اس کی وسعت کا تاثر بڑھتا جاتا، میرا حال یہ تھا کہ علمی اعتبار سے تو مولانا اکرام علی صاحبؒ کے درس سے زیادہ متاثر ہوتا؛ لیکن ذوقی اعتبار سے مولانا کی تحقیق و توجیہہ کی طرف طبیعت زیادہ مائل رہتی۔

مولانا کے درسِ حدیث سے متعلق ایک قابل ذکر بات آپ کے عبارت پڑھنے کا انداز بھی تھا، جب عبارت پڑھتے، تو اتنا بھلا لگتا کہ دل چاہتا کہ آپ عبارت پڑھتے رہیں اور ہم لوگ سنتے رہیں، لگتا تھا کہ ایک سبک خرام آبشار ہے جو ایک ہی رفتار سے بہہ رہا ہے، ہماری جماعت میں طلبہ کم تھے، اس لئے یوں بھی عبارت پڑھنے کا موقع زیادہ ملتا تھا؛ لیکن خاص کر آخری سہ

ماہی میں جب بخاری کی مکررات کا سلسلہ شروع ہوا تو مولانا خاص طور پر مجھے عبارت پڑھنے کا حکم دیتے اور میں آپ ہی کی لے میں عبارت پڑھنے کی کوشش کرتا؛ لیکن بعض دفعہ ہم لوگ خود خواہش کرتے کہ حضرت الاستاذ عبارت پڑھیں، اس کے پیچھے دوہرے مقاصد ہوتے، ایک تو مولانا کی آواز کی نغمگی کی وجہ سے جی چاہتا کہ آپ سے عبارت سنی جائے، دوسرے محدثین کی اصطلاح کے مطابق 'اِخبار' کے ساتھ ساتھ 'تحدیث' بھی مقصود ہوتی، جب مجھے بخاری شریف پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی، تو میں بھی اسی لہجہ میں عبارت خوانی کرتا تھا، طلبہ اسے میرا منفرد لہجہ سمجھتے اور اس سے محظوظ ہوتے؛ لیکن درحقیقت یہ حضرت الاستاذ کے طرزِ ادا کی نقل ہوتی۔

عام طور پر انسان جب کسی سے قریب رہتا ہے تو عقیدت واحترام کا پہلو کسی قدر کمزور پڑ جاتا ہے؛ لیکن یہ مولانا کی بزرگی اور ان کے تقویٰ کی بات ہے کہ مولانا کی محبت وعقیدت میں اضافہ ہی ہوتا رہا، دورۂ حدیث کے سال ایک دن مجھ سے کہنے لگے کہ حضرت امیر شریعت (مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ) نے آج ناشتہ پر مجھ سے آپ کی تعریف کی اور کہا کہ اس بار خالد بھی دورۂ حدیث میں ہے اور آپ کو اچھے مخاطب ملے ہیں، تو میں نے آپ کی سخت شکایت کردی کہ آپ فجر کے بعد سبق میں سوتے رہتے ہیں، یہ مولانا کی صاف دلی کی بات تھی کہ جو بات کہتے، اسے نقل کردیتے، دورۂ حدیث کے سال سنن ترمذی کا امتحان ان کے یہاں گیا، انھوں نے نوے یا پچانوے نمبر دیئے، بعد میں مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کی ترمذی کا پرچہ بہت پسند آیا، جی چاہا کہ سو نمبر دے دوں؛ لیکن سوچا کہ اگر اتنا نمبر دے دوں گا، تو آپ ابھی سے اپنے آپ کو ''علامہ'' سمجھنے لگیں گے، اس لئے میں نے کچھ نمبر کاٹ لئے ہیں، میں نے عرض کیا کہ آپ نے جو بھی نمبر دیا ہوگا، وہ میرے استحقاق سے زیادہ ہی ہوگا، رخصت کرتے ہوئے اپنے دست مبارک سے لکھ کر خصوصی سند عنایت فرمائی۔

حیدرآباد آنے کے بعد عرصہ سے میری خواہش تھی کہ ایک بار انھیں یہاں دعوت دوں، چنانچہ دارالعلوم سبیل السلام میں ختم بخاری کے لئے اس حقیر کی تحریک پر انھیں مدعو کیا گیا،

تشریف لائے اور یہاں ان کے مختلف پروگرام ہوئے، ان کے بیانات پسند کئے گئے اور خاص طور پر لوگ ان کی ظاہری نورانیت اور ورع وتقویٰ سے بھی بہت متاثر ہوئے، موقعہ سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے راقم الحروف نے اپنی لڑکی صفیہ عابدین سلمہا کی بسم اللہ بھی ان ہی سے کرائی اور اس طرح میرے گھر کے لئے یہ ایک یادگار دن بن گیا۔

مولانا سے فریش ہونے سے پہلے آخری ملاقات آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے اجلاس مونگیر کے موقعہ سے ہوئی، اس وقت وہ کافی کمزور ہو چکے تھے، نیچے اُترنا دشوار تھا، اس لئے اپنے حجرہ ہی میں نماز ادا کرتے تھے اور قریب کے ایک کمرے میں درس حدیث دیتے تھے، حسبِ معمول بڑی شفقت ومحبت سے ملے اور میری عزت افزائی کرتے ہوئے فرمایا: تین طلبہ ہیں جن کا نمبر کاٹنے میں مجھے بہت دشواری پیش آتی تھی، ایک نام حضرت مولانا صدر عالم قاسمی، سابق مفتی امارت شرعیہ پھلواری شریف، پٹنہ کا لیا، دوسرا نام میرے شفیق استاذ حضرت مولانا فضل الرحمٰن رحمانی، سابق استاذ جامعہ رحمانی مونگیر کا اور تیسرا اس حقیر کا، ان کے اس ارشاد میں میری لیاقت سے زیادہ ان کے حسن ظن اور خورد نوازی کو دخل ہے؛ لیکن اس سے چھوٹوں کے اعتراف اور ان کی حوصلہ افزائی کا سبق لیا جا سکتا ہے، میں نے اس ملاقات میں مولانا سے خواہش کی کہ آپ کے وہ درسی افادات 'جو سبق کے دوران سامنے رہتے تھے' کو کتابی شکل میں طبع ہونا چاہئے؛ کیوں کہ یہ اشارات اپنی جامعیت کے اعتبار سے بہت اہم اور حدیث کے اساتذہ وطلبہ کے لئے نہایت ہی مفید ہیں، یہ بھی عرض کیا کہ اس کا نام ''جهد البهاری '' کے بجائے ''غنية القاری ''یا ''نصرة الباری '' رکھ دیا جائے، تو بہتر ہے؛ کیوں کہ دینی کاموں میں علاقہ اور خاندان کی نسبت بہتر نہیں معلوم ہوتی۔

مولانا اچھے مدرس ہونے کے ساتھ ساتھ اچھے مقرر بھی تھے، جمعہ کے دن خانقاہ کی مسجد میں ان ہی کا بیان اور خطبہ ہوا کرتا تھا، بخاری کا افتتاحی اور اختتامی درس بھی آپ ہی دیتے تھے، نیز علاقہ میں کثرت سے اصلاحی اور دعوتی اسفار ہوا کرتے تھے، آپ کا خطاب بہت سادہ اور عام فہم ہوتا تھا، سوائے قرآن وحدیث اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے واقعات کے اور کوئی بات نہیں ہوتی،

سادگی کے باوجود لوگوں پر تقریر کا اثر ہوتا اور بہت سے لوگوں کی اصلاح ہوتی، ہمیشہ تقریر کی ابتداء صحیحین کی کسی حدیث سے فرماتے اور اسی کو موضوع بنا کر پوری تقریر کرتے۔

درسی مشاغل نے تصنیف و تالیف کا زیادہ موقع نہیں دیا، لیکن جو کچھ لکھتے شستہ اور آسان زبان میں لکھتے، آپ کے کئی اصلاحی مضامین مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں، آپ کی تصنیفات میں 'مقامات بدیع الزماں ہمدانی' کے دس مقامات کی شرح ''**تسهيل المعاني**'' کے نام سے شائع ہو چکی ہے، اس کے علاوہ ''**تسهيل العربيه**'' کے نام سے بھی آپ کی ایک تالیف ہے، شعر و سخن کا بھی بڑا اعلیٰ ذوق تھا، اصلاحی اور تذکیری اشعار خود بھی کہتے اور دوسروں کے بھی سناتے، پارہ عم کا منظوم ترجمہ بھی آپ نے فرمایا اور ''**عوامل النحو**'' کے نام سے عوامل کو بھی نظم کیا ہے، آپ کا غیر مطبوعہ سفرنامہ حج بھی ''یادِ حرم'' کے نام سے موجود ہے۔

آپ کا ایک معمول درسی یادداشت کو مختصر اشارات کی شکل میں لکھنے کا تھا، یہ اشارات بخاری اور ترمذی کے دورانِ درس سامنے ہوتے تھے، یہ عربی میں ہیں اور دریا بہ کوزہ کا مصداق ہیں، بخاری کی یادداشت کو ''**جهد البهاري في حل البخاري**'' اور ترمذی کی یادداشت کو ''**غنية المبتدي في حل الترمذي**'' کے نام سے آپ نے خود موسوم کیا تھا، اگر یہ افادات شائع ہو جائیں، تو حدیث کے اساتذہ و طلبہ کے لئے بڑے مفید ثابت ہوں گے اور بہت سی کتابوں سے بے نیاز کر دیں گے، خدا کرے حضرت الاستاذ کے متعلقین اسے شائع کریں؛ البتہ یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ آپ کی گفتگو کا دائرہ ان اشارات کے مقابلہ وسیع ہوا کرتا تھا اور اسی طرح بعض دفعہ اشارات میں جو باتیں لکھی ہوتی تھیں، اس کے برخلاف کسی اور نقطۂ نظر کو بھی ترجیح دیا کرتے تھے۔

مولانا کے والد ماجد کا اسم گرامی سید محمد ابراہیم صاحب مرحوم تھا، چک اولیاء، ضلع ویشالی (بہار) کو آپ کی جائے ولادت ہونے کا شرف حاصل ہے، یہیں ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے، والد ماجد اور برادر محترم مولوی منظور الحق صاحب سے ابتدائی تعلیم حاصل کی، عربی تعلیم مدرسہ احمدیہ ابابکر پور، مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ، پٹنہ اور دارالعلوم دیوبند میں حاصل کی

اور جب علامہ کشمیری کا قافلہ دیوبند سے ڈابھیل گیا، تو آپ بھی ڈابھیل چلے گئے، اور ۹/ شعبان ۱۳۵۶ھ کو فراغت حاصل کی، بخاری علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے پڑھی اور ان ہی کے ہاتھوں دستار بندی ہوئی، اجلاس دستار بندی میں مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید دہلوی بھی موجود تھے، پھر مختلف اداروں میں درس کی خدمت انجام دیتے ہوئے ۱۹۶۵ء میں جامعہ رحمانی مونگیر آئے اور فریش ہونے تک درس کی خدمت انجام دیتے رہے، مولانا فضل الرحمٰن رحمانی، مولانا بدر الحسن قاسمی، مولانا نور الحق رحمانی وغیرہ آپ کے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔

۱۹۷۰ء، ۱۹۸۰ء اور ۱۹۸۴ء میں حج کی سعادت سے سرفراز ہوئے، حرمین شریفین کی محبت کس مسلمان کے دل میں نہیں ہوتی، لیکن مولانا پر اس محبت کا خاص رنگ تھا، بڑی محبت سے مقاماتِ مقدسہ کا ذکر فرماتے، حمید صدیقی مرحوم کے اشعار گنگناتے، کوئے جاناں کی محبت میں خود تڑپتے اور دوسروں کو تڑپاتے، پہلی بار حج کی سعادت سے مشرف ہوکر واپس آئے، تو میں جامعہ رحمانی ہی میں زیر تعلیم تھا، آپ نے اتنے درد وسوز کے ساتھ تاثراتِ حرم پیش فرمائے، کہ شاید کوئی آنکھ ہو جو نم نہ ہوئی ہو، آپ رسا دماغ کے ساتھ ساتھ خدا کی محبت میں پگھل جانے والے دل کے بھی مالک تھے، اس لئے احسان وتصوف سے شروع سے تعلق رہا، خود اپنے استاذ علامہ شبیر احمد عثمانیؒ سے بیعت ہوئے، پھر امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ سے، اور ان ہی سے مجاز قرار پائے۔

مؤرخہ ۱۳/ ذوقعدہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۲۵/ نومبر ۲۰۰۷ء کو اپنے وطن ابا بکر پور ضلع ویشالی میں علم وتحقیق اور ورع وتقویٰ کا یہ آفتاب جہاں تاب غروب ہوگیا، اللہ تعالیٰ آپ کی خدمات کو قبول فرمائے، علماء کو آپ کی کسر نفسی، سادگی اور ورع واحتیاط کو اپنے لئے اسوہ بنانے کی توفیق دے اور اپنے رسول کے ایک سچے پکے محبّ کو اپنے محبوب کی رفاقت سے نوازے۔

❁ ❁ ❁

شہنشاہِ تدریس مولانا اکرام علی صاحبؒ

ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم !

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے، جب میں بہار کی مشہور دینی درسگاہ جامعہ رحمانی مونگیر میں داخل ہوا، چوں کہ میں پہلی دفعہ ایک بڑی دینی درسگاہ میں پہنچا تھا؛ اس لئے مجھے وہاں کی ہر چیز عجیب وغریب محسوس ہوتی اور مختلف شخصیتوں کو دیکھ کران کے تقدس سے دل معمور ہوتا جاتا؛ لیکن اس وقت جامعہ کے بزرگ اساتذہ میں سب سے زیادہ جن کے علم اور تدریسی کمال کا چرچا رہتا اور جن کا طلبہ ''مولانا'' کی بجائے ''علامہ'' کے لفظ سے تذکرہ کرتے، وہ تھے حضرت مولانا اکرام علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، گہرا سانولا رنگ، چہرے پر کہیں کہیں چیچک کے اِکادُکا نشانات، میانہ قد، دوہرا بدن، گھنی اور بڑی سیاہ داڑھی، جس میں اِکادُکا سفید بال بھی تھے، نصف پنڈلی تک سفید کرتا اور سفید رنگ یا کسی اور رنگ کی ٹخنوں سے اوپر تک لنگی، گول وضع کی ٹوپی، مگر وہ پانچ کلیوں پر مشتمل نہیں تھی، چلتے اس طرح جیسے نشیب سے فراز کی طرف چڑھ رہے ہوں، آگے کی طرف جھکے ہوئے، بعد کو عصا بھی استعمال کرنے لگے اور زلف بھی رکھ لی، لباس ،عینک اور جوتا نہایت سادہ بلکہ معمولی، یہ تھا آپ کا سراپا۔

دو اساتذہ کا رعب جس قدر طلبہ پر دیکھنے میں آیا، شاید کسی اور میں دیکھنے کو نہیں ملا، ایک دیوبند میں حضرت مولانا معراج الحق صاحب کا، دوسرے مونگیر میں حضرت مولانا اکرام علی صاحب کا، مولانا معراج الحق صاحب استاذ ہونے کے ساتھ ساتھ انتظامی اختیارات کے بھی مالک تھے؛ اس لئے طلبہ کے مرعوب رہنے میں یہ عنصر بھی کارفرما تھا؛ لیکن مولانا کو جو وقار اور خداداد رعب حاصل تھا، وہ صرف علم اور تقویٰ کی بنیاد پر، مولانا کا کمرہ دارِ جدید کے مشرق

سمت کے بالکل کونے میں دوسری منزل پر تھا، آپ نماز کے وقت اپنا کمرہ بند کر کے جوں ہی باہر نکلتے اور طلبہ کی نظر پڑتی تو یا تو طلبہ کمروں کے اندر چلے جاتے یا کنارے دور ہٹ جاتے، اگر کسی طالب علم پر آپ کی ایک نگاہ خشمگیں پڑ جاتی تو یہی دوسرے اساتذہ کی سخت سرزنش سے بڑھ جاتی اور طالب علم ندامت محسوس کرتا۔

اس حقیر کو شرحِ وقایہ وغیرہ کی جماعت تک مولانا سے پڑھنے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی؛ البتہ منتہی جماعتوں کے طلبہ سے آپ کے محققانہ درس کا ذکر خیر ہمیشہ سنتا رہتا تھا، اس درمیان ایک بار بعض وجوہ سے طے پایا کہ تمام کتابوں کا تقریری امتحان ہوگا؛ چنانچہ ہم لوگوں کا 'کافیہ' کا امتحان مولانا کے یہاں چلا گیا، یہ بات ہم سارے ساتھیوں کے لئے پریشانی کا باعث تھی، بہرحال سہمے سہمے ہم لوگ مولانا کے پاس پہنچے، ظہر سے عصر تک امتحان جاری رہا، پھر مغرب بعد بلاوا آیا، عشاء تک امتحان چلتا رہا، پھر عشاء کے بعد بھی اسی امتحان کا سلسلہ جاری رہا اور یہ پورا امتحان کافیہ کی ابتدائی دوتین سطروں ہی تک محدود رہا، مولانا سوال کرتے، ہم لوگ جواب دیتے؛ بلکہ جواب دینے کی کوشش کرتے، پھر اس جواب پر اعتراض ہوتا، اور ساتھی تو ہاں نہیں پر ہی اکتفاء کرتے؛ لیکن محبی مولانا شکیل احمد قاسمی ولد حافظ عبدالسلام صاحب مرحوم (کلکتہ) اور یہ حقیر کچھ جواب دینے کی کوشش کرتے، جب ہم لوگ امتحان دے کر کمرہ سے باہر نکلے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم نے ایک کتاب کا نہیں؛ بلکہ ایک درجن کتابوں کا امتحان دیا ہے، اس وقت پہلی بار براہِ راست مولانا کی علمی جامعیت کا اندازہ ہوا اور خیال ہوا کہ جماعت کا کوئی طالب علم بھی پاس نہیں ہو سکے گا؛ مگر: ''مرگِ انبوہ جشنے دارد''۔

جب نتیجہ آیا تو بعض ساتھی تو واقعی فیل تھے، بعض کو صرف پاس نمبر ملا تھا اور ہم دونوں کے نمبرات کچھ زیادہ تھے؛ لیکن اعلیٰ درجہ سے کم، مولانا کے یہاں اتنا نمبر پا کر بھی بے حد خوشی محسوس ہوئی۔

اس امتحان کے بعد مولانا سے پڑھنے کی آرزو اور بڑھ گئی، مگر اس کی نوبت اس وقت

آئی، جب ہدایہ اولین کی جماعت میں مختصر المعانی کا درس مولانا سے متعلق ہوا، مولانا کی تقریر نہایت مبسوط اور مفصل ہوتی تھی، آپ نے مختصر المعانی اس طرح پڑھائی، جیسے کوئی فن بلاغت کا نکتہ رس، رمز شناس پڑھا رہا ہو؛ لیکن علامہ تفتازانی کی موشگافیوں کی وجہ سے حقیقت یہ ہے کہ اصل فن سے کوئی مناسبت پیدا نہ ہوسکی، پھر مولانا نے اس کا متن تلخیص المفتاح بھی پڑھا دیا، اس سے زیادہ نفع ہوا، جب میں پہلی دفعہ مولانا کے درس میں آیا تو سہما سہما اور لرزاں وترساں رہتا تھا اور عبارت پڑھنے کے سوا کوئی سوال کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

لیکن آہستہ آہستہ مولانا کی اس پُر ہیبت شخصیت میں چھپی ہوئی ایک دوسری شخصیت مجھ پر منکشف ہوئی، جس میں بے حد شفقت اور اتھاہ لطف ومحبت تھی، اب میں درس کے علاوہ اوقات میں بھی مولانا کے کمرہ میں پہنچ جاتا، کچھ سوالات کرتا اور مولانا سے رہنمائی کا طالب ہوتا، خوف کی جگہ محبت نے لے لی، اب کسی قدر بے تکلفی سی پیدا ہوگئی، اس محبت اور تعلق خاطر کا اثر یہ تھا کہ ایک بار مولانا نے جاتے ہوئے مجھے میرے ہم عمر حفظ کے ایک طالب علم کے ساتھ دیکھا اور گذر گئے، اگلے دن سبق میں مجھ سے گذشتہ سبق کا خلاصہ پوچھا، میں نے قریب قریب مولانا کی تقریر بعینہٖ نقل کردی، تو مسکرائے اور فرمایا کہ شاید حفظ کے فلاں طالب علم کے ساتھ تم نے اس سبق کا مذاکرہ کیا ہوگا، میں مولانا کا اشارہ سمجھ گیا کہ اپنے سے نیچی جماعت کے بچوں کے ساتھ کھیل کود یا رہنا سہنا اونچی جماعت کے طلبہ کے شایانِ شان نہیں؛ چنانچہ میں نے اسی وقت اپنے دل میں توبہ کرلی کہ آئندہ پھر حضرت الاستاذ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا۔

آئندہ سال 'ہدایہ ثالث' کا سبق مولانا سے متعلق ہوا، مولانا اپنے سبق میں ہمیشہ ان اُصول وقواعد کو خصوصی اہمیت سے بیان فرماتے تھے، جن پر جزئیات مرتب ہوتی تھیں اور ہر باب کے شروع میں تمہیدی تقریر کر کے مسائل کو اس پر منطبق کرتے جاتے تھے، نیز معمول کے مطابق مسائل اور دلائل دونوں پر نہ صرف تفصیل سے گفتگو کرتے؛ بلکہ بہت سے مواقع پر شارحین کے تسامحات کو بھی واضح کرتے جاتے، اسی زمانہ میں ایک معقولی طالب علم —— جو ضلع

مونگیر ہی کے رہنے والے تھے — جامعہ رحمانی میں آئے ہوئے تھے، کثرتِ سوال اور اس سے بڑھ کر ناشائستہ طرز مباحثہ کی وجہ سے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے ان کا اخراج ہو چکا تھا، وہ منطقی اُصولوں کے مطابق مقدمات قائم کرتے اور بعض اوقات اس انداز پر اعتراض کرتے کہ مصنف کے فلاں دعویٰ کی نقیض مثلاً سالبہ کلیہ ہونا چاہئے اور مصنف یہاں سالبہ جزئیہ لے آئے ہیں وغیرہ، اس طرح کی کج بحثیوں سے اساتذہ کو تنگ کیا کرتے تھے، ہدایہ ثالث کے درس میں بیٹھے اور میں نے خود دیکھا کہ سبحان اللہ سبحان اللہ کے سوا ایک جملہ بھی نہ کہہ سکے، یہاں تک کہ جب درسگاہ سے باہر نکلے تو کہنے لگے کہ میں نے پہلی دفعہ ایک ایسے استاذ کو دیکھا ہے، جہاں میرے لئے کوئی سوال کرنے کی گنجائش نہیں رہی، جن لوگوں نے مولانا سے پڑھا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ ان کے اس اعتراف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں تھا۔

آخری سال مسلم شریف کا سبق مولانا کے یہاں تھا، حدیث کے درس میں مولانا کی شان اور بھی فزوں تر تھی، ابتداء میں حجیتِ حدیث اور انکارِ حدیث کے رد پر بڑی چشم کشا گفتگو کئی دنوں تک فرمائی، پھر جب درس کا سلسلہ شروع ہوا تو ایسا لگتا تھا کہ جیسے ایک متلاطم سمندر ہے، جس کی کوئی نہایت نہیں ہے، ایک گھنٹہ کا درس ہوتا؛ لیکن ایسا لگتا جیسے دس منٹ کا وقت گزرا ہو، یہ کہنے میں مضائقہ نہیں کہ مولانا کو حنفیت میں بہت تصلب تھا، دوسرے فقہاء کے دلائل بھی پوری قوت سے پیش کرتے؛ لیکن اخیر میں احناف کے نقطۂ نظر کو اس طرح مدلل کرتے، اس کی ترجیحات بیان کرتے اور دوسرے دلائل کا رد فرماتے کہ طلبہ کو اس نقطۂ نظر کے صحیح وراجح ہونے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، پوری کتاب میں صرف 'بیع مصراۃ' کے مسئلہ میں مولانا نے اس طرح توضیح کی، جس سے اندازہ ہوا کہ ان کے نزدیک بھی اس سلسلہ میں احناف کا نقطۂ نظر کمزور ہے؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ تمام فقہاء اور محدثین کا بڑے ہی احترام اور توقیر سے نام لیتے اور اس میں ذرا بھی فرق نہ آنے دیتے۔

چوں کہ میں کسی قدر شوخ بھی ہوگیا تھا اور مجھے زمانۂ طالبِ علمی ہی سے ایسے تصلب سے مناسبت نہیں تھی ، نیز ہمارے ایک اور استاذ حضرت مولانا شمس الحق صاحبؒ ولی اللّٰہی ذوق کے حامل تھے اور درس کی حد تک بعض مسائل میں دوسرے فقہاء کی آراء کو بھی ترجیح دیتے تھے اور اکثر احادیثِ احکام مولانا سید شمس الحق صاحب کے یہاں پہلے اور مولانا کے یہاں بعد میں آتی تھیں ؛ اس لئے گاہے گاہے میں کچھ سوالات بھی کرتا رہتا تھا اور مولانا پوری توجہ سے جواب دیتے تھے ، ایک بار کسی مسئلہ میں میں نے پوچھ لیا کہ بہت سے مسائل میں ائمہ ثلاثہ کا تو امام صاحبؒ سے اختلاف رہتا ہی ہے ، صاحبین بھی ائمہ ثلاثہ کی طرف چلے جاتے ہیں اور امام صاحب تنہا رہ جاتے ہیں ، آخر کچھ تو اس کی وجہ ہوگی ؟ مولانا نے بڑے اطمینان سے فرمایا : دراصل بعض مسائل میں مدارک اجتہاد اس قدر دقیق ہوتے ہیں کہ امام صاحب کے سوا کسی کی نظر وہاں پہنچ نہیں پاتی اور وہاں تو ان کی رائے اور زیادہ روایت و درایت سے ہم آہنگ ہوتی ہے ۔

حدیث کے درس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک نام آنے پر درود شریف پڑھنے ، نیز صحابہ کے نام پر رضی اللہ عنہ اور فقہاء و محدثین کے نام پر رحمۃ اللہ علیہ بڑے اہتمام سے کہتے ، مشاجراتِ صحابہ پر گفتگو کرنے سے احتراز کرتے اور اگر کبھی درس میں یہ موضوع آجاتا تو اس طرح گفتگو کرتے کہ کسی صحابی سے ذرا بھی بدگمانی پیدا نہ ہو ، اسی طرح جو کتابیں پڑھاتے ، ان کے مصنف کا بڑے ادب سے ذکر فرماتے اور اگر کہیں مصنف کے تسامح پر گفتگو کرتے ، تب بھی ان کی طرف سے غلط فہمی کی وجہ پر روشنی ڈالتے ؛ تاکہ انھیں معذور سمجھا جائے ۔

اس حقیر کو دورہ کے سال میں مولانا کی مزید قربت حاصل ہوئی ، وہ نہ صرف درس دیتے ؛ بلکہ ایک حد تک میری تعلیمی اور تربیتی نگرانی بھی فرماتے ، مجھے تاکید کرتے کہ تم مسلم پر شرحِ نووی کا بالاستیعاب مطالعہ کیا کرو اور درس میں فقہ شافعی کی ترجمانی کرو اور میں اس کا

جواب دیا کروں گا، میں اس کی پابندی تو نہیں کر سکا؛ لیکن اکثر اوقات مطالعہ کی کوشش کیا کرتا تھا، مولانا کبھی کبھی کچھ سوالات شرحِ نووی سے کرلیا کرتے تھے، اس سے مطالعہ کا ذوق پیدا ہوا اور اساتذہ کی تقریر پر انحصار کرنے کی بجائے معتبر عربی شروح سے استفادہ کا حوصلہ ملا، جو مستقبل میں میرے لئے بڑا مفید ثابت ہوا۔

فراغت کے بعد جب میں مونگیر سے چلنے لگا تو مولانا نے خاص طور پر اپنی استعمال کی ہوئی بھاگلپوری چادر اور بڑی خوبصورت، منقش بُنی ہوئی سوجنی عنایت فرمائی، نیز گلے لگا کر مجھے خوب دُعا دی، اس وقت میری آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ہاتھ ملا کر میں جلدی سے آگے بڑھ گیا کہ کہیں میرے آنسوؤں پر مولانا کی نظر نہ پڑ جائے، جو لوگ مولانا کے رعب و جلال اور محتاط طرز زندگی سے واقف ہیں، انھیں خوب اندازہ ہوگا کہ مولانا کے اس عمل میں کتنی بے پایاں شفقت تھی، اللہ کا شکر ہے کہ آج تک اپنے بزرگوں کی دُعاؤں اور محبتوں کی یہ سوغات ہمارے کام آرہی ہے۔

مولانا کا ایک وصف سنت کی اتباع اور ورع وتقویٰ تھا، ہر کام بہ حد امکان سنت کے مطابق کرتے، مسجد میں ہمیشہ پہلی صف میں موجود ہوتے، زبان کی ایسی حفاظت کرتے کہ نہ کبھی کسی استاذ پر تبصرہ، نہ کسی طالب علم کی شکایت، نہ منتظمین سے گلہ کا اظہار، مدرسہ سے جو کھانا مل جاتا، وہی کھالیتے، اگر پسند نہ آئے تو تھوڑا سا کھا کر چھوڑ دیتے؛ لیکن کھانے کی شکایت اور مطالبہ سے ہمیشہ بچتے، تنخواہ بہت کم تھی اور تنگی کے ساتھ ہی وقت گذرتا تھا، مدرسہ کے حالات کی وجہ سے تنخواہ کی ادائیگی میں خاصی تاخیر ہوتی تھی؛ لیکن اِن سب کے باوجود کبھی طلبہ کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں ہوتا، رات میں جلد سونے اور فجر میں کافی پہلے اُٹھنے کا معمول تھا اور تہجد کا اہتمام؛ لیکن کم لوگوں کو اس کی اطلاع ہو پاتی تھی۔

جامعہ رحمانی میں ایک معمول حجاج کے پرتپاک استقبال کا تھا، جب بھی کوئی حاجی آتا اور خاص کر اساتذہ میں سے کوئی شخصیت حج سے واپس ہوتی تو طلبہ بسوں میں سوار ہوکر

استقبال کے لئے جمال پور اسٹیشن جاتے اور نعرۂ تکبیر، مرحبا اور خوش آمدید کی گونج میں انھیں لے کر آتے، مدرسہ پہنچنے کے بعد یہاں بھی ان کا پرتپاک خیر مقدم ہوتا اور اس دن مغرب کے بعد دارالحدیث کے ہال میں استقبالیہ پروگرام منعقد ہوتا، اس پروگرام میں طلبہ کی انجمن کی طرف سے اور بعض اوقات مختلف جماعتوں کی جانب سے سپاس نامے پیش کئے جاتے، مولانا بھی حج کے لئے تشریف لے گئے، آپ کی واپسی کا ہم لوگ بہت شدت سے انتظار کر رہے تھے اور انگلیوں پر دن گنے جاتے تھے؛ لیکن کوئی سن گن نہیں مل رہی تھی، دراصل انھوں نے اس طرح کے استقبال اور نعروں سے بچنے کے لئے اپنا پروگرام مخفی رکھا تھا، ایک دن ہم لوگوں نے اچانک دیکھا کہ مولانا صاف ستھرے معمول کے لباس میں رکشہ سے چلے آرہے ہیں، جامعہ رحمانی پہنچے، سیدھے اپنے کمرے چلے گئے، وہاں کے ماحول میں یہ ایک عجیب واقعہ تھا، آناً فاناً سب کو اطلاع ہوئی اور ملاقاتیوں کا ہجوم ہوگیا، مغرب کے بعد دارالحدیث کے ہال میں استقبالیہ نشست ہوئی، اس موقعہ سے اس حقیر نے مولانا کے استقبال کے لئے عربی میں ایک منظوم سپاس نامہ کہا تھا جو ''دیوان متنبیؔ'' کی پہلی نظم کی زمین میں تھا، مختلف سپاس نامے پیش ہوئے اور غالباً جماعت ہفتم عربی کی طرف سے میں نے یہ منظوم سپاس نامہ پیش کیا، عربی زبان میں اور پھر منظوم ہونے کی وجہ سے اس وقت بھی اور بعد میں بھی بڑی تحسین کی گئی، میرے ادبِ عربی کے استاذ مولانا علاء الدین ندویؒ تھے، جن سے ہم لوگوں نے ''مختارات'' اور ''دیوانِ متنبیؔ'' پڑھی تھی، وہ مزاج میں درشت اور تعریف میں بخیل تصور کئے جاتے تھے؛ لیکن انھوں نے بھی بڑی پذیرائی فرمائی۔

غالباً امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ بہ نفس نفیس اجلاس کی صدارت کر رہے تھے، ان کے خطاب سے پہلے آخری خطاب مولانا کا ہوا، اس خطاب میں دل اور دماغ دونوں کے لئے غذا تھی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ :

''مکہ مکرمہ'' اللہ تعالیٰ کی شان جلال کا مظہر ہے، پھر ذیل میں صفاتِ باری اور حرم محترم پر ان کی تجلیات کا تذکرہ تھا اور مدینہ منورہ

رسول اللہ ﷺ کی شانِ جمال کا عکس ہے، اس ذیل میں مدینہ میں سکینت اور انصار کے جذبۂ ایثار اور اس کے اثرات پر گفتگو تھی۔

مولانا سے محبت، تعلق اور عقیدت کی وجہ سے اس موقع پر طلبہ بہت پُر جوش تھے اور اسی جذبہ کے تحت دارالحدیث کو آراستہ کرنے کی کوشش بھی کی گئی، بہر حال اگلی صبح سے مولانا کے اسباق شروع ہو گئے، اگر ملاقاتیوں کا ہجوم نہ ہوتا تو شاید روزِ اول ہی سے درس کا آغاز ہو گیا ہوتا۔

جن اساتذہ کو اسباق کی پابندی کا بہت اہتمام کرتے دیکھا، ان میں مولانا بھی تھے، شاید و باید کبھی سبق کا ناغہ ہوتا؛ البتہ باوجود وسعتِ مطالعہ اور استحضار کے بغیر مطالعہ کے کبھی نہیں پڑھاتے، یہاں تک کہ اگر کبھی کسی وجہ سے مطالعہ نہیں ہو سکا تو بے تکلف فرما دیتے کہ رات اس کتاب کا مطالعہ نہیں ہو پایا ہے؛ اس لئے آج سبق نہیں ہوگا، نیز ان کے اخلاص کی بات تھی کہ جو بھی بڑی یا چھوٹی کتاب ان سے متعلق ہوتی، اسے پوری محنت اور اہتمام کے ساتھ پڑھاتے اور نیچے کی کتابوں کو بھی ناقابل اعتناء نہیں سمجھتے۔

درس نہایت مرتب ہوتا اور یہ ترتیب اتنی منطقی ہوتی کہ اگر کوئی طالب علم تھوڑی دیر غافل ہو جائے تو اس کے لئے اگلا مضمون سمجھنا دشوار ہو جاتا، بات میں تکرار سے بہت بچتے، سوائے اس کے کہ کوئی طالب علم گذری ہوئی بات دوبارہ پوچھ لے تو دوبارہ سمجھا دیتے، جب بھی کسی کتاب کو پڑھاتے تو نہ صرف اس فن سے متعلق گفتگو کرتے ؛ بلکہ لغوی، نحوی، صرفی، کلامی اور معقولی ہر پہلو سے اُٹھنے والے شبہات کا جواب دیتے اور قابل ذکر باتوں کو نقل فرماتے، مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ میں نے جتنے اساتذہ سے پڑھا ہے، یا جن اساتذہ کے دروس کو سنا ہے، ان میں مولانا سے بڑھ کر کسی کے درس نے متاثر نہیں کیا۔

درس میں بہت کم ایسا ہوتا کہ لطائف وظرائف کا ذکر کرتے اور اگر کبھی ایسا ذکر آ جائے تو وہ بھی تہذیب وشائستگی کو مجروح نہیں کرتا، ہنسنے ہنسانے کا مزاج بالکل نہیں تھا اور نہ درس میں کوئی غیر متعلق بات ہوتی، نہ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ ہوتا، نہ مدرسہ کے انتظام وانصرام پر کوئی

بات کی جاتی ، جماعت میں آتے ہی سبق شروع ہوتا اور جب گھنٹہ ختم ہوتا تو سبق ختم ہوتا ، پورا وقت خالصتاً تدریس میں صرف ہوتا ؛ البتہ سبق کے دوران سونے والوں پر بہت برہم ہوتے اور کبھی کبھی دو چار جملوں میں حسبِ ضرورت نصیحت بھی کرتے جاتے ، ہمیشہ سبق کے شروع سے آخر تک چہار زانو ہوکر ایک ہی بیٹھک بیٹھتے اور درمیان میں نہ پہلو بدلتے ، نہ کوئی چیز کھاتے پیتے ، پان کے عادی تھے ؛ لیکن درس کے دوران پان کھانے یا چبانے سے پوری احتیاط رکھتے ،غرض کہ پورا درس وقار وتمکنت کا مظہر ہوتا ،مونگیر کے زمانۂ قیام میں تقریر بہت کم کیا کرتے ؛ لیکن جب آپ کا خطاب ہوتا تو بڑا مفید ، مدلل اور متاثر کن ہوتا اور طلبہ گوش برآواز ہوکر سنتے ۔

تحریر بھی بڑی نفیس تھی ، مضامین لکھنے اور تصنیف وتالیف کا کام کرنے کا معمول نہیں تھا ؛ لیکن جب کوئی مفصل تحریر لکھتے تو جچے تلے الفاظ ہوتے اور سلیس عبارت ہوتی ، مکاتیب کی زبان بڑی اچھی ہوتی ، لکھتے پوسٹ کارڈ ؛ لیکن حروف کے باریک اور صاف ہونے کی وجہ سے قریب قریب فل اسکیپ سائز کا مواد اس میں سمو دیتے ، اس حقیر کے پاس بھی حضرت الاستاذ کے کئی خطوط تھے ؛ لیکن افسوس کہ کئی دفعہ مکانات بدلنے کی وجہ سے ان کی حفاظت نہ ہوسکی ۔

آپ ۱۹۳۶ء مطابق ۱۳۵۵ھ میں ریشمی صنعت کے لئے مشہور شہر بھاگلپور (بہار) کے محلّہ چمپانگر میں پیدا ہوئے ، جو قدیم بستیوں میں ہے اور کہا جاتا ہے کہ سمرقند سے آئے ہوئے ایک بزرگ ’’ حاجی دوست محمد ‘‘ کے ذریعہ یہ بستی بسی ہے ، والد ماجد کا اسم گرامی جناب اصغر علی ولد جناب ہدایت علی تھا ، جو بڑے دین دار اور علماء سے محبت رکھنے والے لوگوں میں تھے ، ان کو چار لڑکے اور تین لڑکیاں ہوئیں ، چار میں سے تین لڑکے عالم دین ہوئے جن میں آپ کی شخصیت علمی اعتبار سے سب سے نمایاں تھی ، آپ کے بڑے بھائی مفتی محمد شعیب صاحب بھی اچھے علماء میں تھے اور آپ کے برادر خورد مولانا انصار علی صاحب حدیث اور منتہی کتابوں کے ماہر اساتذہ اور باکردار علماء میں ہیں اور اس وقت دار العلوم حیدرآباد میں نائب شیخ الحدیث ہیں ۔

شرحِ جامی تک آپ کی تعلیم مدرسہ اصلاح المسلمین میں ہوئی، جسے آپ کے نانہالی خاندان کے ایک بزرگ حاجی طاہر صاحب نے ۱۳۱۱ھ میں قائم کیا تھا، یہاں آپ کے خصوصی استاذ مدرسہ کے صدر مدرس مولانا عبدالرحمٰن بھاگلپوری تھے، جو بڑے اچھے استاذ بھی تھے اور مربی بھی، مولانا ہمیشہ ان کے ممنون رہتے تھے، پھر اپنے استاذ کے حسبِ مشورہ ۱۳۶۹ھ میں دیوبند آئے، ۱۳۷۵ھ میں دورۂ حدیث سے فراغت حاصل کی، ۱۳۷۶ھ میں دورۂ تفسیر کیا اور ۱۳۷۷ھ میں افتاء کیا، آپ نے حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، علامہ ابراہیم بلیاویؒ، مولانا بشیر احمد خان دیوبندیؒ، مولانا فخر الحسن صاحبؒ، مولانا مبارک علی صاحبؒ اور مولانا ظہور احمد صاحبؒ سے کسبِ فیض کیا اور افتاء کی تربیت مفتی مہدی حسن صاحبؒ شاہ جہاں پوری سے پائی، جو مفتی کفایت اللہ صاحبؒ کے ممتاز تلامذہ میں تھے، آپ اپنے اساتذہ کا بڑی محبت سے ذکر فرماتے اور مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا ابراہیم بلیاویؒ کا ذکر خاص طور پر کیا کرتے۔

فراغت کے بعد آپ نے فوراً ہی تدریس کا راستہ منتخب کیا اور جامعہ اشرفیہ تھانہ بھون سیوہارہ اور مدرسہ حسینیہ ہرنت بھاگلپور میں خدمات انجام دیں، غالباً ۱۳۸۱ھ میں جامعہ رحمانی آئے اور تقریباً پندرہ سال وہاں تدریس کی خدمت انجام دی، اس دوران مسلم اور ابوداؤد کے علاوہ اکثر منتہی کتابیں آپ کے زیرِ درس رہیں، جامعہ رحمانی سے الگ ہونے کے بعد آپ جامعہ مفتاح العلوم مئو آگئے، یہاں بخاری اول اور مکمل ترمذی آپ کے سپرد ہوئی اور طلبہ کے رُجوع میں بھی بڑا اضافہ ہوگیا، یہ آپ کے استغناء اور احتیاط کی بات ہے کہ آپ نے مفتاح العلوم کے بورڈ سے ملحق ہونے کی بناء پر شروع ہی میں شرط لگادی تھی کہ میری تنخواہ عوامی چندہ سے ادا کی جائے، میں گورنمنٹ والی تنخواہ نہیں لونگا؛ کیوں کہ اس میں سود اور مختلف ناجائز ٹیکسوں کی آمیزش ہوا کرتی ہے، یہاں آپ نے سات آٹھ سال تدریس کا فریضہ انجام دیا۔

اس دوران مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی تجویز پر دارالعلوم دیوبند کی شوریٰ نے آپ کو علیا کا مدرس مقرر کیا اور نقشۂ تعلیم میں بھی آپ کے نام پر سنن ابوداؤد کے سبق کی صراحت منظر

عام پر آ گئی، اسی دوران مولانا کچھ مہلت لینے کے لئے دیو بند آئے اور طلبہ کے اصرار پر آپ نے ایک سبق پڑھادیا، آپ کا یہ سبق ایسا مؤثر ثابت ہوا کہ طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور پورے دارالعلوم میں اس درس کا غلغلہ بلند ہونے لگا، حاسدانہ اذہان کو یہ بات گوارا نہیں ہوئی، شوریٰ کے مستقل تقرر کو مجلس تعلیمی نے ختم کر دیا اور عارضی تقرر نامہ جاری کیا، دوسری طرف جمعیۃ الطلبہ کی طرف سے مطالبہ ہونے لگا کہ مولانا کو بخاری دی جائے، مولانا نے محسوس کیا کہ اس سے فتنہ پیدا ہوسکتا ہے اور آپ کا مزاج ہمیشہ ایسے مواقع سے بچنے کا تھا؛ اس لئے آپ خاموشی سے علی الصباح دارالعلوم سے نکل کر اپنے وطن واپس آ گئے، پھر مئو والوں کے مطالبہ پر دوبارہ تشریف لے گئے، بہر حال سات آٹھ سال آپ نے جامعہ مفتاح العلوم میں تدریس کی خدمت انجام دی۔

صفر ۱۴۰۴ھ میں ''جامعہ اسلامیہ ڈابھیل'' والوں نے آپ سے بحیثیت شیخ الحدیث ڈابھیل آنے کی خواہش کی، اس وقت مولانا ایوب اعظمی وہاں کے شیخ الحدیث تھے؛ لیکن کافی ضعیف ہو چکے تھے؛ اس لئے اربابِ انتظام ان کی جگہ مولانا کی خدمات چاہتے تھے، مولانا نے معذرت کر دی اور فرمایا کہ اس وقت میرا اس عہدہ کو قبول کرنا مولانا ایوب صاحب کے لئے باعثِ تکلیف ہوگا، اتفاق سے اسی سال شوال کی ابتداء میں مولانا محمد ایوب صاحب کی وفات ہوگئی، ڈابھیل کے اربابِ انتظام نے دوبارہ درخواست کی اور ذوالحجہ ۱۴۰۴ھ میں آپ اس تاریخی درسگاہ میں وارد ہوئے اور اس مسند مشیخت پر جلوہ افروز ہوئے، جہاں کبھی علامہ انور شاہ کشمیریؒ، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا محمد یوسف بنوریؒ جیسے نابغہ روزگار علماء کا فیضانِ علمی جاری تھا اور تادم وفات چوبیس سال یہیں تدریس کی خدمت انجام دی، اس طرح آپ نے بحیثیت مجموعی تقریباً پچاس سال تدریس کی اور قریب قریب ۴۵ سال تدریس حدیث کی خدمت انجام دی اور ملک و بیرونِ ملک کے ہزاروں طلبہ نے آپ سے استفادہ کیا۔

آپ کی تصنیفی خدمات میں ''مسلم'' کی ''کتاب الایمان'' کی اُردو شرح ''نفع المسلم''،

خاص طور پر قابل ذکر ہے، جو دراصل آپ کے دروس کا مجموعہ ہے، اسی طرح آپ کی ایک اہم یادگار جامعہ رشید العلوم ہے، جسے آپ نے اپنے محلّہ چمپا نگر میں ۲۰۰۲ء میں قائم فرمایا اور جس میں اس وقت متوسطات تک تعلیم کا سلسلہ جاری ہے، اس کے علاوہ آپ متعدد مدارس کے سرپرست تھے۔

افسوس کہ راقم الحروف کو جامعہ رحمانی سے فراغت کے بعد بہت کم ملاقات کی سعادت حاصل ہوئی، جب میں دیوبند میں تھا تو پابندی سے آپ کا گرامی نامہ آتا تھا، جو عام طور پر تعلیم سے متعلق نصیحتوں پر مشتمل ہوتا تھا؛ چنانچہ مولانا ہی کی ہدایت پر میں نے دارالعلوم میں دورہ کے سال فتح الباری اور فتح الملہم کا پورا مقدمہ پڑھ ڈالا، مولانا اپنے خط میں دریافت کرتے رہتے کہ تمہارا مطالعہ ابھی کہاں تک پہنچا؟ شاید اس نگرانی کے بغیر یہ مطالعہ دشوار ہوتا؛ لیکن مجھے بعد میں زمانۂ طالبِ علمی میں بھی اور زمانۂ تدریس میں بھی اس سے بڑا نفع ہوا، دیوبند سے فراغت کے بعد جب میں امارت شرعیہ میں قضاء کی تربیت پا رہا تھا تو ایک دن اچانک مولانا کا خط آیا جو سلام اور خیریت کے بعد کچھ اس طرح تھا :

> تمھیں اس بات سے یقیناً حیرت ہوگی کہ میں اس وقت یہ خط جامعہ رحمانی مونگیر کے بجائے جامعہ مفتاح العلوم مئو سے لکھ رہا ہوں اور تمھیں اس بات سے خوشی ہوگی کہ مجھے یہاں حدیث وفقہ کی بعض اور کتابوں کے ساتھ ساتھ بخاری شریف جلد اول پڑھانے کی سعادت حاصل ہورہی ہے، اِلیٰ آخرہ۔

میں یہ جملے پڑھ کر حیران سا رہ گیا؛ کیوں کہ مولانا کو میں جامعہ رحمانی کے ساتھ لازم وملزوم سمجھتا تھا، بہرحال وقت گذرتا گیا یہاں تک کہ میں حیدرآباد آ گیا، یہاں جب دارالعلوم سبیل السلام میں دورۂ حدیث قائم ہوا تو میں نے مولانا سے بحیثیت شیخ الحدیث تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا نے یہ کہہ کر معذرت کردی کہ ڈابھیل والوں کا سلوک میرے ساتھ

بہت اچھا ہے اور میرے پاس وہاں سے ہٹنے کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں؛ لیکن بہتر ہوتا کہ تم خود بخاری پڑھاتے، بخاری پڑھانے کے لئے بال کا سفید ہونا ضروری نہیں، بہرحال بات آئی گئی ہوگئی، پھر دورۂ حدیث کے قیام کے دوسرے یا تیسرے سال ختم بخاری کے لئے انھیں دعوت دی گئی، درس میں اساتذہ، طلبہ اور خواص شہر کے علاوہ علماء کی ایک بڑی تعداد تھی، مولانا نے بڑا پُر اثر اور چشم کشا درس دیا اور ہر طبقہ کی مناسبت سے گفتگو فرمائی، جو بہت پسند کی گئی۔

حضرت الاستاذ سے آخری ملاقات غالباً ۲۰۰۳ء میں ہوئی، اپریل ۲۰۰۲ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی وفات ہوگئی، جون میں اکیڈمی کی تنظیم جدید ہوئی جس میں اس حقیر کو جنرل سکریٹری منتخب کیا گیا، قاضی صاحبؒ کی اخیر زندگی میں خاص کر ملی کونسل کے قیام کے بعد علماء کا ایک طبقہ اکیڈمی سے کٹ گیا تھا، اس مناسبت سے راقم الحروف نے ایک طرف دیوبند اور سہارنپور کا سفر کیا اور دوسری طرف محبّ گرامی مولانا مفتی احمد دیولوی (ناظم جامعہ علوم القرآن، جمبوسر) کے ساتھ پورے گجرات کے اہم مراکز و مدارس میں حاضر ہوا، یہ بڑا ہی مفید اور یادگار سفر تھا، فطری طور پر اس نسبت سے گجرات کی سب سے بڑی دینی درسگاہ جامعہ تعلیم الدین ڈابھیل میں حاضری ہوئی اور عرصہ کے بعد مولانا کی زیارت کا موقع ملا، اس وقت مولانا خاصے بیمار تھے، انھیں بتایا گیا تھا کہ کسی شخص نے ان پر جادو کردیا ہے، صورتِ حال یہ تھی کہ ایسے حالت ٹھیک رہتی؛ لیکن جوں ہی درسگاہ کی طرف قدم بڑھاتے، ایسا لگتا کہ کسی نے قدم تھام لیا ہو، ایک بے چینی سی شروع ہوجاتی اور سبق نہیں پڑھا پاتے، کافی دنوں تک یہی کیفیت رہی؛ لیکن بعد میں اس سے شفایاب ہوئے، اس موقع پر پہلی بار محسوس ہوا کہ مولانا کی ہمت ٹوٹ رہی ہے اور اب وہ اپنی زندگی سے ایک حد تک مایوس سے ہوچکے ہیں، میں نے یہی سمجھا کہ یہ مولانا کا وہم ہے اور ایک نفسیاتی کیفیت ہے؛ لیکن غالباً مولانا کی صحت پہلے کی طرح بحال نہیں ہو پائی، مولانا کو مختلف قسم کے عوارض پہلے سے تھے، بعد میں تنفس کا عارضہ بھی پیدا ہوگیا اور اسی تکلیف میں ۲۸ / ذی الحجہ ۱۴۲۸ھ مطابق ۸/ جنوری ۲۰۰۸ء کو رحلت فرمائی اور جامعہ تعلیم الدین کے احاطہ میں پیوند خاک ہوئے۔

اس حقیر کو اسی دن شام میں اطلاع مل گئی اور اپنی طالب علمی اور مولانا کی شفقت کی پوری تاریخ نظروں میں گھوم گئی، حقیقت یہ ہے کہ ایسے مخلص اساتذہ، صاحبِ خشیت علماء اور دل و دماغ کی جامع شخصیتیں مدتوں میں پیدا ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ کتاب وسنت کے اس خادم اور دین وشریعت کے اس مبلغ وداعی کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور ان کی آخرت کو ان کی دنیا سے بہتر فرمائے۔ آمین

❁ ❁ ❁

استاذ الاساتذہ مولانا سید انظر شاہ کشمیریؒ

صاحبِ نظر عالم ، دیدہ ور قائد

شعبان ۱۳۹۵ھ میں جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر (بہار) سے مجھے دورۂ حدیث شریف سے فراغت کی سعادت حاصل ہوئی، میں نے جن اساتذہ سے کسبِ فیض، کیا وہ سب دیوبند کے ممتاز فضلاء میں تھے، پھر اس طالب علمی کے سفر کے دوران کتنے ہی رفقاء، ٹوٹ ٹوٹ کر دیوبند چلے گئے، اس نے سفر دیوبند کی آتشِ سفر کے شوق کو اور بھڑکایا، میرے والد ماجد کی نصیحت تھی کہ جن اساتذہ سے پڑھ رہے ہو، ان کی رضامندی کے بغیر کہیں اور نہ جاؤ، اس کے علاوہ امیر شریعت حضرت مولانا سید محمد منت اللہ رحمانیؒ کی خصوصی شفقت اور بار بار کی تبدیلی سے گریزاں خود اپنی طبیعت نے مجھے ان ساتھیوں کی ترغیب کے باوجود اب تک مونگیر چھوڑنے سے روک رکھا تھا؛ لیکن اب یہ رکاوٹ باقی نہ رہی، والدہ مرحومہ کو اگرچہ کہ ان درسگاہوں کی تعلیم وتربیت کا فرق چنداں معلوم نہیں تھا؛ لیکن دیوبند کی عقیدت ان کے دل ودماغ میں جاگزیں تھی، اور پھر میرے دادا شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے اور میرے چچا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلامذہ میں تھے اور ان دونوں نے دارالعلوم دیوبند میں امتیازی درجہ سے کامیابی حاصل کی تھی، یہ سب محرکات تھے، جن کے باعث والد صاحب کے ریٹائرڈ ہونے اور گھر کے حالات کے ناموافق ہونے کے باوجود دارالعلوم دیوبند میں داخلہ کی بے حد آرزو تھی، چنانچہ شوال ۱۳۹۵ھ کو میں اپنے بعض عزیزوں کے ساتھ دیوبند پہنچ گیا۔

اس زمانہ میں دارالعلوم میں جن اساتذہ کے درس اور خطاب کا شہرہ تھا، ان میں ایک اہم شخصیت حضرت مولانا انظر شاہ کشمیریؒ بھی تھے، اس لئے مولانا کی دید وشنید کا بڑا اشتیاق تھا،

ٹھنڈک گوکم ہوچکی تھی؛ لیکن ابھی بھی اچھی خاصی تھی اور عام طور پر لوگ موٹے کپڑے، سوئٹر اور چادر سے لدے پھندے رہتے تھے، اسی دوران دیکھا کہ ایک بزرگ دفتر تعلیمات کی طرف سے گذر کر صدر مدرس حضرت مولانا فخر الحسن صاحب کے کمرہ کی سیڑھیوں پر چڑھ رہے ہیں، ململ کی کامدار دو پلی ٹوپی، کامدار لکھنوی کرتا اور کسی قدر تنگ پائجامہ، پاؤں میں سلیم شاہی جوتا، کپڑوں پر ایسی استری کہ کہیں شکن نہیں، ہاتھ میں تسبیح، ایک ایک ادا اور ایک ایک شئ سے لطافت نمایاں، لڑکوں میں شور سا مچ گیا کہ شاہ صاحب آگئے ہیں، یہ پہلی جھلک تھی اور کسی قدر فاصلہ سے حضرت الاستاذ کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔

اسی زمانے میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، جو مولانا سے ملاقات کا بہانہ بن گیا اور وہ یہ کہ ہمارا داخلہ امتحان حضرت مولانا محمد حسین بہاریؒ کے ذمہ گیا تھا، اس زمانہ میں داخلہ امتحان تقریری ہوتا تھا، دارالحدیث تحتانی کے وسیع ہال میں مختلف مقامات پر عمر رسیدہ، سفید ریش اساتذہ چھوٹے چھوٹے گدے پر تکیہ لگائے بیٹھے رہتے تھے، سامنے تپائی اور تپائی پر لیمپ، سلسلہ وار ایک طالب علم کا نام پکارا جاتا اور جس کا امتحان جہاں گیا، وہ وہاں جا کر بیٹھتا، مولانا بہاری صاحبؒ ویسے بھی امام المعقولات سمجھے جاتے تھے، اس لئے ان کا امتحان نسبتاً سخت ہوتا تھا اور جو عصا ساتھ رہتا تھا، بعض دفعہ امتحان دینے والے کی اس عصائے کلیمی سے تواضع بھی ہوجاتی تھی، اس لئے لوگ ان کے امتحان سے ویسے بھی گھبراتے تھے، بہرحال خواہی نہ خواہی پہنچا اور سہم کر مولانا کے پاس بیٹھ گیا۔

میرے ساتھ ایک اور طالب علم جو غالباً بستی کے تھے، امتحان دے رہے تھے، مولانا نے زیادہ تر سوالات بیضاوی اور ہدایہ آخرین سے کئے، وہ طالب علم کسی قدر کمزور تھے، اس لئے اکثر جواب نہیں دے پائے، عام طور پر اساتذہ طلبہ سے مشکل سوالات کے جوابات نہ دینے پر آسان سوال کیا کرتے ہیں، اس کا فائدہ مجھے پہنچ گیا، میں نے تقریباً تمام ہی جوابات درست دے دیئے اور مولانا نے اس پر مزید کچھ سوال کیا تو اس کی بھی وضاحت کردی، اس کے

بعد انھوں نے کسی اور کتاب کا سوال نہیں کیا؛ البتہ دریافت فرمایا کہ میبذی پڑھی ہے؟ میں نے عرض کیا: سچی بات یہ ہے کہ میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے؛ البتہ تیاری کی ہے اور امتحان دینے کے لئے تیار ہوں، انھوں نے خوشی کا اظہار کیا، پھر کچھ تفصیل پوچھی، جب میں نے کہا کہ میں مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ کا برادرزادہ ہوں تو خاص طور پر خوش ہوئے اور فرمایا کہ جب ہی تو تو جواب دیتا رہا، بہر حال، اللہ اللہ کر کے میں واپس آیا، مجھے اُمید تھی کہ میرے نمبرات بہت اچھے آئیں گے، جب نتیجہ آیا تو دورۂ حدیث میں میرا داخلہ تو منظور ہو گیا؛ لیکن نمبرات توقع سے کم تھے اور وظیفہ کی سہولت حاصل نہ ہو سکی، صورتِ حال یہ تھی کہ والد صاحب ریٹائرڈ ہو چکے تھے، میرے ایک بہنوئی کا ذہنی توازن متاثر ہونے کی وجہ سے ایک بہن کی بھی ذمہ داری ہم لوگوں پر تھی، اس لئے ہم اس موقف میں نہیں تھے کہ اپنے اخراجات آپ ادا کریں، میں نے والد صاحب کو لکھنا بھی مناسب نہیں سمجھا کہ یہ ان کے لئے پریشانی کا باعث ہوگا؛ چنانچہ میں نے مولانا مجاہد الاسلام صاحبؒ کو خط لکھا کہ میرے نمبرات کم آئے ہیں، اس لئے وہ ماہانہ اتنی رقم دے دیا کریں کہ میری ضرورت پوری ہو جائے اور انشاء اللہ میں اسے بعد میں ادا کر دوں گا۔

قاضی صاحب اسی زمانہ میں ندوہ کے پچاسی سالہ جشن میں لکھنؤ آئے تھے، انھوں نے وہیں سے مولانا معراج الحق صاحبؒ —— جو اس وقت نائب مہتمم تھے —— کو فون کیا اور یہ معلوم کرنے کی خواہش کی کہ خالد کا نمبر کم کیوں آیا؟ مولانا معراج الحق صاحب قاضی صاحب کے استاذ بھی تھے اور ان پر بہت شفیق بھی، انھوں نے ریکارڈ نکلوایا تو معلوم ہوا کہ امتحان مولانا بہاری صاحبؒ کے یہاں تھا، انھوں نے مولانا بہاری صاحب سے تحقیق کی کہ اس طالب علم نے کیسا امتحان دیا اور قاضی صاحب کا حوالہ دیا، مولانا بہاری صاحب نے فرمایا کہ میں نے تو اسے —— جہاں تک مجھے یاد ہے —— بہت اچھے نمبرات دیئے ہیں، ایسا لگتا ہے کہ اس نے گھر سے زیادہ پیسے منگانے کے لئے یہ حرکت کی ہے؛ چنانچہ مولانا بہاری صاحب نے میرا کمرہ نمبر معلوم کرایا اور اگلے روز فجر کے معاً بعد ڈنڈا لے کر واردِ کمرہ ہوئے، آتے ہی پوچھا کہ خالد

سیف اللہ دربھنگوی کون ہے؟ ہاتھ میں لاٹھی اور اوپر سے چہرہ غضبناک، میں سہم کر کھڑا ہوگیا اور عرض کیا کہ خالد تو میرا ہی نام ہے، انھوں نے کچھ پوچھے بغیر پہلے تو دو ڈنڈے رسید کردیئے، ٹھنڈک کا موسم، جسم پر سیوٹر نہ صدری اور میں پتلا دبلا نحیف طالب علم، میرا تو حال برا تھا، انھوں نے ڈانٹنا شروع کردیا کہ تم نے مولوی مجاہد کو کیا لکھ دیا؟ گھر سے پیسہ منگانے کے لئے جھوٹ بولتے ہو، میں نے بڑی مشکل سے بتایا کہ میں نے کسی کی کوئی شکایت نہیں لکھی ہے، صرف اپنی پریشانی کو ذکر کیا ہے، مولانا کا جلال ذرا کم ہوا، تو انھوں نے پوری بات سنی اور افسوس کرنے لگے کہ اس بار جتنے طلبہ نے میرے پاس امتحان دیا تھا، بلا شبہ اس میں سب سے بہتر امتحان تم نے ہی دیا ہے۔

پھر اگلی گھنٹی میں مجھے لے کر دفتر تعلیمات پہنچے، جہاں مولانا انظر شاہ صاحب اور تعلیمات کے محرر منشی عزیز مرحوم موجود تھے، مولانا بہاری صاحب نے میرا فارم نکلوایا، پھر دیکھ کر کہنے لگے: میں نے تو اسے اچھے نمبرات دیئے ہیں، پھر مجموعی نمبر کم کیوں ہوگیا؟ اصل میں عمر زیادہ، بینائی کمزور اور لکھنے میں کسی قدر رعشہ، اس کی وجہ سے ایک خانہ کا نمبر دوسرے خانہ میں چلا گیا تھا اور ایک مضمون کا نمبر ہی درج نہیں تھا، جب انھیں یہ بتایا گیا تو شاہ صاحب سے —— جو ان کے بھی شاگرد تھے —— کہنے لگے کہ اس لڑکے نے بہت اچھا امتحان دیا تھا، میں نے اپنی دانست میں اس کو سب سے زیادہ نمبر دیا ہے اور یہ نمبر رعایتاً نہیں دیا گیا ہے، اس لئے میں اس کو ٹھیک کرنا چاہتا ہوں، شاہ صاحب نے اُصولی بات کہی کہ حضرت! اب تو فارم دفتر میں داخل ہو چکا ہے، نیز ساری کاروائی ہوگئی ہے، اب کیسے اس میں اضافہ ہوسکتا ہے؟ کافی دیر تک اس پر دونوں بزرگوں میں بحث ہوتی رہی، مولانا بہاری صاحب انھیں ڈانٹتے اور تم تمہارے سے خطاب کرتے اور شاہ صاحب اپنے مخصوص انداز میں ہنس ہنس کر نرمی سے جواب دیتے اور استاذ کے احترام میں بھی کوئی فرق نہ آنے دیتے، آخر مولانا بہاری صاحب کا جلال بڑھا اور انھوں نے شاہ صاحب پر ایک ڈنڈا لگاتے ہوئے فارم ان کے ہاتھ سے کھینچا، منشی صاحب سے پوچھ کر خالی خانہ میں نمبر ڈال دیا اور دوبارہ جمع کرا کر اس پر دستخط کردیا، شاہ صاحب

ہنستے رہے، وہ اس وقت نائب ناظم تعلیمات اور مولانا اختر حسین صاحب کی علالت کی وجہ سے عملاً ناظم تعلیمات تھے اور مولانا بہاری صاحب استاذ تھے؛ لیکن ان حضرات کے یہاں استاذ کا اتنا ادب واحترام ہوتا تھا کہ شاگرد چاہے کسی مقام پر پہنچ جائے، وہ اپنے آپ کو چھوٹا ہی سمجھتا تھا؛ اس لئے ایک طرف تو بڑی خوشی ہوئی کہ میرا نمبر بڑھ گیا تھا اور دوسری طرف استاذ کے ادب واحترام کا سبق بھی ملا۔

چند ہی دن میں نظام الاسباق آ گیا، ہم لوگوں کا طحاوی کا سبق شاہ صاحب کے یہاں گیا، یہ سبق عشاء کے بعد ہوتا تھا اور ٹھنڈک کی وجہ سے طلبہ حسب گنجائش ٹھنڈک کی مناسبت سے کپڑے پہن اوڑھ کر درسگاہ میں جاتے تھے، بعض تو ایسے صاحبِ توفیق تھے کہ کمبل اور لحاف ہی اوڑھ کر چلے جاتے تھے، دارالحدیث فوقانی میں دورہ کا سبق ہوتا تھا، چار سو سے اوپر طلبہ دورہ میں تھے اور ہال میں خاصی جگہ باقی رہتی تھی؛ لیکن شاہ صاحب کی کرامت تھی کہ عشاء کے بعد پورا دارالحدیث فوقانی کھچا کھچ بھر گیا، دورہ کے علاوہ ششم وہفتم وغیرہ کے طلبہ بھی اچھی خاصی تعداد میں آ گئے تھے، لڑکے سراپا انتظار تھے کہ شاہ صاحب کمال وقار وتمکنت کے ساتھ داخل ہوئے، ہلکے بادامی رنگ کی شیروانی اور اسی سے ملتے جلتے رنگ کا گرم رومال، جو عمامہ کی طرح سر کی زینت تھا، آنکھوں پر خوبصورت سی عینک، بیٹھے اور درس شروع ہوا، اساتذہ مائک سے پڑھایا کرتے تھے؛ لیکن شاہ صاحب مائک کا استعمال نہیں کرتے تھے، آواز ایسی طرح دار کہ دارالحدیث کے در و دیوار گونجتے تھے، ایک گھنٹہ سے اوپر ہی حدیث کی اہمیت پر شاہ صاحب کا خطاب ہوا اور خوب اور بھرپور ہوا، کیا مجال کہ کسی کو اونگھ آئے؟ پورے مجمع پر سکوت اور سناٹا، سوائے ان قہقہوں کے جو شاہ صاحب کے لطائف وظرائف پر ان کی ہم نوائی کرتا تھا، اس خطاب میں علم وتحقیق کی گہرائی بھی تھی؛ لیکن اس سے بڑھ کر زبان وبیان کی رنگینی کارفرما تھی، یہ پہلا سبق تھا جو حضرت الاستاذ سے پڑھا گیا۔

دوسرے اور تیسرے دن درس کا موضوع 'شرح معانی الآثار' کی اہمیت اور علم حدیث

میں امام طحاویؒ کی عظمت و بالغ نظری تھی، اس میں شاہ صاحب نے بڑا ہی فاضلانہ خطاب فرمایا، نفس موضوع سے متعلق علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے افادات بھی پیش کئے اور مزاح وظرافت کی گل کاریوں سے بھی مستفید فرمایا، جب تقریر کا جوش اپنے اوجِ کمال پر تھا تو اپنے مخصوص لہجے میں کہنے لگے: ''جب تم میرا درس سنتے حینگے (سنوگے) تو کہتے حینگے (کہوگے) کہ نہ معلوم یہ امام بخاریؒ کا درس ہے یا امام طحاویؒ خود قبر سے اُٹھ کر آ گئے حینگے'' (ہیں) ان کے یہاں تلفظ میں ہائے ہوز کا گذر نہیں تھا، بائے ہوز کی جگہ بھی حائے حطی کا استعمال کرتے تھے اور قدیم دکنی لب ولہجہ کے مطابق ہوں گے کی جگہ ''حینگے'' بولا کرتے تھے، اس قسم کے فقرے کہنے کے بعد بے ساختہ خود بھی ہنستے اور طلبہ کو بھی ہنسنے کا موقع دیتے، درس تو ہمیشہ ہی بہتر ہوتا؛ لیکن جس روز تازہ مطالعہ کے ساتھ آتے تو واقعی غضب ڈھاجاتے، ان کا درس کتاب کی عبارت تک محدود نہیں ہوتا؛ بلکہ مختلف جماعتوں، شخصیتوں اور کتابوں پر تبصرہ بھی ہوتا رہتا، بزرگانِ دیوبند کے واقعات کا بھی ذکر ہوتا، علامہ کشمیری کے افادات خاص طور پر نقل کرتے اور اپنی آپ بیتی بھی خوب سناتے، جو اکثر بڑی دلچسپ ہوتی، علامہ ابن عربی اور علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں پہلی بار ان ہی کے درس میں تبصرے سنے اور ان کے افکار کے بارے میں کچھ شد بد معلوم ہوئی، کہتے تھے کہ علامہ انور شاہ کشمیری، علامہ ابن تیمیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ ان کی علمی شان اتنی بلند ہے کہ جب ان کی طرف دیکھتا ہوں تو ٹوپی گرنے لگتی ہے، دوسری طرف مولانا حسین احمد مدنیؒ ان کے بڑے ناقد تھے، یہاں تک کہ ان کی تکفیر کی طرف مائل تھے، مولانا مودودی مرحوم کا بھی ذکر کسی قدر منفی انداز میں گاہے گاہے آ جاتا تھا۔

بزرگانِ دیوبند کے بڑے مؤثر اور عبرت انگیز واقعات درس میں بیان کرتے، جو فکری اور اخلاقی پہلو سے بڑے مفید ہوتے، اساتذہ میں خاص طور پر حضرت مولانا اعزاز علی صاحبؒ کا ذکر کرتے، انھوں نے ہی شعبۂ تدریس میں شاہ صاحبؒ کو بحال کیا؛ اس لئے ان کے بڑے احسان شناس تھے، ایک بار کہنے لگے کہ دارالعلوم نے ان جیسا صاحبِ جلال استاذ نہیں دیکھا، وہ جب نکلتے تو سرکش سے سرکش طلبہ بھی کمروں یا دروازوں کے پیچھے چھپ جاتے، ان کے

ہمہ رنگ درس میں سیاسی تبصروں کا بھی ایک حصہ رہتا تھا، اس زمانہ میں ایمرجنسی لگی ہوئی تھی، سنجے گاندھی کا نام سکہ رائج الوقت کا درجہ رکھتا تھا اور ان کی طرف سے جبری نس بندی کی تحریک چل رہی تھی، مسلمان نس بندی کی مخالفت میں چوں کہ پیش پیش تھے؛ اس لئے وہ خاص طور پر گورنمنٹ کا ہدف تھے، ایک دن اس سلسلہ میں خاصی دیر تک گفتگو کرتے رہے، اخیر میں پھر مزاح کا رنگ چڑھ گیا، کہنے لگے کہ تصوف کے چار سلاسل —— نقشبندیہ قادریہ، چشتیہ، سہروردیہ —— تو پہلے آرہے تھے، اب ایک پانچواں سلسلہ، سلسلۂ نس بندیہ، شروع ہوا ہے، اس سلسلہ کے امام ہیں جناب سنجے گاندھی، پھر ایک استاذ جو تجرد کی زندگی گزار رہے تھے، کے بارے میں کہا کہ فلاں صاحب اس سلسلہ میں بیعت ہیں، اس طرح کے خطابات درس کو زعفران زار بنادیتے تھے اور طلبہ کو تکان کا احساس نہ ہوتا تھا۔

اگر انتظامی ذمہ داریوں کی وجہ سے کبھی مطالعہ نہیں کر سکے تب بھی ان کو پکڑنا آسان نہیں تھا، وہ اپنی خطابت سے دلوں کو فتح کر لیتے تھے، ایک دفعہ راقم الحروف ہی نے عبارت پڑھی، غالباً اس روز کما حقہ مطالعہ کا موقع نہیں مل پایا تھا، عنوان کی تھوڑی سے وضاحت کی، پہلی روایت حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تھی، سند پڑھتے ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ تک پہنچے، فرمانے لگے، جانتے ہو یہ کون علی رضی اللہ عنہ ہیں؟ پھر تو حضرت علی رضی اللہ عنہ پر چالیس پینتالیس منٹ تک ایسا مؤثر خطاب فرمایا کہ سارے طلبہ ہمہ تن گوش اور آنکھیں نم، پھر کہنے لگے: بھائی اب تو وقت ختم ہوگیا، اس لئے حدیث کے ترجمہ پر اکتفاء کرتا ہوں اور بس۔

ایک دن غالباً نجاست ماء کے مسئلہ میں شاہ صاحبؒ نے بڑا ہی عمدہ درس دیا، فقہاء کے اقوال اور دلائل کا بھرپور استیعاب فرمایا، میں پابندی سے حافظ ابن رشد کی بدایۃ المجتہد پڑھا کرتا تھا، اسی کی روشنی میں احناف کے نقطۂ نظر پر ایک اعتراض لکھ کر پرچی بھیجی، اس زمانے میں حدیث کے اسباق کے سلسلہ میں کچھ کشاکش تھی، انھیں غلط فہمی ہوئی کہ شاید کسی استاذ نے سکھا کر بھیجا ہے؛ حالاں کہ ایسا بالکل نہیں تھا، میں چوں کہ دوبارہ دورۂ حدیث کر رہا

تھا، اس لئے بدایۃ المجتہد، تحفۃ الاحوذی اور فتح الباری کا پابندی سے مطالعہ کرتا تھا اور اسی مطالعہ کے نتیجہ میں گاہے سوالات کرلیا کرتا تھا، شاہ صاحب نے میرا سوال پڑھ کر سنایا، نام نہیں پڑھا اور فرمایا: میں خوب سمجھتا ہوں کہ اس پردۂ زنگاری میں کون محبوب چھپا ہوا ہے؟ مجھے اپنے آپ پر بڑی شرمندگی ہوئی کہ خواہ مخواہ میں نے یہ سوال کرکے استاذ کے دل کو مکدر کیا، اس کے دوسرے تیسرے دن ہی دارالعلوم کی مجلس عاملہ کا اجلاس تھا، امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ اور دوسرے ارکان تشریف لائے ہوئے تھے، مولانا رحمانیؒ کا سلوک میرے ساتھ ایک مشفق سرپرست و مربی کا تھا، اس زمانہ میں دارالعلوم میں اکثر فیصلے ان ہی کی رائے پر ہوا کرتے تھے، اسی لئے ان کا کمرہ ضرورت مندوں کا مرجع بنا رہتا تھا، مولانا نے مجھ سے تعلیم کے بارے میں پوچھا، میں نے شاہ صاحبؒ کے درس کا یہ واقعہ نقل کردیا، سوء اتفاق کہ اِدھر میری بات ختم ہوئی اور اُدھر شاہ صاحب آپہنچے، مولانا رحمانی بڑے صاف گو آدمی تھے، انھوں نے شاہ صاحب سے تعارف کرایا کہ یہ مولوی مجاہد کے بھتیجے ہیں اور پوچھ بیٹھے کہ انھوں یہ سوال کیا اور آپ نے اس طرح جواب دیا، اب میرا حال یہ تھا کہ کاٹو تو خون نہیں، شاہ صاحب نے ہنستے ہوئے فرمایا: اچھا، میں تو انھیں پہچانتا نہیں تھا، میں نے تو ان کو دیکھ کر سمجھا کہ شاید یہ شرح وقایہ یا ہدایہ اولین کی جماعت میں پڑھتے ہیں اور یوں ہی شوق میں دورۂ حدیث کے سبق میں آبیٹھے ہیں۔

یہ ایسا تعارف تھا کہ پھر اس کے بعد تعارف کی ضرورت نہیں پڑی، اکثر عصر کے بعد جب شاہ صاحب معمول کے مطابق چہل قدمی کے لئے نکلتے، سرِ راہ ملاقات ہوتی اور سلام کرنے کی سعادت ملتی تو ہمیشہ مسکرا کر ملتے، خیر و عافیت پوچھتے، تعلیم کے بارے میں معلوم کرتے اور حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے بارے میں ضرور دریافت فرماتے؛ کیوں کہ میرے پاس ان کے خطوط آتے رہتے تھے۔

دارالعلوم سے فراغت کے بعد عرصہ تک ملاقات کا موقع نہیں ملا، پھر دارالعلوم میں

ناخوشگوار طریقہ پر انتظامی تبدیلی کا واقعہ بلکہ سانحہ پیش آیا، میں سمجھ رہا تھا کہ شاہ صاحب بجھ گئے ہونگے اور ان کی خوش مزاجی اور زندہ دلی رخصت ہوگئی ہوگی، اس کے بعد پہلی بار آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کسی اجلاس میں غالبًا کلکتہ میں ملاقات ہوئی، اگر چہ وہ دارالعلوم کے قضیہ پر اپنے مزاج کے برخلاف مشتعل ہوجاتے تھے؛ لیکن ان کی خوش مزاجی اور ظرافت اب بھی قائم تھی۔

دارالعلوم سبیل السلام میں دورۂ حدیث کا افتتاح ہوا، مولانا محمد رضوان القاسمی صاحبؒ اور اس حقیر دونوں کی رائے تھی کہ افتتاحِ بخاری کے لئے شاہ صاحبؒ کو زحمت دی جائے، شاہ صاحب نے دعوت قبول فرمائی، کھلے میدان میں وسیع شامیانہ کے زیر سایہ جلسہ ہوا، شاہ صاحبؒ نے بخاری کی خصوصیت، تراجم ابواب، امام بخاریؒ کے حالات نیز پہلی حدیث اور اس کی مناسبت وغیرہ پر بڑی ہی تفصیل سے روشنی ڈالی اور اہل علم اور اصحابِ ذوق بے حد محظوظ ہوئے، اس موقع پر تعارفی خطاب اور نظامت اس حقیر سے متعلق تھی، شاہ صاحبؒ میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے فرمانے لگے کہ بھائی تمہاری تقریر و تحریر اور تصویر میں کوئی مناسبت نہیں —— ہم لوگ بخاری کے لئے کسی اچھے استاذ کے متلاشی تھے، یہ ان کی محبت و شفقت اور اپنے حقیر شاگرد کے ساتھ حسن ظن تھا کہ مولانا محمد رضوان صاحب مرحوم سے کہنے لگے کہ مولوی خالد خود کیوں نہیں بخاری پڑھاتے؟ آپ کے پاس خود چراغ موجود ہے، آپ دوسرے کا چراغ کیوں تلاش کر رہے ہیں؟ میں نے عرض کیا کہ جب تک میں صحاح ستہ میں سے ایک دو کتابیں نہ پڑھالوں، بخاری پڑھانا مناسب نہیں سمجھتا۔

ایک اور سال انھیں ختم بخاری کے لئے مدعو کیا گیا، اس سال بھی بڑا اچھا خطاب ہوا؛ لیکن ایک خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مدرسہ کے استاذ محبی مولانا محمد یٰسین صاحب قاسمی سے جلالین شریف کا درس متعلق تھا، انھوں نے تبرکا ایک خصوصی مجلس میں مولانا سے کتاب ختم کرانے کی گذارش کی، شاہ صاحب نے اس وقت جلالین ختم کراتے ہوئے بڑا ہی مفید و عمدہ خطاب فرمایا اور ربط آیات کے موضوع پر ایسی عمدہ گفتگو کی کہ نہ کہیں اور سننے کا موقع ہوا نہ

پڑھنے کا، واقعہ ہے کہ انھیں قرآن میں بھی بڑی بصیرت حاصل تھی، دارالعلوم میں بھی وہ عرصہ تک ترجمہ قرآن کا درس دیا کرتے تھے اور رمضان المبارک میں بنگلور میں ان کا عوامی درسِ قرآن ہوتا تھا، جس کا پورے شہر میں شہرہ تھا۔

جب میں دارالعلوم پہنچا تو وہاں ان کی خطابت کا طوطی بولتا تھا، متعدد بار ہم لوگوں کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملا، حیدرآباد میں بھی مختلف دینی جامعات کی دعوت پر متعدد بار ان کی تشریف آوری ہوتی رہی، ان کے خطاب میں آواز کا زیر و بم بھی تھا اور الفاظ کا شکوہ بھی، اس لئے سامعین پر بڑا اثر پڑتا تھا اور یہ کیفیت بوڑھاپے تک تھی؛ البتہ ایک فرق یہ پیدا ہوگیا تھا کہ ہم لوگوں کے زمانۂ طالب علمی میں ان کے خطاب پر علمی وفکری رنگ غالب رہتا تھا اور بعد میں بزرگوں کی حکایات اور صوفیاء کی کرامات نیز خوابوں کا ذکر زیادہ ہوتا تھا، اس میں بعض اوقات غلو کا احساس ہوتا تھا، ایک دینی درسگاہ میں بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیتے ہوئے نہ جانے کیوں کر گفتگو کا رُخ اموات کے تصرف کی طرف ہوگیا، فرمانے لگے: قبور متصرف ہیں، میں سامنے بیٹھا تھا، یہ فقرہ سن کر مسکرانے لگا، شاہ صاحب نے دیکھ لیا اور بھانپ گئے کہ میرا ذہن اسے قبول نہیں کر رہا ہے، فوراً ڈسک پر مکا مارتے ہوئے کہنے لگے: قبور معطل نہیں ہیں، قبور معطل نہیں ہیں، قبور متصرف ہیں، پھر اس کی دلیل میں شاہ ولایتؒ اور مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کا ایک واقعہ ذکر کیا، چوں کہ میں شوخ بھی تھا، اس لئے بعد میں تنہائی میں عرض کیا کہ آپ ہی حضرات نے پڑھایا ہے کہ ادلۂ شرعیہ چار ہیں، اگر قبور کے متصرف ہونے پر ان سے دلیل پیش کی جاتی تو قابل قبول ہوتی، فرمانے لگے: بھائی تو بڑا ظالم ہے، مان کر نہیں دے گا۔

بہرحال وہ اپنے زمانہ کے ممتاز خطباء میں تھے اور ان کی تقریروں کے کئی مجموعے شائع ہوچکے ہیں؛ البتہ یہ ظاہر ہے کہ نقل کئے گئے خطبوں میں الفاظ تو محفوظ کئے جاسکتے ہیں، آواز

کے زیر و بم اور مقرر کے ان نقوش کو کیوں کر شامل کیا جا سکتا ہے، جو سامعین کے دلوں کے تار بجاتے ہیں اور ان کے دماغ کے نہاں خانوں تک دستک دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے جلسوں میں شرکت کی کثرت اور تدریسی مشغولیت کی وجہ سے تصنیف و تالیف کی طرف کم توجہ دی، پھر بھی ایک گنج گراں مایہ چھوڑ گئے، ان کے تالیفی ترکہ میں والد ماجد کی سوانح نقش دوام، مولانا اعزاز علی صاحب کا تذکرہ تذکرۃ الاعزاز، حدیث میں الفیض الجاری اور تراجم ابواب اور بیضاوی کی اُردو شرح تقریر شاہی، نیز علامہ کشمیری کے علمی نوادر بہ نام علامہ کشمیری کے علمی تفردات اور سوانحی خاکہ پر لالہ وگل خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ آپ نے ابن کثیر، مدارک، مختلف عربی تفسیروں کے اُردو ترجمے بھی کئے ہیں، طریقۂ تدریس پر تعلیم المتعلم جیسی اہم کتاب کا ترجمہ فرمایا ہے اور بھی متعدد اہم ترجمے آپ کے قلم سے ہیں۔

شاہ صاحب کے اُسلوب تحریر پر اصحابِ قلم نے قلم نہیں اٹھایا، ورنہ واقعی یہ توجہ کا مستحق ہے، ان کی تحریروں میں ابوالکلامیت پوری طرح نمایاں ہے، جو استعارات وتشبیہات، خوبصورت الفاظ، اور طویل فقروں سے آراستہ رہتی ہیں، اس سلسلہ میں علامہ انور شاہ کشمیریؒ کے تذکرہ پر ''نقش دوام'' اور شخصیات پر لکھے جانے والے مضامین کا مجموعہ ''لالۂ وگل'' کو ملاحظہ کیا جا سکتا ہے، شخصیات پر ان کا قلم بڑا جادو جگاتا ہے اور کچھ اس طرح نقشہ کشی کرتا ہے کہ قاری اپنے آپ کو صاحب تذکرہ کے ساتھ محسوس کرنے لگتا ہے، ''لالۂ وگل'' میں شاہ صاحب نے ایک مضمون اپنی مرحومہ بیوی پر ''بے وفا محبوبہ'' کے عنوان سے لکھا ہے، یہ ایسا اثر انگیز ہے کہ پڑھتے ہوئے آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں۔

شاہ صاحب پر مزاح وظرافت کا غلبہ تھا اور اس کا سلسلہ درس گاہ سے لے کر عوامی اجتماعات اور نجی مجلسوں تک جاری رہتا تھا، یہ بعض اوقات اس کے پیچھے چھپی ہوئی روحانیت کو

سمجھنے میں رکاوٹ بن جاتا تھا، حقیقت یہ ہے کہ ان کے یہاں ذکر اور درود شریف کی بڑی کثرت تھی، اُٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے زبان پر اللہ کا نام رہتا تھا، جن لوگوں نے ان کو دیکھا ہے، ان کو بتانے کی ضرورت نہیں کہ وہ فجر اور عصر کے بعد پابندی سے ٹہلنے کا اہتمام کرتے تھے اور یہ معمول حضر کے ساتھ ساتھ سفر میں بھی رہتا تھا، اس پورے وقت میں زبان ذکر میں مصروف ہوتی اور انگلیاں تسبیح کے دانوں پر حرکت کرتی رہتیں، تلاوت قرآن مجید اور نفل کی بھی کثرت تھی، بزرگوں کا ذکر خیر ان کی مجلسوں کا امتیاز تھا، اپنے اساتذہ کا نام بڑے احترام سے لیتے، ایک بار کسی تقریب کی مناسبت سے طلبہ نے مدعوئین کی فہرست بنائی، تو شاہ صاحب کا نام اوپر رکھ دیا اور ان کے بعض اساتذہ کا نیچے، اس پر بہت ناراض ہوئے، دورۂ حدیث کے سبق میں بھی اس کا ذکر فرمایا، اکابر دیوبند کے بعض ایسے واقعات بھی ان سے سننے کو ملے، جن کی حیثیت سینہ بہ سینہ روایت کی تھی، کتابوں میں ان کا ذکر نہیں ملتا۔

شاہ صاحب کا حسن ظن اور ان کی محبت تھی کہ وہ اس حقیر پر بڑا اعتماد کرتے تھے، جب حضرت مولانا مفتی احمد علی سعید صاحبؒ کی وفات ہوئی تو شاہ صاحب نے شعبۂ افتاء کے ذمہ دار اور مدرس کی حیثیت سے مجھے دعوت دی، مگر میرے لئے اپنے حالات کے لحاظ سے اس وقت حکم کی تعمیل دشوار تھی، اس لئے خوش اُسلوبی کے ساتھ معذرت کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

اس حقیر پر استاذ گرامی کے اعتماد ہی کی بات تھی کہ ایک دفعہ حج کے موقع پر وہ باب ملک عبدالعزیز کے اندرونی حصہ میں ایک صاحب کے ساتھ کھڑے تھے، جو اُن سے کچھ مسائل دریافت کررہے تھے، میں اسی درمیان کعبۃ اللہ کے صحن کی طرف سے 'باب ملک عبدالعزیز' کی طرف آرہا تھا، مولانا کی نظر پڑی، آپ نے زور سے آواز دی: ''مولوی خالد، مولوی خالد''! میں جب مڑا تو استاذ گرامی سامنے تھے، فرمانے لگے: پہلے تو انھیں مسئلہ بتاؤ، پھر ایک دوسرا مسئلہ بھی حل کرنا ہے، وہ صاحب حج اور جنایت سے متعلق دریافت کررہے تھے، ان کا جواب دیا گیا، پھر مستفتی کو روانہ کرنے کے بعد شاہ صاحب نے اپنے مخصوص لب ولہجہ میں فرمایا:

’’بھائی! ایک مسئلہ اس سے بھی اہم ہے، بہت ہی اہم، اور وہ یہ کہ میں پی، وی نرسمہا راؤ (جو اس وقت ہندوستان کے وزیر اعظم تھے) کی دعوت پر آیا ہوں، لوگ کہتے ہیں گے (ہیں) کہ تمہارا حج درست نہیں ہوگا؛ کیوں کہ تم اس ظالم وزیر اعظم کی دعوت پر حج کر رہے ہو‘‘ میں نے ہنستے ہوئے عرض کیا کہ جب آپ تشریف لے آئے ہیں تو مجھے تو کوئی نہ کوئی راستہ نکالنا ہی ہوگا، میں نے عرض کیا کہ جو چیز عبادت کے لئے وسیلہ کا درجہ رکھتی ہو، اس میں غیر مسلم سے مدد لینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوۂ حنین کے موقعہ سے صفوان بن امیہ سے ہتھیار وغیرہ حاصل کئے اور ایک موقعہ پر مسلمانوں کے قافلہ کے لئے غیر مسلم عورت سے وضوء کا پانی حاصل کیا، حج میں حکومت سفر کی سہولت فراہم کرتی ہے، یہ وسائل ہی میں تعاون ہے؛ اس لئے اس کو ناجائز نہیں کہا جاسکتا؛ البتہ فقہی نقطۂ نظر سے ہٹ کر میری شخصی رائے یہ ہے کہ اس وقت بابری مسجد کی شہادت کے مجرم سے آپ جیسی نمائندہ شخصیت کا تعاون قبول نہ کرنا بہتر تھا، مولانا بہت خوش ہوئے، دُعاء دی اور فرمایا کہ تم نے جو دوسری بات کہی، وہ بھی درست ہے؛ لیکن حج بیت اللہ کی نسبت سے میں نے اس پیش کش کو قبول کرلیا، اگر کوئی اور سفر ہوتا تو میں قبول نہ کرتا۔

بعض دفعہ انسان جن حالات سے گذرتا ہے، اس کا ردعمل انسان پر بہت بڑھ جاتا ہے اور حد اعتدال سے گذر جاتا ہے، یہی صورتِ حال مولاناؒ کے ساتھ گورنمنٹ کے مجوزہ مرکزی مدرسہ بورڈ کے سلسلہ میں پیش آئی، اس وقت ساری ملت اسلامیہ ہند کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ گورنمنٹ کی طرف سے ’مرکزی مدرسہ بورڈ‘ کی تجویز گمراہ کن اور مدارس کے لئے تباہ کن ہے اور یہ درحقیقت مدارس کے کردار کو ختم کرنے کی ایک سازش ہے؛ لیکن شاہ صاحبؒ اخیر زمانہ میں پوری طرح اس مجوزہ بورڈ کے حامی ومؤید رہے، ان کا خیال تھا کہ مدارس کے مہتمم اور ذمہ دار حضرات عملہ کے ساتھ جو زیادتی کرتے ہیں، اساتذہ کے لئے اس سے تحفظ کا راستہ یہی ہے، شاہ صاحب کے اس نقطۂ نظر سے تو اتفاق مشکل ہے؛ لیکن یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ مدارس کے

انتظامی معاملات میں واقعی اصلاح کی ضرورت ہے۔

شاہ صاحبؒ نے ۱۳۷۲ھ سے ۱۴۰۰ھ تک یعنی ۲۹ سال دارالعلوم میں درس دیا اوراس شان سے دیا، کہ ان کے درس کی مقبولیت اپنے اوجِ کمال پر تھی، اور درس نظامی کی اکثر کتابیں ان کے زیر درس رہیں، پھر دارالعلوم میں جس بد بختانہ انتظامی اختلافات نے سر اُٹھایا، اس میں انھوں نے اپنے سابقہ تعلقات سے ہٹ کر مولانا اسعد مدنی مرحوم کی بجائے، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب کی رفاقت کو ترجیح دی اور احاطہ دارالعلوم کو داغ فراق دینے پر مجبور ہوئے، پھر جب جامع مسجد دیوبند میں دارالعلوم وقف کی ابتداء ہوئی تو وہ نہ صرف اس لٹے پٹے خستہ سامان قافلہ میں شریک رہے؛ بلکہ اس کی سالاری کی اور اپنے درس بخاری کے ذریعہ اس درسگاہ کو طلبہ کا مرجع بنانے کی کامیاب کوشش فرمائی، جس کو سر چھپانے کے لئے کوئی سایہ بھی میسر نہیں تھا، شاہ صاحبؒ نے اسے تعلیمی اعتبار سے بھی آگے بڑھانے کی کوشش کی، وہ تعلیمی اُمور کے ذمہ دار بھی تھے اور مالی اعتبار سے بھی اس کے لئے کثرت سے ملکی اور غیر ملکی اسفار کرتے تھے، اس میں شبہ نہیں کہ انھوں نے اس کو کھڑا کرنے میں اہم کردار ادا کیا؛ لیکن افسوس کہ جلد ہی ذمہ داروں کا باہمی توافق غالباً کم ہوگیا اور شاہ صاحبؒ نے وہاں درسِ بخاری کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اپنے والد ماجد علامہ سید انور شاہ کشمیریؒ کے نام پر 'معہد الانور' کی بنیاد رکھی اور اسے کم وقت میں ظاہری اور معنوی ہر دو اعتبار سے آگے بڑھانے کی کامیاب کوشش فرمائی؛ چنانچہ اس وقت اس جامعہ میں دورۂ حدیث، افتاء اور تکمیل ادب کا شعبہ بھی قائم ہے، یہ استاذ گرامی کی بہترین علمی یادگار ہے اور انشاء اللہ ان کے لئے بہترین صدقہ جاریہ بھی۔

حضرت الاستاذ سے آخری ملاقات ان کے دولت خانہ پر اس وقت ہوئی، جب دارالعلوم وقف دیوبند میں مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ پر سیمینار منعقد ہو رہا تھا، سیمینار نے ایک عوامی جلسہ کی صورت اختیار کر لی تھی، اس بھیڑ بھاڑ میں آنکھیں بجا طور پر حضرت قاری

صاحب کے اس مخلص اور وفادار رفیق کو تلاش کر رہی تھیں؛ لیکن نہ معلوم کیوں شاہ صاحب اس پورے پروگرام سے دور دور رہے، اس صورتِ حال کو دیکھ کر افسوس بھی ہوا اور بعد نماز مغرب درِ دولت پر حاضری ہوئی، ملک کے مختلف علاقوں سے آنے والے متعدد مہمان وہاں موجود تھے۔

شاہ صاحبؒ حسبِ معمول بڑی شفقت سے پیش آئے، کچھ مزاحیہ فقرے بھی کہے اور کچھ حوصلہ افزائی کے کلمات بھی، اس وقت وہ اچھے خاصے تھے، ہلکے پھلکے، چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور ہنستے بولتے؛ لیکن کچھ عرصہ کے بعد ان کی علالت کی اطلاع ملی، شاہ صاحبؒ کی احتیاط اور صحت مندی کی وجہ سے گمان نہیں تھا کہ بیماریاں ان کو اتنی جلدی زیر کرلیں گی؛ لیکن جب بیمار ہوئے تو تیزی سے بیماری کی گرفت بڑھتی چلی گئی اور چند ہی مہینوں میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔

صاحبزادۂ محترم برادرم مولانا احمد خضر صاحب سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے وفات سے کچھ عرصہ قبل خواب دیکھا کہ وہ اپنے صاحبزادے کے ساتھ کھڑے ہیں اور ہاتھ میں چھتری ہے، پھر اتنی تیز آندھی آئی کہ چھتری اُڑ گئی، ایک ٹرین آئی اور شاہ صاحب نے دوڑتے ہوئے ٹرین پکڑ لی، اس دوڑنے میں جوتے بھی نکل گئے؛ البتہ صاحبزادے ٹرین میں سوار نہیں ہو سکے، شاہ صاحب نے پھر خود اپنے صاحبزادے سے اس کی تعبیر بیان فرمائی کہ چھتری کے اُڑ جانے سے مراد ہے ہوش وحواس کا ختم ہو جانا، اور جوتیوں کے پاؤں سے نکل جانے سے مراد ہے چلنے پھرنے کی قدرت کا ختم ہو جانا، اور یہ ٹرین آخرت کی سواری ہے، یعنی موت کی سواری پر سوار ہونا، اور تمہارے رہ جانے سے مراد ہے زندہ بچ جانا، جب صاحبزادہ نے پلٹ کر دیکھا تو شاہ صاحب کی آنکھیں اشکبار تھیں، انھیں اللہ تعالیٰ نے تعبیر خواب کا ملکہ دیا تھا اور وہ کثرت سے ابن سیرین کی تعبیرات کو اپنے درس وخطاب میں بھی موقع کی مناسبت سے نقل کیا کرتے تھے، اس ذوقِ تعبیر نے ان پر موت کی قربت کو پوری طرح منکشف کر دیا تھا، آخری بار دیو بند سے جاتے ہوئے در ودیوار پر نگاہِ حسرت ڈالتے ہوئے روانہ ہوئے اور فرمایا کہ شاید اب یہاں واپسی نہ ہو،

ان کا یہ قیاس صحیح ثابت ہوا، آخر ۱۹/ربیع الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ۲۶/اپریل ۲۰۰۸ء کو دعوت واصلاح اور تدریس وخطابت کے میدان میں چہکنے والا یہ بلبل ہمیشہ کے لئے خاموش ہوگیا، صاحبزادہ گرامی ہی سے معلوم ہوا کہ اخیر وقت میں گو ہوش وحواس متاثر ہو چکا تھا، مگر زبان پر ''اللہ اللہ'' کا ورد تھا اور کیوں نہ ہوتا؛ کہ زندگی میں انسان کا جو عمل ہوتا ہے، اسی پر اس کا خاتمہ بھی ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ مغفرت کرے اور جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

❁ ❁ ❁

استاذ گرامی مولانا فضل الرحمٰن رحمانیؒ

(ایک مثالی استاذ، بے مثال مربی)

والدین کے بعد انسان کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے زیادہ جن کا حصہ ہوتا ہے، وہ ہیں اساتذہ، اگر انسان کے جسم کی نشو ونما والدین کی رہین منت ہوتی ہے تو اس کی فکری نشو ونما اساتذہ کے ذریعہ وجود میں آتی ہے؛ اسی لئے جب بھی کسی اہم شخصیت کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے اساتذہ کا ذکر بھی ضرور ہوتا ہے، اس لئے اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے محسنین کی فہرست میں اساتذہ کے نام کو بڑی اہمیت حاصل ہے، پھر اساتذہ میں بھی بعض وہ ہوتے ہیں کہ شاگردپر ان کی محبت وشفقت اور توجہ وعنایت کے خاص چھاپ ہوتی ہے اور اس کی شخصیت طالب علم کی زندگی کا ناقابل فراموش حصہ بن جاتی ہے۔

راقم الحروف کو بھی بحمد اللہ ایسے اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا، جو علم وفضل، ورع وتقویٰ، تدریسی صلاحیت اور طلبہ کے ساتھ شفقت کے معاملہ میں اپنی مثال آپ تھے، ایسی ہی نمایاں شخصیتوں میں ایک حضرت مولانا فضل الرحمٰن رحمانیؒ تھے، وہ نہ شیریں بیاں مقرر تھے، نہ شستہ ودل آویز قلم کے مالک اور مصنف، نہ شعر وسخن کا ذوق رکھتے تھے، نہ مجلس کو زعفران زار کردینے والی گفتگو کرتے تھے، وضع قطع بھی عام سی تھی، شکل وصورت کے اعتبار سے بھی بہت وجیہ نہ تھے؛ لیکن ان سب کے باوجود وہ ایک کامل درجہ کے استاذ اور نہایت کامیاب مربی تھے، نیز انتظامی اُمور میں سختی واُصول پسندی کے باوجود وہ محنتی اساتذہ اور تعلیم سے رغبت رکھنے والے طلبہ کی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور بن کر رہتے تھے۔

یہ حقیر جب بارہ تیرہ سال کی عمر میں جامعہ رحمانی میں داخل ہوا تو ان کو مدرس ہوئے دو چار ہی سال گذرے تھے، جامعہ میں اس وقت بڑے عالی قدر، منجھے منجھائے، میدان تدریس کے شہسوار اساتذہ موجود تھے، ان میں سے اکثر خود مولانا رحمانی کے بھی اساتذہ میں تھے، امیر شریعت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی نظر جوہری کی نظر تھی، وہ ہر جگہ سے شہد کی مکھی کی طرح عطر کشید کر کے لاتے اور اپنے گلشن علمی میں اس کو کچھ اس طرح سجا دیتے کہ گویا وہ شخص اسی جگہ کے لئے پیدا ہوا تھا، اس ماحول میں ایک نوعمر اور نو فارغ نوجوان کا تدریسی اعتبار سے مقبول ہو جانا کچھ آسان بات نہیں تھی؛ لیکن مولانا فضل الرحمٰن رحمانی صاحب کے یہاں یہ مشکل آسان ہو چکی تھی، ان کا درس بے حد مقبول تھا، طلبہ شائق رہتے تھے کہ ان کا سبق مولانا سے متعلق ہو اور حقیقت یہ ہے کہ طلبہ انھیں خود ان کے بعض اساتذہ پر بھی ترجیح دیتے تھے۔

عام طور پر جب آدمی اس مقام پر پہنچتا ہے تو اس میں اپنی صلاحیت کا احساس پیدا ہو جاتا ہے اور یہ احساس اپنے بڑوں کی بڑائی کو تسلیم کر لینے میں رکاوٹ بننے لگتا ہے؛ لیکن مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ اپنے تمام اساتذہ کا احترام کرتے ان کے سامنے بچھے رہتے، اور تواضع کا دامن نہیں چھوڑتے۔

وہ جب پڑھاتے تو اس محنت کے ساتھ کہ گویا حاصل زندگی یہی ہے، ہر سبق کے مالہ وما علیہ کا مطالعہ کرتے، کوشش کرتے کہ سبق کے متعلق جتنے پہلو ہیں، سب حل ہو جائیں اور کوئی تشنگی باقی نہ رہے، ان کی خاص کوشش یہ ہوتی — جو کم اساتذہ میں ہوتی ہے — کہ کمزور سے کمزور طالب علم بھی سبق کا مضمون سمجھ لے، اس کے لئے حسبِ ضرورت ایک بات کئی کئی بار دوہراتے اور اس میں ذرا بھی الجھن محسوس نہیں کرتے، حضرت مولانا ابوالعرفان ندویؒ (سابق نائب مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ) بڑے پایہ کے مدرس تھے اور بارہا تفسیر بیضاوی کا درس دے چکے تھے، انھوں نے جب مولانا رحمانی کا درس بیضاوی سنا تو فرمایا کہ اس کتاب کا اتنا بہتر استاذ میں نے نہیں دیکھا، اس سے ان کی تدریسی مہارت

کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سبق میں سوال کے جتنے پہلو ہو سکتے تھے، ان سب کو خود ذکر کر کے جواب دیتے اور بہت کم سوال کی گنجائش باقی رہ جاتی، پھر بھی اگر کسی نے سوال کیا تو ذرا بھی ناراض نہیں ہوتے؛ بلکہ اگر نامعقول سوال ہوتا تب بھی حوصلہ شکنی نہیں فرماتے اور اگر کوئی سوال قابل غور محسوس ہوتا تو یہ کہنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے کہ تمہارا سوال معقول ہے، میں کتابوں سے مراجعت کر کے اور ضرورت پڑی تو اپنے اساتذہ سے استفادہ کر کے کل جواب دوں گا، تدریس میں حل عبارت پر خوب توجہ دیتے؛ تاکہ طلبہ فہم کتاب کے معاملہ میں خود مکتفی ہوجائیں، درس میں غیر متعلق باتوں سے گریز کرتے، ہنسی مذاق کی بات کہنے سے خوب بچتے؛ لیکن کبھی طلبہ میں نشاط پیدا کرنے کے لئے کوئی ہلکا پھلکا لطیفہ بیان کردیتے، یا کسی طالب علم سے کچھ مزاح فرماتے؛ لیکن کوئی بات اخلاق کے دائرہ سے باہر نہیں ہوتی اور نہ کسی قسم کا استہزا کرتے، غرض کہ مولانا علوم اسلامی کی تدریس کے لئے وقف تھے، انھوں نے اسی کو اپنی زندگی کا مشن بنایا اور آخر دم تک اس پر قائم رہے۔

مولانا صرف مدرس نہیں تھے؛ بلکہ ایک اچھے مربی بھی تھے، مجال نہیں تھی کہ ان کے حلقہ کا کوئی طالب علم بلا عذر درس سے باہر جائے، یا مسجد میں نماز ادا نہیں کرے، وہ ان چیزوں کی بے حد پابندی کراتے تھے، کوئی طالب کسی استاذ کے ساتھ گستاخی کرتا تو یہ بات انھیں برداشت نہیں ہوتی، اس بات پر بھی نظر رکھتے کہ کون طالب علم کتنا وقت کہاں گذارتا ہے؟ اچھی صحبت اختیار کرتا ہے یا بری صحبت؟ بحیثیت ذمہ دار اساتذہ کے معاملہ میں بھی اُصول کے پابند تھے، خود وقت اور سبق کی پابندی کرتے اور اساتذہ سے پابندی کراتے، خود مقدار خواندگی مکمل کرتے اور دوسروں سے کراتے، بعض کام چور لوگ بادل ناخواستہ ان کی سختی کو گوارا کرنے پر مجبور ہوتے؛ کیوں کہ پہلے وہ خود مدرسہ کے اُصول وضوابط کی پابندی کرتے، پھر دوسروں سے کراتے، اس لئے جو لوگ ان کی اس سختی سے ناراض رہتے، وہ بھی

ان پر انگلی نہیں اُٹھا پاتے ، میرے ایک استاذ نے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سے نقل کیا کہ وہ انتظامی ذمہ داری کے بارے میں کہتے تھے کہ یہ ’مقام مبغوض‘ ہے، یعنی جو لوگ اس ذمہ داری پر رہتے ہیں، وہ لوگوں کے غیظ وغضب کا ہدف بن جاتے ہیں ،مولانا کے ساتھ بھی وہی صورت حال تھی ، وہ جہاں کہیں مدرس رہے، مقبول و عام وخاص رہے ؛ لیکن جہاں انتظامی ذمہ داری ان سے متعلق کی گئی ، ان کی اُصول پسندی کی وجہ سے کچھ لوگوں کو ان سے گلہ وشکوہ رہنے لگا ،مگر جن لوگوں نے بھی کہنا چاہا اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ پائے کہ مزاج میں بہت سختی ہے، کسی نے ان کی تدریسی صلاحیت ، درس کی محافظت، اوقات کی پابندی ،طلبہ کی تربیت ، اخلاق وکردار یا دیانت وامانت کے معاملہ میں زبان کھولنے کی ہمت نہیں کی ، حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی منتظمہ سے سارے لوگ خوش ہوں اور اس کی خوش اخلاقی کا چرچا ہوتو یہ اس کی تعریف نہیں ہے، نقص ہے ؛ کیوں کہ مداہنت کے بغیر سارے لوگوں کو خوش نہیں رکھا جاسکتا ،مولانا کا مزاج یہ تھا کہ وہ کسی جگہ سے رخت سفر تو باندھ سکتے تھے ؛لیکن زہر ہلاہل کو قند نہیں کہہ پاتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جہاں بھی انھوں نے نظم ونسق کی ذمہ داری سنبھالی ، ان کا زمانۂ انتظام اس ادارہ کے لئے عہد زریں بن گیا اور بعد میں اس کا اعتراف ان لوگوں نے بھی کیا ، جن کو ان سے اختلاف تھا۔

اللہ نے انھیں ذہانت وفطانت سے بھی وافر حصہ دیا تھا، مشکل سے مشکل عبارت کو آسانی سے سمجھ لیتے اور چٹکیوں میں سمجھا دیتے ، ان کا یہ جوہر طالب علمی کے زمانہ سے ہی نمایاں تھا، ان کے اساتذہ ان کی صلاحیت کے بارے میں رطب اللسان تھے، خود امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ان کے بے حد قدرشناس تھے، استاذ گرامی حضرت مولانا سید شمس الحق صاحبؒ فرماتے تھے کہ تین طلبہ کے نمبرات کم کرنے میں بڑی دشواری پیش آتی تھی ،مولانا فضل الرحمٰن رحمانیؒ ،مولانا صدر عالم قاسمی (جنھوں نے بہار اکزامینشن بورڈ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تھی) اور ایک نام اس حقیر کا بھی لیتے تھے ؛ چنانچہ وہ جونہی

فارغ ہوئے ،اپنے مادرِ علمی میں استاذ کی حیثیت سے ان کا تقرر ہو گیا اور انھوں نے سال دو سال ہی میں ثابت کر دیا کہ یہ ان کے بڑوں کا حسن انتخاب اور درست فیصلہ تھا۔

بہار کے ضلع سہرسہ کے تعلقہ بختیار پور میں ایک قدیم آبادی 'مبارکپور' کے نام سے ہے، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کے آباء واجداد 'جونپور' سے یہاں منتقل ہوئے تھے، یہ بڑی مردم خیز بستی ہے، مجاہد آزاد مولانا عبدالوحید رحمانیؒ (۱۸۸۵ء-۱۹۷۶ء) یہیں کے تھے، حضرت مولانا حصیر احمد صاحبؒ کا وطن یہی ہے، جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کے تلامذہ میں تھے، سینکڑوں علماء ان کے دامن تلمذ سے وابستہ ہوئے، ان کے صاحبزادہ مولانا اشتیاق احمد قاسمی (رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند وخلیفہ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ) بھی اسی کی خاک سے ہیں، اس چھوٹے سے گاؤں کے بہت سے علماء ملک کے مرکزی مدارس میں دین وعلم دین کی خدمت میں مشغول ہیں اور نمایاں حیثیت رکھتے ہیں، مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا مجاہد الاسلام قاسمی جیسے نادرہ روزگار علماء اس چھوٹے سے قصبہ میں اس کی علمی ودینی کشش کی وجہ سے تشریف لا چکے ہیں، اسی گاؤں میں ۱۹۴۷ء میں مولانا کی ولادت ہوئی، آپ کے والد حافظ محمد یعقوب صاحبؒ نسباً صدیقی تھے اور اپنے علاقہ میں حفظ قرآن مجید مع تجوید اور فضل وتقویٰ میں معروف تھے، اسی دینی گھرانے میں آپ نے نشو ونما پائی، ابتدائی تعلیم گاؤں ہی کے مدرسہ میں حاصل کی، پھر اپنے ماموں مولانا محمد عبدالقدیر اصلاحی کے حوالہ ہو گئے، جن کو عربی زبان وادب کا بڑا اچھا ذوق حاصل ہے اور جن کی بعض کتابیں بہت سے مدارس میں داخل نصاب ہیں، ان کی تربیت میں ان کے ماموں کا بڑا حصہ تھا، پھر عربی کی چوتھی جماعت میں جامعہ رحمانی مونگیر میں داخل ہوئے اور وہیں سے فراغت پائی اور اساتذہ کی نظر انتخاب نے فراغت کے ساتھ ہی مسند تدریس پر بٹھا دیا۔

بعض حالات کی بنا پر مولانا نے ایک نئی منزل کی تلاش کا ارادہ کر لیا تھا، کئی ممتاز

ادارے آپ کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار تھے؛ لیکن جامعہ اسلامیہ بھٹکل کے ناظم الحاج محی الدین منیری کی طلب صادق اور آپ کے شفیق ماموں مولانا عبد القدیر اصلاحی کے مشورہ سے آپ شمال مشرقی ہندوستان کے ایک گوشہ مونگیر سے جنوبی ہند کے ساحل پر پہنچ گئے اور جامعہ اسلامیہ بھٹکل کو اپنی خدمت کا مرکز بنالیا، ۱۹۸۳ء تا ۱۹۸۶ء آپ نے یہاں تدریس و انتظام کی خدمت انجام دی، جامعہ اسلامیہ میں بعض بزرگ اساتذہ کی وفات یا ترک ملازمت کی وجہ سے ایک خلاء سا پیدا ہوگیا تھا، مولانا نے اسے بہت جلد پُر کردیا اوراس ادارہ کی رونق رفتہ واپس آگئی، غالباً مولانا منیری صاحب کی وفات کے بعد آپ کی طبیعت وہاں جم نہ سکی اور آپ نے وہاں سے بھی رخت سفر باندھ لیا، ادھر مولانا حمید الدین حسامی عاقلؒ اور جناب رحیم الدین انصاری آپ کے استقبال کے لئے آنکھیں فرش راہ کئے ہوئے تھے، ان کی دعوت پر دارالعلوم حیدرآباد میں خدمت کرنا قبول کیا اور چار پانچ سال یہاں تدریس وانتظام کی خدمت انجام دی، واقعہ ہے کہ تعلیمی نظام کے استحکام کے اعتبار سے یہ دارالعلوم حیدرآباد کا سنہرا دور تھا؛ لیکن چند سال کے بعد ہی آپ نے دارالعلوم کو بھی چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا اور خاموشی سے دوبارہ جامعہ اسلامیہ بھٹکل چلے گئے، بھٹکل کے منتظمین کی طرف سے بھٹکل واپسی پر مسلسل اصرار تھا اور یہاں تمام ذمہ داران آپ کے لئے چشم براہ تھے؛ چنانچہ دوبارہ ۱۹۹۱ء سے ۲۰۰۲ء تک تدریس اور انتظام کی ذمہ داریاں انجام دیں۔

شاید وطن سے مسلسل دوری اب آپ کو گوارا نہیں تھی ؛ اس لئے آپ اپنے وطن واپس ہوگئے ؛ لیکن جس کو خدا نے تڑپنے اور پھڑکنے کے لئے پیدا کیا ہو، اس کے لئے قرار وسکون کہاں؟ چنانچہ پٹنہ کے قریب ایک قصبہ باڑھ کے مدرسہ والوں نے بے حد اصرار کے ساتھ آپ کو دعوت دی؛ حالاں آپ اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھے اور یہ ابتدائی تعلیم کا مدرسہ؛ بلکہ 'مکتب' آپ کی شخصیت کے شایان شان بھی نہیں تھا؛ لیکن مدرسہ والوں کی ضد کے سامنے آپ کو ہتھیار ڈالنا ہی پڑا، آپ نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا اور اسے اس حد تک ترقی دی کہ درس نظامی کے مطابق چہارم عربی تک کی تعلیم ہونے لگی، آخر اپنے ہاتھوں

لگائے ہوئے اسی شجر علم کے سایہ میں ۴؍صفر ۱۴۳۱ھ مطابق ۳۰؍دسمبر ۲۰۱۱ء جمعہ کے دن صبح کو حسب معمول فجر کی نماز ادا کی، نماز کے بعد لیٹے اور ایسی نیند آ گئی کہ قیامت سے پہلے آنکھ کھل نہیں سکے گی، صبح نو بجے یہ واقعہ پیش آیا، نعش مبارکپور لے جائی گئی اور اگلے دن وہیں تدفین ہوئی، اس طرح آپ نے تقریباً ۶۵ سال کی عمر پائی۔

میں جب جامعہ رحمانی میں داخل ہوا تو عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے مجھے انھیں کے حوالہ کر دیا اور خود سفر حج پر روانہ ہو گئے، کمرہ ملنے تک انھیں کے کمرہ میں مقیم رہا پھر زمانۂ طالب علمی میں بہت سی کتابیں ان سے پڑھنے کا موقع ملا، تیسیر القرآن (از جملہ شرطیہ تا ختم کتاب)، قطبی (حصہ تصدیقات) ترجمہ قرآن مجید (نصف ثانی)، جلالین شریف (نصف اول) اور موٴطا امام محمد کے نام تو یاد ہیں، غالباً ان کے علاوہ بھی بعض کتابیں مستقل یا عارضی طور پر آپ سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، یہ تو مدرسہ کی جانب سے مقررہ کتابیں تھیں؛ لیکن ان کے علاوہ کبھی کوئی کتاب سمجھنے میں دشواری پیش آتی، خواہ کسی فن کی ہو اور کسی استاذ سے متعلق ہو، مولانا کے پاس پہنچ جاتا اور وہ ایک نظر ڈال کر سمجھا دیتے، یہ معاملہ صرف اس حقیر ہی کے ساتھ نہیں تھا؛ بلکہ ہر طالب علم کے ساتھ تھا، جس میں طلب موجود ہو، اکثر عشاء کے بعد کچھ دیر کے لئے مولانا کی خدمت میں جاتا، طالب علمی کا زمانہ ہو یا تدریس کا، بعض دفعہ ادارہ میں حوصلہ شکن باتیں بھی پیش آ جاتی ہیں اور ایسے لوگوں کی بدگوئی سے بھی سابقہ پیش آتا ہے، جن کے بارے میں خیال ہوتا ہے کہ شاید اللہ تعالیٰ نے ان کی زبان کانٹوں ہی سے بنائی ہے، ایسے موقعوں پر مولانا کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی زخم پر مرہم کا کام کرتی۔

وہ مجھ سے بے حد شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے، دور رہتے تو خطوط سے سرفراز کرتے، حیدرآباد میں قیام ہوتا تو گاہے گاہے غریب خانہ پر تشریف لاتے اور کبھی میں ان کی خدمت میں حاضر ہو جاتا، مجھے یہ قلق ہمیشہ باقی رہے گا کہ وفات سے چند ماہ پہلے جب میں کسی بیرونی سفر سے واپس ہوتے ہوئے دہلی ایرپورٹ پر تھا تو مولانا کا فون آیا، آواز پوری

طرح سمجھ میں نہیں آئی، میں نے دریافت کیا: کون صاحب ہیں؟ کہنے لگے: رحمانی؛ چوں کہ جامعہ رحمانی کی نسبت کی وجہ سے مختلف دوستوں کا فون آتا رہتا ہے اور ان کے ساتھ بھی 'رحمانی' کی نسبت لگی ہوتی ہے؛ اس لئے میں سمجھ نہیں سکا، مولانا نے فرمایا: تم مجھے نہیں پہچانتے، میں فضل الرحمٰن ہوں، مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، معذرت کرتے ہوئے دریافت کیا کہ کیا حکم ہے؟ فرمایا: مدرسہ کے سالانہ جلسہ میں بلانا چاہتا ہوں؛ چوں کہ نیٹ ورک صحیح نہیں تھا، اس لئے عرض کیا کہ ایک دودنوں کے بعد میں خود فون کر کے وقت معلوم کرلوں گا؛ لیکن بات ذہن سے نکل گئی، یہاں تک کہ وفات کے دل شکن حادثہ کی اطلاع ملی، نہ معلوم وہ جلسہ ہوا یا نہیں؟

اِس وقت مولانا کے سایۂ شفقت میں گذارے ہوئے لمحات ذہن کی اسکرین پر یکے بعد دیگر آرہے ہیں، لمبا قد، سانولا رنگ، ورزشی بدن، چہرہ پر چیچک کے ہلکے ایک دو داغ، بھرپور داڑھی، لمبا کرتا، طاقتور اور قوی الارادہ شخصیت، رُعب ایسا کہ طلبہ تو کیا اساتذہ بھی سامنے آنے سے کترائیں، شفقت ایسی کہ اساتذہ تو کیا طلبہ کو بھی اپنی جائز ضرورت پیش کرنے میں کوئی تامل نہ ہو، مخلص، ملنسار، تکلف سے خالی، عوامی تعلقات سے دور، آپ اپنی دنیا میں مصروف، یہ تھی مولانا رحمانی کی شخصیت۔

ایسا لگتا تھا کہ خدا نے ان کو صرف اور صرف تدریس وتربیت ہی کے لئے پیدا فرمایا ہے، مدارس کے لئے ایسی شخصیتیں نعمت کبریٰ ہوتی ہیں، ورنہ جو لوگ تقریر وتحریر، ملی کام اور عملیات میں بٹے ہوئے ہوتے ہیں، حقیقت یہ ہے کہ وہ فریضہ تدریس کے وفادار نہیں ہوتے، ان کی صحت شروع سے ہی کچھ بہتر نہیں تھی، ہم لوگوں کی طالب علمی کے زمانہ میں بھی دردسر کا تڑپادینے والا دورہ اُٹھتا، بعد میں مختلف دوسرے امراض کے بھی شکار ہوگئے، مگر اکثر ان کی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری سخت تکلیف پر بھی غالب آجاتی اور بہ مشکل ہی درس کا ناغہ ہوتا۔

'فضل رحماں' پر خداء رحمان کا بے حد فضل وکرم ہو، دنیا بھر میں ان کے جو تلامذہ پھیلے ہوئے ہیں، خدا کی میزان میں وہ ان کے لئے صدقہ جاریہ شمار ہوں۔

❁ ❁ ❁

استاذ محترم مولانا محمد علاء الدین ندویؒ

بلائے جاں ہے غالب ! اس کی ہر بات
عبارت کیا ، اشارت کیا ، ادا کیا ؟

جونپور سے ایک خاندان کئی سو سال پہلے بہار پہنچا، اس خاندان کی شاخیں بہار کے ضلع ''سہرسہ'' کے ایک چھوٹے سے شہر ''سمری بختیار پور'' کے مضافات میں واقع مختلف بستیوں میں آباد ہیں، اسی گھرانہ کے ایک بزرگ جناب محمد یوسف علی صاحب تھے جن کا تعلق مولانا محمد مصطفیٰ میاں کچھوچھہ شریف سے تھا، ان کا جھکاؤ اگرچہ بریلویت کی طرف تھا؛ لیکن مزاج میں تشدد نہیں تھا، اور ہر حلقہ سے تعلق رکھتے تھے، حضرت الاستاذ ان ہی کے صاحبزادے تھے، جو اپنے ننیہال گرینی نامی گاؤں میں پیدا ہوئے تھے، ابتدائی تعلیم اپنے وطن میں حاصل کی، اس کے بعد مختلف مدارس سے استفادہ کیا، جن میں ''جامعہ اشرفیہ مبارکپور'' بھی شامل ہے؛ لیکن زیادہ تر تعلیم مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، ۱۹۵۰ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء سے عالمیت کیا، ۱۹۵۳ء میں مدرسہ عالیہ کلکتہ سے فضیلت اور ۱۹۵۵ء میں دارالعلوم دیوبند سے دورہ حدیث شریف کی تکمیل کی، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا شاہ حلیم عطا ندوی، مولانا عبدالحفیظ بلیاوی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، آپ کے اساتذہ میں ہیں اور احباب و رفقاء درس میں مولانا مجاہدالاسلام قاسمیؒ، مولانا ڈاکٹر سعیدالرحمٰن اعظمی ندوی، مولانا سید محمد واضح رشید ندوی اور مولانا سید ہاشمی وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

یہ ۱۹۶۷ء کی بات ہے جب عم محترم حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ صاحب حج

کے لئے روانہ ہوئے، میرے آبائی قصبہ جالہ (دربھنگہ) سے نکلنے کے بعد ان کی پہلی منزل مونگیر تھی، اسی نسبت سے مجھے بھی انھوں نے ساتھ لے لیا؛ تاکہ جامعہ رحمانی مونگیر میں مجھے داخل کرتے ہوئے اور امیر شریعت حضرت مولانا منت اللہ رحمانیؒ کی دُعائیں لیتے ہوئے آگے بڑھیں، میرے لئے یہ ایک بہت ہی خوشگوار موقع تھا، جب ایک بڑی درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع مل رہا تھا، قاضی صاحب رات بھر رُکے، بعد مغرب وِداعی جلسہ منعقد ہوا اور زائران حرم کے قافلہ کو گرم جوشی اور نم آنکھوں کے ساتھ رخصت کیا گیا اور مجھے جامعہ کے نوجوان فاضل استاذ مولانا فضل الرحمٰن رحمانی صاحبؒ کے سپرد کر دیا، میری عمر اس وقت گیارہ سال تھی، میں مولانا کے کمرہ میں مہینہ بھر قیام پذیر رہا ہوں گا، مولانا کے کمرہ سے پہلے ایک کمرہ کے فاصلہ پر ایک نہایت ہی باوقار اور وضعدار استاذ کا کمرہ تھا، قد درمیانہ درازی مائل، چہرہ پر بھری ہوئی ریش، زیادہ تر سیاہ اور کچھ بال سفید، ململ کا نفیس کرتا جو ہمیشہ شکن نا آشنا رہتا، کسی قدر چست پاجامہ جس کو ہم لوگ اس زمانہ میں علی گڑھی پائجامہ کہتے تھے اور سر پر ململ کی سفید استری کی ہوئی دوپلی ٹوپی، آنکھوں پر نفیس عینک، چہرہ گہرا سانولا، رعب و وقار کا پیکر، یہ شخصیت میرے مشفق استاذ حضرت مولانا محمد علاء الدین ندوی صاحبؒ کی تھی، اپنی وضع قطع اور معمولات میں جس قدر پابند اور لطیف و نفیس ذوق کا حامل انھیں دیکھا، چند ہی شخصیتوں کو دیکھا ہوگا۔

مجھے پہلے سال مولانا مرحوم سے 'تیسیر القرآن' اور 'القرأۃ الراشدہ' پڑھنے کا موقع ملا، مجھے جن اساتذہ سے استفادہ کا موقع ملا مفردات کی ایسی یادداشت کسی اور کی نہیں دیکھی، مصادر اور مختلف ابواب میں معنی کی تبدیلی اور صلات کی تبدیلی کے معنی پر اثرات کے سلسلہ میں مولانا کی نگاہ نہایت وسیع تھی اور لغت دیکھے بغیر وہ اتنی مہارت سے اسے لکھاتے جاتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی اور پھر آیاتِ قرآنی، شعراء جاہلیت اور شعراء اسلام کے اشعار سے اس پر استشہاد برجستہ پیش کرتے رہتے تھے، جہاں درس دیتے تھے وہاں پر عربی لغت اور علم نحو وصرف

کی کتابوں کی قطاریں لگی رہتی تھیں اور المنجد کی جامعیت واستیعاب کے بڑے مداح تھے، پھر جو کچھ بتاتے تھے، پوری سخت گیری کے ساتھ اس کی یادداشت کا محاسبہ بھی فرماتے تھے،اس لئے ہم لوگ ان سے متعلق کتابوں کو خوب محنت سے یاد کرتے تھے اور ڈرے سہمے ہوئے درسگاہ میں پہنچتے تھے۔

عجب اتفاق ہے القرأۃ الراشدہ اور تیسیر القرآن پڑھنے کے بعد مولانا سے استفادہ کا موقع اس وقت ملا جب ہم لوگ مشکوٰۃ کی جماعت میں پہنچے، دیوانِ متنبّی کا سبق مولانا سے متعلق تھا اور اس کے اشعار کثرت سے مولانا کو یاد تھے، جو رنگ مولانا کا تیسیر القرآن میں دیکھا اس کو اور زیادہ گہرائی اور وسعت کے ساتھ دیوان متنبّی میں دیکھنے کا موقع ملا، بہت سے عربی اشعار کو سمجھانے کے لئے اُردو شعراء کے کلام کا سہارا بھی لیتے تھے اور اساتذۂ فن کے منتخب اشعار کو اس طرح منطبق کرتے تھے کہ گویا متنبّی کے اشعار کے ترجمہ کے طور پر کہے گئے ہیں، اس وقت اندازہ ہوا کہ مولانا کے اندر اُردو شعر وسخن کا ذوق بھی بہت اعلیٰ درجے کا ہے، بعض دفعہ اُردو اشعار پر محاورات واستعارات کے پہلو سے دل لگتا نقد بھی کرتے تھے۔

’تیسیر القرآن‘ پڑھتے ہوئے مولانا کے رعب وجلال اور استاذانہ وقار کا تجربہ ہوا تھا اور ’دیوان متنبّی‘ میں اس حرارت مزاج کے پیچھے چھپی ہوئی اتھاہ شفقت ومحبت کو دیکھنے کا موقع ملا ،تمام رفقاء کے ساتھ خاص کر اس حقیر کے ساتھ بہت خورد نوازی اور شفقت کا معاملہ فرماتے تھے،اسی سال جامعہ رحمانی کے محبوب استاذ حضرت مولانا اکرام علی صاحب نے حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی ، میں نے اس موقع پر ٹوٹی پھوٹی عربی نظم میں تہنیت کہی اور اس کے لئے دیوان متنبّی ہی کی ایک زمین کا انتخاب کیا،تمام ہی اساتذہ نے اس کی داد دی؛ لیکن خاص کر استاذ محترم اس سے بے حد خوش ہوئے اور بہت حوصلہ افزائی کے کلمات کہے، پھر یہ شفقت ہمیشہ باقی رہی ،مولانا بعد میں جامعہ رحمانی سے الگ ہوگئے ؛ لیکن مختلف پروگراموں میں ملاقات کی سعادت حاصل ہوتی رہتی تھی اور ہمیشہ ان کی شفقت ومحبت کی شبنم میں نہانے کا موقع ملتا تھا ،مولانا اور قاضی صاحب رفیق درس تھے ، اور دونوں میں بے حد خلوص ومحبت کا

تعلق تھا، اس دوہری نسبت کو میں بھی ملحوظ رکھتا تھا اور مولانا کی طرف سے بھی اس کا پاس ولحاظ رہتا تھا۔

عام طور پر مونگیر میں مولانا کی پہچان عربی زبان وادب تھی، مولانا کے یہاں عموماً عربی ادب وانشاء ہی کے اسباق بھی ہوا کرتے تھے؛ البتہ مولانا مجاہدالاسلام صاحبؒ کے اصرار پر بعد میں تفسیر کے گھنٹے بھی آپ نے لئے اور بڑی کامیابی کے ساتھ انھیں پڑھایا؛ بعض مجلسوں میں مولانا کے ساتھ شرکت کے بعد اندازہ ہوا کہ علوم اسلامی کے دوسرے شعبوں سے بھی انھیں اچھی خاص مناسبت تھی، اس سلسلہ میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہماری فراغت کے بعد مولانا سعید احمد اکبرآبادیؒ کی ''عثمان ذی النورین'' طبع ہوئی، یہ ایک تسلسل تھا، علامہ شبلیؒ نے الفاروق لکھی تھی اور مولانا اکبرآبادیؒ نے صدیق اکبرؓ اور عثمان ذی النورینؓ لکھی، مولانا اکبرآبادیؒ وسیع المطالعہ اور عمیق النظر علماء میں تھے اور ان کی تمام ہی تصانیف میں اس کی شہادت موجود ہے؛ لیکن خود ان کو اپنی کتابوں میں ان دو کتابوں پر ناز تھا، ان کے یہ احساسات اس حقیر کو براہ راست بھی سننے کا موقع ملا ہے۔

مولانا کے قلم سے عثمان ذی النورینؓ میں بعض ایسے فقرے نکل گئے ہیں اور بعض واقعات کی توجیہہ انھوں نے اس انداز پر کی ہے کہ اس سے حضرت عثمانؓ کی شان مجروح ہوتی ہے، استاذ محترم نے اس پر ایک مفصل تنقید لکھی اور از راہ نصح و ہمدردی بجائے اس کے کہ اس مراسلہ کو کسی رسالہ میں طبع کراتے، براہ راست مولانا کو بھیجا اور ان سے خواہش کی کہ وہ آئندہ ایڈیشن میں اصلاح کرلیں، مولانا اکبرآبادیؒ کا جواب آیا، اس میں انھوں نے تاویل وتوجیہہ کرنے کی کوشش کی اور کسی قدر منفی لب ولہجہ اختیار کیا، مولانا نے دوبارہ ایک اور تفصیلی مراسلہ لکھا، جو بہت ہی سنجیدہ، متین اور مدلل تھا، یہ دونوں مولانا نے مجھے پڑھوائے، جس کے مطالعہ سے مجھے ایک تو اس جہت میں مولانا کی نظر کا اندازہ ہوا، دوسرے: صحابہ کی عظمت وتوقیر —— جو اہل سنت والجماعت کے مسلک کی اساس وبنیاد رہی ہے —— کے بارے

میں ان کی حمیت وغیرت کا بھی تجربہ ہوا؛ حالاں کہ وہ مولانا اکبرآبادیؒ کے بڑے مداح اورقدرشناسوں میں تھے اور باہم تعارف بھی تھا؛ لیکن اس مسئلہ میں انھوں نے کسی رورعایت کوجگہ نہیں دی، بعدکو میں نے اسے ''سہ ماہی صفا'' حیدرآباد میں اپنے ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع کردیا، بہرحال اب یہ دونوں بزرگ اللہ کے یہاں جاچکے ہیں، اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے۔

مولانا کے تصنیفی کاموں میں ایک اہم کام مصری عالم ڈاکٹر عبدالمنعم النمر کی کتاب کا ترجمہ ہے، یہ ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ'' کے نام سے ابھی کچھ عرصہ پہلے شائع ہوچکی ہے، جومولانا محمد وقارالدین لطیفی اوران کے برادران کی کوششوں کا نتیجہ ہے، یہ ترجمہ آپ نے مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ صاحب کی تحریک پر۱۹۷۰ء میں کیا تھا، اس کتاب میں جنگ آزادی میں مسلمانوں کے رول پر بہت بصیرت افروز گفتگو کی گئی ہے، مولانا کا ترجمہ بھی بہت سلیس اوررواں زبان میں ہے، پڑھتے ہوئے ترجمہ پن کا احساس نہیں ہوتا ہے۔

مولانا کی ایک اہم خدمت ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی تسوید وتبییض بھی ہے، جب شاہ بانو کیس کے پس منظر میں حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی اورحضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی کی متعدد بار اس وقت کے وزیراعظم جناب راجیو گاندھی اور دوسرے ذمہ داروں سے ملاقات ہوئی تو محسوس کیا گیا کہ قانونِ شریعت کا ایک دفعہ وار مجموعہ ہونا چاہئے، مولانا رحمانی نے طے کیا کہ اس کام کو اجتماعی طور پر انجام دیا جائے؛ چنانچہ انھوں نے اس کام کے لئے اربابِ افتاء کی ایک ٹیم کو جمع کیا، جو اجتماعی طور پر اسے مرتب کرتی، پھر اس پر نظرثانی کا کام ہوتا، اسے مرتب کیا جاتا اور اخیر میں اس کی تبییض کی جاتی، یوں تو مولانا اورنشستوں میں بھی شریک ہوتے؛ لیکن خاص کر اللہ نے آپ کو خوشخطی کا جو ذوق دیا تھا اورعربی عبارتوں سے جو مناسبتیں تھیں، اس کے تحت مسودہ کو صاف کرنا اورحاشیہ میں عربی عبارتوں کا درج کرنا آپ کے ذمہ تھا۔

مولانا کا ایک نمایاں وصف نماز باجماعت کا اہتمام تھا، جامعہ رحمانی میں چند اساتذہ وہ تھے کہ شاید و باید ہی ان کی جماعت مہینوں میں کبھی چھوٹتی ہو، ان میں ایک نمایاں نام استاذ محترم کا تھا، ایسا لگتا تھا کہ جیسے اذان سے پہلے ہی وہ نماز کے لئے تیار رہتے تھے، اذان ہوتے ہی مسجد کی طرف روانہ اور پہلی صف میں موجود، سردی ہو یا گرمی یا برسات، اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا —— مولانا کا ایک اور ممتاز وصف ان کی جرأت اور حوصلہ مندی تھی، اس زمانہ میں جامعہ رحمانی اور خانقاہ رحمانی کے قرب و جوار میں غیر مسلموں کی غالب آبادی تھی، فسادات کا خطرہ لگا رہتا تھا، لوگ ڈرے سہمے رہتے تھے، مگر کیا مجال تھی کہ خوف وگھبراہٹ مولانا کے قریب بھی پھٹک سکے، اسی طرح مدرسہ کے ذمہ داران سے بھی ان کی نوک جھونک ہوتی رہتی تھی اور جو باتیں دوسرے حضرات سوچتے تھے؛ لیکن زبان پر لانے کی ہمت نہیں کرتے تھے، مولانا بلا جھجھک کہہ جاتے تھے اور چوں کہ لوگوں کو لب ولہجہ کے کڑواہٹ کے ساتھ ان کی صاف دلی کا اندازہ تھا؛ اس لئے ان کی بات کا لوگ برا بھی نہیں مانتے تھے۔

ان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض وہبی اوصاف بھی عطا ہوئے تھے، ان میں ایک تو ان کا خوش رقم ہونا تھا، ان کا خط بہت ہی عمدہ اور نہایت نفیس تھا اور باریک ہونے کے باوجود پڑھنے میں ذرا بھی دشواری نہیں ہوتی تھی، یوں تو جامعہ رحمانی میں اکثر اساتذہ خوشخط تھے اور اس کا اثر طلبہ پر بھی تھا، مگر مولانا کو اس باب میں ایک امتیازی حیثیت حاصل تھی، اس زمانہ میں زیراکس کی سہولت نہیں تھی، امتحان کے پرچے سائیکلو اسٹائل مشین پر طبع کئے جاتے تھے، چند اساتذہ جن کا خط صاف تھا، سوالات کی تبییض کرتے تھے، ہم لوگ مشتاق ہوتے تھے کہ مولانا کا تبییض کیا ہوا پرچہ ہمارے حصہ میں آئے؛ کیوں کہ اسے پڑھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی تھی، امیر شریعت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ کے یہاں اہم مراسلات کی کتابت مولانا ہی کے حصہ میں آتی تھی، مولانا صرف خوشخط ہی نہیں تھے؛ بلکہ کتابت کے اُصول وقواعد سے بھی اچھی طرح واقف تھے، رموزِ تحریر کا بھی بڑا اہتمام کرتے تھے؛ اس لئے ان کی تحریر خواہ مخواہ پڑھنے کو دل چاہتا تھا۔

دوسری وہبی صلاحیت نشانہ بازی کی تھی، ان کے پاس رائفل بھی تھی اور بندوق بھی، اوران کا نشانہ غیر معمولی حد تک درست ہوتا تھا، جمعرات کو وہ اور بعض اساتذہ گنگا کے کنارے اور کبھی پہاڑی کی طرف جاتے اور پرندوں کے ڈھیر سارے شکار کر کے لاتے، یہ رائفل ہمیشہ ان کے کمرے میں سامنے آویزاں رہتی تھی، ایک بار جب فرقہ وارانہ فساد کا سخت خطرہ پیدا ہوگیا اور طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں تو مولانا شب میں رائفل لے کر جامعہ اور خانقاہ کے پورے احاطہ کا چکر لگاتے اور چاروں طرف نظر رکھتے۔

دوستوں کی محفل میں ان کی ظرافت اور بذلہ سنجی قابل دید ہوتی، خود فقرہ کستے اور فقرہ بازی کا جواب بھی دیتے، لطائف سناتے؛ لیکن ان میں سطح سے گری ہوئی کوئی بات نہیں ہوتی، طلبہ کے درمیان عام طور پر ہنسی مذاق کی باتوں سے بہت اجتناب کرتے؛ لیکن کبھی کبھی تنبیہ وتوبیخ میں ایسی بات کہہ جاتے کہ وہ نا قابل فراموش لطیفہ بن جاتی، میرے ایک ساتھی تھے، جن کا تلفظ صاف نہیں تھا، وہ 'ش' کو 'س' پڑھ دیتے تھے، دوسری طرف مولانا کا حال یہ تھا کہ وہ تلفظ کے باب میں بہت حساس تھے اور تلفظ کے بگاڑ کو ذرا بھی معاف نہیں کرتے تھے، ان صاحب نے عبارت پڑھی اور حسبِ معمول 'ش' کو 'س' پڑھ دیا، مولانا کے چہرہ پر سخت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے؛ لیکن وہ ادھر دیکھے بغیر پڑھتے جارہے تھے، آخر مولانا نے دریافت فرمایا: میاں! تم کتنے سال سے یہاں پڑھ رہے ہو؟ کہنے لگے: حضرت! تین سال سے، مولانا نے فرمایا: اگر سال میں ایک نقطہ بھی یاد کئے ہوتے تو تین سال میں تین نقطے یاد کرلیا ہوتا، ایک اور موقع پر ایک طالب علم نے اسی طرح 'ش' کو 'س' پڑھ دیا، مولانا نے ناراض ہو کر فرمایا: افسوس! ایک ٹوکرا نقطہ رکھا ہوا ہے، پھر بھی تم دیکھ نہیں پاتے۔

بہر حال بہت سی یادیں ہیں، جو مولانا کی ذات سے وابستہ ہیں، اخیر میں دعوتی اور تعلیمی مقصد کے تحت جنوری ۱۹۹۲ء میں فیجی کا سفر ہوا؛ لیکن آب و ہوا کی ناموافقت کی وجہ

سے چند ہی ماہ میں واپسی ہوگئی، یہاں تک کہ ۲۰؍شعبان المعظم مطابق ۲۲؍جنوری ۱۹۹۵ء کو ٹھیک صبح سات بجے آپ نے داعی اجل کو لبیک کہا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس غیور بندہ کو اپنے سایہ رحمت میں جگہ دے، حسنات کو قبول فرمائے اور آخرت کو دنیا سے بہتر جائے قرار بنائے۔

❁ ❁ ❁

مولانا محمد رضوان القاسمیؒ

ضمیرِ پاک ، خیالِ بلند و ذوقِ لطیف

۱۹۶۸ء یا ۱۹۶۹ء کی بات ہوگی ، میں جامعہ رحمانی مونگیر میں زیر تعلیم تھا، مجھے جامعہ کی پرانی عمارت میں کمرہ ملا تھا، جو 'دارقدیم' کہلاتا تھا، دارقدیم کے سامنے ہی وہ عمارت تھی ، جہاں انتظام وانصرام کے تمام شعبے تھے،اسی میں استاذ محترم مولانا شفیق عالم قاسمی کی قیام گاہ تھی ، اسی سے متصل دفتر تھا اور وہ جو ایک دو گھنٹیاں پڑھایا کرتے تھے، اس کے اسباق بھی وہیں ہوتے تھے، ضابطہ میں تو وہ نائب ناظم تھے اور ناظم مولانا محمد عارف صاحب تھے؛ لیکن عملاً وہ جامعہ اور خانقاہ کے مدارالمہام تھے اور کوئی پتّا ان کی مرضی کے بغیر ہل نہیں سکتا تھا، استاذ محترم کے ہاں بھی مہمانوں کی آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا —— جن میں علماء بھی تھے اور ادارے کے معاونین بھی —— قدیم فضلاء عام طور پر اپنے اہل تعلق استاذ یا طلبہ کے یہاں ٹھہرا کرتے تھے، مولانا کے یہاں ان کا قیام شاذ ونادر ہی ہوا کرتا تھا؛ تاہم ایک روز دیکھا کہ ایک نوجوان پتلا دبلا، کھلتا رنگ ، اونچا قد، چکن کا کرتا، چکن کی ٹوپی اور سفید پائجامہ میں ملبوس، خوش رُو اور خوش لباس استاذ گرامی کے ہاں وارد ہوا، شاید انھیں کسی نے میرے بارے میں اطلاع دی کہ وہ بھی اس مدرسہ میں داخل ہے، انھوں نے مجھے بلا بھیجا، میں حاضر ہوا، بڑی شفقت، محبت، نرم خوئی اور خوش اخلاقی سے پیش آئے اور پہلی ہی ملاقات میں طبیعت مانوس سی ہوگئی ، یہ تھے حضرت مولانا محمد رضوان القاسمیؒ۔

میری ان سے کسی قدر دور کی قرابت بھی تھی ؛ اس لئے بچپن میں وہ بکثرت ہمارے یہاں آیا کرتے تھے، انھیں دینی تعلیم کی طرف حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے ہی لگایا تھا اور ان ہی کے مشورہ سے وہ مدرسہ میں داخل کئے گئے تھے، مولانا خود میری والدہ مرحومہ

کی شفقت کا بھی ذکر کیا کرتے تھے کہ بچپن میں آپ کے ہاں جایا کرتا تھا، تو آپ کی والدہ بڑی محبت سے پیش آتی تھیں اور کچھ کھلائے پلائے بغیر آنے نہیں دیتی تھیں؛ چنانچہ حیدرآباد میں قیام کے درمیان بھی مولانا گاہے گاہے والدہ مرحومہ سے ملاقات کے لئے غریب خانہ پر تشریف لایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ پرانے زمانے کی خواتین میں جو شفقت و محبت اور سادگی ہوا کرتی تھی، آپ کی والدہ اس کی مثال ہیں۔

مولانا کے والد ماجد مولوی حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم نے طویل عرصہ تک جھارکھنڈ کے ایک شہر چکردھر پور میں امامت کی، وہ اپنے کردار و عمل کی وجہ سے وہاں عوام وخواص میں مقبول تھے، وہ اگرچہ عالم نہیں تھے؛ لیکن اچھا علمی ذوق رکھتے تھے اور بکثرت مطالعہ بھی کرتے تھے، کوئی مضمون کبھی پسند آتا تو مضمون نگار کو اس کی داد بھی دیتے تھے، ایک زمانہ میں ’ مکتبہ الفرقان لکھنؤ‘ معرکۂ کربلا پر شائع ہونے والی ایک کتاب کی وجہ سے حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور یزید کے مسئلہ پر خاصی بحث ہونے لگی، اسی زمانہ میں نے ایک سوال کے جواب میں اس موضوع پر مختصر تحریر لکھی، انھوں نے خاص طور پر ملاقات کر کے اس کی تحسین فرمائی۔

یہ پہلی ملاقات اس وقت ہوئی، جب گیا کے ایک خانوادۂ سادات میں مولانا کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، وہ گیا سے ہی مونگیر آئے تھے؛ اس لئے تحفۂ خورد و نوش بھی ساتھ تھا، اس سے مجھے بھی عنایت فرمایا، پھر علامہ اقبال سے متعلق اپنا ایک مضمون مجھے تبییض کے لئے دیا، میں نے صاف کر کے پیش کیا، اس زمانے میں واقعی میرا خط اچھا ہوتا تھا، مولانا نے پسند فرمایا اور مجھے دس روپے یا اس سے کچھ زیادہ عنایت کئے، اُس زمانے میں دس روپے کی بڑی اہمیت تھی، جامعہ میں فیس طعام غالباً ۱۸ روپے ہوتی تھی اور طلبہ کو اخراجات کے لئے ۱۰، ۱۵ روپے آیا کرتے تھے، فطری طور پر اس انعام سے بڑی مسرت ہوئی اور مولانا کی محبت صفحۂ دل پر نقش ہوگئی۔

اس کے بعد عرصہ تک مولانا سے ملاقات کا تعلق نہیں رہا، دیوبند سے فراغت کے بعد جب میں امارت شرعیہ پھلواری شریف پٹنہ میں زیر تربیت تھا تو مولانا وہاں تشریف لائے،

وہاں مولانا کے علاتی چچا مولوی محمد قاسم صاحب مرحوم بھی ملازم تھے، جو دارالقضاء کے رفقاء میں تھے، بڑے رقیق القلب، خوش مزاج، ظریف، سادہ لوح، محبت کرنے والے اور خود محبت کئے جانے کے لائق، ہماری قرابت ان سے ایک دوسری جہت سے بھی تھی، اسی نسبت سے ہم لوگ ان کو قاسم بھیا کہتے تھے، ان کے ہاں مولانا کا قیام تھا، جب تک مولانا رہے، میں ان ہی کے ساتھ لگا رہا۔

یہاں تک کہ حضرت محمد مولانا حمید الدین عاقل حسامیؒ (امیر ملتِ اسلامیہ آندھرا پردیش) کی دعوت پر میں حیدرآباد وارد ہوا، یہاں اس وقت میرے لئے پہلے سے دو متعارف شخصیتیں موجود تھیں، ایک مولانا محمد رضوان صاحب کی، دوسرے مولانا غیاث الاسلام رحمانی صاحب کی، جو جامعہ رحمانی میں مجھ سے چند سال سینئر تھے اور اس وقت دارالعلوم سبیل السلام میں مددگار تعلیمی کے عہدہ پر تھے، مولانا میری آمد سے مطلع ہو چکے تھے، اب یہ ان کی خورد نوازی تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس حقیر اجنبی شہر کی حاضری کا انتظار کرتے، اگلے روز عصر کے وقت خود تشریف لائے، اس وقت مولانا کی آمد سے بے حد خوشی ہوئی؛ کیوں کہ مجھے اجنبیت کا احساس بے حد ستا رہا تھا، مولانا مجھے اپنے ساتھ چار مینار کے قریب لے گئے، اس زمانہ میں بس اسٹانڈ ٹھیک چار مینار کے دامن میں تھا اور وہاں سے قریب ایک بہت ہی چھوٹا سا ہوٹل تھا، جس میں روزانہ مرغ کی حلیم بنا کرتی تھی، جو غالباً رمضان المبارک کے علاوہ اور کہیں دستیاب نہیں تھی، اس لئے جو لوگ حلیم کا ذوق رکھتے تھے، وہ دور دور سے اس چھوٹے سے تنگ اور بے ہنگم قسم کے ہوٹل میں وارد ہوتے تھے۔

مولانا اس وقت حیدرآباد میں حلقۂ دیوبند کے ایک اُبھرتے ہوئے عالم تھے، علماء میں اس وقت ہمارے حلقہ میں غالباً مولانا تنہا ایسے صاحب قلم تھے جن کی نگارشات کثرت سے طبع ہوتی تھیں اور شوق کی آنکھوں پڑھی جاتی تھیں، جناب پالن حقانی مرحوم کی حیدرآباد آمد کے بعد ان ہی کی تحریک پر 'نوید دکن' نکلنا شروع ہوا، مولانا اس میں روزانہ ایک مستقل کالم ''ندائے حجاز'' کے عنوان سے لکھتے تھے، جس میں زیادہ تر اہل بدعت پر رد ہوا کرتا تھا، آپ مسجد عامرہ کے امام

وخطیب بھی تھے، جمعہ سے پہلے آپ کا بیان محض روایتی انداز کا نہیں ہوتا تھا؛ بلکہ جو مسائل درپیش ہوتے، ان پر بھرپور تبصرہ بھی ہوتا تھا؛ اس لئے اہل ذوق دور دور سے جمعہ میں حاضر رہتے تھے اور مسجد میں تنگی دامانی کا احساس ہوتا تھا۔

چنانچہ اکثر و بیشتر میری جمعہ کی نماز مسجد عامرہ ہی میں ہوتی تھی اور جمعہ کے بعد مولانا کے ساتھ ہی کھانا ہوتا تھا، ایک آدھ دن کی تعطیل ہوتی تو وہ بھی مولانا کے ساتھ گذرتی، اس وقت دارالعلوم حیدرآباد چارمینار کے قریب میں واقع محلے ''مگر کی باؤلی'' کے ایک خستہ حال مکان میں تھا، جب بارش ہوتی تو باہر نکل کر بارش کے احوال معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی، کمروں کے اندر بھی برسات کا سماں ہوتا، ایک ہال میں اساتذہ فرشِ زمین پر بستر بچھا کر سوتے، طلبہ بھی کم تھے اور چوں کہ ادارہ کے قیام کو زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا؛ اس لئے نظم ونسق میں استحکام نہیں تھا، میں پہلے امارت شرعیہ جیسے قدیم اور منظّم ادارہ میں وہ چکا تھا، اس لئے طبیعت لگ نہ سکی، رخصت کرتے ہوئے مجھے حضرت مولانا سید نظام الدین صاحب موجودہ امیر شریعت بہار واڑیسہ نے فرمایا تھا کہ امارت کے دروازے آپ کے لئے کھلے ہوئے ہیں، اگر طبیعت نہ لگے تو واپس آجائیں؛ اس لئے بقرعید تک رہنے کے بعد دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ پٹنہ واپس ہوجانا چاہئے، صرف ایک وجہِ ترجیح حیدرآباد کے قیام کے لئے نظر آتی تھی کہ الرجی اور سانس کی وجہ سے شمالی ہند میں جو ہر تھوڑے دنوں پر بخار کا سلسلہ رہتا تھا، اس میں یہاں کافی افاقہ ہوا اور آب وہوا خشک ہونے کی وجہ سے راس آتی تھی؛ لیکن طبیعت کی گھبراہٹ اور تنہائی کے احساس کی وجہ سے دل کو قرار نہیں تھا، اس موقع پر مولانا کی رہنمائی اور دلداری بہت کام آئی انھوں نے بہت سمجھایا کہ چند مہینے رہ جاؤ تو ان شاء اللہ طبیعت لگ جائے گی؛ چنانچہ یہی ہوا اور مولانا ہی کے اصرار وترغیب کی وجہ سے میں نے واپسی کا ارادہ ترک کردیا۔

اس زمانے میں دارالعلوم سبیل السلام کے صدر جناب الحاج سید ضیاء الرحمٰن مرحوم تھے، جو گرچہ عالم نہیں تھے؛ لیکن حد درجہ جوہر شناس اور علم کے قدرداں تھے، باضابطہ دیوبندیوں سے

بڑھ کر ''دیوبندی'' تھے اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی تحریک دعوت وتبلیغ کے ذمہ داروں میں تھے، میرے بڑے محسن، خیر خواہ اور کرم فرما تھے، ان کی شفقتیں اور عنایتیں قدم قدم پر ساتھ رہیں اور وہ میرے بدخواہوں کے مقابلہ ایک مضبوط ڈھال بنے رہتے، وہ مسجد حیدر گوڑہ کے بھی صدر تھے، جہاں جدید تعلیم یافتہ حضرات اور سرکاری افسروں کی اچھی خاصی تعداد آیا کرتی ہے، یہاں جمعہ کے لئے ایک خطیب کی ضرورت تھی، مولانا نے اس سلسلے میں اس حقیر کا نام پیش کیا؛ چنانچہ محرم ۱۳۹۹ھ کے پہلے ہفتے حیدر گوڑہ میں اس حقیر نے انٹرویو کے طور بیان کیا، صدر صاحب مرحوم کی مہربانی کہ انھوں نے اس خدمت کے لئے مجھے قبول فرمایا، وہ وقت تھا اور اب ۱۴۳۳ھ کا سن ہے، یہ خدمت بلا وقفہ اس حقیر سے متعلق ہے، اس خدمت کا سبب بھی مولانا مرحوم ہی بنے۔

پھر الحاج سید ضیاء الرحمٰن صاحب مرحوم کے اصرار پر قیام مسجد حیدر گوڑہ میں ہوگیا، فجر کے بعد درس قرآن نیز مغرب کے بعد درس مشکوٰۃ شریف اس حقیر سے متعلق کیا گیا، مولانا کی مسجد بھی یہاں سے قریب تھی اور اس وقت پیدل چلنا ذرا دشوار محسوس نہ ہوتا تھا؛ اس لئے ہفتہ میں اکثر دنوں ملاقات کی نوبت رہتی تھی، اس کا ایک محرک یہی تھی کہ مسجد عامرہ میں نہ صرف اخبارات پڑھنے کو مل جاتے تھے؛ بلکہ وہاں کی لائبریری میں ملک بھر سے رسائل بھی آیا کرتے تھے، اس زمانہ میں دارالعلوم سبیل السلام کے تحت مسجد حیدر گوڑہ میں جدید تعلیم یافتہ یا زیر تعلیم حضرات کے لئے مختصر مدتی عالم کورس کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور ابھی اس کے آغاز کا ایک ہی سال ہوا تھا، مولانا غیاث الاسلام رحمانی اس کے استاد تھے اور عشاء کے بعد تعلیم ہوا کرتی تھی، اس کی آئندہ جماعت مسجد عامرہ میں قائم کی گئی، اس میں چوں کہ باشعور طلبہ تھے اور وہ واقعی وہ طلبہ شوق سے شریک تھے ؛اس لئے انھیں پڑھانے میں بھی لطف آتا تھا، الحاج سید ضیاء الرحمٰن مرحوم کے اصرار پر مولانا نے حیدر گوڑہ والی جماعت مجھ سے متعلق کردی، اسی جماعت میں مولانا حافظ خواجہ نذیر الدین صاحب جیسے ہونہار فاضل تھے، جو جامعہ عائشہ کے ناظم ہیں اور ریاست کے اہم علماء میں ہیں۔

اس وقت دارالعلوم سبیل السلام کی صورت حال بھی دارالعلوم حیدرآباد سے چنداں مختلف نہیں تھی ؛ لیکن یہاں انتظام وانصرام محترم جناب عبدالرحیم صدیقی صاحب کی وجہ سے نسبتاً بہتر تھا ، وہ گرچہ ضابطہ میں خازن تھے ؛ لیکن عملاً ادارہ کے سب کچھ تھے اوران کی خوش اخلاقی اورنرم گفتاری کی وجہ سے اساتذہ مدرسہ سے جڑے رہتے تھے ، ضیاء الرحمٰن صاحب مرحوم کی طرف سے خواہش ہوئی کہ میں سبیل السلام آجاؤں ؛ بلکہ ان کواس پر بے حد اصرار تھا ، ظاہر ہے کہ اس میں مولانا رضوان صاحب کا ایماء بھی شامل تھا ؛ چنانچہ میں مولانا عاقل صاحبؒ کی اجازت سے سبیل السلام منتقل ہوگیا ، اس میں مدرسہ سے زیادہ باعث کشش مولانا کی شخصیت ، ان کی شفقت ، دیرینہ تعلق ،فکری ہم مزاجی ، اورعلمی ہم ذوقی تھی ، اس کے بعد ۲۳ سال یہ حقیر دارالعلوم سبیل السلام سے وابستہ رہا ، اس پوری مدت وہاں صدر مدرس رہا اورشب وروز مولانا کے ساتھ رہتے ہوئے ان کوقریب سے دیکھنے کا اوراجتماعی معاشرت کے سلسلے میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا ، ان ہی کے زیرسایہ ہم نے فارسی کی پہلی سے لے کر بخاری شریف تک تدریس کی خدمت انجام دی ، زبان ،منقولات اورمعقولات سے متعلق درس نظامی کی شاید ہی کوئی کتاب ہو ، جسے پڑھانے کا شرف اس حقیر کوحاصل نہ ہوا ہو۔

ہم مزاجی اورہم مذاقی کا حال یہ تھا کہ ہم دونوں کی محبوب شخصیتیں بھی عام طور پر ایک ہی ہوتی تھیں ، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ ، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ اورحضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ وغیرہ ایسی شخصیتیں تھیں ، جومشترک طور پر ہم دونوں کے لئے مرکز عقیدت تھیں اوراختلاف رائے میں ان کا اعتدال اوراختلاف کے اظہار میں فریق مخالف کا احترام اوراس کی اچھی باتوں کی قدرشناسی وغیرہ ، ہم لوگوں کو پسند آتی تھی ، ہمارے درمیان حددرجہ ہم آہنگی تھی ، حیرت علمی اورقلمی ذوق کی موافقت پر ہوتی تھی ، کہ اکثر کسی شخصیت کے بارے میں پہلے سے تبادلۂ خیال کے بغیر ہماری سوچ ایک جیسی ہوا کرتی تھی ، کوئی اہم تحریر لکھتے ہوئے جہاں میرا ذہن رکتا اورجس تعبیر کے بارے میں خیال ہوتا کہ اس کے بغیر

کوئی اور تعبیر ہوتی تو بہتر تھا، مولانا وہیں رکتے اور اسی پر اپنا خلجان ظاہر کرتے ،بعض مشورے بھی دیتے اور میں ان کے مشورہ سے استفادہ کرتا، اور مولانا جب کوئی اہم تحریر لکھتے تو سناتے یا مجھ سے پڑھنے کی خواہش فرماتے اور جہاں مجھے تامل ہوتا، کہتے کہ یہاں مجھے بھی انشراح نہیں تھا، اسی ہم آہنگی کی وجہ سے ہم دونوں کے درمیان طویل رفاقت رہی ؛ یہاں تک کہ اخیر کے چند سالوں کے سوا وہ مدرسہ کے انتظامی و تعلیمی اُمور میں بھی اس حقیر کے مشورہ کو بڑی اہمیت دیتے۔

مولانا کے ساتھ شبانہ روز رہنے کی وجہ سے بڑی بے تکلفی بھی تھی، گاہ بگاہ مولانا کی رگ ظرافت پھڑک اُٹھتی اور مجلس زعفران زار ہوجاتی ، میں بھی جب ان کا موڈ خراب ہوتا، ان کے ظریفانہ مذاق سے فائدہ اُٹھایا کرتا، ایک بار ظہر کے وقت اپنے دولت خانہ سے تشریف لائے ، اچانک مجھے، ایک اور سینئر استاذ نیز ایک خادم کو بلایا اور شہر سے تقریباً ڈیڑھ سو کیلومیٹر کے فاصلہ پر واقع مدرسہ کی ایک شاخ کی طرف چل دیئے، صورتِ حال یہ تھی کہ ہم لوگوں نے کھانا نہیں کھایا تھا اور مولانا دوپہر کے کھانے سے فارغ ہوکر آئے تھے، بھوک کا شدید احساس تھا، مولانا کے پاس ولحاظ میں کوئی بول نہیں رہا تھا، جب خاصا وقت گذر گیا تو میں نے عرض کیا: ہم لوگوں سے ایک بڑی غلطی ہوگئی، مولانا نے فرمایا: وہ کیا؟ میں نے عرض کیا: ہم لوگ کچھ پتھر ساتھ نہیں لائے ، مولانا کو بڑی حیرت ہوئی، فرمانے لگے: یہاں پتھر کا کیا کام ہے؟ میں نے عرض کیا: پتھر ہوتے تو پیٹ پر باندھ لئے جاتے ، شاید کچھ بھوک کم ہوتی اور اضطراری طور پر ایک سنت کو ادا کرنے کا اجر بھی حاصل ہوجاتا، مولانا بہت ہنسے، خوب محظوظ ہوئے اور ڈرائیور سے کہا کہ آگے جو دھابہ آئے اس پر گاڑی روک دی جائے ، اس طرح کی بے تکلفی مولانا کے مزاج میں تھی اور اس میں وہ بڑے چھوٹے کا فرق نہیں کرتے تھے۔

مولانا بعض خصوصیات میں اپنے معاصر علماء میں امتیازی شان کے حامل تھے —— ان کی سب سے اہم اور قابل تقلید خصوصیت ''تحمل و بردباری'' تھی ، ایسی ناگوارِ طبیعت باتیں

جن پر اچھے خاصے لوگ آپے سے باہر ہو جاتے ہیں، مولانا بڑے صبر کے ساتھ اسے سہ لے جاتے تھے، مدرسہ میں بھی، مسجد میں بھی، مختلف تنظیموں کی مشاورتی مجلسوں میں بھی اور عوامی ربط و تعلق میں بھی؛ بلکہ بعض دفعہ وہ ہم جیسوں کو سمجھاتے اور ہماری دلداری کرتے تھے، اس حقیقت کے اعتراف میں کوئی حرج نہیں کہ اس سلسلے میں اس حقیر نے ان سے بہت کچھ سیکھنے کی کوشش کی؛ البتہ زندگی کے اخیر چند سالوں میں جب وہ بی پی اور شوگر کے مرض میں مبتلا ہو گئے تھے، ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا، اور مدرسہ کے معاشی حالات پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے، مزاج میں کسی قدر زود رنجی پیدا ہو گئی تھی؛ لیکن یہ ان کا اصل مزاج نہیں تھا۔

ان کی دوسری خصوصیت وسیع الاخلاقی اور ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک، نیز مہمان نوازی تھی، وہ ہر کسی سے احترام و توجہ کے ساتھ بات کرتے، سبھوں کی عزت نفس کا خیال رکھتے، طلبہ کے ساتھ بھی اس کی خوب رعایت فرماتے، غریب طالب علم کی خاص طور پر قدر کرتے اور اپنی طالب علمی کو یاد کرتے، شریر طلبہ کے معاملہ میں عفو و درگزر کا راستہ اختیار کرتے، اساتذہ، عملہ، یا طلبہ کی جو کمزوریاں سامنے آتیں، ان پر پردہ ڈالنے کی سعی کرتے، زبان کی بھی بڑی حد تک حفاظت کرتے، ان کے دسترخوان کی وسعت اہل ثروت کو بھی شرمندہ کرتی اور یہ وسعت حسبِ حیثیت اس وقت بھی تھی، جب تنگ دستی اور عسرت کا زمانہ تھا، مجال نہ تھی کہ کوئی شخص آئے اور کھائے پیے بغیر چلا جائے، مہمان نوازی تو ایسی تھی کہ شاید و باید کہیں اور دیکھی ہو، مہمانوں کے سامنے گویا بچھ جاتے، ان کی محبوبیت اور ہر دلعزیزی میں اس کا بڑا دخل تھا۔

تیسرا نمایاں وصف اپنے بڑوں اور اساتذہ سے تعلق تھا، اپنے تمام اساتذہ سے محبت کرتے، خیر کے ساتھ ان کا ذکر کرتے، اگر کوئی بڑا عالم شہر میں آئے تو ضرور جا کر ان سے ملاقات کرتے، ان کی مجلس میں بیٹھتے اور ان کے ملفوظات سنتے، بعض دفعہ ان پر مضامین لکھتے، اگر اپنے بزرگوں کو دعوت دیتے تو کوشش کرتے کہ خود اسٹیشن پر ان کا استقبال کریں اور رخصت کرتے وقت اسٹیشن تک جائیں۔

چوتھا بڑا وصف شرم و حیاء کا عنصر تھا، عام طور پر اچھے خاصے اہل علم ایسی باتیں بول

جاتے ہیں، جو سطح سے گری ہوئی ہوتی ہیں اور حیاء کو شرم سار ہونا پڑتا ہے؛ مگر مولانا کا مزاج اس سے بالکل مختلف تھا، کوئی ہلکی بات مجلس میں ان کی زبان سے نہیں نکلتی تھی، طلبہ کو پڑھانے یا سمجھانے میں اگر کوئی ایسا مسئلہ آجائے، جس کا مرد وعورت سے تعلق ہو تو اشارہ وکنایہ سے گفتگو کرتے تھے۔

مولانا کا پانچواں وصف طبیعت کی لطافت اور نفاست تھی، وہ بڑا لطیف ذوق رکھتے تھے، نفیس کپڑے، عمدہ قسم کی چپل یا جوتا، قلم اکثر سنہرا استعمال کرتے، عینک بھی نفاست کی آئینہ دار ہوتی، تعمیر میں بھی خواہ مدرسہ کی ہو یا ذاتی، یہی ذوق کارفرما ہوتا، صوفہ، قالین، چادر، تکیہ، گاڑی، ہر چیز میں مولانا کی سلیقہ شعاری اور قرینہ پسندی ظاہر ہوتی، یہی ذوق کتابوں کے سرورق، کاغذ اور کتابت میں بھی ملحوظ ہوتا؛ لیکن اس نفاست کے ساتھ ان کے قول وفعل میں کہیں تکبر اور احساس بڑائی کی بو نہیں آتی اور اس کا اتنا لحاظ ہوتا کہ اگر مجھ جیسے غریب اور بے سلیقہ لوگوں کے گھر تشریف لاتے تو ذرا بھی اس کمی کا احساس نہیں ہونے دیتے اور بات بات پر تعریفی کلمات کہتے، جس کا اصل مقصد دلداری کرنا ہوتا تھا۔

مولانا کا چھٹا وصف ان کا جود وسخا اور اپنے رفقاء کا خیال ولحاظ تھا، یعنی دسترخوان کی وسعت کے علاوہ بھی اپنے متعلقین کے ساتھ لین دین کا معاملہ رکھتے تھے، گاہ بگاہ کسی استاذ کی پریشانی میں کسی کام کے عنوان سے ان کا تعاون، عملہ وطلبہ کی کسی ضرورت کو ذاتی طور پر پورا کردینا، رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک، مسجد کے خادموں کو بند مٹھی حوالہ کرنا وغیرہ، یہ فیاضی ان کی طبیعت کا حصہ تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق وہ کرتے رہتے تھے۔

یہ مولانا کے وہ اخلاقی اوصاف تھے، جن کا ہر شخص پر اثر پڑتا تھا اور جو اَب عنقا ہوتے جارہے ہیں، ان کے علاوہ بعض خوبیاں انتظامی اور علمی نوعیت کی ہیں، ان میں ایک بات مشوروں کو قبول کرنے کی صلاحیت ہے، وہ خود بھی صائب الرائے تھے، دوررس نگاہ کے ساتھ غور وفکر کرتے تھے اور جچی تلی رائے دیتے تھے؛ لیکن اس سے بڑا وصف یہ تھا کہ مشورہ کو قبول کرنے

کا حوصلہ رکھتے تھے، معاملہ مدرسہ کا ہو یا ریاستی سطح کا، یا قومی سطح کا، مدرسہ کے سینئر اساتذہ اورحسب موقع دوسرے علماء سے ضرور مشورہ کرتے اور اختلاف کو خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کرتے اور پہلے سے جورائے رکھتے تھے، اس سے دست بردار ہونے کو تیار رہتے، کئی بار ایسا ہوا کہ مدرسہ کے تعلیمی مسائل پر انھوں نے فیصلہ کرلیا، میں موجود نہیں تھا، جب میں آیا تو اس کے خلاف رائے دی اور اس کے وجوہ بھی بتائے، مولانا مطمئن ہوئے اور اپنی رائے سے رجوع فرمالیا، یہ بڑی عالی ظرفی کی بات ہے، جو کم لوگوں میں پائی جاتی ہے۔

دوسری خصوصیت ان کا علمی ذوق تھا، وہ کسی موضوع پر بولتے یا لکھتے تو کوشش کرتے کہ اس سلسلے میں جو کچھ مل جائے، اسے پڑھ لیں، اس کے لئے اپنے رفقاء سے بھی مدد لیتے، اگر کوئی کتاب ان کے اپنے ذاتی کتب خانہ میں یا مدرسہ میں موجود نہ ہو تو چاہتے کہ اسے خرید لیا جائے یا زیراکس کرالی جائے، ادبی اور فقہی موضوعات سے ان کو خاص دلچسپی تھی، اسی ذوق کا نتیجہ ہے کہ ان کے ذاتی کتب خانہ میں بڑی منتخب کتابیں تھیں، بعض کتابیں جن کو عرصہ سے یہ حقیر بھی پڑھنا چاہتا تھا؛ لیکن کہیں نظر نہیں آتی تھی، مولانا کے کتب خانہ میں ان کے دیدار کا موقع ملا، ان ہی کتابوں میں خواجہ حسن نظامی کی ''سیپارۂ دل'' ہے، جو عرصہ سے نایاب تھی، ادھر دو تین سال پہلے طبع ہوئی ہے، اس حسن ذوق کا سبیل السلام کے مکتبہ میں مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، مولانا خود بھی اپنی بلند ذوقی کی وجہ سے اچھی اچھی کتابیں خرید کر لاتے اور ہر سال یہ حقیر بھی مطلوبہ کتابوں کی فہرست پیش کرتا، مولانا خلیجی سفر میں اسے ساتھ لے جاتے اور جو کتابیں مل جاتیں، انھیں خریدنے کی کوشش کرتے، پھر جب خود میرا سفر جدہ ہونے لگا تو میں بھی ہر سال منتخب کتابیں خرید کر لایا کرتا، مولانا کی طرف سے اس کی اجازت ہوتی۔

انسان کو جس چیز کا ذوق ہوتا ہے، اس کی لالچ بھی ہوتی ہے، مولانا کے کتابی ذوق اور اس سلسلے میں ان کی قابل تعریف حرص کا نتیجہ تھا کہ وہ مسجد چوک اور پرانی کتابوں کے بازار کے اکثر چکر لگاتے، کسی شہر میں جانا ہوتا تو وہاں کا کتب خانہ دیکھتے اور کوئی کتاب پسند آجائے تو چاہے مالی حالات اجازت نہ دیں؛ لیکن اسے خریدے بغیر نہ رہتے، اپنے رفقاء کے یہاں

کوئی پسندیدہ کتاب نظر آجاتی تو خوددار طبیعت ہونے کے باوجود قابو نہ رکھ پاتے؛ چنانچہ ایک مرتبہ میں علامہ سیوطی کی الجامع الصغیر پر علامہ مناوی کی فیض القدیر اپنے لئے لے کر جدہ سے آیا اب جو مولانا کی نظر پڑی تو ریجھ گئے، بڑی رغبت سے الٹتے، پلٹتے، پسندیدگی کا اظہار کرتے؛ لیکن میرے لحاظ میں زبانِ سوال نہ کھولتے، میں نے مولانا کی غیر معمولی رغبت کو دیکھتے ہوئے عرض کیا کہ یہ میری طرف سے آپ کی خدمت میں نذر ہے، مولانا بے حد خوش ہوئے اور دیر تک دُعائیں دیتے رہے؛ بلکہ مولانا میرے غریب خانہ پر تشریف لاتے رہتے تھے اور میری چھوٹی سی لائبریری میں چائے وغیرہ پی جاتی تھی، ایسے موقع پر میں بعض ایسی کتابوں کو وہاں سے ہٹادیتا تھا، جن کے بارے میں گمان ہوتا تھا کہ مولانا کی نگاہ ذوق ضرور اس کی طلب گار ہوگی اور میں انکار نہ کرسکوں گا۔

مولانا کا قلمی ذوق بھی بڑا اچھا تھا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی تحریر کو خاص کر بہت پسند کرتے تھے، خود بھی خوب لکھتے تھے، حسبِ موقع وضرورت تحریر میں شوخی اور تیکھاپن بھی پیدا کرتے؛ اس لئے ان کی تحریر بڑی خوبصورت، شستہ، شائستہ اور شگفتہ ہوا کرتی تھی، اخیر زمانہ میں ادبی موضوعات پر بھی لکھنے لگے تھے؛ لیکن زیادہ تر دینی موضوعات پر قلم اٹھاتے تھے، تنقید میں بھی ان کا قلم خوب چلتا تھا، خاص کر بریلوی بھائیوں کے رد میں ایسی تحریر لکھتے تھے کہ مخالفین ماہی بے آب ہوجائیں، حیدرآباد کے ایک اسی قسم کے نام نہاد سجادہ نشیں —— جو اکثر اپنے آپ کو 'خادم قوم' لکھا کرتے تھے —— کے بارے میں بھی ایک مضمون لکھا، جس کا عنوان تھا: ایک خادم قوم — زر کا مالک، فکر کا مفلس، وہ اپنی تحریر میں بکثرت اشعار بھی لکھا کرتے تھے اور اکثر عنوان بھی بڑے خوبصورت لگاتے تھے، گفتگو میں بھی اور تحریر میں بھی انھیں بات سے بات پیدا کرنے اور مناسبتوں کے ڈھونڈ نکالنے کا بڑا ذوق تھا، جیسے حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام صاحبؒ کی وفات کے بعد بورڈ کے چوتھے صدر کا انتخاب تھا، مولانا کا رجحان اس کے لئے حضرت مولانا سید محمد رابع ندوی کی طرف تھا اور اس سلسلے میں ہم لوگ بھی ہم رائے تھے، مولانا

نے انتخاب سے پہلے اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آپ لوگوں کو صدر رابع کا انتخاب کرنا ہے، اسلامک فقہ اکیڈمی کا چوتھا سمینار حیدرآباد میں ہوا، مولانا نے اس کی میزبانی کی دعوت دیتے ہوئے فرمایا کہ چار مینار حیدرآبار میں ہے؛ اس لئے چوتھے سیمینار کے لئے اس سے اچھی اور موزوں جگہ کون سی ہوگی؟

حالاں کہ مولانا اشعار کہتے نہیں تھے؛ لیکن اشعار کا لطیف ذوق رکھتے تھے اور بکثرت یاد تھے، کسی بھی موضوع سے متعلق اتنے اچھے اچھے اشعار نقل کرتے کہ مجلس میں نشاط کی لہر دوڑ جاتی، اشعار کا یہ ذوق نجی مجلسوں اور تقریروں میں تو ہوتا ہی، تحریروں میں بھی ہوتا، میرا مزاج عام طور پر تحریر میں بھی اور تقریر میں بھی زیادہ اشعار کے نقل کرنے کا نہیں ہے؛ لیکن اگر کہیں ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا سے رُجوع کر کے مناسب حال کوئی شعر حاصل کر لیتا تھا۔

اصل میں مولانا علم و تحقیق اور تصنیف و تالیف کے آدمی تھے؛ لیکن انتظامی کاموں اور عوامی تعلقات کی وجہ سے اس کا کم موقع ملا، پھر بھی ان کی متعدد کتابیں علمی دنیا میں ان کو زندہ رکھیں گی، جن میں ان کے علمی و ادبی مضامین کے مجموعے: ''چراغِ راہ، اسرارِ حیات، متاعِ قلم'' خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ وقت کی اہمیت پر ''اے انسان! وقت کی قیمت پہچان'' دینی مدارس کے نصاب پر ''دینی مدارس اور عصر حاضر'' مولانا حکیم اختر حسین صاحب کے ملفوظات کا مجموعہ: ''باتیں ان کی یاد رہیں گی'' مردہ کے احکام پر ''سفر آخرت — احکام و مسائل'' اور بعض مختصر رسائل بہت خوب ہیں، اس کے علاوہ ان کے لئے سب سے بڑا صدقۂ جاریہ 'دارالعلوم سبیل السلام' ہے، جو ہوش و حواس کی آخری سانس تک ان کی کوششوں کا مرکز رہا اور جسے انھوں نے اپنے حسین خوابوں کی تعبیر بنایا۔

۱۹۶۹ء میں حضرت مولانا قاری طیب صاحبؒ کے حکم پر مسجد عامرہ کے امام و خطیب کی حیثیت سے حیدرآباد تشریف لائے، ان کے جمعہ کے بیانات اور دورسِ قرآن و حدیث

سے بے شمار لوگوں نے اپنی زندگی سنواری، اگرچہ انھیں کتابوں کی تدریس کا زیادہ موقع نہیں ملا؛ لیکن سبیل السلام کے ابتدائی دور میں باضابطہ اسباق بھی پڑھایا کرتے تھے اور ان کے درس میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا بھی پہلو نمایاں رہتا تھا، وہ عرصہ تک ''نوید کن'' میں 'ندائے حجاز' کے عنوان سے خصوصی کالم لکھتے رہے، جس میں عقیدہ وعمل کی اصلاح کی باتیں ہوتی تھیں، جب یہ اخبار بند ہوگیا تو کچھ وقفہ کے بعد ''روزنامہ سیاست حیدرآباد'' میں لکھنا شروع کیا، جس میں ادبی مضامین، شخصی خاکے اور عصری مسائل پر اظہار خیال کا رنگ غالب تھا ''سیاست'' میں گو یہ مضامین ہر ہفتہ پابندی سے شائع نہیں ہوتے تھے؛ لیکن وفات سے چند سال پہلے اسی اخبار میں سوال وجواب کا کالم شروع ہوا اور مولانا کو اس کی ذمہ داری سونپی گئی؛ چنانچہ آپ کی وفات تک ہر اتوار کو یہ کالم بہ پابندی شائع ہوتا رہا، اس میں فقہی مسائل کے ساتھ ساتھ مولانا کے ذوق کے مطابق ادبی موضوعات پر بھی بہت سے سوال وجواب شائع ہوا کرتے تھے۔

اسی طرح مولانا نے دینی مضامین سے مرصع ہجری کیلنڈر بھی شائع کرنا شروع کیا، جو بیک وقت کیلنڈر بھی تھا اور دعوتی لٹریچر بھی، اس میں سارے مضامین خود ان کے ہوتے تھے، جو مہینوں کی مناسبت سے لکھے جاتے تھے، انھیں مضامین کی مناسبت سے ہر صفحہ پر ایک آیت، ایک حدیث مع ترجمہ ہوتی، پھر اسی کی رعایت کرتے ہوئے دل کو چھو لینے والے کسی شعر کا انتخاب بھی ہوتا، ان کیلنڈروں کو بڑی مقبولیت حاصل تھی، خاص کر دارالعلوم دیوبند کے اجلاس صدسالہ پر بڑا عمدہ اور اہم معلومات پر کیلنڈر مرتب کیا اور صاحبِ ذوق کاتب 'سلام خوش نویس' سے اس کی کتابت کرائی، بعد کو مختلف ادارے اس طرح کے کیلنڈر شائع کرنے لگے اور اب بھی شائع کررہے ہیں؛ لیکن اصل میں یہ ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھی ''**والفضل للمتقدم**''۔

ضرورت ہے کہ مولانا کے ورثہ شرعی اور ادبی، سوال وجواب کے مجموعوں کو، نوید دکن میں چھپی ہوئی بھولی بسری تحریروں کو اور کیلنڈر میں مطبوعہ مضامین، نیز متفرق مضامین —— جو اب تک چھپ نہیں سکے ہیں —— کے مجموعے شائع کریں؛ تاکہ اہل علم اور اصحابِ ذوق ان سے استفادہ کرسکیں، یہ یقیناً مولانا کی وفات کے بعد ان کے لئے بہترین خراجِ تحسین ہوگا۔

مولانا اپنی متنوع صلاحیتوں کی وجہ سے کل ہنداور ریاستی سطح کی مختلف تنظیموں سے ذمہ دارانہ تعلق رکھتے تھے، وہ دارالعلوم سبیل السلام کے ناظم ہونے کے علاوہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے رکن تاسیسی و عاملہ، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے نائب صدر، ندوۃ العلماء کی مجلس منتظمہ کے رکن، دینی مدارس بورڈ آندھراپردیش کے نائب صدر، یونائیڈ مسلم فورم اندھراپردیش کے نائب صدر، نیز ملی کونسل اور مجلس علمیہ وغیرہ کے رکن رکین تھے اور عمر نے وفا کیا ہوتا تو شاید ان کی خدمات کا دائرہ اور بھی وسیع ہوتا۔

اس بات کا ذکر بے محل نہ ہوگا کہ یہ حقیر ۲۳ سال ان کے ساتھ دارالعلوم سبیل السلام میں رہا، اور اخیر کے ۲،۳ سالوں کے علاوہ ہمیشہ باہمی اعتماد واعتبار میں کمی نہ آئی، جب خوشگوار تعلقات میں کسی قدر کرواہٹ پیدا ہونے لگی تو میں نے طے کیا کہ اب مجھے اس ادارہ سے الگ ہوجانا چاہئے؛ تاکہ دل ودماغ کی طمانینت کے ساتھ کچھ کام کیا جائے، مولانا سے بھی دیرینہ تعلقات باقی رہیں اور فاصلے بڑھنے نہ پائیں؛ کیوں کہ بعض دفعہ قربت دوری پیدا کردیتی ہے اور دوری قربت کا باعث بنتی ہے؛ حالاں کہ مولانا نے آخری دنوں میں بہ ظاہر مجھے روکنے کی بہت کوشش کی؛ لیکن مصلحت کا تقاضہ یہی محسوس ہوا کہ اب میں خاموشی سے الگ ہوجاؤں۔

اگرچہ ایک سال پہلے مولانا کو میں نے اپنے ارادہ سے مطلع کردیا تھا اور رجب کے شروع میں استعفیٰ بھی پیش کردیا تھا؛ لیکن مولانا کی خواہش پر میں نے ۱۵؍شعبان سے پہلے مدرسہ میں کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی؛ بلکہ اپنے گھر کے لوگوں کو بھی چند ہی دن پہلے بتایا، فطری بات ہے کہ ایسے مواقع پر رنجشیں پیدا ہوتی ہیں اور تلخیاں جنم لیتی ہیں؛ لیکن میری دلی خواہش تھی کہ ہمارے تعلقات خوشگواری کی طرف لوٹ آئیں؛ چنانچہ کرایہ کی ایک جگہ وہاں سے قریب شاہین نگر میں لے چکا تھا، مولانا نے خواہش کی کہ معہد کو تھوڑی دوری پر رکھیں تو بہتر ہوگا؛ چنانچہ مولانا کی خواہش کے احترام میں میں نے ''معہد'' کو ایک دوسرے محلے —— اکبر باغ —— میں شروع کیا، جو سبیل السلام سے سات آٹھ کیلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، اس کے بعد

اس حقیر نے ہمیشہ کوشش کی کہ مولانا مرحوم کے ساتھ تلخیاں ختم ہوجائیں؛ چنانچہ جب ''معہد'' کی چھوٹی سی مسجد اس کی ضرورت کے مطابق تعمیر ہوئی تو اس کے افتتاح کے لئے میں نے مولانا ہی کو زحمت دیا، مولانا پہلی بار معہد کی نوتعمیر شدہ مگر نامکمل عمارت میں تشریف لائے اور خطاب فرمایا، پھر ایک بار ''دعوہ تربیتی کیمپ'' کے افتتاح کے لئے مولانا کو مدعو کیا گیا، اس وقت مولانا محمد کلیم صدیقی صاحب بھی مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف رکھتے تھے، مولانا نے اس موقع پر دعوت کے پس منظر میں سورۂ تکویر کی ابتدائی آیتوں کی بڑی اچھی تفسیر فرمائی، معہد کے سالانہ جلسے میں بھی ان کو مدعو کیا جاتا تھا، متعدد جلسوں میں انھوں نے شرکت فرمائی اور ایک جلسہ کی صدارت بھی کی۔

مولانا نے بھی دیرینہ رفاقت کا خیال رکھا؛ چنانچہ میرے علاحدہ ہونے کے بعد جب بھی کوئی پروگرام ہوتا مجھے ضرور یاد فرماتے اور خاص طور پر ٹیلیفون کرتے، میرا خطاب بھی رکھتے اور ایسے موقع پر خاص طور سے ہماری باہمی دیرینہ رفاقت کا ذکر کرتے، ایک بار کہنے لگے کہ آپ کا کمرہ اب تک میں نے خالی رکھا ہے اور آپ کا استعفیٰ بھی ویسا ہی رکھا ہوا ہے، ابھی تک میں نے اس پر کچھ لکھا نہیں ہے، معہد کے قیام کے بعد بھی محترم دوست جناب رحیم الدین انصاری صاحب کی خواہش بلکہ اصرار پر دو سال میں ظہر تا عصر دارالعلوم حیدرآباد میں سنن ترمذی اور ایک گھنٹی شعبۂ افتاء میں پڑھایا کرتا تھا؛ لیکن یہ دو جگہ کی تدریس بے حد تھکا دیتی تھی اور پھر فاصلہ بھی اچھا خاصا تھا، جب میں نے وہاں چھوڑ دیا تو ایک ملاقات میں مولانا نے سبب پوچھا، میں نے یہی اسباب ذکر کئے، مولانا نے فرمایا: سبیل السلام کا فاصلہ تو زیادہ نہیں ہے، میں نے عرض کیا کہ ویسے آپ کا جو حکم ہو؛ لیکن بہتر ہے کہ آپ ایسا نہ سوچیں؛ کیوں کہ ایک تو میں دو اداروں کا حق ادا نہیں کرسکوں گا، دوسرے بعض اوقات زمینی قربت ذہنی فاصلوں کو بڑھا دیتی ہے اور غلط فہمیوں کو جنم دیتی ہے اور دور رہ کر تعلقات خوش گوار رہتے ہیں؛ چنانچہ مولانا خاموش ہوگئے۔

مولانا کی وفات سے کچھ پہلے دارالعلوم سبیل السلام میں اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کا چودہواں فقہی سیمینار منعقد ہوا، جس کی دعوت انھوں نے حضرت قاضی صاحبؒ کی زندگی ہی میں دی تھی، یہ سیمینار قاضی صاحبؒ کی علالت، مولانا مرحوم کی علالت اور سیمینار کے لئے مطلوب بعض تعمیری ضروریات کی وجہ سے کافی تاخیر سے ہوا، اور ایسا لگا کہ جیسے من جانب اللہ اسی سیمینار کے لئے مولانا کے جسم وروح کا رشتہ باقی تھا، اس سیمینار سے پہلے بھی مولانا کو ہارٹ اٹیک ہو چکا تھا اور سیمینار کے درمیان بھی ان کی حالت بہت بہتر نہیں تھی؛ چنانچہ مولانا نے جو خطبہ استقبالیہ پیش کیا، وہ اسے پورا پڑھ نہیں پائے اور ایک ڈیڑھ صفحہ پڑھ کر مجھ سے خواہش فرمائی کہ میں اسے پورا کردوں؛ چنانچہ میں نے ہی اسے مولانا کی طرف سے پڑھ کر سنایا، اس سیمینار کے موقع سے مولانا سے اتنی قربت ہوگئی اور نہ صرف مدرسہ؛ بلکہ ان کے دولت خانہ پر بھی آمد ورفت کا ایسا سلسلہ رہا کہ گویا میں ابھی بھی ان کے رفیق کار کی حیثیت سے خدمت انجام دے رہا ہوں، مولانا پہلے ہی کی طرح مجھے اپنی برابر میں بٹھاتے، ہر چھوٹی بڑی بات پر مشورہ کرتے، مختلف اُمور مجھ سے متعلق کرتے اور بار بار فون فرماتے، ایک بار ملاقات ہوئی تو کہنے لگے: کیا کہوں سب چیز مل جاتی ہے، افراد نہیں ملتے، سیمینار ہوا اور بہت اچھے ماحول میں ہوا۔

عرصہ سے میرے دل میں یہ آرزو مچل رہی تھی کہ ایک بار مولانا سے مل کر دل کی صفائی کرلوں؛ تاکہ آخرت میں ہم ایک دوسرے کے حق سے بری ہو کر اللہ کے حضور میں حاضر ہوں؛ چنانچہ میں نے مولانا کو فون کیا کہ میں آدھے ایک گھنٹہ کی ملاقات کا وقت چاہتا ہوں، آپ جہاں چاہیں، وہاں حاضری ہو جائے گی، مگر کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے آپ متفکر ہوں اور ذہن پر بوجھ لیں، مولانا نے غالباً منگل کا دن بتایا کہ اس روز عصر کے بعد مدرسہ میں ملاقات کرنی بہتر ہوگی، میں حسبِ وعدہ حاضر ہوا، مولانا انتظار میں تھے اور تنہا تھے، اس روز محسوس ہوا کہ وہ مسجد تک پہنچنے میں اور معمولی سی چڑھائی چڑھنے میں بھی دشواری محسوس کر رہے ہیں، بہر حال میں نے عرض کیا کہ میری عمر بھی پچاس سے متجاوز ہو چکی ہے اور آپ کی بھی ساٹھ کے آس

پاس ہوگی ، رسول اللہ (ﷺ) نے ارشاد فرمایا کہ میری اُمت کی عمر اوسطاً ساٹھ سے ستر سال ہوگی، اس طرح ہم دونوں کے لئے ایک طرح سے دس بیس سال کی مہلت ہے اور کم سے کم ۲۳ سال ہم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے ہیں ، اتنے طویل عرصہ میں ایک دوسرے کے ساتھ کمی زیادتی کا ہوجانا عجیب نہیں ؛ لیکن آپ میرے بزرگ ہیں اور میں آپ کا عزیز ہوں ، آپ میرے محسن بھی ہیں ، میں یہ مان کر چلتا ہوں کہ آپ کو جو بھی تکلیف پہنچی ہو، وہ میری غلطی ہے اور مجھے جو تکلیف پہنچی ہو، وہ غلط فہمی ہے ؛ لیکن اب جب کہ کوئی وجہ اختلاف باقی نہیں رہا ، ہمیں اللہ کے لئے اپنے دلوں کو صاف کر لینا چاہئے ، اس لئے میں آپ سے عفوخواہ ہوں ، مولانا میری اس بات سے بہت متاثر ہوئے ؛ بلکہ آب دیدہ ہوگئے اور فرمایا کہ کچھ لوگوں نے ہم لوگوں کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کردی تھیں ، اب میں بھی اسے بھولتا ہوں اور آپ بھی بھول جائیے ؛ البتہ میرے دل پر اس کا بہت اثر ہے کہ آپ نے الگ ہونے کے بعد بھی میری توقیر میں کوئی کمی نہیں آنے دی ، اللہ آپ کو جزائے خیر دے اور آپ سے زیادہ سے زیادہ دین کی خدمت لے۔

اس ملاقات نے مجھے بے حد شاد کام کیا اور دل پر جو بوجھ تھا وہ اتر گیا، اس کے چند ہی دنوں کے بعد دہلی میں آل انڈیا ملی کونسل کا خصوصی اجلاس تھا، جس میں مولانا کو تو شریک ہونا ہی تھا کہ وہ ملی کونسل آندھرا پردیش کے معاون جنرل سکریٹری تھے اور بہ حیثیت رکن مجھے بھی شرکت کرنی تھی ، اس اجلاس میں صدر اور جنرل سکریٹری کا انتخاب تھا، اس وقت پوری دیانت کے ساتھ میری رائے تھی کہ ان دونوں میں سے کوئی ایک ذمہ داری مولانا مرحوم سے متعلق ہونی چاہئے ، میں نے دہلی میں بھی بعض حضرات سے اس سلسلہ میں گفتگو کی اور مولانا سے بھی عرض کیا کہ اگر اس سلسلہ میں کوئی بات سامنے آئے تو آپ اس سے انکار نہ کریں ، بہر حال مولانا بھی اس پر رضامند ہوگئے ، مولانا نے خواہش کی کہ آپ بھی ساتھ ہی چلتے تو بہتر ہوتا ؛ لیکن میں نے اپنے ایک کام کی وجہ سے معذرت کی اور عرض کیا کہ انشاء اللہ دہلی میں ملاقات

ہوگی اور میں آپ کی قیام گاہ ہی میں حاضر ہوجاؤں گا؛ چنانچہ میں حسب پروگرام دہلی پہنچا، وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ شدید علالت سے دوچار ہوکر ہاسپٹل میں داخل ہیں، بڑا قلق اور افسوس ہوا، واپس آنے کے بعد کئی بار چاہا کہ ہاسپٹل پہنچ کر مولانا کی عیادت کروں؛ لیکن مولانا کے تیمارداروں سے معلوم ہوا کہ اِس وقت ڈاکٹروں کی طرف سے عیادت کی اجازت نہیں ہے، بہر حال اس علالت کے تقریباً ایک ماہ بعد جب میں 'اسلامک فقہ اکیڈمی دہلی' میں چند روز کے قیام کے بعد واپس آرہا تھا تو راستہ ہی میں اطلاع ملی کہ آج دوپہر کو دو بجے کے بعد مولانا کی وفات ہوگئی، یہ ۲۵؍شعبان ۱۴۲۵ھ، مطابق ۱۱/۱ اکتوبر ۲۰۰۴ء دوشنبہ کا دن تھا، مولانا کی پیدائش ۱۸؍شعبان ۱۳۶۳ھ، مطابق ۱۱؍جولائی ۱۹۴۴ء کی ہے، اس طرح شمسی کیلنڈر سے ۶۰ سال اور ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے ۶۲ سال کی عمر پائی۔

عرصۂ حیات کے اتنے کم ہونے کے باوجود انھوں نے جو خدمات انجام دی ہیں، وہ یقیناً لائقِ تحسین بھی ہیں اور قابل رشک بھی، مولانا کی وفات میرے لئے یقیناً ایک بڑا صدمہ تھی، یہ صدمہ دوچند ہوجاتا اگر مولانا کی وفات سے کچھ عرصہ پہلے میری ان سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی، جس کا مقصد دلوں کی صفائی تھی اور جس کا داعیہ آخرت میں جواب دہی کے سوا کچھ اور نہ تھا۔

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوْا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوْفٌ رَّحِيْم ۔ (الحشر:۱۰)

❁ ❁ ❁

قاری محمد تقی الدین صاحبؒ

شمع محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق

تاریخ اور ماہ وسال تو یاد نہیں ؛ لیکن حیدرآباد آنے کے چند سال بعد میری ملاقات ''مدرسۂ نور'' سعیدآباد میں اس کے بانی اور صدر قاری محمد تقی الدین صاحب مرحوم سے ہوئی ، سانولا رنگ ، چہرے پر چیچک کے چند ہلکے نشانات ، باریش چہرہ ، آنکھوں پر موٹی سی عینک ، سفید کرتا پاجامہ اور دو پلی ٹوپی اور پاؤں میں ہوائی چپل ، جب کسی پروگرام میں جانا ہوتو ایک سادہ سی شیروانی اور سیاہ مخملی ٹوپی ، یہ تھا قاری صاحب کا سراپا ، بڑے ملن سار ، مزاج میں منکسر وخاکسار ، ہر بات سے سادگی عیاں ، اس خوش اخلاقی اور ساتھ ہی ساتھ ظرافت اور بذلہ سنجی کی وجہ سے انھیں بڑی قبولیت حاصل تھی ۔

میرا جب ان سے ربط وتعلق ہوا اس وقت وہ اپنے قائم کئے ہوئے گلشن علم ''مدرسۃ النور سعیدآباد'' کو سیراب کرنے میں مشغول تھے ، یہ ایک عصری اسکول تھا ؛ لیکن سرکاری نصاب کے ساتھ ساتھ دینیات کی تعلیم بھی دی جاتی تھی اور شعبۂ حفظ بھی قائم تھا ، اُردو میڈیم ہونے کے باوجود اسے عوام وخواص میں بڑی مقبولیت حاصل تھی ، لوگ دور دور سے یہاں اپنے بچوں اور بچیوں کو داخل کرتے تھے ، داخلہ کے خواہش مندوں کا تانتا بندھا ہوتا تھا اور ڈیڑھ ہزار سے بھی زیادہ طلبہ وطالبات زیر تعلیم تھے ، ادارے کی پرشکوہ عمارت تعمیر ہو چکی تھی اور دوسری منزل تو میری نظر کے سامنے بنی ؛ لیکن قاری صاحب کا دفتر سادگی کا مرقع تھا ، جو ان کے اپنے آبائی گھر کے دیوان خانہ میں واقع تھا۔

قاری صاحب اس مدرسہ کو ترقی دینے اور آگے بڑھانے کے لئے خلیج سے لے کر

امریکہ تک کا سفر کرتے اور اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے؛ لیکن قاری صاحب کو قرآن مجید سے جو تعلق تھا، وہ اس اسکول اور ضمنی طور پر قرآن اور دینیات کی تعلیم پر قانع نہیں تھے، ان کے ذہن میں ایک زبردست ''قرآن یونیورسٹی'' کا تصور تھا؛ چنانچہ ۱۹۸۱ء میں انھوں نے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے ہاتھوں ''جامعۃ القرآن'' کی عمارت کا سنگ بنیاد رکھوایا، دھیرے دھیرے کام ہوتا رہا، یہاں تک کہ جامعۃ القرآن کی ایک خوبصورت اور وسیع عمارت مکمل ہوگئی، یہاں باضابطہ تعلیم کا آغاز ہوگیا اور یہی ادارہ آپ کی توجہ کا اولین مرکز بن گیا، اس کا اثر یقینی طور پر 'مدرسۃ النور' پر پڑا اور اس میں انحطاط آتا گیا اور شاید اب بھی صورتِ حال اس سے مختلف نہیں، اصل یہ ہے کہ جو گلشن اپنے مالی سے محروم ہو، اس کی مثال ایسے یتیم بچے کی ہوتی ہے جس کا کوئی پُرسان حال نہیں ہو۔

یہ نو قائم شدہ جامعہ جس میں طلبہ اور طالبات دونوں کے لئے تعلیم اور رہائش کا جداگانہ انتظام تھا، کچھ ہی عرصہ میں دورۂ حدیث تک پہنچ گیا اور ایسی شہرت اور پذیرائی حاصل کی، جو دوسرے اداروں کے لئے باعثِ رشک بن گئی، قاری صاحب مرحوم نے اس کے علاوہ بھی تعلیم کے بہت سے کام کئے، عیدگاہ اُجالے شاہ میں تلگو میڈیم مدرسہ قائم کیا، جس میں تلگو بولنے والے بچے داخل کئے جاتے، دیہاتوں میں جابجا مدارس و مکاتب قائم کئے اور ان سب کے انتظام و انصرام کے لئے ''الحق ایجوکیشنل سوسائٹی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا، جس کے زیر نگرانی اب بھی ایک درجن سے زیادہ مکاتب و مدارس چل رہے ہیں، اس طرح کی اور بھی کئی کوششیں ہیں جو قاری صاحب مرحوم کی فکرمندی اور دردمندی کا عکس جمیل ہیں۔

انھیں اکابر علماء سے ملاقات کا خاص ذوق تھا اور وہ دو شخصیتوں —— مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی —— سے زیادہ متأثر تھے، تعلیم کے سلسلے میں ان کی سوچ مولانا مودودی کی فکر پر مبنی تھی؛ چنانچہ مدرسۃ النور کی شکل میں انھوں نے ایک ایسا ادارہ قائم کیا، جو اصل میں عصری تعلیم کے لئے تھا؛ لیکن ضمناً وہاں دینی تعلیم ہوتی تھی، اور جامعۃ القرآن کی

صورت میں انھوں نے ایک ایسے ادارے کا خواب دیکھا، جس میں اصلاً دینی تعلیم اور ساتھ ساتھ عصری تعلیم دی جائے؛ چنانچہ جون ۲۰۰۱ء میں جب اس جامعہ کے طلبہ نے میٹرک کا امتحان دیا تو انھوں نے نمایاں کامیابی حاصل کی اور یہ بات ثابت کردی کہ ایک ساتھ یہ دونوں تعلیم دی جاسکتی ہے، افسوس کہ وہ اس قافلہ کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے اور وقت موعود آپہنچا، ورنہ یہ ادارہ دینی اور عصری تعلیم کے امتزاج کے لئے ایک آئیڈیل کی حیثیت اختیار کرلیتا۔

تعلیمی خدمات سے بھی بڑھ کر ان کی دعوتی اور اصلاحی خدمات ہیں، حیدرآباد کے محلّہ سعیدآباد میں اجالے شاہ کے نام سے ایک درگاہ موجود ہے، یہاں روایتی طور پر سفید مرغ نذر کئے جاتے ہیں، شاید اسی لئے یہ درگاہ 'اُجالے شاہ' کہلاتی ہے، درگاہ اور اس کے وسیع قبرستان کے احاطہ میں ایک چھوٹی سی مسجد تھی، جسے قاری صاحب کے والد ماجد جناب شرف الدین صاحب نے آباد کیا تھا، ۱۹۶۱ء تک خود انھوں نے اور ۱۹۶۴ء تک قاری صاحب کے بڑے بھائی جناب ظہیر الدین انجینئر نے اور ان کے پاکستان جانے کے بعد قاری صاحب نے اس مسجد کی امامت وخطابت کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی، یہ علاقہ اور خاص کر یہ درگاہ کا احاطہ بدعات وخرافات اور مشرکانہ رسوم ورواج کا مرکز تھا۔

قاری صاحب کی دعوتی اور اصلاحی محنت سے نہ صرف اس احاطہ سے شرک و بدعت کے اثرات کم ہوئے؛ بلکہ محلّہ سعیدآباد اور شہر کے ایک اچھے خاصے حصہ پر اس کی چھاپ پڑی اور جو لوگ شرک و بدعت کے علمبردار تھے، وہی توحید وسنت کے داعی بن گئے، اس کے علاوہ آپ نے ایک مہم ارتداد کی دہلیز پر کھڑے دیہات کے مسلمانوں کے لئے شروع کی اور حیدرآباد کے مضافات میں واقع بہت سے دیہاتوں میں پہنچ کر آپ نے وہاں خطاب کیا، تلگو مقررین کو اپنے ساتھ رکھا، وہاں مکاتب قائم کئے، چند دیہاتیوں کو جوڑ کر مراکز بنائے اور حسبِ ضرورت وہاں دارالاقامہ کے ساتھ مدرسہ قائم کیا، تلگو زبان میں دعوتی اور اصلاحی نقطۂ نظر سے کتابوں کے ترجمے کرائے اور زیادہ سے زیادہ لوگوں تک اسے پہنچانے کی کوشش کی،

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سینکڑوں خاندان اور ہزاروں افراد ایسے ہوں گے،جن کے لئے ان کی ذات رشد وہدایت کا ذریعہ بن گئی۔

قاری صاحب کی چند خصوصیات ایسی ہیں، جو خاص طور پر علماء اور مذہبی قائدین کے لئے دامن دل سے باندھنے کی ہیں، ایک تو عقیدۂ توحید پر استقامت اور اس کی دعوت، انھیں اس عقیدہ پر پختگی اپنے والد سے میراث میں ملی تھی اور اور ان کے رگ وریشہ میں سمائی ہوئی تھی، وہ شرک وبدعت پر نقلی اور عقلی دلیلوں کے ساتھ بڑی قوت سے رد کرتے تھے اور ان کے لفظ لفظ سے ان کا اندرونی درد چھلکتا تھا؛ اس لئے لوگوں پر اس کا اثر بھی ہوتا تھا، اس کے لئے بعض دفعہ تصادم کی نوبت بھی آئی، خطرات بھی مول لئے اور سب وشتم کے تیر بھی سہے؛ لیکن کبھی ان کے پائے استقامت میں تذبذب نہیں آیا، مسجد اُجالے شاہ ایک طرح سے اس دعوت کا مرکز بن گیا اور جمعہ میں لوگ دور دور سے یہاں آنے لگے۔

دوسری خصوصیت 'تعلق مع القرآن' ہے، وہ قرآن مجید کے عاشق تھے، کثرت سے قرآن کی تلاوت کرتے تھے؛ ایک بار میرا ان کے ساتھ دبئی کا سفر ہوا، میں نے دیکھا کہ سفرِ جہاز کے پورے دورانیہ میں سوائے کچھ ضروری گفتگو کے وہ تلاوت میں مصروف رہے، ان کی تلاوت بھی گویا لحن داؤدی میں ہوتی تھی، برگشتہ کان بھی متوجہ ہو جائیں اور چلتے ہوئے قدم تھم جائیں، سنتے رہیے اور سر دھنتے رہیے، اس زمانہ میں ملیشیاء میں عالمی مقابلہ قراءت ہوا کرتا تھا اور اس میں شرکت کو بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا؛ چنانچہ ۱۹۷۱ء میں قاری صاحب ہندوستانی نمائندہ کی حیثیت سے مدعو کئے گئے، وہ تراویح میں بھی ایسا قرآنِ مجید پڑھتے تھے کہ حرمین شریفین کی لذت تازہ ہو جاتی تھی، لوگ ٹھنڈک اور بارش کی پرواہ کئے بغیر دور دور سے ان کی تراویح میں شرکت کے لئے آتے تھے؛ حالاں کہ ان کی تراویح میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے اور ہر چار رکعت پر تلاوت شدہ حصہ کا ترجمہ سنانے کی وجہ سے بہت دیر ہوتی تھی۔

الفاظِ قرآن کی طرح انھیں معانی قرآنی سے بھی بڑی مناسبت تھی، موضوعات کی

مناسبت سے آیتیں نوکِ زبان تھیں ، جب کسی موضوع پر بیان کرتے تو بڑی حد تک ان کا خطاب اس موضوع کی آیات کا احاطہ کرتا اور آیاتِ قرآنی کی برکت کہ لوگ گوش بر آواز ہو کر سنتے ، اس حقیر نے اپنی زندگی میں تین مقررین کو آیاتِ قرآن کو برمحل اور بکثرت نقل کرتے ہوئے دیکھا، ایک مولانا محمد عمر پالن پوری کو، وہ آیاتِ قرآنی کی روشنی میں جنت و دوزخ کا ایسا نقشہ کھینچتے کہ آخرت کا یقین بڑھ جاتا اور ایسا لگتا کہ جنت و دوزخ سامنے ہے، دوسرے مولانا عبدالکریم صاحب پاریکھ اور تیسرے قاری محمد تقی الدین صاحب؛ لیکن بہ کثرت آیات کے نقل کرنے اور شب و روز کے مسائل سے انھیں جوڑنے میں قاری صاحب کی اپنی ایک شان تھی۔

چنانچہ حیدرآباد کی مشہور مسجد، مسجدِ باغ عامہ —— جس میں ایک زمانہ میں آخری نظام عثمان علی پاشا نمازِ جمعہ ادا کیا کرتے تھے —— میں ہر اتوار کو صبح کے سات آٹھ بجے سے ان کا ایک دو گھنٹے کا تفصیلی درس قرآن ہوتا تھا، یہ درس اتنا مقبول تھا کہ مسجد بھر جاتی تھی اور مسجد کے باہر بھی شامیانے لگانے پڑتے تھے، صرف ایک شخص کے لئے ہر ہفتہ اتنا بڑا اجتماع اور وہ بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کا نہ حیدرآباد میں دیکھنے کا موقع ہوا اور نہ کسی اور شہر میں، یہیں سے قاری صاحب نے دیہاتوں میں دعوتی کام کی تحریک چلائی۔

تیسری قابل ذکر بات 'اتحادِ اُمت' کے لئے ان کی فکر تھی، ان کا تعلق سوائے بریلوی جماعت کے ہر حلقہ کے علماء، تنظیموں اور جماعتوں سے تھا، وہ چاہتے تھے کہ ان سب کو جوڑ کر کام کیا جائے اور ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے ان کا استعمال کیا جائے، وہ مزاحاً یہ بھی کہتے تھے کہ مختلف جماعتوں کے درمیان نکاح کرا دینا چاہئے، وہ ان تمام تنظیموں اور جماعتوں کے بزرگوں کا یکساں احترام کرتے تھے، جو بدعت سے نفور رکھتی ہیں، اسی لئے وہ اپنے زیر اہتمام مسجد میں تبلیغی جماعت کا اجتماع بھی رکھتے تھے اور جماعتِ اسلامی کا بھی، اسی طرح دونوں جماعتوں کے لوگ اپنے اپنے طریقے کے مطابق اور ایک دوسرے سے ٹکراؤ کے بغیر اپنا نظام چلاتے تھے، وہ خود حنفی تھے، انھوں نے جامعۃ القرآن میں فقہ کا پورا نصاب حنفی مسلک کے مطابق رکھا، وہ خود بھی اسی مسلک کے مطابق نماز ادا کرتے تھے؛ لیکن ان کے تعلقات اہل

حدیث حضرات سے بھی تھے، یہ سب ان کے اس اندرونی جذبہ کا مظہر تھا کہ اُمت فقہی اختلاف کو نزاع وجدال کا سبب نہ بنائے۔

چوتھا خصوصی وصف ان کی سادگی تھی، ان کی ہر چیز سے سادگی نمایاں تھی، وہ جب ملک سے باہر کا سفر کرتے تب بھی وہی معمولی لباس اور پرانی چپل، موٹا سا بے رونق چشمہ ان کے زیب تن ہوا کرتا تھا، کھانا اتنا سادہ کہ جو لوگ عادی نہ ہوں وہ کھا نہ سکیں، لوگوں سے ملاقات میں بھی سہل الحصول، نہ کوئی حاجب نہ کوئی دربان اور نہ ہٹو بچو، ہر آدمی اور جس وقت چاہے ان سے ملاقات کرسکتا تھا، نیز ان کے لئے ملاقات کی سب سے آسان جگہ مسجد تھی؛ کیوں کہ ہمیشہ نماز باجماعت کا اہتمام کرتے تھے اور صف اول میں موجود ہوتے تھے۔

اس حقیر کا تعلق ان سے اس وقت سے ہوا جب وہ مدرسۃ النور کو پروان چڑھانے میں مشغول تھے، اور اکثر شرعی مسائل کے سلسلہ میں اس حقیر سے رُجوع کرتے تھے، پھر ایک عرصہ تک ان کی خواہش پر ہفتہ میں ایک دن عصر سے مغرب تک مسجد اُجالے شاہ میں لوگوں کے سوالات کے جواب دیتا تھا، اس میں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد قاری صاحب کی ترغیب پر شریک ہوتی تھی اور متنوع سوالات کئے جاتے تھے، بعض دفعہ رمضان المبارک میں بھی نمازِ تراویح کے بعد سوال و جواب کی طویل مجلسیں ہوتی تھیں، ان مجلسوں میں قاری صاحب بہ نفس نفیس شروع سے آخر تک شریک بھی ہوتے تھے اور عوام کی نمائندگی کرتے ہوئے سوالات بھی کرتے تھے۔

پھر قاری صاحب کی خواہش پر ان کے دفتر میں بخاری کا درس شروع ہوا، یہ ذمہ داری مجھ سے متعلق تھی، خود قاری صاحب پوری یکسوئی کے ساتھ اس میں بیٹھتے تھے اور اسلامیات پڑھانے والے اساتذہ کو بھی بیٹھنے کی تلقین کرتے تھے، غالباً اس طرح بخاری کے ایک دو جزء کا درس ہوا؛ مگر یہ سلسلہ جاری نہیں رہ سکا، جب انھوں نے جامعۃ القرآن کے خواب کو تعبیر دینا شروع کیا تو خاص طور پر اس حقیر کو اس کا تعلیمی نگراں مقرر کیا، ان کی خواہش پر میں نے اس کا

نصاب تعلیم تیار کیا اور حشو وزائد کو حذف کرتے ہوئے ایسا نصاب بنا کہ جس کے ساتھ عصری تعلیم بھی دی جا سکے، اس وقت بھی قاری صاحب کا تعلق مع القرآن سامنے آیا، ان کی خواہش تھی کہ اس نصاب میں شروع ہی سے تفسیر قرآنِ مجید کو شامل رکھا جائے، ظاہر ہے کہ جو بچے ابھی عربی زبان کی شد بد بھی نہ رکھتے ہوں، ان کے لئے تفسیر قرآن کو شامل نصاب کرنا دشوار تھا؛ لیکن ان کے جذبہ وشوق کو سامنے رکھتے ہوئے مدارس کے مروجہ نصاب سے ہٹ کر کسی قدر پہلے سے قرآن کے مضمون کو شامل رکھنے کی کوشش کی گئی، وہ اسلامی علوم کے لئے اساتذہ بھی اسی حقیر کے انتخاب سے مقرر کرتے تھے اور ان کی شرافتِ نفس کی بات ہے کہ اگر انھیں ان اساتذہ کو کوئی بات کہنی ہوتی تو مجھ سے کہلاتے اور فرماتے کہ مجھے علماء کو کچھ کہنے میں حجاب ہوتا ہے۔

پھر جب اس حقیر نے اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ ''المعہد العالی الاسلامی'' کی بنیاد رکھی تو بالکل ابتدائی مرحلہ میں جن لوگوں سے مشورہ کیا، ان میں ایک قاری صاحب بھی تھے، انھوں نے بھرپور تائید فرمائی اور انھیں کے واسطہ سے جامعۃ القرآن کے بالکل سامنے کا ایک مکان کرایہ پر لیا گیا، اتفاق سے اس مکان میں پانی کا نظم نہیں تھا، قاری صاحب نے جامعۃ القرآن سے پانی کا انتظام کیا، پھر آئندہ سال جب وہ عمارت ناکافی ہوگئی تو اپنی عمارت کا کچھ حصہ عارضی استعمال کے لئے عنایت کیا اور لائٹ اور پانی وغیرہ کے اخراجات بھی نہیں لئے، معہد کے طلبہ جامعۃ القرآن کے ہال ہی میں نماز ادا کیا کرتے تھے، کوئی اہم پروگرام رکھنا ہوتا تو وہیں رکھا جاتا تھا، معہد کے نمائندہ کو فراہمی مالیہ کے لئے خود اپنے ساتھ کویت لے گئے اور بعض مخلصین سے ان کا تعارف کرایا، اس طرح انھوں نے معہد کا ایسا تعاون کیا کہ ایک ادارہ کی طرف سے دوسرے ادارہ کے تعاون کی شاید ہی ایسی کوئی مثال مل سکے۔

زندگی کے آخری ایام میں انھوں نے اپنی آنکھوں کا آپریشن کرایا اور شاید ابھی پوری طرح صحت بحال بھی نہیں ہوئی تھی کہ اپنی دینی، دعوتی مہمات کی ضروریات اور خود اپنے علاج

کے پیش نظر برطانیہ وامریکہ کا سفر کیا؛ چنانچہ برطانیہ میں قیام کرتے ہوئے امریکہ پہنچے، کچھ تو پہلے سے موجود علالت اور شاید کچھ ان واقعات کی وجہ سے جو انھیں اخیر زمانہ میں اپنے بعض دوستوں کی طرف سے اس ادارہ میں پیش آئے، جسے انھوں نے خود قائم فرمایا تھا، آپ پر دماغی حملہ ہوا اور ۳۰/ جون کو ایسے بے ہوش ہوئے کہ پھر ہوش نے کبھی وفا نہ کیا، اسی حالت میں ۲۳/ جولائی کو حیدرآباد لائے گئے، جس زبان پر لوگ سر دھنتے تھے، وہ حرکت کرنے سے بھی قاصر تھی اور جن قدموں کو دین کی خدمت کے لئے کوئی قرار نہ تھا، وہ ایسے ساکت و جامد تھے کہ گویا پتھر کے بنے ہوں، دوا اور دُعاء کی ہزار تدبیریں ہوئیں؛ لیکن آخر تقدیر غالب آئی اور ۳/ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو رات کے ساڑھے دس بجے اللہ کو پیارے ہوگئے، نماز جنازہ عیدگاہ اُجالے شاہ میں ادا کی گئی، جس میں غیر معمولی ہجوم تھا اور اس طرح قرآن کا یہ عاشق اس مالک کی آغوش میں پہنچ گیا، جس نے قرآنِ مجید کو نازل کیا ہے، ۲۸/ جون ۱۹۴۳ء ان کی تاریخ پیدائش ہے، اس طرح قاری صاحب نے صرف ۵۸ سال کی عمر پائی؛ لیکن انھوں نے تعلیمی، دعوتی اور اصلاحی میدان میں ایسی خدمت انجام دی کہ اگر سو سال کی عمر میں بھی وہ اس خدمت کو انجام دیتے تو اسے کم نہیں سمجھا جاتا —— بار الٰہا! توحید کے علمبردار اور قرآن کے عاشق زار اپنے اس بندہ کی نیکیوں کو قبول فرمالیجئے اور انھیں بہتر سے بہتر اجر عطا فرمایئے۔ آمین

❁ ❁ ❁

چند آنسو محسن کی قبر پر
(مولانا سید اکبرالدین محسن قاسمیؒ)

١٣٩٨ھ یا ١٣٩٩ھ کا کوئی دن ہوگا، میں اسی سال حیدرآباد میں دارالعلوم حیدرآباد کی دعوت پر وارد ہوا تھا اور دارالعلوم ابھی مگر کی باؤلی کی ایک تنگ گلی اور خستہ حال چھوٹے سے کرایہ کے مکان میں واقع تھا، سو کے آس پاس طلبہ کی تعداد تھی اور چند مدرسین تھے، کنز الدقائق اور شرح تہذیب تک شعبۂ عربی کی تعلیم تھی، کہ اجلی دوپہر میں سائیکل پر ایک صاحب وارد ہوئے، سانولا رنگ، میانہ قامت، متوسط جسامت، کشادہ پیشانی، لمبا کرتا، کھلتا ہوا پائجامہ، دو پلی ٹوپی، سر پر رومال جو گردن میں لپٹا ہوا، آنکھوں پر سادہ سی عینک، پاؤں میں پرانی سی چپل اور معمولی سا ہینڈ بیگ، لباس و پوشاک اور وضع قطع سادگی کا مرقع، گفتگو میں بے تکلفی، ان کے آتے ہی اساتذہ میں ہلچل سی مچ گئی اور ہر طرف سے ''اکبر بھائی، اکبر بھائی'' کی صدائے محبت آنے لگی، کسی نے مشورہ کیا، کسی نے ہنسی مذاق، کسی نے کوئی بات دریافت کی، ہر ایک کا جواب بے تکلفی کے ساتھ متبسم ہوکر، اس طرح پہلی بار محبّ گرامی حضرت مولانا سید اکبر الدین قاسمیؒ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا، میں شہر میں اجنبی تھا لوگوں نے تعارف کرایا، محبت سے ملے اور پہلی ہی ملاقات میں اجنبیت کا احساس جاتا رہا۔

اس وقت مولانا ویمل پلی میں مدرسہ ریاض الاسلام چلاتے تھے اور مدرسہ کے تعاون کے سلسلہ میں زیادہ تر حیدرآباد میں قیام رہتا تھا، اسی نسبت سے سال میں دو تین بار مسجد حیدر گوڑہ بھی تشریف لاتے تھے، یہاں معمول یہ ہے کہ مدارس کے نمائندوں کو خود اعلان کا موقع نہیں دیا جاتا؛ بلکہ خطیبِ جمعہ اعلان کرتا ہے؛ لیکن جب مولانا تشریف لاتے تو میں ان سے

ہی اعلان کرنے کی خواہش کرتا، وہ چند منٹوں میں ہی دیہات کے مسلمانوں کی نسبت سے بڑا موثر اعلان کرتے اور لوگ خاصا تعاون کرتے، آخر ریاض الاسلام نے ویمل پلی میں اپنی بہار دیکھانے کے بعد حیدرآباد ہجرت کی اور مولانا کا مستقل قیام حیدرآباد میں ہوگیا، میں مولانا سے مزاحاً کہتا کہ دیہات کی نسبت سے جونکتہ آپ اعلان میں پیدا کرتے تھے، اب اس کا کیا ہوگا؛ مولانا ہنستے اور کہتے کہ اس کا متبادل دریافت کرلیا جائے گا۔

پھر جوں جوں وقت گذرتا گیا، مولانا سے ذہنی قربت اور فکری ہم آہنگی بھی بڑھتی گئی، درمیان میں جماعتی وابستگی کی نسبت سے اختلاف کا ایک مرحلہ ایسا بھی آیا، جس میں مَیں نے میٹنگ میں ایک ایسی رائے رکھ دی، جو بعد میں میرے لئے اپنے آپ شرمساری کا باعث تھی اور مولانا موصوف کے خلاف جاتی تھی؛ لیکن مولانا کی وسیع القلبی اور کشادہ چشمی کہ انھوں نے میرے ساتھ محبت وشفقت کے رویہ میں کوئی فرق نہیں آنے دیا، معہد کے قیام کے وقت میں ایک تذبذب کی کیفیت سے دوچار تھا، جس ادارہ سے علاحدہ ہونا چاہتا تھا، اس سے ایسی وابستگی تھی کہ فراق کے تصور سے بھی کلیجہ منھ کو آتا تھا، حیدرآباد اور ملک کی مختلف بڑی درسگاہوں اور اداروں کی طرف سے پیشکش تھی اور دل میں یہ آرزو مچلتی تھی کہ کوئی مستقل ادارہ افراد کی تیاری اور علم وتحقیق کے کام کے لئے ہونا چاہئے، اس وقت حرم شریف میں ہدایت خیر کے لئے دُعاء بھی کی گئی، بار بار استخارہ بھی کیا گیا اور کچھ قریب ترین مخلصین سے مشورہ بھی، ان میں نمایاں نام مولانا مرحوم کا تھا، انھوں نے اس ادارہ کی خوب حوصلہ افزائی کی، اس کی ضرورت پر توجہ دلائی اور میرے عزم کو مہمیز کیا۔

جب معہد کا افتتاحی اجلاس ہوا تو پوری دلچسپی کے ساتھ اس میں شریک ہوئے اور پھر تو معہد میں جو بھی چھوٹی بڑی تقریب ہوتی، مولانا اس کے جزو لاینفک ہوتے، نصابِ تعلیم کی ترتیب کے سلسلہ میں میں نے ایک میٹنگ رکھی، اس میں شریک ہوئے اور بہت تفصیل کے ساتھ مشورے دیئے، معہد کے سالانہ جلسوں میں میں نے یہ اُصول رکھا کہ ہر مقرر کا موضوع

اور وقت مقرر ہو اور چاہے حاضرین کی تعداد جو بھی ہو ٹھیک وقت پر شروع ہو جائے، مولانا اس کو بہت پسند کرتے، ان کو ایک سال دعوت، ایک سال قرآن مجید میں اختصاص اور ایک سال حدیث میں اختصاص کی اہمیت کا موضوع دیا گیا، انھوں نے ان میں سے ہر ایک موضوع پر تیاری کے ساتھ نہایت جچی تلی گفتگو فرمائی اور مقررہ وقت کا لحاظ رکھا؛ بلکہ بعض جلسوں میں حاضرین نے ان کے خطاب کو جلسہ کا حاصل قرار دیا۔

مختلف اداروں میں ان کے اشتراک سے کام کرنے کا موقع ملا، مجلس علمیہ آندھرا پردیش، مجلس تحفظ ختم نبوت اور دینی مدارس بورڈ میں مستقل ساتھ رہا، ہر جگہ ان کی شفقت ومحبت اور لطف وعنایت شریک حال رہی، ادھر سالہا سال سے اضلاع کے مختلف اہم جلسوں میں وہ میز بانوں کو اس حقیر کو مدعو کرنے کا مشورہ دیتے اور بعض دفعہ نہ چاہتے ہوئے بھی میں مولانا کے احترام میں آمادہ ہو جاتا، ایسے مواقع پر باہم تبادلہ خیال کا خوب موقع ملتا؛ حالاں کہ ان کا خطاب مجھ سے اور دوسرے مقررین سے زیادہ بہتر ہوتا؛ لیکن وہ اپنے خطاب میں بھی اور پھر اس کے بعد باہمی گفتگو میں بھی بڑی تحسین اور حوصلہ افزائی کرتے اور بار بار اس کا حوالہ دیتے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مولانا سے ذہنی قربت اور قلبی محبت دو چند ہوتی گئی؛ اس لئے ان کی بیماری کی اطلاع اور پھر وفات سے ایسا صدمہ ہوا کہ چند قریب ترین عزیزوں کے سوا شاید کسی اور پر ہوا ہو اور کئی راتیں بے سکون کروٹوں اور بے خواب آنکھوں کے ساتھ گزر گئیں۔

مولانا نے ایک دین دار خاندان میں آنکھ کھولی، ان کے والد ماجد بھی تعلیم سے متعلق تھے اور نکاح ایک دردمند عالم مولانا ضمیر الدین صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے ہوا، زیادہ تر لڑکے اور لڑکیاں مولانا کی ان ہی زوجۂ محترمہ سے ہیں، تعلیم کے آخری مراحل میں دارالعلوم دیوبند سے کسبِ فیض کیا، زمانہ طالب علمی میں تعلیم میں ممتاز اور نمایاں تھے اور دارالعلوم میں

ان کے مذاکرہ کا شہرہ تھا، بڑی تعداد میں طلبہ ان سے استفادہ کرتے تھے، شعروسخن اورتحریر وانشاء کا ذوق بھی اسی وقت سے تھا، میرے ایک قرابت دار مولانا محمد دستگیر قاسمی (صدر مدرس مدرسہ عثمانیہ، جمشید پور) ان کے ساتھی یا کچھ آگے پیچھے تھے، وہ ہمیشہ مجھ سے مولانا کی خیریت دریافت کرتے تھےاوران کی ذہانت واستعداد کا ذکر کرتے تھے۔

فراغت کے بعد تدریسی کا مشغلہ اختیار کیا، دارالعلوم رحمانیہ سے ابتداء کی، پھر دارالعلوم سبیل السلام میں پڑھایا، آخری سالوں میں کچھ دنوں دارالعلوم حیدرآباد میں بھی پڑھایا، طلبہ پران کی تدریس کا بڑا اچھا اثر تھا، کئی شاگردوں کا میں نے خود تاثر سنا، مدرسہ کی تاسیس وانتظام میں ان کا سفر غالبًا کاغذنگر سے شروع ہوا، جہاں انھوں نے اورمولانا میر قطب الدین علی چشتی نے مل کر دینی درسگاہ کی بنیاد رکھی، پھر وہاں سے آگے بڑھے اور ویمل پلی میں خیمہ زن ہوئے اورایک نیا گلشن علم مدرسہ ریاض الاسلام کے نام سے سجایا، پھر ویمل پلی کو شاخ بناتے ہوئے حیدرآباد پہنچے اور بڑی محنت وکاوش کے ذریعہ مدرسہ ریاض الاسلام اُپل کی تعمیر کرائی اوراسے ایک اہم دینی درسگاہ کا مقام حاصل ہوا، اس کے بعد لڑکیوں کی دینی تعلیم کی طرف توجہ کی اور ریاض البنات کی بنیاد رکھی، اسی دوران ایک فاضل خاتون جناب ذکیہ کوثر سے عقد کیا، یہ نکاح اس ادارہ کے لئے ’قران السعدین‘ بن گیا اور بہت کم عرصہ میں یہ لڑکیوں کی ممتاز دینی جامعہ بن گئی، جس کی متعدد شاخیں اس وقت سرگرم عمل ہیں، جن کو ان کی عالم صاحبزادیوں نے سنبھال رکھا ہے، ریاض الاسلام، ریاض البنات اوران کی شاخیں تو براہ راست ان کے انتظام میں تھیں؛ لیکن تلنگانہ کے علاقہ میں کتنے ہی مدراس ہیں کہ مولانا ان کے سرپرست، رکن یا مشیر خاص تھے۔

دینی مدارس کی نسبت سے انھوں نے مجلس علمیہ آندھراپردیش کے تحت ’رابطہ مدارس اسلامیہ‘ کی تشکیل میں بھی بنیادی کردارادا کیا، اس کے تحت وہ اساتذہ کے تربیتی کیمپ بھی رکھا کرتے تھے، جن سے نوجوان مدرسین کو بڑا افائدہ پہنچتا تھا، یہ رابطہ حلقہ دیوبند کے مدارس کا ہے،

پھر جب حکومت کی طرف سے دینی مدارس پر نظرِ عنایت ہونے لگی اور مدارس کے لئے ایک ایسے مشترکہ پلیٹ فارم کی ضرورت محسوس کی گئی، جس میں مختلف مسلک ومشرب کے ادارے شامل ہوں اور ’دینی مدارس بورڈ‘ کی تشکیل عمل میں آئی، تو وہ اس کے نائب صدر منتخب ہوئے، وہ ہمیشہ اس کی میٹنگوں اور تربیتی اجتماعات میں شریک ہوتے رہے اور بہت ہی مفید مشوروں سے نوازتے رہے، غرض کہ دینی مدارس کی خدمت، ان کے استحکام کی فکر، ان کا تعاون اور ان کے معیار کو بلند کرنے کی سوچ، ان کی کاوشوں اور محنتوں کا سب سے اہم عنصر تھا، وہ نصابِ تعلیم کے معاملہ میں بھی وسیع النظر واقع ہوئے تھے اور دینی مدارس کے اصل مزاج و مذاق اور شناخت کو باقی رکھتے ہوئے بقدرِ ضرورت نئے علوم کو شامل کرنے اور طریقۂ تعلیم میں نئے مسائل سے استفادہ کرنے کے قائل تھے، وہ اساتذہ کو طلبہ کے ساتھ شفقت ومحبت کی خاص طور پر تلقین کرتے تھے اور اس سلسلہ میں جو افراط وتفریط پائی جاتی ہے، ان پر بڑی حکمت کے ساتھ ٹوکتے تھے۔

علم سے اختلاف رائے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے، اسی لئے علماء اور اصحابِ نظر کو ایک ساتھ لے کر چلنا آسان نہیں ہوتا، وہ اس مشکل کو بڑی خوبی سے نباہتے تھے، آندھرا پردیش میں ماضی قریب کے بعض بزرگوں نے مجلس علمیہ کے نام سے علماء دیوبند کا ایک وفاق قائم فرمایا جو یقیناً ایک مثالی وفاق ہے، مولانا مرحوم غالباً اس مجلس میں کسی قدر بعد کو شریک ہوئے؛ لیکن جب سے شریک ہوئے، وہ اس وفاق کا دل ودماغ بن کر رہے، منصب کے اعتبار سے وہ نائب ناظم تھے؛ لیکن حقیقت میں وہ سب کچھ تھے، وہی اس کے لئے مالیہ کی فکر کرتے تھے، اجتماعات اور جلسے منعقد کرتے تھے، مجلس کے تحت نئے نئے کاموں کی منصوبہ بندی فرماتے تھے، جو تجویز منظور ہوتی، اس کو روبہ عمل لاتے تھے، اس کا حساب وکتاب خود کرتے یا اس کی نگرانی کرتے، اس کے ترجمان جریدہ کی ترتیب واشاعت کی فکر کرتے اور ضرورت پڑ جائے تو مجلس کے دفتر کی صفائی ستھرائی سے بھی ان کو کوئی عار نہیں تھی، پھر مجلس کی میٹنگوں کو سنبھالنا اور انھیں

کنٹرول کرنا بھی ان ہی کا فن تھا، اختلاف رائے کا تلاطم اُٹھتا، تنقید کی آندھی چلتی اور وہ گاہے اپنی حاضر جوابی اور گاہے صبر وسکون کے ذریعہ اس طوفان کو پار کر جاتے، بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ مجلس علمیہ نے جو کچھ خدمات انجام دی ہیں، عملی اعتبار سے ان میں غالب ترین حصہ مولانا مرحوم کا ہے۔

آندھرا پردیش کے دیہاتوں میں جب قادیانیت کا فتنہ اُٹھا، تو جن لوگوں نے اس پر اولین توجہ دی، ان میں مجلس علمیہ اور اس کے ارکان پیش پیش رہے اور اس نسبت سے خاص طور پر مولانا مرحوم بہت کوشاں رہے، انھوں نے مجلس کی طرف سے مولانا محمد اسماعیل کٹکی کو بلایا، ان کے پروگرام رکھے، حسبِ ضرورت مناظرے کروائے اور مجلس تحفظ ختم نبوت کا قیام عمل میں آیا، تو وہ اس کے نائب صدر منتخب کئے گئے اور اس اہم کام پر پوری پوی توجہ کی؛ چنانچہ مجلس کی میٹنگوں میں اکثر فیصلے ان ہی کی رائے پر ہوا کرتے تھے، ملکی سطح پر ان کی وابستگی جمعیۃ علماء ہند سے تھی، وہ جمعیۃ کی مرکزی مجلس عاملہ کے رکن تھے اور آندھرا پردیش میں جمعیۃ کے نائب صدر، ریاستی سطح پر جمعیۃ کا جو بھی کام ہوتا، اس کی منصوبہ بندی اور پھر اس منصوبہ پر عمل آوری مولانا کی رہین منت ہوتی، وہ اپنے اخلاص اور دردمندی کی وجہ سے کسی ایک تنظیم کے اسیر نہیں تھے؛ بلکہ جہاں بھی خیر کا کام ہوتا، بے تکلف تعاون فرماتے؛ چنانچہ آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے کئی اجلاس حیدرآباد میں منعقد ہوئے اور انھوں نے ان مواقع پر پوری سرگرمی کے ساتھ شرکت فرمائی، اس طرح شہر میں جو بھی اہم کام ہوتا، وہ اس میں اس طرح شامل ہوتے کہ گویا یہ ان ہی کا کام ہے، یہی وجہ ہے کہ مختلف مسلک ومشرب، تنظیموں اور جماعتوں کے لوگ انھیں محبت کی نظر سے دیکھتے اور انھیں اپنے پروگراموں میں مدعو کرتے۔

یہ بات محتاجِ بیان نہیں کہ وہ اس فکر ونظر کے حامل اور اس کے نقیب وترجمان تھے، جو بزرگانِ دیوبند کی رہی ہے اور جس کی سب سے بڑی خصوصیت توحید، اتباع سنت اور اعتدال

ومیانہ روی ہے، اس کے ساتھ ساتھ انھیں دعوت و اصلاح کے کام سے خاص مناسبت تھی ؛ چنانچہ قریہ قریہ، گاؤں گاؤں، ان کے نقوش قدم دیکھے جاسکتے ہیں، انھیں تحریک دعوت وتبلیغ سے بھی خاص تعلق تھا، اس سلسلہ میں انھوں نے متعدد بار اسفار بھی کئے اور خاص کر علماء اور دینی مدارس کے سامنے اس کی اہمیت کو واضح کرنے کی کوشش کی، دعوت کے سلسلہ میں ان کے ذہن کا اُفق بہت وسیع تھا اور وہ برادرانِ وطن میں بھی دعوت کو بہت ضروری اور موجودہ دشواریوں کا حل تصور کرتے تھے، نجی مجلسوں میں بھی اور عام اجتماعات میں بھی اس پر اظہار خیال فرماتے تھے، اسی نسبت سے وہ بعض ایسی شخصیات سے بھی اٹوٹ محبت اور گہری ذہنی وابستگی رکھتے تھے، جو دعوت دین کی اہمیت اور ضرورت پر لکھتے اور بولتے رہتے ہیں، گوان کے بہت سے افکار سوادِ اعظم سے مختلف ہیں، کبھی کبھی مجھ سے اس پر نوک جھونک بھی ہوجاتی تھی ؛ لیکن اس معاملہ میں ان کے اندر تشدد کی حد تک استقامت تھی، جو بہر حال ان کے خلوص نیت کی دلیل ہے۔

وہ خطیب بھی بہت اچھے تھے، نہ جذباتیت نہ لفاظی ؛ بلکہ فکر انگیز اور مدلل گفتگو کرتے، مثالوں سے سمجھاتے اور کبھی کبھی لطائف وظرائف سے مجلس کو قہقہہ زار کردیتے ؛ لیکن ''لطیفہ کو کثیفہ'' نہ بننے دیتے، اناؤنسری تو گویا ان کا خاص حق تھا، ہر مقرر سے پہلے اس کا ایسا تعارف کراتے کہ سامعین خواہی نہ خواہی اس کے لئے گوش برآواز ہوجائیں اور پھر گذشتہ مقرر کی تقریر کا نچوڑ بھی چند جملوں میں پیش کردیتے ؛ اس لئے ان کے بعض بے تکلف احباب ان کے اعلان کو ''مستقل خطاب'' کا نام دیتے تھے، اگر کسی پروگرام میں مقرر کے لئے موضوع متعین ہوتو اعلان میں بڑی لطافت کے ساتھ اس پر اظہار خیال کرتے اور تقریروں میں مناسبت کو بیان کرتے۔

انھیں تحریر کا بھی بڑا عمدہ ذوق تھا، افسوس کہ انتظامی مشاغل نے انھیں اس جانب متوجہ

ہونے کا موقع نہیں دیا؛ اس لئے کم ہی لکھ پاتے ؛لیکن جو لکھتے خوب لکھتے ،اس سلسلہ میں مجلس علمیہ میں ان کی جانب سے پیش کی جانے والی رپورٹیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ،بعض لوگ تنقید وتبصرہ کے لئے گویا آستیں چڑھا کراور کمرکس کر بیٹھے ہوتے ؛لیکن ان کی رپورٹ شعلہ پر شبنم بن جاتی ،تحریر بہت ہی مربوط ،مرتب اور زبان و بیان کے اعتبار سے دل آویز و باوقار ہوتی ، وہ برسہابرس پندرہ روزہ ''قرطاس وقلم'' کے نائب مدیر رہے اور زیادہ تر انھوں نے ہی عملی طور پر اس کی ترتیب و اشاعت کی تمام ذمہ داریوں کو نبھایا ، پھر جب یہ رسالہ بند ہوگیا تو ان ہی کی کوششوں سے ''ضیائے علم'' کا اجراء ہوااور دیدہ زیب ٹائٹل کے ساتھ اسے منظر عام پر لایا ،وہی اس کے مدیر تھے اور پہلے شمارہ کا اداریہ بھی ان ہی کے قلم سے تھا ،لڑکیوں کے لئے 'جامعہ ریاض البنات' سے انھوں نے ''ردائے حرم'' نکالا ،خود ہی اسے ترتیب دیتے ،خود لکھتے اور دوسروں سے لکھاتے ،ابھی یہ رسائل غنچۂ نوشگفتہ کا درجہ رکھتے تھے کہ باغباں باغِ جنت کو روانہ ہوگیا۔

اخبارات کے لئے خبریں تیار کرنے ، دعوت ناموں کے مضامین ترتیب دینے اور مدارس کا تعارف لکھنے میں انھیں خاص ملکہ حاصل تھا اور اضلاع کے بہت سے مدارس ان کی صلاحیت سے مستفید ہوتے تھے ،سب سے مشکل کام تجویز کا لکھنا ہوتا ہے ،تجاویز کے بارے میں مشورہ دینا آسان ہوتا ہے ؛لیکن جچی تلی زبان میں اسے مرتب کرنا اسی قدر دشوار ہوتا ہے ، وہ اس کا بڑا سلیقہ رکھتے تھے ،مجلس علمیہ میں عام طور پر تجاویز کی ترتیب کا کام ان ہی کے ذمہ ہوتا تھا۔

انھیں شعر وسخن کا بڑا ذوق تھا ،اچھے اشعار خوب یاد تھے اور انھیں برمحل پڑھتے بھی تھے ، تقریروں میں بھی اور تحریروں میں بھی اس سے کام لیتے تھے ؛لیکن مناسب حد تک ،اس میں بھی مبالغہ سے کام نہیں لیتے اور نہ اسے پسند کرتے ،خود اشعار کہتے تھے اور ''محسن'' تخلص کرتے تھے ، اب تک میں نے ان کے جو اشعار دیکھے ہیں ، وہ نعتیہ اور اصلاحی ہیں اور خوب ہیں ، چھوٹی بحر ، سہل الفاظ ،نغمگی سے بھرپور ، مناسبتوں اور ادبی صنعتوں کی رعایت ، واقعہ ہے کہ اگر وہ اس

میدان میں طبع آزمائی کرتے تو ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے اُبھرتے ؛ لیکن جس شخص کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی راہ میں آبلہ پائی کے لئے منتخب کیا ہو، اسے مشق سخن کی فرصت کہاں؟

ان کے اخلاق کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو وہ ہوگا ''تواضع'' —— وہ تواضع اور انکساری کا پیکر تھے، بڑوں کی ناگوار خاطر باتیں بھی کمال احترام سے سنتے، دوستوں کے طنز وتعریض کے نشتر کو ایسا گلے سے لگاتے اور صبر سے سہتے کہ گویا کانٹے نہ ہوں، پھول ہوں اور چھوٹوں کی آتشیں تنقیدوں کو بھی پیار کی شبنم اور صبر کی پھوار سے بجھا دیتے اور اس خوبی سے سامنا کرتے کہ اکثر و بیشتر اپنی رائے پر جمے رہتے، عام طور پر جب انسان شہرت ومقبولیت یا دولت وثروت کی دنیا میں آگے بڑھتا ہے اور اوپر کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے تو زمین پر بچھے ہوئے زینے جس کے کاندھوں پر چڑھ کر اس نے عروج وارتقاء کا سفر طے کیا ہے، بھول جاتا ہے اور ان کی طرف پلٹ کر بھی دیکھنے کا روادار نہیں ہوتا، مولانا مرحوم اس معاملہ میں اُسوہ کا درجہ رکھتے تھے، انھوں نے کبھی اپنے ماضی کو فراموش نہیں کیا، ان کا رہن سہن، اُٹھنا بیٹھنا، ملنا جلنا، سلوک و برتاؤ، موٹر نشیں ہونے کے باوجود بھی اس دور کے عین مطابق تھا، جب سائیکل اور بس ہی ان کا ذریعہ سفر ہوتا تھا، وہی سادگی، وہی بچھاؤ، وہی انکساری اور فروتنی، ان کا یہ وصف بھلائے نہیں بھولا جاتا۔

ملی مسائل میں ان کی دردمندی سے میں بہت متاثر تھا، ملت کا جو بھی مسئلہ ہو، وہ گروہی، تنظیمی اور اداراتی سطح سے اوپر اُٹھ کر پوری گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیتے اور جس وقت جس پلیٹ فارم پر ہوتے، اس وقت اسی کی پوری پوری نمائندگی کرتے، وہ اُمت کے مسائل کے بارے میں ذہنی تحفظات سے پرے اُٹھ کر مشورہ دیتے، ادارے، تنظیمیں اور جماعتیں دین کی سربلندی اور اس کے تحفظ کے لئے ہیں ؛ لیکن افسوس کہ اکثر اوقات اس وابستگی کا رنگ اتنا گہرا ہو جاتا ہے کہ وہ اُمت کی فکر اور درد پر بھی غالب آجاتا ہے اور گروہی مفادات کو مسلمانوں کے وسیع تر مفاد پر فوقیت حاصل ہو جاتی ہے، کم لوگ ہیں جو اس گروہی تنگ نائیوں سے اُوپر اُٹھ

پاتے ہیں، ایسے ہی گنے چنے لوگوں میں مولانا مرحوم بھی تھے۔

انھوں نے رمضان المبارک میں عمرہ کیا اور خدا کی چوکھٹ پر اپنی جبین نیاز بچھا کر نہ جانے کیا کیا مانگا؟ اس سے خدا اور اس کا بندہ ہی واقف ہے، پھر عید بعد مدرسہ بلکہ مدارس کے ہنگامی انتظام و انصرام اور داخلہ کی کارروائی میں مصروف ہوگئے، ابھی اس سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ فرزند ارجمند کے عقد کی ذمہ داری پوری کی، پہلے دن دختر نیک اختر کا عقد تھا، دوسرے دن صاحبزادے کا، مولانا نے دعوت نامہ بھی عنایت فرمایا، بالمشافہ بھی کہا اور فون پر بھی، پہلے دن تو حاضری نہ ہوسکی، دوسرے دن میں کسی قدر تاخیر سے پہنچا، عقد ہو چکا تھا اور تہنیت و تبریک کا سلسلہ چل رہا تھا، ملاقات کی، حسبِ معمول بڑی محبت سے ملے اور فرمایا کہ پہلے آئے ہوتے تو بیان کی زحمت دی جاتی، میں واپس ہونا چاہتا تھا؛ لیکن اصرار کر کے شادی خانہ تک لے گئے، اس رات کسی قدر ٹھنڈک بھی تھی اور اتفاق سے کان میں لپیٹنے کے لئے رومال ساتھ نہیں رکھ پایا تھا، مولانا کا پاسِ احباب دیکھئے کہ میرے مزاج اور ٹھنڈک برداشت نہ کر پانے کو دیکھتے ہوئے ایک صاحب کا رومال لے کر عنایت فرمایا اور یہ بھی کہا کہ میرے لئے رومال لباس کے لوازم میں داخل ہوگیا ہے اور میری پہچان بن گیا ہے، ورنہ میں یہی رومال پیش کرتا، پھر کہنے لگے میں بڑی حد تک اپنی ذمہ داری سے فارغ ہوگیا ہوں، اب جو لڑکی ہے وہ بہت چھوٹی ہے، اس طرح محبت کی سوغات لے کر میں وہاں سے واپس ہوا، کسے خبر تھی کہ یہ آخری ملاقات اور آخری گفتگو ہوگی!

دوسرے یا تیسرے دن عزیز گرامی مولانا محمد ارشد قاسمی صاحب (سکریٹری مجلس تحفظ ختم نبوت آندھرا پردیش) کا فون آیا اور گاڑی کے حادثہ اور نازک حالات کی اطلاع ملی، اس روز پوری رات نیند نہیں آئی اور پہلی بار خود مجھے اس محبت اور تعلق کا احساس ہوا، جو مولانا سے تھا، مولانا کے بعض عزیزوں سے صبح و شام احوال معلوم ہوتے رہے، کبھی آس بندھتی، کبھی نا اُمیدی اپنا چہرہ دکھاتی، خبروں کے اس زیر و بم میں مولانا مرحوم کا اورنگ آباد سے سفر شروع

ہوا، اِدھر مسافر زندگی حیدرآباد کی طرف لے جایا جارہا تھا اور اُدھر ملک الموت زندگی کے دروازہ پر آخری دستک دینے کو تیار تھا، گاڑی شہر میں داخل ہوئی اور زندگی نے قفس عنصری سے رخصت سفر باندھا، دوسرے دن عیدگاہ اُجالے شاہ میں نماز جنازہ اس شان سے ہوئی کہ کم ایسا اژدحام دیکھنے میں آیا، چھوٹے بڑے، جوان، بوڑھے، مختلف مسلک ومشرب اور مختلف تنظیموں سے تعلق رکھنے والے، شہر کے علاوہ ایک بڑی تعداد اضلاع سے آنے والے علماء اور اہل دین کی کہ :

عاشق کا جنازہ ہے، ذرا دُھوم سے نکلے

یہیں غالباً سال ڈیڑھ سال پہلے مولانا اپنی والدۂ مرحومہ کا جنازہ لے کر آئے تھے اور تدفین کے بعد ایسے درد کے ساتھ مرحوم والدہ کے لئے دُعاء کی تھی کہ ہر شخص کو ماں کی ممتا اور پیار کی یاد آجائے، آج مولانا خود ایک فرزند سعید کی طرح ماں کے قدموں میں تھے، اس موقع پر ایسا صدمہ ہوا جو زندگی میں چند قریب ترین عزیزوں کی موت پر ہوا ہوگا، اللہ تعالیٰ مولانا کی بال بال مغفرت فرمائے اور زندگی کے اس تھکے ہوئے مسافر کو کروٹ کروٹ راحت وسکون سے سرفراز فرمائے۔

اللھم اغفرلنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ۔

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ

قلندرانہ ادائیں ، سکندرانہ جلال

۵-۸/اکتوبر ۱۹۹۸ء کی بات ہے کہ پڑوسی ملک پاکستان کی راجدھانی اسلام آباد میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے تحت امام ابوحنیفہؒ کی شخصیت اور فکر پر ایک انٹرنیشنل سیمینار منعقد ہوا تھا، اس میں زیادہ تر نمائندے تو عالم اسلام سے تھے؛ لیکن ہندوستان سے بھی چار رکنی وفد شریک تھا، جس میں اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے مولانا عتیق احمد بستوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ، ڈاکٹر فہیم اختر ندوی اور اس حقیر کے علاوہ مولانا سید سلمان حسینی ندوی شریک تھے، ہم لوگ کانفرنس سے ایک یا دو روز پہلے پہنچ گئے تھے، پروگرام کے ذمہ داروں میں تین شخصیتیں نمایاں نظر آئیں، ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری جو اس وقت 'مجلس تحقیقات اسلامی' کے ڈائریکٹر تھے، ڈاکٹر محمود احمد غازی اور ڈاکٹر احمد غزالی، آخر الذکر دونوں سگے بھائی ہیں، ڈاکٹر غازی اس وقت یونیورسٹی میں کسی اہم عہدے پر تھے اور کہا جاسکتا ہے کہ علمی اعتبار سے اس یونیورسٹی میں سب سے بھاری بھرکم شخصیت ان کی ہی تھی، وہ کانفرنس سے پہلے ایک دن شب میں ہم لوگوں سے ملاقات کے لئے آئے اور ایسے تواضع کے ساتھ پیش آئے کہ گویا وہ ایک عام شخصیت ہوں؛ لیکن اگلے دن صبح کو اخبار میں خبر آئی کہ وہ شریعہ اپیلیٹ بنچ، سپریم کورٹ آف پاکستان کے جج منتخب ہوئے ہیں، ڈاکٹر صاحب کے تواضع کا یہ حال کہ جس صبح ان کو حلف دلایا گیا، اسی دن کی شب میں ہم لوگوں سے دیر تک گفتگو کرتے رہے؛ لیکن اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

اس سفر میں عرب وعجم اور خاص کر پاکستان کی مختلف علمی شخصیتوں سے ملاقات کا موقع ملا؛ لیکن ہم لوگوں کے قلب پر جن کی صلاحیت اور صالحیت کا گہرا اثر پڑا، وہ ڈاکٹر محمود احمد غازی

ہیں، اُردو، عربی، انگریزی اور فرنچ سے بھی واقف اور اُردو کے علاوہ انگریزی اور عربی زبان میں بھی برجستہ اور شستہ گفتگو اور خطاب پر قادر، اس کے بعد دوسری بار اسلام آباد یونیورسٹی کی جانب سے منعقد ہونے والے ایک اور سیمینار میں —— جس کا مرکزی موضوع تھا ''اجتہاد'' —— میں ہندوستان سے مولانا جلال الدین عمری، پروفیسر سعود عالم قاسمی اور ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، نیز اس حقیر نے شرکت کی، اس موقع سے ڈاکٹر غازی نے ایک نشست کی صدارت کی اور بڑے تواضع اور محبت سے ہندوستان کے علماء کا استقبال کیا اور منھ بھر بھر کے حوصلہ افزائی کے کلمات کہتے رہے؛ بلکہ اس سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت مولانا عمری کے اور آخری اجلاس کی صدارت اس حقیر کے حصہ میں آئی، اس ملاقات نے محبت کے نقوش کو اور گہرا کردیا۔

غازی صاحب سے تیسری ملاقات بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی ملیشیاء میں منعقد ایک کانفرنس میں ہوئی، ہم دونوں کا قیام ایک ہی ہوٹل میں تھا، اتفاق سے ہم دونوں کے مقالات بھی ایک ہی نشست میں تھے، سیمینار کی نشستیں عصر تک ختم ہوجاتی تھیں، اس کے بعد ڈاکٹر غازی اور یونیورسٹی کے استاذ پروفیسر خالد رشید میرے کمرے میں آجایا کرتے تھے اور عشاء کے بعد کافی دیر تک گفتگو کا سلسلہ رہتا تھا، ایک دن ہم تینوں کوالالم پور سے کسی قدر فاصلہ پر ایک تفریحی مقام کو بھی گئے، اس سفر میں بہت سے مسائل پر گفتگو ہوئی، اندازہ ہوا کہ برصغیر کی شخصیتوں میں وہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی سے زیادہ متاثر تھے، یہ بھی محسوس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب صرف عہدہ و منصب کے آدمی نہیں ہیں؛ بلکہ واقعی ان کے علم میں گہرائی، مطالعہ میں وسعت اور فکر میں اعتدال ہے ، اس ملاقات میں انھوں نے اپنی کتابیں بھی عنایت فرمائیں 'محاضرات قرآن' اور 'محاضرات حدیث' اس وقت تک آچکے تھے، ان دونوں کتابوں سے بھی سرفراز کیا، اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے وہ بے حد قدرشناس تھے اور اس نسبت سے اس حقیر کے ساتھ بھی تعلق خاطر اور محبت کا اظہار کرتے تھے، یہاں تک کہ ان کی ملاقات کویت یا قطر میں محبّ گرامی مولانا امین عثمانی صاحب سے ہوئی تو انھوں نے اپنے حسن ظن کی بناء پر ''اے فقیہ ہند!'' کے عنوان سے اس حقیر کے لئے ایک منظوم تہنیت

بھی روانہ فرمائی۔

وہ نسباً فاروقی تھے، والد ماجد کا اسم گرامی حاجی احمد فاروقی، ۱۸؍ستمبر ۱۹۵۰ء میں فارسی زبان میں آنرس کیا، ۱۹۷۲ء میں عربی میں ایم اے کیا، فرنچ کلچرل سنٹر سے فرنچ زبان کی سرٹیفیکٹ حاصل کی اور ۱۹۸۸ء میں اسلامک اسٹڈیز میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

وہ اپنے مزاج کے لحاظ سے علم و تحقیق کے میدان کے آدمی تھے، عربی زبان میں انھوں نے اپنی پانچ تصانیف چھوڑی ہیں، جن میں امام محمدؒ کی سیر صغیر کا انگریزی ترجمہ اور ''یا اُمم الشرق'' کے نام سے کلام اقبال کا انگریزی ترجمہ بھی ہے، انگریزی زبان میں سیرت اور دوسرے موضوعات پر آپ کی سات تالیفات ہیں، جن میں ایک نہایت اہم کتاب قادیانیت پر ''قادیانی ازم'' کے نام سے ہے، آپ کی اُردو تالیفات بیس سے زیادہ ہیں، جن میں ''قانونِ قصاص و دیت'' کا مسودہ نیز اسلام کے قانون بین الممالک پر خطبات بھاولپور خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اس کے علاوہ قرآن، حدیث، فقہ، سیرت، اُصولِ فقہ اور قواعدِ فقہ پر آپ کے محاضرات بڑی اہمیت کے حامل ہیں، ان محاضرات میں اگرچہ بعض اوقات طول کلام اور دراز نفسی معلوم ہوتی ہے؛ لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ دقیق علمی مسائل اور فنی اصطلاحات کو عام لوگوں کے لئے قابل فہم بنا کر پیش کیا گیا ہے، اسلامی اقتصادیات بھی آپ کی دلچسپی کے موضوعات میں سے ہے، قطر یونیورسٹی میں آپ اس موضوع کے استاذ بھی رہے ہیں اور ''اسلامی بینک کاری — ایک تعارف'' کے نام سے آپ کی ایک گرانقدر تالیف بھی ہے، آپ نے متنوع موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور آپ کی تمام ہی تحریریں علمی اعتبار سے قدر و قیمت کی حامل ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جو غیر معمولی صلاحیت و دیعت کی تھی، اسی لحاظ سے بہت سے مناصب اور عہدوں سے وہ نوازے بھی گئے، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد کے پہلے

نائب صدر پھر صدر ہوئے، ۲۰۰۰ء تا ۲۰۰۲ء پاکستان کے وفاقی وزیر برائے مذہبی اُمور نامزد ہوئے، یہ زمانہ جنرل پرویز مشرف کی آمریت کا تھا، اور دینی مدارس میں امریکی ایجنڈا نافذ کرنے کا خبط ان پر سوار تھا، اس موقع پر حالاں کہ علماء کا طبقہ غازی صاحب سے بڑا نالاں رہا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھوں نے بڑی حکمت کے ساتھ اس فتنہ کو تھامنے کی کوشش کی اور بالآخر مستعفی ہوگئے، حکومت پاکستان کی قومی سلامتی کونسل اور اسلامی نظریاتی کونسل کے ممبر بھی رہے ، الگ الگ زمانہ میں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی کے تحت قائم ''شریعہ اکیڈمی'' اور ''دعوہ اکیڈمی'' کے ڈائریکٹر جنرل کا فریضہ بھی انجام دیا، اسٹیٹ بینک آف پاکستان اور تکافل پاکستان کی شریعہ کمیٹی کے چیئر مین بھی رہے، ادارہ تحقیقات اسلامی سے نکلنے والے علمی و تحقیقی جریدے سہ ماہی ''دراسات اسلامیہ'' اور اُردو سہ ماہی ''فکرونظر'' کے مدیر بھی ہوئے، ان کے علاوہ پاکستان سے باہر آپ الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین (مصر)، المجمع العالمی لعلوم المسلمین (مکہ مکرمہ)، عرب اکیڈمی (شام) وغیرہ کے ممبر بھی تھے۔

جنرل ضیاء الحق مرحوم کے زمانہ سے لے کر جنرل پرویز مشرف کے عہد تک مختلف سرکاری عہدوں اور سرکاری اداروں سے وابستہ رہے اور اس وابستگی کو انھوں نے اچھے مقاصد کے لئے استعمال کیا، غازی صاحب میں خداداد ذہانت تھی، انھوں نے عربی کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد بالکل ابتدائی دور میں ایک عرب شاعر شیخ علی شعلان کا 'کلام اقبال' کے عربی ترجمہ میں تعاون کیا اور اس کام نے ان کی عربی زبان سے مناسبت کو پختہ تر کردیا، انھوں نے اپنے بچپن میں جس عالم کی تحریر بڑے اہتمام سے پڑھی، وہ حضرت تھانوی تھے، پھر بعد کو مولانا مودودی کے لٹریچر نے انھیں متاثر کیا۔

خود ان کا اپنا خاندان بھی ایک علمی و دینی گھرانہ تھا، ان کے والد جناب محمد احمد فاروقی غالباً شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحبؒ کے خلیفہ تھے، حضرت تھانویؒ سے خاندانی تعلق تھا، ان کا دادیہال تھانہ بھون ہی تھا، غازی صاحب کی پیدائش کاندھلہ میں ہوئی اور نانیہالی خاندان

وہی ہے، جس سے مولانا محمد زکریا صاحبؒ اور مختلف اہل علم پیدا ہوئے ہیں، جب پانچ چھ سال کے تھے تو ہندوستان سے پاکستان منتقل ہوئے، وہاں جن علماء سے استفادہ کیا، ان میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ بھی تھے، انھوں نے مشرق و مغرب کے اعلیٰ ترین مصنفین کو پڑھا، نیز روایتی دینی درسگاہوں کے ساتھ ساتھ عصری دانش گاہوں سے بھی استفادہ کیا۔

اس چیز نے ان کے اندر اعتدال اور وسیع الفکری پیدا کردی تھی، ایک صاحب نے ان سے دریافت کیا کہ کیا شافعی امام کے پیچھے حنفی مقتدی کی نماز ہوجائے گی؟ غازی صاحب نے جواب دیا:

> فقہ اسلامی میں ایسا کوئی حکم موجود نہیں ہے، جس نے بھی ایسا کہا، فضول بات کی ہے اور بالکل غلط کہی ہے، جس مسلک کا امام نماز پڑھا رہا ہو، آپ بے تکلف و بے تردد اس کے پیچھے نماز پڑھ لیں، اگر آج امام شافعی یہاں تشریف لے آئیں تو میں کسی آدمی کو نماز پڑھانے نہیں دوں گا، خود بھی امام شافعیؒ کے پیچھے نماز پڑھوں گا اور دوسروں سے بھی کہوں گا کہ امام شافعیؒ کے پیچھے نماز پڑھیں۔

اسی طرح اہل تشیع کو کافر قرار دیا جائے گا یا نہیں؟ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

> یہ بڑی غیر ذمہ داری کی بات ہے، جو لوگ ایسی باتیں کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو ہدایت دے، ان کو یہ باتیں نہیں کہنی چاہئے، یہ دنیائے اسلام میں ایک ٹائم بم رکھنے کے مترادف ہے، شیعہ حضرات آج سے نہیں ہیں، کم سے کم تیرہ سو برس سے چلے آرہے ہیں، کبھی بھی مسلمانوں نے ان کو کافر نہیں کہا، بڑے بڑے اہل علم نے شیعہ عقائد کا مطالعہ کیا تو ان کو غلط کہا، ان پر تنقید تو کی اور ان کی کمزوریاں واضح کیں؛ لیکن کسی نے یہ نہیں کہا کہ شیعہ دائرہ اسلام سے خارج

ہیں؛ لہٰذا یہ بات درست نہیں ہے، اس نے دنیائے اسلام میں بڑا
فساد پیدا کیا ہے، میرے نزدیک شیعوں کے عقائد غلط ہیں، اسلام
کے مطابق نہیں ہیں، بس بات ختم ہوگئی۔

احکام فقہیہ میں بھی وہ یہ تصور رکھتے تھے کہ اس دور میں بہت سے ایسے مسائل ہیں، جن کو مختلف مکاتبِ فقہ سے استفادہ کر کے ہی حل کیا جا سکتا ہے، اس لئے ان کا خیال تھا کہ حالات کے تحت ایک عالمی فقہ وجود میں آرہی ہے، جو مختلف فقہی مسالک سے مستفاد ہوگی، مدارس کے نظام تعلیم اور نصاب تعلیم کے بارے میں بھی ان کی ایک خاص فکر تھی، جس کا لب لباب یہ ہے کہ دینی مدارس میں عصری علوم کو شامل کیا جانا چاہئے اور نظام تعلیم میں بعض بنیادی تبدیلی ہونی چاہئے، انھوں نے اس مقصد کے لئے پرویز مشرف کے دور میں ایک نصابِ تعلیم کی ترتیب دی تھی، اس سلسلہ میں انھوں نے شریعہ اکیڈمی گجرانوالہ میں مولانا زاہد الراشدی کی دعوت پر خطاب کیا ہے، وہ اس لائق ہے کہ ہر عالم کے مطالعہ میں آئے، یہ چشم کشا تحریر ماہنامہ الشریعہ میں شائع ہو چکی ہے۔

آج جب یہ سطریں لکھ رہا ہوں، غازی صاحب کی صورت نگاہوں میں گھوم رہی ہے، اونچا قد، کشادہ پیشانی، چہرہ داڑھی سے مزین، سانولا رنگ، ہونٹوں پر تبسم کھیلتا ہوا، بول چال، خطاب اور اٹھنے بیٹھنے میں متانت ووقار، نرم گفتار اور سراپا انکسار، کبھی کرتا پائجامہ، ٹوپی میں ملبوس اور کبھی ڈھیلے ڈھالے کوٹ پینٹ میں، اسلامی اور مغربی علوم دونوں کے شناور اور متعدد مشرقی اور مغربی زبانوں سے آگاہ، یہ اوصاف اگر ایک شخصیت میں جمع ہوں تو وہ ڈاکٹر محمود احمد غازی فاروقی ہوں گے؛ چوں کہ وہ اپنے لباس و پوشاک میں علماء کی روایتی وضع کے پابند نہیں تھے، اس لئے اِس حلقہ کے لوگ عمومی طور پر ان سے زیادہ قریب نہیں تھے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ علم وعمل ہر دو اعتبار سے بے حد لائق احترام اور قابل قدر شخصیت تھے، اور یہ حقیر اپنی زندگی میں جن شخصیتوں سے علم واخلاق کے امتزاج کے اعتبار سے خاص طور پر متاثر

ہوا، ان میں ایک اہم ترین نام ڈاکٹر محمود احمد غازیؒ کا ہے، ۲۶/ستمبر ۲۰۱۰ء کو اچانک ان کی وفات کی اطلاع ملی، ایک قریب ترین علمی شخصیت کی وفات پر انسان کو جو صدمہ ہوسکتا ہے، دل میں وہی کسک پیدا ہوئی اور بے ساختہ جی چاہا کہ کاش، ڈاکٹر صاحب کے جنازہ میں شرکت کرتا اور سفر آخرت پر جانے والے مسافر کی صورت آخری بار دیکھتا، اللہ تعالیٰ بال بال مغفرت فرمائے اور ان کی دینی و علمی خدمات کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے۔

❁ ❁ ❁

چوتھا باب

کچھ خاندانی بزرگ

میرے ابا جان!
(مولانا زین العابدین جالویؒ)

اگر سیاہ دلم ، داغِ لالہ زار او ام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہارِ او ام

دل مضطرب ہے، طبیعت بے چین ہے، آنکھیں نم ہیں، قلم کا جگر شق ہوا چاہتا ہے اور دل کی دنیا میں ایک طلاطم سا برپا ہے، ماضی کی ایک ایک یادیں اور گذری ہوئی ایک ایک باتیں نگاہوں کے سامنے پھر رہی ہیں۔

......آہ! کیوں کر لکھوں کہ ۳؍ اکتوبر کی آخر شب میری زندگی کی وہ تاریک، تکلیف دہ اور نا قابل فراموش ساعت ہے، جس میں قدرت نے میرے اور میرے باپ کے درمیان فرقت وجدائی کی نا قابل عبور دیوار چن دی اور وہ ہمیشہ ہمیش کے لئے اس دنیائے فانی کو خیر باد کہہ گئے، **رب ارحمهما كما ربياني صغيراً**۔

اسم گرامی عبداللہ تھا، زین العابدین کے نام سے مشہور تھے، میرے دادا یعنی ان کے والد ماجد کا نام (مولانا) عبدالاحدؒ تھا، جو اپنے وقت کے جید علماء میں تھے، شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ کے شاگرد خاص تھے اور حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے درس حدیث میں بھی شرکت فرمائی تھی، امارت شرعیہ کی پہلی مجلس شوریٰ کے رکن رکین تھے، جالے ہی میں پیدا ہوئے، ابا کی صحت بچپن ہی سے خراب تھی، دمہ اور سخت تنفس کے مریض تھے، ذکاوت وطباعی وراثت میں پائی تھی، تعلیم ابتداءً خود میرے دادا سے حاصل کی اور بہار ہی کے مختلف مدارس میں پڑھتے رہے، 'عالم' اکزامینشن بورڈ سے امتیازی نمبرات سے پاس کیا اور صحت کی کمزوری کی وجہ

اپنی خاندانی روایت کے برعکس دارالعلوم دیوبند تشریف نہ لے جاسکے، طب جو خاندانی ورثہ اور ذریعہ معاش تھا، لکھنؤ میں حاصل کیا اور وہیں سے سند طبابت حاصل کی، ابتداءً خود ہی مطب چلاتے رہے، پھر سرکاری ملازمت مل گئی اور زندگی کا بڑا حصہ ملازمت ہی میں گذرا، سرکاری دواخانہ میں ''حکیم'' کے عہدہ پر فائز رہے، ابھی چند سال قبل مدت ملازمت پوری ہوگئی اور اپنے مکان جالہ میں آگئے، وہیں مطب بھی چلایا، مگر اب ان کو ان چیزوں سے کوئی خاص دلچسپی باقی نہیں رہ گئی تھی، کتب بینی، لکھنا اور پڑھنا پڑھانا ہی خاص مشغلہ رہا؛ تا آں کہ وفات حسرت آیات ہوگئی، موت کے وقت عمر ۷۰ سے متجاوز تھی۔

ان کا علمی مذاق بہت اچھا تھا، اُردو نظم ونثر دونوں ہی سے لگاؤ تھا، مضامین بھی اچھے لکھتے تھے اور اشعار بھی خوب کہتے تھے، کبھی کبھی مجھے منظوم خط لکھا کرتے، جو کئی کئی صفحات پر مشتمل ہوتا، زود گو اور زود نویس تھے، اخیر میں انھوں نے طبی نسخوں کو نظم کیا تھا، جو سو صفحات سے متزاد تھے، وفات کے وقت محفوظ تھے، مگر افسوس کہ اب محفوظ نہیں رہے —— فارسی بھی لکھتے تھے اور فارسی زبان سے یوں بھی ان کی دلچسپی کچھ زیادہ تھی، عربی میں اپنے شیخ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی طرف منسوب کر کے آج سے دس پندرہ سال پہلے انھوں نے خطبات جمعہ کا ایک مجموعہ مرتب کیا تھا، جس پر قدیم طرز واُسلوب کا رنگ غالب تھا اور عبارت مقفّی، مسجّع تھی۔

تحریر کے علاوہ تقریر بھی اچھی کرتے تھے، رواں بولتے تھے، لب ولہجہ سنجیدہ ہوتا تھا، تقریر میں بھی غیر مستند واقعات اور ضعیف روایات بیان کرنے سے احتراز کرتے تھے، شروع میں اکثر ان کی تقریر کا موضوع بدعت اور غیر شرعی رسوم کا رد رہتا تھا؛ مگر اخیر عمر میں ان کی تقریر پر اصلاح اعمال کا رنگ غالب ہوتا تھا۔

حافظہ غضب کا تھا، دیوبند سے فراغت کے بعد جب گھر آیا تو میں طالب علمانہ خوش فہمیوں کا شکار تھا؛ اس لئے کہ جامعہ رحمانی مونگیر میں دورۂ حدیث کی تکمیل کے بعد پھر دارالعلوم دیوبند میں دورہ کیا تھا، احادیث کو اکثر متداول شروح کی مشہور اور اہم مسائل میں اور بعض کو

اکثر مقامات سے دیکھ چکا تھا، ظرف تنگ تھا اور عقل کوتاہ تھی، اس لئے اسی کو بڑا کمال سمجھتا تھا — انھوں نے کہا کہ کچھ احادیث پڑھو اور تشریح کرو، اسی خیال میں حدیث پڑھ رہا تھا کہ جہاں جو اشکال ہوگا، انشاء اللہ ابا کو جواب دے کر خوش کردوں گا، جب آپ نے میری تشریح پر بعض فقہی اور اعتقادی گرفت کی تو میں لاجواب اور غلط فہمیوں کا جھوٹا نشہ کافور ہوگیا، **اللّٰھم احفظنا منه۔**

قرآن اور تفسیر قرآن سے بھی ان کو خاص مناسبت تھی، میں نے ان سے سورۂ کہف سورۂ نور، عم پارہ اور سورۂ نساء کے بڑے حصہ کی تفسیر پڑھی ہے، سورۂ کہف کی تلاوت بھی بہت کرتے تھے، قرآن کا بھی بڑا حصہ ان کو یاد تھا، گو کہ حافظ نہ تھے، مگر ''مفردات'' قرآن بہت یاد تھے۔

اپنے اکابر اور سلف سے والہانہ تعلق تھا، دیو بند اور بزرگان دیو بند سے کہنا چاہئے کہ عشق تھا، ان کے واقعات اور ایمان افروز قصے بکثرت ذکر کیا کرتے تھے، میں نے مفتی محمد کفایت اللہ صاحبؒ، مولانا احمد سعید صاحبؒ، مولانا مرتضیٰ حسن چاند پوریؒ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، مولانا حافظ بشارت کریم گڑھولویؒ، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ، مولانا قاضی نور الحسن سابق قاضی امارت شرعیہ کے بہت سے واقعات ان سے سنے ہیں؛ لیکن چار بزرگوں سے ان کو خصوصی تعلق تھا، اور ان کو وہ اخلاص، درمندی و خدا ترسی اور دور اندیشی میں اپنے معاصرین سے فائق تصور کرتے تھے، یہ چار اکابر تھے، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا ابو المحاسن محمد سجادؒ، مولانا محمد الیاس کاندھلویؒ اور مولانا ابو الکلام آزادؒ، کہا کرتے تھے کہ ''جن خوش نصیبوں نے ان حضرات کو دیکھا ہے، ان کی نگاہ میں کوئی اور جچ ہی نہیں سکتا ہے''۔

مولانا سید حسین احمد مدنیؒ ہی سے بیعت بھی تھے، اس وقت میں دیو بند میں زیر تعلیم تھا تو ہمیشہ خط میں لکھا کرتے کہ مولانا مدنیؒ کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھو اور برابر وہاں جایا کرو!

اپنے معمولات اور اذکار کے بڑے پابند تھے، نماز اور جماعت کی بھی بڑی پابندی کرتے تھے، تلاوت قرآن بھی پابندی سے کیا کرتے تھے، وضع قطع اور لباس و پوشاک کے معاملہ میں سختی سے سلف کے طریقہ پر تھے، سنت سے بہت محبت تھی، اس کا فطری اثر تھا کہ

بدعات اور رسوم و رواج میں از راہ مصلحت بھی رواداری ان کو گوارا نہیں تھی — بلکہ اس معاملہ میں ایک حد تک شدت یا غلو کی کیفیت تھی؛ وہ اُردو میں خطبۂ جمعہ کے قائل نہیں تھے اور عام بزرگان دیوبند کے مسلک پر سختی سے قائم تھے ''دُعاء'' اجتماعی کو بھی صحیح تصور نہیں کرتے تھے اور اس کے متعلق مولانا مرتضی حسن چاند پوری سابق ناظم تعلیمات دارالعلوم دیوبند کے ایک رسالہ کا تذکرہ کیا کرتے تھے، مروجہ طریقہ میلاد کو بھی ناپسند کرتے تھے اور ایسی مجلسوں میں شریک نہ ہونے کی کوشش کرتے تھے، ایصال ثواب اور قرآن خوانی کا جو اجتماعی طریقہ ہمارے یہاں رائج ہے، کہتے تھے کہ یہ طریقہ حدیث سے ثابت نہیں ہے۔

محرم کی تعزیہ داری سے ان کو اتنی نفرت تھی کہ دسویں محرم کو چوں کہ رکاوٹ اور منع کرنے کے باوجود میرے صحن میں ہی 'تعزیہ' رکھا جاتا ہے، اس لئے اس پورے دن مسجد میں مقیم رہتے اور گھر کا رُخ نہیں کرتے تھے، بدعت کے معاملہ میں وہ اپنے سلف صالحین میں مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے مسلک کو اسوہ قرار دیتے تھے اور اس معاملہ میں ان کی غیر معمولی احتیاط کا بہت تذکرہ کرتے تھے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا احترام بہت ملحوظ رکھتے، اگر ہم کبھی کسی صحابی کے نام کے ساتھ ''رضی اللہ عنہ'' نہیں کہتے، یا نہیں لکھتے، یا لکھتے لیکن ''رض'' یا آنحضور کے نام کے ساتھ ''صلعم'' لکھنے پر اکتفا کرتے تو بہت خفا ہوتے اور تنبیہ کرتے، اسی طرح وہ مصنفین جو ان کے خیال کے مطابق صحابہ پر بے جا تنقید کرتے تھے، یا وہ جماعت جو ان کی رائے میں صحابہ کا شایانِ شان احترام نہیں کرتی، کو ناپسند کرتے اور ان کے معاملہ میں وہی شدت اختیار کرتے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کا مسلک تھا۔

تبلیغی جماعت سے بڑا تعلق تھا، ملازمت کے دوران بھی اور اس کے بعد بھی برابر جماعت سے عملی یا کم از کم فکری ربط برقرار رکھا، عام طرز کے جلسوں، کانفرنسوں اور اس قسم کے دیگر اجتماعات کو غیر مفید یا کم مفید تصور کرتے تھے، اس کے مقابلہ میں تبلیغی اجتماعات اور گشت کو زیادہ اہمیت دیتے تھے اور اس کی افادیت کے قائل تھے؛ بلکہ اگر کہیں جلسہ کی تجویز ہوتی اور وہ محسوس کرتے کہ ان کی بات مانی جائے گی تو کہتے کہ اس کی بجائے جماعت کو دعوت دے

کر بلایا جائے، وہ اس کام سے اس قدر متاثر تھے کہ مولانا الیاس صاحبؒ کے اس دعوتی کام کو اس صدی کا ''تجدیدی کارنامہ'' قرار دیتے تھے۔

اخیر عہد میں اپنی بہت سی پریشانیوں اور اُلجھنوں کے باوجود بڑے ذوق وشوق اور لگن کے ساتھ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ترجمے اور تشریحات کا ایک مجموعہ مرتب کر رہے تھے، موت سے چند دنوں پہلے تک وہ یہ لکھتے اور لکھاتے رہے، ان کی خواہش تھی کہ یہ مجموعہ ان کی زندگی میں شائع ہو جائے مگر ایسا نہ ہوسکا، اللہ کرے کہ میرے ہاتھوں ان کے بعد ان کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو جائے —— یوں بھی حدیث سے ان کو خاص تعلق تھا، جب وہ رمضان المبارک کے مہینہ میں معتکف ہوتے تو بعد ظہر مجھ سے احادیث کی تلاوت اسی طرح کراتے، جس طرح قرآن شریف پڑھا جاتا ہے، حدیث میں مشکوٰۃ شریف اور ترمذی شریف اور تفسیر میں ''مدارک'' کا اکثر مطالعہ کیا کرتے تھے اور یہ کتابیں ان کو زیادہ پسند بھی تھیں۔

ان کے علمی آثار میں اس غیر مطبوعہ مجموعہ احادیث کے علاوہ دو مطبوعہ رسالے بھی ہیں، جن میں سے ایک کا نام ''سیرت المصطفیٰ'' ہے، یہ رسالہ جو ۳۲ صفحات پر مشتمل ہے، دراصل سیرت کے موضوع پر کی گئی ایک تقریر ہے، جسے داعیان جلسہ نے کتابی صورت میں شائع کیا ہے، اس رسالہ میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی پہلو کے علاوہ حب رسول کا صحیح مفہوم بتایا گیا ہے اور غلو آمیز مبتدعانہ بداعتقادیوں پر تنقید کی گئی ہے، دوسرا رسالہ ''دین ابراہیمی'' ہے جو توحید کے موضوع پر ہے اور اب نایاب ہے۔

اس کے علاوہ ان کی علمی یادگار ان کے طبی نسخوں کا وہ منظوم رسالہ ہے، جس کا اس سے پہلے تذکرہ ہو چکا ہے، وہ بعض احباب اور رفقاء کی تحریک پر بہار کے ماضی قریب میں گذرنے والے ان اہم علماء اور قائدین کے مختصر تذکروں اور سوانحی خاکوں پر مشتمل کتاب بھی ترتیب دے رہے تھے، جن کو عوام کے حافظہ نے بھلا دیا ہے، اور اہل قلم نے ان کی زندگی پر کچھ نہیں لکھا ہے، چنانچہ وہ اس سلسلہ میں بارہ تیرہ شخصیتوں کا مختصر تذکرہ لکھ چکے تھے، جن میں مولانا

عبدالوہاب صاحبؒ، مولانا عبدالحفیظ صاحبؒ میرے دادا مولانا عبدالاحد صاحبؒ، مولانا محمد عارف ہرسنگھ پوریؒ خاص طور پر قابل ذکر ہیں، افسوس کہ یہ اہم کام پورا نہیں ہوسکا۔

وہ صرف میرے باپ ہی نہ تھے اور میں صرف ان کا بیٹا ہی نہیں تھا؛ بلکہ وہ میرے اتالیق اور مربی بھی تھے، اخلاقی معلم بھی اور درسی اور کتابی استاذ بھی، جب میں ننھی منّی عمر میں تھا اور زندگی کی پانچ چھ ہی بہاریں دیکھ سکا تھا، اسی وقت میں ان کے ساتھ ساتھ رہنے لگا، باوجودیکہ مرض کی وجہ سے ان کے مزاج میں تندی تھی، جذباتی بھی تھے، خوش بھی جلد ہوتے اور رنج بھی، مگر میرے معاملہ میں ان پر غصہ سے زیادہ شفقت کا رنگ غالب تھا اور ان کا یہی لاڈ و پیار تھا جس نے مجھے گھر کی، ماں اور بھائی بہنوں کی دوری کا احساس بہت کم ہونے دیا۔

میں نے قرآن مجید اور اُردو اپنی والدہ اور دادی اماں مرحومہ سے پڑھا، اس کے بعد فارسی اور عربی کی مبادیات زیادہ تر ابا ہی سے پڑھیں، عربی صرف ونحو کے معاملہ میں وہ مدارس کی مروجہ ''جولانی خطابت'' کو ناپسند کرتے تھے اور تمرین ومشق اور بول چال کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ عربی قواعد کا اجراء کرایا کرتے تھے، نحو وصرف پڑھانے کا طریقہ یہ تھا کہ جو بحث پڑھاتے، قرآن مجید کے چند رُکوع حوالہ کردیتے کہ اس میں اس سے اس کی مثالیں نشان زد کریں، جیسے مرکب اضافی، مرکب توصیفی، جملہ اسمیہ، جملہ شرطیہ وغیرہ، اس تطبیقی انداز درس نے مجھے بے حد فائدہ پہنچایا، عربی الفاظ کا بھی ان کے پاس بڑا ذخیرہ تھا، مجھے انھوں نے عربی سے اُردو اور اُردو سے عربی الفاظ کی ایک ضخیم کاپی محض اپنے حافظہ اور یادداشت پر لکھ کر دی تھی کہ میں اسے یاد کرلوں، ''نحو'' میں وہ ''نحومیر'' کو بہت مفید خیال کرتے تھے، ''نحو عربی'' کے نوٹس انھوں نے اتنی سہل، تعبیر اور عمدہ ترتیب سے لکھایا تھا کہ مجھے اس نے سب سے زیادہ فائدہ پہنچایا اور عربی قواعد کی جو کچھ شُدبُد پیدا ہوئی وہ بڑی حد تک اسی کا ثمرہ تھا، اس کے علاوہ میں نے ان سے بعض سورتوں کی تفسیر بھی پڑھی ہے، حنفی نقطۂ نظر سے احادیث کے مجموعہ ''اثار السنن'' کے بعض ابواب بھی میں نے انھیں سے پڑھے ہیں، گلستاں اور فارسی کی تمام کتابیں بھی انھیں

کے پاس ہوئیں، فارسی قواعد اور نحو و صرف سے بھی ان کو بہت لگاؤ تھا، اسی دلچسپی اور تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ فارسی پڑھنے پڑھانے پر بہت زور دیا کرتے تھے ، مجھے اس وقت فارسی کا یہ بوجھ خواہ مخواہ محسوس ہوتا تھا؛ مگر بعد کو جب قلم تھامنے کا شعور پیدا ہوا تو اندازہ ہوا کہ فارسی سے مناسبت کے بغیر کوئی اچھی اُردو تحریر نہیں لکھی جاسکتی۔

تفہیم و تعبیر پر ان کو جو قدرت حاصل تھی اور جس طرح سہل سے سہل اُسلوب میں مختصر الفاظ اور کم سے کم وقت میں وہ اپنی باتیں طلبہ کے ذہن و دل میں اُتار دیتے تھے، کم لوگ اس صلاحیت سے بہرہ مند ہوتے ہیں، میرے خیال میں اگر وہ تدریس کی راہ اختیار کرتے تو بہترین اور ممتاز مدرس ثابت ہوتے اور اس حیثیت سے ان کو بڑی شہرت حاصل ہوتی ،مگر ان کے مزاج کی نزاکت، صحت کی ناموافقت اور زود رنجی اس کی متحمل نہیں تھی کہ وہ مدارس اور دینی اداروں کے تلخ و شیریں حالات سے گذر سکیں۔

بہت سے لوگ تعلیم و تربیت کے میدان کے شہسوار تو ہوتے ہیں؛ مگر تربیت کا کام ان سے نہیں ہو پاتا اور نہ زندگی کے اس اہم پہلو پر ان کی توجہ ہوتی ہے، واقعہ ہے کہ تربیت ایک حد تک تعلیم سے زیادہ دشوار اور اہم کام ہے، وہ تربیت پر بہت زور دیتے تھے اور اس کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔

ایک بار ایک بزرگ مجھ سے ایک کتاب کا امتحان لے رہے تھے، ابا موجود تھے، ان بزرگ مہمان نے عبارت پڑھوائی، ترجمہ کرایا، بعض الفاظ کے معانی دریافت کئے، میں نے جواب بھی ''باصواب'' ہی دیا؛ لیکن تعبیر میں مجھ سے کچھ ایسی غلطی ہوگئی کہ مفہوم الٹا ہوگیا، انھوں نے میری تغلیط کی اور اسی کو دوسرے الفاظ میں سمجھانے لگے، میں نے عرض کیا: آپ سمجھ نہیں سکے، میرا مقصود بھی وہی تھا، میرے جواب کا یہ غیر دانش مندانہ اور طفلانہ لب و لہجہ ابا کو بہت گراں گذرا اور ان کے چہرے کا رنگ بدل گیا، بعد کو میری فہمائش کی کہ کبھی کسی بزرگ کو یہ مت کہا کرو؛ بلکہ کہو کہ میں آپ کو سمجھا نہیں سکا، واقعہ ہے کہ مقصود کی یکسانیت کے باوجود

لفظوں کی تبدیلی نے اخلاق وادب کی میزان میں اس فقرہ کو کتنا گراں قدر بنا دیا ہے !

وہ مجھے کبھی سوکر، ٹیک لگا کر کتاب پڑھنے نہیں دیتے تھے، ہمیشہ میرے ہاتھوں فقیروں اور بھکاریوں کو بھیک دلایا کرتے تھے، کہتے تھے کہ اس سے دینے کی عادت پڑے گی، ساتھ دسترخوان پر کھانا کھلاتے اور غلطیوں پر ٹوکتے رہتے، مجال نہ تھی کہ ان کی موجودگی میں کسی کی چیز دیکھ کر ان کی طرف لپکیں، یا اس سے مانگ لیں؛ بلکہ کسی کی دی ہوئی چیز ان کی آنکھوں کا اشارہ پائے بغیر لے بھی نہیں سکتا تھا، ابتداءً میرا یہ معمول ''کرہاً'' تھا لیکن بعد کو ''طوعاً'' ہو گیا، نہ میرے لئے یہ بات ممکن تھی کہ دوسرے ساتھیوں کی طرح ہم بھی فیشن اور تزئین وتجمل کی طرف توجہ دیں، وہ نہ صرف یہ کہ ہمیں معمولی پہناتے اور معمولی حالت میں رکھتے: بلکہ اسے ضروری بھی سمجھتے اور میرے لئے اسی کو پسند بھی فرماتے، ابا کے اس طرز عمل نے ایک حد تک مجھے قانع بھی بنا دیا تھا کہ اپنی ظاہری سادگی و بے سروسامانی پر ہمیں کوئی جھجک، شرم و عار، افسوس اور دوسروں پر رشک ورقابت یا حسد کا کوئی جذبہ پیدا نہیں ہوتا تھا اور اس کا نتیجہ تھا کہ میں ان معاملات میں ''لا اُبالی'' بلکہ اپنے بے تکلف دوستوں کے زبان میں ''باؤلا'' اور بعض شفیق اساتذہ کے الفاظ میں ''مستان'' سا ہو گیا تھا۔

زبان و بیان کی غلطیوں پر بھی وہ ٹوکتے رہتے تھے، بچپن میں میری عادت تھی کہ درد، بخار، پیشاب وغیرہ الفاظ کو مؤنث بولا کرتا تھا، اسی طرح ''گھر کے اندر'' کی بجائے ''گھر کے اندر میں'' بولنے کی عادت تھی، اس طرح لفظی اور جزوی غلطیوں پر وہ ابتداء ہی سے تنبیہ کرتے رہتے تھے؛ تا آں کہ یہ عادت چھوٹ جائے۔

انھوں نے اپنے تمام بال بچوں میں سب سے زیادہ مجھے ہی ساتھ رکھا اور از خود میری تعلیمی اور تربیتی ذمہ داریوں سے عہد برآ ہوتے رہے؛ اس لئے وہ اپنے بچوں میں مجھ سے سب سے زیادہ پُر اُمید بھی تھے، بڑی توقعات وابستہ رکھتے تھے، اور آئندہ نسل میں مجھے ہی اپنے خاندان کی دینی، علمی، ادبی، تحریری اور تقریری روایات کا امین تصور کرتے تھے، اللہ ان کے خواب کو حقیقت کا روپ دیدے، **وما ذالک علی اللہ بعزیز**، ورنہ ''من آنم کہ من دانم!''

ان کو مجھ سے اور مجھ کو ان سے جو غیر معمولی تعلق تھا، اس کو ''عشق'' سے کم کوئی اور نام نہیں دیا جاسکتا، میری علالت کی معمولی اطلاع سن کر اختلاج قلب شروع ہوجاتا تھا اور بے قرار ہوجاتے تھے؛ اسی لئے میں بہت کم ان کو اپنی بیماری کی اطلاع دیتا تھا، دیوبند میں زمانۂ طالب علمی میں سخت بیمار پڑا، ان کو معلوم ہوا تو بے چین ہوگئے اور دل ودماغ کا یہ عالم تھا کہ ''دربھنگہ'' جہاں سے اس وقت قریبی علاقوں کے لئے ریل گاڑیاں چلتی تھیں، میں جاکر پوچھنے لگے کہ کیا یہاں سے کوئی ٹرین دیوبند کو بھی جاتی ہے؟ —— اس دردمندی اور بے قراری سے باپ کے دھڑکتے ہوئے دل کے سوا اور کون آشنا ہوسکتا ہے؟

ایک سال قبل جب میں نے حیدرآباد کے لئے رخت سفر باندھا، تو روانہ کرتے ہوئے چند نصیحتیں کیں اور خطوط لکھنے کی تاکید فرمائی، بات یہ ہے کہ خط لکھنے میں —— خدا معاف کرے —— یہ ناکارہ طبعاً سست اور کاہل؛ بلکہ غافل واقع ہوا ہے، میں نے عرض کیا کہ اگر میرا خط نہ آئے تو آپ سمجھ کرلیا کریں کہ میں اچھا ہی ہوں گا، اور کوئی قابل ذکر بات پیش نہیں آئی ہوگی، اس لئے کہ خط لکھا ہی اس وقت جاتا ہے، جب معمول اور عادت کے خلاف کوئی بات پیش آگئی ہو —— میری اس ''خیالی منطق'' پر مسکرائے اور کہنے لگے کہ یہ تڑپ اس وقت سمجھ میں آئے گی، جب تم بھی باپ بن چکے ہوگے۔

میں جب حیدرآباد جارہا تھا تو ان کی حالت اتنی ناقابل اطمینان نہیں تھی؛ مگر اس درمیان رفتہ رفتہ صحت گرتی گئی، علاج بھی ہوا مگر ''مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی'' —— یہاں تک کہ تھوڑے دنوں کے لئے فریش بھی ہوگئے، مگر اب بھی استنجاء وغیرہ کو اٹھتے تھے، ان کی گفتگو، بول چال، آنے جانے والوں سے ملاقات یہاں تک کہ کچھ لکھانے کا سلسلہ جوں کا توں باقی رہا، ایک دو روز قبل زبان میں کچھ لکنت سی ہوگئی اور کھانا پینا بھی چھوٹ گیا، عم محترم حضرت قاضی صاحبؒ کی موجودگی اور تیمارداری کی وجہ سے ان کو اطمینان بھی تھا، سکون بھی اور ہر طرح کی سہولت اور آسانی بھی۔

ہاں البتہ اخیر وقت میں مجھے دیکھنے، میری شادی دیکھنے اور میری ایک پھوپھی جو

پاکستان میں ہیں، ان کو دیکھنے کی حسرت رہی، جو آخر ساتھ گئی اور مجھ بدنصیب کو ان کا جنازہ تک نصیب نہ ہوسکا، اخیر وقت تک وہ اپنے معمول کے مطابق اوراد واذکار پڑھتے رہے، موت سے پہلے پہلے تک کلمہ کا ورد بھی جاری رہا، آخری لمحات میں تین بار کہا: اٰمَنْتُ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ اور ہر بار یہ فقرہ پڑھنے سے پہلے نحیف آواز میں کہا کہ آپ حضرات گواہ رہئے —— اور روح پرواز کرگئی—— ہوش وحواس، شعور، لوگوں کی پہچان اخیر وقت تک باقی رہی، یہاں تک کہ دم ٹوٹنے سے تھوڑا پہلے خود ہی انگلیوں سے اپنی پلکیں بھی بند کیں۔

آج جب یہ سطریں ان کی یاد میں لکھ رہا ہوں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا وجود میرے سامنے ہے، آہ! کیوں کر لکھوں کہ یادوں کے یہ نشتر اور خیالات وتصورات کے یہ خنجر کس طرح زخم دل کو ہرا کئے دیتے ہیں، وہی پست قد، ہلکا سانولا رنگ، سفید داڑھی، آنکھیں بڑی مگر اندر کو دھنسی ہوئی، پیشانی پر سجدہ کا نشان، ناک کھڑی، ہونٹ باریک، جسم لاغر اور دبلا، سر کے بال اکثر سفید کچھ سیاہ، لانبا کرتا، عربی پاجامہ جو اکثر نصف پنڈلی تک ہوتا، سر پر دو پلی ٹوپی، آنکھ پر چشمہ، ہاتھ میں ایک بید کی لاٹھی، کپڑے معمولی جو اکثر سفید ہوتے، جاڑے کے موسم میں کھدر کے کپڑے کی شیروانی، بولتے تو ٹھہر ٹھہر کر، آواز صاف نہ کرخت اور نہ ایسی کہ سننا دشوار ہو جائے، طبیعت میں سنجیدگی کے ساتھ حسب موقع ظرافت، سادگی کی تصویر، عجز وانکساری اور تواضع کا پیکر، زود رنج وزود خوش مگر کینہ وکدورت سے دور، یار باش اور دوست پرور مگر حق کے معاملہ میں دوست نوازی سے نفور —— یہ ''متاع گراں مایہ'' مجھ سے ۳؍اکتوبر ۱۹۷۹ء کو قدرت نے چھین لیا اور عبدا پنے معبود کے حضور پہنچ گیا، جہاں وہ میری محبت اور میری خدمت سے بے نیاز ہوچکے ہیں، جہاں پسماندگان کے آنسو کے قطرے، دلوں کی بے قراری اور دنیا کی ساری متاع غرور کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتی، ہاں، ان کے لئے دُعائیں اور التجائیں انشاء اللہ کام آئیں گی، دُعاء ہے کہ :

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

❁ ❁ ❁

محبت واحترام کے چند آنسو، ماں کے قدموں میں!

دفتر ہستی میں تھی ، زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

۱۵رشوال ۱۴۲۶ھ مطابق ۱۷رنومبر ۲۰۰۵ء روز جمعہ کی شب میری زندگی میں دوسری سب سے غم انگیز اورالم خیز رات بن کر طلوع ہوئی، جس میں، میں ماں کی ممتا کی ٹھنڈی اور گہری چھاؤں سے محروم ہوگیا، والد مرحوم کی وفات کے بعد سے میرے لئے غالباً یہ سب سے بڑا سانحہ ہے؛ کیوں کہ میری تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے :

اگر سیاہ دلم ، داغِ لالہ زار او ام
وگر کشادہ جبینم ، گلِ بہارِ او ام

اگست کے آخری ہفتہ میں برطانیہ کی بعض مسلم تنظیموں کی دعوت پر یہ حقیر برطانیہ گیا ہوا تھا، اورنہایت ہی مشغول پروگرام کے تحت انگلینڈ سے اسکاٹ لینڈ کی طرف سفر کی حالت میں تھا کہ اماں کی علالت کی خبر آئی، معلوم ہوا کہ بائیں حصہ پر فالج کا حملہ ہوا ہے، اور حالت بہت ہی نازک ہے، ابھی آئے ہوئے چند ہی دن ہوئے تھے، میں نے اپنے میز بانوں سے کہا کہ اس وقت اگر آپ لوگ مجھے واپس کردیں تو بڑی نوازش ہوگی، ان حضرات نے کہا کہ ہم لوگ پورے ملک میں پروگرام بنا چکے ہیں، دعوت نامے اوراعلانات شائع ہو چکے ہیں، اب اگر پروگرام ملتوی ہوتو بُرا اثر پڑے گا، میں خاموش ہوگیا، اندر سے طبیعت میں بڑی بے چینی تھی؛ چنانچہ ایک دو راتیں آنکھوں میں کٹ گئیں اور دُعاء کا سلسلہ جاری رہا، قریب قریب روزانہ ہی ایک دو دفعہ فون کرنے کی نوبت آتی تھی، اخیر کے چند دن میز بانوں نے تفریح کے لئے رکھے تھے، میں نے اسے ختم کردیا، اور ۲۲ر ستمبر کو حیدرآباد واپس آ گیا، اور پھر ایک دو روز میں اپنے آبائی وطن جا لے پہنچا۔

اللہ کا شکر ہے کہ گوان کے جسم کا ایک حصہ گرا ہوا تھا؛ لیکن طبیعت نسبتاً بہتر تھی، مجھے پہچان گئیں، کچھ بات چیت بھی ہوئی، میں نے دیکھا کہ ہر وقت تسبیح اور دُعاء پڑھنے کا سلسلہ جاری ہے، کوئی وہاں بیٹھ کر دنیوی گفتگو کرتا تو ناراضگی ظاہر کرتیں، نماز کی طرح ہاتھ باندھتیں، اور انگلی اس طرح چلتی کہ گویا تسبیح پڑھ رہی ہوں، اسی حال میں ہم دونوں بھائی اور دونوں بہوئیں انھیں ساتھ لے کر پٹنہ آئے اور وہیں سے اجازت لے کر اور آخری ملاقات کر کے ہم لوگ حیدرآباد کی طرف روانہ ہوئے، یہی گویا زندگی کی آخری ملاقات تھی، حیدرآباد پہنچنے کے بعد بھی روزانہ ہی دو تین بار استفسار حال کرنے کی نوبت آتی تھی، اور اطلاع مل رہی تھی کہ حالت نسبتاً بہتر ہو رہی ہے؛ بلکہ ایک دو دفعہ فون پر مختصر گفتگو بھی ہوئی، آخر عید الفطر کے چند روز بعد دہلی، لکھنؤ ہوتے ہوئے میں پٹنہ کے لئے روانہ ہوا، اور برابر حالات کی اطلاع لیتا رہا، ۱۷؍نومبر کو ۴؍بجے دن برادر عزیز ڈاکٹر مظفر الاسلام سلمہ کا فون آیا کہ آج طبیعت میں مسلسل انحطاط اور گراوٹ ہے، دُعاء کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا، ۹؍بجے شب میں جب کہ میں ایک پروگرام میں مشغول تھا، اطلاع آئی کہ حالت بہت زیادہ نازک ہوگئی ہے، میں اسٹیشن کی طرف لپکا کہ ۹؍بج کر ۴۰؍منٹ پر فون آیا کہ ۵؍منٹ پہلے والدہ دنیا سے رخصت ہو چکیں۔

گو خبر غیر متوقع نہیں تھی؛ لیکن کان اس کے سننے پر آمادہ نہیں تھا، اس لئے بڑی کشمکش کے ساتھ ٹرین میں رات گذری اور علی الصباح پھلواری شریف پٹنہ میں عزیزی عارف سلمہ کے مکان پر پہنچا، اور اماں کو اس حال میں دیکھا کہ ہمیشہ محبت وشفقت اور دُعاؤں کی پھوار برسانے والی زبان بند ہے اور آنکھوں نے دنیا سے منھ موڑ لیا ہے، یوں تو ہمیشہ ہی ذکر اور درود شریف کی کثرت رکھا کرتی تھیں؛ لیکن بیماری کے اس آخری حملہ کے بعد یہ کیفیت بڑھ گئی تھی اور آخری دو دن ورات مسلسل ''**سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم**'' کا ورد کرتی رہیں اور وہ بھی جہر کے ساتھ، میرا چھوٹا لڑکا عزیزی ظفر عابدین سلمہ بھی ساتھ تھا؛ چنانچہ ہم سب لوگ جن کی تعداد پندرہ بیس ہوگئی تھی، لاش لے کر اپنے آبائی موضع جالے کے لئے روانہ ہوئے، عصر کے بعد نماز جنازہ ادا کی گئی، جس میں لوگوں کا بڑا مجمع اور نمازیوں کی سترہ صفیں تھیں، علاقہ کے

علماء اور ذمہ داران مدارس بھی اچھی خاصی تعداد میں آ گئے ؛ چنانچہ سنت کے مطابق نماز اور تدفین عمل میں آئی۔

میری والدہ جن کا نام بلقیس جہاں تھا، سید اسلم ہاشمی مرحوم کی صاحبزادی تھیں، بہار میں ایک بڑے صاحب نسبت اور بافیض بزرگ حضرت مولانا بشارت کریم صاحبؒ گذرے ہیں، مرحوم کا ان سے خصوصی تعلق تھا، اوران کے مقربین خاص میں تھے، قدیم زمانہ کے مطابق والدہ کی تعلیم معمولی درجہ کی تھی، ناظرۂ قرآن، اُردو، دینیات وغیرہ پڑھی ہوئی تھیں ؛ لیکن اللہ نے ان کو بچوں کی تربیت کا بڑا ملکہ عطا کیا تھا، ہم بھائی بہنوں نے ان ہی سے قرآن مجید اور اُردو کی ابتدائی کتابیں پڑھیں، اور خاندان کے کتنے ہی لڑکوں اورلڑکیوں کوانھوں نے فی سبیل اللہ ناظرۂ قرآن مجید اور مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی اُردو کی کتاب اور بہشتی زیور پڑھائی، باوجود کم تعلیم یافتہ ہونے کے اُردو تحریر بہت پختہ تھی، اور ہم لوگوں کو املاء لکھانے اور درست کرنے میں بھی بنیادی حصہ والدہ ہی کا ہے، مجھے جب خط لکھتیں تو اس کا ابتدائی مضمون کچھ اس طرح ہوتا ’’عزیزم، نور چشم، لخت جگرم خالد سلمہ، عافیت دارم وخواہم، بعد دُعاءِ حیات واقبال ایں کہ......‘‘ خطوط میں زمانۂ طالب علمی کے لئے بڑی اچھی نصیحتیں بھی کرتیں۔

معمول یہ تھا کہ فجر کے ساتھ ہی ہم لوگوں کو قرآن مجید لے کر بیٹھ جانا پڑتا، اور جب تک ہم لوگ آموختہ سنانہیں لیتے، مجال نہ تھی کہ ناشتہ مل جائے، مدرسہ سے آنے کے بعد عصر سے مغرب تک تو کھیل کود کی اجازت ہوتی ؛ لیکن مغرب سے پہلے لالٹین صاف کر کے رکھتیں اور مغرب کے ساتھ ہی ہم لوگوں کو کتاب لے کر بیٹھ جانا ہوتا، چاہے وہ خود کھانا پکارہی ہوں ؛ لیکن توجہ ہم لوگوں کی طرف ہوتی، ذرا بھی غفلت ہوتی تو فوراً ڈانٹ پڑ جاتی، تعلیم کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت پر بھی بڑی توجہ ہوتی، ہمیشہ پردہ کا اہتمام کرتی رہیں، یہاں تک کہ اپنے آخری درجہ کے بوڑھاپے میں بھی یہ اہتمام باقی رہا، رکشہ میں برقعے پہن کر بیٹھنے کو کافی نہیں سمجھتیں ؛ بلکہ اس کو پھر اوپر سے گھیر دیا جاتا، خاندان کی لڑکیوں پر بھی پردہ کے سلسلہ میں بڑی سختی کرتیں، اگر کبھی آنچل سر سے ہٹ گیا تو فوراً ڈانٹ پڑتی۔

ایک بار اپنی قریبی رشتہ دار خاتون سے ان کی ذرا تلخ گفتگو ہوگئی، جو رشتہ میں ہماری بزرگ ہوتی تھیں، ان کے جانے کے بعد میں نے ان کے ناموزوں انداز گفتگو پر ناگواری کا اظہار کیا، اماں نے فوراً مجھے ڈانٹا کہ ''خبردار! وہ تمہاری ...... ہیں، میں کچھ بھی کہوں؛ لیکن تمہاری زبان سے بے ادبی کا کوئی لفظ نہیں نکلنا چاہئے'' اس تنبیہ کا اثر یہ ہوا کہ اگر وقتی طور پر بڑوں کے درمیان کوئی ہلکی پھلکی تلخی پیدا ہوجاتی تو ہم لوگ اس سے بالکل الگ تھلگ رہتے۔

میں مدرسہ جاتا تو مجھے خاص طور پر تاکید ہوتی کہ کسی استاذ کا اور بڑے کا دل نہ دکھاؤ، اگر ان کی طرف سے زیادتی بھی محسوس ہو تب بھی اس کو ان کی بہی خواہی ہی سمجھو، ایک زمانہ میں مدرسہ قاسم العلوم دوگھرا میں زیر تعلیم تھا، میرے استاذ حضرت مولانا عبدالحمید صاحب قاسمی مدظلہ، (نیپال) مجھ پر خصوصی توجہ رکھتے تھے، اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے مجھے یہ توجہ سختی محسوس ہوتی تھی اور ناگواری کا باعث بنتی تھی، ایک دفعہ میں بھاگ کر گھر آ گیا اور والدہ سے شکایت کی، والدہ نے بجائے اس کے کہ محبت اور ممتا کا اظہار کرتیں، کہنے لگیں کہ ''بیٹا! میں ایسی محبت کرنے والی ماں نہیں ہوں، تم ابھی واپس جاؤ، اور جا کر استاذ سے معافی مانگو'' چنانچہ اسی وقت مجھے ایک صاحب کے ساتھ مدرسہ واپس بھیج دیا، اس کا نتیجہ تھا کہ میں گھر پر کسی استاذ کے بارے میں ایک حرفِ شکایت بھی کہہ نہیں سکتا تھا، اور نہ کبھی تعلیم چھوڑ کر گھر آنے کی ہمت ہوتی تھی۔

تربیت کا ایک اور پہلو یہ تھا کہ ہم لوگوں کی ابتدائی زندگی بڑی عسرت اور تنگی کی تھی، والد صاحب مرحوم گورنمنٹ طبیب تھے، حلال وحرام میں بہت محتاط رہتے تھے، اس لئے خود بھی قناعت کی زندگی گذارتے تھے، اور ان کے تحت جو کمپاؤنڈر اور ملازم ہوتے تھے، انھیں بھی مریضوں سے پیسے لینے یا دوائیں بیچنے کا موقع نہیں ملتا تھا، اس وجہ سے بعض ملازمین — جو اس طرح پیسے حاصل کرنے کے عادی تھے — ان سے ناراض رہتے تھے، اور چاہتے تھے کہ حکیم صاحب کا ٹرانسفر ہوجائے؛ اس لئے ایک گونہ تنگ دستی کا سامنا تھا، ان حالات میں ایک طرف والدہ ہمیشہ مہمانوں کے لئے ضیافت کی ضروری چیزیں چھپا کر رکھا کرتی تھیں، کہ اگر اچانک کوئی مہمان آجائے تو بے

عزتی کا سامنا نہ ہو، دوسرے ہم لوگوں کا یہ مزاج بنا دیا گیا تھا کہ دوسرے اقرباء کے یہاں کوئی اچھی چیز دیکھیں تو حرص ولالچ کا اظہار نہ ہو، اس طرح والدہ نے عسرت وتنگی کے اس دور کو غیرت اور خود داری کے ساتھ گذارا، اور ہم لوگوں کو بھی اپنی روکھی روٹی پر قانع رہنے کی تربیت دی، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ والدہ کی اس تربیت نے بعد کی زندگی میں بڑا فائدہ پہنچایا، اور سادگی مزاج میں اس طرح رچ بس گئی کہ دوسروں کی عشرت سامانی کو دیکھ کر نہ اپنے اندر طمع پیدا ہوئی اور نہ شرمساری، پھر اللہ نے وسعت بھی دی؛ لیکن یسر وسہولت اور خوشحالی کے دور میں بھی یہ تربیت کام آرہی ہے۔

کئی مواقع پر والدہ کی قوت ایمانی اور دینی غیرت ہمارے لئے فیصلہ کن ثابت ہوئی، اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جب میں دارالعلوم سبیل السلام میں مدرس تھا، اور میری تنخواہ غالباً ۳۵۰/روپئے تھی، اسی زمانہ میں خدابخش لائبریری پٹنہ میں چند جائیدادوں کے لئے آدمی کی تلاش تھی، ان میں ایک جگہ ایسے شخص کے لئے تھی جو عربی زبان میں اسلامی علوم میں کام کرنے والوں کو مراجع کے سلسلہ میں رہنمائی کرے، میں جناب عابد رضا بیدار صاحب کی دعوت پر ایک سیمینار میں ''آزاد ہندوستان اور جدید علم کلام میں اُردو زبان کا اثاثہ'' کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھ چکا تھا، جسے انھوں نے باوجود اختلاف رائے کے پسند کیا تھا؛ چنانچہ انھوں نے قاضی مجاہد الاسلام صاحبؒ سے خواہش کی کہ میں اس جگہ کے لئے درخواست دوں، اور وہ اسے منظور کرادیں گے، یہ لائبریری سنٹرل گورنمنٹ کے تحت ہے، اس وقت وہاں کی تنخواہ اچھی خاصی تھی، اور سرکاری ملازمین کو دوسری سہولتیں بھی تھیں، ادھر گھر کا حال یہ تھا کہ ابا کا انتقال ہو چکا تھا، زمینیں بٹائی داروں کے پاس تھیں، اور ان سے ناکافی غلہ حاصل ہوتا تھا، میری ایک بہن کو ان کے شوہر کے دماغی توازن متاثر ہونے کی وجہ سے علاحدگی حاصل کرنی پڑی تھی، اس لئے وہ بھی میرے ہی گھر تھیں، اور میرے چھوٹے بھائی ابھی زیر تعلیم تھے، ان ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے میرے چچا مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے خاص طور پر مجھے خط لکھا کہ میں پٹنہ آکر اس ملازمت کے لئے کوشش کروں، جس میں ۹۵ فیصد کامیابی کا امکان ہے، مجھے اس اطلاع سے

بڑی مسرت ہوئی، والدہ اس وقت میرے ساتھ ہی حیدر آباد میں تھیں، خوشی خوشی جا کر ان کو اطلاع دی، مجھے توقع تھی کہ وہ بڑی خوش ہوں گی؛ لیکن والدہ اس بات کو سن کر بالکل خاموش ہوگئیں، میں نے عرض کیا کہ میں سمجھتا تھا کہ آپ اس سے بہت خوش ہوں گی، دُعائیں دیں گی؛ لیکن آپ بالکل خاموش ہیں؟ انھوں نے کہا: ''بیٹا! تمہارے ابا ہمیشہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے اس لڑکے کو خدا کے دین کے لئے وقف کر دیا ہے، تو تمہارے ابا نے تم کو دین کی خدمت کے لئے پڑھایا تھا، اور تم سرکار کی خدمت کروگے، تاکہ زیادہ پیسے مل جائیں؟ مجھے تو یہ مطلق پسند نہیں ہے'' میں خاموش ہوگیا اور میں نے کہا کہ آپ کی جو رائے ہو، اس کے مطابق عمل ہوگا، میری اس بات سے انھیں بہت اطمینان ہوا اور کہنے لگیں کہ ''زندگی آرام یا تکلیف سے گذر ہی جائے گی، اسی لائن میں رہو، اللہ تعالیٰ اسی میں برکت بھی دے گا اور عزت بھی دے گا'' اور واقعہ ہے کہ آج اس برکت وعزت کو میں کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہوں، اور ان کی دُعاؤں کا پھل کھا رہا ہوں۔

جب سے مجھے ہوش ہوا، ہمیشہ ان کو نہ صرف فرائض بلکہ نفل نمازوں اور روزوں کا بھی پابند پایا، قرآن مجید کی تلاوت بھی بہت ہی اہتمام سے اور خاصی دیر تک کرتیں، اور رمضان المبارک میں تو مسلسل پانچ پانچ، چھ چھ گھنٹے تلاوت کا معمول تھا، سورۂ یٰسین، آیت الکرسی، معوذتین اور درود شریف روزانہ پڑھ کر ہم لوگوں کو اور گھر کے بچوں کو دم کرتیں، ایک سال رمضان المبارک آ گیا، بینائی تیزی سے متاثر ہو رہی تھی، ڈاکٹر نے منع کیا؛ مگر جب ماہ مبارک شروع ہوا تو والدہ کو یہ پرہیز گوارا نہیں ہوا اور حسبِ معمول انھوں نے تلاوت شروع کر دی؛ چنانچہ ایک دو ہفتہ کے بعد بینائی ختم ہوگئی، والدہ کو افسوس تو ہوا؛ لیکن کہنے لگیں کہ خوشی کی بات ہے کہ میری بینائی قرآن مجید پر قربان ہوئی ہے؛ غریبوں کی مدد کرتیں، ۱۹۹۰ء میں میرے ساتھ ہی حج ہوا، میری اہلیہ بھی شریک سفر تھیں اور میں نے خاص طور پر ان کو والدہ کی سہولت اور خدمت کے لئے ساتھ رکھا تھا، ضعف اور پیرانہ سالی کی وجہ سے میں چاہتا تھا کہ وہ وہیل چیئر پر سعی وطواف کرلیں، اور رمی ہم لوگ ان کی طرف سے کر آئیں؛ لیکن وہ اس پر راضی نہیں

ہوئیں، اور ہم دونوں میاں بیوی دونوں طرف سے ہاتھ پکڑ کر ان کو سعی وطواف کراتے، انھوں نے خود پیدل چل کر اور جمرات تک پہنچ کر رمی کی، حرمین شریفین میں ان کو ایسا سکون حاصل ہوتا کہ وہاں سے جانا نہ چاہتیں، مدینہ میں کہنے لگیں کہ بیٹا دُعاء کرو کہ یہی پاک مٹی نصیب ہوجائے، منی اور عرفات میں شب وروز دُعاء اور ذکر کا مشغلہ رہتا۔

انھیں اپنی اولاد کی طرح اولاد کی اولاد کے لئے بھی دینی تعلیم کی فکر دامن گیر تھی، میرے دونوں لڑکے، میری بہن اور چھوٹے بھائی کے ایک لڑکے جو دینی تعلیم میں لگے، اس میں بھی ان کی تمناؤں اور خواہش کا خاص دخل ہے، میرے بڑے لڑکے محمد عمر عابدین سلمہ نے دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد سے فراغت حاصل کی تو والدہ نے کہا کہ میرے پوتے کو دیوبند ضرور بھیجو؛ کیوں کہ تمہارے دادا نے، مجاہدؒ بابو (حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ) نے دیوبند سے پڑھا ہے، انھیں دیوبند سے بڑی عقیدت تھی، میرے چھوٹے لڑکے محمد ظفر عابدین سلمہ نے جب حفظ قرآن کی تکمیل کی تو ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا۔

ان کا سلوک اپنے تمام بچوں کے ساتھ اتنا شفقت آمیز ہوا کرتا تھا کہ ہر ایک کو محسوس ہوتا کہ وہ سب سے زیادہ اسی کو چاہتی ہیں، بہوؤں کے ساتھ بھی ان کا سلوک بیٹی کی طرح تھا، اسی لئے بیٹی کے ساتھ ساتھ بہوؤں نے بھی ماں کی طرح ان کی خدمت کی، حقیقت یہ ہے کہ ہم بھائی بہنوں کی تربیت میں ان کا بڑا حصہ ہے، ان ہی کی تربیت اور دُعاؤں کا اثر ہے کہ اس حقیر سے کچھ چھوٹی موٹی علم اور دین کی خدمت ہوجاتی ہے، میرے برادر خورد ڈاکٹر مظفر الاسلام عارف بھی نہ صرف تعلیم ومعالجہ کے پیشہ سے وابستہ ہیں؛ بلکہ علمی ذوق کے بھی حامل ہیں، اور ان کی ایک کتاب ''اے ہسٹری آف یونانی میڈیکل سائنس ان بہار'' A History of Unani Medical Scienge in Bihar کے نام سے طبع ہوچکی ہے، یہ والدین ہی کی دُعاؤں کا فیض ہے۔

میں جب بھی گھر میں داخل ہوتا یا دور دراز کے سفر سے واپس آتا تو سب سے پہلے اماں کے پاس حاضر ہوتا، اوران کے دست شفقت کی ٹھنڈک حاصل کرتا، کہیں جانا ہوتا تو سب سے آخر میں ان سے ملاقات کرکے اور دُعاؤں کی سوغات لے کر باہر جاتا، کوئی نیا کام شروع کرتا تو ان سے پہلے دُعاء کراتا، کوئی نئی کتاب آتی تو خیال آتا کہ اماں کو دکھاؤں گا، اور واقعی وہ دیکھ کر باغ باغ ہوجاتیں، سوچتا ہوں کہ اب کس کی نگاہ شفقت میرے غم کو ہلکا کرے گی؟ کس کی محبت میرے لئے قلب و روح کے سکون کا باعث ہوگی؟ کس کی دُعائیں میرے لئے راہِ حیات کی مشکلات میں زادِ سفر بنیں گی؟ کس کی مسرت ہماری خوشیوں کو دوبالا اور دو چند کردے گی؟ — پروردگارا! جس طرح میرے ماں باپ نے محبت وشفقت کے ساتھ میری پرورش کی ہے، اسی طرح آپ ان کے ساتھ بھی رحم وکرم اور عفو ودرگذر کا معاملہ فرمایئے۔ رب ارحمهما كما ربياني صغيراً ۔

❁ ❁ ❁

ایک بزرگ خاندان کی رحلت
(ڈاکٹر سید اظہار احمد صاحبؒ)

جب سے شعور کی آنکھیں کھلیں اور آنے جانے والوں کی پہچان پیدا ہوئی تو گھر سے باہر کے واردین میں سب سے زیادہ جن کو آتے جاتے دیکھا وہ ڈاکٹر سید اظہار احمد صاحبؒ تھے، وہ میرے والد کے خالہ زاد بھائی تھے اور اتنی زیادہ ایک دوسرے کے یہاں آمد و رفت کا سلسلہ رہتا تھا کہ بہت سے لوگ میرے والد ماجد مولانا زین العابدینؒ، عم محترم مولانا مجاہد الاسلام قاسمیؒ اور ڈاکٹر صاحب کو حقیقی بھائی گمان کرتے تھے، وہ دیکھنے میں بھی بڑے وجیہ تھے، درازی مائل قد، گندمی لیکن کھلتا ہوا رنگ، کشادہ پیشانی، گھنی اور بھرپور داڑھی، دوہرا بدن، سر پر کشتی نما ٹوپی، سفید کرتا پائجامہ، یہ ان کا حلیہ تھا، جو اس وقت بھی دیکھا جب داڑھی سیاہ تھی اور زندگی کے آخری زمانہ میں بھی جب داڑھی کے بال سفید ہو چکے تھے۔

ان کا خاندان اصل میں سمرقند سے تعلق رکھتا تھا، وہاں سے یہ حضرات کابل ہوتے ہوئے مغربی پنجاب میں وارد ہوئے، ان کے خاندان کے مورث اعلیٰ ملا محمد علیؒ حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ کے ساتھ معرکۂ بالاکوٹ میں شریک ہوئے، پھر جب سید صاحب کے کاروانِ حق کو شکست ہوئی اور ان کے رفقاء وہاں سے بکھر گئے تو ملا محمد علیؒ مولانا حافظ رحمۃ اللہ صاحب (بانی مدرسہ جامع العلوم مظفر پور) کی دعوت پر ان کے یہاں مقیم ہوئے، مظفر پور سے کچھ فاصلہ پر اور دربھنگہ سے بہت ہی قریب مسلمانوں کا ایک قصبہ ''بریول'' ہے، جس کے زمین دار ایک مسلمان رئیس تھے اور ''نواب بریول'' کہلاتے تھے، وہ ملا صاحبؒ سے

بہت متاثر ہوئے اور انھیں اپنے یہاں قیام کی دعوت دی، عرصہ بعد ملا محمد علی نے اپنے وطن واپس ہونے کا ارادہ کیا؛ لیکن علاقہ کے لوگوں نے اصرار کیا کہ وہ یہاں سے واپس نہیں ہوں اور انھیں روک رکھنے کے لئے کوشش کی کہ علاقہ ہی میں ان کا نکاح ہو جائے، ملا صاحب نے کہا کہ وہ ایسی لڑکی سے نکاح کرنا چاہیں گے جو سید الطرفین ہو؛ چنانچہ ''سیسو'' نامی گاؤں جو دربھنگہ شہر کے قریب ندی کے کنارے آباد ہے، میں ایک گھر سادات خاندان کا تھا، اس خاندان کی دینی حالت بہت اچھی نہیں تھی؛ لیکن ملا محمد علی صاحب کو وجدانی طور پر احساس ہوا کہ یہ لوگ ہیں سید الطرفین؛ لہٰذا اسی خاندان میں آپ کا نکاح ہو گیا، یہ خاندان بھی شیر شاہ سوری کے ساتھ اس علاقہ میں آیا تھا، شیر شاہ کی فوج اصل میں تو پٹھانوں پر مشتمل ہوتی تھی؛ لیکن فوج میں ہر پیشہ کا ایک آدمی شامل ہوتا تھا اور ایک سید النسب امامت کے لئے ہوتا تھا؛ چنانچہ اس گاؤں میں بنیادی طور پر پٹھانوں کی آبادی ہے، اور تقریباً ہر پیشہ کے لوگ موجود ہیں، نیز یہی ایک خاندان سادات کا ہے۔

اس سسرالی نسبت سے ملا سید محمد علیؒ ''ملا سیسو'' کے نام سے مشہور ہو گئے اور مظفر پور اور دربھنگہ سے لے کر نیپال کی سرحدوں تک ہزاروں لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، علاقہ سے بدعتیں دور ہوئیں، اس پورے علاقہ میں آپ کا دینی اور روحانی فیض جاری ہوا اور اس نسبت سے آج بھی اس خاندان کو عزت وتوقیر کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ملا محمد علی کے صاحبزادے ملا سید عبداللہ ہوئے، یہ بھی صاحبِ نسبت بزرگ تھے اور علاقہ میں ان کے اصلاح وتزکیہ کا سلسلہ جاری رہا، پھر ان کے صاحبزادے ڈاکٹر سید نور الحق مرحوم علاقہ کے معزز اور با اثر لوگوں میں تھے، ڈاکٹر سید اظہار احمد صاحب مرحوم ان ہی کے صاحبزادہ تھے۔

شریعت ان کے مزاج میں راسخ تھی؛ اس لئے بدعت اور خلافِ سنت کسی بھی کام کو

گوارہ نہیں کرتے تھے اور اس معاملہ میں بعض اوقات جذباتی بھی ہو جاتے تھے، احکام شریعت کے مقابلہ رسم ورواج کو ذرا بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے، شادی بیاہ وغیرہ کے سلسلہ میں آج کل تلک اور لین دین کی جو غیر شرعی رسمیں چل پڑی ہیں، اس سے ان کو شدید نفرت تھی، اللہ نے پانچ لڑکیاں اور چار لڑکے دیئے تھے، ان میں ایک کے سوا سب کی شادی انھوں نے خود کی، تمام شادیوں میں سنت کے اہتمام کا پورا خیال رکھا اور اتنی سادگی سے یہ تقریبات انجام دیں کہ اس کی مثال کم ہی ملے گی، اس سلسلہ میں اعزہ کے طعن وتشنیع اور گلہ وشکوہ کو بھی خاطر میں نہیں لائے۔

حضرت مولانا اشتیاق احمد مظفر پوری (ناظم تعلیمات مدرسہ جامع العلوم مظفر پور و رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند) سے بیعت تھے، میں نے جب سے انھیں دیکھا، ان کو فرائض ونوافل اور سنن وآداب کا بہت زیادہ اہتمام کرنے والا پایا، تبلیغی جماعت سے گہرا تعلق تھا، چار ماہ بھی لگایا اور چالیس دن کا وقت تو ہر سال ہی لگانے کی کوشش کرتے تھے، اس کام سے انھیں بڑی محبت تھی اور اپنے علاقہ میں کام کے ذمہ داروں میں تھے، اس کے ساتھ ساتھ علماء اور مشائخ سے تعلق بھی اسی درجہ تھا۔

تنظیمی اعتبار سے ان کا تعلق ہمیشہ امارت شرعیہ سے رہا، وہ اپنے علاقہ میں امارت کے ''نقیب'' تھے اور اس کی مجلس اربابِ حل وعقد کے رکن بھی تھے، ہمیشہ امارت شرعیہ کے کاز کے لئے سرگرم رہا کرتے تھے، حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجادؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، معقولات کے مشہور استاذ مولانا عبدالوہاب صاحبؒ، مفتی عبدالحفیظ صاحبؒ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ وغیرہ کو انھیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تھا اور ہمیشہ ان کے ذکر میں رطب اللسان رہتے تھے، ان پر اپنے چچازاد بھائی، مولانا اعجاز احمد صاحب، جو تقسیم ہند سے پہلے جمعیۃ علماء دربھنگہ کے صدر تھے، کی ذہانت، اصابتِ رائے اور کثرت

معلومات کا خاص تاثر تھا اور خود بھی تقسیم ملک کے وقت جمعیۃ علماء ہند کی فکر سے متفق تھے، حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمی رحمۃ اللہ علیہ ان کے خالہ زاد بھائی اور عمر میں چند سال ان سے چھوٹے تھے، اس لئے آپس میں بہت بے تکلفی تھی اور ایک دوسرے سے بڑی محبت رکھتے تھے۔

ادبی ذوق کے بھی حامل تھے، قمؔر تخلص کرتے تھے، ان کے اشعار کا ایک مجموعہ جسے آخر زندگی میں وہ خود مرتب کر رہے تھے، زیر طبع ہے اور اُمید ہے کہ جلد ہی اس کی اشاعت عمل میں آئے گی، تقریر کا بھی خاص ملکہ تھا اور اور مجلسی گفتگو کے تو دھنی تھے، واقعات واحوال کے بڑے ہی ماہرانہ تجزیئے کرتے تھے، سیاست کے کارزار سے دور رہتے ہوئے بھی اپنے علاقہ کے الیکشن میں غیر محسوس طور پر بہت ہی اہم رول ادا کرتے تھے۔

انھوں نے اپنے ذریعۂ معاش کے لئے ہومیو پیتھک طریقۂ علاج کو اختیار کیا تھا اور اس میں انھیں بڑی مہارت حاصل تھی، بہت سے پیچیدہ امراض کا کامیاب علاج کرتے تھے، میں نے اپنے بعض احباب میں پولیو اور عرق النساء کے کہنہ مریض کو ان کے ہاتھوں شفایاب ہوتے دیکھا ہے، زندگی کا زیادہ عرصہ ''چلہا، دلاور پور'' نامی ایک گاؤں میں اسی پیشہ کی نسبت سے گذارا، وہاں کے لوگ نہ صرف ایک معالج کی حیثیت سے بلکہ ایک دینی مصلح کی حیثیت سے بھی ان سے بے حد محبت کرتے تھے، اخیر عمر میں خود اپنے دولت کدہ (سیسو) میں مقیم ہوگئے، یہاں بھی دور دور سے ضرورت مند آتے رہتے تھے۔

ان کا نمایاں وصف سنت کی اتباع، بدعت اور رسم ورواج سے نفرت کے ساتھ ساتھ اہل ثروت سے استغناء عسرت وتنگدستی کے دور میں بھی خود داری اور ستر حال تھا، زندگی کا ایک اچھا خاصا حصہ معاشی مشکلات میں گذرا؛ لیکن ان کے رکھ رکھاؤ، مہمان نوازی

اور خوش پوشی کی وجہ سے لوگوں کے لئے اس کا اندازہ کرنا دشوار ہوتا تھا اور حالات خواہ کیسے بھی ہوں، مجال نہیں تھی کہ لوگوں کے سامنے یہاں تک کہ اپنے قریب ترین رشتہ داروں کے سامنے بھی اپنی دشواریوں کا ذکر آجائے، ان کی ایک قابل تقلید صفت صلۂ رحمی اور اعزہ کی خبر گیری تھی، وہ قریب اور دور کے تقریباً ہر رشتہ دار کے یہاں پہنچتے، خوشی کی تقریبات ہوں یا غم کی، وہ ضرور شرکت کرتے، کسی کی بیماری کی اطلاع ملتی تو عیادت کے لئے پہنچ جاتے، کسی کے یہاں کوئی حادثہ ہوا ہو تو ضرور پُرسہ دیتے، رشتہ داروں میں امیر وغریب کا کوئی فرق نہیں تھا؛ بلکہ غریبوں کو مقدم رکھتے، اگر کہیں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو لوگوں کے بلانے کا انتظار نہیں کرتے؛ بلکہ مسئلہ کو حل کرنے اور میل ملاپ پیدا کرنے کے لئے خود ہی پہنچ جاتے، پورے خاندان کو جوڑ کر رکھتے اور اس کے لئے بعض دفعہ ناگوارِ خاطر باتوں کو برداشت بھی کرتے، اپنے یتیم بھانجہ اور بھانجی کی پرورش بھی اولاد کی طرح کی، دسترخوان بھی وسیع ہوتا اور کھانا گو سادہ ہوتا؛ لیکن ہر آنے جانے والے کو شریک کرتے اور کھلا کر بہت خوش ہوتے۔

اس وقت وہ میرے خاندان کی سب سے بزرگ شخصیت تھے اور مجھ سے دوہری نسبت تھی، کہ چچا بھی تھے اور خسر بھی، افسوس کہ ۲۳؍صفر ۱۴۲۷ھ مطابق ۲۴؍مارچ ۲۰۰۶ء جمعہ کی شب میں چند روزہ علالت کے بعد تقریباً ساڑھے بارہ بجے ان کی وفات ہوئی، وفات کے وقت عمر ۸۷ سال تھی، وفات کے روز دن میں طبیعت بہت بہتر رہی، تمام افرادِ خانہ کو بلا بلا کر فرداً فرداً نصیحتیں کیں اور کلمہ پڑھتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے، عشاء کی نماز اس دن گھر ہی میں جماعت کے ساتھ بہ مشقت ادا فرمائی، ادھر عرصہ سے حال یہ تھا کہ جب بھی ٹیلیفون پر بات ہوتی تو آخری جملہ یہی کہتے کہ میرے لئے حسن آخرت اور حسن خاتمہ کی دُعاء کرو، اللہ کا شکر ہے کہ ان کی یہ آخری خواہش پوری ہوئی، وفات کے بعد جب ان کی ڈائری

دیکھی گئی تو ایک ایک پیسہ کا حساب اس میں وضاحت سے لکھا ہوا پایا گیا، یہاں تک کہ لڑکوں کی طرف سے جو پیسے آئے اس کا حساب بھی، یہ یقیناً جائے عبرت ہے، بہت سے لوگ جو معاملات کو واضح نہیں کرتے، ان کے ورثہ دشواری میں مبتلا ہوتے ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی قبر پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے اور اپنی مخلوق کے ساتھ عفو ودرگذر کرنے والے اس بندہ کو بھی اپنے دامنِ عفو میں پناہ دے۔ آمین

❁ ❁ ❁